"اقبال کا ذوق جمال"

تحقیقی مقالہ برائے
پی۔ایچ۔ڈی

مقالہ نگار
فقیرا خان فقری جدون

نگران
پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

گروہ ادبیات اردو
دانشگاہ پشاور

جنوری ۲۰۰۲ء

"اقبال کا ذوقِ جمال"

تحقیقی مقالہ برائے

پی۔ ایچ۔ ڈی

مقالہ نگار

فقیرا خان فقریؔ جدون

نگران

پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

گروہِ ادبیاتِ اردو

دانشگاہ پشاور

DEPARTMENT OF URDU
University of Peshawar

Dr. Zahoor Ahmed Awan
Associate Professor

COMPLETION CERTIFICATE

It is to affirm that **Mr. Faqira Khan Faqri Jadoon,** Asstt. Professor, Department of Urdu, University of Peshawar has successfully completed his Ph.D. thesis on the topic " اقبال کا ذوقِ جمال " under my supervision.

I recommend that on the basis of this thesis he may be awarded Ph.D. Degree.

13.2.2002

Dr. Zahoor Ahmad Awan

باب اوّل
یونانی فلاسفہ اور جمالِ کائنات

فہرست موضوعات

بابِ دوئم

حکمت بحثیہ (فلسفہ) حکمت ذوقیہ (عشق)
اور صاحبِ ذوق وشوق اقبال کی نظر میں

فہرست موضوعات	ص

باب سوئم

چشم در کشت محبت کاشتم
از تماشا حاصلے برداشتم

فہرست موضوعات — ص

باب چہارم

اقبال کی حسن کاری

باب پنجم

نتائج

انتساب

ماں جی کے نام

فقیرا خان فقری

یکم دسمبر ۲۰۰۱ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

پندرہ برس کی ایک پوری عمر سے اس سوچ بچار میں ہاتھ دھو بیٹھا کہ میرے تحقیقی مقالے کا موضوع کیا ہونا چاہیے؟ کبھی سوچتا، "زندگی درد پرانا میرا" پر کام کروں اور کبھی دل میں ٹھان لیتا کہ راستہ طویل اور کٹھن ہونا چاہیے، تاکہ گزرنے والے بے سروساماں مسافر کے نشان پادیر تک زمین کے کلیجے میں کندہ رہیں۔

خوش قسمتی سے میری یہ الجھن ڈاکٹر محمد اشرف عدیل صاحب نے یہ تجویز دیتے ہوئے حل کردی کہ آپ "اقبال کا نظریہ جمال" پر حقیقی تحقیق کریں۔ مجھے یہ موضوع بہت پسند آیا۔ اور اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ایک واضح منزل کی طرف رواں دواں کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

سال ہا سال کے مسلسل مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ "اقبال کا ذوق جمال" زیادہ موزوں موضوع ہے اس لیے کہ اقبال فلسفے کی "نظریاتی" موشگافیوں کے مقابلے میں، سینہ افروخت مراصحبت صاحب نظراں اور:

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش، لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف، خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوہ دانش فرنگ، سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف، کے مصداق کسی حکیم کے بجائے کلیم کے گرویدہ ہیں۔

بر حال میں یہ سوچتا تھا کہ ایسی طویل اور مشکل مسافت کیونکر طے ہوگی؟ مگر بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر، طلسم زمان و مکاں توڑ کر، نے ہمت بندھائی اور آج اللہ تعالٰی کے فضل و کرم سے یہ دن بھی دیکھنا نصیب ہوا کہ مقالہ اپنی تکمیل کے تمام تر مراحل طے کر چکا ہے۔

مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں "حرم پرنٹرز" اور جناب ظفر خٹک کا بہت بڑا کردار ہے۔ بہرام صاحب نے سب سے پہلے اس مقالے کی کمپوزنگ کا بیڑہ اٹھایا اور پورے خلوص نیت سے خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے کے بعد غائب ہوجانے کا سہرا ان کے سر ہے۔

البتہ عمران علی صاحب نے دن رات ایک کرکے پانچ ماہ کے عرصے میں، آخر دم تک بڑی محنت و جانفشانی سے یہ مقالہ کمپوز کیا۔ میں انکی محنت شاقہ اور وفاداری بشرط استواری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ذوالفقار صاحب اور عابد صاحب بھی دست تعاون برابر بڑھاتے رہے۔ جس کے لیے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

علاوہ ازیں جناب پروفیسر شیر وہاب، جناب پروفیسر میاں سہیل احمد، جناب پروفیسر امیر شاہ، جناب کرنل ڈاکٹر محمد ایوب، جناب اختر خٹک، جناب پروفیسر غیور حسین، جناب پروفیسر محمد سلیم خان، جناب پروفیسر تاج الدین تاجور، جناب پروفیسر اظہار اللہ اظہار، جناب پروفیسر محمد سلمان اور استاد محترم و رفیق کار جناب پروفیسر ضیاء الرحمٰن اور پروفیسر سہیل احمد بھی شکریے کے مستحق ہیں، کہ مقالے کی تکمیل پر وہ مجھ سے بھی زیادہ خوش دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ان کی محبت و خلوص ہے جسے اس گئے گزرے دور میں غنیمت جانیے۔

اس موقع پر مجھے محترم جناب پروفیسر عبدالقادر ساجد کی یاد بھی شدت سے آ رہی ہے، اس لیے کہ اگر وہ مثنوی مولانا روم کی چھ جلدیں فراہم نہ کرتے تو صاف ظاہر ہے کہ مجھے بہت دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ محترم جناب ڈاکٹر غلام ناصر مروت رئیس مشرقی السنہ "اقبال کے ذوق جمال" میں دلچسپی رکھتے ہوئے ہمیشہ میری ہمت بڑھاتے ہوئے صورت حال کا جائزہ لیتے رہے۔ میں ان کا بھی ممنون ہوں۔

آخر میں اپنے نگران جناب پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے خلوص نیت اور تعاون کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تحقیق کے ہر موڑ پر میری رہنمائی اور ہمت افزائی کرنے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ میرے نزدیک کسی بے سروسامان مسافر کی بے مثال رہنمائی یہ ہے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا میں جتنا بھی شکریہ ادا کروں پھر بھی کم ہے۔

بہر حال یہ مقالہ بعنوان "اقبال کا ذوق جمال" پیش خدمت ہے۔ جس کے پیش کرنے میں راقم کسی عرق ریزی اور ورق گردانی کا دعویٰ تو ہرگز نہیں کر سکتا، مگر اتنا ضرور ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی "دشتِ جنوں" نظر آیا، جمع کردم مشتِ خاشاکے کہ سوزم خویش را، کے مصداق میں نے ہر "دشتِ جنوں" سے حتی الوسع تنکے اکٹھے کیے ہیں۔ اور اس طرح ایک ایک تنکا جمع کر کے اپنی بساط کے مطابق، اقبال کے ذوق جمال کی مہکتی ولہکتی ڈال پر اس مقالے کی صورت میں حسرتوں بھرا ایک معمولی سا آشیانہ تعمیر کیا ہے۔ جس میں دل و دماغ کے دو پنچھی سلگتے نغمے الاپ رہے ہیں۔ ان نغموں کا مطلب بدست ذرہ دادم آفتابے سے لے کر، از نگاہ عشق خارا شق شود، عشق حق آخر سراپا حق شود، سے جاملتا ہے۔

اگرچہ میں "خبر و نظر" سے عاری ہوں، لیکن پھر بھی کسی پوشیدہ تڑپ کے بل بوتے پر سوت کی ایک حقیری "انٹی" اٹھائے کائنات جلال و جمال میں نکل آیا ہوں

پیش خدمت مقالے کی "پروف ریڈنگ" بندہ ناچیز نے بذات خود تین مرتبہ کی ہے۔ غلطیوں اور بے اعتدالیوں کو دور کرنے کی خاطر محتاط غور و خوض کے باوجود اگر غلطی سے کچھ غلطیاں مزید غلط ہو گئی ہوں تو یہ میرا انسانی اور کمپیوٹر کا غیر انسانی فعل ہوگا۔ جس کے لیے یوں معذرت خواہ ہوں کہ:

اگر سیاہ دلم، داغ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم، گل بہار توام

"فقری جدون"

۱۴ جنوری، ۲۰۰۲ء

''جھلک''

تمام ماہرین جمالیات اس بات پر متفق ہیں کہ ''حسن وفن'' کا فلسفہ جمالیات (AESTHETICS) کہلاتا ہے اور یہ کہ جلال بھی جمال کی لازمی صفت ہے۔علاوہ ازیں کسی پوشیدہ راز کو معلوم کرنا بھی جمالیات کے زمرے میں آتا ہے۔حسن کو مجسم انداز میں پیش کرنے کو آج تک مروجہ اصطلاح میں فنکاری کہتے ہیں۔لیکن چونکہ فن کے اندر حسن پیش کیا جاتا ہے۔اس لئے راقم الحروف اس عمل کو فن کاری کی بجائے ''حسن کاری'' اور فن پارے کی جگہ ''حسن پارے'' کی اصطلاح اختراع کرتے ہوئے، اسی مناسبت سے فنکار کو ''حسن کار'' کا نام دینا زیادہ بہتر خیال کرتا ہے۔

''اقبال کے ذوق جمال'' پر بات کرتے ہوئے، ان کی اردو، فارسی ''حسن کاری'' سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ''فلسفہ جمالیات'' عالم محسوسات و موجودات تک محدود ہے۔اس لئے کہ تجزیاتی یا معروضی فلسفے کی رو سے، جو کچھ ظاہر ہے وہی حقیقت ہے۔اور موضوعی یا عینی فلسفہ ظاہر کو دھوکہ اور اعیان کا عکس قرار دیتا ہے۔مطلب یہ کہ فلسفے کے مطابق جمالیات صرف مجاز تک محدود ہیں۔مجاز سے آگے نہ جمال ہے نہ جلال۔لیکن ذوق وشوق یا عشق کی رو سے نہ مجاز دھوکہ ہے اور نہ ظاہر حقیقت ہے۔بلکہ تخلیق بالحق ہوتے ہوئے جلال و جمال کی نشانیاں ہیں، جن سے حسن مطلق کہیں دور کسی دوسری دنیا میں جلوہ گر نہیں بلکہ یہیں اپنے انہی نقوش کے پردوں میں، ہر ایک شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

جلال و جمال کا منبع ایک مخفی راز ہے جو ''فلسفیانہ جمالیات'' نہیں بلکہ ''عاشقانہ جمالیات'' کے ضمن میں آتا ہے۔اسے معلوم کرنا فلسفے کے بس کا روگ نہیں، بلکہ ''قوت عشق'' کے ذریعے جلال و جمال کے اس لازوال و باکمال نورانی سرچشمے تک رسائی ممکن ہے۔اس بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اقبال چونکہ اپنے آپ کو فلسفے تک پابند سلاسل نہیں رکھتے، وہ منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے، اختیار جادہ و ترک مقام اور در نظر رود در نظر رود در نظر کی رو سے ذوق وشوق کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔اس لئے زیر نظر مقالے کو ''اقبال کا ذوق جمال'' جیسے عنوان سے مزین کرتے ہوئے جمالیات میں ان کے ذوق جمال کا تعین کیا گیا ہے۔

یہ مقالہ کہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا باب ''آیونی'' اور ''ایلیائی'' مفکروں کے علاوہ سقراط افلاطون، ارسطو، فلاطینوس، شہاب الدین سہروردی (شیخ الاشراق) اور اشاعرہ سے متعلق ہے۔

دوسرے باب میں حکمتِ بحثیہ وحکمتِ ذوقیہ یعنی فلسفے وعشق کے مابین فرق کو اجاگر کرتے ہوئے، تصوف، عجمی تصوف، مرد فقیر اور بحوالہ عشق ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق پر بات کی گئی ہے۔

تیسرا باب، موضوعیت (Subjectivity) معروضیت (Objectivity) وحدت الوجود (Pantheism) وحدت الشہود (Pan-antheism) قرآن حکیم کی رو سے ''وحدت جمال''، حسن مطلق سے متعلق تجسیم گری، حسن وعشق آرزو و تڑپ اور قوت مسخرہ، حسن مطلق و حسن فطرت، مجاز و حسن مطلق، عشق در ہجر و وصال، حسن وعشق بلا واسطہ، تو شعلہ سینائی، میں شعلہ سینائی، تجزیاتی

(Analytic) یعنی معروضی، تصوراتی (Idealist) یعنی موضوعی وعینی فلسفے سے متعلق اقبال کا ردعمل یا تقابل، خرد کی گتھیاں سلجھانے کے بعد اقبال کی عشق سے رغبت، سینہ افروخت مراصحبت صاحب نظراں، آنحضورؐ کی ذات اقدس مبارک مولانا رومیؒ سے عقیدت اقبال اور حسن مطلق کی معرفت ودیدارذات یعنی واجب الوجود کے بارے میں ہے۔

چوتھے باب میں اقبال کی ''حسن کاری'' زیر بحث لائی گئی ہے۔ جس میں افادی شاعری کے حوالے سے شاعر کو اقبال نے، کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں فرد وملت، فنون لطیفہ، جدت وندرت اور اجتہاد فکر ونظر، تقلید اور جان رسکن کے حوالے سے ''فطریت'' کے ردعمل میں اقبال کے فوق الفطرت وتسخیر فطرت کے جذبے پر بات کرنے کے علاوہ، غلامی وآزادی کے فنون اور بکبوتر اں عقابی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

جبکہ پانچواں باب تمام تر نتائج کی روشنی میں، ازتماشا حاصلے برداشتم کا نورانی کھلیان ہے۔

استھیٹکس کا لفظ تاریخ جمالیات میں سب سے پہلے بام گارٹن نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ۱۷۳۲ء کو استعمال کیا۔ جسے اس نے یونانی لفظ استھیس سے وضع کیا۔ جس کے معنی ''ادراک حسی'' کے ہیں۔ اس طرح فلفسہ، جمالیات سے حسی ادراک مراد لیتا ہے۔ اس لئے پہلے ہم محسوسات وموجودات یعنی آب وگل کے حوالے سے تخلیق کائنات پر بات کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہماری ظاہری آنکھوں کے سامنے قدرت کا جتنا جلال و جمال بکھرا ہوا ہے، وہ موجودات ومظاہر ہی کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تخلیق کائنات کی ایسی منظم ترتیب وترکیب کیونکر معرض وجود میں آئی۔ جس میں ہمارے فہم وادراک سے بڑھ کر اعلیٰ وارفع درجے کی حسن کاری سے کام لیا گیا ہے۔ بلکہ جس کے مقابلے میں ہمارا ادراک کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ دکھائی دیتا ہے۔

یہ حسن کاری، حسن در حسن کے جلال و جمال سے معمور و پرنور ہوتے ہوئے نظر افروز و دل فروز ہے۔ اس بنا پر ساری کائنات جلال و جمال کا ایک دلکش ودیدہ زیب مرقع ہے۔ یہی وہ دلکشی ہے۔ جس کی وجہ سے حسن کائنات نے مختلف ادوار میں بے شمار مفکرین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ جنہوں نے اس ''جلالی و جمالی کائنات'' کی تخلیق اور اجزائے ترکیبی کے بارے میں کبھی حقائق بیان کئے اور کبھی محض مفروضوں اور اندازوں سے کائنات کے معرض وجود میں آنے سے متعلق اظہار خیال کیا۔ تاریخ میں دستیاب معلومات کی روشنی میں ''یونانیوں'' نے سب سے پہلے تخلیق کائنات پر غور وخوض کیا۔

''آیونیا'' اور ''ایلیا'' کے مفکرین اس ضمن میں ہراول دستے کا مقام رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے مصر، بابل اور یونان میں اساطیری خداؤں کے عام تصور نے یہ عقیدہ پختہ کر دیا کہ کائنات دیوتاؤں کی تخلیق ہے۔ جبکہ ''آیونائی'' مفکر تھیلز (Thales) نے سوچا کہ کائنات کسی ایک ہی عنصر سے بنی ہے، جو ''پانی'' ہوسکتا ہے۔ وحدت عنصر کی بناء پر تھیلز کے فلسفے میں وحدت الوجود کا عکس نظر آتا ہے۔

بعد ازیں ''آیونیا'' ہی کے فلسفی انیکسمنڈر (Anaximander) نے کہا کہ تخلیق کائنات لامحدود مادہ سے ہوئی ہے۔ اس نے نظریہ ارتقاء بھی پیش کیا۔ یعنی پہلے نچلے درجے کی مخلوقات معرض وجود میں آئیں اور پھر اعلیٰ مخلوقات ظہور پذیر ہوئیں۔

پھر ''آیونیا'' ہی میں ملٹس شہر کے انیکسمنز (Anaxemines) کے مطابق کائنات اور اس میں موجود تمام اشیاء ہوا سے بنی ہیں۔

فیثا غورث نے ریاضی دانی کے سبب اعداد سے کائنات کی تشکیل ظاہر کی۔

اس کے بعد ایلیائی مفکرین میں سے زینوفینز (Xenophanes) نے سب سے پہلے ہستی کے متعلق "احدیت" (Monism) کا اظہار کیا۔ ایلیا کا دوسرا مفکر پارمینڈیز (Parmenides) بھی احدیت کو مانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مطابق ہستی ایک ہے۔ اور موجود ہے۔

زینو نے پارمنڈیز کے نظریہ وحدت الوجود کا پرچار کیا اور رواقیت یعنی (Stiocism) کا بانی ٹھہرا۔ شوپن ہار اسی کے چراغ سے قنوطیت (Pessimisim) کا چراغ روشن کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایپقورس کا فلسفہ ابیقوریت (Epicureanism) کے نام سے مقبول و بدنام ہوا۔ جسے لذیت (Hedonism) پر محمول کیا گیا۔ ایپقورس کہتا ہے کہ فقط کائنات ہی جمال کی مکمل و اکمل جلوہ گاہ ہے، حسن کے اس فطری جلوے میں انسان کے فن پارے ناقص و نامکمل ہیں۔ اس لئے وہ فنون لطیفہ کو اہمیت نہیں دیتا۔

بہر حال ہراقلیتوس نے انیکسمنز کے نظریے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہ ہوا جلتی ہے۔ یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کائنات آگ سے بنی ہے۔

ہراقلیتوس انیکسمنز کے علاوہ ایران کے زرتشت سے بھی متاثر تھا۔ بعد میں نطشے اور برگساں بھی ہراقلیتوس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے اپنے نظریات کو ارتقائی صورت میں پیش کیا۔

ہراقلیتوس کے بعد ایمپیڈوکلیز نے اپنے عہد کے مختلف فلسفیوں سے متاثر ہو کر ارتباطی (Unifying) انداز اپنایا اور اس طرح پانی، ہوا، آگ اور مٹی یعنی چاروں عناصر کو تخلیق کائنات کے "جلال و جمال" میں برابر کا شریک ٹھہرایا۔ یوں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر تعمیر و ترقی اور ایجادات کے مراحل طے نہیں ہو سکتے۔ انکساغورس کے نزدیک بہت سے عناصر ایک دوسرے سے خلط ملط ہو جانے کی بناء پر کائنات معرض وجود میں آئی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ایک نہیں بلکہ بہت سی دنیائیں ہیں۔ جن کی تکمیل کا باعث ایک عالمگیر حرکت ہے۔

اس کے بعد سوفسطائیوں سے فکر یونان کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ پرٹاگورس (Protagorass) کے مطابق آدمی ہر شے کا پیمانہ ہے۔ نطشے پر ہراقلیتوس کے علاوہ اسی سوفسطائیت کا اثر ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جو فلسفی طبیعاتی یا کائناتی فلسفے کے لحاظ سے کائنات کے معرض وجود میں آنے کی علت معلوم کرنے میں لگے رہے کسی ایک نقطے پر نہ پہنچ سکے۔ گویا کہ عقلیت حقیقت کا سراغ نہیں لگا سکتی۔ البتہ عشق ایک ایسی قوت اور تڑپ ہے جو زمان و مکاں سے رشتہ بپا عقل کے مقابلے میں طائر سدرہ آشنا ہے۔ اور مرغ لاہوتم واز دوست پیامے دارم کی روشنی میں اقبال عشق ہی کو حقیقت آشنا سمجھنے میں حق بجانب دکھائی دیتے ہیں۔

سقراط سے یونانی فکر اور جمالیات کے نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ اور واقعی، کتنی چھنا چھن ناچتی صدیاں، کتنے گھنا گھن گھومتے عالم، جن کا مآل اک سانس کی مہلت، سانس کی مہلت عمر گریزاں، جس کی لرزتی روشنیوں میں، جھلمل جھلمل، جھلکے اک مسحور مسافت۔ حد نظر تک وسعتِ دوراں۔ جس کی خونیں سطح پر تڑپے، طوق و سلاسل میں جکڑی، انسان کی قسمت۔ سقراط نے طبیعات کی بجائے انسان کو موضوع فکر

بنایا۔ وہ حسن کو خیر اور علم و حکمت بھی خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حسن خیر ہے اور خیر حسن ہے۔

سقراط ہی نے نظریہ ''تعقلات'' بھی پیش کیا۔ افلاطون اور ارسطو اس نظریے سے متاثر تھے۔ افلاطون نے اسے ''نظریہ اعیان'' اور ''اعیان ثابتہ'' کی صورت میں پیش کیا۔ اور بعد میں ظہور پذیر ہونے والی تصوریت (Idealism) دراصل سقراطی نظریہ تعقلات کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

افلاطون کے مطابق عالم ناسوت۔ عالم لاہوت یا عالم امثال کا پرتو ہے۔ اس کے مطابق یہ دنیا دھوکہ وسراب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ نظریہ بے شمار اعتراضات کی زد میں آتا ہے۔ اسی بناء پر اقبال نے افلاطون کو

راہب دیرینہ افلاطون حکیم — از گروہ گوسفندان قدیم

کہہ کر یاد کیا ہے۔ کیوں کہ فلاطینوس کے ذریعے جب نو افلاطونیت کا پرچار ہوا تو اقوام عالم بے عملی، سستی و کاہلی اور رہبانیت کا شکار ہو کر اپنا وقار کھو بیٹھیں۔ خاص کر عجمی تصوف کے زیر اثر مسلمانوں پر سکر کی حالت طاری رہی۔ جس کے نتیجے میں

قومہا از سکر او مسموم گشت — خفت و از ذوق عمل محروم گشت

نہ صرف افلاطون بلکہ حافظ شیرازی بھی اقبال کی تنقید سے نہ بچ سکے۔

پھر مشترکہ شادیوں کے ''درزغوبل'' کی وجہ سے افلاطون پر معاشرتی نوعیت کے اعتراضات بھی ہیں۔ جو تفصیلاً زیر بحث لائے گئے ہیں۔

ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا۔ ٹہل ٹہل کر خطبہ دینے کی بناء پر اس کا فلسفہ ''مشائیت'' کہلایا۔ جسے اہل یورپ پری پاٹنک سکول (Peripatetic School) اور ہم مدرسیت بھی کہتے ہیں۔ اقبال نے اپنے کلام میں ارسطو کے فلسفے سے متعلق مشائی اور مدرسہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ارسطو ہراقلیتوس کے برعکس کائنات کو جامد مادے کا ایک ڈھیر سمجھتا ہے۔ جس کی تخلیق مکمل ہو چکی ہے۔ مگر اقبال کے مطابق:۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

اے کہ تو پاس غلط کردۂ خود می داری — آنچہ پیش تو سکوں است خرام است اینجا

یہاں تک ''حکمت بحثیہ'' کی بات ہے۔ اس کے بعد فلاطینوس اسکندری کے حوالے سے ''حکمت ذوقیہ'' کا آغاز ہوتا ہے۔ جس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ اور شہاب الدین سہروردی شیخ الاشراق بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ جنہیں سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹے نے چھتیس سال کی عمر میں قتل کروا دیا تھا۔

جہاں تک اشاعرہ کا تعلق ہے۔ ان کے نزدیک کائنات کی تخلیق چھوٹے چھوٹے جواہر سے ہوئی ہے۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری و ساری ہے۔

اقبال نہ ''اشراقیوں'' سے مطمئن ہیں، نہ ''تصوراتیوں'' و ''تجزیاتیوں'' سے، نہ مشائیت سے اور نہ اصحاب علم کلام و منطق سے۔ اس لئے کہ یہ سب فلسفے ہی کے مختلف روپ ہیں اور فلسفہ و علم کلام خود اندھے ہیں دوسروں کو راستہ کیا دکھائیں گے۔

مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را　　　جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی ، چہ اشراقی

اقبال فلسفے اور عشق کا فرق کرگس و شاہین کی مثال سے واضح کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ

حکیماں گر چہ صد پیکر شکستند　　　مقیم سومنات بودو ہستند

چساں افرشتہ ویزداں گیرند　　　ہنوز آدم بفترا کے نہ بستند

''اقبال کے ذوق جمال'' میں یہ حقیقت صاف طور سے عیاں ہے کہ عقل و فلسفہ پردہ ہائے افلاک چاک کرنے سے قاصر ہیں۔اس کے برعکس عشق ایسا شورانگیز ہے کہ اس کے نالوں کا جواب افلاک سے آنے لگتا ہے اور ''حسن مطلق'' سارے حجابات سے نکل کر جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش　　　لاکھ حکیم سر بجیب ، ایک کلیم سر بکف

تپش می کند زندہ تر زندگی را　　　تپش می دہدبال وپرزندگی را

اہل فکر یا فلسفیوں کا معجزہ الجھن پہ الجھن ڈالنا ہے۔جبکہ اہل عشق کے معجزوں کی کیا بات ان کے معجزے سے حقیقت مطلقہ مکمل طور پر جلوہ گر ہو جاتی ہے اور فرعون دریائے نیل میں غرق ہو جاتا ہے۔جبکہ سربکف کلیم اللہ کے سامنے دریا خشک ہو جاتا ہے۔

معجزۂ اہل فکر فلسفہ ، پیچ پیچ　　　معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

علاوہ ازیں دگر است آنسوے نہ پردہ کشادن نظرے ،ایں سوے پردہ گمان وظن وتخمین دگر است اور دل گیتی! انا المسموم فریادش ،خردنالاں کہ ماعندی بتریاق دلاراتی ،حکمت وفلسفہ است گراں خیز مرا ،خضر من !از سرم بارگراں پاک انداز۔مزید برآں یہ کہ:۔

چہ کنم چہ چارہ گیرم کہ زشاخ علم و دانش　　　نہ دمیدہ ہیچ خارے کہ بدل نشانم اورا

اقبال شرکت میان حق و باطل قبول نہ کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ مرا از منطق آید بوئے خامی ،دلیل او دلیل ناتمامی ، بروئیم بستہ در ہا را کشاید ،دو بیت از پیر رومیؒ یا ز جامی !مامون الرشید نے فلسفہ وحکمت کو عربی میں منتقل کرانا شروع کیا تو نتیجے کے طور پر مذہب میں عقلیت پرستی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔جس کی بناء پر اسلامی اقدار وعقائد کو سخت دھچکے سے دوچار ہونا پڑا۔اقبال اس عقلیت پرستی اور عجمی تصوف کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے چنانچہ کہتے ہیں ،تمدن تصوف ،شریعت کلام ،بتان عجم کے پجاری تمام ،حقیقت خرافات میں کھو گئی ،یہ امت روایات میں کھو گئی ،لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب ،مگر لذت شوق سے بے نصیب !بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا ،لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا۔اس لئے

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے　　　گلیم بوذرؓ دلق اویسؓ و چادر زہراؓ

نہ ایں جا چشمک ساقی ،نہ آنجا حرف مشتاقی　　　زبزم صوفی و ملا بسے غمناک می آیم

اور یہی وہ عجمی تصوف ہے کہ جس نے مسلمانوں کو ایسا بے عمل اور راہب بنایا کہ وہ ہندو جوگیوں کے چرنوں پہ جا جا کر گرتے اور ناک رگڑتے ہیں۔آخر ایسے مسلمان جنہیں اپنی خودی تک بھی رسائی نہ ہو انہیں جینے اور حکمرانی کرنے کا کیا حق ہے؟ان کے لئے تو بس ابلیس نے ٹھیک

ہی کہا ہے کہ:۔

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

اور پھر:۔

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

اور وحید خان جیسے لوگوں کو دیکھیں کہ فخر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ:۔

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ
شرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

ایسے مسلمان برطانوی وامریکی غلامی کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ یہ سب ''عقلیت پرستی'' اور ''عجمی تصوف'' کی کرامات ہیں۔ جن کی وجہ سے اقبال کہتے ہیں کہ:۔

درمیان سینہ دل خوں کردہ ام
تاجہانش را دگرگوں کردہ ام

زروداد دو صد سالش ہمیں بس
کہ دل چوں کندۂ قصاب دارم!

بہر حال اقبال چونکہ ازلی وابدی رجائیت پسند ہیں اس لئے وہ مستقبل سے مایوس نہیں اور ویسے بھی ''شاعر فرداستم'' کے مصداق وہ ہمیشہ روشن مستقبل کی نوید سناتے ہوئے دوش کے آئینے میں فردا کو دیکھتے ہیں اور حاضر کے پتھر کو اس قدر صیقل کرتے ہیں کہ اسے معجزاتی طور پر مستقبل کا آئینہ بنالیتے ہیں۔ فلسفہ ''تخمین وظن'' ہے اور عشق ''یقین وایمان''۔ اس لئے:۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستان پیدا

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

عقلیت پرستی کے طوفان میں اقبال نے یورپی علوم وفنون کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس لئے کہ وہاں ہر چیز پر مصنوعیت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ یورپ کتے کی ناف سے کستوری بنالیتا ہے۔ اس کے قالین سے ہمارا بوریا، اور مخمل سے ہمارا کھدر اچھا ہے اقبال کہتے ہیں یورپ کے وزیر کے عوض ہم اپنا پیادہ نہیں دیتے۔ وہ سرتاپا مشینوں کے دھوئیں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس لئے یورپ انسان کو بھی ایک مشین ہی سمجھ بیٹھا ہے۔ افرنگ کی سیاست بھی ان کی تجارت ہی کی طرح ہے۔ غریب اور کمزور اقوام کا خون چوسنے کے لئے ''اقوام متحدہ'' بنا رکھی ہے۔ جس کی آڑ میں:۔

غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش!
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش!

ارسطو کی مدرسیت کے ہاتھوں طفلک مکتب بھی ہلاک ہے، جس میں نہ ادائے کافرانہ اور نہ تراش آزرانہ ہے۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں، چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں، علم حاضر سے ہے دیں زار وزبوں۔ کیونکہ علم حاضر زا فلسفہ ہے، جو موجودات ومحسوسات اور آب وگل حاصل کرنے کے درپے ہے۔ جبکہ اقبال کے نزدیک عاشق رومی بجا فرماتے ہیں کہ:۔

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بردل زنی یارے بود

وہی علم منفعت بخش اور حقیقت رساں ہے جو عشق اور واردات قلبی سے لبریز ہو۔ گویا کہ عشق ہی حقیقت رسا اور قلب ساز ہے۔ بغیر عشق کے دل گوشت کا محض ایک لوتھڑا ہے۔ اور جب گوشت کا یہ لوتھڑا تپش عشق سے دل زندہ بن جاتا ہے تو انسان مردفقیر و مردمومن کے مقام پر فائز ہوتے ہوئے، مردحر خود را ز گل بر می کند، خویش را بر روزگاراں می تند، ہمت حر با قضا گردد مشیر، حادثات از دست او صورت پذیر بلکہ یہاں تک کہ:۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر ! ایام کا مرکب نہیں ، راکب ہے قلندر !

جب مردفقیر عشق و مستی کی بدولت وقت پر حکمرانی کرتا ہے تو پھر اسے کسی اور بادشاہی و تخت وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اگر چہ زیب سرش افسر و کلاہے نیست، گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہے نیست، شایان جنون ما پہنائے دو گیتی نیست، ایں راہگذر ما را آں راہگذر ما را، او نگنجد در جہان چوں و چند، تہمت ساحل، بایں دریا مبند۔

چہ عجب اگر دو سلطاں بہ ولایتے نگنجند عجب ایں کہ می نگنجد بہ دو عالمے فقیرے

حضرت بوعلی قلندر، اورنگزیب عالمگیر اور حضرت میاں میر کی مثالوں سے علامہ اقبال واضح کرتے ہیں کہ مردفقیر کے سامنے تخت و شاہی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ بادشاہی کو دو جو کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ چنانچہ فقر اور مردفقیر کا مقام واضح کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں، چیست فقر اے بندگان آب و گل، یک نگاہ راہ بیں یک زندہ دل، فقر خیبر گیر با نان شعیر، بستہ فتراک او سلطان و میر، با سلاطیں در فتد مردفقیر، از شکوہ بوریا لرزد سریر اور

قلب اورا قوت از جذب و سلوک پیش سلطاں نعرۂ او لاملوک !

مردفقیر سے اگلا درجہ انسان کامل کا ہے۔ اقبال عاشق رسول ہوتے ہوئے "انسان کامل" کا رتبہ حضرت نبی اکرمؐ کے شایان شان سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ، آیۂ کائنات کا معنی دیریاب تو، نکلے تری تلاش ہیں قافلہ ہائے رنگ و بو۔ ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست، بحر و بر در گوشۂ دامان اوست، ہر کہ اندر دست او شمشیر لاست، جملہ موجودات را فرمانرواست۔ اس لئے:۔

دمید آں لالہ از مشت غبارم کہ خونش می تراود از کنارم
قبولش کن ز راہ دلنوازی کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

انسان کامل کی تو بات ہی اور ہے۔ مردفقیر کے بارے میں اقبال کہتے ہیں کہ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما کے مصداق مردفقیر کو موت نہیں آسکتی۔ اے عالم رنگ و بو، ایں صحبت ما تا چند، مرگ است دوام تو عشق است دوام من۔

زندگانی ہے صدف قطرہ نیساں ہے خودی وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے!

یہ سب فلسفے اور عشق کا فرق ہے۔ فلسفہ مجاز ہے اور عشق حقیقت، مجاز فانی ہے اور حقیقت لافانی۔ مجاز مجاز سے آگے نہیں بڑھتا اور عشق حقیقت تک پہنچتے ہوئے عاشق کو بھی وہ مقام دلا دیتا ہے کہ ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق۔

یہ پائیداری و دلداری، حسن مطلق اور عشق کے مابین راز و نیاز کی مرہون منت ہے۔ لیکن ''جمالیات'' کی رو سے ''موضوعیت'' اور ''معروضیت'' فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں۔ مقالے میں اقبال کے ''ذوق جمال'' کا تقابل انہی فلسفیانہ اصطلاحات کی روشنی میں ''تصوریت'' اور ''معروضیت'' سے کیا گیا ہے اور پروفیسر بریڈلے، بارکلے موضوعی جبکہ جی ای مور، لاک، برٹرینڈ رسل، جان سٹارٹ مل اور ہیوم، معروضی و تجزیاتی فلسفیوں کے طور پر زیر بحث لائے گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ''وحدت جمال'' عاشقانہ اصطلاح ہوتے ہوئے، عشق کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور ''اقبال کا ذوق جمال'' بھی وحدت جمال پر مشتمل ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

دنیائے جمالیات میں ''جمالیاتی حس'' اور ''جمالیاتی ذوق'' بنیادی عناصر ہیں۔ ان میں جہاں تک جمالیاتی حس کا تعلق ہے وہ ''اصل'' اور جمالیاتی ذوق ''فروع'' حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ حس ایک ہی ہوتی ہے اور ذوق اپنا اپنا جداگانہ رنگ ہے۔ جمالیاتی حس قدر مشترک اور ذوق انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ اس لئے مختلف علاقوں، نسلوں، قوموں اور افراد کا ''معیار حسن'' بہت سی وجوہات پر مختلف ہوتا ہے۔ لیکن میری ذات رائے میں کسی کے معیار کی بناء پر، بنیادی طور سے حسن کی حیثیت و کیفیت میں کوئی کمی پیشی نہیں ہوتی۔ یعنی اگر لوگوں کا معیار حسن بدل جائے یا بدلا ہوا ہو، تو اس کا حسن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ حسن جیسا ہوتا ہے، ویسا ہی ہوتا ہے۔

موضوعین یا تصوریت پسندوں کے مطابق کائنات اور مظاہر کائنات کا ہونا نہ ہونا حواس کا مرہون منت ہے۔ اس لئے ہابز کہتا ہے۔ روشنی آنکھوں کی وجہ سے ہے قوس قزح بھی آنکھوں کی وجہ سے موجود ہے۔ گویا کہ آنکھیں نہ ہوں تو وہ بھی نہ ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنکھیں ہوتی ہیں اور جب رات یا اندھیرا ہو جائے تو پھر کیوں دکھائی نہیں دیتا؟ اسی مقام پر دن کے وقت سب کچھ نظر آتا ہے اور اسی جگہ پر رات کے وقت دیکھیں تو فقط اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ پھر اگر قوس قزح ہماری آنکھوں میں ہے تو ہم ہر وقت، خواہ دن ہو یا رات اسے کیوں نہیں دیکھ پاتے۔ کائنات کی وسعتوں میں اربوں، کروڑوں اشیاء خصوصاً ایسے ایسے ستارے موجود ہیں۔ جنہیں ابھی تک انسان کی آنکھ یا دوربین دیکھ نہیں پائی۔ تو کیا وہ موجود ہی نہیں؟ اس ضمن میں ''ول ڈیورانٹ'' بھی خوب کہتے ہیں کہ

''۔۔۔۔۔۔۔ دوربینوں نے دیکھا اور ایک نیا سیارہ دریافت کیا، کیا اس طرح ہم نے نیپتون کو تخلیق کیا تھا؟''

اسی طرح میرے پاؤں میں کل ایک خار مغیلاں چبھ گیا اور میں شدت درد سے بلبلا اٹھا۔ میری آنکھوں نے تو اسے نہیں دیکھا مگر وہ موجود تھا۔ اس سلسلے میں رومی بھی خوب فرماتے ہیں۔

حسن یوسف دیدۂ اخواں ندید   از دل یعقوب کے شد ناپدید

بہر حال ''موضوعیت'' کے نزدیک

ع عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

جہاں تک ''معروضیت'' کا تعلق ہے وہ مظاہر کو دھوکہ و فریب نہیں سمجھتی بلکہ موجودات و محسوسات ہی کو حقیقت سمجھتی ہے۔ اس مسئلے پر بھی تفصیل کے ساتھ قلم اٹھایا گیا ہے۔

میرے نزدیک ''حسن خدا ہے اور خدا حسن ہے۔ خدا اس لئے خدا ہے کہ خدا حسن ہے اور حسن اس لئے خدا ہے کہ حسن خدا ہے''۔

جب حسن خدا ٹھہرا تو ہر قسم کا حسن لافانی اور لازوال ہوا۔ یونانیوں کے ہاں پہلے پہل ''حسن مطلق'' کا تنزیہی تصور تھا۔ جو بعد میں رفتہ رفتہ تجسیمی صورت اختیار کیا گیا۔ اس سے ''بت گری'' اور ''اصنام تراشی'' کا فن معرض وجود میں آیا۔ اس طرح خدا کو اپنی ہی شکل وصورت اور عادات واطوار کے مطابق ظاہر کیا گیا۔ ایلیائی مفکر زینوفینز نے اس رویے کی شدید مخالفت کی ہے۔ اور ناصر علی سرہندی نے کہا کہ:۔

مرا برصورت خویش آفریدی بیروں از خویشتن آخر چہ دیدی

اور اقبال کے مطابق:۔

ذوق حضور درجہاں رسم صنم گری نہاد عشق فریب می دہد جان امیدوار را

دل و دیدۂ کہ دارم ہمہ لذت نظارہ چہ گنہ اگر تراشم صنمے زسنگ خارہ

گرچہ ہے میری جستجو دیر وحرم کی نقشبند میری فغاں سے رستخیر کعبہ وسومنات میں!

یہ ساری جستجو اور ''تجسیم سازی'' اس لئے ہے کہ محبوب حقیقی بلاواسطہ، کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ جس کے نتیجے میں کسی نے کعبہ اور کسی نے بت خانہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ۔

سرگرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ اڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو کہ بت خانہ

یعنی کہ اگر:۔

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے

علامہ محمد اقبال، ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' کی روشنی میں، ماترا جویم وتو از دیدہ دور، نے غلط ما کور وتو اندر حضور، اگر چشمے کشائی بر دل خویش، درون سینہ بنی منزل خویش، سفر اندر حضر کردن چنیں است، سفر از خود بخود کردن چنیں است۔

حسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانہ ء دل

اللہ تعالیٰ ''حسن مطلق'' ہے اور ''**اللہُ نور السموت و الارض** '' کی روشنی میں، حسن ایک زبردست قوت ہے۔ میں یہاں نور سے مراد حسن لیتے ہوئے، عرض کروں گا کہ حسن یعنی اللہ تعالیٰ زمینوں اور آسمانوں کا حسن وجمال ہے۔ اور حسن وجمال یا جلال وجمال کو میں ایک زبردست باکمال وبے مثال اور لازوال قوت سمجھتا ہوں۔

چونکہ انسان کے پاس ایسا کوئی دوسرا طریقہ نہیں کہ اس کے وسیلے سے ''حسن ازل'' کو بیان کر سکے اس لئے تجسیم اور مجاز ہی کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے۔ اس کے علاوہ انسان اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ اقبال کبھی، دام زگیسواں بدوش زحمت گلستاں بری، صید چرا می کنی طائر بام خویش را کے حوالے سے ''حسن مطلق'' کو مجسم انداز ہی میں پیش کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ''حسن مطلق'' نے بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی حوالے سے مجازی روپ ہی میں پیش کیا ہے۔ اگر طور پہ تجلی گرائی ہے تو طور مجازی ہے اگر مظاہر کے پردے میں جلوہ گری کی ہے تو مظاہر بھی مجازی ہیں۔ بلکہ ساری کائنات ہی مجاز ہے۔ قرآن حکیم میں اپنی قدرت ثابت کرنے

کے لئے بھی مجازہی کی قسمیں کھائی ہیں۔پیغمبروں کو بھیجا ہے تو بھی مجازی روپ میں۔اس لئے کہ انسان کو سمجھانے اور منانے کا اس سے بہتر طریقہ اور نہیں ہوسکتا۔اور جواباً انسان نے بھی، چند بروے خود کشی پردۂ صبح وشام را، چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را، کہتے ہوئے مجازی انداز بیان میں اپنے دل کی بات کی ہے۔اس سے زیادہ وہ کربھی کیا سکتا ہے؟

''حکمت بحثیہ'' والے بحث ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور ''حکمت ذوقیہ'' والے، عاشق حقیقت کی جھلکیاں راتوں کو ستاروں، سرشار بہاروں اور آبشاروں میں دیکھ لیتے ہیں۔اقبال کے نزدیک دعا اور عبادت کے ذریعے بھی حضوری نصیب ہوسکتی ہے۔خطبات میں اقبال نے عبادت کو بھی دعا ہی کہا ہے۔نکوملکیست ملک صبحگاہی، درآں کشور بیابی ہر چہ خواہی۔من آں شمعم کہ در شب زندہ داری، ہمہ شب می کنم چوں شمع زاری۔نظامی گنجوی کی طرح اقبال بھی ز اشکِ صبحگاہی زندگی را برگ وساز آور، شود کشت تو ویراں تا نہ ریزی دانہ پے در پے پر یقین رکھتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق شور انگیز را ہر جادہ کوے تو برد، بہ تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوے تو برد!

حسن مطلق کی معرفت ہر طرح کے حسن مجازی بغیر ناممکن ہے۔حسن فطرت ہو یا حسن انسان بات دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔اس لئے کہ دونوں جگہوں میں معنی مولا ہے جلوہ گر۔تراحق داد چشمے بینے، کہ از نورش نگاہے آفرینے۔دلا رمز حیات از غنچہ در یاب، حقیقت در مجازش بے حجاب است اور جلوہ دہد باغ وراغ معنئی مستور را، عین حقیقت نگر حنظل وانگور را۔

تجزیاتی فلسفے کے برخلاف اقبال کے نزدیک مظاہر حقیقت نہیں، بلکہ حقیقت کی صفات ہیں۔اور تصوراتیوں کے برعکس کائنات یا مظاہر فطرت واہمہ وسراب نہیں۔بلکہ تخلیق بالحق ہیں۔اس لئے:۔

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ	ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر	ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ

فطرت کے علاوہ حسن نسوانی یا حسن انسان بھی معرفت کا ایک ذریعہ ہے۔اس لئے کہ گل لالہ کے پردے میں جو حسن جلوہ گر ہے، وہی حسن کسی کے رخسار سے بھی جھلک رہا ہے۔چنانچہ اقبال نے معرفت حسن مطلق کی خاطر اس راستے کی راہ نوردی بھی کی ہے۔اور مدتے با لالہ رویاں ساختم، عشق با مرغولہ مویاں باختم۔مگر یہ بھی ہے کہ حسرت جلوۂ آں ماہ تمامے دارم، دست بر سینہ نظر بر لب بامے دارم۔اور پھر جنت میں حوروں کے اصرار کے باوجود اس لئے نہیں ٹھہرتے کہ:۔

عشق درہجر و وصال آسودہ نیست	بے جمال لایزال آسودہ نیست
ابتدا پیش بتاں افتادگی	انتہا از دلبراں آزادگی
کیش ما مانند موج تیز گام	اختیار جادہ و ترک مقام

اقبال کہتے ہیں، غربیاں را زیرکی ساز حیات، شرقیاں را عشق راز کائنات انہوں نے فلسفہ ضرور پڑھا، مگر پھر خرد کی گتھیاں سلجھانے کے بعد صاحب جنوں ہوگئے۔واقعی وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میر، اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو۔بے شک، خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ، لیکن سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں اسی لئے:۔

پیر رومی خاک را اکسیر کرد　　از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

رازِ معنی مُرشد رومی کشود　　فکر من بر آستانش در سجود

تب کہیں جا کر

کشودم از رخِ معنی نقابے　　بدست ذرہ دادم آفتابے

اور

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم　　کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

اقبال یہ سب کچھ فلسفے سے نہیں بلکہ عشق کے بل بوتے پر کرتے ہیں۔ صحبت صاحب نظراں کی بدولت اقبال رومی کے اس فرمان پر عمل کرتے ہیں کہ:۔

آں نگاہے پردہ سوز از من بگیر　　کو بچشم اندر نمی گردد اسیر

جملہ تن را درگداز اندر بصر　　در نظر رو درنظر رو در نظر

آدمی دید است باقی پوست است　　دید آں باشد کہ دید دوست است

اقبال کا ایمان ہے کہ، ایں بدن باجان ما انباز نیست، مشت خاکے مانع پرواز نیست یہ مشاک خاک پرواز کر سکتی ہے اور ''حسن مطلق'' کا دیدار بھی کر سکتی ہے۔ اس لئے اقبال حسن مطلق سے عرض کرتے ہیں کہ:۔

چند بروے خود کشی پردۂ صبح و شام را　　چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

از زبان صد شعاع آفتاب　　کم نمی گردد متاع آفتاب

کیوں کہ:۔

چشم درکشت محبت کا شتم　　از تماشا حاصلے برداشتم

اگر مقصود کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے　　مرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے

حسن کو جب مجسم صورت میں پیش کیا جائے تو ''فن'' کہلاتا ہے میں نے فن کار کے لئے، ''حسن کار'' اور ''فن پارے'' کے لئے ''حسن پارہ'' کی اصطلاح تجویز کی ہے۔ ''اقبال کا ذوق جمال'' حسن وعشق، خودی اور حرکت وعمل سے تکمیل پاتا ہے۔ اس لئے وہ ان چاروں عناصر کو فن کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ورنہ فن کا افادی پہلو ختم ہو جاتا ہے۔

اقبال فن کے ''کسبی'' اور ''وہبی'' ہونے پر برابر یقین رکھتے ہیں۔ کیوں کہ ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خداداد، کوشش سے کہاں مرد ہنر مند ہے آزاد۔ اس لئے کہتے ہیں کہ:۔

درمیان کارزار کفرودیں　　ترکش مارا خدنگ آخریں

میری چالیسویں کوشش کا نتیجہ ہے۔ اور یوں بھی ہے کہ، جز نالہ نمی دانم، گویند غزل خوانم، ایں چیست کہ چوں شبنم برسینہ من ریزی۔

اقبال کے نزدیک معجزۂ فن کی نمود خون جگر سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ خون جگر کے بغیر ''حسن کاری'' کے سبھی نقوش ناتمام ہیں۔ وہ کہتے ہیں افادی حسن کاری کے لئے ضروری ہے کہ فرد وملت کے اتحاد و رابطے پر زور دے۔ اقبال اجتہادِ فکر و نظر پر بھی زور دیتے ہیں۔ تقلید سے پرہیز اور تسخیر فطرت بھی ان کی حسن کاری کا مطمح نظر ہے۔ تقلید و پیروی سے اقبال کو غلامی کی بو آتی ہے۔

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب	نے زرقص دختران بے حجاب
نے زسحر ساحران لالہ روست	نے زعریاں ساق و نے از قطع موست
محکمی اورانہ از لادینی است	نے فروغش از خط لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است	از ہمیں آتش چراغش روشن است

علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ
مغزمی باید نہ ملبوس فرنگ

اور اجتہاد سے ان کی مراد انقلاب و مثبت تبدیلی ہے۔ جس کے تحت وہ ایک ایسا ''ولولۂ تازہ'' بخشتے ہیں کہ ممولے کو شہباز سے لڑا دیتے ہیں اور کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا کر دیتے ہیں۔ تسخیر فطرت کا نظریہ انہوں نے افلاطون کی تصوریت اور جان رسکن کی فطریت

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد	عالمے ازذرہ تعمیر کرد

کے ردعمل کے طور پر پیش کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ غلامانہ علوم وفنون مایوسی و مردنی کی تصویر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی افادی پہلو نہیں ہوتا۔ وہی ''حسن کاری'' بہترین اور زندگی کی امین ہوتی ہے جو ملت کو، ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم، کا پیغام دے۔ حضورؐ نے امرالقیس کو دوزخیوں کا سرخیل اس لئے کہا کہ اس کی شاعری عیش وعشرت کی دلدادہ اور محنت و لگن سے بعید ہے۔ اس کے مقابلے میں حضورؐ نے جب ''عنترہ'' کا یہ شعر سنا۔

ولقد ابیت علی الطویٰ و اظلۃ حتی انال بہ کریمہ الماکل

تو بہت خوش ہوئے اور ''عنترہ'' سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

اقبال کہتے ہیں عقل کھدر کو اطلس بنا دیتی ہے۔ اس کا کمال پتھر کو آئینے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لیکن شاعر جادو نگار کا گیت، زندگی کے زہر کو شہد بنا دیتا ہے۔ جو کہ بہت بڑی عبادت و افادیت ہے۔

خرد کر پاس را زرینہ سازد	کمالش سنگ را آئینہ سازد
نوائے شاعرے جادونگارے	زنیش زندگی نو شینہ سازد

اقبال کی ''حسن کاری'' جبر و استبداد کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں عدل و انصاف اور ہمدردی و غمگساری کی نورانی قوس قزح ہے۔ وہ مایوسی و ناامیدی کے خلاف کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا کے مصداق، انسانیت کے ہاتھ میں عزم و استقلال اور امید و یقیں کا بلند و بالا علم تھما دیتے ہیں۔ جسے دنیا کی کوئی طاقت سرنگوں نہیں کر سکتی۔ اقبال مظلوموں و بے کسوں کو اپنی قسمت پر پنجرے کے پنچھی کی طرح چپکے

چپکے آنسو بہانے کی بجائے ظالم کے خلاف کمر بستہ ہو کر اٹھ کھڑا ہونے کا جراءت آموز پیغام دیتے ہیں۔

از خواب گران خوب گراں خواب گراں خیز

از خواب گراں خیز

ان کی حسن کاری جلال و جمال کا ایسا جلیل و جمیل آمیزہ ہے، جس میں بجلی کی کڑک کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کی مسحور کن جھلک پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی حسن کاری میں، چودھویں کے چاند کی نکھری ہوئی خنک چاندنی اور آفتاب یوم انشور کی جگر اندوختہ تمارت بھی ہے۔ جس کے اثر سے مردوں کی رگوں میں بھی کشمکش حیات کی ہلچل مچلنے لگتی ہے۔ گویا کہ انہوں نے اپنے نغمے کی صورت میں ایسا صور پھونکا ہے جسکی حرارت سے قوموں کا منجمد خون گرم ہو کر دوڑنے لگتا ہے۔ اس طرح اقبال امنگوں، آرزوؤں، امیدوں، جراءتوں، حوصلوں اور ولولوں کا پیامبر ٹھہرائے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کے نزدیک شاعر کا بڑا کارنامہ اور فرض اولین یہی ہے۔ کہ کمزوروں کو نطشے کی طرح ''دبایا' نہ جائے بلکہ انہیں زندگی کی ولولہ انگیز قوت اور ناقابل تسخیر عزم و ہمت کے ساتھ ''جگایا'' جائے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اقبال چڑھتے سورج کے ہرگز بجاری نہیں۔ بلکہ وہ غریبوں، دردمندوں اور کمزوروں کے مسیحا ہیں۔

بشکوہ بے نیازی زخدایگاں گذشتم   صفت ماہے تمامے کہ گذشت بر ستارہ

اور کیا خوب کہا:۔

بجلال تو کہ درد ل دگر آرزو نہ دارم   بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی

اقبال ایسی شاعری کے قائل ہیں کہ جو ''بت گری'' کی بجائے ''آدم گری'' کی صفات سے مالامال ہوتے ہوئے پیغمبرانہ فرائض ادا کرتی ہو ان کی اپنی حسن کاری اسی کمال لازوال سے عبارت ہے۔ اقبال پیغمبر نہیں مگر قلندر ضرور ہیں۔

بیا بمجلس اقبال ویک دوساغر کش   اگر چہ سرنتر اشد قلندری داند

ساز سخن کے پردے میں اقبال نے وہی فریضہ سرانجام دیا ہے۔ جو حضرت ابراہیمؑ سے لے کر آنحضور تک مختلف انبیاء کرام نے اپنی اپنی امتوں کو ودیعت فرمایا۔ اقبال کو اس بات پر فخر ہے کہ آپؐ کے ایک سچے امتی کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر گئے۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست   سوئے قطار می کشم ناقہء بے زمام را

جہاں تک اقبال کے مجموعی ''ذوق جمال'' کا تعلق ہے تو اس کا نچوڑ یہی ہے کہ ایک عاشق ہونے کے ناطے اقبال حسن و جمال کے تمام مظاہر سے گزرتے ہوئے ''حسن مطلق'' کی طرف اپنا

گہے ہر پردۂ فطرت دریدم   جمال یار بے باکانہ دیدم

سفر جاری رکھتے ہیں۔ وہ راستے میں کہیں نہیں ٹھہرتے، خواہ حوران خلد ہی کیوں نہ انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کوشش کریں۔ اقبال از یسار واز یمیں حوروں کے شور و غوغا کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور

عشق در ہجر و وصال آسودہ نیست   بے جمال لایزال آسودہ نیست

کیش ما مانند موج تیز گام اختیار جادہ و ترک مقام

کہتے ہوئے ہردم جواں اور رواں دواں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ معرفت حق کے اس مقام تک جا پہنچتے ہیں کہ بس۔

چشم در کشت محبت کاشتم از تماشا حاصلے برداشتم

اور جب اقبال ''حسن مطلق'' سے یہ کہتے ہیں کہ

چند بروئے خودکشی پردۂ صبح و شام را چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

تو جواباً محبوب بھی مظاہر وصفات کے تمام پردے اپنے چہرے سے ہٹا کر انجمن آرائی کرتے ہوئے جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ یہی وہ حیرت انگیز اور دل آویز گھڑی ہے جب ''اقبال کا ذوق جمال'' حسن لایزال کے دیدار پر بہار سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اور معروضی یعنی تجزیاتی اور موضوعی یعنی عینی یا تصوراتی فلسفے اور فلسفیوں کے برخلاف اقبال اپنے ''واردات قلبی'' کی روشنی میں کیا خوب کہتے ہیں۔

کوہ و دریا و غروب آفتاب من خدارا دیدم آنجا بے حجاب

اُلٹ جائیں گی تدبیریں بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

فقیرا خان جدون

۱۰ دسمبر ۲۰۰۱ء

باب اوّل

”یونانی فلاسفہ
اور
جمالِ کائنات“

تلمیح

فلسفہ ''حسن و جمال'' کو جمالیات (AESTHETICS) کہتے ہیں یا کسی مخفی راز کو معلوم کرنا بھی جمالیات کہلاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ فلسفے ہی کی ایک شاخ ہے لیکن در حقیقت اپنی وسعت و گیرائی کے طفیل جمالیات :

''کل زندگی کو محیط ہے اس لیے کہ علم کا کوئی گوشہ بھی اس کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کی وسعت موضوع کے حدود کا حکیمانہ انداز میں تعین کرنا چاہیں تو ہمیں اسے حسن وفن کے عوالم ہی تک محدود کرنا پڑتا ہے۔ (١)

مجنوں گورکھپوری نے جمالیات کی یوں تعریف کی ہے :

'' جمالیات سے مراد ارباب فلسفہ کے وہ نظریے ہیں جو حسن اور اس کے کوائف و مظاہر (جن میں فنون لطیفہ بھی شامل ہیں) کی تحقیق و تشریح میں پیش کیے گئے ہیں''۔ (٢)

اسی طرح ڈاکٹر یوسف حسین خان اپنی کتاب غالبؔ اور اقبالؔ کی متحرک جمالیات میں رقمطراز ہیں:

''جمالیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جس میں حسن و جمال کی فنی تخلیق پر گفتگو کی جاتی ہے۔ یہ جذبے وتخیل کی مسرت ہے نہ کہ تعقل کی۔ اگر تعقلی فکر بھی چوری چھپے اس سے مسرت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو یہ اس کا فعل ہے جس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے''۔ (٣)

جمالیات کا مفہوم سلجھاتے اور سمجھاتے ہوئے پروفیسر ثریا حسین لکھتی ہیں کہ :

''ایستھیٹکس کو جرمن نقاد بام گارٹن نے یونانی لفظ ایستھیس سے وضع کیا جس کا مفہوم ادراکِ حسی ہے۔ چنانچہ ایستھیٹکس کو اس نے ادراکِ حسی کے علم کے معنی میں استعمال کیا ہے اور اس کے دائرہ عمل کو محدود کیا۔ لیکن وقت کے ساتھ اس میں تبدیلی آتی چلی گئی۔'' (٤)

بلاشبہ جس طرح تمام علوم وفنون کی کونپلیں یونانی سرزمین ہی سے پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح جمالیات کے

---

(١) تاریخ جمالیات ۔ جلد اول ۔ ٢٥ ۔ نصیر احمد ناصر ۔ (٢) تاریخ جمالیات ۔ ١٠ ۔ مجنوں گورکھپوری

(٣) غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات ۔ ٦٧ ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان (٤) جمالیات شرق و غرب ۔ ١٠٨ ۔ پروفیسر ثریا حسین

ڈانڈے بھی وہیں جا کر ملتے ہیں اور ایستھیٹکس کا لفظ یونانی زبان میں پہلے سے موجود تھا۔ بام گارٹن (۱۷۱۴ء۔۱۷۶۲ء) نے اکیس سال کی عمر میں پی۔ ایچ۔ڈی کا مقالہ مکمل کیا۔ نصیر احمد ناصر رقمطراز ہیں کہ:

> ''اس مقالے میں اس نے لفظ ایستھیٹک (جمالیات Aesthetic) استعمال کیا۔ تاریخ جمالیات میں بام گارٹن پہلا شخص ہے جس نے فلسفہ حسن وفن یا جمالیات کے لیے ایستھیٹک کے لفظ کو اصطلاح کے طور پر استعمال کیا۔ اسے رواج دیا اور اسے فلسفے کا ایک علیحدہ اور مستقل شعبہ قرار دیا۔۔۔۔بام گارٹن حسن و کمال کو ایک ہی شے سمجھتا ہے اور حسن کی مبہم سی یہ تعریف کرتا ہے کہ وہ ایسا کمال ہے جس کا ادراک حواس سے کیا جاتا ہے۔'' (۱)

اسی طرح ''ول ڈیورنٹ'' اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

Baum Garten, the first thinker to recognize the nature of beauty as a distint realm of inquiry, and the first to give it the terrible name of esthetics, apologized for including so undignified a subject matter among the mansions of philosophy; doubtless he fearesd that even under the repellent label which he had put upon the problem would make his readers think of statues and fair women; and he blushed at the philosophy"(2)

ترجمہ: بام گارٹن جو پہلا مفکر تھا کہ جس نے فطرت کے حسن کو ایک الگ موضوع سمجھ کر اسے جمالیات کے نام سے منسوب کیا۔ وہ اسے مضامین فلسفہ میں شامل کرنے کی بنا پر معذرانہ رویہ رکھتا تھا۔ یقیناً اسے اندیشہ تھا کہ نام کو ایک علمی انداز دینے کے باوجود اس کے فلسفہ کے ناظرین کا ذہن اصنام اور حسین عورتوں کی طرف منتقل ہو گا اور اس امکان پر اسے ایک طرح کی شرمندگی سی تھی۔

بعد میں بام گارٹن کے خدشات سو فیصد پورے ہوئے اور جمالیات نے مدتوں پہلے اپنا دائرہ کار تمام فنون لطیفہ یعنی

---

(۱) تاریخ جمالیات، جلد اول ۴۳۵، ۴۳۶۔ نصیر احمد ناصر۔

(۲) The Pleasures of Philosophy۔ ول ڈیورنٹ

اصنام سازی، مصوری، سنگ تراشی، فنِ تعمیر، شعر و ادب، موسیقی اور رقص و سرود تک بڑھا لیا ہے۔

غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ساری کائنات ''حسن و جمال'' کا ایک دلکش و دیدہ زیب مرقع ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ مختلف ادوار کے مختلف مفکرین نے کائنات کے معرضِ وجود میں آنے سے متعلق کون کون سے خیالات و سوالات اٹھاتے ہوئے کیسے کیسے حقائق بیان کیے یا محض اندازے لگائے ہیں۔

ایشائے کوچک میں ''آیونیا'' کے شہر میلیٹس (Miletus) میں پیدا ہونے والے مفکر تھیلیز (Thales) نے کہا کہ: ''تمام اشیا پانی ہیں'' قبل ازیں مصر، بابل اور یونان میں اساطیری خداؤں کے عام تصور کی بنا پر یہ عقیدہ پختہ ہو گیا تھا کہ کائنات دیوتاؤں نے بنائی ہے جبکہ تھیلیز کے ذہن میں پہلی دفعہ یہ سوال پیدا ہوا کہ ''کائنات اگر ایک کل ہے تو اس کا بنیادی اصول اور علت کیا ہے''۔ (۱) گویا تھیلیز کے مطابق پانی کائنات کا بنیادی جزو ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> ''یونانی فلسفے کا بانی تھیلیس کو قرار دیا جاتا ہے جس نے چھٹی صدی قبل مسیح کا زمانہ پایا تھا۔ اس اعتبار سے وہ گوتم بدھ کا تقریباً ہم عصر ہے۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے پانی کو ہر چیز کی اصل ٹھہرایا۔۔۔۔۔ ہر چیز پانی سے پیدا ہوئی اور پانی ہی کی طرف عود کرنے والی ہے''۔ (۲)

آج ہم کہتے ہیں کہ ''انا للہ و انا علیہ راجعون'' ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ تھیلیس کے فلسفے میں وحدت الوجود کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ خود اس وقت تھیلیز کو اس کا احساس بھی نہ ہوگا کہ اس کا نظریہ وحدت الوجود کا بھی ترجمان ہے۔

اس کے بعد تھیلیز کا ہم وطن فلسفی انیکسیمنڈر (Anaximander) کہتا ہے کہ تخلیقِ کائنات کا بنیادی جزو مادی ہے۔ مگر وہ پانی کا نام نہیں لیتا۔ اس کے خیال میں تخلیقِ کائنات غیر متعین، غیر ممیز اور لا محدود مادے سے ہوئی ہے۔ انیکسیمنڈر نے نظریہ ارتقاء بھی پیش کیا:

> ''پہلے نچلے درجے کی مخلوقات پیدا ہوئیں اور پھر ان سے بتدریج اعلیٰ مخلوقات کا

---

(۱) تاریخ فلسفہ یونان۔۲۔ نعیم احمد　　(۲) اقبال اور مسلک تصوف (یونانی ماخذ)۔۸۱۔

ارتقاء ہوا۔ انسان شروع شروع میں مچھلی تھا۔۔۔۔انیکسیمنڈر اور ڈارون کے نظریہ ارتقاء میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے انیکسیمنڈر کو ایشائے کوچک کی بلند پہاڑیوں پر قدیم مخلوقات کے متحجر آثار (fossils) دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شروع شروع میں سطح زمین زیرِ آب تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ پانی خشک ہوتا گیا اور سمندری مخلوقات کے ڈھانچے خشکی پر رہ گئے۔''(۱)

پھر انیکسیمنز (Anaxemines) بھی پہلے دونوں فلسفیوں کا ہم وطن یعنی کہ میلٹس کا رہنے والا تھا۔(۵۸۸ق۔م،۲۶۴ ق۔م) وہ کہتا ہے کہ کائنات کی تمام اشیاء ہوا سے معرض وجود میں آئی ہیں۔ سورج، چاند، ستارے بلکہ سبھی نباتات و جمادات ہوا ہی کی بے شمار صورتیں ہیں۔ ہوا جلتی ہے اور منجمد بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے نزدیک سورج اور چاند ستارے منجمد ہوا کی جلتی ہوئی مختلف اشکال ہیں۔

بعد ازیں فیثا غورث ریاضی دان ہونے کے سبب اعداد سے کائنات کی تشکیل بتاتا ہے۔مولانا عبدالسلام ندوی رقم طراز ہیں کہ:

''فیثا غورث بندقلیسؔ کے بعد پیدا ہوا اور حضرت سلیمانؑ کے اصحاب سے مصر میں حکمت سیکھی۔۔۔معاد کے متعلق اس کا مذہب قریب قریب وہی ہے جو بندقلیسؔ کا ہے۔یعنی اس مادی عالم کے علاوہ ایک روحانی عالم اور بھی ہے، جس کے حسن و جمال کا ادراک عقل نہیں کر سکتی۔ تمام پاکیزہ روحیں اس کی مشتاق رہتی ہیں اور جس شخص نے اپنی روح کو عجب و غرور، ریا و حسد اور اس قسم کی جسمانی خواہشوں کی گندگی سے پاک کر لیا ہے وہ اس روحانی عالم سے ملنے کا مستحق ہو جاتا ہے''۔(۲)

ان آیونیائی فلسفیوں کے بعد ''ایلیائی مکتبہ فکر'' کی طرف رجوع کیا جائے تو زینوفینیز (Xenophanes) اس مکتب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ یہ پارمینڈیز کا پیش رو گردانا جاتا ہے۔ ۵۷۶ ق۔م میں آیونیا کے شہر کوسوفون میں پیدا ہوا۔ یہ

---

(۱) یونان کے فلسفی ۔۲۴۔ رابرٹ ایس برمیاف

(۲) حکمائے اسلام، جلد اول ۔۱۰ عبدالسلام ندوی

بیک وقت شاعر اور گلوکار بھی تھا۔ اس نے خدا سے متعلق ہومرؔ اور ہیسوئڈ کی سخت مخالفت کی جس کا ذکر آئندہ چل کر موقع و محل کے مطابق کیا جائے گا۔ بہرحال اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ وہ ہستی کے حوالے سے احدیت (Monism) کا قائل تھا۔ زینوفینز کی طرح دوسرا ایلیائی مفکر پارمینڈیز (Parmenides) بھی احدیت پر یقین رکھتا ہے۔ اس کے فلسفے کا بنیادی اصول ہستی (Being) اور نیستی (Not Being) کی تفریق پر مبنی ہے۔اس کے نظریے کے مطابق ہستی ایک ہے اور موجود ہے۔ جبکہ نیستی غیر حقیقی ہوتے ہوئے کوئی وجود نہیں رکھتی۔ ایک طویل مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''پارمینڈیز '' کے نظریہ ہستی میں مادیت اور تصوریت کے تخم برابر موجود ہیں۔ اس طرح اس کے نظریے میں دیمقراطیسؔ اور افلاطون دونوں کے لیے متاثر کن کشش پائی جاتی ہے۔

جہاں تک ''زینو'' کا تعلق ہے تو تاریخ جمالیات میں نصیر احمد ناصر اس کی پیدائش و وفات (۳۴۰۔۲۶۵ ق۔م) (۱)بتاتے ہیں جبکہ صاحب فلسفہ یونان لکھتے ہیں کہ وہ تقریباً (۴۸۹ ق م) (۲)میں پیدا ہوا۔ تاریخ فلسفہ یونان میں لکھا ہے کہ ''زینو نے اپنا ذاتی نظریہ پیش نہیں کیا''۔(۳) مگر درحقیقت یہ شامی النسل ایتھنز میں رہنے والا فلسفی ایک طرف رواقیت (Stiocism) کا بانی سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف فیثا غورثیہ کے نظریہ ٔکثرت کی تردید کرتے ہوئے اپنے استاد پارمینڈیز کے نظریہ ٔوحدت الوجود کی حمایت کرتا ہے۔

تھیلیز نے پانی اور انیکسمنز نے ہوا کو کائنات کا بنیادی جزو قرار دیا تھا۔ ان دونوں کے برعکس ''ہراقلیتوس'' نے تخلیقِ کائنات میں آگ کو بنیادی حیثیت دی۔ ایلیائی مکتبہ فکر کے نزدیک کائنات میں سکون وثبات ہے۔لیکن ہراقلیتوس کے مطابق کائنات میں ہر طرف کش مکش اور جنگ و جدل ہے۔ (ایسا لگتا ہے کہ نطشےؔ ہراقلیتوس سے بھی متاثر تھا)۔ ہر چیز تغیر پذیر ہوتے ہوئے لمحہ بہ لمحہ بدلتی چلی جاتی ہے۔عتیق فکری لکھتے ہیں کہ:

> '' ہراقلیتوس کی فلاسفی ، ایران کے مشہور مذہبی فلسفی زرتشت کی رہین منت معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایران، یونان سے بہت پہلے متمدن تھا۔ اور اکثر ایرانیوں کے حملے یونانی قوم پر ہوتے رہتے تھے۔ اور کئی بار ایرانی یونانیوں پر غالب رہے۔'' (۴)

زرتشت ہراقلیتوس کے زمانے میں ہوگزرا ہے۔ اس کی تعلیمات ایک وسیع علاقے پر اثر انداز تھیں۔ بلکہ آج بھی زر

---

(۱) تاریخ جمالیات جلد اول۔ ۱۲۹۔ نصیر احمد ناصر۔

(۲) تاریخ فلسفہ یونان۔ ۳۵۔ نعیم احمد

(۳) تاریخ فلسفہ یونان۔ ۳۵۔ نعیم احمد

(۴) انسان اور خدا۔ ۸۱۔ عتیق فکری۔

تشت کے پیروکار موجود ہیں۔ اور باقاعدہ آتش پرست کہلاتے ہیں۔ چنانچہ ہراقلیتوس کا اس مقبول عام مذہبی فلسفی سے متاثر ہونا بعید از قیاس نہیں۔ ہراقلیتوس کے نزدیک "ہر شے بدل کر کسی دوسری شے کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ فطرت کی نہایت متضاد صورتیں ہی حقیقت میں ایک ہی جوہر کی متضاد شکلیں ہیں اور سب کچھ احد ہے۔ دن رات، گرما و سرما، صلح و جنگ، سیری اور بھوک سب خدا ہی ہے۔ اس واحد اور کلی فطرت کی اصل ہراقلیتوس کے نزدیک آگ ہے" (۱)

جیسا کہ اقبال بھی فرماتے ہیں:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں (۲)

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات (۳)

اے من و تو موجے از رودِ حیات
ہر نفس دیگر شود ایں کائنات

از خس و خاشاک تعمیرِ وجود
غیر حسرت چیست پاداشِ وجود (۴)

ہراقلیتوس کہتا ہے کہ "آگ وہ بنیادی جوہر (Fundamental substance) ہے جس سے کائنات کے رنگارنگ پہلوؤں کی ترکیب ہوئی ہے۔ آگ کائنات کا اولین جوہر ہے جس سے ہوا پیدا ہوئی ہے، ہوا سے پانی اور پانی سے مادّہ۔ آگ زندگی کا مظہر ہے اس لیے جس مظہر میں آگ کا جتنا کم امتزاج ہوگا اتنا ہی وہ زندگی سے عاری ہوگا"۔ (۵)

اسی طرح "فلسفہ ہندو یونان" میں تحریر ہے کہ "اس حکیم کا عقیدہ تھا کہ آگ ہر چیز کی اصل ہے، اگر وہ آگ نہیں تو کوئی ایسا جوہر ہے جس کا مظہر آگ ہے۔ چونکہ آگ یا نور ہمیشہ متحرک اور تغیر پذیر ہے اس لیے کوئی چیز ایک حالت پر نہیں رہتی" (۶)

ہراقلیتوس وحدت الوجودی (Pantheist) ہے۔ مگر اس کا نظریۂ وحدت الوجود ایلیائیوں سے متضاد ہے۔ انہوں

---

(۱) انسان اور خدا۔ ۸۰۔ شفیق فکری۔ (۲) بانگِ درا (کلیاتِ اقبال)۔ ۱۴۸۔ نظم "ستارہ" (۳) کلیاتِ اقبال۔ بال جبریل۔ ۱۲۶۔ ساقی نامہ

(۴) جاوید نامہ۔ ۱۸۶۔ علامہ محمد اقبال (۵) تاریخ فلسفہ یونان۔ ۳۸۔ نعیم احمد۔ (۶) فلسفہ ہندو یونان۔ ۸۰۔ دین محمد شفقی عبدی پوری۔

نے کثرت کو فریبِ نظر اور ثبات و سکون کو حقیقت گردانا ہے۔ جبکہ ہراقلیتوس حرکت اور کثرت کو وحدت کے لیے لازمی قرار دیتا ہے۔ ''کہ شعلۂ لرزاں ہر وقت متحرک رہتا ہے'' اس کے نزدیک حرکت اور کش مکش ہی میں اشیاء کا وجود قائم ہے۔ اس لحاظ سے عہدِ جدید کے نطشے پر ہراقلیتوس کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کی جڑیں زرتشت سے جا ملتی ہیں۔ لگتا ہے کہ بعد میں سارتر نے ہراقلیتوس کے فلسفے سے فلسفہ ٔ وجودیت (Existentialism) اخذ کیا۔

اس کے علاوہ ہراقلیتوس کے فلسفہ ٔحرکت نے ''برگساں'' کو بھی متاثر کن حد تک متاثر کیا۔ جیسا کہ ''برگساں'' کہتا ہے کہ کائنات دو متضاد حرکتوں (Motions) سے وجود میں آئی ہے۔ ایک حرکت اوپر کی جانب ہے جو کہ زندگی ہے۔ مادّہ نیچے کی طرف ایک حرکت ہے۔''(۱)

علاوہ ازیں سسلی کے شہر ایکراگاس (Akragas) میں رہنے والے ایمپیڈوکلیز (Empedocles) کی سوچ تخلیقی ہونے کے بجائے ارتباطی (Unifying) تھی۔ اس نے اپنے عہد کے مختلف فکری رجحانات کو یک جا کر کے ایک ہی نظام کے سانچے میں ڈھال دیا۔ اور تاریخ فلسفہ میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ جب پھرتا ہے فلک برسوں، تب خاک کے پردے سے کوئی ایسا مفکر نکل آتا ہے جو مختلف متضاد نظریات کے مابین ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ کانٹ (Kant) بھی ''عقلیت'' اور ''تجربیت'' کو ایک ہی تار میں پروتا نظر آتا ہے۔ بہر حال ایمپیڈوکلیز کے مطابق پانی، مٹی، ہوا اور آتش : ان چار عناصر سے بنتی ہے کائنات جبکہ علامہ اقبال کے ہاں

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان! (۲)

خیر پھر یوں ہے کہ جوہریت یا ذرّاتی مادّیت (Atomism) کا بانی ''میلیٹس'' کے مفکر لیوی پس (Leucippus) کو سمجھا جاتا ہے۔ دیوجان (Diogenes) لکھتا ہے کہ'' وہ ایلیائی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا تھا اور زینو کا مقلد ہوتے ہوئے رواقی تھا''۔(۳) لیوی پس اور دیمقراطیس نے مشترکہ کاوشوں سے فلسفۂ جوہریت کا ایک مجموعہ (Orpus) کے نام سے تحریر کیا۔ یہاں پر یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ آیونی مفکرین کی مادّیت لیوی پُس اور دیمقراطیس کی ذراتی مادّیت میں ڈھل جاتی ہے۔ اور ہمیں چراغ سے چراغ جلتا دکھائی دے رہا ہے۔ جوہریت کی رو سے ''جب کسی روح

تاریخ فلسفہ یونان۔۴۱۔نعیم احمد۔ (۲) کلیاتِ اقبال (ضربِ کلیم)۔۶۰۔'' مردِ مسلمان''

''Life of Leucipus'' by Diogenes.(۳)

کے اجزاء مکمل طور پر خارج ہو جاتے ہیں یعنی انسان مر جاتا ہے تو ان جواہر کا دوبارہ اسی طرح جمع ہونا ناممکن ہے۔ یعنی حیات بعد الموت کا امکان نہیں'' (۱)

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب!
موت کیا ہے ؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا (چکبست)

جبکہ اقبال کہتے ہیں:

اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں (۲)
مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (میر)
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (۳)

یونانی فلسفیوں میں انکساغورس (Anaxagoras) کا نام بھی بہت اہم ہے۔وہ آیونیا کے شہر کلازومینیا (Clazomenae) میں ۵۰۰ ق۔م (۴) میں پیدا ہوا۔ انکساغورسی فلسفے کی تصویر کے دو رخ ہیں۔ پہلا رخ مادّہ اور اس کی ماہیت کے بارے میں ہے۔ جبکہ دوسرا رخ اس کے نظریۂ ''ناؤس'' (Nous) کا رخ ہے۔ مادّے کے بارے میں ''انکساغورس کہتا ہے کہ شروع شروع میں مادہ کی تمام قسمیں ایک دوسرے میں خلط ملط تھیں۔ تمام عناصر ایک دوسرے کے ساتھ گھلے ملے ہوئے تھے۔ دنیا کی تشکیل اس وقت ہوئی جب ایک ہی طرح کے عناصر ایک دوسرے کے ساتھ ملنے لگے۔ مثلاً آگ آگ کے ساتھ اور مٹی مٹی کے ساتھ۔ پارمینڈیز نے کہا تھا کہ عدم سے کچھ وجود میں نہیں آتا۔ اس لیے اس نے موجودات کے آغاز و انجام سے انکار کر دیا تھا۔ انکساغورس اشیاء کے وجود میں آنے اور معدوم ہونے کی تشریح اس اصول پر کرتا ہے کہ ''ہر شے میں ہر شے کا کچھ حصہ ہے'' مثلاً مٹی کے اندر باقی تین عناصر کے اجزاء بھی شامل ہیں۔ آگ کے اندر مٹی بھی ہے، پانی اور ہوا بھی۔ مٹی کو مٹی اور آگ کو آگ ہم اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے اندر مٹی اور آگ کے عناصر کا غلبہ ہوتا

---

(۱) تاریخ فلسفۂ یونان ۔۵۲ نعیم احمد
(۲) بال جبریل ۔۱۳۶۔ ساقی نامہ۔
(۳) دیوان غالب ۔۵۶
(۴) فلسفہ ہند و یونان ۔ ۸۷ ۔ اور تاریخ فلسفہ یونان ۔۵۳۔

ہے۔ لہذا خالص سونا اور خالص چاندی موجود نہیں۔ سونے اور چاندی کے ہر ٹکڑے میں دیگر عناصر کے ذرات بھی شامل ہوں گے مگر ان میں سونے یا چاندی کے ذرات کا غلبہ ہوگا"۔(۱)

اس کے بعد انکساغورس فلسفے کے دوسرے رخ کی طرف رجوع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ "دنیاؤں کی تشکیل ایک عالمگیر حرکت سے ہوئی ہے۔ یہ عالمگیر حرکت عقل یا ذہن یا ناؤس (Nous) ہے۔(۲)۔۔۔۔ناؤس خالص، عالمگیر، قادرِ مطلق اور غیر مخلوط ہے۔ مادّہ کی مختلف اقسام میں اس کی آمیزش نہیں ہوتی۔ تاہم کچھ مادّی جسموں میں اس کا کچھ حصہ ضرور ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ جسم زندہ اور ذہین جسم ہیں۔ انسان حیوانوں سے اعلیٰ و ارفع اپنے مخصوص اعضائے جسمانی کی وجہ سے ہے۔ حیوان انسان کی طرح ہاتھ نہیں رکھتے۔ لہٰذا وہ انسان سے کمتر ہیں۔ ناؤس غیر مادّی اور غیر شخصی (Impersonal) ہے۔ ناؤس کی مادّہ کے ساتھ آمیزش نہیں ہوتی۔ لہذا ناؤس کی فعلیت (Activity) آزاد اور غیر مشروط رہتی ہے۔ کیونکہ اس کے راستے میں مادّہ کوئی مذاحمت پیش نہیں کر سکتا۔"(۳)

اس طرح ناؤس کا نظریہ پیش کرتے ہوئے انکساغورس نے فکر ونظر اور سوچ بچار کی نئی راہیں ہموار کر دیں۔ اس نے کائنات کو مادّے کا ڈھیر سمجھنے کے برعکس ایک عمل (Process) سمجھا۔ بعد میں وائٹ ہیڈ، (White Head) نے اس فکر ونظر کو آگے بڑھایا۔

یہاں تک فکرِ یونان کا پہلا دور ہے۔ اس کے بعد سوفسطائیت (Sophism) کا عہد شروع ہوتا ہے۔ جسے دوسرا دور سمجھنا چاہیے۔ سوفسطائیت (Sophist) سوفست سے مشتق ہے۔ جسے عربی اور فارسی میں "سوفسطائی" کہتے ہیں۔ سوفسطائیت یعنی سوفسطائی کا طریقہ یا مسلک۔ "سوفسطائی حکماء کا وہ گروہ جن کے خیالات کی بنیاد وہم پر ہو۔ جو حقائق اشیاء کا منکر ہے۔ ۔وہمی ۔ مغالطہ زدہ فلسفی۔ اسی طرح واہمیات یا وہم پر مبنی فلسفے کو سوفسطاء اور سوفسطہ کہتے ہیں"(۴)

تاریخ فلسفہ یونان میں لکھا ہے کہ "یونانی لفظ سوفسطائی کا کم و بیش وہ مطلب تھا جو آج کل لفظ "پروفیسر" (Professor) سے لیا جاتا ہے۔" (۵) اس میں شک نہیں کہ جب یونان میں اساطیری خیالات و عقائد مٹنے لگے تو جمہوریت کی وجہ سے سیاست میں حصہ لینے کی غرض سے یونانیوں کو تعلیم اور خطابت کی ضرورت تھی۔ سوفسطائی ضرورت مندوں کو معاوضے کے بدلے طرزِ تحریر و تقریر سکھاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اپنے مقدمات کی پیروی کی خاطر مواد اور

---

(۱) تاریخ فلسفہ یونان ۔۵۵ ۔ نعیم احمد ۔(۲) Nous "تاریخ تصوف قبل از اسلام" کے ص ۹۶ پر "نفس" اور "شاہد" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ از بشیر احمد ڈار۔ (۳) تاریخ فلسفہ یونان ۔ ۵۶۔۵۷۔۵۸۔(۴) علمی اردو لغت ۔ ۹۱۲۔۹۳۰ ۔ وارث سر ہندی ۔(۵) تاریخ فلسفہ یونان۔۶۰۔ نعیم احمد ۔

دلائل بھی فراہم کرتے تھے۔ لہٰذا میرے نزدیک سوفسطائیوں کی حیثیت ہمارے دور کے "وکلاء صاحبان" کی سی تھی۔ یا ان کا طریقہ کار ان جیسا ہے۔ سوفسطائیت میں نیکی و بدی کوئی چیز نہیں جو بھی جائز و ناجائز جس کسی کے نزدیک اپنے فائدے کے لیے ہے، بس جائز ہے۔ اس لحاظ سے طاقتور کی طاقت کا بول بالا ہے اور کمزور کا حال بد نرالا ہے۔ قانون و عدالت کمزوروں کو محض نیچا دکھانے کے لیے ہے۔ نطشے کا منہ زور فلسفہ انہی خیالات کا پروردہ نظر آتا ہے۔

صاحب تاریخ فلسفۂ یونان رقم طراز ہیں کہ " دوسرا دور سوفسطائیوں (Sophist) اور سقراط کا دور ہے۔۔۔سوفسطائی کائنات کی ماہیت کے بارے میں استفسار نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی توجہ ذہن اور انسان پر مرکوز کرتے ہیں۔" (۱)

یہاں سوفسطائیوں کے ساتھ سقراط کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ وہ بھی سوفسطائی لگ رہا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو سوفسطائی نہیں بھی لگتا۔ مگر بات کچھ مبہم سی ضرور ہو گئی ہے۔ جبکہ دوسری طرف "فلسفۂ ہند و یونان" میں ہے کہ "سقراط بہت بڑا حکیم اور مفکر تھا وہ سوفسطائی نہیں تھا، لیکن اس کا طرز بیان سوفسطائی تھا۔ اسی لیے بعض اسے سوفسطائی سمجھتے ہیں" (۲)

بہر حال سوفسطائیوں کے سلسلے میں پروٹا گورس (Protagorass) کا ذکر بھی بہت اہم ہے۔ اس سے پہلے کے فلسفیوں کی اختلافی آراء سے پروٹا گورس اس نتیجے پر پہنچا کہ عقل کلی طور پر ذریعہ علم نہیں بن سکتی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہراقلیتوس کے نظریہ تغیر و تبدل سے بھی متاثر تھا۔ کہ جب کسی چیز کو سکون و قرار ہی نہیں تو اس کا علم کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے؟ جب کوئی شے کچھ عرصے تک اپنی عینیت (Identity) میں رہے تب ہی اس کے بارے میں کچھ جان سکتے ہیں بلاشبہ

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا (میرؔ)

لیکن درحقیقت سارے پھول اور کلیاں تو بیک وقت تبدیل یا مرجھا نہیں جاتیں۔ اقبال کہتے ہیں:

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے (۳)

نہ ہی سارے انسان یا دوسری اشیاء ایک آنِ واحد میں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آج یہ کائنات نباتات و

---

(۱) تاریخ فلسفہ یونان۔ ۶۰۔ نعیم احمد۔

(۲) "فلسفہ ہند و یونان"۔ ۸۸۔ دین محمد شفیقی عہدی پوری۔

(۳) بالِ جبریل۔ ۱۲۷۔ ساقی نامہ۔

جمادات ، حیوانات اور انسانوں سے یکسر خالی ہو چکی ہوتی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شے ختم ہوتی یا تبدیل ہوجاتی ہے مگر اس کی قسم یا ذات میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ انسان مرتے ہیں لیکن سبھی انسان تو ختم نہیں ہوتے نہ ہو گئے ہیں۔ انسان اگر انسان کا یا اشیاء کا مشاہدہ کرنا چاہے تو یہ مشاہدہ ہر وقت کرسکتا ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہد کی زندگی بھی مختصر ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نسلِ انسانیت کی زندگی تو مختصر نہیں ہے۔ نہ کائنات کی زندگی مختصر ہے۔ اشیاء یا بنی نوعِ انسان کو انفرادی طور پر جانچنے کے بجائے کلی طور پر جانچنے کی ضرورت ہے۔ پروٹا گورس کا مقولہ ہے کہ:

" آدمی ہر شے کا پیانہ ہے۔۔۔۔۔ جو اشیاء ہیں، ان کا (پیانہ) ہے کہ وہ ہیں، جو نہیں (ان کا پیانہ ہے) کہ وہ نہیں۔

Man is the measure of all things, of those that are, that they are, of those that they are not(1)"

دراصل اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پروٹا گورس نے کلی طور پر نسلِ انسانی کے بجائے صرف انفرادی ، فرد کی بات کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آدمی سے مراد اس نے صرف اور صرف اپنی ہی ذات لی ہو۔ ہر آدمی اور ہر چیز ہر دور میں نہیں ہوتی۔ لیکن اشیاء کی جنس اور بنی نوع انسان ہر دور میں ہوتے ہیں۔ اگر وہ اس نکتے کو سمجھ سکتا تو یہ ہرگز نہ کہتا کہ تغیر و تبدیلی کی وجہ سے اشیاء کا علم حاصل کرنا ممکن نہیں۔

اس کے بعد قنوطیت (Pesimesim) کے حوالے سے پرُوڈیکس کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ آگے چل کر یاد رہے کہ شوپنہآر پہلا قنوطی نہیں۔ پروڈیکس کے نظام فکر میں انسان کو موت کی آرزو کرنی چاہیے۔کہ زندگی کے مصائب اور دکھ درد سے موت ہی نجات دلاتی ہے۔لیکن بات یہ ہے کہ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟ اور پھر میری ذاتی رائے میں موت کی تمنا بھی تو ایک امید ہے۔ لہٰذا جسے مر جانے کی آرزو یا اُمید ہو تو وہ قنوطی نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ در حقیقت زندگی موت ہے اور موت زندگی۔ جب میں نہیں تھا تو موجود تھا ، میں ہوں اس لیے میں نہیں ہوں اور جب میں نہیں ہوں گا تو اس وقت موجود ہوں گا۔ جسے ہونے یا نہ ہونے کی امید یا آرزو ہو تو وہ قنوطی نہیں بلکہ رجائی ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں جہاں تک گورجیس کا تعلق ہے وہ کہتا ہے کہ کوئی چیز بھی موجود نہیں۔ پارمینڈیز کی طرح وہ بھی کہتا ہے

---

(۱) تاریخ فلسفہ یونان ۔۶۲۔۶۳۔نعیم احمد۔

کہ اگر کوئی شے ہے تو اس کا آغاز ہستی یا نیستی سے ہوگا۔ اگر کوئی چیز ہستی سے معرضِ وجود میں آئی ہے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کا کوئی آغاز نہیں۔ اگر وہ شے نیستی سے وجود پذیر ہوئی ہے تو ایسا ناممکن ہے۔ کہ ہستی نیستی سے ظہور میں نہیں آسکتی۔ لہذا کوئی شے بھی موجود نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شے موجود نہیں تو گورجیس کو متاثر کرنے والا پارمینڈیز کہاں سے آگیا۔ بلکہ گورجیس بذات خود کیسے موجود ہوگیا تھا؟ پھر یہ بھی ہے کہ ہستی تو ہستی ہے نیستی بھی ایک ہستی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نیستی کچھ بھی نہیں۔ کچھ نہ ہونا بھی تو کچھ ہونا ہے۔ نیستی یا عدم کا مطلب ہے جہاں کچھ نہ ہو۔ لیکن خدا تو ہر جگہ ہے۔ لہذا نیستی یا عدم نام کی کوئی چیز اور جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر ایسا ہے تو ہستی موجود ہے۔

وہ یہ بھی دعوئ کرتا ہے کہ اگر شے موجود ہے تو اس کا علم ممکن نہیں، علم چونکہ حسیات سے حاصل ہوتا ہے، جبکہ حسیات تمام انسانوں میں ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہاں پر میں یہ کہوں گا کہ بے شک لوگوں کے حسیات میں تنوع ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی چیز ''حس'' تو سب میں قدر مشترک ہے۔ اس لیے یہ دعوئ غلط ہے کہ کسی چیز کا علم حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

گورجیس یہ بھی کہتا ہے کہ اشیاء کا علم ممکن ہوتے ہوئے بھی ، اس کا ابلاغ (Communication) ناممکن ہے۔ ایک رنگ کور (Colour Blind) شخص کو سرخ رنگ کے بارے میں سمجھانا بعید از قیاس ہے۔ گورجیس کا یہ نقطہ نظر آگے چل کر ''موضوعیت'' یا ''تصوریت'' کے سلسلے میں زیرِ بحث آئے گا۔ البتہ یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ''رنگ کور'' اگر رنگ نہیں دیکھ سکتا تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ رنگ موجود ہی نہیں۔ رنگ تو اپنی جگہ موجود ہے۔

ہم دیکھ آئے ہیں کہ حقیقت کے بارے میں فلاسفہ کی رائے مختلف ہے۔ پارمینڈیز اسے واحد، غیر متغیر اور ناقابل تقسیم مانتا ہے تو ہراقلیتوس کے خیال میں حقیقت متغیر و متحرک ہے۔ پھر فیثا غورثیہ کے نزدیک حقیقت کثیر ہے۔ اس طرح ایک ہی حقیقت کے سلسلے میں متضاد آراء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم یا حقیقت کا بھید عقل کے بس میں نہیں۔

اس ساری بحث اور تجزیے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ''آیونیا'' اور ''ایلیا'' کے بیشتر مفکرین ''طبیعاتی'' یا ''کائناتی'' فلسفے کے پیش رو تھے۔ ان کی سوچ بچار کا لب لباب یہ ہے کہ کائنات کیسے بنی؟ مثلاً ''ول ڈیورنٹ'' (The story of philosophy) میں سقراط کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ:

There had been philosophers before him of course; strong man like "Thales" and "Haraclitus", subtle man like "Parmenides" and "Zeno of Elea, seers like Pythogoras and Empedocles; but for the most part they had been physical philosophers; they had sought for the physis or nature of external things, the laws and constituents of the material and measurable world. This is very good said socrates; but there is an infinitely worthier subject for philosophers than all these trees and stones , and even all those stars; there is the mind of man. What is man and what can he become? "(1)

اس سے پہلے بھی فلسفی ہوگزرے تھے مثال کے طور پر تھیلیز، ہراقلیتوس، کہ توانا تھے۔ پارمینڈیز اور ایلیا شہر کا زینو (رواقی) کہ دقیق النظر تھا۔ فیثا غورث اور ایمپیڈوکلیز کہ روشن ضمیر تھے۔ لیکن بیشتر یہ تھا کہ یہ لوگ منکرین طبیعات تھے۔ ان کا مطمح نظر خارجی اشیاء کی ماہیت یا طبیعت دریافت کرنا تھا۔ وہ اس مادّی دنیا کے عناصر و قوانین کی جستجو میں لگے رہے۔ سقراط نے کہا یہ جستجو خوب ہے مگر تمام اشیاء و حجار اور ثوابت و سیار سے کہیں بلند پایہ موضوع انسان کا ذہن موجود ہے۔ انسان کیا ہے؟ اور کہاں تک پہنچ سکتا ہے؟ اقبال بھی کہتے ہیں کہ:

شعلہ کمتر ہے یہ گردوں کے شراروں سے بھی کیا
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا (۲)

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں (۳)

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
ایں مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد (۴)

---

(1) The Story of Philosophy p-5 will Druant-

(۲) بانگِ درا۔۲۳۳۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں"۔

(۳) ایضاً۔۲۳۴۔

(۴) زبورِ عجم۔۶۳۔ اقبال۔

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے (۱)

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے ، خود شکنے، خود نگرے پیدا شُد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
خذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شُد
آرزو بیخبر از خویش بآغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شُد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تاازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شُد (۲)

سقراط سے یونانی علم وحکمت کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ (۴۶۹۔۳۹۹ق۔م) وہ ایتھنز میں پیدا ہوا اور یہیں زہر کا پیالہ پی کر اپنی جان جان آفرین کے حوالے کر دی۔ عبدالسلام ندوی اس کی نسبت فیثا غورثیہ سے ٹھہراتے ہوئے لکھتے ہیں '' سقراط اسی فیثاغورث کا شاگرد تھا'' (۳) اس کے بعد نعیم احمد لکھتے ہیں: '' سقراط کے نظریات کی بنیاد صرف منطقی تفکر ہی نہ تھا بلکہ ان میں داخلی اور وجدانی قوتوں کا پورا حصہ تھا۔'' (۴)

سقراط کا باپ بت تراش تھا مگر بیٹے کو بت گری اور بت پرستی سے نفرت تھی۔ شاید یہی وجہ ہو کہ وہ نفسیاتی طور سے مصوری اور دوسری فنی اصناف کو بنظرِ حقارت دیکھتا تھا۔ اس نے فن کو دوسرے درجے کی نقالی کہہ کر باطل قرار دیا۔ اس کی تعلیم کا دارومدار کلیتاً اس عقیدے پر تھا کہ علم خیر ہے، جس کا نقیض یہ ہوا کہ جہالت شر ہے۔ سقراط اپنا تصور خیر پیش کرتے ہوئے ''حسن'' کو خیر اور علم وحکمت بھی خیال کرتا تھا۔۔۔جس شے کو وہ مظاہر فطرت میں حسن سمجھتا ہے، اس شے کو وہ مظاہر

---

(۱) زبور عجم ۔۲۲۶ ۔ علامہ محمد اقبال ۔
(۲) پیام مشرق ۔ ۱۴۸۔ تسخیر فطرت ۔ علامہ محمد اقبال ۔
(۳) حکمائے اسلام ۔ جلد اول ص ۔ ۱۱ ۔عبدالسلام ندوی ۔
(۴) تاریخ فلسفہ یونان ۔۷۲ ۔نعیم احمد ۔

اخلاق میں ''خیر'' کہتا ہے۔ اور جب یہی شے انسانی قلب میں نمودار ہوتی ہے، تو اسے ''علم وحکمت'' کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ خدا کی ہستی کے لیے ''اگاتھوس'' یعنی ''الخیر'' کا تصور پیش کرتا ہے ____ خدا سراسر اچھائی اور حسن ہے۔ ''حسن مطلق'' ہی اصل حقیقت ہے۔ اور جن چیزوں کو ہم خوبصورت کہتے ہیں وہ اسی حقیقت کے مظاہر ہیں۔ حسن مطلق قائم بالذات، ناقابل تغیر، حی و قیوم اور بے مثل و بے عدیل ہے۔ حسن مطلق ہی تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اور حسن مطلق کے مشاہدے کا نام ہی علم ہے۔ یہ علم خیر ہے اور یہ حیاتِ انسانی کا مقصودِ حقیقی ہے۔

سقراط کے مطابق روح پہلے ہی سے ''حسن مطلق'' کا علم رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں سقراط ''تذکر'' کی اصطلاح بروئے کار لاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ انسانی روح قفس عنصری میں اسیر ہونے سے قبل عالم حقیقت میں خدا اور ناقابلِ تغیر ''تصورات یا اعیان'' کے رو برو رہتی ہے۔ مگر جب وہ حواس کی زنجیروں میں جکڑ لی جاتی ہے تو اپنی گزشتہ زندگی کی یادیں بھول جاتی ہے۔ روح کا غور وفکر اور مشاہدے سے ان گزرے ہوئے حالات و واقعات کی دوبارہ یادآوری ہی ''تذکر'' وعلم و مشاہدہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلکِ پروانہ خو! شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو
یہ مری آغوش میں بیٹھے ہوئے جنبش ہے کیا روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا؟
اس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے
یہ کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے (۱)

بے شک سقراط کے فلسفے کا نچوڑ ''حسن'' ہے۔ اس کے نزدیک مردِ کامل کی پہچان یہ ہے کہ اس کے قول وفعل میں حسن ہوتا ہے۔ اس کے تصورات حسین ہوتے ہیں اور اسے حسنِ مطلق کا عرفان ہوتا ہے۔ سقراط کہتا ہے کہ ''حسن'' اصل اور فن کی حیثیت '' فروعی '' ہے۔ اصل اور فرع چونکہ ایک نہیں ہو سکتے، اس لیے حسن اور فن کا ایک ہونا بھی ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں حسن چونکہ حقیقت ہے اس لیے فن حقیقت نہیں ہوسکتا۔ پس فن کا باطل اور لا حاصل ہونا لازمی ہوا۔

سقراط فن کو چار وجوہات کی بناء پر زندگی کے حق میں منفعت بخش نہیں سمجھتا۔ اول یہ کہ فن حقیقت کی ہو بہو عکاسی کرنے سے قاصر ہے۔ دوئم یہ کہ وہ انسان کی نفسیاتی شبیہ گری نہیں کرسکتا۔ سوم یہ کہ وہ افادی اقدار کا حامل نہیں ہوتا۔ چہارم

---

(۱) بانگ درا۔ ۹۳۔ '' بچہ اور شمع ''۔

یہ کہ فنی تخلیقات عقل سے نہیں بلکہ عبقریت (Genious) اور تخلیقی مہیج (Creative Stimulus) سے معرض وجود میں آتی ہیں۔ افادے سے مراد سقراط روحانی و اخلاقی افادیت لیتا ہے ماڈی کم۔ اس زمانے کے انسان نے اپنی تخلیق کا آغاز فطرت کی نقالی ہی سے کیا، جوفن پارہ نفسیاتی کیفیات کی عکاسی کر سکتا ہے، سقراط اس کا معترف ہے۔ سقراط فن کی حقیقت کو ''اظہار'' میں بھی پوشیدہ سمجھتا ہے۔ گویا کہ وہ اولیں مفکر ہے جس نے ''جمالیات'' میں ''اظہاریت'' (Expressionism) کی داغ بیل ڈالی۔ چنانچہ وہ اظہاریت کے مکتب فکر کا بانی کہلائے جانے کا بھی مستحق ہے۔ (۱)

سقراط نے ''نظریہ تعقلات'' بھی پیش کیا۔ جس نے فلسفے میں انقلابی ہلچل مچا دی۔ افلاطون اور ارسطو کا فلسفہ اور بعد میں ظہور پذیر ہونے والی ''تصوریت'' (Idealism) درحقیقت سقراط کے نظریۂ تعقلات ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ بھی ہے کہ اپنے دور میں فوری طور پر سقراط کے نظریۂ تعقلات نے سوفسطائیت کی تردید کر دی۔ سوفسطائی تعلیمات کے مطابق صداقت ''حسی ادراک'' ہے۔ چونکہ ایک ہی چیز کا ادراک مختلف اوقات و شرائط کے تحت مختلف ہو گا۔ اس لیے سچائی فرد کا ذاتی ذوق بن گئی۔ اس کے نتیجے میں اس یقین کا خاتمہ ہو گیا کہ صداقت معروضی حقیقت بھی رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر سٹیس رقمطراز ہیں کہ:

> ''سوفسطائی علم کو حسی ادراک کا مرہونِ منت سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس سقراط نے کہا علم تعقلات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ علم پر تعقلات کی کمند ڈالنا درحقیقت علم کو عقل کی ہمہ گیری سے ناپنے کے مترادف ہے۔ اس طرح سقراط علم کو موضوعی تاثرات سے اٹھا کر معروضی حقیقت کا درجہ دے دیتا ہے۔'' (۲)

بعد ازیں جہاں تک افلاطون کا تعلق ہے اس کا پیدائشی نام ارسطوقلیس والد کا نام ارسٹن اور والدہ کا نام ''پریکشن'' تھا افلاطون ایتھنز میں (۴۲۷ ق۔م) کو پیدا ہوا، اور اسی شہر میں (۳۴۷ ق۔م) کو فوت ہوا۔ یہ حکیم اپنے چوڑے چکلے شانوں کی بناء پر ''افلاطون'' کہلاتا ہے۔ جمالیات میں اس کا ذوق یکطرفہ دکھائی دیتا ہے۔ کہ وہ صرف جمال یا حسن کا قائل ہے۔ جمالیات کے دوسرے آدھے حصے فنون لطیفہ کا زبردست مخالف ہے۔ چونکہ سقراط کے نزدیک حسن اور فن باطل ہے اس لیے افلاطون بھی اپنے استاد سے براہِ راست متاثر اور متفق دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ استادی شاگردی اور مرعوبیت کا یہ سلسلہ ماضی کی

---

(۱) اس ساری بحث کے ضمن میں '' تاریخ جمالیات'' جلد اول ص ۳۳ تا ۵۶، از نصیر احمد ناصر، استفادہ اٹھایا گیا ہے۔

(۲) ''یونانی فلسفے کی تنقیدی تاریخ'' ۔ ۱۵۱۔ پروفیسر سٹیس۔

طرف موڑیں تو افلاطون سے سقراط، سقراط سے فیثا غورث اور اس کے بعد بند قلیس تک جا پہنچتا ہے۔ یوں اگر یہ کہا جائے کہ افلاطون بالواسطہ طور پر بند قلیس سے بھی متاثر تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ بہر حال افلاطون کا ''نظریۂ اعیان'' اور ''عالم امثال'' وغیرہ بھی سقراط کے نظریۂ ''تعقلات''، ''تصورات'' (Concepts) ہی کی ارتقائی صورت ہے۔ فلاسفہ جسے ''اعیانِ ثابتہ'' بھی کہتے ہیں۔ اعیان جمع ہے عین کی، جس کے معنی نمونے کے ہیں۔ اس طرح عالم اعیان سے مراد نمونوں کی دنیا ہے۔ پھر مثل کا مطلب بھی نمونہ یا ''کی طرح'' ہے۔ جب امثال مثل کی جمع ہوئی تو عالم امثال بھی نمونوں ہی کی دنیا کہلاتی ہے۔ اور اعیانِ ثابتہ سے مراد سالم و ثابت یعنی لازوال نمونے ہیں، گویا کہ وہ دنیا جو قائم و دائم، ''عالم لاہوت'' ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم ''سُکانِ زمین'' کی دنیا عالم ناسوت یا عالم محسوسات ہے۔ جو ''اعیان ثابتہ'' کے مقابلے میں مادّی اور زوال پذیر ہے۔ لیکن سقراط اور افلاطون کے مطابق یہ عالمِ محسوسات، عالم اعیان ہی کا عکس ہے۔ عکس یا تصویر اپنی اصل کے عین مطابق ہوتی ہے۔ اس طرح عالم ناسوت کی ہر شے کا ایک نمونہ عالم امثال میں موجود ہے۔ یا یوں کہیے کہ عالم ناسوت کی ہر شے عالمِ لاہوت یا عالم امثال سے ملتی جلتی ہے۔

اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ یونان کے آیونی اور ایلیائی طبعی فلسفیوں نے مختلف عناصر کو کائنات کے اجزائے ترکیبی قرار دیا تھا۔ لیکن اس کے برعکس افلاطون نے ظہورِ کائنات کے سلسلے میں ''نظریۂ اعیان'' پیش کر دیا۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ عالمِ محسوسات کوئی حقیقی شے ہے ہی نہیں بلکہ عالم امثال کا عکس ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ہماری یہ مادّی دنیا ایک آئینہ ہے جس میں عالم اعیان کا عکس منعکس ہو رہا ہے۔ آئینہ اگر ٹوٹ جائے یا اس کا رخ پھیر دیا جائے تو اس میں عکس نظر نہیں آتا۔ لیکن عکس نظر نہ آنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ چیز جس کا عکس آئینے میں منعکس ہو رہا تھا، وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ بلکہ وہ شے اپنی جگہ بدستور قائم رہتی ہے۔ اسی لیے افلاطون کہتا ہے کہ عالم امثال، لازوال ہے۔ آئینہ یا مادّی دنیا عارضی اور ناپائیدار ہے۔ عالم لاہوت یا اعیان ثابتہ اس وقت بھی موجود ہوں گے جب یہ عالم ناسوت موجود نہیں ہوگا۔

> ''پرمینڈیز نے ہستی (Being) کو آخری حقیقت تسلیم کیا تھا۔ اسی طرح افلاطون بھی یہ کہتا ہے کہ کائنات کی آخری حقیقت دنیائے امثال (World of Ideas) ہے۔ پارمینڈیز ہی کی طرح اس نے عقل اور حواس کی تفریق پر حقیقت

اور مجاز (Reality and Appearance) کے فرق کی وضاحت کی ہے ۔
دنیائے تصورات حقیقت ہے۔ اور اس کا علم صرف عقل سے ہوتا ہے۔ یہ دنیا جس
میں ہم رہتے ہیں، مجاز ہے۔۔۔۔۔حقیقت کا عکس یا پرتو ہے جس کے نقش و نگار
حواس تیار کرتے ہیں۔"(۱)

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اپنے پیش رووں کی طرح افلاطون بھی عقلی بندھنوں میں پڑا ہوا ہے۔ اور عقل ہی کو طائرِ سدرہ آشنا سمجھتا ہے۔ نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

"افلاطون تصور کو محسوسات سے الگ ایک ہستی خیال کرتا ہے اور اسی بناء پر وہ روحِ
مطلق اور روحِ انسانی کو بھی مادّیات سے منزہ اپنی اپنی انفرادی ہستی کا مالک سمجھتا
ہے، اور یہی روحِ مطلق یا نفسِ کل جسے وہ ذاتِ الٰہی تصور کرتا ہے، اس کے
نزدیک حسن کا مبدا ہے۔ جس کا حسین ترین تصور روحِ انسانی ہے۔ پھر اسی حسن کی
وجہ سے روحِ انسانی میں عقل و ہوش کی شمع روشن ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرقعِ کائنات
کی تمام تصویریں انہیں ازلی حسین تصورات کے مظاہر ہیں۔ افلاطون کے اس
نظریے کو" تصوریت" یا "عینیت" (Idealism) کے نام سے بقائے دوام
حاصل ہے۔"(۲)

ویسے تو "تصور" کے معنی اس فکری تصویر کے ہیں جو ذہن کے صفحے پر بنتی ہے۔ جبکہ لاکؔ (Locke) کہتا ہے کہ "تصور وہ شے ہے جس کا ذہن اپنی ذات میں ادراک کرتا ہے، یا جو ادراکِ فکر یا علم کا براہِ راست معروض ہے۔"(۳)

ھیومؔ تصور کو ارتسام یا حس کی نقل کہتا ہے۔ گویا کہ وہ شے جو حواس کے لیے واقعی موجود ہو تصور کہلاتی ہے۔

افلاطون تصور کو مختلف معنی میں استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

"تصورات اعیان یا حقیقی اشیاء ہیں اور اس کائنات کی تمام اشیاء ان ہی اعیان کی
محض نقلیں ہیں۔ اعیان کا عالم ہی در اصل عالم "حقیقت" ہے۔ جس کی تصویروں کا

---

(۱) تاریخ فلسفہء یونان ۔۱۲۰۔ نعیم احمد۔ (۲) تاریخ جمالیات ۔ جلد اول ۔ ۶۳۔ نصیر احمد ناصر۔

Essay concerning Human understanding book 11, ch VIII(۳)

مرقع یہ ہمارا عالم صوری ہے۔ جو فی الحقیقت عالم مجاز ہے۔ مثلاً ہم درخت یا گھوڑے کو دیکھتے ہیں، یہ دونوں اشیاء اپنی ذات میں حقیقی نہیں ہیں، بلکہ ان کا ایک ''عین کلی'' یا ''تصورِ ازلی'' ہے جو درخت اور گھوڑے کی تمام اصلی صفات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ درخت اور گھوڑے تو متاثر ہو سکتے ہیں، مگر ان کا ''تصور'' یا ''عین'' کبھی معدوم نہیں ہو سکتا۔۔۔۔یہ تصور ایک مثالی اور ابدی نمونہ ہے، جس کے مطابق فطرت اشیاء کو پیدا کرتی ہے۔ اس لیے وہ حسین بھی ہیں۔''(۱)

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ اگر کائنات کی تمام اشیاء ''اعیان'' کی نقلیں ہیں تو پھر ساری کی ساری کائنات مجموعی طور پر ایک نقل کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ نقل کس نے پیش کی ہے___ حسن مطلق یا فطرت نے جو بذاتِ خود حسن مطلق ہی کا حسین وجمیل مظہر ہے۔ نقل کے یا کائنات کے نقلی ہونے کے بارے میں آگے چل کر مناسب جگہ بحث کی جائے گی۔

جیسا کہ سقراط نے حسن مطلق یا ذاتِ الٰہی کی ''اگاتھوس'' کے نام سے شناخت کی ہے۔ جسے وہ خیر اور حسن و خوبی سمجھتا ہے۔ ادھر افلاطون کہتا ہے حسن ایک ''ہستی'' ہے جو حقیقی ہے۔ کائنات کی ساری خوبصورت اشیاء کو ملا کر بھی اس حقیقت کی حقیقت ان سے زیادہ ہے۔ اس لیے کہ جس شے کو ثبات ہے وہ بے ثبات شے کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ حقیقت رکھتی ہے۔ کارخانہ قدرت میں سکوں محال ہے لیکن بذاتِ خود قدرت تغیر پذیر نہیں۔ لباسِ مجاز میں ملبوس ہر خوبصورت شے حادث ہے اور اسی لیے

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ راہ گزار بادیاں (غالب)

مجازی اشیاء کے سانچے تو زوال پذیر ہیں اس لیے ان کا حسن بھی تغیر پذیر ہے لیکن حسن حقیقی قدیم ہے جو کہ فنا نہیں ہوتا اور قائم و دائم ہے۔ یہ زمان و مکاں سے بے نیاز ہر عیب سے مبّرا اور تخیلاتی قوتوں سے ماورا ہے۔ اقبال کہتے ہیں

---

(۱) تاریخ جمالیات۔ جلد اول۔۶۴۔نصیر احمد ناصر۔

نہ بہ امروز اسیرم، نہ بہ فردا، نہ بہ دوش
نہ نشیبے، نہ فرازے، نہ مقامے دارم (۱)

افلاطون حسن کو صداقت، خیر اور خدا بھی کہتا ہے۔ کبھی یہ سمجھتا ہے کہ حسن وہ ''موزونی'' ہے جو اشیاء کو خوبصورت بنا کر دکھاتی ہے۔ وہ حسن کو ''واحد'' سمجھتے ہوئے اسے نور کے مثل قرار دیتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جب وہ یہ کہتا ہے کہ عقل کی تجلی کا یہ فانی آنکھ ہرگز مشاہدہ نہیں کر سکتی تو صاف ظاہر ہے افلاطون حسن کو ''عقل'' بھی سمجھنے لگتا ہے۔ جبکہ جس طرح افلاطون اس عالم مجاز کو حقائق ثابتہ (ایڈوس Eidos) کی نقل قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اقبال کے نزدیک عقل کی حیثیت نقلی ہے۔ بس لگتا ہے کہ عقل کوئی بزدل چور ہے جسے اقبال نے رنگے ہاتھوں پکڑ کر کان پکڑوا دیے ہیں۔ بہر حال حسن کو ہم حسن کہیں یا اسے دیگر ہزاروں ناموں سے پکاریں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ___ سو تعریفوں کی ایک تعریف کہ ''حسن بس حسن ہے''۔

افلاطون اپنے فلسفۂ غایتیت کی تشریح کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔ ''فلسفہ غایتیت کی تشریح تجزیہ و تحلیل کے آخری مرحلے پر انسانی افعال کی روشنی میں نہیں بلکہ ''جمالیاتی قدر'' (Aesthetic Value) کی روشنی میں کرنا پڑتی ہے۔ اہل خرد جانتے ہیں کہ اس جمالیاتی قدر کا تعلق، عقل کے نظام سے ہے اور یہ نظام ریاضی کی حسین نسبتوں میں پایا جاتا ہے۔'' (۲)

اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ افلاطون حکیم حسن کی گتھیاں خرد کی نظر سے سلجھا رہا ہے جبکہ خرد سے خرد ہی کی گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں، حسن کی گتھیاں سلجھانے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت ہے جس پر بات ہو گی۔

افلاطون کے نظریہ تصورات و موجودات کی بحثوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ تصورات کو ''واجب الوجود'' (Self Subsistent) سمجھتا ہے۔ اس لیے کہ جوہر (Subsistent) یا واجب الوجود کسی کا مرہون منت نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو شے کسی دوسری شے کی محتاج ہو، عرض (Accident) کہلاتی ہے۔ آئینے میں عکس اسی وقت تک دکھائی دیتا ہے جب تک کسی شے کا عکس اس پر پڑتا رہے۔ اس طرح منعکس ہونے والی شے ''جوہر'' اور ''عکس'' عارض ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آئینے میں درخت منعکس ہو رہا ہے تو وہ ایک لحاظ سے جوہر ہے لیکن افلاطون ہی کے نظریہ اعیان کی رو سے درخت اپنے عین کا عارض بھی ہے۔ اسی طرح گنا جوہر ہے اور چینی عارض مگر گنا تو بذات خود عارض کا درجہ رکھتا ہے یہ

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۶۴۔ علامہ محمد اقبال۔
(۲) تاریخ جمالیات۔ جلد اول۔ نصیر احمد ناصر۔

مسئلہ اسی وقت حل ہو سکتا ہے جب ہم عالم ناسوت یا عالم موجودات کو عارض اور اس کی سبھی اشیاء کو ''عوارض'' سمجھیں۔ گویا کہ

میں ہی فقط نہیں ہوں

ہر چیز حادثہ ہے (فقرتی)

فلسفہء تصورات و موجودات کو سمجھاتے ہوئے افلاطون مندرجہ ذیل طریقے سے وضاحت کرتا ہے:

فرض کریں ایک غار کے اندر کچھ قیدی قطار بنائے بیٹھے ہیں۔ یہ قیدی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ صرف سامنے والی دیوار کی طرف ہی دیکھ سکتے ہیں۔ قیدیوں کی پشت پر ایک چھوٹی سی دیوار یا اسٹیج ہے، اس دیوار یا اسٹیج کے ساتھ ساتھ کوئی پر اسرار مخلوق ہاتھوں میں مختلف اشیاء اور جانوروں کے مجسمے لیے اس طرح گزر رہی ہے کہ مجسمے اسٹیج سے اوپر رہتے ہیں۔ اسٹیج کے پیچھے دور آگ جل رہی ہے جس کی وجہ سے مجسموں کے سائے سامنے والی دیوار پر پڑتے ہیں۔ غار کے قیدی صرف سامنے والی دیوار پر ہی سائے دیکھ سکتے ہیں، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتے۔ قیدیوں سے مراد موجودات (اس دنیا) کے لوگ ہیں جنھیں حواس کی زنجیروں میں جکڑا گیا ہے۔ اس لیے وہ صرف ان سایوں کو دیکھ سکتے ہیں جنھیں ازلی و ابدی اور حقیقی تصورات سامنے کی دیوار پر ڈالتے ہیں۔ عقل استعمال کرنے والا اسیر حواس کی زنجیریں توڑ کر پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھ سکتا ہے۔ گویا کہ وہ اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ کسی ''سائے'' اور ''پرچھائیں'' کی حقیقت کوئی تصور ہے۔ (۱)

موجودات، ظاہریت یا مجاز (Appearance) کہلاتے ہیں۔ جبکہ تصورات، حقیقت (Reality) کی دنیا ہے۔ اس طرح ہر شے حقیقی و ظاہری دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ظاہری یا مجازی پہلو کا ادراک حواسِ خمسہ سے ہوتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ شے کا ظاہر زمان و مکان میں ہوتا ہے۔ اس طرح حواس اسی شے کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ جو زمان و مکان کے اندر ہو کسی شے کے دوسرے پہلو یعنی اصلیت (Essence)، حقیقت، تعقل یا تصور کو صرف عقل کی کمند سے زیر دام لایا جا سکتا ہے۔ گویا تصورات یا عالم اعیان و حقائق ثابتہ یا عالم لاہوت عقل کا منتہائے مقصود ہے اور موجودات، عالمِ احساسات یا عالم ناسوت حواسِ خمسہ کا۔

عالمِ لاہوت ''ہستی'' (Being) اور عالم ناسوت تکوین (Becoming) کہلاتا ہے۔ افلاطون کے نظریۂ

---

(۱) ماخوذ از جمہوریہ افلاطون ساتویں کتاب۔

موجودات اور نظریۂ تصورات کا آپس میں چولی دامن کا تعلق ہے۔ ایک حقیقت ہے اور دوسرا مجاز۔ ایک واجب الوجود ہے اوردوسرا اس کا لحظہ بہ لحظہ ڈھلتا ہوا سایہ۔ افلاطون کائنات کو ایک زندہ جسم بھی سمجھتا ہے جو اپنے اندر روح بھی رکھتی ہے۔ اس کے مطابق روح عاقل ہوتی ہے، اسی لیے نظام کائنات میں عقل کارفرما نظر آتی ہے۔ لیکن اس کائنات کو کبھی سایہ، کبھی عکس اور کبھی زندہ جسم سمجھنے سے تشکیل کائنات سے متعلق افلاطون کا فلسفۂ تصورات و موجودات تضاد کا شکار دکھائی دیتا ہے۔

انسانی روح کے بارے میں افلاطون کہتا ہے کہ یہ پیدائش سے قبل بھی موجود تھی اور انسان کے مر جانے کے بعد بھی قائم و دائم رہے گی۔ زندہ رہنا روح کی بنیادی صفت ہے۔ جس طرح آگ کی بنیادی خصوصیت جلانا ہے۔ اگر جلائے نہ تو وہ آگ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح روح زندہ نہ ہو تو وہ روح ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے فلسفۂ اعیان کے مطابق جس طرح تصورات (Concepts) یا اعیان (Forms) لافانی ہیں اسی طرح روح بھی لافانی ہے۔ اس کا تعلق بھی حقائق ثابتہ سے ہے۔ لہٰذا اسے موت آ ہی نہیں سکتی۔ روح اپنی فطرت کے لحاظ سے موت کا اُلٹ ہے، گویا کہ روح ہی زندگی ہے چنانچہ موت صرف جسم کو ہو سکتی ہے ___ روح کو نہیں۔

راقم الحروف نے افلاطون کے نظریۂ اعیان اور عالم محسوسات کے بارے میں اپنی بساط کے مطابق جہاں کہیں بھی جو کچھ پڑھا ہے، اس سلسلے میں سبھی نقادوں نے افلاطون کے فلسفہ تصورات و موجودات کو بڑے شاندار انداز میں سمجھنے سمجھانے کی بہترین کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے طرح طرح کی وضاحتیں وصراحتیں دیکھنے سننے میں آتی ہیں۔ لیکن یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ سبھی نے افلاطون حکیم کے ''نظریۂ عالم امثال'' اور ''عالم مجاز'' کے باہمی تعلق یا رشتے کو، جو نقل پر مبنی ہے من و عن پیش کر دیا ہے۔ ہر ایک یہی کہتا ہے کہ افلاطون نے یہ کہا ہے وہ کہا ہے۔ اس نے جو کچھ کہا ہے اس سے کسی کو کتنا اتفاق اور کتنا اختلاف ہے؟ ہر کسی کی تحریر سے یہی تاثر ملتا ہے کہ بس جو ہے سو ہے۔ مطالعہ کرتے وقت میرے ذہن میں افلاطون کے نظریۂ عالم لاہوت اور عالم ناسوت کے بارے میں جو اختلافات جنم لیتے رہے، ضروری سمجھتا ہوں کہ انہیں اپنے اس مقالے میں تحریر کر دوں۔

جیسا کہ افلاطون اس مادّی دنیا کی ہر چیز کو عالم امثال کی نقل، عکس یا سایہ قرار دیتا ہے۔ گویا کہ عالم محسوسات سارے کا سارا نقل ہے اصل نہیں۔ اصل صرف عالم اعیان ہے۔ مگر مجھے اس سے واضح اختلاف ہے۔ افلاطون یہ بھی مانتا ہے

کہ عالم امثال کا خالق ''حسن مطلق'' یا خدا ہے۔ حسن مطلق یا خدا بے شک، حقیقی خالق ہے، اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اب جب خالقِ حقیقی ہی قادرِ مطلق ہے تو اسے کیا پڑی ہے کہ پہلے ''عالم امثال'' بنائے اور پھر ان امثال یا نمونوں کے مطابق عالم محسوسات کو پیش کرے اور وہ بھی کسی اصل کی نقل کی صورت میں۔ ہم یہ تو مان سکتے ہیں کہ انسان میں پوشیدہ فن کار فطرت کی نقل کرتا ہے لیکن یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں کہ خالق اعلیٰ نے یہ دنیا اصل دنیا کی نقل کے طور پر پیش کی ہے۔ یقیناً اسے ایسی کوئی مجبوری درپیش نہیں ہو سکتی کہ وہ انسان کی طرح ہمارے سامنے کوئی نقل پیش کرے۔ وہ ہمیں نقل، عکس یا سایہ دکھا کر اپنی قدرتِ کاملہ کا قائل نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنی اصلی و تخلیقی نشانیاں دکھا کر اپنا مطیع و فرمانبردار بنانا چاہتا ہے۔ دراصل افلاطون خالق حقیقی کے بارے میں افراط و تفریط کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ کبھی تو وہ کہتا ہے:

> ''ذرا توقف کرو تو شاید تم اور بھی زیادہ حیران ہو گے۔ کیونکہ یہ ہنر مند نہ صرف تمام اشیائے مصنوعات کو بنانے کے قابل ہوتا ہے بلکہ وہ تمام اشیاء کو بھی بناتا ہے جو کہ زمین سے اُگتی ہیں اور تمام زندہ اشیاء کو پیدا کرتا ہے اور صرف اسی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ زمین اور آسمان کو بھی بناتا ہے اور آسمان میں موجود تمام اشیاء اور دیوتاؤں کو اور زمین کے نیچے برزخ میں موجود تمام اشیاء اور دیوتاؤں کو پیدا کرتا ہے'' (۱)

صاف ظاہر ہے قادر مطلق یہ سب کچھ کر سکتا ہے تو اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ عالم امثال کو اصل اور عالم موجودات کو نقل کے طور پر بنائے بلکہ عجیب تضاد ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس میں افلاطون زمینوں، آسمانوں اور دوسری اشیاء کے حوالے سے کسی چیز کو نقل نہیں بلکہ تخلیق ہی کہہ رہا ہے۔ جیسا کہ زندہ اشیاء نقل، سایہ یا عکس نہیں ہوتیں اصل ہوتیں ہیں۔ لیکن ایک دوسری جگہ افلاطون حکیم کہتا ہے کہ:

> ''چونکہ خدا نے ایسا ارادہ کیا تھا یا چونکہ اس پر کوئی مجبوری تھی کہ فطرت میں ایک سے زیادہ پلنگ نہ بنائے لہٰذا اس نے صرف ایک مثل بنائی۔'' (۲)

قادر مطلق پر کسی مجبوری کا لاگو ہونا یا کرنا اسے انسانی خصوصیات سے متصف کرنے کے مترادف ہے۔ شاید اسی لیے افلاطون نے ''حسن مطلق'' کو عالم امثال تیار کرنے کے بعد ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت عالم محسوسات میں عالم امثال کی

---

(۱) جمہوریہ افلاطون۔ دسویں کتاب۔

(۲) جمہوریہ افلاطون۔ دسویں کتاب۔

نقلیں یا عکس دکھاتے دکھایا ہے۔ حالانکہ خالق حقیقی کو مادّی دنیا بنانے سے پہلے، ریہرسل کے طور پر ''عالم اعیان'' تخلیق کرنے کی کوئی مجبوری نہیں تھی اور نہ خالق حقیقی کے نزدیک عالم اعیان اور عالم موجودات جیسی مختلف دنیائیں ہو سکتی ہیں۔ وہ تو بس ساری کائنات کا خالق ہے۔

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے (۱)

زجبر او حدیثے درمیاں نیست
کہ جاں بے فطرتِ آزاد جاں نیست (۲)

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لیے لا مکاں میرے لیے چار سو! (۳)

وہ ہر کہیں موجود ہے۔ درخت سے اتنا قریب ہے جتنا کہ اس کی جڑ اور انسان کے وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ زمان و مکان اور لا مکاں کے بُعد اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ چنانچہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ خالق حقیقی نے ہر شے حقیقی بنائی ہے۔ اس نے کوئی نقل تیار نہیں کی وہ اول درجے کا خالق ہے اور اول درجے ہی کی تخلیقات کی ہیں۔ اس نے ایسا کوئی عالم اعیان نہیں بنایا جس کا عکس یا نقل عالم محسوسات ہے۔ اس نے کل کائنات حقیقی بنائی ہے۔ یہ دلائل لکھنے کے بعد راقم نے دوران مطالعہ میں کئی دنوں بعد وائیکونٹ سموئیل کی بھی ایک دلیل پڑھی جو افلاطون کی تصوریت و موجودیت کے خلاف بڑی اہمیت کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ سموئیل کہتا ہے:

'' قوی خوردبینوں اور دوربینوں کی ایجاد نے جب سائنس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ
اس عالم محسوس کا ایک جدید رخ بے نقاب کرے تو عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا ہے
کہ ظاہری طور پر جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ حقیقی عالم ہے۔'' (۴)

جس میں بے شک ''حسن مطلق'' لا فانی اور لازوال ہے باقی سب تخلیقات کی حیثیت زوال پذیر اور بے ثبات ہے۔ اور یہ اس کی مشیت ایزدی ہے۔

---

(۱) دیوانِ درد ۔۸۹۔ خواجہ میر درد ۔
(۲) زبور عجم ۔۱۶۳۔ اقبال ۔
(۳) بالِ جبریل ۔۹۲۔ اقبال ۔
(۴) انسان اور خدا۔ ۱۲۱ ۔ عتیق فکری۔

یہی نہیں راقم الحروف کے ہاں افلاطونی نظریہ تصورات و موجودات کے خلاف اور بھی دلائل ہیں۔عکس ،نقل یا سائے کو ہاتھوں سے محسوس نہیں کیا جا سکتا جبکہ عالم محسوسات میں ہم ہر چیز کو محسوس کر سکتے ہیں۔ درخت کو کاٹیں با قاعدہ کتنا محسوس ہوتا ہے جبکہ سائے یا عکس کی یہ نوعیت نہیں ہوتی۔ پھول کی خوشبو ہماری سانسوں کو بھی معطر کر دیتی ہے، پھول اگر عالمِ امثال کے پھول کا سایہ ہوتا تو اس میں خوشبو ہر گز نہ ہوتی۔ سائے ہنستے ، بولتے اور روتے نہیں جبکہ ہم ایسا کرتے ہیں۔عکس کے ہلنے سے کوئی آواز نہیں پیدا ہوتی جبکہ درخت کو ہلائیں تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ چاند اگر عکس ہوتا تو اس میں چاندنی ہرگز نہ ہوتی۔ سورج کی گرمی و تپش بھی اسی لیے ہے کہ وہ سایہ، عکس یا نقل ہر گز نہیں بلکہ حقیقی سورج ہے۔ قرآن حکیم میں خالق الکائنات فرماتا ہے:

" **یزیدُ فِی الخَلقِ مایَشاءُ** (۳۵:۱) وہ جسے چاہتا ہے تخلیق میں بڑھاتا ہے۔تصوریت کے مطابق مظاہر فطرت موجود فی الذہن یا سوچ کا نتیجہ یا پیداوار ہیں،تو پھر ہم جو بھی سوچتے ہیں وہ ہو کیوں نہیں جاتا۔عکس ،تصویر، سایہ اور نقل پروان نہیں چڑھتے نہ باتیں کر سکتے ہیں جبکہ بیج سے پودا اور پودے سے تناور درخت بن جاتا ہے۔غنچوں سے کلیاں اور کلیوں سے پھول کھل کر رنگ و نور کے ہالے اوڑھے خوشبوئیں پھیلانے لگتے ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال کیا خوب فرماتے ہیں:

پھر بادِ بہار آئی اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو! گل ہے، تو گلستاں ہو (۱)

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن! شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن!
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں!
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رُکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

---

(۱) بانگ درا۔۲۸۰۔

یہ کائنات و عالم موجودات تصویروں، نقلوں اور کٹھ پتلیوں کا بے حس و بے حرکت جمود زدہ ڈھیر یا نگار خانہ نہیں بلکہ روئیدگی و نامیاتی حقیقتوں کی جلوہ گاہ ہے۔ یہاں حقیقت جمال کے مختلف قافلے سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عالم ناسوت بے شک نا پائیدار سہی لیکن تخلیق کی حقیقت رگِ سنگ میں بھی رواں دواں ہے۔ نیلی فضاؤں اور مسرور ہواؤں میں پرندوں کا مست مست اڑنا، ہر پہاڑی ندی کا کہساروں اور دشوار گزار گھاٹیوں میں سنگلاخ چٹانوں کو چیر کر اپنا راستہ بنا لینا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ:

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود　　　کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود (۱)

غرضیکہ روتی آبشاروں، بہتی ندیوں، گاتی پھواروں، آتی جاتی بہاروں، چمکتے ستاروں، دلفریب نظاروں، حسن کے مہ پاروں، خوبصورت جانداروں، بوڑھی ماؤں کے سہاروں و جگر پاروں، پرندوں کی چہکاروں، پھولوں کی مہکاروں، حسین و جمیل دوشیزاؤں کی رہ گزاروں، تروتازہ سبزہ زاروں اور دلکش مرغزاروں کو کسی بھی صورت میں عکس، نقل یا سایہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نا پائیدار سہی مگر نقلیں ہرگز نہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ عالمِ ناسوت یا یہ دنیا جس میں ہم سکانِ زمیں رہتے ہیں۔ نقل، عکس یا سایہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فطرت و مظاہر فطرت دوسرے نمبر کی چیز ہے۔ اگر ایسا ہے تو گویا خالقِ کائنات کسی نقال کی طرح مجبور تھا کہ اصل کی نقل پیش کرے؟ اگر وہ خود ہی تخلیق کرنے والا ہے تو اپنی تخلیقات کو ہو بہو سچے اور کھرے انداز میں پیش کیوں نہ کر دے؟

"فتبرك الله احسن الخالقين"

برکتوں والی ذات ہے اللہ تعالیٰ کی جو پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے۔ تو ایسا بہترین خالق مظاہر کو نقل بنا کر پیش نہیں کرتا۔ وہ عالم تصورات کی صورت میں "اصل" تخلیق کر سکتا ہے تو عالم موجودات کی صورت میں نقل کیوں پیش کرے؟ کیا اصلی مواد اس کے پاس ختم ہو گیا تھا؟ یا کسی مجبوری سے عاجز آ کر عالم ناسوت کو آئینے کی حیثیت سے نصب کر دیا اور یوں عالم امثال کے حقائق ثابتہ باطل عکس کی حیثیت سے اس آئینے میں منعکس ہونے لگے؟ جبکہ حسن مطلق خود حق ہوتے ہوئے باطل کو پسند ہی نہیں کرتا۔

وَماَ خَلقنَا السموٰاتِ والارضَ وَ ماَ بینَھُماَ لٰعِبین

---

(۱) یہ سب اشعار بالِ جبریل کی نظم "ساقی نامہ" سے ماخوذ ہیں۔

ما خَلقناَ ھُماَ اِلّاَ باِ لحَقِ وَلکِنّ اَکثرَ ھُم لَا یَعلَمُون (۴۴:۳۸:۲۹)

ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان کے اندر ہے کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ ہم نے انہیں پیدا نہیں کیا مگر ساتھ حق کے، لیکن ان میں سے اکثر اس کا علم نہیں رکھتے۔

یہاں واضح طور سے ارشاد حسن مطلق ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کو تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر جو کچھ ہے اسے بھی تخلیق کیا گیا ہے۔ گویا کہ افلاطونی تصوریت و موجودیت کے تحت ہم کسی پر اصل اور کسی پہ نقل ہونے کا شائبہ تک نہیں کر سکتے۔ سب اصل ہی اصل ہے اور حقیقت ہے۔ اس طرح ذہن میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر عالم بالا روح ہے تو پھر عالم حیات مادّے کی صورت میں ظل کیسے؟ اور اگر عالم محسوسات عالم ارواح کا عکس ہوتا تو فانی ہرگز نہ ہوتا۔

یہیں بہشت بھی ہے، حورو جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخئ نظارہ نہیں (۱)

ان فی خلق السموات والا رض و اختلاف فی الیل والنھار لایت لاولی لالباب ○ الذین یذ کرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم ○ ویتفکرون فی خلق السموات والارض ج ربنا ما خلقت ھذا باطلاً ○ (۳:۱۹۰:۱۹۱)

بلا شبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات دن کے اختلاف میں "اہل دانش" کے لیے نشانیاں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور کروٹیں بدلتے یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں۔ (اور اعتراف کرتے ہیں) اے ہمارے پروردیگار تو نے یہ سب کچھ باطل نہیں پیدا کیا۔

ہم جس لحاظ سے بھی غور کریں تصورات و موجودات کا افلاطونی نظریہ ہی باطل نظر آتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اپنے اس وقت کے لحاظ سے اس میں بے پناہ کشش اور مسحور کن اثر محسوس ہوتا ہے۔ افلاطون نے جس زورِ بیان اور جاندار دلائل سے کام لیا ہے وہ یقیناً متاثر کن ہیں۔ مگر درحقیقت ایسا ہرگز نہیں۔ انسان کی سوچ اور ذہنی قوتِ پرواز در اصل محدود ہے۔ وہ یہ بہت کم جانتا ہے کہ:

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

---

(۱) بالِ جبرئیل ۔ ۴۴۔

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا   کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں (۱)

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست   کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است! (۲)

افلاطون نے اپنے نظریۂ تصورات وموجودات یا عالم امثال و عالم محسوسات کو مکان و لامکان کا نام دے کر اس کی تائید میں دلائل دیئے ہیں۔ کئی دنوں سے اس مسئلے پر غور وفکر کرتے اور لکھتے ہوئے آج رات راقم الحروف کے ذہن میں ایک نئے نکتے کا نزول بھی ہوا کہ افلاطون اور ہم اس عالم ناسوت میں بیٹھ کر اس دنیا کو مکان اور عالم اعیان و عالم لاہوت کو لا مکاں کا نام دے رہے ہیں۔ جہاں تک ہماری رسائی نہیں بس اس مقام کو لا مکاں کہہ دیتے ہیں۔ اگر ہم اس عالم محسوسات کی بجائے کسی اور مقام پر ہوتے تو پھر جس مقام پر ہم ہوتے اسے ''عالم محسوسات'' سمجھتے اور اس مقام کو جس پر ہم ہیں اسے افلاطون عالم اعیان یا حقائق ثابتہ کے نام سے پکارتا اور جب علامہ اقبال یہ کہتے ہیں کہ:

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر   طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر (۳)

ممکن ہے کہ تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں
اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا!
شاید کہ زمیں ہے یہ کسی اور جہاں کی
تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا (۴)

اقبال نے ضربِ کلیم کی ایک نظم ''نسیم وشبنم'' میں بھی افلاطون کے برخلاف موجوادت ومحسوسات کو تخلیق بالحق کی بناء پر حقیقت قرار دیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم محسوسات کی افلاطونی تقسیم بذاتِ خود غیر حقیقی ہے۔ نسیم کہتی ہے۔

انجم کی فضا تک نہ ہوئی میری رسائی
کرتی رہی میں پیراہن لالہ و گل چاک!
مجبور ہوئی جاتی ہوں میں ترکِ وطن پر
بے ذوق ہیں بلبل کی نوا ہائے طربناک!

---

(۱) بالِ جبرئیل ص۔۶۱۔ غزل۔
(۲) زبورِ عجم۔۸۶۔
(۳) بالِ جبرئیل۔ساقی نامہ۔اقبال۔
(۴) ضربِ کلیم۔۱۹۔اقبال۔

دونوں سے کیا ہے تجھے تقدیر نے محرم
خاکِ چمن اچھی کہ سرا پردۂ افلاک!

شبنم:

کھینچیں نہ اگر تجھ کو چمن کے خس و خاشاک
گلشن بھی ہے اک سرِّ سرا پردۂ افلاک (۱)

اور

ہوتا مگر محنت پرواز سے روشن
یہ نکتہ کہ گردوں سے زمین دور نہیں ہے! (۲)

تو افلاطون کے نظریۂ اعیان اورمکان و لا مکان کا سارا طلسماتی بھرم کھل جاتا ہے۔ دراصل افلاطون کے عہد میں ''قرآن حکیم'' جیسی الہامی کتاب نہیں تھی کہ جس سے وہ تخلیقِ کائنات کے بارے میں استفادہ اٹھا سکتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر وہ قرآن پاک کے دور میں ہوتا تو اس کے باوجود نظریۂ اعیان پیش کرتا۔ اس لیے کہ آج بھی تو بے شمار فلسفی موجود ہیں لیکن وہ سب ہی قرآن حکیم سے استفادہ نہیں کرتے۔ جس کی اپنی جگہ مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر افلاطون کا نظریہ فن بھی اس کے نظریہ تصوریت و عینیت کے زیرِ اثر ہے۔ جب اس نے کہہ دیا کہ مظاہرِ فطرت عالم اعیان کی نقالی ہوتے ہوئے ناقص ہیں تو لازماً فن کے بارے میں اسے کہنا پڑا کہ فن نقالی کی نقالی ہے۔ لہٰذا تیسرے درجے کی چیز ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ مختلف تاویلات کرتے ہوئے ہر قسم کے فن کو بیک جنبشِ قلم رد کر دیتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک سب ہی فنون لطیفہ ___ مصوری، شاعری، موسیقی وغیرہ کی کوئی اہمیت و حیثیت نہیں۔ راقم الحروف کو تو یوں لگتا ہے کہ مخصوص حالات کے تحت فنون لطیفہ کو مطعون قرار دینے کی غرض ہی سے افلاطون حکیم نے عالم بالا اور عالم سفلی کا نظریہ پیش کیا۔ دانشور تو وہ تھا ہی لہٰذا زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے تسلسل کے ساتھ فن کو گھٹیا ثابت کر دکھایا۔ ویسے بھی صاف ظاہر ہے کہ فن کار خالقِ حقیقی کی تخلیقات کا تو مقابلہ کر نہیں سکتا کہ خالقِ حقیقی ایسا فن کار و تخلیق کار ہے جس نے شاعر، موسیقار اور مصور کو بھی بنایا اور تخلیق کیا۔ میں نے گزشتہ بحث کے دوران میں افلاطون کی تصوریت و موجودیت کا جو ردّ پیش کیا ہے اس کی رو سے فن کار کا

---

(۱) ضرب کلیم۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۱۱۹۔

فن تیسرے نہیں بلکہ دوسرے درجے کی چیز ٹھہرتی ہے۔ اس لیے کہ فنون لطیفہ نقل کی نقل نہیں ____ اصل کی نقل ہیں۔

لیکن افلاطون نے مختلف دلیلوں اور مثالوں سے فنون لطیفہ کو تیسرے درجے کی چیز ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ افلاطون نظریۂ اعیان ہی کے مطابق پلنگ، بڑھئی اور مصور کی مثال دے کر ''ماہیتِ نقل'' کی تعریف کرتا ہے۔

> ''اب یہ تین پلنگ ہیں۔ پہلا تو وہ جو فطرت میں موجود ہے اور جسے خدا نے بنایا ہے۔دوسرا وہ جسے بڑھئی نے بنایا ہے۔ اور تیسرا وہ ہے جسے مصور نے بنایا ہے۔''(۱)

فطرت میں موجود وہ پلنگ جسے خدا نے بنایا، اس سے افلاطون کی مراد وہی عالم اعیان والی ہے کہ اصلی پلنگ وہاں ہے۔ اس کی نقل بڑھئی کی صنعت گری کی صورت میں دوسرا پلنگ ہے۔اور بڑھئی کے پلنگ کو دیکھ کر بنایا ہوا تیسرا پلنگ، جسے مصور نے بنایا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا درختوں کی صورت میں لکڑی تو تخلیق کرتا ہے اور وہ بھی عالم محسوسات میں، افلاطون جسے عالم امثال کہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے وہاں تیشے، آرا مشینیں اور میخیں بنانے کے کارخانے نہیں لگا رکھے۔ البتہ خدا نے فولاد کی صورت میں خام مواد عالم محسوسات میں انسانوں کو فراہم کر دیا ہے اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے کے مصداق لکڑی وفولاد سے پلنگ بھی بن رہے ہیں اور دوسری اشیاء بھی۔ بڑھئی کے سامنے خدا کا بنایا ہوا کوئی پلنگ نہیں تھا۔ یہ ساری منصوبہ بندی صرف اور صرف مصور کی بنائی ہوئی تصویر کو فن کے تیسرے درجے میں رکھنے کی خاطر کی گئی ہے۔ اگر یہی بات ہے تو پھر آج کا مصور تو ہوائی جہازوں، موٹر گاڑیوں اور ریل گاڑیوں سے لے کر ہر قسم کی مشینوں کی تصویریں بھی بناتا ہے۔ افلاطونی نظریہ فن کے مطابق یہ ساری مشینری بھی عالم اعیان میں ہوگی جو کہ ایک مضحکہ خیز سی بات لگنے لگتی ہے۔ افلاطون فنون لطیفہ کو تیسرا درجہ دینے کی غرض سے پلنگ، بڑھئی اور مصور کی بات کرتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہاڑ، ندی، پھول، انسان، گھوڑے، سورج، چاند، ستاروں اور دوسرے قدرتی نظاروں کو تو کسی بڑھئی نے نہیں بنایا، اگر مصور ان کی تصویریں بناتا ہے تو پھر اس کا فن کون سے درجے میں جگہ پائے گا؟ جمہوریہ افلاطون کی دسویں کتاب میں فنون لطیفہ کے خلاف لکھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ افلاطون مصوری کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے اس لیے کہ پلنگ اور بڑھئی کے حوالے سے وہ مصوری کو تیسرے درجے کی

(۱) جمہوریہ افلاطون۔ دسویں کتاب۔

صنعت گری ثابت کرتا ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر بات نہیں کرتا۔ اس میں بھی اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ ہوسکتا ہے بڑھئی نے مصور کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھ کر پلنگ بنایا ہو تو بات بالکل الٹ ہو جائے گی۔اسی طرح باگ اور کاٹھی کی مناسبت سے افلاطون کہتا ہے:

''کیا مصور یہ جانتا ہے کہ باگ و کاٹھی کو کیسا ہونا چاہیے؟ یا بات کچھ یوں ہے کہ خود انہیں بنانے والے یعنی لوہار اور زین ساز بھی یہ نہیں جانتے بلکہ گھوڑ سوار جانتا ہے جو کہ انہیں استعمال کرتا ہے۔۔۔۔ہر شے سے متعلق تین فنون ہوتے ہیں___ ایک فن وہ جو کہ اسے استعمال کرتا ہے، دوسرا وہ جو کہ اسے بناتا ہے اور تیسرا وہ جو کہ اس کی نقل کرتا ہے۔۔۔۔ نے نواز ہی،بانسری بنانے والے کو یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی بانسریاں کیسی ہیں۔ وہ اسے اپنی ضروریات سے آگاہ کرے گا اور بانسری بنانے والا ان کے مطابق بانسری بنائے گا۔۔۔۔فن کار اپنی نقل کے موضوعات کے حسن و قبح کے بارے میں نہ تو کوئی علم رکھے اور نہ کوئی درست رائے۔''(۱)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر گھوڑ سوار زین بنانے کا فن جانتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہی فن کار ہوا۔ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ ایک ہی شخص لوہار بھی ہو ،گھوڑ سوار بھی ہو اور مصور بھی ہو۔ اسی طرح کیا بانسری بنانے والے پر کوئی ممانعت ہے ؟ کہ بانسری نہیں بجائے گا۔ وہ تو زیادہ مہارت کے ساتھ بانسری بجا سکتا ہے۔ اسی طرح گھوڑ سوار محض نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو زین بنانے والے لوہار سے اس لیے برتر سمجھتے ہوئے کہ وہ لوہار کو اجرت دیتا ہے۔ خواہ مخواہ ہدایات صادر فرماتا رہتا ہے۔ یوں کرو دوں مت کرو۔ حالانکہ زین بنانے والا بخوبی جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا ہے۔ بلکہ وہ شہسوار کی باتوں کو دل ہی دل میں محسوس بھی کرتا ہے اس مقام پر میں یہ بھی کہوں گا کیا زندگی بنانے والے کے مقابلے میں زندگی گزارنے والا زیادہ جانتا ہے؟ بہر حال فنون لطیفہ کی مخالفت میں افلاطون مزید کہتا ہے کہ:

''مصوری اور بلکہ تمام فنون نقل حقیقت و صداقت سے بہت دور ہوتے ہیں اور ان کا

---

(۱) جمہوریہ افلاطون ، دسویں کتاب۔

اثر ہماری ذات کے اس عنصر پر ہوتا ہے جو بصیرت اور عقل سے عاری ہوتا ہے۔
اور جو کسی صحت مند یا حقیقی مقصد کے لیے کوشاں نہیں ہوتا۔۔۔۔پس فن ایک ادنیٰ
غریب بچہ ہے جو ادنیٰ والدین کے گھر پیدا ہوتا ہے ۔۔۔کیا اس بات کا اطلاق
صرف بصری فن پر ہوتا ہے یا سمعی فن پر بھی ہوتا ہے جسے کہ ہم شاعری کہتے
ہیں؟قدرتی بات ہے کہ اس پر بھی ہوتا ہے''۔(۱)

مجھے ذاتی طور پر تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ فنون لطیفہ حقیقت کی ہمسری ہرگز نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ہو تو ہر فن کار زمین و آسمان تخلیق کرتا پھرے۔ لیکن اگر فن کا اثر ہماری ذات کے اس عنصر پر ہوتا ہے۔جو بصیرت اور عقل سے عاری ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاگلوں کے لیے فن زیادہ سے زیادہ اثر انگیز ہو گا۔لگتا ہے کہ افلاطون حکیم فن کاروں کو ذہنی طور پر دیوالیہ سمجھتا ہے۔ اور یوں فن کو غریب والدین کے گھر پیدا ہونے والا بچہ قرار دیتا ہے۔فن میں بھی یہ طبقاتی درجہ بندی کم از کم افلاطون حکیم کی زبانی زیب نہیں دیتی۔ دراصل یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ نظریہ عالم امثال کے زیر اثر افلاطون ''عالم سفلی'' میں ''یوٹوپیا'' (مثالی ریاست) بنانے کی منصوبہ بندی کرتا ہے ۔ جس میں حکومت کا حقدار وہ صرف فلسفیوں کو سمجھتا ہے۔شاید اسی لیے افلاطون شاعری کی مخالفت میں یہاں تک آگے جاتا ہے کہ:

''اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ہم نے ''ریاست'' سے شاعری کو خارج کر دیا ہے، تو
ہماری دلیل یہ ہو گی کہ عقل کا یہی تقاضا تھا، لیکن کہیں ہم پر بے حسی اور عدم
رواداری کا الزام لگایا جائے تو ہمیں یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ فلسفے اور شاعری میں
پرانا جھگڑا ہے۔'' (۲)

نقالی کے حوالے سے تو شاعری کی مخالفت کی اور بات ہے لیکن شاعری اور فلسفے میں جھگڑے کی وجہ سے شاعر کو یوٹوپیا سے نکال دینا تعصب پر دلالت کرتا ہے۔مگر آج تو صورت حال یہ ہے کہ شاعر اور فلاسفر دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔

افلاطون یہ اعتراف بھی ضرور کرتا ہے کہ شاعری خوش گوار اور دلآویز ہوتی ہے ۔ اگرچہ مفید نہیں ہوتی۔ اگر مفید ہو تو

---

(۱) جمہوریہ افلاطون ۔ دسویں کتاب۔ (۲) ایضاً۔

افلاطون شاعری کو قبول کرنے پر تیار ہے۔ اسے یہ بھی احساس ہے کہ شاعری میں دلکشی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے تو خدشہ محسوس کرتا ہے کہ مبادا کہیں وہ بھی شاعری کی جنوں خیز محبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر زمانے کے لوگوں نے وقتی ضرورتوں کے تحت بھی مختلف نظریات پیش کیے۔ افلاطون سے ذرا پہلے سوفسطائیوں نے فضیلت اور برتری پر اپنے فلسفے اور نظریے کی عمارت کھڑی کی۔ انہوں نے اپنے آپ کو حق بجانب قرار دینے کی خاطر فضیلت و برتری کو نیکی (Vitrue) کا نام دیا۔ لیکن درحقیقت اس برتری سے ان کی مراد ____ جس کی لاٹھی اس کی بھینس تھی۔ بعد میں نطشے نے زبردست کا ٹھینگا سر پر کے مصداق اس نظریے کو پروان چڑھایا۔ کمزور کو دبانے اور اس پر ظلم کرنے کی صورت میں ظالم کو مزہ آتا ہے۔ اسی لیے سوفسطائیوں نے تاریخ فلسفہ میں سب سے پہلے لذتیت (Hedonism) کی طرح ڈالی، جسے بعد میں اپیقورس نے اپیقوریت کی شکل میں آگے بڑھایا۔ اس کے برخلاف افلاطون نے نیکی اور سچائی کا اخلاقی فلسفہ پیش کیا، اس کے نزدیک نیکی اور سچائی حسن کا دوسرا نام ہے یا حسن نیکی اور سچائی ہے۔ نصیر احمد ناصر رقمطراز ہیں:

> ''افلاطون جس دور میں پیدا ہوا وہ یونانی تاریخ میں اخلاقیات کی تعلیم و ترویج کے لیے بہت مشہور ہے۔۔۔۔ چنانچہ افلاطون کے نظام فکر کا منبع بھی اخلاقیات ہی ہے۔ اور اس نے جمالیاتی مسائل کو اخلاقی زاویۂ نگاہ ہی سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ فن اس لیے مذموم اور قابل اعتراز ہے کہ یہ حقیقت سے تین درجے بعید ہے تو یہ فتوٰی دیتے وقت بھی اس کے تحت الشعور میں اخلاقی معیار ہی کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جو شے حقیقی نہیں ہے وہ باطل ہو گی اور باطل شے ظاہر ہے حیاتِ انسانی کے لیے خیر نہیں ہو سکتی، بلکہ شر ہو گی۔ لہٰذا غیر حقیقی فن قابل تحقیر اور سزا وارِ مذمت ہوا۔ یہ دراصل افلاطون کے تصور فن کا سلبی رخ ہے۔ اس نے فن کے اس مسئلے کو ایجابی نقطہ نظر سے بھی دیکھا ہے اور اس طرح اس نے اس نظریے کی داغ بیل ڈالی ہے، جو فن برائے زندگی کے نام سے

مشہور ہے۔" (۱)

نصیر احمد ناصر کی رائے اپنی جگہ لیکن مجھے تو لگتا ہے نیکی اور سچائی کو بھی ہر کوئی اپنے مخصوص مقاصد کے تحت استعمال کرتا تھا۔ افلاطون ایک طرف تو نیکی اور سچائی کی بات کرتا ہے، لیکن دوسری طرف مشترکہ شادیوں کے سلسلے میں قرعہ اندازی کرتے وقت ایک لحاظ سے دھوکہ دہی کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ یہ فعل بھی تو باطل ہی ٹھہرتا ہے۔ بیشک وہ فسطائی نہیں تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ سوفسطائیوں کی طرح وہ بھی اپنے کیے کو درست سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک فلسفی حکمرانی کے لیے موزوں ہیں اس لیے فن کار اور شاعر مطعون ہیں۔ البتہ افادی فن کی بات کرتے ہوئے "فن برائے زندگی" کی داغ بیل ڈالتے ہوئے افلاطون نے جمالیات کو ایک نئے رخ سے آشنا کیا۔ اس نظریے کے ردِعمل کے طور پر "فن برائے فن" کی تحریک نے بھی زور پکڑا لیکن افلاطون کی شروع کردہ تحریک "فن برائے زندگی" کی مقبولیت میں آج تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ "فن برائے فن" کی اصطلاح ہی غیر حقیقی ہے۔ دراصل اس کا مطلب بھی "فن برائے زندگی" ہی ٹھہرتا ہے۔

اصل، نقل، فطرت اور فن کی بحثوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمالیات میں اس مقبول و معروف مکتبہ فکر کا ظہور ہوا جسے "حقیقت" یا "فطریت" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ گویا ہم اس نظریۂ جمال کو تصوریت یا عینیت کا بیٹا بھی کہہ سکتے ہیں۔

نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

> "اس نظریۂ فن کا سب سے بڑا نقیب جان رسکن (John Ruskin) (۱۹۰۰ء۔۱۸۱۹ء)(برطانوی عالم جمالیات) ہو گزرا ہے۔ اس کے نزدیک فقط فطرت ہی فن کا واحد حقیقی نمونہ ہے۔ فنکار چونکہ اس فطری نمونے سے اعلیٰ کوئی شے نہیں بنا سکتا، اس لیے جو بھی فنی تخلیق اس سے جس قدر مختلف ہوگی اسی نسبت سے وہ ناقص اور باطل ہوگی۔ لہٰذا فن کا اگر کوئی نصب العین ہو سکتا ہے تو وہ فقط فطرت ہی ہے۔ حسن و کمال کا بے مثال شاہکار۔ (۲)

نظریۂ فطریت کے ردِعمل میں فن کا فطرت سے اعلیٰ ہونے کا نظریہ معرضِ وجود میں آیا لہٰذا عہدِ حاضر میں علامہ اقبال اس نظریے کے حامی و علمبردار ہیں کہ وہ فن اور فنکار سے توقع رکھتے ہیں کہ اسے فطرت پر بازی لے جانی

---

(۱) تاریخ جمالیات۔ جلد اول۔ ۷۹۔۸۰۔ نصیر احمد ناصر۔

(۲) تاریخ جمالیات، جلد اول۔ ۸۷۔ نصیر احمد ناصر۔

چاہیے۔میرے تجزیے کے مطابق اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ افلاطونی ''تصورات'' نے نظریہ فطریت کے لیے راہ ہموار کی۔جس کے زیرِ اثر فن کو فطرت کا مقلد اور غلام بنانے کی کوشش کی گئی جبکہ اقبال ہر قسم کی غلامی اور قید کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ اقبال بالواسطہ طور پر افلاطون کو نظریہ فطریت کا بانی اور ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اس لیے افلاطون کی مخالفت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اقبال عملی طور پر ثابت کر دکھاتے ہیں کہ فن کا مطمح نظر اگر تعمیر انسانیت و احترامِ آدمیت ہو تو فن و فن کار رسالت و نبوت کے پیغمبرانہ مقاصد کا امانت دار اور علمبردار ہوتا ہے۔

شعررا مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارث پیغمبری است

بے شک یہ وہ عظیم المرتبت فن ہے جو اپنے اعلیٰ و ارفع نصب العین کے طفیل ہر لحاظ سے فطرت پر حاوی دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال اس نظریے (فطریت) کی شدید مخالفت کرتے ہیں، جس کی رو سے فن کو فطرت کا ادنیٰ غلام سمجھا جاتا ہے اور اس (فن) کا حسن و کمال نقالیِ فطرت میں مضمر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ اس نظریۂ فن کے نقیب ہیں جو فن کو فطرت سے زیادہ شاندار سمجھتے ہوئے اسے فطرت پر فوقیت دیتا ہے۔ یہی حال ارسطو کا بھی ہے۔ وہ فن کو فطرت سے افضل خیال کرتا ہے۔

''افلاطون کے برعکس ارسطو فطرت کو کم درجے کا فن تصور کرتا ہے اور انسانی فن کو اس سے ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہے۔ کیونکہ موخر الذکر فطرت کی فنی خامیوں کو دور کر دیتا ہے۔''(۱)

اقبال اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اس دشتِ جگر تاب کی خاموش فضا میں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر
اہرام کی عظمت سے نگونسار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر؟

---

(۱) تاریخ جمالیات ۔ جلد اول ۔۱۰۲۔ نصیر احمد ناصر۔

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر؟ (۱)

اقبال فطرت کی کرشمہ سازی اور ذوق جمال کے بھی معترف ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر فن کار کو احساسِ بیداری و ذمہ داری بھی عطا کرتے ہیں۔

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت ۔۔۔ جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

فطریت کے خلاف اپنے ردِ عمل کو درست ثابت کرنے کی خاطر علامہ اقبال فطرت اور انسان کے فن کا تقابل اثر انگیز انداز میں کرتے ہیں:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم ۔۔۔ سفال آفریدی ایاغ آ فریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی ۔۔۔ خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم ۔۔۔ من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہ تو ہوا فن کا اصلی و حقیقی اور افادی مقصد، لیکن اگر فن کو منفی و تخریبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ فن اقبال کے نزدیک فطرت پر فوقیت نہیں رکھتا۔ ایسے فن کے مقابلے میں فطرت ہی اعلیٰ و ارفع ہے۔ ایسے ضرر رساں فن کے خلاف اقبال فطرت ہی کی زبانی اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال فطرت سے کمتر فن کی مذمت کرتے ہوئے اسے گھٹیا سمجھتے ہیں۔

جہاں را از یک آب و گل آفریدم ۔۔۔ تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم ۔۔۔ تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را ۔۔۔ قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را (۲)

افلاطون تصوریت کے زیرِ اثر نفیٔ خودی کا درس بھی دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں فن کار نہ صرف فطرت بلکہ معمولی سی للکار کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس اقبال کے نزدیک وہی فن کار بہترین ہنر مند ہے، جس کا فن ایک آفاقی معیار کی حیثیت سے وضع ہوتا ہے۔ ایسے ہی فن کی جمالیاتی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

---

(۱) ضرب کلیم۔ ص۔ ۱۱۵۔ (۲) کلیاتِ اقبال فارسی۔ پیام مشرق۔ ۱۱۴۔

آں ہنر مندے کہ بر فطرت فزود　　رازِ خود را بر نگاہِ ما کشود
گرچہ بحر او ندارد احتیاج　　می رسد از جوئے ما او را خراج
چیں رباید از بساطِ روزگار　　ہر نگار از دست او گیرد عیار
حورِ او از حورِ جنت خوشتر است　　منکرِ لات و مناتش کافر است (۱)

فطریت کے ردِعمل کے طور پر اقبال کے فوق الفطرت نظریہ فن سے یہ چند مثالیں کافی ہیں۔ جو افلاطون سے اختلافات کی ایک کڑی ہے۔ اقبال کے اس نظریہ فن سے متعلق سیر حاصل بحث اقبال کے نظریہ فن کے باب میں ہو گی۔ بہرحال افلاطون کی مخالفت کا ایک اور سب سے بڑا سبب نظریہ تصوریت ہے جو افلاطون کو سقراط سے استادی شاگردی کے ورثے میں ملا۔ اور جس کی رو سے: ''تصوریت'' یا ''صور'' ہی درحقیقت موجود ہیں۔ مادّی دنیا و مافیہا کا کوئی وجود نہیں'' (۲)

اس نظریے کے زیرِ اثر نفئ خودی کا پرچار ہونے لگا اور اقبال نفئ خودی کی تعلیم کے خلاف کس طرح خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ ان کے افکار کا نچوڑ ہی خودی ہے۔ جس کے مطابق استحکامِ خودی میں قوموں کا عروج و استحکام مضمر ہے، جبکہ نفئ خودی قوموں کی داستانِ زوال بن جاتی ہے۔ علامہ اقبال کو مسلمانوں کے عروج و زوال میں ہو بہو یہی بات دکھائی دی۔ جب تک ان کی خودی مستحکم تھی عظمت و سطوت ان کے پاؤں چومتی رہی اور جب ان کی خودی کمزور پڑ گئی تو بحیثیت قوم وہ بھی کمزور پڑ گئے۔ علامہ اقبال نے جب مسلمانوں کی حالت زار پر غور کیا تو:

''ان کو معلوم ہوا کہ نفئ خودی کی بنیاد نظریۂ وحدت الوجود ہے، جو نو افلاطونیت کے ذریعے سے اسلام میں داخل ہوا اور جس کی اصل افلاطون یونانی کا فلسفہ ہے۔'' (۳)

گویا کہ فطریت کی طرح وحدت الوجود کی کڑیاں بھی افلاطون سے جا کر ملتی ہیں۔ فلاطینوس افلاطون کا زبردست حامی و مداح تھا۔ اس نے افلاطونی تعلیمات کو ''نو افلاطونیت'' کی صورت میں پیش کیا، جس کے زیرِ اثر شیخ الکبیر ابنِ عربی اندلسی نے وحدت الوجود کا پرچار کیا۔ اس کے بعد فخر الدین عراقی ہمدانی اور خواجہ حافظ شیرازی نے بھی شاعرانہ جادو بیانی سے مسلمانوں پر سکر کی حالت طاری کر دی۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اس نظریے کے بانی افلاطون حکیم کے ساتھ ساتھ ابن عربی و خواجہ حافظ شیرازی پر بھی کڑی تنقید کی۔ مثلاً اقبال کہتے ہیں کہ:

---

(۱) کلیات اقبال فارسی۔ زبورِ عجم۔ ۱۸۸۔ نقشِ مصوری۔　　(۲) مختصر تاریخ فلسفہ یونان۔ ۱۱۸۔ یقسل۔

(۳) اسلامی تصوف اور اقبال۔ ۲۴۲۔ ڈاکٹر ابوسعید نورالدین۔

'' یہی افلاطونیتِ جدیدہ جس کا اشارہ میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے فلسفۂ افلاطون کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے، جس کو (اس کے) اس پیرو(Plotinus) نے مذہب کی صورت میں پیش کیا۔۔۔مسلمانوں میں یہ مذہب حران کے عیسائیوں کے تراجم کے ذریعے پھیلا اور رفتہ رفتہ مذہب اسلام کا ایک جزو بن گیا۔ میرے نزدیک یہ قطعاً غیر اسلامی ہے، اور قرآن کریم کے فلسفہ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ تصوف کی عمارت اسی یونانی بیہودگی پر تعمیر کی گئی ہے۔''(۱)

پھر ابنِ عربی نے وحدت الوجود کے اس نظریے کو اسلامی تعلیمات کا لازمی جزو سمجھتے ہوئے اپنے زورِ قلم اور اثر انگیز خطابت کے بل بوتے پر خوب پروان چڑھایا۔ چنانچہ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

'' اسی نقطہء خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی نے قرآن شریف کی تفسیر کی، جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم وفضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ ''وحدت الوجود'' کو، جس کے وہ انتھک مفسر تھے، اسلامی تخیل کا ایک لا ینفک عنصر بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانی (م ۶۹۷ھ۔۱۲۶۸ء) اور فخر الدین عراقی (م۶۸۶ھ۔۱۲۸۷ء) ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔''(۲)

لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اقبال تصوف کے خلاف ہیں بلکہ وہ تصوف کے انتہائی قائل و معترف ہیں۔ چنانچہ مولانا اسلم جیراج پوری کو لکھتے ہیں:

''تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے، (اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے ۔۔۔۔اور نظامِ عالم کے حقائق اور ذاتِ باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے، تو میری روح اس کے خلاف

---

(۱) مکاتیب اقبال ۔ بنام محمد نیاز الدین خان ۔ص ا۔

(۲) دیباچہ ''اسرار خودی''، مشمولہ مضامین اقبال۔۵۰۔

بغاوت کرتی ہے۔" (۱)

نظریۂ وحدت الوجود کے مطابق جب یہ یقین عام ہو گیا کہ دنیا و عالم محسوسات بالکل ہیچ ہے تو نتیجتاً ترکِ دنیا، ترکِ عمل اور راہبانہ رجحانات کے زیرِ اثر نفئ خودی کی وبا پھیل گئی۔ ایسے میں علامہ اقبال نے جب یہ قیامت خیز منظر دیکھا:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے (۲)

تو کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا کرنے کے علاوہ ممولے کو شہباز سے لڑانے کی تیاری بھی کرنے لگے۔

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے لڑا دے ممولے کو شہباز سے (۳)

یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک:

"فن کا مقصد اولیں زندگی یا حرکت وعمل ہوا۔ لہٰذا فلسفہ ہو یا فن اگر حرکت وعمل کا دشمن ہے تو وہ فسوں وسحر کاری ہے اور اس لیے ناجائز و ناروا ہے۔ اپنے اس نظریے کی بناء پر علامہ اقبال نے افلاطون کے فلسفے پر سخت تنقید کی ہے۔ جو ان کے نزدیک جمود وتعطل کا پیامبر ہے۔ ---علامہ نے اس کے فلسفے کو جمود و تعطل کا پیام سمجھتے ہوئے اپنے تیرِ ملامت کا حدف بنایا ہے۔" (۴)

جب شاہین بچہ قفس کے اندر دانہ کھانے پر مطمئن ہو جاتا ہے تو اس کا بدن چڑیا کے پر کے سائے سے بھی لرزنے لگتا ہے۔

چوں شاہیں زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد تنش از سایۂ بالِ تدروے لرزہ می سازد (۵)

اس راہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں (۶)

ہر اک مقام سے آگے نکل گیا مہ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو (۷)

---

(۱) مکاتیب اقبال۔ حصہ اول۔ ۵۳۔۵۴۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۱۴۴۔ ساقی نامہ (۳) بالِ جبریل۔ ۱۴۳۔ ساقی نامہ۔

(۴) اقبال اور جمالیات۔ ۳۰۶۔ ۳۲۵۔ نصیر احمد (۵) پیامِ مشرق۔ ۱۳۵۔ (۶) بانگ درا۔ ۱۱۹۔ "چاند اور تارے" (۷) بال جبریل۔ ۴۳۔

خاک ماخیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرّہ ناچیزے و تعمیرے بیابانے نگر! (۱)

کفِ خاک برگ و سازم برہے بفشانم اورا
باامیدِ ایں کہ روزے بفلک رسانم اورا (۲)

اقبال اس قدر انقلابی وسیلابی واقع ہوئے ہیں کہ افلاطون کا جمود و تعطل اس سیلاب کے سامنے:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب (۳)

ایک پرکاہ کے برابر بھی نہیں۔ وہ زمین سے لے کر آسمان تک جادہ پیائی کرتے چلے جاتے ہیں۔

زخاک تابہ فلک ہرچہ ہست راہ پیاست — قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است (۴)

کائنات کی ہر چیز حرکت میں ہے۔ ہمیں بھی جلدی جلدی قدم اٹھانے چاہیں تا کہ اس قافلے سے پیچھے نہ رہ جائیں۔

امیر قافلہ سخت کوش و پیہم کوش — کہ در قبیلہ ما حیدری زکرّاری است (۵)

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز — کاشانۂ ما رفت بتاراج غماں خیز
از نالہ مرغ چمن، از بانگِ اذاں خیز — از گرمئ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خواب گراں خیز (۶)

دل دریا سکوں بیگانہ از تست — بجنبش گوہر یک دانہ از تست
توائے موجِ اضطراب خود نگہدار — کہ دریا را متاعِ خانہ از تست (۷)

اقبال کے نزدیک زندگی و تابندگی افلاطونی بے عملی و کاہلی میں نہیں بلکہ حرکت و عمل اور مسلسل روانی میں حسن حیات پوشیدہ ہے۔

زندگی جولاں میانِ کوہ ودشت — اے خنک موجے کہ از ساحل گزشت (۸)

---

(۱) زبورِ عجم۔۱۳۲۔ (۲) زبورِ عجم۔۹۴۔ (۳) بالِ جبریل۔۱۰۰۔ مسجد قرطبہ۔ (۴) پیام مشرق۔۲۷۰۔
(۵) زبورِ عجم۔۱۵۴ (۶) زبورِ عجم۔۱۶۴۔ (۷) ارمغانِ حجاز۔۲۱۸۔ (۸) جاوید نامہ۔۱۲۶۔

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی (۱)

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم (۲)

اسی لیے تو اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ:

چو موج سازِ وجودم زسیل بے پرواست گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم (۳)

جمود و تعطل کے صیدِ زبوں کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں (۴)

رمز حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی
در قلزم آرمیدن ننگ است آبجو را (۵)

اقبال جانفشانی اور سخت کوشی کا پیغام دیتے ہیں تا کہ بے عملی کا احتمال ہی نہ رہے اس لیے وہ تن آسانی اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھ رہنے کے سخت خلاف ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ باز جب ممولے کے شکار کا عادی ہو جائے تو وہ اپنے شکار سے بھی زیادہ عاجز و خوار ہو جاتا ہے۔

باز چوں با صعوہ خو گری شود از شکارِ خود زبوں تر می شود (۶)

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ (۷)

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کر گسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی (۸)

---

(۱) بالِ جبریل ۔۱۲۲۔ (۲) پیامِ مشرق ۔۱۲۸۔ (۳) پیامِ مشرق ۔۱۲۸۔ (۴) ضربِ کلیم ۔۸۲۔
(۵) پیامِ مشرق ۔۱۵۳۔ (۶) اسرار و رموز ۔۱۲۷۔ (۷) بالِ جبریل ۔۱۱۶۔ (۸) بالِ جبریل ۔۱۷۔ غزل ۔

اور پھر ویسے بھی:

بحکم مفتیٔ اعظم کہ فطرتِ ازلیست "بدین صعوہ حرام است کارِ شہبازی
ہماں فقیہہ ازل گفت جرہ شاہیں را آسماں گردی بازمیں نہ پردازی (۱)

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام ترا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں (۲)

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا پُردم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ افتاد (۳)

افلاطون کی نظر موت پر رہتی ہے، بالواسطہ طور سے جمود و تعطل اور نظریہ اعیان اقوامِ عالم کو مرگِ دوام کی طرف لے جاتے ہیں۔ اسی لیے اقبال افلاطون کے برخلاف اپنا ردِعمل یوں ظاہر کرتے ہیں۔

غبارِ گشتۂ؟ آسودہ نتواں زیستن اینجا بہ بادِ صبح دم درپیچ و منشیں بر سرِ راہے
زجوئے کہکشاں بگذر، زنیلِ آسماں بگذر ز منزل دل بمیرد گرچہ باشد منزلِ ماہے
اگر زاں برقِ بے پروا درونِ او تہی گردد بچشمِ کوہ سینا می نیرزد با پرِ کاہے (۴)

لہٰذا موج کی طرح اٹھ اور سمندر سے مسلسل کشمکش جاری رکھ۔ تو ساحل کی تلاش میں ہے بے خبر! ساحل کہاں؟ ایک ہی جھپٹ میں زمانے کو دبوچ لے، اگر تو دیروزود سے نکل جائے تو پھر زمانہ کہاں؟

چوں موج خیز و بہ یم جاویدانہ می آویز کرانہ می طلبی بے خبر کرانہ کجاست!
بیک نوردفرو پیچ روز گاراں را زدیرو زود گذشتی دگر زمانہ کجاست! (۵)

اقبال حرکت وعمل کے اس قدر جویا وشیدائی ہیں کہ انہیں ساری کائنات تنگ وتاز کرتی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:۔

زندگیء رہرواں در تگ و تاز است و بس قافلہء موج را جادہ و منزل کجاست (۶)

پھر کہتے ہیں:۔

تورہ نوردشوق ہے؟ منزل نہ کر قبول! لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں! محفل گداز! گرمیء محفل نہ کر قبول! (۷)

---

(۱) ارمغان حجاز (اردو) ۔۴۴۔ (۲) بال جبریل ۔۶۱۔ (۳) ضرب کلیم ۔۷۲۔ (۴) زبور عجم ۔۲۰۲۔
(۵) زبور عجم ۔۷۸۔ (۶) پیام مشرق ۔۱۷۱۔ (۷) ضرب کلیم ۷۲۔۷۳۔ "سلطان ٹیپو کی وصیت"۔

تپش ہی زندگی ہے ۔ تپش ہی جاودانی ہے ۔ خدا کرے کہ میرے بدن کا ہر ذرہ دل بیقرار بن جائے ۔ نہ اسے راستے میں قرار آتا ہے ۔ نہ یہ کسی منزل پر ٹھہرتا ہے ۔ میرا دل ، میرا مسافر ، اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہو۔

تپش است زندگانی ، تپش است جاودانی ۔۔۔ ہمہ ذرہ ہائے خاکم دل بیقرار بادا
نہ بہ جادۂ قرارش ، نہ بہ منزلے مقامش ۔۔۔ دل من مسافر من کہ خداش یار بادا (۱)

خدا کرے تیری جان کو ایک لمحہ کا قرار نصیب نہ ہو اور تو زندگی کی تب و تاب سے آشنا ہو جائے ۔

نشود نصیب جانت کہ دمے قرار گیرد ۔۔۔ تب و تاب زندگانی بتو آشکار بادا (۲)

یہ بہانہ کر کے دشت طلب میں نہ بیٹھ رہ کہ ہمارے زمانے میں کوئی ایسا شخص نہیں جو آشنائے راہ ہو ۔ اٹھ اور خود ہی راستہ تلاش کر تو خود ہی راہ رو ہے ، راہ بھی ہے ۔ راہنما بھی ہے ۔ اور منزل بھی ہے ۔ تو اپنے وقت کے بارے میں کیوں غافل بیٹھا ہوا ہے ۔ اٹھ اور ایسا زمان پالے جس کا حساب ماہ و سال سے بے نیاز ہے اس پرانی سرائے عافیت کی آرزو رکھتا ہے ۔ کیا زندگی کی کش مکش پر تیری نگاہ نہیں ؟

بہ ایں بہانہ بدشت طلب زپا منشیں ۔۔۔ کہ در زمانہ ء ما آشنائے راہے نیست
زوقتِ خویش چہ غافل نشستہ دریاب ۔۔۔ زمانہ ء کہ حسابش زسال و ماہے نیست
دریں رباط کہن چشم عافیت داری ۔۔۔ ترا بکشمکش زندگی نگاہے نیست (۳)

وہ بہشت جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا کی سب ہیچ ہے ۔ ہاں جنت اگر تیرے عمل کی جزا ہے ۔ تو ضرور کوئی چیز ہے ۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ ۔۔۔ تا جزائے عمل تست جناں چیزے ہست (۴)

گویا کہ:۔

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی ۔۔۔ ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی
تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ ۔۔۔ جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی!
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ ۔۔۔ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی!
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے ۔۔۔ گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

---

(۱) پیام مشرق ۱۷۹۔ (۲) پیام مشرق ۱۸۰۔ (۳) ایضاً ۱۸۲۔ (۴) جاوید نامہ ۴۷۔

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب — اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا ایک انبار تو

پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو!

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار — تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب — تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے

سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر — رات کے تاروں میں اپنے راز داں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے

پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے (۱)

مجھے ایک پیر مرد کی دو نصیحتیں یاد ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی جان ہی سے زندہ رہا جا سکتا ہے۔ دوسری یہ کہ اس بے ہمت انسان سے دور رہ، جس نے اپنی جان گروی رکھ دی۔ اور صرف تن کی زیبائش و پرورش کے لئے زندہ رہا۔

ز پیرے یاد دارم ایں دواندرز — نباید جز بجان خویشتن زیست

گریز از پیش آں مرد فرو دست — کہ جان خود گرو کرد و بہ تن زیست! (۲)

موج بیقرار نے ساحل سے کہا۔ میں کسی فرعون سے اپنی ہمت آزماتی ہوں۔ کبھی سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتی ہوں۔ اور کبھی ذوق انتظار میں رقص کرتی ہوں۔

بساحل گفت موج بیقرارے — بفرعون کنم خود را عیارے

گہے برخویش می پیچم چو مارے — گہے رقصم بہ ذوق انتظارے! (۳)

علامہ اقبال حرکت و عمل کے ایسے زبردست داعی ہیں۔ کہ اگر انہیں پیغمبر حرکت و عمل کا خطاب دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ زندہ انسانوں کو اقبال مردوں کی طرح بے عمل اور بے حس دیکھ کر پیچ و تاب کھانے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہاتھ

---

(۱) بانگ درا ۲۵۸۔۲۵۹۔۲۶۰۔ خضر راہ۔ (۲) ارمغان حجاز ۱۴۱۔ (۳) ایضاً

پر ہاتھ دھرے منتظر فردا مسلمانوں کی سستی و کاہلی اور بے عملی پر انتہائی کاٹ دار طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک بہشت پاکان حرم ، یعنی برگزیدہ ہستیوں اور روحانی لوگوں کے لئے ہے ۔ ایک بہشت اہل ہمت مجاہدین کے لئے ہے ۔ ہندی مسلمان سے کہو، تو بھی خوش ہو جا ، ایک بہشت فی سبیل اللہ ، کچھ نہ کرنے والوں کے لئے بھی ہے ۔

بہشتے بہر پاکان حرم ہست　　بہشتے بہر ارباب ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش　　بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست　　(۱)

ایسا طنز اقبال اس لئے کرتے ہیں کہ فطرت کی ہر چیز محوحرکت وعمل ہے ۔ جمود میں موت ہے ۔

جھپٹنا، پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا　　لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ　　(۲)

اور :۔

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر　　وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں　　(۳)

تڑپنے پھڑکنے ، دل مرتضی اور سوز صدیق کے بغیر بات نہیں بنتی ۔ اس لئے کہ اقبال کے مطابق :۔

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں　　جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ　　(۴)

علاوہ ازیں اسی سلسلے میں مزید کہتے ہیں کہ تو نے بہت فغاں کی مگر تیری تقدیر وہی رہی جو تھی ۔ تو اس کے حلقہ زنجیر کو نہ توڑ سکا۔لیکن اس کے باوجود ناامید نہ ہو ایک بار پھر کوشش کر ۔ جل بجھا؟ داغ جگر سے ایک شرر اور لے ، ذرا اپنے آپ کو سنبھال اور سارے نیستاں پر چھا جا ۔ شعلہ بن کر ایک بار پھر خاشاک کو جلا دے ۔

نالیدی و تقدیر ہمان است کہ بود است　　آں حلقہ زنجیر ہمان است کہ بود است
نو مید مشو! نالہ کشیدن دگر آموز!
وا سوختہء یک شرر از داغ جگر گیر!　　یک چند بخود پیچ و نیستاں ہمہ درگیر!
چوں شعلہ بخاشاک دویدن دگر آموز!　　(۵)

اقبال حرکت مسلسل اور جدوجہد کے اس قدر پیغامبر ہیں کہ ان کے مطابق اگر تو غبار بھی ہو چکا ہے تو آرام سے نہ

---

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۱۴۶۔　(۲) بال جبریل ۱۶۵ "شاہین"　(۳) بال جبریل ۱۲۱۔
(۴) بال جبریل ۱۳۳۔　(۵) زبور عجم ۸۰۔

بیٹھ ۔ سر راہ نہ پڑا رہ بلکہ بادِ سحر سے مل جا ۔ جوئے کہکشاں سے بھی گزر جا ۔ نیلگوں آسمان سے بھی گذر جا منزل دل کی موت ہے خواہ وہ چاند ہی کی منزل کیوں نہ ہو۔ انسان اس قدر متحرک ہے کہ فرشتوں کو اب سجدوں کی فرصت کہاں ۔ وہ تو خاکیوں کی تگ و تاز کے نظارے میں محو ہیں ۔

غبارے گشتہ ؟ آسوہ نتواں زیستن اینجا — بہ بادِ صبحدم در پیچ و منشیں برسرراہے

زجوئے کہکشاں بگذر ، زنیل آسماں بگذر — زمنزل دل بمیرد گرچہ باشد منزل ماہے (۱)

فرشتہ را دگر آں فرصت سجود کجاست — کہ نوریاں بتماشائے خاکیاں مستند! (۲)

یعنی کہ :۔

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی

تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ! (۳)

میں روز اول ہی سے موج و گرداب کا جویا ہوں اگر میرا بحر حیات پر سکون ہو جائے تو میں خود طوفان کو آواز دیتا ہوں ۔

من از صبح نخستیں نقشبند موج و گردابم — چو بحر آسودہ میگردد زطوفاں چارہ برگیرم (۴)

تو بچوں کی طرح درختوں کے نیچے کھڑا آشیانوں کو دیکھ رہا ہے ۔ درخت کے نیچے سے نکل پرواز میں آ مہر و مہ کو بھی شکار کیا جا سکتا ہے ۔

تو در زیر درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بینی — بہ پرواز آ کہ صید مہر و ماہے می تواں کردن (۵)

آدم خاکی کی شان نت نئے کاموں سے ہے ۔ اس کے برعکس مہ و ستارہ وہی کرتے ہیں ۔ جو پہلے سے کرتے آ رہے ہیں۔

فروغ آدم زتازہ کاری ہاست — مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند (۶)

اقبال حرکت و عمل اور جانفشانی کے اس حد تک معتقد ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تجھے اپنے باپ کی میراث میں لعل مل جائے تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں ۔ اپنے ہاتھ کی محنت شاقہ کے ذریعے پتھر سے لعل نکالنے میں جو لطف ہے وہ اور ہے۔

پشیماں شو اگر لعلے زمیراث پدر خواہی — کجا عیش بروں آوردن لعلے کہ درسنگ است (۷)

شیشے کو پگھلانا شرم کی بات ہے ۔ البتہ پتھر کو پگھلانا کچھ کام ہے ۔

---

(۱) زبور عجم ۱۰۰۔ (۲) ایضاً ۱۰۹۔ (۳) بال جبریل ۲۳۔ (۴) زبور عجم ۱۰۱ ۔ (۵) ایضاً ۱۰۶۔ (۶) زبور عجم ۱۲۶ (۷) ایضاً ۔ ۱۲۹۔

شیشہ را بگداختن عارے بود سنگ را بگداختن کارے بود! (۱)

اقبال عزم و ہمت اور نگاہ بلند کے اس قدر حامی و پیامبر ہیں کہ نیا زمانہ و نئے صبح و شام پیدا کرنے کے ساتھ اپنے لئے تخت و تاج فراہم کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔

برہنہ سر ہے ،تو عزم بلند پیدا کر یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ! (۲)

فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں حریری! (۳)

ہماری لغزشیں بھی ایک لذت رکھتی ہیں ۔ میں خوش ہوں کہ منزل دور ہے اور راہ پیچ در پیچ۔ جس میں خوش قسمتی سے بھٹکنے اور مشکلات و مصائب کے امکانات بہت ہیں۔

غلط خرامیء ما نیز لذتے دارد خوشم کہ منزل ما دور ورہ خم بہ خم است (۴)

وہ جب دیکھتے ہیں کہ اس ساری بے عملی اور جمود کا منبع افلاطون کا نظریۂ تصورات ہے تو اس کی مخالفت میں سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے افلاطون کو گوسفند اور اس کے نظریے کو گوسفندی کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں ''افلاطون کے نظریہ اعیان (Theory of Ideas) کو اقبال نے اقوام کے حق میں سمِ قاتل خیال کیا ہے اور اس کی انہوں نے قدم قدم پر تردید اور تغلیظ کی ہے۔'' (۵)

اس ضمن میں اقبال نے ''اسرارِ خودی'' میں شیر اور گوسفند کے حوالے سے ایک منظوم حکایت تحریر کی ہے۔ جس میں گوسفند نے شیر کو نہایت لطیف پیرائے میں نفئ خودی کی ترغیب دی۔ اس طرح اقبال یہ ثابت کرتے ہیں کہ افلاطون نے بھی ہمارے سامنے اپنا نظریۂ تصورات پیش کر کے مسلکِ گوسفندی ہی اپنایا ہے۔ لہٰذا ''از تخیلاتِ او اعتراز واجب است'' اس کے تخیلات سے اعتراز واجب ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> '' اشیائے عالم کو محض عارضی ثابت کر کے افلاطون نے ایک ایسے نظام فکر کی بنیاد رکھی، جس پر ایک پورا ہوائی قلعہ تعمیر ہو گیا اور آگے چل کر یورپ اور ایشیاء کے مفکرین نے جن میں صوفیا بھی شامل ہیں، اسی کو اپنی فکر کی بنیاد قرار دیا۔ یہی وہ فلاطونیت ہے جس کی تردید اقبال نے مثنوی اسرارِ خودی میں کی ہے۔''(۶)

---

(۱) جاوید نامہ ۔ ۱۳۸۔ (۲) بال جبریل ۴۶۔ (۳) ضرب کلیم ۱۷۴۔ (۴) زبورِ عجم ۸۸۔

(۵) اقبال اور مغربی مفکرین ۔۴۴۔ جگن ناتھ آزاد۔ (۶) اقبال اور مسلکِ تصوف (یونانی ماخذ) ص ۸۶۔

راہب دیرینہ افلاطوں حکیم　　از گروہِ گوسفندانِ قدیم

رخشِ او در ظلمتِ معقول گم　　در کہستانِ وجود افگندہ سم

آنچناں افسونِ نا محسوس خورد　　اعتبار از دست و چشم و گوش برد

گفت سرِ زندگی در مردن است　　شمع را صد جلوہ از افسردن است

بر تخیلہائے ما فرماں رواست　　جامِ او خواب آور و گیتی رباست

گوسفندے در لباسِ آدم است　　حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است

عقل خود را بر سرِ گردوں رساند　　عالمِ اسباب را افسانہ خواند

کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات　　قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت　　حکمتِ او بود را نا بود گفت

فطرتش خوابیدو خوابے آفرید　　چشمِ ہوشِ او سرابے آفرید

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود　　جانِ او وارفتۂ معدوم بود

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت　　خالقِ ''اعیانِ'' نا مشہود گشت

زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است　　مردہ دل را عالمِ اعیان خوش است

آہویش بے بہرہ از لطفِ خرام　　لذتِ رفتار بر کبکش حرام

شبنمش از طاقتِ رم بے نصیب　　طائرش را سینہ از دم بے نصیب

ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش　　از طپیدن بے خبر پروانہ اش

راہبِ ما چارہ غیر از رم نداشت　　طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت

دل بسوزِ شعلۂ افسردہ بست　　نقشِ آں دنیائے افیوں خوردہ بست

از نشیمن سوئے گردوں پر کشود　　باز سوئے آشیاں نامد فرود

درخمِ گردوں خیالِ او گم است　　من ندانم دُردیا خشتِ خم است

قومہا از سکر او مسموم گشت
خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت (۱)

حکیم افلاطون جو زمانہ قدیم کا ایک راہب ہے، اپنے وقت کی بھیڑوں کے گروہ میں سے تھا۔ اس کا گھوڑا فلسفے کی تاریکی میں بھٹک گیا ہے اور ہستی و موجودات کے کوہستان میں مجبور و بے بس کھڑا ہے۔ وہ قیاسی علم کے سحر سے مسحور ہوا کہ ہاتھ، آنکھ اور کان پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا۔ کہنے لگا زندگی کا راز مر جانے میں ہے۔ شمع کے بجھ جانے سے سینکڑوں جلوے پیدا ہوتے ہیں۔ افلاطون ہمارے افکار و اعصاب پر سوار ہے، حکمران ہے۔ حالانکہ اس کا جام و پیغام خواب آور ہے اور نفیٔ دنیا کی دعوت دیتا ہے۔ انسان کے روپ ولباس میں وہ ایک بھیڑ ہے لیکن صوفی کے تخیل پر مسلط ہے۔ اس نے اپنی عقل کو بہت کچھ سمجھا اور عالم اسباب کو محض افسانہ بتایا اس کا کام حیات کے اجزاء کو ناپید کرنا ہے۔ وہ زندگی کے سروِ جمیل کی شاخیں کاٹتا ہے۔ فکرِ افلاطون نے انسان کے نقصان کو اس کا فائدہ قرار دیا۔ اس کے فلسفے کی رو سے موجود ناموجود ہے۔ اس کی فطرت خوابیدہ ہوگئی اور اس نے خواب آور دنیا تخلیق کی۔ اس کی آنکھ نے سوتے میں سراب پیدا کیا۔ چونکہ وہ ذوقِ عمل سے محروم تھا۔ اس لیے اس کی جان عدم کی والہ وشیدا تھی۔ وہ ہنگامۂ ہستی سے انکاری ہوا، اور وہ اعیان پیدا کیے جن کا خارج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جو کوئی زندہ ہے اس کے لیے تو عالمِ امکان و عالمِ موجودات بہتر ہے۔ البتہ مردہ دل کے لیے عالم اعیان و عالم امثال کا تخیلاتی سراب خوب ہے۔ افلاطون کا ہرن لطفِ خرام سے نابلد اور اس کا چکور لذتِ رفتار سے محروم ہے۔ اس کی شبنم پرواز سے بے نصیب ہے۔ اس کے پرندے کے سینے میں نغمہ آرائی کا دم نہیں۔ جبکہ ادھر صورت حال یہ ہے کہ:

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک (۲)

نہ اٹھا جذبہ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو (۳)

دے ولولہ شوق جسے لذتِ پرواز کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج (۴)
ہوتا ہے مگر محنت پرواز سے روشن یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے! (۵)

---

(۱) اسرار خودی۔ ۳۲، ۳۳، ۳۴ اقبال (۲) بانگِ درا۔ ۱۷۰۔ شکوہ۔ اقبال۔ (۳) بانگِ درا۔ ۷۴۔ تصویر درد۔
(۴) ضرب کلیم۔ ۱۷۔ "معراج"۔ (۵) ضرب کلیم۔ ۱۱۹۔

اس کے دانے میں ذوقِ نمو نہیں اور اس کا پروانہ تڑپ سے ناآشنا ہے۔ اس راہب کے لیے بغیر فرار کے کوئی چارہ نہ تھا وہ اس دنیا میں ہنگامے کی سکت نہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنے آشیانے سے سوئے فلک پرواز کی، لیکن پھر اپنے نشیمن یعنی دنیائے عمل کی طرف نہ آیا۔ اس کا نظریہ آسمان کی پہنائیوں میں گم ہو چکا ہے، میں نہیں جانتا کہ اس کے پاس تلچھٹ ہے یا خم کے سر پر رکھی ہوئی اینٹ ہے۔ اس کی مستی سے قومیں زہر آلود ہو گئیں اور خوابِ خرگوش میں ذوقِ عمل سے محروم ہو کر بے عملی کا شکار ہو گئیں۔ جبکہ علامہ اقبال کے ہاں:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ (۱)

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ (۲)

اقبال ذوقِ عمل اور جدو جہد کا پیغام دیتے ہیں۔ کہ اسی میں بقائے دوام ہے۔ عمل اور جہد مسلسل کے لیے امید کی شعاع کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ خدا کرے اس پختہ کار کے قبیلے میں اضافہ ہو جس نے کہا کہ جلوۂ اُمید زندگی کے راستے کا چراغ ہے۔

فزوں قبیلۂ آں پختہ کار باد کہ گفت   چراغِ راہ حیات است جلوۂ اُمید (۳)

اقبال کہتے ہیں کہ کارزارِ حیات میں نہنگوں کے شکار اور انہیں قید کرنے کی بات کر، یہ مت کہہ کہ ہماری کشتی دریا سے روشناس نہیں۔ میں اس مسافر کی ہمت کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں جس نے اس راہ میں قدم نہ رکھا، جہاں بیابان، پہاڑ یا دریا جیسی مشکلات نہیں۔ شراب نوشی کرنے والے حلقۂ رنداں میں شامل ہو جا۔ ایسے پیر کی بیعت نہ کر جو ہنگامہ آرا نہ ہو۔ زندہ لوگوں کے مذہب میں زندگی مشکل پسندی کا نام ہے۔ میں نے کعبے کا سفر اس لیے نہ کیا کہ راستے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔

---

(۱) پیامِ مشرق۔۱۲۶۔   (۲) بانگِ درا۔۲۳۳۔ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''۔   (۳) پیامِ مشرق۔۱۵۶

زِ قید و صیدِ نہنگاں حکایتے آور　　گو کہ ذوقِ ما روشناسِ دریا نیست
مرید ہمت آں رہروم کہ پا نگذاشت　　بہ جادۂ کہ در و کوہ و دشت و دریا نیست
شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیا باش　　حذر ز بیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست (۱)
بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است　　سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است (۲)
وائے آں قافلہ کزدونی ہمت می خواست　　رہگزارے کہ درو ہیچ خطر پیدا نیست (۳)

اگر تو اپنے اندر محکم ہو جائے تو بڑے سے بڑا سیلاب بھی کوئی چیز نہیں۔ دریا کے دل میں گوہر کی مانند بیٹھا جا سکتا ہے۔

گر بہ خود محکم شوی سیلِ بلا انگیز چیست
مثلِ گوہر در دلِ دریا نشستن می تواں (۴)

پروفیسر محمد عثمان لکھتے ہیں کہ: ''جب مسلمانوں کے اندر عراق اور شام کے عیسائیوں اور یہودیوں کی بدولت، یونانی علوم کا چرچا ہوا اور افلاطون اور اس کے ماننے والے مفکروں (جن کو فلسفے کی اصطلاح میں نو افلاطونی کہا جاتا ہے) کی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں تو اس سے مسلمانوں کے ذہن نے لامحالہ اثر قبول کیا اور پھر جوں جوں یہ خیالات اور تصورات راسخ ہوتے گئے۔ عمل کا وہ ولولہ اور جدوجہد کا وہ جذب وشوق، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کو آدھی دنیا کا حکمران بنا دیا تھا سرد پڑ گیا۔ اور رہبانیت اور بے عملی کے رجحانات نے زور پکڑا۔ اقبال نے ایک عمیق نظر محقق کی طرح جب مسلمانوں کے صدیوں کے انحطاط کے پیچھے ان تصورات کی زہرناکی کو پالیا تو وہ ایک پرجوش مصلح کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔'' (۵)

گویا کہ یہ بات ہر لحاظ سے طے ہو جاتی ہے کہ افلاطون کے نظریہ اعیان نے کسی نہ کسی صورت میں پھیل کر اقوام کو نقصان پہنچایا اور بالخصوص مسلمانوں کو بے عملی اور رہبانیت کا شکار بنایا۔ اقبال جانتے تھے کہ اسلام کی بہترین رہبانیت جہاد یعنی جدوجہد ہے۔ چنانچہ انہوں نے یقین محکم، عملِ پیہم، محبت فاتح عالم، جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں، کا پیغام دیتے ہوئے اس بے عمل رہبانیت کی شدید مخالفت کی جو کسی قوم کو اوجِ ثریا سے کھینچ کر زمین پر دے مارتی ہے۔ کیونکہ اقبال کے نظامِ فکر کا سفینہ سکوں پرستئی راہب سے بالکل بیزار ہے۔ اس لئے جاوید نامہ میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں

---

(۱) پیام مشرق ۱۵۹۔　(۲) پیام مشرق ۔۱۶۷۔　(۳) پیام مشرق ۔۱۷۰۔
(۴) پیام مشرق ۔۱۶۰۔　(۵) اقبال کا ادبی نصب العین ۔۶۲۔۶۳۔ مرتبہ سلیم اختر۔

کارواں کے ساتھ چلنا اور اس جہاں کے اندر جانِ جہاں بن کے رہنا کتنا خوش آئند ہے۔ ذوق عمل کے بغیر عبادت بھی خشک رہتی ہے اور کہیں نہیں پہنچاتی۔ زندگی سر تا پا کردار ہے خواہ اچھا ہو یا برا:

راہِ حق با کارواں رفتن خوش است ہمچو جاں اندر جہاں رفتن خوش است! (۱)

سجدہ بے ذوقِ عمل خشک و بجائے نرسد زندگانی ہمہ کردار چہ زیبا و چہ زشت! (۲)

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں (۳)

صاف ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں حرکت و عمل کے پیامبر علامہ محمد اقبال نے نظریہ افلاطون کی مخالفت ہی کرنی تھی۔ چنانچہ وہ افلاطون حکیم کے برعکس اپنا پیغام بہ بانگِ دہل دیتے ہیں۔

بہ ضربِ تیشہ بشکن بیستوں را کہ فرصت اندک و گردوں دو رنگ است
حکیماں را دریں اندیشہ بگذار شرر از تیشہ خیزد و یا زسنگ است (۴)

تیشے کی ضرب سے بیستوں پہاڑ، ریزہ ریزہ کر دے کیونکہ فرصت کم ہے اور بدلتے حالات کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ فلسفیوں کو اس سوچ میں سرگرداں رہنے دے کہ چنگاری تیشے سے نکلتی ہے یا پتھر سے۔

جیسا کہ فلاطینوس کا فلسفہ (اشراقیت) مزاجاً بالکل مشرقی تھا اس لیے مشرقی اقوام خصوصاً مسلمانوں میں خوب پھلا پھولا۔ ''مشرقِ وسطیٰ اور ایران کے صوفیاء نے فلاطینوس اسکندری (پلاٹینس) کے باطنی فلسفے کی پیروی کی۔ شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی نے اسے اپنی تصنیف ''حکمت الاشراق'' میں مرتب کر کے وحدتِ وجود کو نظامِ کائنات کی صورت میں پیش کیا۔ اس کے نزدیک ذاتِ واجب نورِ محض ہے، جس کا اشعاع یا اشراق تمام کائناتِ ہستی میں نظر آتا ہے۔۔۔ یہ پوری بحث افلاطون اور فلاطینوس اسکندری کے یہاں علمی تجرید کے انداز میں ہے۔۔۔ حکمتِ اشراق کی بدولت وحدتِ وجود کے خیالات متصوفانہ شاعری کا جزو بن گئے۔۔۔ اقبال کا خیال ہے کہ متصوفانہ شاعری، مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ جب کسی جماعت میں قوت و اقتدار اور توانائی مفقود ہو جاتی ہے، جیسا کہ تاتاریوں کی یورش کے بعد مسلمانوں میں ہو گئی، تو اس کے نزدیک ناتوانی حسین و جمیل شے بن جاتی ہے۔ اور ترکِ دنیا کے ذریعے سے وہ اپنی شکست اور بے عملی کو

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۵۱۔ (۲) ایضاً۔ ۱۷۱۔ (۳) بانگِ درا۔ ۵۲۔ (۴) ارمغانِ حجاز۔ ۲۱۶۔

چھپانے کی کوشش کرتی ہے" (۱)

گویا کہ مسلمان قوم کے انحطاط و زوال پذیری سے متعلق تمام حقائق و شواہد کی تاریخی کڑیاں افلاطون حکیم کے نظریۂ اعیان و تصوریت سے جا ملتی ہیں۔ جس کی بناء پر علامہ محمد اقبال مختلف واسطوں سے افلاطون حکیم ہی کو بے عملی و پستی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ لہٰذا ایک اور موقعے پر سراج الدین پال کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معنی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت سٹل (Subtle) طریق تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا تا ہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا، یا باالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بناء وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے، تو شعرائے عجم اس شعارِ اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً

غازی زپے شہادت اندر تگ و پوست — غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر ازوست
در روزِ قیامت ایں باو کے ماند — ایں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابل تعریف، مگر انصاف سے دیکھیے تو جہاد اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے آب حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔" (۲)

ان حالات و گراوٹ کا ذمہ دار اقبال افلاطون کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی ٹھہراتے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ

---

(۱) حافظ اور اقبال۔ ۲۳۔ ۲۴۔ یوسف حسین خان

(۲) اقبال نامہ (خطوطِ اقبال) حصہ اول۔ مرتبہ، شیخ عطا اللہ۔ ایم۔ اے۔

مسلمان خود بھی اس کے ذمے دار ہیں۔ چنانچہ افلاطون کے ہمراہ وہ مسلمان قوم کو بھی کھری کھری سنانے سے دریغ نہیں کرتے۔

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی!
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی (۱)

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مسلمان ہی اتنے نادان تھے کہ وہ افلاطونی نظریات کا شکار ہو گئے؟ نہیں ایسا نہیں، درحقیقت یہ کسی ایک قوم کی بدنصیبی نہیں، بلکہ اقبال کہتے ہیں:

قوم ہا از سکر او مسموم گشت خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

افلاطون کے زیرِ اثر فلاطینوس نے بھی عالم معقولات و عالم محسوسات پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ چنانچہ ''جس حد تک ان دونوں عالموں کی علیحدگی پر زور دیا جاتا ہے۔ وہیں زہد و ریاضت، جسم و نفس کشی اور راہبانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مشرق و مغرب میں جہاں کہیں یہ تصور اپنی مبالغہ آمیز شکل میں ظاہر ہوا وہیں ترکِ دنیا اور ترکِ علائق کے تصورات اُبھر آتے ہیں۔ جدید مغربی فلسفے میں جرمن فلسفی کانٹ کے ہاں جو عالم ظاہر اور عالم حقیقت کی تقسیم ملتی ہے وہ فلاطینوس کے اسی تصور کی بازگشت ہے۔'' (۲)

گویا کہ بہت سی اقوام افلاطونی فلسفے کا صیدِ زبوں بن کر رہ گئیں۔ ڈاکٹر ابوسعید نور الدین رقم طراز ہیں ''اس فلسفے کا اثر صرف مسلمانوں پر ہی نہیں پڑا بلکہ ان تمام ممالک میں جہاں یونانی فلسفے اور نو افلاطونیت کا اثر پہنچا یہ مسلک عام ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی اکثر اقوام بھی اسی مسلک کی بدولت مفلوج ہو کر رہ گئیں اور ان کو اس خواب سے بیدار کرنے کے لیے نیٹشے کا پیدا ہونا ناگزیر ہو گیا، اور اس کے ردِ عمل کے طور پر یورپ میں جدوجہد کا وہ دور شروع ہوا جس نے جرمن اور اطالوی قوموں کو روحِ جہاد سے دوبارہ آشنا قرار دیا۔ لیکن چونکہ اس جہاد کی بنیاد قومی منافرت اور جوع الارض پر تھی، اس لیے اس نے قومی زندگی کو استوار بنیادوں پر کھڑا نہ ہونے دیا۔ اس ردِ عمل نے ہٹلر اور مسولینی تو پیدا کیے، انسانِ کامل پیدا نہیں کیا۔'' (۳)

جبکہ

---

(۱) ضرب کلیم۔۱۲۲۔ نظم ''جدت''۔ (۲) تاریخ تصوف قبل از اسلام۔۳۹۔ بشیر احمد ڈار۔

(۳) اسلامی تصوف اور اقبال۔۲۳۹۔ ڈاکٹر ابوسعید نور الدین۔

آدمیت احترامِ آدمی ۔۔۔ باخبر شو از مقامِ آدمی (۱)

بر تر از گردوں مقامِ آدم است ۔۔۔ اصلِ تہذیب احترامِ آدم است (۲)

لیکن اقبال نے دیکھا کہ:

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست ۔۔۔ چشمِ او ینظر بنور اللہ نیست

او نداند از حلال و از حرام ۔۔۔ حکمتش خام است و کارش نا تمام

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد ۔۔۔ دانہ ایں می کارد، آں حاصل برد

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است ۔۔۔ از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

شیوۂ تہذیب نو آدم دری است ۔۔۔ پردۂ آدم دری سوداگری است

ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود ۔۔۔ نورِ حق از سینۂ آدم ربود

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام ۔۔۔ دانش و تہذیب و دیں سودائے خام (۳)

افسوس یورپ اس مقام سے آگاہ ہی نہیں۔ اس کی آنکھ اللہ تعالیٰ کے نور سے نہیں دیکھتی، وہ حلال وحرام میں امتیاز نہیں کرتا۔ اس کا فلسفہ خام اور کام نامکمل ہے۔ایک قوم دوسری قوم پر پلتی ہے۔ دانہ یہ کاشت کرتی ہے اور حاصل وہ لے جاتی ہے۔ غریبوں سے روٹی چھین لینا اور ان کے بدن سے جان نکال لینا ان کی ڈپلومیسی ہے۔ (آئی ایم ایف کا برتاؤ ہمارے سامنے ہے) نئی تہذیب کا شیوہ انسانوں کی چیر پھاڑ ہے اور یہ کام انہوں نے تجارت کے پردے میں اپنا رکھا ہے۔ بینک یہودیوں کی عیار سوچ کا حربہ ہے۔ انسان کے سینے سے اللہ تعالیٰ کا نور نکال لیتے ہیں۔ جب تک یہ سودی نظام تہہ و بالا نہ ہو، دانش، تہذیب اور دین کی باتیں بے سود ہیں۔

اسی لیے اقبال یورپ کے ان سوفسطائیوں کی بھی مخالفت کرتے ہیں، دراصل اقبال کے نزدیک نہ تو افلاطون حکیم انسان کامل ہے اور نہ یورپ کے عیارشکر پارہ فروش بلکہ وہ رحمت اللعالمین حضرت محمد ﷺ کو انسانِ کامل سمجھتے ہیں۔ کہ آپؐ نے ساری انسانیت کو انصاف اور مساوات کی ایک ہی لڑی میں پرو کر ہمدردی و غمگساری کی تعلیم دی۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں ۔۔۔ حاملِ او رحمۃ للعٰلمین (۴)

---

(۱) جاوید نامہ ۔۳۸۴۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۶۹۔ (۳) جاوید نامہ ۔۱۴۷۔ (۴) اسرار و رموز ۔۱۲۲۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل، جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طاہا (۱)

آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو (۲)

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب (۳)

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمت اللعالمینے ہم بود! (۴)

تخلیق کرنا، ہر وجود کی استعداد مقرر کرنا اور اس کے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ رکھنا۔ یہ ابتداء ہے اور مقامِ رحمت اللعالمین انتہا ہے۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداء ست رحمت اللعالمینی انتہا ست! (۵)

جہاں کہیں تو رنگ و بو دیکھتا ہے، ایسا جہاں جس کی خاک سے آرزو پھوٹتی ہو یا تو اس کی قدر و قیمت نورِ مصطفیٰ سے ہے یا وہ ابھی تک مصطفیٰ ﷺ کی تلاش میں ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست (۶)

چنانچہ:

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست (۷)
کسے کو "دید" عالم را امام است من و تو نا تمامیم او تمام است! (۸)
نمو و رنگ از دمِ بادے نہ جوییم ز فیضِ آفتابِ تو برویم

---

(۱) بالِ جبریل ۔ ۲۵۔ (۲) بالِ جبریل ۔ ۱۱۲۔ ذوق و شوق ۔ (۳) ایضاً ۔ ۱۱۳۔ (۴) جاوید نامہ ۔ ۱۲۶۔

(۵) جاوید نامہ ۔ ۱۲۷۔ (۶) جاوید نامہ ۔ ۱۲۸۔ (۷) پیام مشرق ۔ ۲۰۔ (۸) زبورِ عجم ۳۳۴۔

نگاہم از مہ و پرویں بلند است   سخن را بر مزاجِ کس نگویم (۱)

اس کائنات کا مرتبہ آپؐ کی بدولت بلند ہوا۔ آپ کا فقر کائنات کی دولت ہے۔

از تو بالا پائیہ ایں کائنات   فقرِ تو سرمایہ ایں کائنات (۲)

دارم اندرسینہ نور لا الہ   در شراب من سرور لا الہ

فکر من گردو ں مسیر از فیض اوست   جوئے ساحل نا پذیر از فیض اوست

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام   تادرخشی مثل تیغ بے نیام (۳)

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کا پیکر تخلیق فرمایا اور رسالت سے ہمارے بدن میں جان پھونکی۔ ملت کا حلقہ جس کا مرکز وادی بطحا (بیت اللہ شریف) ہے۔ ہر دم وسعت پذیر ہے۔ ہم حضور ﷺ کی نسبت سے ایک ملت ہیں اور دنیا والوں کے لئے رحمت ہیں۔

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید   وز رسالت در تن ماجاں رسید

حلقہ ملت محیط افزاستے   مرکز اووادیء بطحاستے

ماز حکم نسبت او ملتیم   اہل عالم را پیام رحمتیم (۴)

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں (۵)

دنیا میں انسان انسان کی پرستش کرتا تھا لوگ انسانیت سے گر چکے تھے۔ ان کا کوئی مقام نہیں تھا اور وہ دبے ہوئے تھے۔ قیصر و کسریٰ کی سطوت نے رہزن بن کر اس کے ہاتھ پاؤں اور گردن میں زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔ کہیں کاہن تھے کہیں پوپ۔ کہیں سلطان کہیں حاکم۔ ایک شکار کے لئے سینکڑوں شکاری تھے۔ بادشاہ اور مذہبی رہنما دونو ں انسانیت کی ویران کھیتی پر بھی مالیہ لگاتے تھے۔ عیسائیت کی جنت کے پروانے فروخت کرنے والا پادری اسی صید زبوں کے شکار کے لئے کندھے پر جال رکھے ہوئے تھا۔

درنگاہ او یکے بالا وپست   باغلامِ خویش بر یک خواں نشست (۶)

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔ ۸۸۔ (۲) اسرار و رموز۔ ۱۶۶۔ (۳) مثنوی پس چہ باید کردا ے اقوامِ مشرق۔ ۸۶۔ اقبال۔

(۴) رموز بیخودی ص ۱۰۱۔ (۵) بانگِ درا۔ ۲۰۸۔ جواب شکوہ۔ (۶) جاوید نامہ۔ ۵۵۔

برہمن نے بھی انسانیت کی کیاری سے پھول توڑ لیا۔ مغ زادے نے انسانیت کے خرمن کو سپرد آتش کر دیا۔ غلامی کی وجہ سے انسانوں کی فطرت پست ہو گئی تھی۔ انسانیت کی نے کے نغمے خون آلود تھے۔ ان حالات میں جناب رسول پاک ﷺ تشریف لائے اور انہوں نے امین بن کر حقداروں کا حق ان کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ کا تخت رعایا کے سپرد کر دیا۔ دور حاضر جس نے ،علم کے سینکڑوں چراغ روشن کیے ہیں آپ ﷺ ہی کی آغوش میں آنکھ کھولی ہے۔

بود انسان در جہاں انسا ں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش بند ہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صا حب او رنگ و ہم پیر کنشت باج بر کشت خراب او نوشت
در کلیسا اسقف رضواں فروش بہر این صید زبوں دامے بدوش
بر ہمن گل از خیابانش ببرد خر منش مغ زادہ باآتش سپرد
از غلامی فطرت او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نےء او خوں شدہ
تا امینے حق بحقداراں سپرد بندگاں را مسند خاقاں سپرد
عصر نو کایں صد چراغ آوردہ است چشم در آغوش او وا کردہ است (۱)

چنانچہ افلاطون سمیت تمام عجمی بت کدہ افکار و نظریات کی چمک دمک اقبال کے سوز و گداز ،یعنی عشق کو نہیں پہنچ سکتی۔ حضور ﷺ نے ایک نگاہ سے ان کے دل کا حجاز فتح کر لیا ہے۔

تب و تاب بت کدہ عجم نرسد بسوز و گداز کہ بیک نگاہ محمد ﷺ عربی گرفت حجاز من (۲)

اس لئے اقبال دعا گو ہیں کہ خدا کرے سارے کا سارا عرب میرے خون ملے آنسوؤں سے لالہ زار ہو جائے اور عجم کے لئے جو اپنی خوشبو کھو چکا ہے میری نوائی بہار ثابت ہو۔

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا (۳)

کوئی ایسا خم شکن نہیں جو آپ ﷺ کی محبت سے سرخوش نہ ہو۔ کوئی ایسا شیریں سخن نہیں جو آپ ﷺ کے لب

---

(۱) رموز بیخودی۔۱۰۳۔۱۰۴۔ (۲) پیام مشرق۔۱۷۴۔ (۳) پیام مشرق۔۱۷۹۔

لعلیں سے سرمست نہ ہو۔

سر خوش از بادۂ خم شکنے نیست کہ نیست　　مستِ لعلیں تو شیریں سخنے نیست کہ نیست　(۱)

☆حضورﷺ کی بارگاہ میں ، جو غیر فانی زمانہ سے عبارت ہے اس کی مٹی سے بغیر صورت کے معانی پیدا ہوتے ہیں یہاں حکیم و کلیم دونوں کندھے سے کندھا ملائے فیض یاب ہو رہے ہیں ۔ یہاں کوئی "لن ترانی" تو مجھے نہیں دیکھ سکتا ، نہیں کہتا ۔ گویا کہ آپ ﷺ کسی کو محروم نہیں فرماتے ۔

دریں وادی زمانی جاودانی　　زخاکش بے صوّر روید معانی

حکیماں با کلیماں دوش بر دوش　　کہ ایں جاکس نگوید لن ترانی!　(۲)

پس اقبال کہتے ہیں کہ افلاطون نے مشرق و مغرب دونوں کو گمراہ و بے راہ کر دیا ہے ۔ لہٰذا افلاطونی نظریات کی بجائے دنیا کو چاہیئے کہ انسان کامل (حضورﷺ) کی تعلیمات کو اپنائے ، جن میں معراج انسانیت مضمر ہے ۔ آجکل یورپی تہذیب لگتا ہے کہ بالکل "جمہوریہ افلاطون" کی نقل ہے ۔ افلاطون کے یونان میں لڑکے اور لڑکیاں بالکل ننگے ہو کر ورزش کی صورت میں اکٹھے جمناسٹک کرتے تھے تو آج یورپ میں بھی تنگ دھڑنگ دوشیزائیں اور مرد "سوئمنگ پولوں" میں مشترکہ طور پر غوطہ زن ہو کر ایک دوسرے کے رسیلے و پرشباب اجسام سے جواہر حسن کی غواصی کرتے ہیں ۔ چنانچہ

ع　　پھول ہیں ساحل پہ یا پریاں قطار اندر قطار

لیکن یہاں نیلے نیلے اودے اودے اور پیلے پیلے پیرہن بالکل دکھائی نہیں دیتے بلکہ سحر خیز اور سکر ریز بے لباس جوانیاں ، جلوہ آرائی کرتے ہوئے لڑکھڑاتی پھرتی ہیں ۔ دل و نظر کو خیرہ کر دینے والی موجودہ یورپی تہذیب کی ساری کڑیاں نظریات افلاطون ہی سے جا ملتی ہیں ۔ چنانچہ افلاطون کے نظریاتی گہوارے میں پلنے والی اس تہذیب کے نگارخانے کو بھی اقبال پاش پاش کر دینا چاہتے ہیں ۔

تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے　　آداب جنون شاعر مشرق کو سکھا دو　(۳)

علامہ اقبال مشرق و مغرب کے اسباب انحطاط پر سوچ بچار کرتے ہوئے دنیا پر نظر دوڑاتے ہیں تو مجموعی طور سے اس کی وجہ نفی خودی ہی قرار دیتے ہیں ۔ اس لئے افلاطونی "تصوریت" کے خلاف لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۱۸۱ ۔　　(۲) ارمغان حجاز ۔ ۳۰ ۔　　(۳) بال جبریل ۔ ۱۱۰ ۔ لینن (خدا کے حضور)

وجوداست این کہ بینی یا نموداست حکیم ماچہ مشکلہا کشوداست
کتابے برفن غواص بنوشت و لیکن دردل دریا نبوداست (۱)

یہ عالم جو تجھے نظر آرہا ہے حقیقی وجود رکھتا ہے یا ویسے دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے حکیم (افلاطون) نے کیا کیا مشکلات پیدا کر رکھی ہیں۔ اس نے غواصی کے فن پر کتاب تو لکھ دی مگر اسے دریا کے اندر جانا نصیب نہیں ہوا۔ یعنی افلاطون حقیقت کائنات کو نہ سمجھ سکا۔ یہی حال جدید مغربی فلاسفہ کا ہے۔ بہرحال مشرق و مغرب میں ''مرگ خودی'' کا باعث اقبال کو افلاطونی نظریات کے اثرات ہی دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ ایک مجموعی تجزیہ کرتے ہوئے خوبصورت پیرائیہ بیان اختیار کرتے ہیں۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روح عرب ہے بے تب و تاب بدن عراق و عرب کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور کہ بیچ کھائے مسلمان کا جامۂ احرام (۲)
گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں (۳)

نفئ خودی کے نتیجے میں اقوام جراءت رندانہ سے محروم ہوکر انداز راہبانہ اپنانے پر مجبور ہوگئیں۔ ایسے میں اقبال جگہ جگہ ضرب کلیمی کے ساتھ ''جلال عصا'' کا دوٹوک مظاہرہ کرنے پر زور دیتے ہیں۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد (۴)
ہزار چشمہ تیرے سنگ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر (۵)
خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب خودی ہو زندہ تو کہسار پر نیاں و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر! (۶)

اس ساری بحث سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ نظریہ اعیان کے اثرات جہاں جہاں، جس صورت میں پہنچے، وہاں نفی

---

(۱) ارمغان حجاز۔ ۲۱۶۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۸۰۔ ''مرگ خودی'' (۳) بال جبریل۔ ۴۷۔
(۴) بال جبریل۔ ۷۰۔ (۵) بال ضرب کلیم۔ ۱۔ (۶) ضرب کلیم۔ ۶۷ ''خودی کی زندگی''۔

خودی کے نتیجے میں مردنی چھا گئی ، جس کی بناء پر علامہ محمد اقبال نے افلاطون کے خلاف اپنا ردعمل ظاہر کیا ۔ اسی طرح ہیگل بھی افلاطون کے "نظریہ اعیان ثابتہ" پر کڑی تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہے ۔

"یہ ایک نہایت بری علامت ہے کہ کوئی فن کار بھر پور زندگی کے مقصد کے بجائے "مجرد تصورات" کی خاطر اپنی تخلیقی فعلیت شروع کر دیتا ہے ۔ جن کا مقصد صداقت کو محسوس صورت میں پیش کر دینے میں مضمر ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ ہر دوسرا مقصد قطعاً اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا" (۱)

نظریہء اعیان کے حوالے سے اقبال افلاطون حکیم سے مخاطب ہوتے ہوئے مزید کہتے ہیں :۔

تو چشم بستی و گفتی کہ ایں جہاں خواب است — کشائے چشم کہ ایں خواب خواب بیداری است (۲)

ترسم کہ تو می رانی زورق بہ سراب اندر — زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر (۳)

سخن از بود و نابو دِ جہاں بامن چہ می گوئی — من ایں دانم کہ من ہستم ندانم ایں چہ نیرنگ است (۴)

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی — یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطون! (۵)

میان آب و گل خلوت گزیدم — زافلاطون و فارابی بریدم

نہ کردم از کسے دریوزۂ چشم — جہاں راجز بچشم خود ندیدم (۶)

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مرد دانشمند — حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود (۷)

اقبال نے ہمیشہ تسخیر فطرت کا پیغام دیا ہے لیکن افلاطونی "نظریہ اعیان" کے تحت آگے چل کر بارکلے و بریڈلے کی طرح بہت سے دیگر موضوعی و تصوری فلسفی سامنے آئے ۔ جنہوں نے افلاطونی تصوریت کا پرچار کیا اور مزید بے عملی پھیلائی ۔ صاف ظاہر ہے کہ موجودات کو واہمہ قرار دیا جائے تو اقبال کے عقیدہ عمل میں تسخیر فطرت کا کام نہیں ہو سکتا ۔ چنانچہ انہوں نے افلاطون کی " فطریت و تصوریت و عینیت" کے برخلاف "فوق الفطرت" کا عمل پیش کرتے ہوئے انسان سے کہا کہ تیرے فکر کے گھوڑے کو طوطی کے پر لگے ہوئے ہیں ۔ اس کا قدم آسمان کی وسعتوں تک پہنچتا ہے زندگی کی ضروریات اسے چلاتی ہیں اور اسے زمین پر رہتے ہوئے فلک پیما بناتی ہیں ۔ تاکہ اس نظام کائنات کی وسعتوں کی تسخیر سے تیری ہنرمندیوں کی صلاحیتیں پایہ تکمیل تک پہنچیں ۔ دنیا میں آدم اللہ تعالی کا نائب ہے اور عناصر فطرت پر اس کا حکم جاری ہو۔

---

(۱) Hegel, Aesthetic, Eng. Tr, PP 345-55 (۲) زبور عجم ۔ ۱۵۴ ۔ (۳) جاوید نامہ ۔ ۷۶ ۔

(۴) زبور عجم ۔ ۲۶۰ ۔ (۵) ضرب کلیم ۔ ۳۹ ۔ (۶) پیام مشرق ۔ ۱۰۲ ۔ (۷) ضرب کلیم ۔ ۶۸ ۔ " فلاطون " ۔

ذلدل اندیشہ ات طوطی پرست | آنکہ کا مش آسماں پہناوراست
احتیاج زندگی میراندش | برزمیں گردوں سپر گرداندش
نائب حق درجہاں آدم شود | برعناصر حکم او محکم شود (۱)

جب کہ افلاطون کا فلسفہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ واہمے و سراب میں زندگی و قوت نہیں ہوتی۔ اقبال کہتے ہیں خورشید عالم تاب سے اس کی توانائی لے اور پانی سے بجلی حاصل کر جو گھروں کو روشن کرے آسمان کے سیارے اور ستارے جنہیں پرانی اقوام نے اپنے معبود بنایا ہوا تھا۔ اے خواجہ یہ سب تیرے خدمت گار، غلام اور کنیزیں ہیں۔ اپنی تحقیق کو منصوبہ بندی سے مستحکم کر اور انفس و آفاق کو مسخر کر لے۔ تو ''انظر'' کے خطاب کا مقصود ہے۔ پھر تو کیوں اندھوں کی طرح راہ پر چل رہا ہے۔

تابش از خورشید عالم تاب گیر | برق طاق افروز از سیلاب گیر
ثابت و سیارۂ گردوں وطن | آں خداوندانِ اقوام کہن
ایں ہمہ اے خواجہ آغوشِ تواند | پیش خیز و حلقہ درگوشِ تواند
جستجو را محکم از تدبیر کن | انفس و آفاق را تسخیر کن
تو کہ مقصودِ خطابِ انظری | پس چرا ایں راہ چوں کو راں بری (۲)

علاوہ ازیں کلام اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں کہ علامہ اقبال عقل پر عشق کو ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں اس لئے کہ عشق کی رسائی جہاں تک ہے۔ عقل سراپا سوچ ہو کر بھی وہاں کا سوچ نہیں سکتی۔ اس لئے تو عشق عقل سے کہتا ہے۔

تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا | طائرسدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا | عرش رب جلیل کا ہوں میں (۳)

لیکن ایک فلسفی ہونے کے ناطے:۔" افلاطون کے نزدیک معرفت چونکہ تعقل و تفکر سے حاصل ہوتی ہے اس لئے وہ علم و حکمت کو عشق پر ترجیح دیتا ہے۔ دور حاضر کے حکیم، علامہ اقبال نے گوئٹے اور مولانا رومی کی ہمنوائی میں افلاطون کے

---

(۱) رموزِ بے خودی۔۱۴۲۔ (۲) رموزِ بے خودی۔۱۴۳۔ (۳) بانگِ درا۔ص۔۴۲۔ ''عقل و دل''۔

اس نظریے کی پرزور مخالفت کی ہے اور عشق کو عقل پر فوقیت دی ہے"۔ (۱)

مولانا روم کی ہمنوائی اقبال اس لئے کرتے ہیں کہ رومی کے افکار بھی قرآن پاک سے وابستہ ہیں۔اور افکار اقبال کا منبع بھی قرآن حکیم ہے چنانچہ اقبال کہتے بھی ہیں۔

گر توی خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

من بندہ آزا دم ، عشق است امام من عشق است امام من ، عقل است غلام من (۲)

چنانچہ عقل و عشق کے ضمن میں بھی افلاطون حکیم سے نظریاتی اختلاف رکھتے ہوئے مختلف حوالوں سے ثابت کر دکھاتے ہیں کہ" نظریہ اعیاں" کی طرح افلاطون اس معاملے میں بھی فریب نظر کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

برعقل فلک پیما تر کانہ شبیخوں بہ یک ذرۂ درد دل از علم فلاطوں بہ (۳)

دربودو نبودِ من اندیشہ گمانہاداشت از عشق ہویداشد ، ایں نکتہ کہ ہستم من (۴)

مجھے افلاطون کی عقل جہاں بیں پر بھروسہ نہیں کیوں کہ میرے پہلو میں ایسا دل ہے جو شوخ اور نظرباز ہے، میری سوچ میں عشق کی جراءت اور گہرائی ہے۔

تکیہ برعقلِ جہاں بینِ فلاطوں نکنم درکنارم دلکے شوخ و نظر بازے ہست (۵)

عشق میرے لئے سبھی کچھ ہے اور افلاطوں کا فلسفہ و ادراک تجھے مبارک ہو میرے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر چہ:۔

میں اصل کا خاص سو مناتی آبا مرے لاتی و مناتی

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اقبال اگر چہ بے ہنر ہے اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم دیں سر محمد و براہیم (۶)

دیں اور زور حیدری سے مراد عشق ہے گویا کہ عشق میرے لئے سبھی کچھ ہے اور افلاطون کا فلسفہ و ادراک تجھے مبارک ہو۔ میں فلسفے کا بخوبی واقف ہوں۔ میرے نزدیک اس کی حیثیت کھوٹے سکے سے زیادہ نہیں۔ عشق ایک ایسی طاقت ہے

---

(۱) تاریخ جمالیات، جلد اول۔ ۸۹۔۹۰۔نصیر احمد ناصر۔ (۲) زبور عجم۔۲۸۰۔ (۳) زبور عجم۔۵۰۔

(۴) پیامِ مشرق۔۱۵۲۔ (۵) زبورِ عجم۔۱۶۔ (۶) ضرب کلیم۔۱۸۔"ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام"

جس کے سامنے افلاک بھی سرنگوں ہیں ۔ اس لئے اقبال عشق کوفوقیت دیتے ہیں ۔

ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک | مرے لئے ہے فقط زور حیدری کافی
که سربجده ہیں قوت کے سامنے افلاک | مری نظر میں یہی ہے جمالِ زیبائی (۱)

اقبال عشق کے یہاں تک معترف ہیں کہ اس کی خصوصیات کی روشنی میں کہتے ہیں ۔

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ | کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک! (۲)

یہ سب کہنے کے علاوہ علامہ اقبال افلاطون حکیم کو ایک بار پھر مشورہ دیتے ہیں کہ عشق کی آنکھ سے دیکھ تاکہ تو جہاں کا سراغ پاسکے، عقل کی نظر میں تو یہ محض سحر و ساحری اور اعیان ثابتہ کی نقل ہے۔

جہاں بچشم خرد سیمیاء و نیرنگ است | بچشم عشق نگر تا سراغِ او گیری (۳)

عشق سے عمل کا سبق حاصل کر اور جو چاہے کر گزر اس لئے کہ عشق ہی سمجھ کا جوہر اور عقل کی جان ہے۔

زعشق درس عمل گیر و ہرچہ خواہی کن | کہ عشق جوہر ہوش است وجان فرہنگ است (۴)

اس کے علاوہ ، افلاطون حکیم اور علامہ اقبال کے مابین نظریاتی اختلافات کے ضمن میں مزید عرق ریزی کرتے ہوئے راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ "نظریہ ملوکیت" بھی اختلافات رائے کا ایک باعث ہے، جمہوریہ افلاطون پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہوگیا ہے کہ افلاطون کا نظریہ، یٹوپیا یا مثالی ریاست کے حوالے سے بالکل ملوکانہ ہے جبکہ علامہ اقبال ملوکیت کے یکسر خلاف ہیں۔ اقبال کے نزدیک ملوکیت ایک شیطانی فعل ہے۔ جس کے ذریعے نیکی کا قلع قمع کرتے ہوئے بدی اور تباہی و بربادی پھیلائی جاتی ہے۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس اپنے اسی منشور پرعمل پیرا دکھائی دیتا ہے۔

میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں | میں نے دکھلایا فرنگی کوملوکیت کا خواب (۵)

چنانچہ اس لئے بھی علامہ اقبال افلاطون کی مخالفت کرتے ہیں۔

سینہ بے نور او از دل تہی است! | ہم ملوکیت بدن رافربہی است (۶)

ملوکیت بھی بدن کو فربہ کرتی ہے اس کا سینہء بے نور دل سے خالی ہے۔

چیست تقدیر ملوکیت؟ شقاق | محکمی جستن ز تدبیر نفاق!

---

(۱) ضربِ کلیم ۔۱۳۳۔ (۲) ایضاً ۔۱۳۴۔ (۳) پیامِ مشرق ۔ ۱۵۱۔
(۴) ایضاً ۔ (۵) ارمغانِ حجاز ۔ ۵۔ (۶) جاوید نامہ ۔ ۱۱۸۔

حاکمی بے نور جاں خام است خام   بے ید بیضا ملوکیت حرام (۱)

افلاطون ملوکیت کا حامی تھا، جبکہ ملوکیت یا بادشاہت لوگوں میں پھوٹ اور نفاق ڈالتی ہے۔ بادشاہت کے پاس نوربصیرت اور ید بیضا نہیں ہوتا، یعنی یہ حق وصداقت سے دور ہوتی ہے اس لئے حرام ہے۔ اقبال کہتے ہیں آسمان کے نیچے روئے زمین پر حکومتیں جبر سے قائم ہوتی ہیں۔ اس لئے ماسوائے اللہ کی حکومت کافری ہے۔ افلاطون کی یوٹوپیا کی مثال ایسی ہے۔ جیسے اندھا اندھے کو سرمہ عطا کرتا ہو۔ بادشاہوں کے آئین ودستور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جاگیردار موٹے ہوجاتے ہیں اور دہقان تکلے کی مانند نحیف ونزار۔

زیر گردوں آمری از قاہری است   آمری از ما سوا اللہ کافری است
قاہری را شرع و دستورے دہد   بے بصیرت سرمہ با کورے دہد!
حاصلِ آئین ودستورِ ملوک!   دہ خدایاں فربہ ودہقاں چودوک! (۲)

اقبال کے نزدیک افلاطون کی ملوکانہ آئینی کتاب ''یوٹوپیا'' نہیں بلکہ قرآن حکیم ساری دنیا کے لئے خیرکثیر ہے۔ اسی لئے قرآن پاک آقا کے لئے موت کا پیغام ہے اور بے سروسامان بندے کا دستگیر۔ دولت کے پجاری سے کسی بھلائی کی امید نہیں۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ تم نیکی نہیں پاسکتے۔ جب تک اپنی محبوب ترین چیز اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ   دستگیرِ بندۂ بے سازوبرگ!
ہیچ خیر ازمردک زر کش مجو   لن تنالواالبر حتیٰ تنفقوا (۳)
بندۂ آزاد را ناسازگار   بردمد ازسنبل اونیش خار!
غاصباں غرق اند درعیش وطرب   کار مغلوباں شمارِ روز و شب
ازملوکیت جہانِ توخراب   تیرہ شب درآستینِ آفتاب (۴)

ملوکیت بندہ آزاد کے لئے ناسازگار ہے اس کے گل سنبل سے کانٹے کا زخم پیدا ہوتا ہے۔ چیرہ دست، بادشاہ عیش وطرب میں بدمست رہتے اور کمزوررات دن گن گن کر اپنی زندگی کی سانسیں گزارتے ہیں۔ بادشاہی نے دنیا کو تباہ وبرباد کردیا ہے۔ آستین آفتاب میں شب تاریک چھپی ہے۔ افلاطون کی یوٹوپیا بھی ایسی ہی ہے۔ جس کے نتیجے میں اقبال افلاطون

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۱۸۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۷۱۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۸۰۔ (۴) جاوید نامہ۔ ۳۵۶۔

سے اختلاف کرتے ہیں۔

حکمت ارباب کیں مکر است وفن	مکروفن؟تخریب جاں تعمیر فن!
بندہ را باخواجہ خواہی درستیز؟	تخم لا درمشتِ خاکِ اوبریز
ہرکبائے کہنہ چاک ازدستِ او	قیصرو کسریٰ ہلاک ازدست او
گاہ دشت ازبرق وبارانش بدرد	گاہ بحر اززور طوفانش بدرد (۱)

فرعونیت، ملوکیت یا بادشاہت مکروفن کا دوسرا نام ہے۔ اقبال ملوکیت کے پنجہ استبداد سے کمزور غلام کو چھڑانے کا ذریعہ صرف اورصرف ''لا'' کے اندر مضمر سمجھتے ہیں۔

لادینی ولاطینی کس پیچ میں الجھا تو	دارو ہے ضیعفوں کا لاغالب الا ھو (۲)

کہ ''لا'' ہی نے قیصروکسریٰ کی ملوکانہ بنیادیں ہلادیں۔ کبھی اس کے برق رفتار انقلاب نے صحراؤں پرلرزہ طاری کردیا اور کبھی دریاؤں کے دل دہلادیئے۔ افلاطون ہی نہیں بلکہ اقبال نے ملوکانہ نظریات رکھنے والے ہر جابر کی مخالفت کی ہے۔ اس سلسلے میں، فلارنس میں پیداہونے والے فلارنساوی ''میکاولی'' کی مثال بھی موجود ہے۔ میکاولی نے بھی افلاطون کی ملوکانہ یوٹوپیا کی طرح اپنی کتاب ''الملوک'' کے ذریعے ظالم کے پنجہ استبداد کو مضبوط کرنے میں کوئی کسرنہیں چھوڑی چنانچہ اقبال نے میکاولی کی بھی کھل کرمخالفت کی ہے۔

دہریت چوں جامہء مذہب درید	مرسلے ازحضرت شیطاں رسید
آں فلارنساوی‌ء باطل پرست	سرمہء اودیدۂ مردم شکست
نسخہء بہر شہنشاہاں نوشت	درگلِ مادانہء پیکار کشت
فطرتِ اوسوئے ظلمت بردہ رخت	نقد حق را برعیار سوورزد
باطل از تعلیم اوبالیدہ است	حیلہ اندازی فنے گرویدہ است
طرح تدبیر زبوں فرجام ریخت	ایں خسک در جادۂ ایام ریخت (۳)

صاف ظاہر ہے کہ ایسے میں ایسے تمام غاصبوں کے غاصبانہ نظریات کا سرچشمہ افلاطون ہی کے سیاسی نظریات ہیں۔

---

(۱) پس چہ باید کردائے اقوامِ مشرق۔ ۲۶، ۳۰، ۳۲۔	(۲) ضرب کلیم ۔۱۷۲۔	(۳) رموز بیخودی ۔ ۱۱۶۔۱۱۷۔

اس لئے اقبال ان ملوکانہ خیالات کی مخالفت کرتے ہیں ۔

درنگاہش ناصواب آمد صواب ترسد از ہنگامہ ہائے انقلاب
خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد آبروئے دخترِ مزدور برد
درحضورش بندہ می نالد چو نے برلب او نالہ ہائے پے بہ پے
نے بجامش بادہ ونے در سبوست کاخہا تعمیر کرد و خود بکوست
اے خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست درچنیں عصرے خدااندیش زیست (۱)

آپ کا جہاں چند خسیسوں کے ہاتھ میں ہے ۔ یہاں کے اہل لوگ چند نااہلوں کے پنجے میں گرفتار ہیں ، ہنرمند کارخانوں میں اپنے آپ کو چند گدھوں (سرمایہ داروں) کے عیش وعشرت کے لئے ہلاک کر رہے ہیں ۔

جہانِ تست در دستِ خسے چند کسان او بہ بند ناکسے چند
ہنر ور در جہانِ کارگاہاں کشد خود رابہ عیشِ کرگسے چند (۲)
کارخانے کا ہے مالک مردک ناکردہ کار عیش کا پتلا ہے ، محنت ہے اسے ناسازگار
حکم حق ہے لیس للانسان الا ماسعیٰ کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار (۳)

اقبال کہتے ہیں ملوکیت کے دور دورے میں فرہاد کا تیشہ اپنے خون پینے سے پہاڑ کو بھی الٹ پلٹ کر کے رکھ دے مگر اس محنت شاقہ کا پھل بھی پرویز ہی کھاتا ہے کیوں کہ ملوکیت میں آسمان بادشاہ کی اجارہ داری کے فن میں گردش کرتا ہے۔

اگرچہ تیشہء فن کوہ را زپاآور ہنوز گردش گردوں بکامِ پرویز است (۴)
تیشے کی کوئی گردشِ تقدیر تو دیکھے سیراب ہے پرویز ، جگر تشنہ ہے فرہاد! (۵)

بنوں کے جواں مرگ شاعر مقبول عامر نے اسی مضمون کو ایسی خوبصورتی سے بیان کیا ہے ۔

پھر وہی ہم ہیں وہی تیشہء رسوائی ہے دودھ کی نہر تو پرویز کے کام آئی ہے مقبول عامر

چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ ایسے خودکار غاصبانہ نظام میں جس کے ذریعے غریب وبیکس کو غلام بنا کر حکمران اس کا خون

---

(۱) پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق ۔ ۲۹۔ (۲) ۔ ارمغانِ حجاز ۔ ١٦۔ (۳) بانگِ درا ۔ ۲۹۱۔
(۴) پیامِ مشرق ۔ ۱۹۸۔ (۵) ارمغانِ حجاز ۔ ۲۳ ۔ '' دوزخی کی مناجات''

چوستا رہے ،حکمران کی راہزنی کا انتقام لینا چاہیئے ۔ ایسے ملوکانہ نظام کی مکمل تبدیلی و انقلاب برپا کر دینے کی خاطر اقبال ظلم و ستم کی چکی میں پسے ہوئے طبقے سے کہتے ہیں کہ پروانے کی طرح شمع کے اردگرد چکر لگاتے رہنا کب تک ۔ اپنے آپ سے اس طرح بیگانہ رہ کر زندگی بسر کرنا کب تک ۔

به بزم غنچه و گل طرح دیگر اندازیم   ز رہزنانِ چمن انتقامِ لاله کشیم

زخویش ایں ہمه بیگانه زیستن تاکے   بطوفِ شمع چو پروانه زیستن تاکے (۱)

ملوکیت ہی میں سرمایہ دار مزدور کے خون سے سرخ موتی بناتا ہے ۔ ادھر زمینداروں کے ظلم سے دہقانوں کی کھیتیاں اجڑ چکی ہیں ۔ مفتئی شہر نے اپنی تسبیح کے دام میں سینکڑوں مومن گرفتار کئے ہوئے ہیں ۔سادہ دل کفار کو برہمن نے اپنے زنار میں باندھ رکھا ہے ۔ میرو سلطان کھلاڑی ہیں ، اور شادی بیاہ کے معاملات میں بھی قرعہ اندازی جیسے مکروفریب ان کے مہرے ، یہ محکوموں کی جان بدن سے نکال کر انہیں سلا دیتے ہیں ۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں ۔انقلاب !انقلاب !اے انقلاب ۔

خواجه از خونِ رگ ِمزدور سازد لعلِ ناب   از جفائے ده خدایاں کشت دہقاناں خراب

شیخ شہر از رشتهء تسبیح صد مومن بدام   کافران ساده دل را برہمن زنارتاب

میرو سلطاں نرد بازو کعبتین شان و غل   جان محکوماں زتن بردند و محکوماں بخواب!

انقلاب! اے انقلاب (۲)

نظام ملوکیت میں آمر کا معیار نیکی و بدی بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسے ہمیشہ اپنے ہی فائدے میں نیکی دکھائی دیتی ہے ۔ طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر وہ بالکل الٹا سوچنے لگتا ہے ۔ اس سلسلے میں افلاطون حکیم کی مثالی ریاست سے مثال پیش کی جاتی ہے ۔'' بہترین مرد اور بہترین عورتوں کا بکثرت ملاپ کرنا چاہئے ۔ جبکہ کم ترین مردوں اورعورتوں کا ملاپ کم سے کم ہونا چاہئے ۔ اور یہ کہ صرف پہلے قسم کے ملاپ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچوں کی ہی پرورش کرنی چاہئے نہ کہ دوسروں کی ۔ اس کے علاوہ اپنے محافظین کے اس گلہ میں بغاوت کے رجحانات سے بچنے کے لئے ضروری ہوگا کہ یہ انتظامات حکام کے علاوہ باقی سب لوگوں سے خفیہ رہیں'' (۳)

مشترکہ شادیوں کا یہ وہ منصوبہ ہے کہ افلاطون حکیم کے ملوکانہ خیالات ونظریات کی غمازی کرتا ہے ۔ اس منصوبے کی

---

(۱) پیامِ مشرق ۔ ۲۱۷۔   (۲) زبورعجم ۔ ۹۴۔   (۳) جمہوریہ افلاطون ۔ پانچویں کتاب ۔

رو سے حکومت جس لڑکی کو چاہے بھیڑ بکری کی طرح پکڑ کر، دوسری عورتوں و مردوں کے اس ریوڑ میں شامل کر لے، جو افزائش نسل کی غرض سے بیرکوں میں پڑے ہیں ۔ ایسی مشترکہ شادیاں جانوروں میں بھی ہوتی ہیں ۔جن میں ''خنزیر'' بھی شامل ہیں ۔ جنہیں ماں ، باپ ، بہن بھائی اور دوسرے مقدس رشتوں کا نہ احساس ہوتا ہے نہ پاس ۔ اپنی مرضی کے خلاف بچوں کو قتل کردینے سے مجھے تو یوں لگتا ہے کہ فرعون جیسے آمر نے یہ طریقہ افلاطون ہی سے سیکھا تھا۔عورتوں اور مردوں کی مشترکہ بیرکوں میں مادر پدر آزاد بچوں کو تو افلاطون حرامی نہیں سمجھتا لیکن ایک ایسا شخص جو:۔

'' باپ بننے کی عمر میں ہے اور شادی کے قابل عمر کی ہی کسی عورت سے ملاپ کرتا ہے ،لیکن جسے حاکم نے اس کی اجازت نہیں دی ہے ۔ ہم یہ کہیں گے کہ وہ ریاست کے لئے قانونی نکتہ نگاہ سے ایک ناجائز ، ناپاک اور حرامی بچہ پیدا کر رہے ہیں''۔ (۱)

یہ تو وہی بات ہوئی کہ Law is an Invention of the strong to chain and rule the weak صاف ظاہر ہے کہ یہ وہ جبرواستبداد ہے جو افلاطونی آمریت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اقبال جیسا ''کلیم'' ایسے فرعونوں کی ہاں میں ہاں نہیں ملا سکتا ۔ ملوکیت کے اس ظلم کدے میں افلاطون یہ بھی کہتا ہے کہ مشترکہ شادیوں کے تحت کسی کو پتہ نہ چلے کہ کون کس کا بیٹا ، بیٹی یا ماں باپ ہے ۔ صاف ظاہر ہے کہ جب ماں باپ کو اپنی اولاد کی شناخت اور اولاد کو والدین کی پہچان نہیں ہوگی تو بھائیوں ، بہنوں اور دوسرے مقدس رشتوں کی پاسداری کیوں کر ہو سکتی ہے؟

''کسی عورت کو یہ پتہ نہ چلنے پائے کہ اس کا اپنا بچہ کونسا ہے'' (۲)

اس طرح افلاطون ماؤں سے ان کی مامتا کا حق بھی چھین لیتا ہے اور بیٹے بیٹیوں کے دلوں سے والدین کے لئے فطری جذبات کو انجانے میں تبدیل کرتے ہوئے بے حسی کی برفیلی سلوں میں بدل دیتا ہے ۔جس قوم کی مائیں اپنے بیٹوں کو نہ پہنچانتی ہوں اور بیٹے ماؤں سے نابلد ہوں وہ آداب فرزندی سے محروم رہتے ہیں ۔ ایسی مائیں اور بیٹے نفسیاتی مریض ہی بن سکتے ہیں وہ کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے ۔ ساری عمر ان کے دل پہ ایک ہی داغ ہوگا ۔کہ ہمارے مقدس رشتے کہاں ہیں ؟ پھر جن بیٹوں کو اپنی ماؤں کے بارے میں کچھ علم نہ ہو، وہ دھرتی ماں سے کیا خاک محبت کریں گے ؟ جبکہ مرغی خانوں جیسی پیدائش گاہوں میں پیدا ہونے والے ان بچوں سے افلاطون یہ توقع بھی رکھتا ہے کہ وہ جوان ہو کر مادر وطن کی خاطر اپنا تن من

---

(۱) جمہوریہ افلاطون ۔ پانچویں کتاب ۔ (۲) جمہوریہ افلاطون ۔ پانچویں کتاب ۔

قربان کرتے ہوئے کارہائے نمایاں سرانجام دیں گے ۔ جو زیادہ بہادر اور جری ہوگا ، وہ لشکر میں موجود سبھی عورتوں و مردوں کا بوسہ لے گا اور سبھی مرد و عورتیں اس کا بوسہ لیں گی ۔ لیکن پھر وہی سوال کہ جو اپنی ماں کو نہیں پہچانتا وہ دھرتی ماں کے لئے کیسے لڑ سکتا ہے ؟ارسطوکلیس (افلاطون) کو تو اپنے والدین کے ناموں کا علم تھا اور ہم بھی جانتے ہیں کہ اس کے والد کا نام ارسٹن اور والدہ کا نام پریکشن تھا ، اسی طرح اس کا والد اور والدہ بھی اپنے بیٹے کو پہچانتی تھی ۔ اپنی آغوش محبت میں اس کی پرورش کی ، لیکن یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ افلاطون کے بنائے ہوئے قانون کے تحت دوسرے لوگ اپنے اپنے پیاروں سے ناآشنا رہیں ۔ اگر افلاطون کی پیدائش سے قبل ایسی ریاست (یٹوپیا) قائم ہوتی تو خود افلاطون کو بھی اپنے والدین کے بارے میں کچھ علم نہ ہوتا ۔ پھر جمالیاتی حوالے سے اقبال کے نظریہ فن میں یہ گنجائش ہرگز نہیں کہ جب چاہو عورت کو ایک مشین کی طرح استعمال کر لو ۔ چنانچہ اقبال افلاطون حکیم سے متفق نہیں ہو سکتے ۔ اس لئے کہ افلاطون ایسی ایسی باتیں کرتا ہے کہ بس آنکھوں میں دھول جھونکتا دکھائی دیتا ہے ۔

چشم ہا از سرمہ اش بے نور تر بندۂ مجبور ازو مجبور تر

از شرابِ ساتکینش الحذر از قمارِ بدنشینش الحذر

از خودی غافل نہ گردد مرد حر حفظِ خود کن حب افیونش مخور

پیش فرعوناں بگو حرف کلیم تا کند ضرب تو دریا رادو نیم (۱)

یہی نہیں افلاطون عجیب وغریب افراط وتفریط کا بھی شکار دکھائی دیتا ہے ۔ ایک طرف تو وہ مقدس رشتوں کو پوشیدہ رکھنے کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور دوسری طرف :-

''جب یہ مرد اور عورتیں عمر کی اس مقررہ حد سے گزر جائیں جبکہ ان کے ہاں بچے پیدا ہو سکتے ہیں تو ہم بے شک ان کو اس بات کی اجازت دیدیں گے کہ جس سے مرضی رابطہ رکھیں ماسوائے اس کے کہ ایک مرد کو اپنی بیٹی یا ماں یا پوتی اور دادی نانی سے اختلاط نہ کرنا ہوگا ۔ اسی طرح عورتوں کو اپنے بیٹوں اور باپوں یا پوتے اور دادا نانا سے اختلاط نہ کرنا ہوگا ۔ یہ اجازت بھی ہم انہیں اس وقت دیں گے جبکہ ہم انہیں یہ تنبیہ کر چکے ہوں گے کہ اگر اس قسم کے ملاپ کے نتیجے میں اتفاق سے کوئی حمل ٹھہر جائے تو اسے ساقط کر دینا ہوگا ۔ تاہم اگر حمل ساقط نہ ہو سکے تو بچے کو پیدا ہوتے ہی تلف کر دینا ہوگا ۔ کیونکہ اس قسم

---

(۱) پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق ۔ ٦٨ ۔

کے بچے کی پرورش نہیں کی جاسکتی ......انہیں اس بات کا تو بالکل پتہ نہ چل سکے گا کہ ان کی مخصوص ماں یا بیٹی یا بیٹا کون ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ تمام بچے جو کسی آدمی کی شادی کے ساتویں سے دسویں مہینے تک پیدا ہوں گے، انہیں وہ اپنے بیٹے بیٹیاں کہے گا اور بچے اس شخص کو اور اس کے ہم عمر دوسرے مردوں کو باپ دادا سمجھیں گے۔ یہ تمام بچے آپس میں بھائی اور بہنیں کہلائیں گے۔ قانون ان بھائیوں اور بہنوں کے ملاپ کی اجازت دے سکتا ہے بشرطیکہ قرعہ اندازی کے نتائج ان کے مطابق ہوں اور اپالو کی پجارن اس کی اجازت دے'' (۱)

صاف ظاہر ہے کہ اس ''درز غوبل'' اور ''غوبیے'' کے اندر مقدس رشتوں کا تقدس بحال نہیں رہ سکتا۔صرف عمر کے لحاظ سے تک بندی کے ذریعے رشتوں کی تقدیس قائم نہیں رہ سکتی۔ جب کوئی حقیقی ماں یا بہن کو جانتا ہی نہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ زندگی کے کسی بھیانک اور مکروہ موڑ پر اپنی ہی ماں اور بہن کے ساتھ شادی کرنے سے بچ سکیں گے۔ یہی نہیں بلکہ افلاطون مثالی ریاست میں حکام کو مزید چالاکیاں بھی سکھاتا ہے۔ یہ ایسی چالاکیاں ہیں جو مکاری اور عیاری اور دھوکہ دہی کی حدود کو بھی پھلانگتی نظر آتی ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ حکام کو نہایت چالاکی سے قرعہ اندازی کا طریقہ اپنانا چاہئے تاکہ وہ لوگ جو ان کی نظر میں شادی کے قابل نہیں ہیں، جب مسترد کردیئے جائیں تو بجائے حکام کے وہ اپنی قسمت کو الزام دیں'' (۲)

تقدیر پرستی کا یہ رجحان گردش دوراں کا ایک چکر ہے جس کے ننانوے کے پھیر میں افلاطون نچلے طبقے کے غریب لوگوں کو ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ اقبال کیا خوب فرماتے ہیں۔

اس کی خودی ہے ابھی شام وسحر میں   گردش دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ (۳)

اسی روز وشب میں الجھ کر نہ رہ جا   کہ تیرے زمان ومکاں اور بھی ہیں (۴)

کھونہ جا اس سحر وشام میں اے صاحب ہوش   اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش! (۵)

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں   تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟ (۶)

اگر انسان کی خودی آفاقی اور کائناتی ہوتو وقت کی قیود سے آزاد ہوکر تقدیر کے پھندوں سے بھی رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔خلق خدا کے ساتھ جوکوئی بھی دھوکہ دہی اور حیلہ سازی ومکر بازی کرتے ہوئے ان پر حکمرانی کرتا

---

(۱) جمہوریہ افلاطون۔ پانچویں کتاب۔ (۲) ایضاً۔ (۳) بال جبریل۔۷۲۔

(۴) بال جبریل۔۴۱۔ (۵) ایضاً۔۷۴۔ (۶) ارمغان حجاز۔۳۲۔

ہے۔ اقبال افلاطون سمیت سب ایسے گندم نما جوفروش لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں۔

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے! (۱)

برٹرینڈ رسل افلاطون کے ان خیالات پریوں تبصرہ کرتا ہے''افلاطون کا کمال یہ ہے کہ اس نے تنگ نظری کے خیالات ایسے انداز میں پیش کیئے کہ آنے والی نسلیں دھوکے میں آ گئیں۔ صدیوں تک ری پبلک کی تعریفیں ہوتی رہیں۔ لیکن کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ اس کی تجاویز میں کیسی کیسی ضرررساں باتیں پوشیدہ ہیں'' (۲)

اقبال حیلہ ومکروفریب کے بالکل خلاف ہے اس لئے وہ افلاطون کی قرعہ اندازی جیسی چالاکیوں کے بالکل حق میں نہیں۔

ہو اگرقوت فرعون کی در پردہ مرید قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللہی (۳)

ایسی عیاری اور مکروفریب کی بناء پر بھی علامہ اقبال نے افلاطون کی سخت مخالفت کی ہے بے شک ایسے خیالات سے ملوکانہ خیالات کی بدبو بھی آ رہی ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں۔

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است ازوایمن نہ رومی ، نے حجازی است
حضور تو غم یاراں بگویم بامیدے کہ وقتِ دل نوازی است! (۴)

اس قطعے سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ اقبال ملوکیت کو پسند نہیں کرتے تھے، پس ملوکیت دور حاضر کی ہو یا عہد پارینہ کی اقبال کے نزدیک گردن زدنی ہے۔ پھر مشترکہ شادیوں کے لئے قرعہ اندازی کا ڈھونگ رچاتے ہوئے بھی افلاطون سراسر مکروفریب کا پلندہ دکھائی دیتا ہے۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی وبے باکی اللہ کے شیروں کوآتی نہیں روباہی (۵)

ایسے میں اقبال ، افلاطون کے ساتھ کیسے متفق ہوسکتے ہیں؟ چنانچہ اقبال کے نزدیک یہ مکروفریب ملوکیت کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ سلطانی افلاطونی یوٹوپیا کی صورت میں ہو یا فرعونی صورت میں اقبال کے نزدیک شیطانی ہے۔ جس کا علاج خلافت کے بغیر ممکن نہیں۔

خلافت بر مقام ماگواہی است حرام است آنچہ برما پادشاہی است

---

(۱) بالِ جبریل ۔ ۴۸۔ (۲) تاریخ فلسفہ مغرب ۔ ۱۲۵۔ برٹرینڈ رسل ۔ (۳) ضرب کلیم ۔ ۱۵۸۔
(۴) ارمغانِ حجاز ۔ ۲۶۔ (۵) بالِ جبریل ۔ ۵۷۔

ملوکیت ہمہ مکرات و نیرنگ خلافت حفظ ناموس الٰہی است! (۱)

علاوہ ازیں قرعہ اندازی کے حوالے سے ''اپنی قسمت ہی کو الزام دیں گے''۔ اور نظریہ اعیان کے ضمن میں ۔ جب افلاطون غار کے اندر انسانوں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدیوں سے تشبیہ دیتا ہے تو اقبال جیسے ''تقدیر شکن'' اور ''جبر شکن'' مفکر عاشق کے نظریات افلاطونی نظریات سے متصادم ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کہ اقبال انسان کو زنجیروں میں جکڑا ہوا مجبور و بے کس قیدی نہیں سمجھتے ۔

نہ ستارے میں ہے، نے گردش افلاک میں ہے تیری تقدیر مرے نالہء بیباک میں ہے! (۲)

بچشم مردہ دلاں کائنات زندانے است دوجام بادہ کشیدند واز جہاں رستند (۳)

اور نہ ہی تقدیر پرستی پر یقین رکھتے ہیں :

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا کہ وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبوں (۴)

مگو بامن خدائے ما چنیں کرد کہ شستن میتواں از دامنش گرد

تہ و بالاکن ایں عالم کہ دروے قمارے می برد نامرد ازمرد! (۵)

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے کہ خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں (۶)

کب تک رہے محکومی انجم میں مری خاک یا میں نہیں یا گردش افلاک نہیں ہے! (۷)

فکر اقبال کا یہی وہ سلسلہ ہے جس کے زیر اثر وہ انسان کو فطرت پر فوقیت دیتے ہیں اور اسی سوچ کی بناء پر زیر تحریر مقالے میں پہلے ہی یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ اقبال نے اپنے ذوق جمال کی روشنی میں فطریت کے خلاف بھی اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے ____ جس کا مبدا و منبع افلاطونی تصورات ہی تھے۔ لہٰذا انسان کو زنجیروں میں جکڑا دکھانے اور تقدیر کے بھنور میں پھینک دینے پر بھی اقبال افلاطون سے اتفاق نہیں کرتے ۔ اس لئے کہ اقبال کے نزدیک انسان کا مقام بہت بلند ہے۔

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی (۸)

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے (۹)

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا وہ مشت خاک ابھی آوارگان راہ میں ہے (۱۰)

---

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۹۰۔ (۲) بال جبریل ۔ ۶۵۔ (۳) زبور عجم ۔ ۲۲۰۔ (۴) بال جبریل ۔ ۲۷۔ (۵) ارمغان حجاز ۔ ۱۱۶۔

(۶) بال جبریل ۔ ۴۴۔ (۷) بال جبریل ۔ ۳۴۔ (۸) بانگ درا ۔ ۲۷۴۔ ''طلوع اسلام'' (۹) بال جبریل ۔ ۱۰۔ غزل ۔ (۱۰) ایضاً ۔ ۶۸۔ غزل۔

بلند بال چنانم کہ برسپہر بریں — ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند (۱)

کجانورے کہ غیراز قاصدی چیزے نمی داند — کجاخاکے کہ درآغوش دارد آسمانے را (۲)

ہے گرمئی آدم سے ہنگامہ عالم گرم — سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی (۳)

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن — زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟ (۴)

بپایاں نارسیدن زندگانی است — سفر مارا حیاتِ جاودانی است

زماہی تابمہ جولاں گہ ما — مکان وہم زماں گرد رہ ما (۵)

افکارِ اقبال میں انسان وہ عظیم ہستی ہے کہ خدا بھی اس کی تلاش میں ہے۔

گدائے جلوہ رفتی بر سرطور — کہ جانِ تو زخود نامحرمے ہست

قدم درجستجوئے آدمے زن — خدا ہم درتلاش آدمے ہست (۶)

منکر حق نزد ملا کافر است — منکر خود نزدمن کافر تراست! (۷)

اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اقبال ثابت کرتے ہیں کہ تقدیر پرستی ابلیسی مشغلہ ہے۔ اس لئے بھی اقبال افلاطون سے متفق دکھائی نہیں دیتے۔

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں! (۸)

بپائے خود مزن زنجیرِ تقدیر — تہِ ایں گنبد گرداں رہے ہست

اگرباورنداری، خیز ودریاب — کہ چوپاواکنی جولاں گہے ہست (۹)

چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ اپنے پاؤں میں تقدیر کی زنجیر نہ پہن۔ اس گنبد گرداں سے نکلنے کا راستہ موجود ہے۔ اگر اعتبار نہیں تو اٹھ، کوشش کر اور اس راستے کو پالے۔ جب تو قدم اٹھائے گا تو دیکھے گا کہ میدان موجود ہے۔ اور پھر غزل کے مندرجہ ذیل اشعار تو اس مجبوری و بے بسی کا شدید ردعمل ہیں جو افلاطون نے غار کے اندر انسانوں سے وابستہ کی تھی۔

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں! — آب وگل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا میں

---

(۱) زبورعجم ۔۲۵۴۔ (۲) زبورعجم ۔۵۴۔ (۳) بال جبریل ۔۱۲۲۔ (۴) ایضاً ۔۶۔ (۵) زبورعجم ۔۱۶۶۔

(۶) پیام مشرق ۔۴۰۔ (۷) جاوید نامہ ۔۲۰۳۔ (۸) ارمغان حجاز ۔۵۔ (۹) پیام مشرق ۔۵۰۔

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم — اک ردائے نیلگوں کو آسمان سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ وخم میں رہ گیا — مہروماہ ومشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں (۱)

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں — ہمت ہو پرکشاتو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا ہے تو ہے نام اس کا آسماں — زیر پرآ گیا تو یہی آسماں زمیں (۲)

باوج مشتِ غبارے کجارسد جبریل! — بلند نامیٔ او از بلندیٔ بام است (۳)

یونان میں تقدیر پرستی بہت زیادہ تھی جس کے زیر اثر افلاطون بھی تقدیر پرستی کا قائل دکھائی دیتا ہے۔تاریخ تصوف قبل از اسلام میں بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں:۔''یونانیوں کے ہاں قسمت کا تصور اتنا وسیع تھا کہ ان کے نزدیک نہ صرف انسان بلکہ خود دیوتا بھی اس عالمگیر قوت سے آزادنہیں۔ اس تصور جبریت کے ساتھ بعد میں بابل کی ستارہ پرستی نے مل کر ایک ایسی خوفناک شکل اختیار کرلی کہ انسان محض بے جان ہستی بن کر رہ گیا''۔ (۴)

ادھر اقبال انسان سے تسخیر کائنات کا کام لینے کی خاطر اسے انسان کامل کے رتبے پر فائز کرتے ہیں چنانچہ افلاطون کے برعکس اقبال سمجھتے ہیں کہ انسان تقدیر کے بندھنوں میں جکڑا کسی غار کی تاریکی میں گم سم پڑانہیں بلکہ:۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے — کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں! (۵)

کب تک رہے محکومیٔ انجم میں مری خاک — یا میں نہیں، یاگردش افلاک نہیں ہے
بجلی ہوں نظرکوہ و بیاباں پہ ہے میری — میرے لئے شایاں خس وخاشاک نہیں ہے! (۶)

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اورنہیں (۷)

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے — جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے (۸)

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کرلیتا ہے یہ بال وپر روح الامین پیدا (۹)

فروغ خاکیاں ازنوریاں افزوں شود روزے — زمیں ازکوکب تقدیر ما گردوں شودروزے (۱۰)

فرشتہ گرچہ بروں از طلسم افلاک است — نگاہ او بتماشائے ایں کف خاک است (۱۱)

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے — ذرۂ نا چیز وتعمیر بیابانے نگر! (۱۲)

---

(۱) بال جبریل۔ص۔۸۔غزل۔(۲) ضرب کلیم۔۱۷۶۔(۳) زبور عجم۔۲۶۔(۴) تاریخ تصوف قبل از اسلام۔۳۲۔بشیر احمد ڈار۔(۵) بال جبریل۔۲۷۔(۶) ایضاً۔۳۳۔
(۷) ایضاً۔۳۷(۸) ایضاً۔۳۹۔(۹) بانگ درا۔۲۷۱۔''طلوع اسلام'' (۱۰) زبور عجم۔۱۱۳۔جاوید نامہ میں فروغ مشت خاک ہے۔(۱۱) زبور عجم۔۷۷۔(۱۲) زبور عجم۔۵۹۔

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے　　کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

خودی کو کربلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے (۱)

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں　　ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی! (۲)

لیکن اس کے لئے بقول اقبال

ضمیر پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق　　نہ مال و دولتِ قاروں ، نہ فکر افلاطون! (۳)

اک آن میں سوبار بدل جاتی ہے تقدیر　　ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　　مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابندی (۴)

خویشتن را تیزیٔ شمشیر دہ　　باز خود را درکف تقدیر دہ (۵)

ہرکہ از تقدیر دارد سازوبرگ　　لرزد از نیروئے اوابلیس ومرگ (۶)

تقدیر پرستی کے اس رجحان کی مخالفت علامہ اقبال نے پیام مشرق میں اپنی ایک نظم ''محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ ومرد مزدور'' کے ذریعے بھی کی ہے۔ اس مکالماتی نظم میں فلسفی مزدور سے کہتا ہے! اولاد آدم ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں۔ ایک شجر کی شاخیں، پتے اور ثمر ہیں۔ دماغ میں عقل فطرت کی عطا کردہ ہے۔ پاؤں زمیں پر چلتا ہے تو یہ بھی فطری عمل ہے۔ کوئی حاکم ہے تو کوئی محکوم یعنی حکم بجالانے والا۔ محمود ایاز کا کام نہیں کرسکتا۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ تقسیم کار کے باعث خار حیات بھی چمن بن جاتا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند　　ہماں نخل را شاخ وبرگ وبراند

دماغ ار خرد زاست ،ازفطرت است　　اگر پا زمیں ساست، از فطرت است

یکے کار فرما ، یکے کارساز　　نیاید زمحمود کار ایاز

نہ بینی کہ از قسمتِ کارزیستِ　　سراپا چمن می شود خارزیست (۷)

مزدور جواباً کہتا ہے، اے فلسفی! کیا تو مجھے اپنے فلسفے کے فریب میں پھنساتے ہوئے کہتا ہے کہ اس پرانے طلسم کوتوڑنا محال ہے۔ تو کچے تانبے پر سونے کا پانی چڑھا کر مجھے ہر حال میں تسلیم ورضا کی عادت اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

---

(۱) بال جبریل۔ ۵۵۔ غزل۔ (۲) ایضاً۔ ۱۹۔ (۳) بال جبریل۔ ۲۷۔ (۴) ضرب کلیم۔ ۶۴۔ ''احکامِ الٰہی''۔

(۵) پس چہ باید کرد۔ ۴۶۔ (۶) جاوید نامہ۔ ۱۲۱۔ (۷) پیام مشرق۔ ۲۰۴۔

جبکہ میری کشتی سمندر کو مسخر کرتی ہے۔ میرا تیشہ چٹان سے دودھ کی نہر بہاتا ہے۔ اے فلسفی تو نے کوہکن کا حق چالاک پرویز کے حوالے کر دیا ہے، جس نے کوئی محنت و مشقت نہیں کی، کوئی تکلیف نہیں اٹھائی۔ اپنے فلسفے کے بل بوتے پر غلط کو درست مت بنا، خضر کو سراب کے جال میں لانے کی بے سود کوشش نہ کر۔

فریبی بحکمت مرا اے حکیم — کہ نتواں شکست ایں طلسمِ قدیم
مسِ خام را از زر اندودۂ؟ — مرا خوے تسلیم فرمودۂ؟
کند بحر را آبنا یم اسیر — زخارا برد تیشہ ام جوے شیر
حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویز پرکار و نابردہ رنج؟
خطا را بحکمت مگرداں صواب — خضر را نگیری بدامِ سراب (۱)

ٹالسٹائی نے بھی تقدیر پرستی کی مخالفت کی ہے۔ جسے اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں باندھا ہے۔

عقل دوراندیش آفرید فلسفۂ خود پرست — درسِ رضا می دہی بندۂ مزدور را؟ (۲)

اقبال کے نزدیک تقدیر ایک بہانہ ہے جو انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے چنانچہ اپنی ایک دوسری نظم ''قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور'' میں اقبال طنزاً لکھتے ہیں۔ جس میں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے۔ فولاد سازی کے کارخانے کا شور میرے لئے ہے۔ اور کلیسا کے پیانو کی خوبصورت آواز تیرے لئے۔ وہ درخت جس سے بادشاہ خراج وصول کرتا ہے میرے لئے ہے اور بہشت کا باغ، سدرہ اور طوبیٰ تیرے لئے ہیں۔ وہ تلخ شراب جو دردِ سر پیدا کرے میرے لئے ہے آدم و حوا (یعنی جنت)، تیرے لئے ہے۔ مرغابی، تدرو اور کبوتر میرے لئے ہے۔ اور ظلِ ہما اور شہپرِ عنقا تیرے لئے۔ یہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے۔ وہ میرے لئے ہے اور زمین سے عرش تک سب تیری ملکیت ہے۔

غوغائے کارخانۂ آہن گری ز من — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شاہ خراج بردی ز من — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابۂ کہ دردِ سر آرد از آنِ من — صہبائے پاک آدم و حوا از آنِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر از آنِ من — ظلِ ہما و شہپرِ عنقا از آنِ تو

---

(۱) پیام مشرق ـ ۲۰۵ـ (۲) ایضاً ـ ۱۹۷ـ

این خاک و آنچہ درشکمِ او ازان من ‏ و زخاک تابہ عرشِ معلا ازان تو (۱)

گویا کہ:۔

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار

انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات (۲)

اور دوسری افلاطون جیسے استحصالی مفکرین کی حیلہ سازی ہے، جو طبقاتی درجہ بندی کرتے ہوئے غریبوں کو نچلے درجے میں پھینک کر انہیں اپنی تقدیر پر کف افسوس ملنے کی ترغیب دیتے ہیں تاکہ حکمرانوں کے استحصالی ہتھکنڈے ان کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ اور وہ حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی بجائے اپنی تقدیر ہی کو کوستے رہیں۔ اس کے برخلاف

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب رنگ ‏ خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات (۳)

اقبال انسان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں وہ اسے ستاروں پر کمند ڈالنے کے جذبہ اولیٰ سے نوازتے ہیں اس لئے کہ:۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ! ‏ یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ (۴)

غلام ہمت بیدار آں سوارانم ‏ ستارہ را بسناں سفتہ درگرہ بستند (۵)

حدیث بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز! ‏ زمانہ باتونسازد، تو بازمانہ ستیز (۶)

چنانچہ اقبال تقدیر پرستوں کے لئے دعاگو ہیں کہ اے میرے مالک مجھے تقدیر کے ترکش یعنی پھندے سے آزاد کر دیجئے۔ اس لئے کہ جو تیر ترکش کے پھندے میں ہو وہ کیسے جگر کے پار ہوسکتا ہے۔

مرا اے صید گیر از ترکش تقدیر بیروں کش ‏ جگر دوزی چہ می آید ازاں تیرے کہ درکش است (۷)

ایسی صورتحال میں علامہ محمد اقبال یہ پیغام دیتے ہیں۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو ‏ اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو! (۸)

یہی وہ زیرِبحث نکات ہیں جن کی بنا پر:۔

تڑپ رہا ہے فلاطوں میان غیب و حضور ‏ ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف! (۹)

اس کے علاوہ صاحب تاریخ فلسفہ یونان لکھتے ہیں کہ:۔" افلاطون کا خیال ہے کہ روح کی صحیح تربیت اور نشوونما کے

---

(۱) پیام مشرق۔۲۱۵۔ (۲) بانگِ درا۔۲۶۳۔"خضرِ راہ"۔ (۳) بانگِ درا۔۲۶۲۔خضرِ راہ۔ (۴) بالِ جبریل۔۶۷۔

(۵) زبورِعجم۔۲۲۰۔ (۶) بالِ جبریل۔۱۲۔ (۷) زبورِعجم۔۹۲۔ (۸) بانگِ درا۔۲۹۳۔"خضرِ راہ"۔ (۹) بالِ جبریل۔۷۸۔

لئے فلسفہ یعنی تصورات کا علم ضروری ہے ۔ جو انسان اس دنیا میں عقل کی نشوونما کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرتا اس کی روح دنیائے تصورات میں پہنچ کر تکلیف اٹھاتی ہے اور سزا کے طور پر اسے دوبارہ کسی کم تر بدن میں ڈال کر اس دنیا میں بھیج دیا جاتا ہے ۔ یعنی اس کی روح کو کسی جانور وغیرہ کے جسم میں ڈال دیا جاتا ہے ۔'' (۱)

اس کا مطلب ہے کہ افلاطون اواگون کا قائل تھا ۔ صاف ظاہر ہے کہ اقبال نے اس لئے بھی افلاطون کی مخالفت کی۔ یہ مقام حیرت ہے کہ افلاطون جیسا جمالیات شناس جس کے نزدیک روح ہی ''حسن ہے'' اس حسن کو مسئلہ اواگون کے تحت مختلف جانوروں کے قالب میں ڈالنے پر یقین رکھتا ہے ۔ میرے ذہن میں اس لمحے ایک نکتہ رونما ہوا کہ اگر انسانی روح کسی حیوان کے بدن میں داخل کر دی جائے تو وہ حیوان انسان ہی کی طرح عاقل و عاشق بن کر ستاروں پر کمند ڈالتا پھرے گا۔ عشق کی ایک ہی جست سارا قصہ تمام کر دے گی ۔ اور تمام فنون لطیفہ بھی اس حیوان کی جولانگاہ بن جائیں گے ۔ پھر وہ بیں بیں ، ہاؤ ہاؤ ، چنگھاڑنے ، گرجنے اور میاؤں میاؤں کرنے کی بجائے مختلف زبانیں بولنے لگے گا۔

اس کے بعد افلاطون کے ہونہار شاگرد ارسطو کے بارے میں قلم اٹھایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو (۳۸۴ ۔ ۳۲۲ ق ۔م) تھریس کے شہر استاجرہ میں پیدا ہوا اور کلکس میں وفات پائی اس کا والد نکومیکس ، اسکندر اعظم کے دادا امنطاس ، جو مقدونیہ کا حکمران تھا کا دوست اور درباری طبیب تھا ۔ اسی لئے کتھارسس (Katharsis) وغیرہ کے حوالے سے ارسطو کی شخصیت پر علوم طبیعہ کا فطری اثر تھا ۔ ''مشی کے معنی عربی زبان میں چلنے اور ٹہلنے کے ہیں''۔ (۲)

'' ارسطو چونکہ ٹہلتے ہوئے درس دینے کا عادی تھا اس لئے اس کے مکتب فکر کا نام مشائیت (Peripatetic School) اور اس کے پیرووں کا نام ''مشائین'' (Peripatectics) پڑ گیا''۔ (۳)

اسی طرح دین محمد شفیقی عہدی پوری لکھتے ہیں :۔

'' ارسطو کے مدرسے کا نام پری پتاتک (Peripatetic) مشہور ہوا ۔ پری پاتوس (Peripatos) کے معنی چہل قدمی کے ہیں ۔ عربی میں اس کا ترجمہ'' مشائین ہے اس کے مقابلے میں افلاطونیوں کو'' اشراقین'' کہتے ہیں ۔ مشائین منطقی تھے اور اشراقین تخیل و ادب و شعر اور ریاضیات کے دلدادہ تھے''۔ (۴)

ارسطو سقراط کے تصور حسن کا انکار کرتا دکھائی دیتا ہے ۔ اس کے نزدیک فطرت ہی حسن کا سرچشمہ ہے ۔ وہ افلاطون

---

(۱) تاریخ فلسفہ ء یونان ۔ ۱۳۴ ۔ نعیم احمد۔ (۲) حکمائے اسلام جلد اول ۔ ۱۵ ۔ عبدالسلام ندوی۔

(۳) تاریخ جمالیات ۔ جلد اول ۹۶ ۔ ۹۷ ۔ نصیر احمد ناصر ۔ (۴) فلسفہء ہند و یونان ۔ ۱۲۱ ۔ ۱۲۲ ۔

کی طرح خیر اور حسن کو ایک ہی شے خیال نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ نیکی ہمیشہ عمل میں پائی جاتی ہے، جو متحرک حالت ہے۔ جب کہ حسن بے حرکت اور جامد اشیاء یا حقیقی سکوں میں مضمر ہوتا ہے۔

مگر میں یہ کہوں گا کہ حسن بھی متحرک ہوتا ہے۔ موسموں کا آنا جانا، فطرت کے نئے نئے خوش رنگ لباس زیب تن کرنا، آفتاب و مہتاب کا طلوع و غروب، خود حسن مطلق کی تجلی کا پوری کائنات میں پھیل جانا وغیرہ۔ پھر علامہ اقبال کے ہاں تو حسن کی بے پناہ قوت ہر وقت متحرک دکھائی دیتی ہے۔ اگر حسن ساکن ہو تو کائنات کا عمل رک جائے۔

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں — چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں (۱)

وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب — لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب (۲)

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں — معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا (۳)

زندگانی از خرام پیہم است — برگ و سازِ ہستیء موج از رم است (۴)

این گل ولالہ تو گوئی کہ مقیم اندہمہ — راہ پیما صفتِ موجِ نسیم اندہمہ (۵)

فنی نکتہ نظر کے حوالے سے نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں کہ "ارسطو قبیح کو حسن ہی کی ایک ناگزیر صفت سمجھتا ہے ----- مثلاً اس کے نزدیک ہر قابل تضحیک شے (Ugliness) طربیہ کا موضوع ہوتی ہے۔ چونکہ قبیح فن لطیف کے ضمن میں آجاتا ہے اس لئے خوبصورت شے کی ایک ضروری صفت ہوا۔ ہم ان اشیاء کی کمال ہنرمندی سے بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں جنھیں ہم ان کی اصلی صورت میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ مثلاً رزیل ترین جانوروں یا نعشوں کو" (۶)

یعنی کہ تضحیک بری چیز ہے، لیکن طربیے میں دلکش لگتی ہے۔ اسی طرح بدصورت جانور یا نعشیں تو قبیح ہوتی ہیں، لیکن ان کی تصویریں اچھی لگتی ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ طربیے سے ہٹ کر دیکھا جائے تو تضحیک اچھی نہیں لگتی، بلکہ ہوسکتا ہے طربیے میں بھی ہر ایک کو اچھی نہ لگے، اسی طرح بدصورت جانور کی تصویر بالکل اس جانور کی طرح تو لگ سکتی ہے مگر خوبصورت کبھی نہیں لگتی، اسی طرح نعش کی تصویر بھی نعش کی طرح ہوگی۔ تصویر اپنی طرف سے خود بخود حسین و قبیح نہیں ہوسکتی، ہمیں جو خوشی ہوتی ہے وہ فن کار کی مہارت پر ہوتی ہے۔

"افلاطون کے برعکس ارسطو فطرت کو کمتر درجے کا فن تصور کرتا ہے اور انسانی فن کو اس سے ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہے

---

(۱) بال جبریل۔ ۱۱۱۔ ذوق و شوق (۲) بال جبریل۔ ۱۰۰۔ "مسجد قرطبہ" (۳) ضرب کلیم۔ ۱۷۳۔

(۴) اسرار و رموز۔ ۴۶۔ (۵) جاوید نامہ۔ ۸۳۔ (۶) تاریخ جمالیات۔ جلد اوّل۔ ۱۰۰، ۱۰۱۔ نصیر احمد ناصر

کیونکہ موخرالذکر فطرت کی فنی خامیوں کو دور کر دیتا ہے۔"   (۱)

علامہ اقبال کا بھی یہی نظریہ ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس تخلیق کار نے فطرت پیدا کی، اسی نے انسان کو بھی تخلیق کیا۔ انسان خود تخلیق ہو کر، خالق کی ایک دوسری تخلیق "فطرت" کی خامیاں کیسے دور کرے گا؟ کیا ہرے بھرے پھل دار یا بے ثمر درخت کو چوٹی سے کاٹ دینا یا کسی دوشیزہ کی لیل زمستاں بساں زلفِ دراز اور کبوتر کے پر یا دم، تراش خراش کے بہانے کتر دینا فطرت کی فنی خامیوں کو دور کرنا ہے یا خوبصورت فطرت کو بدصورت بنانا ہے۔ پھر وہ فطرت ہی کیا؟ جس میں فنی خامیاں موجود ہوں؟

افلاطون شاعری کی مخالفت اس لئے کرتا ہے کہ شاعری جذبات کو بھڑکا کر انسانی اعصاب کو کمزور کر دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان بے قابو ہو جاتا ہے۔ جبکہ ارسطو بالخصوص المیاتی شاعری کو تطہیر جذبات کا ایک بڑا وسیلہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک "حزنیہ" یا "طربیہ" دونوں ہی تزکیہ نفس (Katharsis) کا کام کرتے ہیں۔ اس طرح شاعری انسانی جذبات کو بے شک بھڑکا کر فالتو جذبات کا انخلا کر دیتی ہے اور انسان تزکیہ نفس کی صورت میں اعصاب زدگی کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے۔" ارسطو نے "بوطیقا" میں اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ ہر فنی تخلق خواہ وہ تصویر ہو یا نظم حسین ہوتی ہے اور اپنے اپنے اعتبار سے مسرت عطا کرتی ہے۔ اس کے خیال میں فن نہ صرف حسن کا آئینہ دار ہے بلکہ تزکیہ نفس کا وسیلہ بھی ہے۔ چنانچہ وہ المیہ کو فنی تخلیق کا اعلیٰ معیار قرار دیتا ہے جس کے ذریعے سے جذبات کی تطہیر ہوتی ہے"۔   (۲)

تزکیہ نفس (Katharsis) ایک طبعی اصطلاح ہے، جس کے معنی جلاب یا ہلکا کرنے کے ہیں۔ بالکل جلاب ہی کی طرح، شاعری کے طفیل انسانی جذبات کا انخلا ہو جاتا ہے تو انسان پرسکون محسوس کرنے لگتا ہے مثلاً اگر کسی شخص کا انتہائی قریبی عزیز فوت ہو جائے تو ایسے دلدوز موقع پر شاعری اس غم زدہ شخص کا بہترین نفسیاتی علاج کر سکتی ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے   آج وہ کل ہماری باری ہے

غیرت خور مہ جبیں نہ رہے   (ماخوز از مثنوی

ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے   مرزا شوق)

ارسطو کے بارے میں مختلف آرا کا تجزیہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وہ تو افلاطون کے برخلاف"

---

(۱) تاریخ جمالیات۔ جلد اوّل۔ ۱۰۲۔   (۲) جمالیات شرق و غرب۔ ۱۴۲۔۱۴۳۔ پروفیسر ثریا حسین۔

نقل'' کو''فن کاری'' ، باز آفرینی اور تخلیق مکرر کے معنوں میں استعمال کرتا ہے ۔''تخلیقی عمل ایک قسم کی نقالی ہے۔ جس کو ارسطو معروضات یا اصل واقعات کے استحضار (Representation) سے تعبیر کرتا ہے'' (۱)

اس طرح ارسطو کا نظریہ نقل افلاطون کے نظریہ نقل سے یکسر مختلف دکھائی دیتا ہے۔ نظریہ اعیان کے تحت افلاطون دوسرے و تیسرے درجے کی نقالی پر بات کرتا ہے۔ جبکہ ارسطو کہتا ہے :۔

''نقل کرنا بچپن ہی سے انسان کی جبلت ہے'' (۲)

نقل ، بچپن ، انسان اور جبلت سے صاف ظاہر ہے کہ ارسطو کی نقل سے مراد پیروی ، ترجمانی اور تقلید کرنا ہے ۔ کہ انسان بچپن ہی میں فطری طور پر دوسروں کی تقلید کرنا شروع کر دیتا ہے ۔ مثلاً بچہ سب سے پہلے وہی زبان سیکھتا اور بولتا ہے جو اس کے والدین یا ، ماحول کے لوگ بولتے ہوں ۔ بچے جب بڑوں کو گھروں میں رہتا دیکھتے ہیں تو وہ بھی درختوں کے پتوں وغیرہ کو برتنوں کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ، مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بنا کر کھیلتے ہیں ۔ ان گھروندوں میں وہ پتوں کے علاوہ ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑوں کو بھی برتنوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔ چھوٹی چھوٹی ہانڈیوں میں ساگ پکاتے ہیں اور بیریوں کے بیر توڑ کر سلوں پہ رگڑ کر چٹنی بناتے ہیں ۔

بچہ جب کسی کو پھول سونگھتے دیکھتا ہے ۔تو وہ بھی پھول سونگنے لگتا ہے بلکہ اپنے بڑوں کی ناک کے آگے پھول رکھ کر انہیں بھی لطف اندوز کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ جب بڑوں کو چلتا پھرتا دیکھتا ہے تو وہ بھی اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہوکر چلنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اگر بچے کو انسانوں کی بجائے کسی طریقے سے چوپایوں میں رکھا جائے تو وہ کبھی دو ٹانگوں پہ نہ چل سکے گا ۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ سیکھتا ہے ، تقلید کی بنا پر سیکھتا ہے اور یہی ارسطو کی نقل ہے ، افلاطون نقل یا نقالی کی وجہ سے فن اور فن کار کی مذمت کرتا ہے ۔ جبکہ ارسطو کے نزدیک نقل ہی کی بدولت انسان انسان بنتا ہے ۔نقل ہی کی بناء پر انسان اشرف المخلوقات ہے ۔نقل ہی کے طفیل انسان نے ہر طرح کی ترقی کی ہے ۔ ہوائی جہازوں سے لے کر پیڈسٹل پنکھوں اور زیورات کے مختلف نمونوں تک نقل اور پیروی ہی کا ثمرہ ہے ۔ تمام ایجادات کے نمونے فطرت میں پہلے سے موجود ہیں ۔مختلف زیورات کے ڈیزائن کھیتوں اور ویرانوں میں چھوٹے چھوٹے پھولوں و ساگ پات کی صورت میں موجود ہیں ۔ انواع و اقسام کی شکل وصورت رکھنے والے پرندے نہ ہوتے تو ہمارے جہاز بھی نہ ہوتے ۔حتیٰ کہ انسان کے

---

(۱) جمالیات شرق و غرب ۔۱۴۳۔ (۲) بوطیقا ۔۳۹۔ ارسطو۔ مترجم عزیز احمد ۔

مختلف ہیلی کا پٹر ہو بہو مچھروں اور مکڑوں کے ڈیزائن پر بنائے گئے ہیں ۔ افلاطون فن کو نقل اور فن کار کو نقال قرار دے کر دونوں کی تذلیل کرتا ہے جبکہ ارسطو فن کو پیروی اور فن کار کو پیروکار سمجھتے ہوئے ------------- فن و فن کار کو اوج کمال کے رتبے پر فائز کرتا ہے ۔ چنانچہ فن کی تعریف کرتے ہوئے ارسطو رقم طراز ہے ۔

''کسی پیش نظر حقیقت یا واقعیت کی نقل کو اپنے زور تخیل سے حد کمال تک پہنچا دینا'' (۱)

ارسطو نے ''شعریات'' میں کہیں بھی نہیں لکھا کہ افلاطون کے نظریہ نقل سے اسے اختلاف ہے یا اتفاق ۔ بس اس نے اپنا نظریہ پیش کر دیا ہے ۔ افلاطون کے برعکس ارسطو کے نزدیک :۔

''نقل کے موضوع انسان کے افعال ہیں'' (۲)

گویا عالم امثال کے زیر اثر افلاطون فطرت کی نقالی کی بات کرتا ہے جس کی رو سے فن تیسرے نمبر کی نقالی قرار پاتا ہے ۔ جبکہ ارسطو کی نقالی یا پیروی انسانوں کے اعمال و افعال کی بات کرتی ہے ۔ ارسطو یہاں نقل سے مراد شاعری لیتا ہے ۔ افلاطون کے برخلاف ارسطو عالم موجودات کو عکس نہیں بلکہ حقیقت قرار دیتا ہے اور یہی اقبال کا بھی پختہ یقین ہے ۔ اسی لئے اقبال اور ارسطو کے نزدیک نظریہ اعیان باطل ٹھہرتا ہے ۔

''جس طرح افلاطون یہ کہتا ہے کہ یہ دنیا عالم مثال کی نقل ہے
اسی طرح ارسطو کا کہنا یہ ہے کہ شاعری الفاظ کے ذریعے
اس دنیا کے انسانوں کے اعمال و افعال کی نقل کرتی ہے
ارسطو کے نفس مضمون میں عالم مثال کی نہ گنجائش ہے
اور نہ ضرورت ------ ارسطو نقل کا قائل ضرور ہے لیکن
''نقل کی نقل'' کا قائل نہیں''۔ (۳)

ارسطو اپنے عہد کا ایک حقیقت پسند مفکر تھا اور اس کا انداز فکر معروضی حیثیت کا حامل تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو بھی اقبال کی طرح افلاطون کے نظریہ اعیان سے اتفاق نہ کرتے ہوئے مختلف اعتراضات کرتا ہے ۔ ارسطو کے نزدیک نظریہ اعیان کی رو سے محض یہ کہہ دینا کہ پہاڑ اور انسان یا گل و بلبل ذہن میں پائے جانے والے تعقلات کی بناء پر موجود ہیں قابل

---

(۱) تاریخ جمالیات ۔ جلد اول ۔ ۱۰۳ ۔ نصیر احمد ناصر ۔ (۲) بوطیقا ۔ ۳۶ ۔ ارسطو ۔ مترجم عزیز احمد ۔ (۳) بوطیقا ۔ ۱۱ ۔ تمہید عزیز احمد ۔

اعتبار نہیں ۔ اس کے علاوہ ارسطو کا افلاطونی فلسفے پر یہ اعتراض بھی ہے کہ اس میں تصورات اور متعلقہ اشیاء کے تعلق کی وضاحت نہیں ملتی ۔ بلکہ صرف شاعرانہ انداز بیان کا مظاہرہ ہے ۔

ارسطو کہتا ہے افلاطون ایسا شخص ہے جو چیزوں کو گننے کی بجائے انہیں تعداد میں دوگنا کر دیتا ہے ۔ کثرت موجودات کی توجیہہ کرتے ہوئے افلاطون کثرت تصورات کی بات کرتا ہے ۔ اس طرح افلاطون کثرت موجودات کی توجیہہ کے بجائے اسے دوگنا کر دکھاتا ہے ۔

ارسطو کے مطابق تعقلات احساسات کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور تعقلات اور اشیاء وحس میں کوئی فرق نہیں ۔ اشیاء تعقلات کا پرتو نہیں بلکہ تعقلات اشیاء کا پرتو ہیں ۔ ارسطو کہتا ہے کہ موجودات یا محسوسات کی حیثیت ازلی و ابدی ہے، چیزیں فنا ہوتی ہیں لیکن اپنی اقسام میں ختم نہیں ہوتیں ۔ اس طرح ارسطو کے ہاں تصورات و موجودات کا معاملہ بالکل الٹ ہو جاتا ہے ۔

افلاطون کے نظریہ اعیان پر ارسطو کے اعتراضات کے حوالے سے پروفیسر سٹیس (Stace) لکھتے ہیں ۔

But by far most important of all Aristotle,s objections to ideal theory, and that wich, to all intents and purposes, sums all the others, is that it assumes that ideas are the essences of things and yet places those essneces out side the things themselves. The essences of a thing must be in it, and not out side it. the ideas away somewhere " But Plato separated ideas from things, and place in a mysterious world of their own.(1)

علاوہ ازیں جیسا کہ افلاطون تصورات کو محسوسات (اشیاء) کی ماہیت قرار دیتے ہوئے ،اعیان کو اشیاء سے باہر، غیر مرئی دنیا میں برا جماں کر دیتا ہے ۔ جس سے یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ محسوسات یا اشیاء اپنے اپنے وجود کے لئے کسی خارجی حقیقت کی مرہون منت نہیں ہوسکتیں ۔ ارسطو کے مطابق زید، بکر یا عمر کی اصلیت اگر'' انسان ہے تو اس کو ان اشخاص کے خارج میں نہیں بلکہ اندر ہونا چاہیئے''۔ (۲)

---

(1) A Critical History of Greek Philosophy P264

(۲) ارسطو کے یہ اعتراض پروفیسر سٹیس کی مذکورہ کتاب سے ترجمہ شدہ ہیں ۔ص ۔۲۶۲۔۲۶۳۔۲۶۴۔

یہ تو ارسطو کا اعتراض ہے لیکن " ہوسکتا ہے کہ ہم تک یہ اعتراض خلط ملط ہو کر پہنچا ہو ۔ اور اگر واقعی ارسطو نے اعتراض کیا ہے تو حیران ہوں کہ اتنے بڑے دانشور نے یہ اعتراض کیوں کر اٹھایا ۔

اس لئے کہ افلاطون عالم محسوسات کی اشیاء کو حقیقی اشیاء تو نہیں قرار دیتا ۔ اس کے نزدیک تو موجودات عکس ہیں ، عالم اعیان کا ، عکس کی اصلیت تو عکس کے اندر نہیں ہوسکتی ، عکس سے باہر ہی ہوگی ۔

بہر حال عالم امثال اور عالم محسوسات کی ثنویت فلسفہ افلاطون کا سب سے بڑا نقص ہے ۔ اس طرح عالم امثال اور عالم محسوسات الگ الگ دو حصے بن گئے ۔ میرے خیال میں عکس اور شے کا آپس میں کوئی تعلق نہیں جوڑا جا سکتا ۔ مثال کے طور پر پانی میں چاند یا درخت کا عکس نظر آ رہا تھا ۔ میں نے پتھر پھینکا تو چاند اور درخت کا عکس ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ۔ مگر چاند اور درخت پر کوئی اثر نہ ہوا ۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کے عکس پھر سالم و ثابت ہوگئے حتیٰ کہ یہ عمل دہراتے دہراتے رات ہوگئی ، چاند بادلوں میں چھپ گیا ، درخت اگر چہ برلب جھیل ہی کھڑا رہا مگر عکس مہتاب کی طرح درخت کا عکس بھی موجود نہیں تھا ۔ چنانچہ میری ذاتی رائے کے مطابق عالم محسوسات کی اشیاء اگر عالم اعیان کا عکس ہوتیں تو کائنات کی جھیل میں کنکر پھینکنے سے ریزہ ریزہ ہو جاتیں ۔

میرے خیال میں خالق حقیقی ہمیشہ زندہ اشیاء تخلیق کرتا ہے ۔ اور انسان ہمیشہ مردہ اشیاء بناتا ہے ۔ لہذا ثابت ہوا کہ فطرت اور مظاہر فطرت زندہ اور حقیقی ہیں ، عکس یا پرچھائیاں ہرگز نہیں اس لئے کہ عکس یا سائے میں زندگی نہیں ہوتی ۔ چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ افلاطون کے نظریہ تصورات و موجودات کی حیثیت طلسماتی گھورکھ دندے کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ جہاں تک ارسطو کا تعلق ہے تو باوجود اختلاف رائے کے وہ افلاطون سے متاثر دکھائی دیتا ہے ۔ اس لئے کہ ارسطو نے بھی صورتوں کا وہی افلاطونی گھورکھ دندا بنایا ہے لیکن ذرا نئی ترتیب کے ساتھ :۔

" مراتب ہستی کا انحصار صورتوں کے اعلیٰ یا کمتر ہونے پر ہے مادہ کی نوعیت پر نہیں ۔ ہستی کے مراتبی نظام کی بالائی حد بے مادہ صورت یا خالص صورت ہے ۔ یعنی وہ صورت جس میں مادہ کی آمیزش نہیں ۔ نچلے درجے کی صورتیں بلند تر صورتوں کا مادہ بنتی جاتی ہیں ۔ حتیٰ کے سب سے بلند صورت کے نیچے صورتیں ہی مادہ کی حیثیت رکھتی ہیں "۔ (۱)

ارسطو مابعد طبیعات کو فلسفہ اولیٰ اور منطق کو فکر کی سائنس کہتا ہے ۔ اس کے نزدیک استقراء (Induction)

---

(۱) تاریخ فلسفہ یونان ۔ ۱۷۴ ۔ ۱۷۵ ۔ نعیم احمد ۔

اوراخراج (Deduction) فکر کی دوصورتیں ہیں ۔ جزئیات سے کلیات اخذ کرنا استقرائی علم کہلاتا ہے ۔ جبکہ کلیات سے جزئیات کی طرف آنا استخراج کہلاتا ہے ۔

مابعد الطبعیات یا فلسفہ اولیٰ نے ہمیشہ جوہر یعنی بنیادی حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے ۔ لوسی پس اور دیمقراطیس نے مادّی سالمات کو جواہر قرار دیا تھا ۔ افلاطون ''تصورات'' کو جواہر کا درجہ دیتا ہے ۔ ارسطو کے فلسفے کے مطابق جوہر جزئیہ اور کلیہ یا صورت اور مادّہ کے مرکب کا نام ہے ۔ اس مرکب کو وہ فرد (Individual) کہتا ہے ۔

ارسطو کے مطابق جواہر یا فرد ایک نہیں بلکہ بہت سے ہیں ۔ چنانچہ ارسطو کی مابعد الطبعیات واحدانی (Monistic) ہونے کے طفیل کثرتی (Pluralistic) ہے ۔ دیمقراطیس کے برعکس ارسطو کے نزدیک جواہر سالمات کی طرح کائنات میں بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے نہیں ۔ بلکہ ایک خاص ترتیب میں بلند سے بلند تر مراتب میں مربوط ہوتے جاتے ہیں ۔ان مراتب کی بالائی حد خالص صورت (Pure Form) یا خدا ہے اور زیریں حد خالص مادّہ ______ (Pure Matter)

ارسطو کے مطابق ہر طبعی شے یا فرد (Indivedual) جزیہ اورکلیہ سے ترکیب پاتا ہے ۔ وہ جزیہ کو مادہ اورکلیہ کوصورت گرداننا ہے ۔ گویا کہ کائنات میں جزئیہ اور کلیہ یامادّہ اورصورت کی آمیزش وسیع تر ہے ۔لیکن ارسطو کہتا ہے کہ خدا، نفوس ملکوتی اور تخلیقی عقل ایسی خالص صورتیں ہیں ۔ جو مادّہ سے بالکل مبرا ہیں ۔ ارسطو کے نزدیک مادہ صورت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا ۔ استرائی لحاظ سے ہرصورت سے بلند تر صورت ہے جبکہ استخراجی طور پر نیچے کی طرف آتے ہوئے صورت کم ہوتی جاتی ہے ،حتیٰ کہ مجرد جزئیہ یا بےصورت مادہ (Formless matter) سامنے آجاتا ہے ۔ بےصورت مادہ ذہنی تصور سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا ۔

ارسطو کہتا ہے کہ خدا وہ اولین علت ہے جو کائناتی حرکت کا باعث ہے ۔ مگر بذات خودحرکت وتغیر سے مبرا ہے ۔ اس طرح ارسطو خدا کو غیرمتحرک (The unmoved mover) محرک کے نام سے منسوب کرتا ہے ۔ارسطو کی دلیل بعد میں فلسفیوں کی کونیاتی دلیل (Cosmological Argument) کی بنیاد بنی ۔

He is the absolute and --------he is the idea. He is the first mover as such he

is himself unmoved...... as absolute end god is absolute perfection. Absolute form cannot pass into any higher form..... He is not the form of matter, but the form of form. His matter so to speak, is form. Form as the universal, is thought. And this gives us Aristotle,s Famous definition of god as the thought of thoght. He things only his ownself. He is at once the subjcect and the object of his thought......And as god is form without matter, he cannot be called existent, though, he is absolutly real. God, there fore, is neither existent nor Individual. And this means that he is not a person.(1)

خالص صورت ہونے کی وجہ سے خدا میں مادہ کی آمیزش نہیں پائی جاتی ۔ وہ حرکت سے بھی معریٰ ہے ۔ ارسطو کلیہ (Universal) یا تعقل (Concept) کو صورت کہتا ہے ۔ اس طرح ارسطو فکر (Thought) کو خدا کہتا ہے ۔ وہ کمال مطلق (Absolute Perfection) ہے ۔ اس لئے اس کا معروض اس کے موضوع سے باہر نہیں ۔ خود ارسطو خدا کی یہ تعریف کرتا ہے۔" خدا تفکر فکر (Thinking Thought) ہے ۔ وہ کائنات کی کسی چیز کے بارے میں سوچ بچار نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے ہی ازلی و ابدی کمال سے متعلق سوچتا رہتا ہے ۔

بے صورت مادہ اور بے مادہ صورت کی انتہاؤں کے درمیان وجود (Existence) کے مختلف درجات ہیں۔ ہرفرد نچلے درجوں کی منزل یا علت غائی ہے ۔ مگر اپنے سے بلند تر صورت کے لئے علت مادی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر فرد مادہ اور صورت کا مرکب ہے ۔ اس لئے وہ جزوی طور پر حقیقی ہوتا ہے ۔ لیکن خالص صورت سے بلند و بالا کوئی منزل نہیں جس کی وہ علت مادی بن سکے۔ مگر اس کے برخلاف ، وہ تمام زیریں درجوں کی انتہا ہے ۔ ، لہٰذا اسے حقیقت مطلقہ کہا جا سکتا ہے ۔ موجودات زمان و مکان کی گرفت میں ہوتے ہیں ۔ مگر ہستی زمان و مکان سے بالاتر ہے ۔ ارسطو کے نزدیک خدا مکمل ہستی ضرور ہے مگر وجود سے وہ عاری ہے ۔

خالص صورت سے ماورا کوئی صورت نہیں ۔ جیسا کہ حسین چیز کی تمنا روح کو آمادہ عمل کرتی ہے ، پس حسن الوہی

---

(1)A Critical History of Greek philosophy - p284,285 by, S-T- Stace

کائنات میں حرکت وارتقا کا سبب ہے ۔ اس کی مقناطیسی کشش کے باعث ساری کائنات اس کی طرف کشاں کشاں چلی جا رہی ہے ۔ اس حسن ازل کا حصول اس سارے ہنگامہ وجود کی علت ہے ۔ مادہ ہمیشہ صورت کی آمیزش کے ساتھ ہوتا ہے ۔ مادے اور صورت کی یہ آمیزش باعث حرکت بنتی ہے ۔ اس لئے کہ صورت ہی حقیقی علت فاعلی ہے ۔ مادہ اپنی صورت حاصل کرنے کے لئے حرکت کرتا ہے ۔ جب وہ اپنی صورت کو پا لیتا ہے تو پھر اپنے سے بلند تر صورت کے لئے مادہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور یوں ارتقائی عمل جاری رہتا ہے ۔ لیکن کائنات کا خالص صورت تک پہنچنا ناممکن ہے ۔ ارسطو کے نزدیک خدا ایک خیالی نصب العین ہے ، جسے حاصل کرنا ممکن نہیں ۔ حاصل تو وہ چیز ہوتی ہے ۔ جو موجود ہو ، خدا حقیقی تو ہے مگر لاموجود ہے ۔ خدا کاروبار کائنات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا ۔ وہ ازلی و ابدی طور پر حسن و کمال کی زندگی بسر کر رہا ہے ۔ جبکہ ساری کائنات اس کی الفت میں اسیر ہے ۔ ارسطو کے نزدیک خدا کو کائنات کے حسن و قبح یا خیر و شر کا کوئی شعور نہیں ۔ اسپنوزا کا بھی یہی خیال ہے ۔ خیر و شر اس دنیا کے بکھیڑے ہیں ۔ خدا کے مقام پر ان کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی ۔ خدا نہ احتیاج رکھتا ہے نہ ارادہ ۔ وہ ایک ایسی فکر ہے جو خود اپنے ہی بارے میں متفکر ہے ۔ وہ ایک ایسی علت غائی ہے ۔ جو ساری کائنات کا نصب العین ہے ۔

ماورائے ثوابت خالص صورت یا خدا ہے ، خدا سے بالا کوئی شے موجود نہیں اس لئے خدا لامکان ہے ۔ خیر و شر ارضی فضا میں محو ہو جاتے ہیں ۔ سماوی فضا میں صعود کرتے ہوئے تغیر ، حرکت اور مادہ میں بھی درجہ بہ درجہ کمی واقع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ عقل کل یا خالص صورت یعنی خدا کی جلوہ گری باقی رہ جاتی ہے ۔ جو موجود نہیں لیکن حقیقی ہے ۔ اسی طرح ول ڈیورنٹ رقم طراز ہیں :۔

''ارسطو کے خدا نے کبھی کچھ کر کے نہیں دکھایا ۔ نہ اس کی کوئی تمنا نہ ارادہ نہ مقصد ۔ اس کی فعلیت ایسی خالص ہے کہ اس سے کوئی فعل صادر ہی نہیں ہوتا ۔ وہ کمال محض ہے ۔ اس لئے اسے کسی چیز کی تمنا نہیں ۔ اس لئے وہ کچھ کرتا بھی نہیں اس کا شغل یہ ہے کہ ماہیت اشیاء پر غور کرے ۔ لیکن وہ خود تمام اشیاء کی ماہیت اور علت غائی ہے ۔ اور تمام اشکال کی صورت ہے ۔۔۔۔۔۔ بے چارا ارسطو کا خدا اسے کوئی کام کاج تو ہے نہیں ۔ وہ سلطان ضرور ہے ۔ لیکن حکومت نہیں کرتا ۔ No wonder the British like Aristotle his god is obviously copied from their king. انگریز

جو ارسطو کو بہت پسند کرتے ہیں، اس کی وجہ ظاہر ہے، ارسطو کا خدا انگریزوں کے بادشاہ کی نقل ہے۔
ہوسکتا ہے کہ خدا کا یہ تصور ارسطو ہی کی ذات سے ماخوذ ہو۔ اسے غور وفکر اس قدر پسند تھا کہ الوہیت کے تعقل کو بھی اس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ ارسطو کا خدا خاموش اور متعین ہے کہ اس میں رومانیت کا کوئی عنصر نہیں۔ وہ دنیا کی کشمکش اور مکروہات سے دامن چھڑا کر ایک مینار حاج میں اپنے آپ میں مگن مسند افروز ہے۔ نہ اسے ان فلسفی بادشاہوں کی پرواہ ہے۔ جو افلاطون کے منظور نظر ہیں نہ یہودیوں کے خدا یہودا کی، گوشت پوست کی تلخ حقیقتوں کی خبر ہے، نہ اسے یہ پروا ہے کہ عیسائیوں کے شریف اور رحمدل اور پر شفقت خدا کی کیا کیفیت ہے۔" (۱)

فنی نقطہ نظر سے ارسطو کہتا ہے کہ کسی شے کی تخلیق اور وجود کی خاطر چار علتیں یعنی اسباب لازمی ہیں۔ امام غزالی لکھتے ہیں۔" موجود سبب اور مسبب علت ومعلول کے خانوں میں بھی منقسم ہے۔ یہ علت وسبب کیا ہے اور مسبب ومعلول کسے کہتے ہیں؟ اسے یوں سمجھنے کی کوشش کرو۔ جب کوئی چیز کسی دوسری چیز کی وجہ سے پائی جائے تو یہ شی جو سبب قرار پاتی ہے علت ہے اور دوسری جو بطور نتیجہ کے ہوتی ہے۔ معلول یا مسبب ہے"۔ (۲)

ان میں سے اگر ایک علت بھی کم ہو تو کوئی شے اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔ "مابعدا طبیعات" کی ابتداء میں ارسطو ان چاروں علتوں کے بارے میں بیان کرتا ہے۔

(۱) علت مادی = The material cause

(۲) علت فاعلی = The efficient cause

(۳) علت صوری = The formal cause

(۴) علت غائی = The final cause

ارسطو کے مطابق سارے فلسفی انہی چار علتوں کے متلاشی رہے ہیں۔ بے شک انہوں نے یہ چاروں علتیں ایک ایک کر کے معلوم کر لیں۔ مگر کسی مفکر نے یہ محسوس نہ کیا کہ حقیقت کی تشریح کی خاطر چاروں علتوں کی بیک وقت موجودگی ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ چاروں علتیں حقیقت کی قسمیں ہیں۔ پروفیسر سٹیس رقم طراز ہیں:۔ Aristotle finds that there are four kinds of cause, the material, The effecient the formal and the

---

(۱) داستان فلسفہ۔ ۱۵۹۔ ول ڈیورنٹ۔ (۲) مقاصد الفلاسفہ اردو ترجمہ" قدیم، یونانی فلسفہ" ص۔ ۱۳۲۔ مترجم۔ محمد حنیف ندوی۔

final cause........... in every cause of existence or production of a thing all four causes operate simultaneously. Moreover the same four causes are to be found both in human and in cosmic porduction. (1)

(۱) علت مادی سے مراد ارسطو وہ خام مواد لیتا ہے جو کسی شے یا فن پارے کی تخلیق میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔لکڑی کے تختے میز بننے سے قبل اور سنگ مرمر یا پتھر مجسمے کی صورت اختیار کرنے سے پہلے ،علت مادی کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ارسطو کا خیال ہے کہ'' آیونیا'' کے فلسفیوں نے سب سے پہلے علت مادی کی دریافت کی ۔ پانی ، ہوا یا مادہ وہ خام مواد تھا جس سے کائنات کی تخلیق ہوتی ہے ۔

(۲) سنگ مرمر کا ٹکڑا یا تختے خود بخود میز نہیں بن سکتے ضروری ہے کہ ان میں کوئی تغیر و تبدل کرے ۔ چنانچہ علت فاعلی عمل کا وہ سبب یا عمیل (Agent) ہے ،جس کے ذریعے علت مادی میں حرکت و تبدیلی واقع ہوتی ہے ۔ اس طرح مجسمہ سازی میں سنگتراش اور دوسری اشیاء کے بنانے میں ان کے اپنے اپنے فن کار علت فاعلی کی حیثیت رکھتے ہیں ارسطو سے پہلے بھی مفکرین علت فاعلی کی ضرورت محسوس کر چکے تھے ۔ چنانچہ تھیلز ،انکسیمنز ، ہراقلیتوس ، ایمپیڈ وکلیز اور انکساغورس کے فلسفوں میں تکوین (Becoming) کے لئے حرکت و تغیر یا حرکی اصول کی اہمیت نمایاں ہے ۔

(۳) علت صوری کی حیثیت اس نقشے یا شکل وصورت کی ہے جو علت مادی پر بنتی ہے ۔ یہ کسی فن پارے کی ماہیت (Essence) ہوتی ہے ۔ اسی کے طفیل کوئی شے اپنی انفرادیت اور مخصوص حیثیت کے ساتھ معرض وجود میں آتی ہے ۔ سنگتراش کے ذہن میں کسی مجسمے کا جو خاکہ ہوتا ہے وہی علت صوری ہے جو سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر ثبت ہو کر اسے نئی شکل وصورت سے نوازتی ہے ۔ ارسطو کے خیال میں افلاطون کے تصورات علت صوری کی حیثیت رکھتے ہیں ۔لیکن سنگتراش انسان ہے ۔جبکہ افلاطون عالم اعیان کی بات کرتا ہے ۔ افلاطون کے نزدیک ۔'' اعیان'' انسان نے نہیں بلکہ خدا نے بنائے ہیں مگر خدا کو افلاطون انسان کی طرح منصوبہ بندی کرتے دکھاتا ہے ۔

(۴) اس کے بعد چوتھی اور آخری علت ،علت غائی کہلاتی ہے ۔ خام مواد یا سنگ مرمر کا ٹکڑا علت مادی ، سنگتراش علت فاعلی اور اس کے ذہن میں مجسمے کا خاکہ یا شکل وصورت علت صوری ہے تو مکمل مجسمہ علت غائی کا درجہ رکھتا ہے ۔ ارسطو

---

(1) A Critical History of Greek Philosophy, P-26-

تسلیم کرتا ہے کہ علت غائی کی اہمیت سب سے پہلے انکسا غورس نے دریافت کی ۔ اس کے مطابق ناؤس (Nous) کا مقصد کائناتی غائت کی وضاحت کرنا تھا ۔ اسی طرح افلاطون بھی لاشعوری طور سے، بغیر کوئی نام رکھے، علت غائی کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے ۔ جیسا کہ خیر (The Good) کا تصور اس کے ہاں علت غائی کا حامل دکھائی دیتا ہے ۔ دراصل ارسطو نے کوئی نیا فلسفہ پیش نہیں کیا، اس نے ہمیشہ اپنے پیش روفلسفیوں کے افکار پر غور وفکر کرتے ہوئے ایک نئے انداز میں زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنی فکر میں دوسروں کی فکر کو شیر وشکر کرنے کے بعد اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ۔ جیسا کہ انہی چاروں علتوں ہی کے حوالے سے پہلے بھی غور وفکر کے دروازے کھولے گئے ۔ اس ضمن میں ڈبلیو ۔ ٹی ۔ سٹیس لکھتے ہیں :۔

It was not Aristotle,s habit to profound his theories as if they were some thing absolutely new, spuring for the first time from his own brain...... The first book of the metaphysics is a history of all previous philosophy, from thales to plato, undertaken wiht the object of investigating how far the four causes had been recognized by his predecessors. The material cause, he says, had been recognized from the first. The ionics believed in this and no other cause. They sought to explain every thing by matter, though they differed among themselves has the nature of the material cause, Thales discribing it as water, Anaximenes as air .... Heracleitus thingking it was fire, empedocles the four elements, Anxagoras an indefinite number of kinds of matter. But the Point is that they all recognized the necessity for a material cause of some sort to explain the universe.(1)

ارسطو کے فلسفے پر تجزیاتی نظر ڈالی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ طلسم افلاطون سے باہر نکل نہیں سکا ۔ لفظی ہیر پھیر کے ساتھ ارسطو کا مطلب بھی وہی ہے جو افلاطون کا تھا ۔ افلاطون عالمِ اعیان کی بات کرتا ہے تو ارسطو اسے عالمِ حقیقی

---

(1) A Critical History of Greek Philosophy - p-271 by , W.T.Stace

کا نام دیتا ہے۔ موجودات ارسطو کے نزدیک بھی افلاطون ہی کی طرح غیر حقیقی دکھائی دیتے ہیں۔

"خدا حقیقی تو ہے مگر موجود نہیں"

سے مراد یہی ہو سکتی ہے کہ وہ صورتوں کی صورت ہوتے ہوئے کہیں دور عالم بالا یا عالم حقیقی میں ہے۔ عالم موجودات میں موجود نہیں۔ یہاں صرف وہ صورتیں ہیں جن کی وہ صورت ہے۔ یہاں موجود نہ ہونے کی بناء پر وہ موجودات کے حسن و قبح یا خیر و شر سے بھی نابلد ٹھہرتا ہے۔ اس طرح ارسطو بھی عالم بالا اور عالم سفلی کے چکر میں پھنس کر رہ گیا۔ جبکہ در حقیقت خدا عالم موجودات میں بھی اتنا ہی موجود ہے جتنا کہیں اور۔ ایسا خدا ہو ہی نہیں سکتا جو کہیں موجود ہو اور کہیں موجود نہ ہو اس کے لئے زمان و مکان اور لا مکاں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اس کی جلوہ گری ہر جگہ برابر ہے۔ بلکہ ہر جگہ ہمارے لئے ہر جگہ ہے۔ حسن مطلق کے لئے ہر جگہ ایک ہی جگہ اور ہر عالم ایک ہی عالم ہے جو حقیقی ہے۔ لہذا ارسطو کا یہ کہنا کہ:۔

"خدا کو کائنات کے حسن و قبح یا خیر و شر کا کوئی شعور نہیں" بالکل باطل ہے۔

"فمن یعمل مثقال ذرة خیر ایره و من یعمل مثقال ذرة شرا یره

افلا یعلم اذا بعثر ما فی القبور و حصل ما فی الصدور ان ربهم بهم یومئذ لخبیر (۱)

قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا الله (۲)

حق تعالیٰ علیمٌ خبیر اور سمیع البصیر ہے۔ وہ واجب الوجود ہے اور واجب الوجود اپنے اور ہمارے بارے میں کلی علم رکھتا ہے جبکہ ہم نہ اس کے متعلق مکمل علم رکھتے ہیں اور نہ اپنے متعلق۔ ارسطو نے اسی بشری خامی کو واجب الوجود سے منسوب کر دیا ہے۔ افلاطون پر اعتراض کرتے ہوئے تو ارسطو یہ کہتا ہے کہ اعیان اشیاء سے باہر نہیں ہو سکتے۔ لیکن خود بھی ایک طرف تو خدا کو صورتوں کی صورت قرار دیتا ہے اور دوسری طرف خدا کو ان صورتوں سے بالکل بے خبر لاتعلق اور جدا ظاہر کرتا ہے۔ یہی فلسفہ ارسطو کی سب سے بڑی خامی ہے۔ شیخ الکبیر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں۔

لم یبقی الا الحق لم یبقی کائن   فماتمه موصول و ماتمه بائن (۳)

"وجود اور احدیت میں تو سوائے حق تعالیٰ کے کوئی موجود رہا ہی نہیں۔ پس یہاں نہ کوئی ملا ہوا ہے نہ کوئی جدا ہے۔ یہاں تو ایک ہی ذات ہے۔ جو عینی وجود ہے۔ یہاں یکی ہے دوئی کو یہاں گنجائش نہیں ہے۔"۔

---

(۱) القرآن ۱۰۰ عمہ ۳۰۔ العدیت۔ (۲) النمل۔ آیت۔ ۶۵۔ (۳) فصوص الحکم۔ ۱۳۰۔ ابن عربی۔ مترجم، مولانا محمد عبدالقدیر صدیقی۔

علامہ اقبال تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں ارسطو سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آگے چل کر غزالی کے حریف اعظم ابن رشد نے جو گویا باغیوں کے خلاف حکمت یونان کی حمایت میں سینہ سپر تھا، ارسطو کی پیروی میں بقائے عقل فعال کا عقیدہ وضع کیا جس کا ایک زمانے میں فرانس اور اٹلی کے ذہنی حلقوں پر بڑا اثر تھا۔ لیکن جو میری رائے میں اس تصور کے سرتاسر خلاف ہے۔ جو قرآن پاک نے نفس انسانی کی قدر و قیمت اور مقصود و منتہا کے بارے میں قائم کیا۔ یوں ابن رشد اسلام کے ایک نہایت اہم اور پر معانی تصور کے فہم سے قاصر رہا اور نادانستہ ایک ایسے فرسودہ اور ست رگ فلسفہء حیات کے نشو ونما کا سبب بنا جس سے انسان کو نہ تو اپنی ذات میں کوئی بصیرت حاصل ہوتی ہے نہ خالق کائنات اور کائنات میں"۔ (۱)

گویا کہ اقبال فلسفہ ارسطو کو فرسودہ اور ست رگ فلسفہ حیات کا نام دیتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ جس کے زیر اثر نہ خدا ہی ملتا ہے اور نہ وصال صنم۔ ارسطو نے خدا کو ایک اچھے خاصے راہب فلسفی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ وہ یا تو بذات خود ارسطو ہے یا دیوجانس کلبی جو دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے ہی حال میں مگن ہے۔ جو نہ غفور رحیم ہے اور نہ ربُّ العٰلمین۔

صاحب "فلسفہ ہند و یونان لکھتے ہیں کہ:۔

"خدا کے متعلق ارسطو کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ایک قوت مقناطیسی ہے جو تمام اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے، لیکن درحقیقت نہ وہ خالق ہے اور نہ خلق و خلقت سے اسے کوئی تعلق ہے۔ ۔۔۔ ارسطو کا خدا بے نیاز ہے۔ اپنی نمود کا نیاز مند نہیں۔ نہ کسی کو دوزخ میں ڈالتا ہے۔ نہ بہشت میں بھیجتا ہے۔ نہ اسے نیکی سے تعلق ہے نہ برائی سے۔ وہ صرف قوت اور مادۃ کا قائل ہے، جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے"۔ (۲)

دراصل ارسطو اکثر اوقات تضاد بیانی کا شکار ہو جاتا ہے، خود ہی کہنا کہ خدا ایک مقناطیسی قوت ہے کہ تمام اشیاء اس کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہیں اور خود ہی یہ کہنا کہ خلق و خلقت سے اسے کوئی تعلق نہیں عجیب سی بات ہے۔ اگر تعلق نہیں تو پھر اشیاء کے لئے اس میں کشش کیا ہے؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو خالق کائنات نہ ماننا بھی انتہائی درجے کا دہریہ پن ہے۔ اس سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ خدا کو نیکی و بدی یا جنت و دوزخ سے کوئی سرکار نہیں۔ اس طرح ارسطو ضابطہ اخلاق کی نفی

---

(۱) تشکیل جدید الٰہیات اسلام۔ ۵۔ ۶۔ (۲) فلسفہء ہند و یونان۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ دین محمد شفیقی عہدی پوری۔

کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اس کے برعکس ''اشاعرہ'' کے رکن امام غزالی رقمطراز ہیں:۔

'' جب یہ سارے کا سارا عالم محسوس ممکن ٹھہرا۔ اور ہر ہر ممکن ایک علت چاہتا ہے۔ اور علل کا سلسلہ بدیہی طور پر ایک آخری کڑی پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔ جو واجب الوجود ہے تو یہ حقیقت آپ سے آپ ثابت ہوگئی کہ اس گارگہ ہست و بود کو وجود میں لانے والا واجب الوجود ہے۔۔۔۔۔۔ اور وہی وجود کا سرچشمہ اصلی ہے۔'' (۱)

یہاں پہنچ کر راقم الحروف بندقلیس کا ذکر کرنا ناگزیر سمجھتا ہے۔ حکمائے اسلام میں لکھا ہے'' بندقلیس جو حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں تھا اور اس نے شام میں لقمان علیہ السلام سے حکمت سیکھی تھی ۔۔۔۔۔ بندقلیس پہلا فلسفی ہے۔ جس کا خیال تھا کہ خداوند تعالیٰ کی ذات میں جو مختلف اوصاف مثلاً علم، قدرت، جودوسخا وغیرہ پائے جاتے ہیں، وہ الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ ان سب کا منشا صرف خداوند تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ اور تمام موجودات میں تو کثرت پائی جاتی ہے۔ اس لئے ان میں الگ الگ اوصاف موجود ہیں، بلکہ اس کی ذات ہی ان سب کا منشا ہے۔'' (۲)

بندقلیس کا دور فیثاغورث اور سقراط سے بھی پہلے کا ہے۔ لیکن یہاں موقع ومحل کے مطابق اس کا ذکر آیا ہے ارسطو کے برخلاف بندقلیس کے نزدیک واقعی اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہونے کے ساتھ ساتھ قادر مطلق بھی ہے اور جود وسخا اس کی صفات ہیں۔ گویا کہ بندوں اور دوسری تخلیقات سے اس کا خاص تعلق ہے۔ جن پر وہ اپنی جودوسخا کا فیضان کرتا رہتا ہے۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ علم، قدرت اور جودوسخا ہی کا مرکب خدا ہے۔

البتہ ارسطو کا تصور خدا غیر شخصی اور خالص فلسفیانہ ہے۔

ارسطو کے مسلمان پیروؤں (مسلم مشائیوں) نے ارسطو کے منطقی فلسفے کو مذہبی عقائد کی تاویل اور تائید میں پیش کیا۔ اس طریقہ کار کو انہوں نے '' علم کلام'' کا نام دیا۔ بعد ازیں مغرب میں یہی طریقہ مروج ہوا جسے مدرسیت (Scholasticism) کے نام سے منسوب کیا گیا۔

ارسطو کے مدتوں بعد فلاطینوس "Plotinus" حکمت نکسثیہ کے مقابلے میں حکمت ذوقیہ کی بنیادیں مستحکم کرتا دکھائی دیتا ہے۔ فلاطینوس (۲۰۴-۲۷۰ء) مصر کے شہر لکوپاس میں پیدا ہوا۔ روم میں فوت ہوا اسے فلاطینس۔ پلوطینس اور پلوٹینس

---

(۱) مقاصد الفلاسفہ کا ترجمہ'' قدیم یونانی فلسفہ ۱۹۳۔

(۲) حکمائے اسلام، جلد اوّل ۔ ۸-۹-۱۰ ۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔

بھی کہتے ہیں ۔ اس کے فلسفہ اشراق کو اشراقیت ، نوفلاطونیت(New-Plotinism)، افلاطونیہ جدیدہ ، مذہب افلاطون جدیدہ اور افلاطونیۃ الحدیثہ بھی کہتے ہیں۔ جبکہ پیرووں کو''اشراقی'' اور نوافلاطونی کہا جاتا ہے۔ آ گے چل کر شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی نے فلاطینوس کی نو فلاطونیت ہی کا پرچار کیا۔ اور اپنی شہرہ آفاق کتاب ''حکمت الاشراق ''لکھی۔ امونیس ساکاس فلاطینوس کا استاد اور فورفوریوس (اصلی نام مالشش) فلاطینوس کا شاگرد ، دوست اور سوانح نگار ہے۔ فلاطینوس نے اپنے استاد کی تعلیمات کو پچاس رسالوں کی صورت میں سپردقلم کیا۔ جنھیں بعد میں فلاطینوس کے شاگرد ، فورفوریوس نے چھ چھ کی ''انیڈز''(Eneads) میں تقسیم کردیا۔ انیڈز کے معنی ہیں نو پرتقسیم کیا ہوا۔ فیثاغورث کے نزدیک 9 کا ہندسہ مقدس تھا ، چونکہ فلاطینوس فیثاغورث سے بھی متاثر تھا۔ اس لئے اس کے رسالوں کو''انیڈز'' کہا جاتا ہے۔مجنوں گورکھپوری رقمطراز ہیں کہ:-

فلاطینوس افلاطون سے بہت زیادہ متاثر تھا اس نے افلاطونی نظریات کا نئے انداز میں دوبارہ پرچار کیا اسی لئے اس کے فلسفے کو نو فلاطونیت کہا جاتا ہے ۔ جہاں تک فلسفہ اشراق یا اشراقیت کا تعلق ہے تو :- ''اس کو فلسفہ اشراق یا تو اس بنیاد پر کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد اشراق یعنی کشف پر قائم ہے یا اس بناء پر کہ یہ مشرقیوں یعنی اہل فارس کا فلسفہ ہے لیکن اس کا حاصل بھی وہی کشف وذوق ہے''۔ (۱)

''اشراقیت نام ہے مذہب کو فلسفہ افلاطون میں رنگنے کی کوشش کا، جس کا نتیجہ ایک قسم کا تصوف ہے ۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے چند صدیوں بعد تک یہی کوشش ہوتی رہی کہ مذہب اور فلاطونیت میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اس طرح ایک نیا فلسفہ وجود میں آ گیا جو''حکمت الاشراق'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی طرح مذہب اور فلسفے میں مطابقت پیدا کرنے کی ایک دفعہ ازمنہ وسطیٰ میں بھی کوشش کی گئی اور مشائیت (فلسفہ ارسطو) اور مسیحیت کو مخلوط کرکے ایک نئے فلسفے یعنی ''علم کلام'' کی بنیاد ڈالی گئی ۔ جو دلکشی اور دل آویزی میں اشراقیت کا مقابلہ نہ کرسکا'' (۲)

بذات خود فلاطینوس اشراق سے مرادنور باطن لیتا ہے ۔وہ ابیقوریت اور رواقیت کا مخالف ہے۔ رواقیوں کی مخالف ان کی مادہ پرستی کی وجہ سے کرتا ہے اور ابیقوریوں کے فلسفہ لذتیت کو سرے سے مانتا ہی نہیں۔فلاطینوس کے ذوقی فلسفے (اشراقیت) کی ایک امتیازی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مزاج میں بالکل مشرقی ہے۔ یہ دراصل ایک طرح کا مذہبی فلسفہ ہے، اس

---

(۱) حکمائے اسلام ۔ حصہ دوم ۔ ۲۹ ۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔

(۲) تاریخ جمالیات ۔ ۳۶ ۔ مجنون گورکھپوری ۔

کے ڈانڈے تصوف سے آ ملتے ہیں:- ''جس کی بنیاد اس عقیدے پر رکھی گئی ہے کہ خدائے برتر واعلیٰ ''حسن ونور'' کا سرچشمہ ہے اور وہی حیات انسانی کا مقصود حقیقی بھی ہے۔ کیونکہ اس کے مشاہدے سے ایسی وجدآفریں حالت میسر آجاتی ہے جو دراصل غایت زندگانی ہے'' (۱)

اشراقیت علم اور عقل کے برعکس وجدان (Intution) اور بصیرت (Vision) کے ذریعے سے حقیقت اشیاء تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نوافلاطونیت کی رو سے ''حسن مطلق'' کا دیدار حاصل کیا جاسکتا ہے مگر ظاہر کی آنکھ سے نہیں بلکہ دیدہ دل وا کرنے سے۔ علامہ محمد اقبال رقمطراز ہیں:-

''نوافلاطونیت کا خدا موجود فی العالم بھی ہے اور ماورائی بھی۔ چونکہ یہ تمام اشیاء سے الگ ہے۔ اس لئے یہ کہیں بھی نہیں ہے۔ اگر وہ صرف ''ہر جگہ ہوتا اور یہ نہ کہا جاتا کہ وہ کہیں نہیں ہے تو وہ سب کچھ ہوتا (ہمہ اوست) بہر حال صوفی سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا سب کچھ ہے'' (۲)

اور مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں ''فلاطینوس کا خیال ہے کہ خدا اور مادہ دونوں حقیقی وجود رکھتے ہیں، مادہ خدا نہیں ہے مگر خدا کی ذات سے نکلا ہے۔۔ یعنی مادے میں الوہیت موجود ہے۔ جب ہستی الٰہی کا پیانہ لبریز ہوکر چھلک پڑتا ہے تو کائنات کا وجود ہوتا ہے۔ ہستی کی غائیت دوبارہ پھر اسی الوہیت یا نفس کل میں مل جانا ہے'' (۳)

مجھے لگتا ہے کہ مرزا بیدل نے اشراقیت یا فلاطینوس کے اسی خیال کو یوں باندھا ہے۔

دل اگری داشت وسعت بے نشاں بوداین چمن　　　　رنگ مے بیروں نشست ازبسکہ مینا تنگ بود

نکتہ یہ ہے کہ ہستیٔ الٰہی کا پیانہ لبریز ہوکر چھلک پڑا، جس کے نتیجے میں کائنات معرض وجود میں آ گئی۔ اس لئے مادے میں الوہیت موجود ہے۔ بالفاظ دیگر الوہیت ہی مادہ ہے۔ یہ خیال بظاہر تو بڑا دلکش دکھائی دیتا ہے لیکن غور کیا جائے تو اس لحاظ سے ناقص معلوم ہوتا ہے، کہ راقم الحروف کے نزدیک ہستیٔ مطلق یا حسن مطلق اتنا بے قابو نہیں ہوسکتا کہ اس کا اپنا ہی پیانہ لبریز ہوکر چھلک پڑے۔

افلاطون نے اپنی تصوریت کو زیادہ تر عقلی اور اخلاقی عالم میں پروان چڑھایا تھا۔ اس کے جمالیاتی افکار اس کے اخلاقی تصورات کے زیر اثر تھے۔ جبکہ فلاطینوس ذوق وشوق اور کشف کے ذریعے ''حسن مطلق'' تک رسائی حاصل کرنے کی

---

(۱) تاریخ جمالیات۔ جلد اول ۱۷۶ تا ۱۷۷ نصیر احمد ناصر۔ (۲) فلسفہ عجم ۱۵۹۔ علامہ محمد اقبال۔ (۳) تاریخ جمالیات۔۳۶۔۳۷۔ مجنوں گورکھپوری

تگ ودو کرتا ہے۔''ہمارے اور ذات مطلق کے درمیان جو بعد ہے، متصوفانہ کشف ہی کے دوران میں اس پر قابو پایا جاسکتا ہے'' (۱)

فلاطینوس نے مسائل جمالیات کو نوروظلمت کے مابعد الطبیعاتی حوالے سے حل کرنے کی سعی کی ہے چنانچہ لکھتا ہے کہ:۔''حسن تناسب وہم آہنگی کا نام نہیں ۔ بلکہ ایک نور ہے جو چیزوں کے تناسب وہم آہنگی کے اوپر چمکتا ہے اور اسی پر ان کی دلکشی ونظر افروزی کا انحصار ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ حسن کا نور زندہ چہروں پر تو ہوتا ہے مگر مردہ چہرے پر اس کا صرف شائبہ ہی ہوتا ہے ۔گو اس کی صورت عناصر ترکیبی کے تناسب وہم آہنگی کے لحاظ سے ابھی خراب بھی نہ ہوئی ہو۔ اگر یہ نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ مجسمے جو زندگی سے معمور معلوم ہوتے ہیں ان مجسموں کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں جن سے ان کے اعضاء کے تناسب وہم آہنگی کے باوصف زندگی نہیں ٹپکتی؟اور ایسا کیوں ہے کہ ایک بدصورت مگر زندہ شخص، کسی حسین شخص کے مجسمے سے نسبتاً دلکش معلوم ہوتا ہے؟ اور اس کا سبب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ زندہ حسن، بے جان حسن سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب ومطلوب ہوتا ہے'' (۲)

ایک عام تجزیے کے مطابق سبھی عالم جمالیات اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ حسین صورت یا حسن کے لئے تناسب وہم آہنگی بہت ضروری ہے۔لیکن فلاطینوس کے نزدیک تناسب وہم آہنگی پر اگر نور نہ چمکے تو حسن دکھائی نہیں دیتا یا معرض وجود میں نہیں آتا۔گویا اس کے مطابق تناسب وہم آہنگی نہیں بلکہ ''نور'' حسن کا درجہ رکھتا ہے۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سبھی زندہ لوگ خوبصورت کیوں نہیں ہوتے؟ ان میں کچھ تو بدصورت ، کچھ کم خوبصورت ، کچھ قبول صورت اور کچھ انتہائی حسین وجمیل کیوں ہوتے ہیں؟

شمشیر زنی کرتے لاکھوں میں کوئی دیکھا ہر چہرے کے ہاتھوں میں تلوار نہیں دیتا (فقری)

زندگی میں وہ چمکتا ہوا نور کسی پہ کم اور کسی پہ زیادہ اور کسی پہ بالکل کیوں نہیں چمکتا؟ چاہیئے تو یہ تھا کہ فلاطینوس کے نظریئے کے مطابق سبھی زندہ اشیاء یا لوگ غضب کے دلکش اور حسین وجمیل ہوتے مگر ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔بعض زندہ اجسام یا صورتوں کو بدصورتی کی بناء پر دیکھا نہیں جاسکتا۔جبکہ ان کے مقابلے میں مجسموں میں حسن کے زیادہ آثار دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل فلاطینوس کے زمانے میں پتھروں سے مجسمے بنتے تھے، پتھر مردہ نہیں ہوتے ، ان میں بھی اپنی نوعیت کی زندگی ہوتی ہے،

---

(۱) تاریخ جمالیات ۔جلد اوّل ۔۱۷۶۔۱۷۷۔ (۲) تاریخ جمالیات ۔ جلد اوّل۔۱۸۳۔نصیر احمد ناصر۔

آج کل کی طرح اس دور میں پلاسٹک کے مردہ مجسمے نہیں تھے کہ بالکل مکروہ اور بے کیف دکھائی دیتے۔

فلاطینوس کے برعکس میں یہ بھی کہوں گا کہ حسن رخصت ہوجاتا ہے مگر مرتا کبھی نہیں۔ مشاہدے کی بات ہے کہ حسین شخص کی میت کچھ دیر تک سہی لیکن زندہ بدصورت شخص کے مقابلے میں خوبصورت ہوتی ہے۔ اسی طرح جوانی میں خوبصورت شخص ، بوڑھا ہوکر خوبصورت نہیں رہتا بوڑھے کا حسن زندگی ہی میں رخصت ہوجاتا ہے۔ شاید عناصر میں اعتدال نہ رہے تو حسن بھی روٹھ جاتا ہے۔ مگر یہ عجیب حقیقت ہے کہ عناصر میں اعتدال ہوتے ہوئے کچھ لوگ جوانی میں بھی خوبصورت نہیں ہوتے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ بدصورت لوگ اپنے بڑھاپے کی نسبت جوانی کے عالم میں اپنے آپ سے خوبصورت ہوتے ہیں۔

بہرحال فلاطینوس حسن کی جاذبیت ودلکشی کو زندگی سے وابستہ سمجھتا ہے۔ نطشے زندگی کی اس تاثیر کو قوت سے، برگساں قوت حیات اور اقبال قوت خودی سے تعبیر کرتا ہے۔ برٹرنڈ رسل نے بھی دیگر عالم جمالیات کی طرح اخلاقیات فلاطینوس کی تعریف کی ہے:-

''اسپنوزا کی طرح افلاطونس کے ہاں بھی اخلاقی پاکیزگی اور
رفعت پائی جاتی ہے جو بہت موثر ہے'' (۱)

وہ حسن کائنات کے خارجی مشاہدات اور مظاہر فطرت کو بھی معرفت حقیقت کا وسیلہ سمجھتا ہے ۔ حسن کی موضوعیت (Subjectivity) اور معروضیت (Objectivity) دونوں ہی کا معترف ہے۔ اس کی رائے میں انسان حسن مطلق کا مشاہدہ صرف اپنے باطنی نور ہی سے کرسکتا ہے۔ فلاطینوس کہتا ہے کہ ہماری روح حسن مطلق کی جدائی میں بے قرار رہتی ہے ۔ ہمیں ہر حسین چیز اس لئے اچھی لگتی ہے کہ ہماری روح کو اس پہ حسن مطلق کا گمان ہوتا ہے ۔ مولانا روم نے بھی ہجروفراق کے اسی مضمون کو باندھا ہے۔

بشنو ازنے چوں حکایت می کند وزجدائیہا شکایت می کند (۲)

جیسا کہ فلاطینوس حسن کے دونوں پہلوؤں ، معروضی وموضوعی کا جوہر شناس ہے ۔ اس کا یہ تصور حسن قرآن پاک کے تصور حسن ''وحدت جمال'' کی طرح ہوتے ہوئے اپنے وقت کے لحاظ سے بے مثال تھا۔ لیکن مغربی فلسفیوں کی ''عقلیت

---

(۱) مغربی فلسفے کی تاریخ ۔ ۳۱۰ ۔ برٹرنڈرسل۔ (۲) مثنوی مولوی معنوی کا پہلا شعر ص ۔ ۳۱۔

پرستی'' اسے کوئی اہمیت نہ دے سکی ۔ البتہ اشراقیت کا یہ تصورِ حسن اسلامی مفکرین کے نظام فکر میں رچ بس گیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:-

''نو افلاطونی افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ ذات اعلیٰ واحد ہے، وہ ہر جگہ تجلی دکھاتا ہے اور ہر چیز اس کی تجلی کا پرتو ہے۔ اشیاء میں کثرت اور تفرقہ کا سبب پرتو کی تدریجی منازل سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر منزل اسفل ایک کمزور تر پرتو ہوتا ہے...... فلاطینوس کا فلسفہ حسن یہ ہے کہ حسن اور خیر ایک ہی شے ہے۔لیکن خیر حسن پر فوقیت رکھتی ہے''۔ (۱)

فلاطینوس کی نو افلاطونیت یا اشراقیت کا تصور وجدان انسان کی جمالیاتی تاریخ میں زبردست حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے ہاں حسن کا ارتقائی تصور موجود ہے ۔ وہ فطرت کو حسن کا شاہکار سمجھتا ہے ،مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ انسانی تخلیق فطرت سے بھی حسین تر اشیاء بناسکتی ہے۔ علامہ اقبال کا بھی یہی نظریہ ہے۔ بلاشبہ دور حاضر کے دو بلند پایہ حکماء ____ گوئٹے اور کروچے فلاطینوس کے تصور وجدان سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ جبکہ علامہ اقبال پر قرآن حکیم کا اثر نمایاں ہے۔ فلاطینوس کے خیال میں حقیقت اور تصوریت آپس میں ہم آہنگ نہیں ہوسکتیں ۔ چنانچہ نصیر احمد ناصر کے مطابق ۔

''اگر میں یہ کہوں کہ فن کے بہت سے جدید نظریات کا مبداء مثلاً رمزیت (Symbolism) ارتسامیت (Impressiomism) تجریدیت (Abstractism) وغیرہ جن کا آج کل بہت شہرہ ہے۔ افلاطونس کا یہی تصورفن ہے تو مبالغہ نہ ہوگا'' (۲)

اشراقی افلاطون کے اس خیال سے تو اتفاق کرتے ہیں کہ عالم محسوسات ، عالم تصورات کا ایک عکس ہے۔۔لیکن وہ اس عکس کو بے کار یا بیگانہ اصلیت نہیں سمجھتے۔ اشراقی مجاز کو حقیقت کا آئینہ کہتے ہیں اور اسی آئینے ، یعنی مجاز کے توسط سے حقیقت کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک فنون لطیفہ کا تعلق ہے تو اشراقئین ، فنون لطیفہ کو نقالی مانتے ہیں۔ مگر ان کے مطابق یہ نقالی مجاز کی بجائے براہ راست حقیقت کی نقالی ہے۔ مجاز اور فنون لطیفہ دونوں ہی حقیقت کی نقلیں ہیں، بلکہ فنون لطیفہ مجاز سے بھی حقیقت کی خوب تر نقل اتارتے ہیں۔ مجاز میں حقیقت کے جو پہلو پوشیدہ رہ جاتے ہیں ،فنون لطیفہ میں وہ بھی اجاگر ہوجاتے ہیں۔ اشراقیت کا یہ خیال ارسطو کے خیال سے مشابہ دکھائی دیتا ہے۔

فلاطینوس کائنات کو حقیقت نہیں بلکہ مجاز ہی سمجھتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ مجاز باطل اور فریب نظر

---

(۱) اقبال اور مسلک تصوف ۔ ۸۷۔۸۸۔ ۹۰ (۲) تاریخ جمالیات ۔ جلد اوّل ۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔

نہیں بلکہ ''تخلیق بالحق ہے''ارسطو نے افلاطون کے ''نظریہ تکفیرفن'' کے خلاف المیاتی تزکیہ نفس یا کیتھارسس کی رو سے آواز بلند کی تھی۔ جبکہ فلاطینوس نے فن کو بحیثیت کل کے سراہا ہے۔

طامس اکویناس (تیرہویں صدی) اور ونکل مان (اٹھارویں صدی) فلاطینوس سے بہت زیادہ متاثر ہیں ۔ جیسا کہ طامس اکویناس ہر چیز میں حسن کا متلاشی تھا اور تمام حسن کا سرچشمہ، ''حسن مطلق'' کو سمجھتا تھا۔ مجنوں گورکھپوری رقمطراز ہیں:-

''طامس ایکویناس کے تمام فلسفے پر ''اشراقیت'' کا رنگ غالب ہے'' (۱)

ونکل مانِ حسن جز کو حسن کل کی جلوہ گری گردانتا ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ حسن ازل کے جمال سے لبریز ہے۔ ہم ہر حسین شے میں اسی شاہد ازل اور حسن مطلق کا دیدار کرتے ہیں:-

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں (غالب)

قطرے میں کچھ نہیں پانی کے سوا کیا کہئے
بات کہنے کی نہیں ہے بخدا کیا کہئے (مولانا آسی)

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا (خواجہ میر درد)

''جز میں کل دیکھنے کے لئے ونکل مان کہتا ہے ایک خاص قوت درکار ہے جو کم وبیش ہر شخص میں موجود ہے۔ لیکن جو شاعر یا کسی اور صناع میں درجہ کمال کو پہنچی ہوتی ہے۔ ایک اور بات جو ونکل مان کے نظام فکر میں بالکل نئی ہے اور جو قابل توجہ ہے کہ وہ عورت کے حسن پر مرد کے حسن کو ترجیح دیتا ہے، اس لئے کہ اس کے خیال میں مرد اس ''حسن ازل'' کا بہترین مظہر ہے'' (۲)

اس کے ساتھ ہی اشراقیت کے زور دار حامی شہاب الدین سہروردی شیخ الاشراق کا ذکر بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔آپ کا پورا نام ''ابو حفص شہاب الدین عمر بن محمد البکری سہروردی ہے... مولد عراق عجم کا قصبہ سہرورد تھا۔ مزار بغداد میں ہے'' (۳)

علامہ محمد اقبال لکھتے ہیں ''شیخ شہاب الدین سہروردی جو شیخ الاشراق مقتول کے نام سے مشہور ہیں۔ بارہویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوئے ..... ۳۶ سال کی عمر میں اس نوجوان ایرانی مفکر نے اس مہلک ضرب کے آگے سر جھکا دیا۔ جس

---

(۱) تاریخ جمالیات ۔۴۳۔ (۲) تاریخ جمالیات ۔۵۳۔ مجنوں گورکھپوری۔ (۳) تصوف اسلام ۔۹۰۔ عبدالماجد دریا بادی ۔

نے اس کو شہید حق بنا کر اس کے نام کو بقائے دوام عطا کیا" (۱)

سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹے ملک الظاہر حاکم حلب نے شیخ الاشراق کو شریعت کی مخالفت کرنے کے الزام میں بمقام حلب قتل کروادیا تھا۔ "کچھ لوگ ان کے معتقد تھے اور کچھ لوگ ان کو ملحد سمجھتے تھے۔ غرض ان کی شخصیت بالکل منصور حلاج کے مشابہ تھی اور ان کا بھی وہی حشر ہوا، جو منصور کا ہوا تھا" (۲)

شیخ الاشراق حکمت بحثیہ اور حکمت ذوقیہ وکشفیہ دونوں ہی کا شغف رکھتے تھے۔ فلاطینوس سے متاثر ہونے کی بناء پر شیخ الاشراق کے نزدیک حسن مطلق نور الانوار ہے۔ وہ مثل افلاطونیہ اور اعیان پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ الاشراق کے نزدیک "ہر نوع کے لئے ایک رب النوع ہوتا ہے۔ جو اس کی تدبیر وتصرف میں مصروف رہتا ہے اور اسی رب النوع کو اس چیز کی طبیعت کہتے ہیں۔ پانی میں جو برودت اور آگ میں جو حرارت پائی جاتی ہے، وہ ان کی طبیعت نہیں ہے، بلکہ ان کا رب النوع ان کی طبیعت ہے۔ اور وہی ان میں برودت وحرارت پیدا کرتا ہے" (۳)

مولانا عبدالسلام ندوی رقمطراز ہیں "وہ حکمائے ایران کے سخت معتقد تھے۔ اور ان کے فلسفے کو زندہ کرنا چاہتے تھے..... زرتشت وغیرہ کا نام نہایت ادب واحترام سے لیا ہے اور ان کے فلسفیانہ نظریات کی تائید کی ہے۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ تمام حکمائے ایران اس پر متفق ہیں کہ عالم نور میں ہر نوع کا ایک پروردگار ہے.... ان کے یہاں پانی کے پروردگار کا نام خرداد، درختوں کے پروردگار کا نام مرداد اور آگ کے پروردگار کا نام اردی بہشت ہے" (۴)

زندگی اور حسن کے نو افلاطونی یا فلاطینوسی تعلق کو شیخ الاشراق مزید آگے کی طرف بڑھاتے دکھائی دیتے ہیں:-

"یہاں تک کہ جنسی تعلقات کی لذت جو سب سے بڑی مادی لذت ہے اس میں بھی روحانیت کے بہت سے اجزاء شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص ایک مردہ حسین عورت سے مقاربت کرنا پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ روح اور روح کے آثار سے خالی ہے۔ اس کے لئے صرف حسن ہی کافی نہیں بلکہ اس میں روح کی آمیزش ہونی چاہئے۔ پتھر کی ایک مورت جو روح سے خالی ہے کتنی ہی حسین ہو، اس مقصد کے لئے کافی نہیں۔ ایک مسن عورت اس مقصد کے لئے ناپسند کی جاتی ہے کہ اس میں روح کے آثار کے قبول کرنے کی صلاحیت ایک نوخیز عورت سے کم ہوتی ہے۔ اس کے لئے حرارت اور حرکت بھی ضروری ہے، کیونکہ حرارت اور حرکت روح ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے" (۵)

---

(۱) فلسفہ عجم ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ علامہ محمد اقبال۔ (۲) حکمائے اسلام حصہ دوم۔ ۵۷۔ عبدالسلام ندوی۔

(۳) حکمائے اسلام حصہ دوم۔ ۸۶۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔ (۴) حکمائے اسلام حصہ اوّل۔ ۴۱۔ (۵) حکمائے اسلام حصہ دوم۔ ۸۷۔

ہم دیکھ آئے ہیں کہ فلاطینوس نے حسن اور زندگی کے تعلق کو مجسمے اور زندہ یا مردہ انسان کی مثالوں سے واضح کیا تھا۔ جبکہ شیخ الاشراق اسے بڑھاپے اور نوجوانی کی مثال دے کر واضح کرتے ہوئے اس میں جنسی عنصر کو بھی شامل کر دیتے ہیں۔

شیخ الاشراق مشائیت یعنی فلسفہ ارسطو کا رد کرتے ہیں ۔ ان کے ''روحانی فلسفے'' کی بنیاد ذوق مشاہدہ اور ریاضت ومجاہدے پر ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب ''حکمت الاشراق'' میں لکھتے ہیں۔

''رب الانواع کو اہل تجرید نے اپنے جسمانی تعلقات سے الگ ہوکر بارہا دیکھا ہے....افلاطون اور اس سے پہلے کے حکماء مثلاً سقراط ، ہرمس ، اغاثا، ذیمون اور ابناذقلس سب کی یہی رائے تھی ۔حکمائے ہندو حکمائے یونان سب کے سب اس پر متفق ہیں، جب امور فلکیہ کے متعلق ایک شخص بطلیموس یا دو شخص ابرخس اور ارشمیدس کا رصدی مشاہدہ قابل اعتبار ہے تو بڑے بڑے حکماء وانبیاء کا روحانی مشاہدہ اوس چیز کے متعلق جس کو انہوں نے اپنی روحانی رصدگاہ میں دیکھا ہے، کیوں قابل اعتبار نہ ہو۔ میں خود ان چیزوں کے انکار میں مشائین کا سب سے بڑا حامی تھا اور ان کے فلسفہ کی طرف شدت سے مائل تھا ، اگر مجھ کو خدا کی دلیل نظر نہ آتی تو میں اس پر قائم رہتا، جو شخص اس کی تصدیق نہیں کرتا اور دلیل سے اس کو تسکین نہیں ہوتی، اس کو ریاضت اور اصحاب مشاہدہ کی خدمت کرنی چاہیئے ۔ امید ہے کہ اس حالت میں اس کو وہ انوار نظر آئیں جو ہرمس اور افلاطون کو نظر آتے تھے'' (۱)

یہاں شیخ الاشراق کے نظریات ومعتقدات میں ایک طرح کا ارتقا دکھائی دیتا ہے۔ جیسا کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ پہلے وہ بھی مشائین سے واسطہ رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں نور مطلق کے قائل ہوگئے۔ امور فلکیہ کے رصدی مشاہدے کے مقابلے میں روحانی رصدگاہ کی دلیل بڑی وزنی اور مدلل ہے جس سے شیخ الاشراق نے ارسطو اور پیروان ارسطو کے فلسفہ مشائیہ کا موثر جواب دیا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیخ الاشراق ''عقلیت پرستوں'' کے مقابلے میں ''روحیت پرست'' ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فقہا نے ان پر کفر والحاد کا فتویٰ لگایا۔ اگر چہ زمانی لحاظ سے ''اشاعرہ'' شیخ الاشراق سے پہلے تھے لیکن اشراقیت کے حوالے سے شہاب الدین سہروردی کا ذکر فلاطینوس کے ساتھ ضروری معلوم ہوتا تھا۔ اور اب موقع کی مناسبت سے ''اشاعرہ'' کے بارے میں قلم بدست وسر بگریباں ہوجانا لازمی سمجھتا ہوں۔ علامہ محمد اقبال رقمطراز ہیں کہ:-

---

(۱) حکمائے اسلام۔ حصہ دوم ۔۹۴۔۹۵۔

"خاندان عباسیہ کے ابتدائی خلفاء کی سرپرستی میں عقلیت اسلامی دنیا کے عقلی مراکز میں پھولتی پھلتی رہی۔ لیکن نویں صدی کے نصف اول میں اس کو ایک زبردست ردعمل سے دو چار ہونا پڑا جس کا پرجوش علمبردار الاشعری تھا (تاریخ ولادت ۸۷۳ء) اس نے علماء عقلیت (معتزلہ) سے تعلیم پا کر خود انہی کے طریقوں سے انکی اس عظیم الشان عمارت کو منہدم کرنے کی کوشش کی جو بڑی محنت سے تعمیر کی گئی تھی" (۱)

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ "الاشعری" اور اس کے پیروکار "اشاعرہ"، عقلیت پرستی کے زبردست مخالف ہوتے ہوئے روحانیت کی شمعیں روشن کرتے رہے۔ "اشاعرہ کے نزدیک نہ کوئی کسی چیز میں خاصیت اور تاثیر ہے نہ کوئی چیز کسی چیز کی علت ہے، بلکہ تمام ظاہری اسباب ہیں۔ موثر حقیقی صرف خدا ہے" (۲)

اشاعری تحریک ارسطاطالیسیت اور مشائیت کے خلاف سینہ سپر تھی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے اندر جو غیر اسلامی عناصر در آئے ہیں، انہیں اسلام سے باہر نکال دے۔ اشاعری حکماء عقلیین کے برخلاف صفات باری تعالیٰ کے قائل تھے۔ ان کے مطابق "حسن مطلق" انتہائی "واجب الوجود" ہستی ہے جو اپنی صفات کو اپنی ہی صفات میں رکھتا ہے۔ ہر ممکنہ ہستی کے لئے ایک علت یا سبب لازمی ہے۔ کائنات ممکن ہے۔ لہٰذا اس کی ایک علت ہے جو خدا ہے۔

اشاعرہ نے "نظریہ جواہر" پیش کرتے ہوئے تخلیق کائنات کی تشریح وتوضیح کی۔ ان کے نزدیک کائنات کی ترکیب وتنظیم لاتعداد چھوٹے چھوٹے ذرات (جواہر) سے کی گئی ہے۔ ان جواہر کی تعداد اس لئے لامتناہی ہے کہ خالق کائنات کی تخلیقی فعالیت کا سلسلہ متواتر جاری ہے۔ گویا کائنات بڑھتی اور پھیلتی جارہی ہے یا یوں سمجھئے کائنات میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ علامہ محمد اقبال لکھتے ہیں۔

"الٰہیات اسلامیہ کے سب سے زیادہ متشرع اور تاحال مقبول عام مذہب یعنی اشاعرہ کے نزدیک قدرت کاملہ الٰہیہ کا منہاج جواہر کی آفرینش ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کا یہ عقیدہ اس آیہ قرآنی پر مبنی تھا۔

وان من شی الاعند ناخزائنه ومانتزله الابقدر معلوم (۲۱:۱۵)

عالم اسلام میں نظریہ جواہر کا نشوونما اسلامی تاریخ کا ایک بڑا دلچسپ باب ہے، جسے گویا ارسطو کے اس نظریئے کے خلاف کہ کائنات ایک ساکن وجود ہے مسلمانوں کی ذہنی بغاوت کا پہلا اہم مظہر تصور کرنا چاہئے" (۳)

---

(۱) فلسفہ عجم۔ ۹۵۔۹۶۔ (۲) حکمائے اسلام حصہ دوم ۸۵۔ (۳) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۱۰۳۔

نظریہ جواہر کی رو سے حسن مطلق ہر لمحے نئے نئے جواہر تخلیق کر رہا ہے گویا تخلیق کائنات کا عمل اب بھی جاری و ساری ہے یہی وجہ ہے کہ کائنات کی ہر شے حرکت و عمل میں مصروف ہے ۔ گویا کہ کائنات حرکی ہے ۔ اس سے ارسطو کا یہ نظریہ کہ کائنات ایک ساکن وجود ہوتے ہوئے تعطل و جمود کا شکار ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں عمل تخلیق بند ہو چکا ہے ۔ سراسر غلط ثابت ہوتا ہے میرا خیال ہے ارسطو کے اسی نظریے کے ردعمل میں اقبال فرماتے ہیں۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید   کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون (۱)

نیک بنگر اندریں بودونبود   پے بہ پے آید جہانہا درروجود! (۲)

اے کہ تو پاسِ غلط کردۂ خود می داری   آنچہ پیش تو سکون است خرام است انیجا (۳)

دمادم نقشہائے تازہ ریزد   بیک صورت قرار زندگی نیست

اگر امروزِ تو تصویر دوش است   بخاک تو شرار زندگی نیست (۴)

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است   زندگی درپۓ تعمیر جہاں دگراست (۵)

اشاعرہ کہتے ہیں کہ مختلف چیزوں کے انفرادی جواہر ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے ۔ اللہ تعالیٰ یا انتہائی علت ان کا تعین کرتی ہے ۔ انہوں نے ایسے ابتدائی مادے کے وجود سے انکار کیا ۔ جو تغیر پذیر ہے اور سبھی اشیاء میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے ۔ عقلیت پرستوں کے برعکس اشاعرہ کا یہ دعویٰ تھا ۔ جوہر کی ماہیت وجود ہی ہے ۔ وہ جوہر اور وجود کو ایک دوسرے کی عین سمجھتے ہیں ۔ اشاعرہ کے خیال میں اعراض کی مسلسل تخلیق ہی سے جوہر کی ہستی قائم رہتی ہے ۔ گویا کہ خالق کائنات اعراض کا سلسلہ بند کر دے تو ہستی جوہر ختم ہو کر رہ جائے گی ۔ ہر ایک جوہر کے لئے اپنی اپنی جگہ کچھ صفات لازمی ہیں ۔ جو ہمیشہ اضداد کی صورت میں دو دو کے مجموعوں میں وقوع پذیر ہوتی ہیں ۔۔ مثال کے طور پر حرکت و سکون اور موت وحیات وغیرہ۔

علامہ محمد اقبال بجا فرماتے ہیں کہ

''اشعری تحریک کا مقصد بحیثیت مجموعی صرف یہ تھا کہ اسلامی معتقدات کی حمایت یونانی جدلیات کے حربوں سے کی جائے ۔'' (۶)

---

(۱) بالِ جبریل ۔ ۲۸۔   (۲) جاوید نامہ ص ۔ ۱۲۵   (۳) پیامِ مشرق ۔ ۵۶۔

(۴) پیامِ مشرق ۔ ۱۹۲۔   (۵) پیامِ مشرق ۱۲۴۔ ''جہانِ عمل''۔   (۶) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۔ ۶

اشاعرہ کے بعد شیخ الاشراق نے فلاطینوس کے علاوہ اشاعری تحریک سے بھی اثر قبول کیا خاص کر مادی آنکھ، ہستی مطلق ،نور حقیقی اور مظاہر وغیرہ کے حوالے سے شیخ الاشراق پر اشاعرہ کا خاطر خواہ اثر دکھائی دیتا ہے ۔ چنانچہ علامہ محمد اقبال رقم طراز ہیں ۔'' مادی آنکھ ہستی مطلق یا نور حقیقی کے صرف خارجی مظہر کو دیکھ سکتی ہے ۔ انسان کے دل میں ایک باطنی آنکھ بھی ہے ۔ جو برخلاف مادی آنکھ کے اپنے آپ کو بھی اسی طرح دیکھ سکتی ہے ۔ جس طرح کہ دوسری اشیاء کو ۔ یہ ایسی آنکھ ہے جو محدود سے آگے بڑھ کر مظاہر کا پردہ چاک کر دیتی ہے ۔ یہ خیالات محض جراثیم تھے ۔ جو الاشراقی کے فلسفہ اشراق یا حکمت الاشراق ، میں نشوونما پا کر بارآور ہوئے ۔ اشاعرہ کے فلسفہ کا یہ ماحصل تھا ۔'' (۱)

مولانا جلال الدین رومی اور بذات خود علامہ اقبال نے بھی ظاہری و باطنی آنکھ کے حوالے سے اپنی شاعری میں طرح طرح کے مضامین باندھے ہیں ۔ موقع و محل کے مطابق یہاں رومی و اقبال کے ایسے اشعار پیش کرنے چاہیں مگر آگے چل کر کسی انتہائی موزوں موقع پر ان اشعار کو پیش کیا جائے گا۔

اشعری مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے نامور مفکرین کے اسماء:۔

الاشعری (التوفی ۳۰۶ ۔ ۹۳۰ء) امام الحرمین (التوفی ۱۱۱۰ء) امام غزالی (التوفی ۱۱۱۱ء) ابوبکر باقلانی (التوفی ۱۱۹۰ء) شہرستانی (۱۱۹۰ء) اور امام فخر الدین رازی (التوفی ۱۲۲۲ء) ہیں ۔ اشاعری فلسفہ قبالہ یعنی وحی و الہام پر یقین رکھتے ہیں ۔

جبکہ ان کے مقابلے میں مسلمان عقلیت پسندوں یا فلاسفہ کے گروہ میں الکندی (التوفی ۸۷۳ء) ابونصر فارابی (التوفی ۹۵۰ء) ابن مسکویہ (التوفی ۱۰۳۰ء) ابن سینا (التوفی ۱۰۳۷ء) ابن الہیثم (التوفی ۱۰۳۹ء) ابن باجہ التوفی ۱۱۳۸ء) ابن طفیل (التوفی ۱۱۸۵ء) اور ابن رشد التوفی ۱۱۹۸ء کے نام ناقابل فراموش ہیں ۔ ابن رشد فلسفہ ارسطو کا زبردست حامی و شارح تھا ۔ اپنے زمانے میں اسے ملحد قرار دے دیا گیا ۔ جبکہ الکندی ، فارابی اور ابن سینا نے اسلام کی مختلف تاویلات پیش کرتے ہوئے اسے افلاطونی اور ارسطا طالیسی فلسفے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ۔ اسی لئے یہ صاحبان عقل و خرد افلاطون، ارسطو اور فلاطینوس کو سند مانتے ہیں ۔

---

(۱) فلسفہ عجم ۔۱۱۳۔

بابِ دوم

حکمتِ بحثیہ (فلسفہ)
حکمتِ ذوقیہ (عشق)
اور
صاحبِ ذوق و شوق
اقبال کی نظر میں

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ بمن نیست اگر با دگرے ہست (عرفی شیرازی)

علامہ اقبال کے نزدیک بجا طور پر فلسفہ یا علم کلام حق شناس نہیں ہو سکتے ۔ تاویلیں اور بحثیں سدرہ آشنا نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے یونان سمیت ظاہری چمک دمک رکھنے والی دوسری تمام سرابی و عجمی تہذیبیں اقبال کے ہاں کوئی فیض رساں درجہ نہیں رکھتیں۔ چنانچہ نہ صرف افلاطون بلکہ سارا یونانی فلسفہ ہی مئے گزشتہ و جام شکستہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

دگر بہ دشت عرب خیمہ زن کہ بزم عجم مئے گزشتہ و جام شکستی دارد (۱)

اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ پروانے سے جلنے کی رمز سیکھ ۔ اس کی طرح شرر میں کاشانہ تعمیر کر ۔ اپنی جان کے اندر عشق کی بنیاد رکھ حضورؐ سے اپنا پیمان محبت ازسرنو استوار کرا ے امت مسلمہ جب سے تیرے حسین چہرے پر سے نقاب اٹھا ہے میں اہل یورپ کی محبت سے دل گرفتہ ہوگیا ہوں ۔ یعنی یورپی علوم وفنون اور فلسفہ بیکار سی چیز لگتی ہے ۔

رمزِ سوز آموز از پروانہء درشرر تعمیر کن کاشانہء
طرح عشق انداز اندر جان خویش تازہ کن با مصطفیٰ پیمان خویش
خاطرم از صحبت ترسا گرفت تانقاب روے تو بالاگرفت (۲)

اقبال کے جمالیاتی مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں ۔ کہ وہ نہ تو مشائین سے متاثر ہیں اور نہ اشراقیوں و اشاعرہ سے مطمئن دکھائی دیتے ہیں ۔

مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را جہاں راتیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشراقی (۳)

نہ مشرق اس سے بری ہے ، نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری (۴)

پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں! (۵)

اقبال کہتے ہیں فلسفیوں نے اگر چہ تصورات کے سینکڑوں پیکر یا بت توڑ ڈالے ۔ مگر ابھی تک وہ ہست و بود کے سومنات میں پڑے ہیں ۔ فرشتے اور حسن مطلق کو سمجھنا سمجھانا فلسفیوں کی فکر نارسا کے بس میں نہیں اس لئے کہ فلسفہ تو ابھی

---

(۱) پیام مشرق ۔۱۶۳۔ (۲) اسرار خودی ۔ ۸۱۔ (۳) زبور عجم ۔۶۰۔
(۴) ضرب کلیم ۔۱۶۰۔ (۵) ضرب کلیم ۔۱۳۲۔

تک انسان کو نہیں سمجھ سکا۔ فلسفی بذات خود اپنے آپ کو پہچان نہیں سکا فرشتے اور یزداں کی حقیقت کیوں کر سمجھے گا؟ چنانچہ مدرسیت کا جلوتی فلسفی ہو یا میکدے کا خلوتی دونوں ہی کورنگاہ، بے ذوق اور تہی کدو ہیں۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے　　یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا　　(۱)

جلوتیانِ مدرسہ کورنگاہ و مردہ ذوق　　خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو　　(۲)

حکیماں گرچہ صد پیکر شکستند　　مقیم سومنات بود و بستند

چساں افرشتہ ویزداں بگیرند　　ہنوز آدم بفترا کے نہ بستند　　(۳)

''اقبال کے ذوق جمال'' میں یہ حقیقت صاف طور سے عیاں ہے کہ عقل و فلسفہ پردہ ہائے افلاک چاک کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کے برعکس عشق ایسا شورانگیز ہے کہ اس کے نالوں کا جواب افلاک سے آنے لگتا ہے۔ اور حسن مطلق سارے حجابات سے نکل کر جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں　　ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں　　(۴)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ　　سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ　　(۵)

پھر کہتے ہیں:۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور　　(۶)

اقبال فلسفے یعنی عقل اور عشق کو شاہین اور کرگس کی علامت سے واضح کرتے ہیں۔ فلسفے اور عشق کے مابین فرق کو اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں بیان کرنا محال ہے۔ جس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ فلسفہ کرگس کی طرح بے راہ روی کا شکار ہو کر کسی اور ہی دنیا کے چکر کاٹتا رہتا ہے۔ جبکہ عشق شاہین وار بلند بال ہوتے ہوئے حقیقت رسا ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفی بھی تخیلات کی بلندیوں میں محو پرواز رہتا ہے لیکن وہ رازِ عشق سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ جس طرح کرگس مردار خور ہے اسی طرح فلسفی کے افکار بھی مردہ ہیں۔ ان میں زندگی کی رمق نہیں ہوتی۔ چنانچہ اقبال اپنی ایک نظم ''فلسفی'' میں کہتے ہیں:۔

بلند بال تھا، لیکن نہ تھا جسور و غیور　　حکیم سرِ محبت سے بے نصیب رہا

---

(۱) بالِ جبریل۔۲۳۔　(۲) بالِ جبریل۔۱۱۲۔ ذوق شوق۔　(۳) پیامِ مشرق۔۱۱۰۔

(۴) بالِ جبریل۔۲۷۔　(۵) بالِ جبریل۔۵۱۔　(۶) ایضاً۔۱۵۶۔ ''حال و مقام''۔

پھرا فضاؤں میں کرگس اگر چہ شاہیں وار　　شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا!　(۱)

کم ہمت لوگوں سے عشق کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ عقاب مردہ تدرو کا شکار نہیں کرتا۔ جبکہ فلسفہ کرگس کی طرح مردہ خوری سے دریغ نہیں کرتا۔ اس لئے فلسفیانہ افکار بھی مردہ ہوتے ہیں۔

نہ دارد کاربادوں ہمتاں عشق　　تدرِومردہ را شاہیں نگیرد　(۲)

عشق وعقل کا فرق مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں۔

الفاظ ومعانی میں تفاوت نہیں لیکن　　ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور　(۳)

کرگساں رارسم و آئیں دیگر است　　سطوت پرواز شاہیں دیگر است

رزق زاغ و کرگس اندر خاک گور　　رزق بازاں درسوادِ ماہ وہور　(۴)

نگاہِ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے　　شکار مردہ سزا وار شاہباز نہیں　(۵)

بے حضوری ہے تیری موت کا راز　　زندہ ہو تو تو بے حضور نہیں　(۶)

اور مولانا روم فرماتے ہیں:۔

بال بازاں راسوے سلطاں برد　　بال زاغاں رابگورستاں برد

یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک فلسفہ کسی بڑی ذمہ داری کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ خودانداھا ہے زندگی کی رہبری و رہنمائی کیا کرے گا۔ یہ خود تاریک ہے۔ زندگی کی شب تار میں اجالا کیوں کر پھیلا سکتا ہے۔

عقلِ بے مایہ امانت کی سزا وار نہیں　　راہبر ہوظن و تخمینِ تو زبوں کارحیات!

فکر بے نور ترا ، جذب عمل بے بنیاد　　سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تارحیات　(۷)

انجام خرد ہے بے حضوری　　ہے فلسفہ زندگی سے دوری

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت　　ہیں ذوق عمل کے واسطے موت　(۸)

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا　　غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟　(۹)

---

(۱) بالِ جبریل۔۱۶۴۔ (۲) پیامِ مشرق۔۲۲۱۔ "خردہ"۔ (۳) بالِ جبریل۔۱۵۶۔ (۴) جاوید نامہ۔۲۰۴۔۲۰۷۔ (۵) بالِ جبریل۔۳۸۔
(۶) ایضاً۔۴۳۔ (۷) ضربِ کلیم۔۳۸۔ "وحی"۔ (۸) ایضاً۔۱۸۔ "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام"۔ (۹) ضربِ کلیم۔۴۲۔ "فلسفہ"۔

اقبال کے مطابق عقلیت پسندی اور فلسفہ پرستی اپنے گردوغبار ہی میں مسافر کو بھٹکا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقلیت پسندی کی بناء پر بوعلی سینا غبارناقہ ہی میں کھو گئے، جبکہ رومی عشق کے بل بوتے پر پردہ محمل (حسن مطلق) تک پہنچ گئے۔ رومی نے جذبہ عشق کے سہارے ایسی غوطہ زنی کی کہ گوہر مقصود کو پا لیا، جبکہ بوعلی سینا ایک تنکے کی مانند سطح آب پر گرداب فلسفہ ہی میں چکرا کر رہ گئے۔

بوعلی اندر غبار ناقہ گم — دست رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فروتر رفت و تا گوہر رسید — آں بگردابے چوخس منزل گرفت (۱)

عقل اور فلسفہ ہمیشہ پابہ گل ہی رہے گویا کہ طاقت پرواز سے محروم ہیں۔ اس لئے حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ مغربی فلسفے کا یہ حال ہے کہ:۔

ازمن اے بادِصبا گوے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است (۲)

اقبال اپنے ذوقِ جمال کی رو سے قیل و قال کی بجائے حال کے قائل ہیں۔ چنانچہ ان کا یقین کامل ہے کہ بحث و تمحیص اور فلسفے کی بجائے روحانی کیفیات کے ذریعے "حسن مطلق" کے نور مطلق سے اعمال کی تاریکی دور کی جاسکتی ہے۔

قال راگبذار وباب حال زن — نورِ حق برظلمت اعمال زن (۳)

اس لئے ضروری ہے کہ صحبت اہل صدق و یقین سے فیضیاب ہو کر منزل مقصود تک رسائی حاصل کی جائے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہوکرگسوں میں — اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شہبازی (۴)

شمس تبریزی نے بھی مولانا روم کو قال سے نکال کر حال کی دنیا میں منتقل کر دیا تھا۔ تب کہیں جا کر مولانا روم حقیقت آشنا ہوئے۔

مولوی ہر گز نہ شد مولائے روم — تا غلام شمس تبریزی نہ شد (رومی)

اقبال کہتے ہیں جب تک تو کسی مرد خدا کے دامن سے وابستگی اختیار نہیں کرے گا اس دنیا میں تیری قیمت پرکاہ کے برابر بھی نہیں ہوگی۔

اس مرد خود آگاہ و خدا مست کی صحبت — دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز (۵)
اندریں عالم نیرزی باخسے — تانیاویزی بدامانِ کسے (۶)

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۹۰۔ (۲) ایضاً۔ ۳۳۸۔ "نقش فرنگ"۔ (۳) اسرار و رموز۔ ۱۵۲۔
(۴) بال جبریل۔ ۱۷۔ (۵) ضرب کلیم۔ ۵۴۔ (۶) پس چہ باید کرد۔ ۴۸۔

صحبت اہل صفا نور و حضور و سرور — سرخوش و پرسوز ہے لالہ لب آبجو! (۱)

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی — خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ (۲)

عشق لمبی چوڑی بحثوں اور مجادلوں کا نام نہیں ۔ بلکہ اپنے جسم کی شمع کو رومیؒ کی مانند فروزاں کرکے تبریز کی آگ میں جلا دینے کا نام ہے ۔

شمع خود را ہمچو رومی برفروز — روم را درآتشِ تبریز سوز (۳)

مطرب غزلے بیتے از مرشد روم آور — تاغوطہ زند جانم درآتش تبریزے (۴)

می نہ روید تخم دل از آب و گل — بے نگاہے از خداوندانِ دل (۵)

روم سے مراد عقل و فلسفہ ہے اور تبریز سے مراد عشق و تصوف ہے ۔ اس ضمن میں بلاشبہ اقبال نے بذات خود عملی ثبوت بہم پہنچایا ہے کہتے ہیں مجھے دیکھ کہ ہندوستان میں تجھے میرے سوائے کوئی اور ایسا برہمن زادہ نہیں ملے گا جو روم و تبریز کے رموز (تصوف) سے باخبر ہو ۔

مرا بنگر کہ درہندوستان دیگرے نے بینی — برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است (۶)

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق — دل میں صلوۃ و درود ، لب پہ صلوٰۃ و درود (۷)

اقبال فلسفے اور علم کلام کی محدود پرواز کی وجہ سے کہتے ہیں کہ حسن مطلق اور دین کی منزل فلسفہ میں نہیں اور نہ ہی فلسفے کی کتابیں انسان کو کسی مقام پر پہنچا سکتی ہیں بلکہ عشق ہی وہ قوت ہے جو انسان کی رہبری و رہنمائی کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے ۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر — علم و حکمت از کتب دیں از نظر

بوعلی دانندۂ آب و گل است — بے خبر از خستگیہائے دل است

نیش و نوشِ بو علی سینا بہل — چارہ سازی ہائے دل از اہل دل (۸)

مزید تفصیل میں جاتے ہوئے اقبال رقم طراز ہیں کیا تو استاد رومی کا واقعہ جانتا ہے وہ جو شام کے شہر حلب میں درس و تدریس میں مشغول تھے ۔ ان کے پاؤں میں عقلی استدلال کی زنجیر پڑی ہوئی تھیں ۔ ان کی زورق دل عقلی تاریکیوں میں

---

(۱) بال جبریل ۔ ۹۱۔ (۲) بال جبریل ۔ ۱۱۶۔ (۳) اسرار و رموز ۔ ۲۰۔ (۴) پیام مشرق ۔ ۱۶۱۔

(۵) پس چہ باید کرد ۔ ۲۸ (۶) زبور عجم ۔ ۱۳۔ (۷) بال جبریل ۔۹۶۔ ''مسجد قرطبہ''۔ (۸) پس چہ باید کرد ۔ ۲۹۔

تھپیڑے کھا رہی تھی ۔ وہ موسیٰ تھے ۔ مگر عشق کے طورسینا سے بے خبر ۔ وہ ''تشکک ''اور'' اشراق'' کی باتیں کرتے ہوئے فلسفہ کے چمکدار موتی پروتے وہ اقوال ہائے مشائین کی گتھیاں سلجھاتے ۔ ان کے فکر کی روشنی ہر پوشیدہ نکتہ واضح کر دیتی ۔ ان کے اردگرد کتابوں کا ڈھیر لگا رہتا ۔ ان کی زبان اسرار کتب کی وضاحت کرنے میں مصروف رہتی ۔ شیخ کمال جنیدی کے حکم پر شمس تبریزی رومیؒ کے مکتب کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں جا کر مولانا سے کہا ۔ یہ شوروغوغا وقیل و قال و قیاس و وہم و استدلال کیا ہے ۔ رومیؒ نے کہا ۔ بیوقوف زبان بند رکھ فلسفیوں کے مقالات کا مذاق نہ اڑا ۔ میرے مکتب سے باہر نکل جا ۔ یہ فلسفیوں کے مقالات ہیں تیرا ان سے کیا تعلق ۔ ہماری گفتگو تیری سمجھ سے بالاتر ہے ۔ اس سے آئینہ ذہن منور ہوتا ہے ۔ رومی کی باتوں سے شمس کے سوز میں اضافہ ہوا ان کی آتش دروں بھڑک اٹھی ۔ شمس تبریزی کی برق نگاہ رومی کی زمین دل پر گری اور اس کے سوز سے خاک رومی کے اندر سے شعلہء عشق اٹھا ۔ شمس تبریزی کی آتش عشق سے خرمن ادراک بھسم ہو کر رہ گیا ۔ شعلہ بھڑکا اور اس فلسفی (رومی) کا دفتر خاکستر کر دیا ۔ اس نے کہا کہ تو نے یہ آگ کیسے جلائی ۔ جس نے اہل فلسفہ کا دفتر راکھ کر دیا ۔ شیخ نے کہا کہ اے مسلم زناردار یہ ''ذوق و جمال'' ہے تیرا اس سے کیا کام ۔ ہماری کیفیت تیری سوجھ بوجھ اور عقل سے بالاتر ہے ہمارا شعلہ عشق کیمیائے احمر ہے ۔ جو تانبے کو سونا بنا دیتی ہے ۔ تو نے فلسفے کی برف کو اپنا سرمایہ بنا رکھا ہے تیرے فکر کے بادل سے صرف اولے ہی برستے ہیں ۔ عشق کے طفیل اپنے خس وخاشاک سے آگ روشن کرتا کہ تیری مٹی شعلہ بن جائے ۔
اس سلسلے میں علامہ اقبال کے اشعار نقل کرنے سے پیشتر مثنوی مولانا روم کے مترجم قاضی سجاد حسین کی تحریر بھی پیش خدمت ہے ۔

'' ایک روایت یہ بھی ہے کہ مولانا کسی حوض کے کنارے کتب بینی میں مصروف تھے ۔ وہاں شمس تبریز آ گئے ۔ اور مولانا سے دریافت کیا کہ یہ کتابیں ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ تمہیں ان کتابوں سے کیا غرض ۔ اس پر شمس تبریز نے وہ کتابیں حوض میں پھینک دیں ۔ مولانا کو سخت رنج ہوا اور فرمایا کہ میاں درویش تم نے تو ایسی چیزیں ضائع کر دیں جن میں نادر نکتے تھے ۔ اور اب ان کا ملنا محال ہے ۔ اس پر شمس تبریز نے وہ کتابیں خشک حالت میں حوض سے نکال کر مولانا کے سامنے رکھ دیں مولانا حیران ہوئے تو شمس تبریز نے کہا یہ حال کی باتیں ہیں ۔ تم صاحب قال ان کو کیا جانو'' ۔ (۱)

اقبال کہتے ہیں :۔

---

(۱) مقدمہ مثنوی مولوی معنوی ۔ ۳ ۔ دفتر اوّل ۔

آگہی از قصۂ اخوندروم   آنکہ داداندر حلب درس علوم

پائے درزنجیر توجیہاتِ عقل   کشتیش طوفانیء ظلمات عقل

موسیٰ ، بیگانہء سینائے عشق   بے خبر از عشق و از سودائے عشق

از تشکک گفت واز اشراق گفت   وزحکم! ، صد گوہرِ تابندہ سفت

عقد ہ ہائے قولِ مشائیں کشود   نورفکرش ہر خفی را وا نمود

گرد و پیشش بود انبارِ کتب   برلب او شرح اسرار کتب

پیر تبریزی زارشاد کمالؒ   جست راہِ مکتبِ ملاّ جلال

گفت ایں غوغا و قیل و قال چیست   ایں قیام و وہم و استدلال چیست

مولوی فرمود ناداں لب بہ بند   برمقالاتِ خرد مندان مخند

پائے خویش از مکتبم بیروں گزار   قیل و قال است ایں ترابا وے چہ کار

قالِ ما از فہمِ تو بالا تر است   شیشۂ ادراک را روشنگر است

سوز شمس از گفتۂ ملا فزدو   آتشے از جان تبریزی کشود

برزمیں برقِ نگاہِ او فتاد   خاک از سوزِ دمِ او شعلہ زاد

آتشِ دل خرمنِ ادراک سوخت   دفترِ آں فلسفی را پاک سوخت

مولوی بیگانہ از اعجاز عشق   ناشناسِ نغمہائے ساز عشق

گفت ایں آتش چساں افروختی   دفتر ارباب حکمت سوختی

گفت شیخ اے مسلم زناردار   ذوق و حال است ایں ترا باوے چہ کار

حال ماازفکر تو بالاتر است   شعلہء ماکیمیائے احمراست

ساختی از برفِ حکمت سازو برگ   ازسحاب فکر تو بارد تگرگ

آتشے افروز از خاشاک خویش   شعلہ تعمیرکن از خاکِ خویش (۱)

---

(۱) اسرار ورموز ۔ ۶۶ ۔ ۶۷۔

عاشق کا سب ہی فلسفیوں کے لئے یہی پیغام ہے۔اقبال فلسفی وعقلیت پسند سے کہتے ہیں، تو نے دانش تو جمع کر لی، مگر دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ افسوس اس نایاب سرمایہ پر جو تو نے ہار دیا۔ حکمت و فلسفہ میں بھی گہرائی ہے لیکن اس مکتب میں عشق و محبت کے تھپیڑے نہیں ۔ یہ بیدار دلوں کے لئے غارت گر ہے ۔ سارے فتنے فلفسے کی چشم فتنہ زا میں ہیں ۔ عقل کی آتش سرد، دل کو تڑپنا پھڑکنا نہیں سکھاتی جبکہ

تپش می کند زنده تر زندگی را تپش می دہد بال و پر زندگی را (۱)

زندگانی سوختن با ساختن در گلے تخم دلے انداختن (۲)

فلسفہ جنگلوں اور پہاڑوں کے چکر کاٹتا رہا مگر غزالِ حقیقت، یعنی حسن مطلق کو نہ پا سکا۔ سارے چمن میں گھوما پھرا لیکن اس کے گریباں میں ایک پھول بھی نہیں ۔

دانش اندوختہء ، دل زکف انداختہء آہ زاں نقد گرانمایہ کہ درباختہء

حکمت و فلسفہ کارے است کہ پایانش نیست سیلیء عشق و محبت بہ دلبستانش نیست

بیشتر راہِ دل مردمِ بیدار زند فتنہء نیست کہ درچشم سخندا نش نیست

دل زنارِ خنک او بہ تپیدن نرسد لذتے درخلش غمزۂ پنہانش نیست

دشت و کہسار نورد ید و غزالے نگرفت طوف گلشن زدویک گل بہ گریبانش نیست (۳)

یعنی فلسفے کے پاس حسن مطلق کا مظہر ایک پھول بھی نہیں ۔ عقل کے ذریعے حسن مطلق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے پانی میں آگ لگا دی گئی اور دنیا برہم ہوگئی۔ اس کیمیا ساز نے اڑتی ہوئی ریت کو تو سونا بنا دیا۔ مگر کسی دل سوختہ پر اکسیر نہ ڈالی۔ کہ وہ کندن بن جاتا ۔ افسوس ہماری سادگی پر ہم عقل عیار سے دھوکہ کھا گئے اس راہزن نے، گھات لگا کر آدم کو راستے میں لوٹا ۔ اپنے آپ کو دیکھنے والی عقل اور ہے، جہاں پر نگاہ مرکوز رکھنے والی عقل دوسری ہے ۔ عقل بلبل کے کمزور پر ہیں ۔ جبکہ عشق شاہین کا توانا و مضبوط بازو ہے ۔ عقل ایسا پرندہ ہے جو بلند پروازی کی سکت نہ رکھتے ہوئے زمین بوس دانے دنکے چگتا رہتا ہے اس کے برعکس عشق ایسا بلند پرواز پرندہ ہے جو دانہء پرویں سے خوراک حاصل کرتا ہے۔ عقل وہ پرندہ ہے جو سرسری طور پر باغ کے اوپر اوپر سے گزر جاتا ہے اور عشق ایسا پرندہ ہے جو باغ ہستی کے تمام مظاہر کے اندر داخل

---

(۱) پیامِ مشرق ۔۱۰۴۔ (۲) جاوید نامہ ۔۶۵۔ (۳) پیامِ مشرق ۔۳۵۰۔

ہو کر حسن مطلق کو پالیتا ہے نو پردوں والے آسماں کے آر پار دیکھنا اور بات ہے، جو عشق کے بس کا کام ہے۔ اور پردوں کے اس طرف قیل و قال، بحث و تخمیس یا ظن و تخمین میں مشغول رہنا اور چیز ہے فلسفے کی صورت میں تو جو علم سیکھتا ہے وہ نگاہ محبت کا اشتیاق نہیں رکھتا۔ یہ راہ حیات کا تھکا ہوا راہی سرگرم سفر نہیں۔

عقل چوں پائے دریں راہِ خم اندر خم زد — شعلہ درآب روانیدو جہاں برہم زد
کیمیا سازیء اوریگ رواں را زرکرد — بردل سوختہ اکسیرِ محبت کم زد
وائے برسادگیء ما کہ فسونش خوردیم — رہزنے بود، کمیں کرد ورہ آدم زد
عقل خود بیں دگر وعقل جہاں بیں دگراست — بال بلبل دگر و بازوے شاہیں دگراست
دگراست آں کہ بردانہء افتادہ زخاک — آں کہ گیرد خورش ازدانہء پرویں دگراست
دگراست آں کہ زندسیر چمن مثل نسیم — آں کہ درشد بہ ضمیر گل و نسریں دگراست
درگراست آنسوے نۂ پردہ کشادن نظرے — ایں سوے پردہ گمان وظن و تخمین دگراست (۱)
عملے کہ تو آموزی مشتاق نگاہے نیست — واماندۂ راہے ہست، آوارۂ راہے نیست (۲)
معجزہ اہل فکر، فلسفہ پیچ پیچ — معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور (۳)
پائی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک — مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی (۴)
حیرت آغاز و انتہا ہے — آئینے کے گھر میں اور کیا ہے (۵)

مزید برآں زمانے کا دل فریاد کناں ہے کہ میرے اندر زہر سرایت کر رہا ہے۔ مگر خرد اشک بار ہے کہ اس کے پاس اس زہر کا کوئی علاج نہیں۔ حکمت و فلسفہ مشکل کشا نہیں ہو سکتا بلکہ الٹا مشکلات لا کھڑی کرتا ہے۔ فلسفے کے بارگراں سے کوئی عاشق ہی چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ عشق ہی فلسفے کی تھونپی ہوئی سرگرانی سے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔

دل گیتی اناالمسموم، اناالمسموم فریادش — خرد نالاں کہ ماعندی بتریاق دلا راقی
حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا — خضرمن! از سرم ایں بارگراں پاک انداز (۶)

کیا کروں علم و دانش یعنی عقل اور فلسفے کی شاخ سے کوئی ایسا کانٹا نہیں نکلا جو دل میں چبھو سکوں اور ایسے علم و دانش

---

(۱) پیام مشرق۔۳۵۲۔ (۲) زبور عجم۔۱۰۵۔ (۳) ضرب کلیم۔۵۱۔
(۴) بانگ درا۔۱۳۹۔ (۵) ایضاً۔۱۳۶۔ (۶) زبور عجم۔۶۰۔۶۲۔

سے جہالت ہزار گنا بہتر ہے۔ دل جس کی تصدیق نہ کرے۔ عقل کی گتھیاں سلجھانے میں اگر چہ اور طرح کی لذت ہے مگر سادہ دلوں کا ایمان دقیق نکات سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ فلسفے وعلم کلام کی کم مائیگی کی بناء پر میں نے انہیں اپنے ذہن کی تختی سے دھوڈالا ہے۔ تاریخ فلسفہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکثر فلسفی درباروں کے پروردہ ہیں لیکن عاشق کا معاملہ جدا ہے۔اس لئے اقبال کہتے ہیں میں سلطانی دربار سے دور رہتا ہوں کافر نہیں ہوں۔ کہ حسن مطلق کے علاوہ کسی بے اختیار خدا کی پرستش کروں۔

چہ کنم چہ چارہ گیرم کہ زشاخ علم دانش	نہ دمیدہ ہیچ خارے کہ بدل نشا نم اورا	(۱)
ہزار بار نکوتر متاع بے بصری	زدانشے کہ دل اورانمی کند تصدیق	
بیچ و تابِ خرد گر چہ لذتِ دگراست	یقینِ سادہ دلاں بہ زنکتہ ہائے دقیق	
کلام و فلسفہ از لوحِ دل فرو شستم	ضمیرِ خویش کشادم بہ نشترِ تحقیق	
زآستانہء سلطان کنارہ می گیرم	نہ کافرم کہ پرستم خدائے بے توفیق	(۲)

عقل خود پرست وخود بیں ہے یہ دوسروں کی خیر خواہی نہیں کرتی۔ صرف اپنے فائدے کے لئے سوچتی ہے۔ نطشے جیسے فلسفی کو عقل ہی نے بھٹکائے رکھا، عقل ہی نے اسے سمجھایا کہ تو اپنے راستے پر چل تیرا راستہ بہتر ہے۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر	سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر	(۳)
عقل او باخویشتن درگفتگو ست	تو رہَ خود روکہ راہِ خودنکوست!	(۴)

فلسفہ ومنطق سے اقبال نالاں ہیں، انہیں منطق سے خامی کی بو آتی ہے۔ اس کے دلائل نامکمل ہیں۔ اس کے مقابلے میں پیر رومیؒ اور جامیؒ جیسے عاشقوں کے وجد آفریں عاشقانہ اشعار حسن ومعرفت کے سربستہ راز واکردیتے ہیں۔

مراز منطق آید بوے خامی	دلیل او دلیلِ ناتمامی	
برویم بستہ درہا را کشاید	دو بیت از پیرِ رومیؒ یا زجامیؒ	(۵)

عقل کی کشمکش کا فریب دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہے تو یہ امیر قافلہ مگر رہزنی کا ذوق رکھتی ہے۔ اسی بناء پر اقبال کہتے ہیں عقل حیلہ جو سے راستے کا پتہ نہ پوچھ۔ عشق کی طرف آ، جو عقل ذوفنوں کے مقابلے میں یک فنی میں کمال رکھتا ہے۔

---

(۱) زبور۔عجم۔۹۴۔ (۲) ایضاً۔۲۲۸۔۲۳۰۔ (۳) جاوید نامہ۔۱۳۲۔

(۴) ایضاً۔۲۸۲۔ (۵) ارمغانِ حجاز۔۲۵۴۔

فریب کشمکشِ عقل دیدنی دارد   کہ میرقافلہ و ذوقِ رہزنی دارد
نشان راہ زعقلِ ہزار حیلہ مپرس   بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد   (۱)

اقبال کہتے ہیں، عقل سے آگے گزر کر بحرعشق کی موج سے ٹکرا۔ اس لئے کہ عقل کی کم آب ندی میں کوئی موتی نہیں۔ اس خرد سے بچ جو مایوسی کے نقش بناتی رہتی ہے۔ اور اپنے ساز سے جس کے تار ٹوٹے ہوئے ہیں، ہمارا دل لبھا لیتی ہے۔

بگذر از عقل و در آویز بموج یم عشق   کہ دراں جوئے تنک مایہ گہر پیدا نیست   (۲)
خذر از خرد کہ بندد ہمہ نقشِ نامرادی   دل مابرد بسازے کہ گسستہ تار بادا   (۳)

خرد کی جادوگری دل زندہ کی تڑپ کو نہیں پہنچتی۔ فلسفیوں کے کنشت (یہودیوں کا معبد) سے میرے سوز و ساز یعنی عشق کے حرم میں آ جا۔ اس لئے کہ میرا عشق بے نیاز اپنی آغوش میں شعلہ رکھتا ہے مگر میرے بانجھ فلسفے کے اندر سے ایک شرر بھی نہیں پھوٹتا۔

نرسد فسوں گریء خرد بہ تپیدنِ دلِ زندہَ   زکنشت فلسفیاں درآ بحریم سوز و گداز من   (۴)
شعلہ در آغوش دارد عشقِ بے پروائے من   برنخیزد یک شرار از حکمتِ نازائے من   (۵)
بیا بمجلسِ اقبال ویک دو ساغر کش   اگر چہ سر نتراشد، قلندری داند   (۶)

اور پھر:۔

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے   جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول   (۷)

اس سے ہم یہ نتیجہ برملا اخذ کر سکتے ہیں کہ علامہ ''اقبال کا ذوق جمال'' فلسفہ، منطق، علم کلام اور قیل و قال سے متفق نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک جمال و فلسفہ دو متضاد چیزیں ہیں، فلسفہ کا جمال جیسی حقیقت اولیٰ تک پہنچنا محال ہے۔ علاوہ ازیں ''ذوق جمال'' سمیت فکر اقبال کے سبھی سوتے اسلامی تعلیمات بالخصوص قرآن پاک سے پھوٹتے ہیں۔ اقبال سے بہت ہی پہلے فلسفہ و عقلیت پرستی کے خلاف زبردست ردعمل شروع ہو چکا تھا۔

'' مامون نے فلسفہ و حکمت کو عربی میں منتقل کر کے فکر کے لئے نئی راہیں ہموار کیں۔ ان علوم کی وجہ سے عقل نے

---

(۱) پیامِ مشرق۔۱۶۲۔۱۶۳۔   (۲) پیامِ مشرق۔۱۷۰۔   (۳) پیامِ مشرق۔۱۷۹۔   (۴) ایضاً۔۱۷۴۔
(۵) پیامِ مشرق۔۱۸۲۔   (۶) ایضاً۔۱۷۶۔   (۷) ضربِ کلیم۔۷۳۔

بے لگام ہو کر مذہب سے بغاوت کی ۔ اسلامی عقائد وفکر کو دھچکا لگا ۔ اسلامی پختگی فکر، شک اور انکار میں تبدیل ہونے لگی۔ اسلامی فکر ونظر سے ہٹ کر طرح طرح سے قرآنی آیات کی تاویلات کی جانے لگیں ۔ مذہب کو عقل کا یہاں تک تابع بنایا گیا کہ عقلیت کے اس طوفان میں لوگ مذہب سے بے تعلق ہونے لگے۔" (۱)

چنانچہ قبل از" صاحب نظراں" اقبال نے عقلیت پرستی کا مقابلہ تصوف کے زور سے کیا۔ اقبال اس عقلیت پرستی اور گراوٹ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہوئے ۔

تمدن ، تصوف ، شریعت کلام — بتان عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا (۲)

اپنے "صاحب دل" پیش رووں کی طرح عقلیت کے مقابلے میں ڈٹ جاتے ہیں ۔ وہ اس "عجمی تصوف" کی بھی مخالفت کرتے دکھائی دیتے ہیں جس میں فلسفہ شامل ہو ۔ ایسے تصوف کو اقبال خام تصوف کہتے ہیں، جس کا سرچشمہ قرآن و حدیث نہ ہو ۔تو نے اپنے شمشاد یعنی اسلامی تعلیمات کی قیمت نہ پہنچانی ۔ دوسروں کے سرو (مغربی تعلیمات) کو بلند درجہ دیا۔ بانسری کی طرح تو نے اپنے آپ کو اپنے آپ سے خالی کردیا اور دوسروں کی آواز سے دل لگایا۔ ہر لمبے بالوں والا خرقہ پوش روحانی بزرگ بنا ہوا ہے۔ ان دین فروش سوداگروں پر افسوس ہے ۔ آج کل کے پیر مریدوں کے ساتھ سفر میں رہتے ہیں۔ وہ ملت کے حالات وضروریات سے بالکل بے خبر ہیں ۔ ان کی آنکھیں نرگس کی مانند بے نور ہیں ۔ ان کے سینے دل کی دولت (عشق) سے محروم ہیں ۔ کیا واعظ اور کیا صوفی سب مادّہ پرست ہیں ۔ ملت بیضا کا وقار ختم ہو چکا ہے ہمارے واعظ کی نظریں بت خانے پر لگی ہوئی ہیں ۔ اور ہمارے مفتی فتوے بیچ رہے ہیں ۔ دوستو! اب ہمارے لئے کیا چارہء کار باقی رہ گیا ہے ۔ جبکہ ہمارے پیر ہی نے میخانے کا رخ اختیار کر لیا ہے ۔

قیمت شمشاد خود نشناختی — سرو دیگر را بلند انداختی
مثل نے خود را زخود کر دی تہی — برنوائے دیگراں دل می نہی

---

(۱) اقبال کے محبوب صوفیہ ۔ ص ۔ ج ۔ اعجاز الحق قدوسی۔

(۲) بال جبریل ۔ ۱۴۳۔ "ساقی نامہ"۔

می شود ہرمؤ درازے خرقہ پوش ۔ اہ ازیں سوداگرانِ دیں فروش
بامریداں روز و شب اندر سفر ۔ ازضرورت ہائے ملت بے خبر
دیدہ ہا بے نور مثل نرگس اند ۔ سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند
واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست ۔ اعتبار ملتِ بیضاشکست
و اعظ ماچشم بربتخانہ دوخت ۔ مفتئی دینِ مبیں فتویٰ فروخت
چیست یاراں بعد ازیں تدبیر ما
رخ سوے میخانہ دارد پیرما (۱)

اس لئے کہتے ہیں کہ میں صوفی اور ملاّ دونوں کی بزم سے غمناک نکلا ہوں ۔ نہ یہاں کوئی رمزِ محبت ہے ۔ نہ وہاں کوئی شوق کی بات ۔

نہ ایں جا چشمک ساقی نہ آنجا حرف مشتاق ۔ زبزم صوفی و ملا بے غمناک می آیم (۲)
یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے ۔ گلیم بوزر و دلق اویس و چادرِزھرا؟ (۳)

ایسے ہی ملا وصوفی کے لئے ابلیس اپنے مشیروں کوتلقین کرتا ہے کہ:۔

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے ۔ پختہ ترکردو مزاج خانقاہی میں اسے (۴)

چنانچہ اقبال ایسے زندہ دلوں کے غلام ہیں جو حسن حقیقی کے عاشق ہیں،نہ کہ ان خانقاہ نشینوں کے جو سوزِ محبت سے خالی ہیں ۔ وہ زندہ دل رنگ آشنا بھی ہیں اور بے رنگ بھی ۔ یہی لوگ مسجد ، میخانہ اورصنم کدہ کے لئے معیار ہیں ۔

غلامِ زندہ دلانم عاشق سرہ اند ۔ نہ خانقاہ نشیناں کہ دل بکس ندہند
بآں دلے کہ برنگ آشنا و بیرنگ است ۔ عیار مسجد و میخانہ و صنم کدہ اند (۵)
''قم باذن اللہ'' کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے ۔ خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن (۶)

اور پھر:۔

سبوئے خانقاہاں خالی ازمے ۔ کندمکتب رہِ طے کر دہ راطے

---

(۱) اسرار ورموز ۔ ۶۹۔۷۰۔ (۲) زبورِعجم ۔ ۳۱۔ (۳) بالِ جبریل ۔ ۲۳۔
(۴) ارمغانِ حجاز (اردو) ۔ ۱۵۔ ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' ۔ (۵) زبورِعجم ۔ ۶۹ ۔ (۶) بالِ جبریل ۔ ۱۶۱۔

زبزم شاعراں افسردہ رفتم نواہا مردہ بیروں افتد از نے (۱)

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے؟ فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی (۲)

اسی طرح یہ سب عجمی تصوف کی بے علمی اور حقیقت سے بعد کی کڑیاں ہیں۔

دل ملا گرفتار غمے نیست نگاہے ہست در چشمش نمے نیست

ازاں بگریختم از مکتب او کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست (۳)

یہی وجہ ہے کہ:۔

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے (۴)

ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے ''گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا'' (۵)

(دوسرا مصرعہ حکیم سنائی کا ہے)

مجھ کو تو سکھادی ہے افرنگ نے زندیقی اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی (۶)

مگر:۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد (۷)

بس حالت زار کچھ یوں ہے کہ:۔

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی خونِ دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز (۸)

اسی واسطے:۔

بادہ گردان عجم وہ، عربی مری شراب میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مئے آشام ابھی (۹)

اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں۔'' حقیقت اور معرفت کی تلاش کے جذبے کو بھی قرآن ہی سے تسکین ملتی ہے۔ عالم اسلام میں'' قرآن حکیم سے دوری نے ایک فکری خلا کو جنم دیا، اور پھر تجزیاتی فلسفہ و منطق اور نوافلاطونیت (Neo Platonism) کے افکار کی یلغار ہوئی تو ہمارے بڑے بڑے ذہن اس سے آزاد نہ رہ سکے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی جیسی شخصیت افلاطون کے خیالات سے آزاد نہ ہو سکی تو پھر اور کس کی بات کی جائے''۔ (۱۰)

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔ ۴۰۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۳۰۔ (۳) ارمغانِ حجاز۔ ۴۸۔ (۴) بانگِ درا۔ ۳۰۳۔'' جواب شکوہ''۔ (۵) بالِ جبریل۔ ۲۴۔

(۶) بالِ جبریل۔ ۱۹۔ (۷) ضرب کلیم۔ ۳۶۔''ہندی اسلام'' (۸) بالِ جبریل۔ ۲۶۔ (۹) بانگِ درا۔ ۲۷۹۔ (۱۰) حقیقتِ تصوف۔ ۳۲۔ ڈاکٹر اسرار احمد۔

اقبال جب کبھی رسمی تصوف کے خلاف لکھتے ہیں تو ان کے پیش نظر یہی تلخ حقائق ہوتے ہیں ۔

خوار از مہجوریء قرآں شدی　　شکوہ سنجِ گردش دوراں شدی
اے چوں شبنم برزمیں افتندۂ　　دربغل داری کتاب زندۂ　　(۱)

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے　　تم مسلماں ہو یہ انداز مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نہ دولت عثمانی ہے　　تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے طارق قرآں ہو کر　　(۲)

ہمارا واعظ خوب سماں باندھتا ہے ۔ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے۔ پرشکوہ الفاظ میں انتہا کی لفاظی ہے ۔لیکن بہ لحاظ مفہوم پستی اور ہلکے پن کا شکار ہیں ۔ضعیف احادیث اور خطیب بغدادی یا امام دیلمی سے اس کی ساری گفتگو ماخوذ ہے ۔ پیر حرم اگر چہ لا الہ کا ورد کرتا ہے مگر وہ نگاہ کہاں جو تلوار سے تیز تر ہو۔

واعظِ دستاں زنِ افسانہ بند　　معنیء او پست و حرف او بلند
ازخطیب و دیلمی گفتارِ او　　باضعیف و شاذو مرسل کاراو　　(۳)
گرچہ پیر حرم وردِ لاالہ دارد　　کجا نگاہ کہ برندہ تر زپولاداست!　　(۴)
سر منبر کلامش نیشدار است　　کہ اوراصد کتاب اندر کناراست
حضورِ تو من از خجلت نہ گفتم　　زخود پنہان و برما آشکاراست　　(۵)
صاحب قرآں و بے ذوق طلب　　العجب ثم العجب ثم العجب!　　(۶)

اونی گدڑی پہننے والے صوفی کی محفل ذکر قرآن سے عاری ہے ۔قوال کے نغمے سن کر وہ مدہوش ہو جاتا ہے ۔ اور عراقی ہمدانی کے شعر سے اس کے دل میں آگ بھر جاتی ہے ۔مگر اس کی محفل میں قرآن کا ذکر نہیں ہوتا۔

صوفیء پشمینہ پوشِ حال مست　　ازشراب نغمہء قوال مست
آتش از شعرِ عراقی دردلش　　درنمی سازد بقرآں محفلش　　(۷)

---

(۱) اسرار و رموز ۔۱۶۳۔　(۲) بانگِ درا ۔۳۰۳۔۲۰۴۔ جواب شکوہ ۔　(۳) اسرو رموز ۔۱۲۳۔
(۴) پس چہ باید کرد ۔ ۶۵۔　(۵) ارمغانِ حجاز ۔ ۴۸۔　(۶) جاوید نامہ ۔۲۰۱۔　(۷) اسرار و رموز ۔ ۱۲۳۔

جبکہ درحقیقت:۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن (۱)
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو — ورنہ مانند غبار آشفتہ شو (۲)

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال — ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار (۳)

علاوہ ازیں:۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست!
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست (۴)

ایسی حالت زار میں اقبال کھل کر کہنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں:۔

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں — کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں (۵)

اقبال کہتے ہیں کہ میرا یہ جام لے لے اس سے اپنا چہرہ گلستان یعنی سرخ بنا۔ بہار، گویا کہ وقتی مصلحت اندیشی اور ضرورت نے صوفیوں کو خرقہ فروشی سکھا دی ہے۔ وہ خرقہ فروشی کرکے شراب حاصل کر رہے ہیں۔ طنزاً کہتے ہیں کہ فقیہہ حرم کی محرومی پر میرا دل بہت جلا کہ پیر مغاں نے فتویٰ کے عوض اسے جام شراب دینے سے انکار کر دیا۔ گویا فتوے بیچ کر شراب کمائی جاتی ہے۔

تو ہم ز ساغر مۓ چہرہ راگلستان کن — بہار خرقہ فروشی بہ صوفیاں آموخت
دلم تپید ز محرومیٔ فقیہہ حرم — کہ پیر میکدہ جامے بفتویٰ نہ فروخت (۶)

ایسے میں:۔

بیا کہ دامن اقبال رابدست آریم — کہ اوز خرقہ فروشان خانقاہے نیست (۷)
صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند — کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی (۸)

اقبال کہتے ہیں کہ ایسے مسلمانوں سے دور بھاگ جو وضع میں نصاریٰ اور تمدن میں ہیں ہنود، ایسی حالت زار

---

(۱) اسرار خودی۔۱۳۳۔ (۲) اسرار و رموز۔۱۳۶۔ (۳) ضرب کلیم۔۳۹، ۴۰۔ "مستیٔ کردار"۔ (۴) ضرب کلیم۔۳۸۔
(۵) بانگ درا۔۲۰۳۔ جواب شکوہ۔ (۶) پیام مشرق۔۱۵۵۔ (۷) ایضاً۔۱۸۲۔ (۸) بال جبریل۔۷۶۔

میں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود، مسلمانوں میں نہیں بلکہ مسلمانی میں داخل ہو جانا چاہئے۔ کیوں کہ اس دور کے مسلمان کافرانہ انداز اپنا چکے ہیں۔

برون آ از مسلماناں گریز اندر مسلمانی — مسلماناں رواداراند کافر ماجرائی ہا (۱)

ہونکوکام جوقبروں کی تجارت کرکے — کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے (۲)

در جہاں آوارۂ بیچارۂ — وحدتے گم کردۂ صد پارۂ (۳)

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغاں بھی — تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلماں بھی ہو (۴)

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں — کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں (۵)

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت — وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد (۶)

باہمی چپقلش اور بے اتفاقی کی ایسی انتہا ہو چکی ہے کہ اگر "فقیہان شہر" اقبال کے خلاف متحد ہوتے ہیں تو اقبال ان کے ایسے اتحاد کو بھی غنیمت سمجھتے ہوئے خوش ہیں کہ آخر کسی نہ کسی بات پہ تو مسلمانوں میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لئے — کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف (۷)

عجمی تصوف کے ذریعے غیر اسلامی روایات کا اسلام میں در آنا اقبال کے نزدیک ایک بہت بڑا سانحہ ہے چنانچہ ایسے عجمی تصوف اور ایسی روایات کی کھل کر مخالفت کرتے ہیں۔ ایک نظم "بیکے از صوفیہ نوشتہ شد" میں کہتے ہیں:۔ لیلیٰ (محبوب حقیقی) کی منزل کی خواہش نہ تو رکھتا ہے نہ میں۔ حدت صحرا برداشت کرنے کی ہمت نہ تیرے اندر ہے نہ میرے اندر۔ میں جواں ساقی ہوں اور تو میکدہ تصوف کا پیر کہن ہے۔ بزم پیاسی ہے لیکن شراب نہ تیرے پاس ہے، نہ میرے پاس۔ ہم نے دل و دین کو عجمی یا مجازی محبوبوں کی محبت میں رہن رکھ دیا ہے۔۔ شوق لیلیٰ کے عشق کی آگ نہ تو رکھتا ہے نہ میں وہ سنگریزے تھے جو ہم نے ساحل دریا سے چنے۔ گوہر یکتا نہ تیرے پاس ہے نہ میرے پاس۔ اب یوسف گم گشتہ کی بات نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ کہ خون زلیخا کی تپش نہ تجھ میں ہے نہ مجھ میں۔ بہتر ہے کہ ہم دامن کے نیچے چھپے ہوئے چراغ کی روشنی پر اکتفا کریں۔ کیوں کہ تجلی وادیء سینا برداشت کرنے کا دم خم تو رکھتا ہے نہ میں۔

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من — جگرِ گرمئی صحرا نہ تو داری و نہ من

---

(۱) زبور عجم۔۱۴۴۔ (۲) بانگ درا۔۲۰۱۔ جواب شکوہ۔ (۳) پس چہ باید کرد۔۵۹۔ (۴) بانگ درا۔۲۰۳۔

(۵) بانگ درا۔۲۰۲۔ (۶) ضرب کلیم۔۲۵۰۔ (۷) بال جبریل۔۷۸۔

من جواں ساقی و تو پیرکہن میکدۂ ‌ ‌ بزم ما تشنہ و صہبا نہ تو داری و نہ من
دل و دیں در گروِ زہرہ وشانِ عجمی ‌ ‌ آتشِ شوقِ سلیمیٰ نہ تو داری و نہ من
خزفے بود کہ از ساحلِ دریا چیدم ‌ ‌ دانۂ گوہرِ یکتا نہ تو داری و نہ من
دگر از یوسفِ گم گشتہ سخن نتواں گفت ‌ ‌ تپشِ خونِ زلیخا نہ تو داری و نہ من
بہ کہ بانورِ چراغِ تہِ داماں سازیم ‌ ‌ طاقتِ جلوۂ سینا نہ تو داری و نہ من (۱)

خالی سبو صوفیوں کا میکدہ حلقۂ خود فراموشاں بن چکا ہے اور بلند بانگ مدرسیوں کی آتشِ حیات بجھ چکی ہے۔ فکر جو زندگی کے مسائل حل کرتی ہے۔ تقلید کی غلامی میں گرفتار ہے۔ دین صرف روایات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اس لئے کہ سینوں کے اندر جو دل ہیں ان کا کوئی ہدف نہیں رہا۔

میکدۂ تہی سبو حلقۂ خودفراموشاں ‌ ‌ مدرسۂ بلند بانگ بزم فسردہ آتشاں
فکر گرہ کشا غلام، دیں بروائتے تمام ‌ ‌ زانکہ درون سینہ ہا دل ہدفے است بے نشاں (۲)

شبے پیشِ خدا بگرستم زار ‌ ‌ مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد، نمیدانی کہ ایں قوم ‌ ‌ دلے دارند و محبوبے ندارند (۳)

اگر چہ واعظ کے بیان میں طور وکلیم کا ذکر ہے۔ مگر اس کی گفتار کے شیشے میں اس جلوۂ طور کی چمک نہیں۔

گرچہ از طور و کلیم است بیان واعظ ‌ ‌ تابِ آں جلوہ بآئینۂ گفتارش نیست (۴)

شعور وہوش و خرد کا معاملہ ہے عجیب ‌ ‌ مقام شوق میں ہیں سب دل ونظر کے رقیب
میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا ‌ ‌ مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب! (۵)

ایسے میں مسلمان نے اپنے اوپر سینکڑوں فتنوں کا دروازہ کھول رکھا ہے۔ دو قدم چل کر گر پڑتا ہے برہمن نے تو اپنے طاق کو بتوں سے آراستہ کر لیا۔ مگر مسلمان نے قرآن پاک کو طاق نسیاں پر رکھ دیا۔

در صد فتنہ را برخود کشادی ‌ ‌ دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست ‌ ‌ تو قرآں را سرِ طاقِ نہادی (۶)

---

(۱) پیامِ مشرق۔ ۱۶۸۔ ‌ ‌ (۲) زبورِ عجم۔ ۲۰۔ ‌ ‌ (۳) ارمغانِ حجاز۔ ۴۱۔
(۴) پیامِ مشرق۔ ۱۷۶۔ ‌ ‌ (۵) بالِ جبریل۔ ۷۸۔۷۹۔ ‌ ‌ (۶) ارمغانِ حجاز۔ ۹۶۔

ایسے میں:۔

مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے　　تیرے نفس میں نہیں گرمیء یوم النشور! (۱)

کیوں کہ:۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود　　یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود (۲)

گدڑی پہن لی اور بے ذوق کے تڑپنا شروع کر دیا۔ ایسا تڑپا کہ کہیں نہ پہنچ سکا۔ انجمن شوق یعنی محفل عشق میں حقیقی تڑپ سیکھ۔ وہ مسلمان جو فاقہ مست اور گدڑی پوش ہے۔ اس کی حالت زار دیکھ کر جبرئیل امین بھی فریاد کناں ہے۔ آ کہ ہم نئی ملت کی بنیاد رکھیں۔ کیوں کہ یہ ملت تو دنیا کے لئے بار دوش ہے۔

موئینہ بہ بر کر دی و بے ذوق تپیدی　　آں گو نہ تپیدی کہ بجا ئے نہ رسیدی
درانجمنِ شوق تپیدن دگر آموز (۳)

مسلماں فاقہ مست وژندہ پوش است　　زکارش جبرئیل اندر خروش است
بیانقشیں دگر ملت بہ ریزم　　کہ ایں ملت جہاں را بار دوش است (۴)

چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ ردعمل کے طور پر میں نے اس لئے زنار باندھ کر بتوں کے سامنے رقص کیا کہ جواباً ردعمل کرتے ہوئے شیخ شہر مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا کر مرد خدا بن جائے۔

ازاں پیش بتاں رقصیدم و زنّار بربستم　　کہ شیخ شہر مرد باخدا گردد زتکفیرم! (۵)

وہ عشق وتصوف جو یارب کے نعروں سے اپنی نمائش چاہتا ہے۔ اس نے اپنے مقام کو نہیں پہنچانا اور ریاکاری کے دام میں گرفتار ہے جس دل کا تعلق اللہ تعالیٰ سے کٹ چکا ہو۔ وہ مساجد کی قراءت اور مدارس و مکاتب کی حکمت سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔

نشناخت مقام خویش، افتادہ بدامِ خویش　　عشقے کہ نمودے خواست از شورش یا رب ہا!
آسودہ نمی گردد آں دل کہ گسست از دوست　　باقراءتِ مسجدہا بادانشِ مکتب ہا! (۶)

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں　　لرز جاتا ہے آواز اذاں سے (۷)

---

(۱) ضرب کلیم۔ ۵۱۔　(۲) بانگِ درا۔ ۲۰۳۔ جواب شکوہ۔　(۳) زبور عجم۔ ۷۹۔
(۴) ارمغانِ حجاز۔ ۱۵۔　(۵) زبور عجم۔ ۱۰۱۔　(۶) زبور عجم۔ ۱۱۷۔　(۷) بانگِ درا۔ ۹۹۔

شیوخ و واعظ فتوے صادر فرمانے اور فروخت کرنے میں بڑے مشتاق ہیں۔ اقبال کہتے ہیں میں نے وہ بات کہہ دی جو کہی نہیں جاسکتی تھی ۔ حیران ہوں کہ فقیہان شہر ابھی تک کیوں خاموش ہیں ۔ میرے خلاف فتویٰ دینے میں دیر کیوں کر دی۔

بلب رسید مرا آں سخن کہ نتواں گفت بحیرتم کہ فقیہانِ شہر خاموشند! (۱)

لیکن فقیہان شہر کی یہ خاموشی عارضی تھی ورنہ اقبال یہ نہ کہتے :۔

واعظ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انسان ہوں میں

کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم آں متاعم کہ شوددست زدِ بے بصراں (۲)

میں دودھاری تلوار ہوں اور آسمان نے مجھے برہنہ کر دیا ہے ۔ پھر مجھے سان پر تیز کر دیا اور زمانے کے مقابلے میں لاکھڑا کیا ۔ عشق و معرفت کی یہ مئے جواں جو میں تمھارے سبو میں ڈال رہا ہوں ۔ ایسی تیز ہے جس نے میرے جام و سبو پگھلا دیئے ہیں ۔ میں طائر حرم ہوں اپنا جذب سینے میں محفوظ رکھتا ہوں ۔ مجھے میری گرمی آواز سے پہچانا جا سکتا ہے ۔ پرانے صوفیاء کے ادراک کی کشتی ٹوٹ چکی ہے ۔ مبارک ہے وہ شخص جو عصر رواں میں مجھے کشتی بناتا ہے ۔

دو دستہ تیغم و گردوں برہنہ ساخت مرا فساں کشید و بروے زمانہ آخت مرا

مئے جواں کہ بہ پیمانہء تو می ریزم زراوقے است کہ جام وسبوگداخت مرا

نفس بہ سینہ گدازم کہ طائر حرم تو اں زگرمئی آوازِ من شناخت مرا

شکست کشتیء ادراکِ مرشدانِ کہن خوشا کسے کہ بدریا سفینہ ساخت مرا! (۳)

لیکن عجمی و رسمی تصوف سے ہٹ کر اقبال کو جوانانِ عجم سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں ۔ کہتے ہیں اے جوانان عجم میں اپنی اور تمہاری جان کو خیابان میں ، چراغ لالہ کی طرح جلا رہا ہوں ۔ میں نے تمھارے قید خانے کی دیوار کے سوراخ سے دیکھ لیا ہے ۔ ایک مردِ آزاد آنے والا ہے جو غلامی کی زنجیریں توڑ دے گا ۔ یقیناً امام خمینی کی آمد کی پیش گوئی ہے ۔

چوں چراغ لالہ سوزم درخیابان شما اے جوانان عجم جان من و جان شما

---

(۱) زبور عجم ۔ ۱۲۱۔ (۲) پیامِ مشرق ۔ ۱۴۵۔ (۳) زبورِ عجم ۔ ۱۲۲۔

می رسد مردے کہ زنجیر غلاماں بشکند ۔۔۔ دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما (۱)

اس میں شک نہیں کہ خود فراموش مسلمانوں کی خاک کو عشق صبر آزما نے چشم تر دی اور اقبال نے انہیں لذت دید عطاء کی۔:۔

عشق شکیب آزما خاک زخود رفتہ را ۔۔۔ چشم ترے دادومن لذتِ دیدن دہم! (۲)

میں نے شاعروں، فقیہوں اور فلسفیوں کی باتیں سنی ہیں اگر چہ ان کا درخت بلند، یعنی شہرت بہت ہے مگر یہ درخت بے برگ و بار ہے۔ مجھے وہ ساقی نہ حرم میں نظر آیا ہے۔ نہ بت خانے میں جو آتش عشق شراروں کی صورت میں دینے کی بجائے، شعلوں کی صورت میں ______ عطاء کرے۔

شنیدہ ام سخنِ شاعر و فقیہہ و حکیم ۔۔۔ اگر چہ نخل بلند است برگ و برندہد!

نہ درحرم نہ بہ بتخانہ یا بم آں ساقی ۔۔۔ کہ شعلہ شعلہ بہ بخشد شرر شرر ندہد! (۳)

اس لئے کہ:۔

یہ معاملے ہیں نازک، جوتری رضا ہو، تو کر ۔۔۔ کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی!

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الاّ ۔۔۔ لغت غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی! (۴)

پیرحرم کی یہ حالت ہے کہ قول و فعل میں تضاد کے باعث۔ اس کی گفتگو بے ربط اور بے اثر ہے۔

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے ۔۔۔ کردار بے سوز! گفتار واہی! (۵)

یہی بے عملی اور حالات و مسائل سے چشم پوشی آج بھی دیکھنے میں آ رہی ہے۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ میں محراب مسجد پر ۔۔۔ یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا! (۶)

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود ۔۔۔ ان کی فطرت کا تقاضا ہے نماز بے قیام (۷)

مذہب کے حوالے سے کلیسا کے پادری ہوں یا حرم کے شیوخ، سبھی گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ دوسروں کے سینوں کو بھی منور کرنے کی بجائے بے نور اور تیرہ و تار بنا رہے ہیں۔ اقبال اس سانحے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

---

(۱) زبورِ عجم۔ ۱۲۵۔ (۲) زبورِ عجم۔ ۱۲۳۔ (۳) ایضاً۔ ۱۲۷۔ (۴) بالِ جبریل۔ ۴۵۔

(۵) بالِ جبریل۔ ۵۳۔ (۶) ایضاً۔ ۵۷۔ (۷) ارمغانِ حجاز۔ ۶۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔

یہ پیران کلیسا و حرم! اے واے مجبوری صلہ ان کی کدوکاوش کا ہے سینوں کی بے نوری! (۱)

حلقہ صوفی میں ذکر عشق کے سوز و گداز اور گریہ دل سے یکسر عاری ہے۔ اس لئے وہاں سے کوئی بھی فیضاب نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی خانقاہی سلسلہ آج کل کے حالات سے موافق نہیں۔

حلقہء صوفی میں ذکر ، بے نم و بے سوز و ساز میں بھی رہا تشنہ کام تو بھی رہا تشنہ کام! (۲)

تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ! (۳)

تھا جہاں مدرسہء شیری و شاہنشاہی آج ان خانقہوں میں ہے فقط روباہی

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللہی! (۴)

روحانی پستی و گراوٹ پر اقبال کف افسوس ملتے ہوئے ایک آہ سرد کے ساتھ یوں گویا ہوتے ہیں۔

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری رہا صوفی گئی روشن ضمیری

خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ نہیں ممکن امیری بے فقیری! (۵)

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج ، دل پریشاں ، سجدے بے ذوق کہ جذب اندرون باقی نہیں ہے

باقی سب کچھ باقی ہے لیکن عشق و مستی اور جذب اندرون نہ ہونے کے باعث کوئی صاحب صدق و یقین دکھائی نہیں دیتا۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے

نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے (۶)

ایسے میں اقبال بجا کہتے ہیں کہ بت کے سامنے بیٹھا ہوا بیدار دل کافر اس مسلمان سے بہتر ہے، جو حرم میں سویا پڑا ہے۔

کافر بیدار دل پیش صنم بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم! (۷)

مسلمان کی رگوں سے عشق و مستی رخصت ہوئی تو اسے ہر مقام پر زوال سے دوچار ہونا پڑا ''مسجد قرطبہ'' میں یہ

---

(۱) بال جبریل۔۵۹۔ (۲) ایضاً۔۶۲۔ (۳) بال جبریل۔۷۲۔ (۴) بال جبریل۔۷۵۔

(۵) ایضاً۔۸۳۔ (۶) بال جبریل۔۸۹۔ (۷) جاوید نامہ۔۳۹۔

دلدوز حقیقت اقبال یوں بیان کرتے ہیں ۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں   آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے   عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں   (۱)

کلامِ اقبال کے مجموعی مطالعے سے یہ نتیجہ کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ وہ مصنوعی تصوف کی آڑ میں استحصال انسانیت اور دین فروشی کے سخت مخالف ہیں ۔ ایسی صورت حال پر "باغی مرید" میں طنزاً کہتے ہیں ۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی   گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن!
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ   مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن!
نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا   ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد   زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن!   (۲)

عجمی تصوف کے زیر اثر مسلمانوں نے جدوجہد اور کوشش عمل ترک کرتے ہوئے حرکت و عمل سے کنارہ کشی اختیار کر لی ۔ تو معاملہ ترک دنیا و رہبانیت تک جا پہنچا۔ وہ مسلمان جو میدان عمل کا مجاہد تھا سستی و کاہلی اور بے عملی کا شکار ہو کر رہ گیا ۔ اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے دوسروں کا دست نگر ہوگیاایسی صورتحال کی عکاسی وحید خان کے شعر سے بھی ہوتی ہے ۔

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ   شرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ   (وحید خان)

اقبال کہتے ہیں دین حق کافری کی وجہ سے رسواتر ہے کیوں کہ ہمارا ملا کافر گر مومن ہے ۔ ہماری نگاہ میں ہماری شبنم سمندر ہے اس کی نگاہ میں ہمارا سمندر شبنم ہے ۔ اس قرآن فروش کی طرفہ باتوں کے سبب میں نے جبرئیل امین کو خشمگیں پایا ہے ۔ ملا کا دل آسماں کی طرف سے (اللہ تعالیٰ) ناآشنا ہے اسکے نزدیک قرآن پاک محض افسانہ ہے۔ وہ جناب رسول پاکؐ کے دین کی حکمت سے محروم ہے ۔ اس کا آسمان ستاروں کے نہ ہونے کی وجہ سے تاریک ہے ۔ وہ کم نگاہ، کورذوق اور فضول گو ہے ۔ اس کی باتوں سے ملت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ہے ۔ مکتب و ملا اور قرآن پاک کے اسرار کی مثال یوں ہے جیسے مادرزاد اندھا اور آفتاب کی روشنی ۔ کافر کا دین جہاد کی فکر و تدبیر ہے ۔ اور ملا کا دین فی سبیل اللہ فساد۔

دین حق از کافری رسوا تراست   زانکہ ملامومن کافر گراست!

---

(۱) بالِ جبریل ۔ ۹۹۔   (۲) بالِ جبریل ۔ ۱۲۶۔

شبنمِ مادرنگاہِ ما یم است | ازنگاہِ اویم ماشبنم است!
از شگرفیہائے آں قرآں فروش | دیدہ ام روح الامیں را درخروش!
زانسوے گردوں دلش بیگانہء | نزدِ او ام الکتاب افسانہء
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ | آسمانش تیرہ از بے کو کبی!
کم نگاہ و کورذوق و ہرزہ گرد | ملت ازقال و اقولش فرد فرد!
مکتب و ملا واسرار کتاب | کور مادرزاد و نور آفتاب!

دین کافر فکرو تدبیر جہاد
دین ملا فی سبیل اللہ فساد! (۱)

پھر کہتے ہیں :۔ آئینے کی مانند دوسروں کے حسن کا حیرتی نہ ہو۔ اپنے دل و دیدہ سے دوسروں کا خیال نکال دے۔ اے وہ شخص جس نے دوسروں کے درخت پر آشیانہ بنا رکھا ہے، حرم کے پرندوں کی فغاں سے اثر پذیر ہو اور اس فغاں کے سوز سے اپنے آپ کو جلا دے۔ دنیا میں اپنے بال و پر کھولنا سیکھ۔ دوسروں کے بال و پر سے پرواز نہیں کی جا سکتی۔ مجھے دیکھ میں مرد آزاد اتنا غیور ہوں کہ مجھے دوسروں کا ایک جام شراب صافی دے کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے زکوٰۃ کے طور پر بادشاہی عطاء فرمائے تو میری خودداری اسے بھی ٹھکرا دے۔

مثل آئینہ مشو محو جمال دگراں | ازدل و دیدہ فروشوے خیال دگراں
آتش از نالہء مرغان حرم گیر و بسوز | آشیانے کہ نہادی بہ نہال دگراں
درجہاں بال و پرخویش کشودن آموز | کہ پریدن نتواں باپر و بال دگراں
مرد آزادم و آں گو نہ غیورم کہ مرا | می تواں کشت بیک جام زلال دگراں (۲)
تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز | دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر | حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سرِدوش | کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات

---

(۱) جاوید نامہ۔۷۶۔ ''سعید حلیم پاشا''۔

(۲) پیامِ مشرق۔۱۷۴۔

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول   جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات   (۱)

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور   قلندری مری کم کچھ سکندری سے نہیں   (۲)

نئے معنی جو ہم ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے ، کہاں ہیں؟ مسجد ہو یا مکتب یا میخانہ سب بانجھ پڑے ہیں۔اپنے آپ سے ایک حرف "اللہ" سیکھ اور پھر اس میں جل جا کیوں کہ اس خانقاہ میں کلیمی کے سارے دعویدار سوز دروں کے بغیر ہیں۔ ان تکیہ نشینوں کی صفا کوشی کی بات نہ کر ان کے بال الجھے ہوئے اور گودڑی ناصاف ہے ۔انہوں نے حرم کے اندر کتنے اور حرم بنا رکھے ہیں اہل توحید کی سوچ ایک ہے مگر وہ خود ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

معنیء تازہ کہ جوئیم و نیابم کجاست   مسجد و مکتب و میخانہ عقیم اندہمہ

حرفے از خویشتن آموزودرآں حرف بسوز   کہ دریں خانقہ بے سوزِ کلیم اندہمہ

از صفاکوشئ ایں تکیہ نشیناں کم گوے   موئے ژولیدہ و ناشستہ گلیم اندہمہ

چہ حرمہا کہ درونِ حرمے ساختہ اند   اہل توحید یک اندیش و دو نیم اندہمہ   (۳)

چنانچہ اقبال حرم کے اندر ملک عشق سے نیا لشکر بھرتی کر رہے ہیں ۔ کیوں کہ حرم کے اندر عقل کی بغاوت کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

سپاہِ تازہ بر انگیزم از ولایت عشق   کہ درحرم خطرے از بغاوت خرد است   (۴)

اس کے بعد اقبال کہتے ہیں افسوس اس قوم پر جس پر زوال طاری ہوگیا ۔ اس نے میر وسلطان پیدا کئے مگر کوئی درویش پیدا نہ کیا۔ جس سے متعلق یہ دعوٰی کیا جا سکے :۔

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الہ   سایہء شمشیر میں اس کی پنہ لا الہ   (۵)

برعیار   مصطفٰی   خود   رازند   تاجہانے   دیگرے   پیدا   کند   (۶)

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی   کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا   (۷)

مجھ سے اس قوم کی داستان نہ پوچھ جو بات بیان میں نہیں آسکتی میں اسے کیسے بیان کروں۔ میرے گلے میں گریہ گرہ بن گیا ہے ۔ یہ قیامت سینے کے اندر ہی بہتر ہے ۔ اس ملک کا مسلمان اپنے آپ سے ناامید ہے ۔عمر گزر گئی اس نے

---

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۴۸ ۔ (۲) ضرب کلیم ۔ ۲۰ ۔ "مسلمان کا زوال" ۔ (۳) جاوید نامہ ۔ ۸۳ ۔ (۴) پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق ۔ ۵ ۔

(۵) بالِ جبریل ۔ ۹۷ ۔ مسجد قرطبہ ۔   (۶) پس چہ باید کرد ۔ ۲۳ ۔   (۷) بالِ جبریل ۔ ۳۲ ۔

کوئی باخدا مرد نہیں دیکھا ۔ لامحالہ وہ دین کی قوت سے بدظن ہے ۔ وہ خود ہی اپنے کاروان کے لئے رہزن بنا ہوا ہے ۔ تین سو سال سے یہ امت زبوں حال ہے ۔ اور بغیر سوز درون و سرور کے دن بسر کر رہی ہے ۔ مسلمان پست فکر کم ہمت اور کورذوق ہو چکا ہے ۔ اس کے مکتب اور علماء سب محروم شوق ہیں ۔ اس کی فکری خرابی نے اسے ذلیل کر دیا ہے ۔ باہمی اختلاف نے اسے بیزار کر دیا ہے ۔ چونکہ وہ اپنے مقام و منزل کو نہیں پہچانتا ۔ اس لئے اس کے دل میں ذوق انقلاب بھی ختم ہو چکا ہے کوئی مرد خبیر نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طبع بیمار افسردہ اور حق قبول کرنے کی صلاحیت ہی کھو چکی ہے ۔

آہ زاں قومے کہ از پا برفتاد   میر و سلطاں زاد و درویشے نزاد
داستانِ او مپرس از من کہ من   چوں بگویم آنچہ ناید درسخن
درگلویم گریہ ہا گردگرہ   ایں قیامت اندرون سینہ بہ
مسلمِ ایں کشور از خود ناامید   عمر ہاشد باخدا مردے ندید
لاجرم از قوتِ دیں بدظن است   کاروانِ خویش را خود رہزن است
از سہ قرن ایں امت خوار وزبوں   زندہ بے سوزوسرور اندروں
پست فکر ودوں نہاد و کور ذوق   مکتب و ملائے او محرومِ شوق
ازخشتیِ اندیشہ اورا خوار کرد   افتراق اورا زخود بیزار کرد
تانداند از مقامِ و منزلش   مُرد ذوقِ انقلاب اندر دلش
طبع او بے صحبت مرد خبیر   ختہ و افسردہ و حق نا پذیر (۱)

وہ ایسا غلام ہے جس کا آقا اسے ٹھکرا چکا ہے ۔ وہ مفلس بھی ہے قلاش بھی اور لاپرواہ بھی ۔ نہ اس کے ہاتھ میں مال ہے کہ سلطان چھینے ۔ نہ اس کے دل میں نور ہے کہ شیطان لے جائے ۔ اس کے صوفیہ فرنگی لارڈ کے مرید ہیں ۔ اگر چہ باتیں حضرت بایزیدؒ کے مقام کی کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ دین کی رونق محکومی سے ہے ۔ خودی سے محرومی کا نام زندگی ہے ۔ اس نے غیروں کی دولت ، یوں سمجھیئے کہ آئی ایم ایف کی دولت کو اپنے لئے دین و دنیا کی رحمت سمجھا اور کلیسا کے گرد پروانہ وار رقص کرتا ہوا مرگیا ۔ تو جو ذوق وشوق اور سوز و درد سے خالی ہے ۔ کیا تو جانتا ہے کہ ہمارے دور نے ہمارے ساتھ کیا

---

(۱) پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق ۔ ۲۳ ۔ "فقر" ۔

کیا۔ اس دور نے ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اس نے ہمیں جمال مصطفیٰ سے ناآشنا کر دیا ہے۔ جب حضورؐ کے عشق کا سوز سینے سے نکل گیا تو گویا آئینے کے اندر سے اس کا جوہر جاتا رہا اس زبوں حالی اور خستہ دل پر قابو پانے کے لئے اقبال کا پیغام یہ ہے کہ اے زار وزبوں مسلم! پہلے اپنی خودی کو تلوار کی طرح تیز بنا۔ پھر اپنے آپ کو تقدیر کے ہاتھ میں دے۔ تیرے اندر ایک بے پناہ سیلاب ہے۔ جس کے سامنے کوہ گراں گھاس کے ایک تنکے کے برابر ہے۔ سیلاب کی شان نہ رکنے میں ہے اگر وہ ایک لمحے کے لئے بھی رک جائے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ میری تب و تاب سے اپنا حصہ لے لے میرے بعد پھر کوئی مجھ جیسا مردِ فقیر نہیں آئے گا۔

بندۂ روکردۂ مولاست او مفلس و قلاش و بے پرواست او
نے بکف مالے کہ سلطانے برد نے بدل نورے کہ شیطانے برد
شیخِ او لردِ فرنگی رامرید گرچہ گوید از مقامِ بایزیدؒ
گفت دیں را رونق از محرومی است زندگانی از خودی محرومی است
دولتِ اغیار را رحمت شمرد رقص ہا گرد کلیسا کرد و مرد
اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد می شناسی عصر ماباماچہ کرد؟
عصر ما مارا زما بیگانہ کرد از جمالِ مصطفیٰؐ بیگانہ کرد
سوزِ او تا ازمیان سینہ رفت جوہر آئینہ از آئینہ رفت
خویشتن راتیزیء شمشیر دہ باز خود را درکفِ تقدیر دہ
اندرونِ تست سیل بے پناہ پیشِ او کوہِ گراں مانندِ کاہ
سیل را تمکیں زنا آسودن است یک نفس آسودنش نابودن است
ازتب و تابم نصیب خود بگیر بعد ازیں ناید چومن مرد فقیر (۱)

بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدّر کے ستارے کو تو پہچان! (۲)

---

(۱) پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق۔ ۲۴۔۲۵۔ (۲) ضربِ کلیم۔ ۶۱۔

عجمی تصوف کے زیر اثر اشراقی اور اشاعرہ سبھی قیل و قال علم کلام اور منطقی بحثوں میں ایک دوسرے سے گتھم گتھہ ہیں۔ علماء اپنے مدرسوں میں محض باتیں بناتے ہیں۔ نہ وہ اس نکتے کو سمجھتے ہیں نہ مومنوں کو سمجھاتے ہیں مسلمان زندہ قوم تھے مگر احکام دین کی تاویلوں نے انہیں موت سے ہمکنار کر دیا۔

قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاع کردار — بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات و صفات (۱)
طبع مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی — ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علم کلام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا — کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام (۲)

ان کے ضمیر کے اندر جو آگ تھی وہ بجھ چکی ہے۔ میں نے صوفیان باصفا کو دیکھا ہے اور علمائے مدارس کو بھی خوب پرکھا ہے۔ میرے دور نے ایک جھوٹا نبی (مرزا قادیان) بھی بنایا ہے وہ جسے قرآن پاک میں اپنے سوائے اور کچھ نظر نہ آیا یہ سب قرآن و حدیث کے عالم ہونے کے دعویدار ہیں مگر شریعت سے بے بہرہ اور اس کے راز دیکھنے سے بے بصر۔ ان کی عقل و نقل ہوس کے بند میں بندھی ہوئی ہے۔ ان کا منبر صرف روٹی کمانے کے لئے ہے۔ ان بناوٹی کلیموں سے کوئی امید رکھنا لاحاصل ہے۔ کہ وہ قوم کے حالات درست کر سکیں گے۔ کیوں کہ ان کی آستینیں ید بیضا سے خالی ہیں۔

مکتب و ملا سخنہا ساختند — مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود از تاویل مرد — آتش او در ضمیر او فسرد
صوفیان باصفارا دیدہ ام — شیخ مکتب رانکو سنجیدہ ام
عصر من پیغمبرے، ہم آفرید — آنکہ در قرآں بغیر از خود ندید
ہر یکے دانائے قرآن خبر — درشریعت کم سواد و کم نظر
عقل و نقل افتادہ دربند ہوس — منبر شاں منبر کاک است و بس
زیں کلیماں نیست امید کشود — آستیں ہا بے ید بیضا چہ سود؟ (۳)

گویا کہ:۔

رہا نہ حلقہ صوفی میں سوز مشتاقی — فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی!

---

(۱) ضرب کلیم۔ ۷۷۔ (۲) ارمغانِ حجاز۔ ۲۔ (۳) پس چہ باید کرد۔ ۳۲۔

خراب کو شک سلطان و خانقاہِ فقیر فغاں کہ تخت و مصلّیٰ کمالِ زرّاقی!
کرے گی داورِحشر کو شرمسار اک روز کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراقی! (۱)

اقبال کہتے ہیں کہ میری طرف سے صوفی و ملا کو سلام پہنچے کہ انہوں نے ہمیں اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ مگر اس کلام کی جو تاویل اانہوں نے کی۔ اس نے اللہ تعالیٰ، جبرئیل علیہ السلام اور جناب رسول پاکؐ سب کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔

زمن برصوفی و ملا سلامے کہ پیغام خدا گفتند مارا
و لے تاویل شاں درحیرت انداخت خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را! (۲)

صوفی کا یہ حال ہے کہ عجمی تصوف کے زیر اثر خود تو ڈوبے تھے صنم، ہم کو بھی لے ڈوبے کے مصداق دوسروں کا بیڑا بھی غرق کر رہا ہے۔ اس دلدوز حقیقت کو اقبال اپنے مخصوص دردِ دل میں پروکر یوں بیان کرتے ہیں۔

سکھا دیئے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی فقیہہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب!
وہ سجدہ، روح زمین جس سے کانپ جاتی تھی اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!
سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب (۳)
نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی (۴)

ان حالات میں ردعمل کے طور پر اقبال بجا فرماتے ہیں کہ،میں نے اپنی جان پرسوز کا چراغ اس لئے جلایا ہے کہ اس دور میں یدبیضا، حق وصداقت کو آستین میں چھپا دیا گیا ہے۔

چراغ خویش برافروختم کہ دست کلیم دریں زمانہ نہاں زیر آستیں کردند (۵)
اک ولولہء تازہ دیا میں نے دلوں کو لاہور سے تاخاک بخارا و سمر قند! (۶)

وہ کہتے ہیں کہ فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ کی طرح بے باکانہ بات کرتا کہ تیری ضرب سمندر کو دو ٹکڑے کر دے۔ اس قافلے یعنی امت مسلمہ کی رسوائی کے خیال سے میرا دل داغ داغ ہے مجھے اس کے امیر کے دل میں کوئی نور نظر نہیں آتا۔ یہ شخص حرم میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن کلیسا کا مرید ہوگیا ہے۔ اس نے ہماری غیرت ملی کا پردہ تار تار کر دیا ہے۔ ایسے شخص کا دامن پکڑنا حماقت ہے کیوں کہ اس کا سینہ دل روشن سے خالی ہے۔ تو اس راہ میں اپنے آپ پر اعتماد کر کیوں کہ

---

(۱) بالِ جبریل۔ ۶۵۔ (۲) ارمغانِ حجاز۔ ۷۳۔ (۳) بالِ جبریل۔ ۳۶۔
(۴) ایضاً۔ ۱۱۔ (۵) زبورِ عجم۔ ۱۲۶۔ (۶) ضربِ کلیم۔ ۲۳۔

اندھے کتے کی معیت میں ہرن کا شکار نہیں کیا جا سکتا۔افسوس اس قوم پر جو اپنے آپ سے آنکھیں بند کر لے اپنے آپ سے کٹ جائے اور دل غیر اللہ کو دے دے۔ جب ملت کے سینے میں خودی مر گئی تو اس کے کوہ گراں نے تنکے کا انداز اختیار کر لیا تو اسے ہوا اڑا کر لے گئی۔ اگر چہ ملت اپنی نہاد میں لا الٰہ رکھتی ہے مگر اس کی ماؤں کے پیٹ سے کوئی ایسا مسلمان پیدا نہیں ہوا۔ جو بے یقینوں کو یقین بخشے جس کے سجدے سے زمین لرز اٹھے۔ جو تلوار کے نیچے بھی لا الہ کہے۔ جس کے ہر قطرہ خون سے لا الہ کا نقش ابھرے۔ افسوس کہ نہ وہ سرور باقی رہا اور نہ وہ سوز عشق حرم کے اندر کوئی صاحب قلب ونظر دکھائی نہیں دیتا۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں (۱)

گویا کہ:۔

ورنہ داری خون گرم اندر بدن سجدۂ تو نیست جز رسم کہن (۲)

اور عراقی ہمدانی کہتے ہیں۔

بہ زمیں چوں سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد کہ مرا خراب کر دی تو بہ سجدۂ ریائی

اے مسلمان تو اس دنیا میں کب تک شیطان کا اسیر رہے گا تجھے ایسی کوشش کی ضرورت ہے جو تا حد ہمت کی جائے اور جس کے اندر لذت محسوس ہو۔ مگر یہ چیز گریہ، نیم شبی، یعنی عشق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

اگر کافر نے، اے مرغ شبگیر چرا بر ناوری آواز تکبیر نظامی گنجوی

اقبال ایسے نباض ہیں کہ قلب و روح کی تمام تر بیماریوں کی آن واحد میں تشخیص کر کے مرض اور اس کے عوامل و اسباب پر بھر پور روشنی ڈالنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

---

(۱) بانگ درا۔ ۲۸۱۔ (۲) پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔ ۳۸۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا ، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوئے سامری ، تو قتیل شیوۂ آزری
میں نوائے سوختہ درگلو ، تو پریدہ رنگ ، رمیدہ بو
میں حکایتِ غم آرزو ، تو حدیث ماتمِ دلبری
مرا عیش غم ، مرا شہد سم ، مری بود ہم نفس عدم
ترا دل حرم ، گروِ عجم ، ترا دیں خریدۂ کافری
کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی شرشتِ سمندری!
گلہ جفائے وفانما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری
کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری (۱)

عشق باصفا ساری کائنات پر نور بن کر چمکتا ہے۔ لیکن عجمی تصوف کے زیر اثر عشق میں وہ قوت و اثر بالکل نہیں۔ بلکہ زمان و مکاں کی قیود میں اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی — تو ہے زناریء بت خانہء ایام ابھی (۲)
دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے — پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے (۳)
اے لاالٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں — گفتار دلبرانہ ، کردار قاہرانہ!
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے! — کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ! (۴)

---

(۱) بانگِ درا۔۲۵۲۔۲۵۳۔"میں اور تو"۔ (۲) بانگِ درا۔۲۷۹۔ (۳) بالِ جبریل۔۳۳۔ (۴) ایضاً۔۵۴۔۵۵۔

ناوک ہے مسلماں ! ہدف اس کا ہے ثریا — ہے سرّ سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج
تو معنئی و النجم نہ سمجھا تو عجب کیا — ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج (۱)

چنانچہ اقبال مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے — تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تری — تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے! (۲)

پھر ایسے ناگفتہ بہ حالات میں اقبال کی تمام امیدیں نوجوانوں سے وابستہ ہیں کہ ان کا خون گرم تیز وطرار ہے اس لئے وہی انقلابی تبدیلی لا سکتے ہیں۔کیوں کہ:۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں (۳)

یہی وجہ ہے کہ اقبال اللہ تعالی کے حضور محو دعا ہیں کہ:۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نور بصیرت عام کر دے (۴)
جوانوں کو سوز جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤگرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر! (۵)

اور پھر کیا خوب فرماتے ہیں:۔

اندازِ بیاں گر چہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات (۶)

دل میں اتر جانے والی وہ بات یہ ہے کہ:۔

اے پیر حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے ان کو سبق خود شکنی ، خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا (۷)
اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی — ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد (۸)

---

(۱) ضرب کلیم ۔۱۷۔ (۲) بال جبریل ۔۸۲۔ (۳) ایضاً ۔۱۲۰۔ (۴) بال جبریل ۔۸۶۔
(۵) ایضاً ۔۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ساقی نامہ۔ (۶) بال جبریل ۔۷۹۔ (۷) ضرب کلیم ۔۵۸۔ (۸) ایضاً ۔۷۲۔

اقبال جوانوں کو خاکبازی سے نکال کر بلندیوں و عظمتوں کا پیغام دیتے ہیں ۔ تاکہ رفعتیں ان کا مقدر بن سکیں اور فضائے نیلگوں ان کے زیر پرواز رہے ۔ مگر اس کے لئے اندرونی جذبے کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ ایک نظم'' فوآرہ'' میں کہتے ہیں ۔

یہ آبجو کی روانی یہ ہمکناریء خاک — مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظّارہ
ادھر نہ دیکھ، ادھر دیکھ اے جوانِ عزیز — بلند زور دروں سے ہوا ہے فوآرہ! (۱)

اور عشق حرکت اور عمل و کوشش و جدوجہد کا دوسرا نام ہے ۔ تو کب تک دریا میں پڑے ہوئے تنکے کی صورت زندگی بسر کرے گا ۔ ضبط نفس سے اپنے اندر پہاڑ کی سی مضبوطی پیدا کر ۔ اگر چہ سمجھ دار آدمی اپنے دل کی بات کسی کو نہیں بتاتا مگر میں تجھ سے اپنا درد چھپا نہیں سکتا ۔ چونکہ میں غلام ہوں اور غلامی کے اندر پیدا ہوا ہوں ۔ اس لئے آستان کعبہ سے دُور جا پڑا ہوں ۔ جب حضور اکرمؐ پر درود بھیجتا ہوں ، تو میرا وجود شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے ۔ عشق مجھ سے کہتا ہے کہ اے غیر کے محکوم بتوں کی وجہ سے تیرا سینہ بت خانہ بنا ہوا ہے ۔ جب تک آنحضورؐ کے اخلاق عالیہ کا رنگ و بو اختیار نہیں کرتا ، اپنے درود شریف سے ان کے نام گرامی کو آلودہ نہ کر ۔

پیش فرعوناں بگو حرف کلیم — تا کند ضرب تو دریا را دونیم
داغم از رسوائی ایں کارواں — در امیر او ندیدم نور جاں
تن پرست و جاہ مست و کم نگہ — اندرونش بے نصیب از لا الہ
درحرم زادو کلیسا را مرید — پردۂ ناموسِ مارا بر برید
دامنِ اورا گرفتن ابلہی است — سینہء او از دلِ روشن تہی است
اندریں رہ تکیہ بر خود کن کہ مرد — صیدِ آہو باسگِ کورے نکرد
آہ زقومے کہ چشم از خویش بست — دل بہ غیر اللہ داد ، از خود گسست
تا خودی درسینہء ملت بمرد — کوہ کا ہی کرد و باد اورا ببرد
گرچہ دارد '' لا الہ '' اندر نہاد — از بطونِ او مسلمانے نزاد

---

(۱) ضرب کلیم ۔ ۱۳۶ ۔ ۱۲۷ ۔

آں چہ بخشد بے یقیناں را یقیں — آنکہ لرزد از سجود او زمیں
آنکہ زیرِ تیغ گوید لا الہ — آنکہ از خونش بروید لا الہ
آں سرور آں سوزِ مشتاقی نماند — درحرم صاحبدلے باقی نماند
اے مسلماں اندریں دیرِ کہن — تاکجاباشی بہ بند اہرمن
جہد تو توفیق و لذت درطلب — کس نیابد بے نیازِ نیم شب
زیستن تاکے بہ بحر اندر، چوخس
سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس
گرچہ دانا حال دل باکس نگفت — از تو درد خویش نتوانم نہفت
تاغلامم درغلامی زادہ ام — زآستانِ کعبہ دور افتادہ ام
چوں بنام مصطفیٰ خوانم درود — ازخجالت آب می گرددوجود
عشق می گوید کہ اے محکومِ غیر — سینہء تو ازبتاں مانند دیر
تانداری از محمدؐ رنگ وبو — از درودِ خود میالا نام او (۱)

میری نماز کے قیام بے حضوراور سجودِ بے سرور کی بات نہ پوچھ۔ ہم ایسے غلام میں خواہ وہ حافظ قرآن ہو، ایمان کی لذت تلاش نہ کر۔

از قیام بے حضور من مپرس — از سجودِ بے سرور من مپرس
از غلامے لذتِ ایماں مجو — گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو (۲)
دل مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ — کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ
ترا بحر پرسکوں ہے! یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟ — نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں، نہ خرابیء کنارہ! (۳)
قم باذنی گوے و او را زندہ کن — دردلش اللہ ھو را زندہ کن (۴)

ہندی مسلمان نے اپنے دل کو دنیائے رنگ و بو کا اسیر بنا کر اسے سوزِ عشق اور پرواز آرزو سے دور کر لیا ہے۔ وہ

---

(۱) پس چہ باید کرد۔ ۳۶۔ ۳۷۔ (۲) ایضاً۔ ۳۷۔ (۳) ضرب کلیم۔ ۳۶۔ (۴) پس چہ باید کرد۔ ۵۰۔

شہباز کی آواز کونہیں پہچانتا کیوں کہ اس کے کان مچھر کی آواز سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔

دلِ خود را اسیر رنگ و بوکرد تہی از ذوق و شوق و آرزو کرد
صفیر شاہبازاں کم شناسد کہ گوشش باطنین پشہ خو کرد (۱)

ایسی صورت حال میں اقبال اپنی شاعری کے ذریعے صوفیوں، ملاؤں اور عام مسلمانوں میں روح بیداری پھونکتے ہوئے کہتے ہیں، کہ اگر اسلامی روایات کو خلوص نیت سے دوبارہ اپنا لیا جائے تو کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ میری مینائے غزل میں وہی شراب کہن بچی ہوئی موجود ہے مگر شیخ جی فرماتے ہیں کہ اقبال کا کہا نہ مانو۔ اس کی غزل سے استفادہ نہ اٹھاؤ۔

لا اک بار پھر وہی بادہ و جام اے ساقی! ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی!
مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی! (۲)

چنانچہ:۔

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے کہ امیر کارواں میں نہیں خوے دل نوازی! (۳)
تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر! (۴)

پستی و تنزّل کے ان حالات میں علامہ محمد اقبال دعا کرتے ہیں۔ کہ

رگ تاک منتظر ہے تیری بارش کرم کی کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ (۵)

عجمی تصوف کے زیر اثر خانقاہوں میں صوفیوں کے کدو بے فیض ہو چکے ہیں۔ مگر اس عہد میں اقبال کا سبوچہ غنیمت ہے کہ اس میں اتنی مے دیرینہ موجود ہے کہ نوش جان فرمانے والے سبھی افراد فیضاب ہو سکتے ہیں۔

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو! (۶)
مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے (۷)
زیارت گاہِ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی! (۸)

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔ ۳۳۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۱۲۔ (۳) ایضاً۔ ۱۷۔ (۴) ایضاً۔ ۲۹۔
(۵) بالِ جبریل۔ ۱۵۔ (۶) ایضاً۔ ۱۳۔ (۷) ایضاً۔ ۶۹۔ (۸) ایضاً۔ ۱۴۔

آج کل مسلمان فرنگ زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ تیرے اس مرض کا علاج مولانا جلال الدین رومیؒ کے سوز عشق میں ہے۔ جو کہ اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ اقبال کہتے ہیں رومی ہی کے سوز و گداز سے فیضاب ہو کر میرا دل دیدہ ور ہے اور میرے سبو میں دریائے معرفت ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا — تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!

اسی کے فیض سے مری نگاہ ہے روشن — اسی کے فیض سے مرے سبو میں ہے جیحوں! (۱)

وہی دیرینہ بیماری! وہی نامحکمی دل کی — علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی! (۲)

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا — مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہد شباب (۳)

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں — خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں (۴)

مسلمان کی خستہ حالی و بدحالی کی تصویر کشی کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں، اس کا گریبان پھٹا ہوا ہے۔ مگر اسے اس کا چاک سینے کی فکر نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ آرزو، یعنی عشق کے بغیر کیسے زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ مسلمان ''جو اللہ ھو'' کے بغیر زندگی بسر کر رہا ہے، اس کی قسمت میں نامکمل موت ہے۔ اس کا شمار نہ زندوں میں نہ مردوں میں۔

گریباں چاک و بے فکر رفوزیست — نمیدانم چساں بے آرزوزیست

نصیب اوست مرگ ناتمامے — مسلمانے کہ بے اللہ ھوزیست! (۵)

زندگی کی دلہن اس کی خلوت گاہ میں اجنبی ہے، وہ نیستی کے مقام کی سیر میں مصروف ہے، وہ ایسا گناہ گار ہے جو موت سے پہلے ہی قبر میں پہنچ چکا ہے۔ اس کے نکیر کلیسا سے ہیں اور منکر مندر سے۔

عروسِ زندگی درخلوتش غیر — کہ دارد در مقامِ نیستی سیر

گہنگار یست پیش از مرگ درقبر — نکیرش ازکلیسا، منکر از دیر! (۶)

اس کے علاوہ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔ رات میں اللہ کی جناب میں بہت رویا۔ کہ مسلمان کیوں زار و خوار ہیں۔ آواز آئی کیا تو نہیں جانتا کہ یہ قوم دل رکھتی ہے۔ مگر محبوب نہیں رکھتی۔ یعنی حضورؐ کو اپنا آئیڈل نہیں بناتی۔

شبے پیش خدا بگریستم زار — مسلماناں چرا زارند و خوارند

---

(۱) بال جبریل۔ ۴۸۔ (۲) بال جبریل۔ ۱۱۔ (۳) ایضاً۔ ۳۷۔

(۴) ایضاً۔ ۱۰۴۔ (۵) ارمغانِ حجاز۔ ۳۳۔ (۶) ایضاً۔ ۳۴۔

ندا آمد ، نمیدانی کہ ایں قوم دلے دارند و محبوبے ندارند! (۱)

اقبال کہتے ہیں کہ میں اپنی عظمت رفتہ کی بات نہیں کرتا۔ جو حالات گزر چکے انہیں بیان کرنے سے کیا حاصل۔مگر دکھ اس بات کا ہے کہ میں اپنے سینے کے اندر، عشق رسول کا جو چراغ رکھتا تھا، گزشتہ دوسو سال میں وہ بھی بجھ چکا ہے۔

نگویم از فروفالے کہ بگذشت چہ سوداز شرح احوالے کہ بگذشت
چراغے داشتم درسینۂ خویش فسرد اندردوصد سالے کہ بگذشت (۲)

ساقی اٹھ اپنے چہرے سے نقاب اٹھا اور دیکھ میرے دل کا خون میری آنکھوں سے ٹپک رہا ہے۔اور مقام" لاتخف" سے اس لے میں نواریز ہو، جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔

بیاساقی نقاب از رخ برافگن چکیداز چشمِ من خونِ دل من
بہ آں لحنے کہ نے شرقی ، نہ غربی است نوائے از مقامِ لاتخف زن (۳)

فرنگی نے کعبہ و دیر سے لوگ صیدزبوں بنا لئے۔ خانقاہوں سے صدا اٹھی کہ وہ غیر نہیں۔ مولانا صاحب کی خدمت میں شکایت کی، تو انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے، الہیٰ اس کی عاقبت بخیر ہو!

فرنگی صیدبست از کعبہ و دیر صد از خانقاہاں رفت ، لاغیر،
حکایت پیشِ مُلاباز گفتم دعا فرمود یارب عاقبت خیر! (۴)

لہٰذا:۔

میں جانتا ہوں انجام اس کا جس معرکے میں ملا ہوں غازی! (۵)
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن پرکارو سخن ساز ہے ! نمناک نہیں ہے (۶)

چنانچہ اقبال کا پیغام ہے کہ:۔

ہو تری خاک کے ہر ذرے سے تعمیر حرم دل کو بیگانۂ انداز کلیسائی کر (۷)

تو صوفی و ملا کی قید میں گرفتار ہے۔ قرآن پاک سے زندگی حاصل نہیں کرتا۔ اس کی آیات سے تجھے صرف اتنا سروکار ہے کہ مرتے وقت یٰسین پڑھ لے۔ تا کہ جان آسانی سے نکل جائے۔

---

(۱) ارمغان حجاز۔۴۱۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔۶۶۔ (۴) ایضاً۔۷۳۔

(۵) بال جبریل۔۱۷۔ (۶) ایضاً۔۳۳۔ (۷) بانگِ درا۔۲۷۹۔

بہ بندِ صوفی و ملا اسیری حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش تراکارے جزایں نیست کہ از یٰسیٰن، او آساں بمیری (۱)

ایک پیشہ ور پیر نے اپنے بیٹے سے کہا تجھے یہ نکتہ اچھی طرح سے یاد رکھنا چاہئے! اس دور کے نمردوں سے دوستی رکھ، کیوں کہ ان کے فیض سے براہیمی کا ڈھونگ رچایا جا سکتا ہے۔ اور آج کل ذرائع ابلاغ کے ذریعے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ مولوی صاحب حکومتی نمرودوں کے خلاف بیان بازی کرنے کے بعد رقوم بٹور کر تھوڑے عرصے کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ روپے ختم ہونے پہ آتے ہیں۔ تو ایک آدھ بیان دوبارہ و سہ بارہ داغ دیتے ہیں اور پھر:۔

آپ تک ہے نہ غم جہاں تک ہے جانے یہ سلسلہ کہاں تک ہے (باقی صدیقی)

مگر نمرودوں کی جلائی ہوئی آگ میں کود جانے کو، کوئی بھی تیار نہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ:۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا (۲)
آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے! کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟ (۳)

بالکل یہی بات ہے۔ آتش نمرود اپنے زوروں پر ہے اور امتحان کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔ صورتحال بڑی نازک ہے۔ لیکن ہمارے دل میں عشق کا وہ پرانا سوز و گداز نہیں کہ آتش نمرود کے بھڑکتے شعلوں کا مقابلہ کر سکے۔

آتش نمرود ہے اب تک جہاں میں شعلہ ریز ہوگیا آنکھوں سے پنہاں کیوں ترا سوز کہن (۴)
پسر را گفت پیرے خرقہ بازے ترا ایں نکتہ باید حرز جاں کرد
بہ نمرودان ایں دور آشنا باش زفیض شاں براہیمی تواں کرد (۵)

آج قرآنی تعلیمات کی تاویلات بھی وقتی مصلحت اندیشیوں کے مطابق کی جا رہی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ چند ٹکوں کے عوض آیات فروشی کا مکروہ دھندہ جاری ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اقبال کہتے ہیں:۔

اسی قرآں میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر، ہے آج ان کے عمل کا انداز تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو نا خوب، بتدریج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر (۶)

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔ ۷۳۔ (۲) بانگِ درا۔ ۲۰۵۔ جوابِ شکوہ۔ (۳) ایضاً۔ ۲۵۷۔ خضر راہ۔
(۴) بانگِ درا۔ ۲۴۰۔ کفر و اسلام۔ (۵) ارمغانِ حجاز۔ ۷۵۔ (۶) ضربِ کلیم۔ ۱۶۔ تن بہ تقدیر۔

قرآن پاک مسلمانوں کو غلامی نہیں بلکہ آزادی سے زندہ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔مگر فقیہانِ حرم الٹی بات کرتے ہوئے، سبق شاہین بچوں کو دیتے ہیں خاک بازی کا۔

خود بدلتے نہیں ، قرآں کو بدل دیتے ہیں　　ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق!
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب　　کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!　　(۱)

اقبال انتہائی تیکھے طنزیہ لہجے میں کہتے ہیں کہ مسلمان:۔

چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس　　چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد!
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر　　چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد!
ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا　　اسلام ہے محبوس ، مسلمان ہے آزاد!،　　(۲)

علاوہ ازیں اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان اگر تو ڈروخوف کے مارے بزدل و کمزور اور کم ہمت و بے حوصلہ ہو کر بدل گیا ہے تو:۔

تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت　　کہ موافقِ تدرواں نہیں دین شاہبازی!
ترے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا　　کہ سکھا سکے خرد کو رہ ورسم کار سازی!　　(۳)

اسی لئے تو اقبال ’’مسجد قوت الاسلام‘‘ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

اب کہاں میرے نفس میں وہ حرارت ،وہ گداز　　بے تب و تاب دروں میری صلوٰۃ اور درود!
ہے مری بانگ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ　　کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود؟　　(۴)

اس پستی و ذلت کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے فقر غیور کو خیر باد کہہ دیا ہے۔فرنگیوں نے مسلمانوں کا صدق و خلوص اور فقیہان حرم کو اونے پونے داموں خرید لیا ہے جس کے نتیجے میں امت مسلمہ کی پیشانی کی چمک ماند پڑ چکی ہے۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو　　کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی!
مثال ماہ چمکتا تھا جس کا داغ سجود　　خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی!
ہوا حریف مہ و آفتاب تو جس سے　　رہی نہ تیرے ستاروں میں وہ درخشانی　　(۵)

---

(۱) ضرب کلیم۔۲۲۔ اجتہاد۔ (۲) ضرب کلیم۔۶۲۔ آزادی۔ (۳) ضرب کلیم۔۴۷۔ (۴) ایضاً۔ ۱۰۵۔ (۵) ایضاً۔۳۲۔

شیخ مکتب ،صوفی و ملا اور فقیہہ حرم سب افرنگ زدہ ہیں ۔ ان کی نس نس میں فرنگیت سرایت کر چکی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے وجود سے تجلی افرنگ منعکس ہو رہی ہے۔ مسلمان کی اپنی حیثیت کوئی بھی نہیں ۔یہ خودی سے اس طرح خالی ہے جس طرح زرنگار نیام تلوار سے خالی ہوتا ہے ۔

ترا وجود سراپا تجلیء افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر!
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی — فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر! (۱)

اس لئے اقبال کیا خوب فرماتے ہیں کہ:۔

یہ حکمت ملکوتی ، یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی ، یہ مراقبے ، یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں (۲)

مردہ ضمیری اور زبونی و تخچیری کے باعث ہندی مسلمان کے پاس وہ قوت نہیں جس سے وہ اپنی خودی کی حفاظت کر سکے ۔ اس کی اس حالت زار و حیلہ سازی اور موقع پرستی پر اقبال کڑا طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اے مرد خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل — جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدیء جاوید — جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد! (۳)
ہوا ہے بندۂ مومن فسونیء افرنگ — اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک (۴)

ایسے دگرگوں و پرخوں حالات پر کف افسوس ملتے ہوئے اقبال جب لعل ناب بہاتے اور لٹاتے ہیں تو دل و جگر پر کپکپی طاری ہونے لگتی ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔

تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار — کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟ — کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں — نے گرمئ افکار ، نہ اندیشہء بیباک!

---

(۱) ضرب کلیم ۔۲۳۔ (۲) ضرب کلیم ۔۳۴۔ ۳۵۔ ''تصوف ۔ (۳) ایضاً۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ہندی اسلام ۔ (۴) ضرب کلیم ۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری! اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری! (۱)

کیا کہوں تیرا رقص یوں ہے اور یوں نہیں ہے، یہ اندرونی مسرت کا اظہار نہیں بلکہ حشیش ہے۔ تو فرنگیوں کی تقلید میں پاؤں سے حرکات کرتا ہے۔ مگر تیری رگوں میں خون کا وہ جوش نہیں۔

چہ گویم رقص تو چون است و چوں نیست حشیش است ! ایں نشاط اندروں نیست!
بہ تقلید فرنگی پائے کوبی بہ رگہائے تو آن طغیان خوں نیست (۲)

اور اگر یہی حال ہے تو پھر واقعی:۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے!
وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے! (۳)

اس سارے ضعف، تنزل اور دلگیری و نخچری کا علاج یہ ہے کہ:۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوے رہبانی یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری
شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوق نخچیری (۴)

زوال پذیری، بے ضمیری، گراوٹ اور تباہی و بربادی کی اس ساری روح فرسا داستان پر اقبال خوں کے آنسو بہاتے ہوئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش میں ان کے تن مردہ میں زندگی اور شہ زور ولولوں کی روح پھونکتے رہے۔ اس کی روشنی میں اقبال بجا فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو ان کی پستی و تباہی و بربادی کا احساس دلایا۔ گویا کہ پرانی کھوکھلی اور خشک شاخ کو دوبارہ آب حیات سے سرسبز و شاداب اور ترو تازہ کر دیا۔ میں نے مسلمانوں کی خاکستر کو حرف شوق یعنی آتش عشق کے ذریعے دوبارہ روشن کیا۔ امت مسلمہ میں زندگی کی روح پھونکی اور اپنے سینے کے اندر میں نے اپنا دل خون کر کے اس کی حالت زار کو بدلا ہے:۔

بامسلماناں غمے بخشیدہ ام کہنہ شاخے رانمے بخشیدہ ام
ہمچونے نالیدم اندرکوہ و دشت تامقامِ خویش برمن فاش گشت

---

(۱) ارمغان حجاز۔ ۲۷۔۲۸۔ آوارغیب۔ (۲) ایضاً۔ ۹۶۔ (۳) ضرب کلیم۔ ۱۴۱۔۱۴۲۔ (۴) ارمغان حجاز۔ ۳۸۔

حرف شوق آموختم واسوختم آتشِ افسردہ باز افروختم (۱)

درمیان سینہ دل خوں کردہ ام
تاجہانش را دگرگوں کردہ ام (۲)

میرے سوز سے مسلمان کی رگوں میں خون تڑپ رہا ہے ۔ اس کی آنکھ سے میرے بیتاب آنسو ٹپک رہے ہیں ۔ لیکن ابھی تک وہ اس محشر کو نہیں سمجھا جو میری جان میں برپا ہے ۔ ابھی تک اس نے جہان کو میری آنکھ سے نہیں دیکھا۔

رگ مسلم زسوز من تپید است ز چشمش اشک بیتابم چکیداست
ہنوز از محشر جانم نداند جہاں را با نگاہِ من ندیداست (۳)

میری نوا نے عجم میں اسلام کی پرانی آگ روشن کر دی ۔ لیکن عرب ابھی تک میرے نغمہ شوق سے باخبر نہیں ۔

نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت عرب زنغمہ شوقم ہنوز بے خبر است (۴)

وہ جو افیون کے عادی تھے ۔ انہیں اقبال کے پیغام نے جذبہ بلند اور عالی حوصلگی عطاء کر دی ہے ۔ اسی لئے وہ فضائے نیلگوں کی وسعتوں میں اڑنے کے لئے بڑی بیتابی سے پرتول رہے ہیں ۔

جو کوکنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو تری نوا نے دیا ذوق جذبہ ہائے بلند!
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے وہ پرشکستہ کہ صحن سرامیں تھے خورسند! (۵)

یہ مسلمان جو بحر حیات سے شرمندہ اور اپنے آپ سے ناامید ہو کر ساحل پر بیٹھ گیا ہے ۔ اقبال جیسے درد مند کے سوا کس نے اس کے زخم ہائے نہاں دیکھے ہیں۔

مسلماں تابساحل آرمیداست خجل از بحرواز خودناامید است
جزایں مردے فقیرے درد مندے جراحت ہائے پنہانش کہ دیداست؟ (۶)

اقبال کہتے ہیں میرے بغیر کس نے اسے کہا کہ ناامید نہ ہو دوست کی خوشبو آرہی ہے ۔ کس نے اسے نئے دور بہار کی خوشخبری دی۔ جب اس کے دم سے پرانا سوز جاتا رہا تو کس نے اس کے نیستاں پر نیا شرر پھینکا۔

کہ گفت اورا کہ آیدبوے یارے؟ کہ داد اورا امیدے نو بہارے؟

---

(۱) پس چہ باید کرد ۔ ۸۶۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۲۰۲۔ (۳) پیام مشرق ۔ ۷۷۔
(۴) ایضاً ۔ ۱۴۷۔ (۵) ضرب کلیم ۔ ۱۲۔ (۶) ارمغان حجاز ۔ ۵۰۔

چوں آں سوزِکہن رفت از دمِ او | کہ زد بر نیستانِ او شرارے؟ (۱)

اس کے علاوہ کہتے ہیں کہ میں آغاز بہار کا پہلا گل لالہ ہوں اور ملت اسلامیہ کے غم سے مسلسل جل رہا ہوں -- مجھے اکیلے پا کر حقارت کی نظر سے نہ دیکھ، اس لئے کہ پھولوں کے سینکڑوں کارواں میری آغوش میں ہیں گویا کہ خوشبوؤں و نغموں کا ایک لامتناہی سلسلہ میرے جلو میں ہے۔

نختیں لالہ صبح بہارم | پیاپے سوزم از داغے کہ دارم
بچشم کم مبیں تنہا ئم را | کہ من صد کارواں گل درکنارم (۲)

اس کے بعد اقبال دربار حضورؐ میں عرض کرتے ہیں ۔ میں اس مسلمان کی حالت کیسے بیان کروں؟ نہاں و عیاں آپؐ کے سامنے ہے ۔اس کی دوسو سالہ سرگزشت کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میرا دل اس کے زخم کھا کھا کر کندۂ قصاب کی مانند ہو چکا ہے۔

چساں احوالِ او رابرلب آرم | تو می بینی نہان و آشکارم
زرودادِ دوصد سالش ہمیں بس | کہ دل چوں کندۂ قصاب دارم (۳)

ایسے میں اقبال بجا فرماتے ہیں:۔

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی | ان کا سرِدامن بھی ابھی چاک نہیں ہے (۴)
اگر چہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں | مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ (۵)

اور پھر اقبال'' طارق'' کی زبانی دعا کرواتے ہیں:۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن | نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی!
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے | قبا چاہیئے اس کوخون عرب سے!
عزائم کوسینوں میں بیدار کردے | نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے (۶)

ان اوراق میں بیان کیے گئے عالم نزع کے باوجود اقبال پر امید ہیں کہ اگر مسلمان دوبارہ اپنے مرکز کی طرف رجوع کریں تو متاع عروج حاصل کرتے ہوئے ، بحرظلمات میں ایک بار پھر گھوڑے دوڑا سکتے ہیں۔اس کا بہترین طریقہ یہ

---

(۱) ارمغان حجاز۔۵۰۔ (۲) ایضاً۔۸۷۔ (۳) ارمغان حجاز۔۳۲۔

(۴) بال جبریل۔۳۳۔ (۵) ضرب کلیم۔۱۶۔ (۶) بال جبریل۔۱۰۵۔'' طارق کی دعا''۔

ہے کہ:۔

تو خودی اندر بدن تعمیر کن مشتِ خاکِ خویش را اکسیر کن (۱)

اگر تو ایسا کرے تو کیا عجب کہ:۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک بزمِ گل کی ہم نفس بادِصبا ہو جائے گی!
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوزوساز اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!
دیکھ لو گے سطوتِ رفتاردریا کا مآل موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی!
نالہء صیاد سے ہوں گے نواساماں طیور خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے! (۲)

اقبال ہر حال میں امیدورجا کے پیغمبر ہیں ۔ ان کے ''قلزم جمال'' میں طوفان انگیزوگوہر ریز رجائیت ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔مایوسی و ناامیدی کا کوئی گزر نہیں ۔ وہ ہمیشہ حوصلہ افزائی سے کام لیتے ہوئے روشن مستقبل کا مژدہ سناتے ہیں ۔

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی گل برانداز ہے خون شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے (۳)

لاریب :۔

(۱) مثنوی مسافر ۔۶۰۔ (۲) بانگِ درا ۔۱۹۴۔ ۱۹۵۔شمع اور شاعر''۔ (۳) بانگِ درا ۔۲۰۵۔ جواب شکوہ۔

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا ۔۔۔ اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہ (۱)

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطاء کر دیں ۔۔۔ شکوہ سنجر و فقر جنید و بسطامیؒ (۲)

حاصل کلام یہ ہے کہ:۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی (۳)

ایسے میں وہ تصوف جس کا منبع قرآن وحدیث ہے اقبال نے اسے عشق کا نام دیا ہے ،جو کہ ایک لازوال قوت ہے۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے ۔۔۔ دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے (۴)

زندگی کشت است و حاصل قوت است ۔۔۔ شرح رمز حق و باطل قوت است

مدعی گرمایہ دار از قوت است ۔۔۔ دعویٰ او بے نیاز از حجت است (۵)

میں یہاں زیادہ تفصیل سے بچتے ہوئے مختصراً لفظ تصوف کے ماخذ اور مطالب کے حوالے سے بات کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں ۔ اس ضمن میں اگر کوئی چاہے تو پوری ایک کتاب تحریر کر سکتا ہے مگر راقم اپنے موضوع کے حوالے سے اتنا ہی عرض کرتا ہے ۔ کہ اکثر حضرات کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''صفا'' سے بنا ہے ۔ جبکہ بحوالہ صرف ونحو''صفا'' سے لفظ ''صوفی'' تشکیل نہیں پاسکتا ۔ اس سے خاندان صفوی کی طرح ''صفوی'' بنے گا۔اسی طرح ایک رائے کے مطابق ''تصوف'' کو'' صف سے'' منسوب کیا جاتا ہے مگر ایسی بھی کوئی بات نہیں ۔ اس سے صفی تو بن سکتا ہے ۔لیکن ''صوفی'' ہرگز نہیں اسی طرح ''صفہ'' سے بھی ''صفی'' بنتا ہے ۔صوفی نہیں ۔ ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں ۔

'' لفظ تصوف کا ماخذ یونانی لفظ Sophia ہے ۔۔۔یونانی زبان میں Sophia کا معنی ہے ۔ Wisdom یعنی حکمت ودانائی ۔۔۔۔لفظ تصوف درحقیقت Theosophy سے بنا ہے جو عرفان و معرفت خداوندی کا علم ہے ۔'' (۶)

ابوالحسن نوریؒ (۹۰۸ء) فرماتے ہیں :۔

'' صوفی وہ لوگ ہیں جن کی روح بشریت کی کدورت سے آزاد ہوگئی ہو اور آفت نفس سے صاف اور ہوا وہوس

---

(۱) ضرب کلیم ۔۱۶۵۔ (۲) بال جبریل ۔۷۳۔ (۳) بال جبریل ۔ ۱۱۔ (۳) بانگ درا ۔ ۲۰۷۔ جواب شکوہ ۔

(۵) اسرار و رموز ۔ ۱۲۶۔ (۶) حقیقت تصوف ۔ ۱۰۔ ۱۱ ۔ ڈاکٹر اسرار احمد ۔

سے خالص ہو گئے ہوں ۔ یہ لوگ صف اول ودرجہ اعلیٰ میں خداوند کریم سے قوت حاصل کئے ہوئے ہیں ۔" (۱)

حضرت جنید بغدادیؒ کے مطابق :۔

صوفی وہ ہے جس کا دل دنیا سے متنفر اور فرمان الٰہی کو ماننے والا ہو۔ اس میں تسلیم حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح ، اندوہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ، فقر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ، صبر حضرت ایوب علیہ السلام کی طرح ، شوق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح اور اخلاق جناب رسول خداصلعم کی طرح ہو"۔ (۲)

"صوف" کے لباس کے پس منظر کے علاوہ تصوف کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں ۔ لیکن درحقیقت تصوف کی کوئی جامع اور مکمل تعریف کرنا محال ہے ۔ البتہ حضرت جنید بغدادی کے فرمان کے مطابق تصوف کا عمل دخل بہت وسیع دکھائی دیتا ہے۔ بہر حال صوفیاء کرام اور اولیاء کرام کی بیان کردہ آرا اوران کی عملی زندگی کی روشنی سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے ۔ کہ تصوف زہد وتقویٰ کا نام ہے ، جس سے معرفت الٰہی جیسی نعمت حاصل ہوتی ہے ۔

اقبال تصوف کو عشق ، ذوق وشوق اور فقر غیور کا نام دیتے ہیں ۔ زہد وتقویٰ اور فرمان الٰہی کے لحاظ سے علامہ اقبال تصوف سے مراد عبادت اور دعا بھی لیتے ہیں ۔ جن کا تعلق مذہب سے ہے ۔ اس لئے کہ زہد وتقویٰ اور عبادت الٰہی کے بغیر تصوف وعرفان الٰہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ علامہ اقبال رقم طراز ہیں۔" مذہب کے عزائم فلسفہ سے بلند تر ہیں ۔ مذہب کے لئے یہ ممکن نہیں کہ صرف تصورات پر قناعت کر لے ۔ وہ چاہتا ہے اپنے مقصود ومطلوب کا زیادہ گہرا علم حاصل کرے اور اس سے قریب تر ہوتا چلا جائے ۔ لیکن یہ قرب حاصل ہوگا تو دعا کے ذریعے ، مگر پھر دعا وہ چیز ہے جس کی انتہا روحانی تجلیات پر ہوتی ہے۔۔۔ روحانی تجلیات سے شخصیتیں بنتی ہیں اور انسان محسوس کرتا ہے کہ اس نے ایک نئی قوت حاصل کر لی ہے"۔ (۳)

یہی وجہ ہے کہ تاریخ انسانیت میں آج تک کوئی ایک بھی فلسفی ایسا نہیں جسے اپنے علم وحکمت کے بل بوتے پر "حسن مطلق" کی معرفت نصیب ہوئی ہو ۔ اس لئے کہ فلسفی کا صدف گہر سے خالی اور اس کا طلسم سب خیالی ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس انبیاء کرام اور اولیاء عظام نے عشق کے طفیل حسن حقیقی سے لو لگائی ۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فلسفی ہمیشہ اہل علم حضرات رہے ہیں ۔ جبکہ انبیاء کرام اور صوفیاء کرام سب کے سب اہل علم نہیں تھے ۔ مگر ان برگزیدہ ہستیوں نے علم کے بغیر

---

(۱) تذکرۃ الاولیاء ۔ ۲۵۸۔ (۲) اسلامی تصوف اور اقبال ۔۱۴۔۱۵۔ (۳) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۔۱۳۳،۱۳۶۔

بھی معرفت الٰہی حاصل کر لی ۔ جبکہ فلسفیوں کی ساری بحث وتمحیص ،علم کلام اور قیل و قال دھرے کا دھرا رہ گیا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ سب سے پہلا فلسفی "شیطان" ہی ہے ۔جس نے قیل و قال کا آغاز کیا ۔اور راہ راست سے بھٹک کر راندۂ درگاہ ہوا۔ یہ لکھنے کے ٹھیک ایک ماہ بعد تحقیق وجستجو کے دوران میں ، راقم الحروف نے علامہ اقبال کی نظم" جلال و گوئٹے" پڑھی تو مجھے اپنے کہے پر اقبال اور رومی کے مندرجہ ذیل ایک ایک شعر کی صورت میں مہر تصدیق مل گئی۔

ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست ہر کسے شایان ایں درگاہ نیست (۱)

دانداں کو نیک بخت و محرم است زیر کی زابلیس و عشق از آدم است (۲)

نظم" جبرئیل و ابلیس" کے مکالمے میں بھی اقبال ابلیس سے اعتراف کراتے ہیں کہ:۔

ہے مری جراءت سے مشت خاک میں ذوق نمو میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو (۳)

اب یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جو حسن مطلق کے مقرب فرشتوں میں سے ہوتے ہوئے دیدار حسن مطلق سے بھی سرفراز ہو چکا تھا ،فلسفی بننے کے بعد اپنے عظیم رتبے سے پستی و تاریکی کے گڑھے میں گر گیا ،تو وہ عام بشر فلسفی جو پہلے ہی انکار وتشکیک کے بھنور میں تنکے کی طرح چکرا رہا ہے،معرفت حقیقت سے کیونکر بہرہ یاب ہوسکتا ہے؟ چنانچہ اکبر آلہ آبادی نے خوب کہا ہے:۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں (اکبر آلہ آبادی)

اور خواجہ میر درد فرماتے ہیں:۔

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے (۴)

اقبال کہتے ہیں عقل دو قدم آگے نہیں دیکھ سکتی ۔ یہ دل عاشق ہی ہے کہ زمینوں و آسمانوں کی تمام وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹنے کے بعد خالق حقیقی سے لو لگا لیتا ہے ۔اس تک پہنچ سکتا ہے ۔

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۲۰۷ ۔ اقبال ۔ (۲) مثنوی مولانا روم ۔ دفتر چہارم ۔ ۱۴۱ ۔ (۳) بال جبریل ۔ ۱۴۴ ۔ (۴) دیوان درد ۔ ۸۸ ۔ ۸۹ ۔

ایں گنبد مینائی ، ایں پستی و بالائی
درشد بدل عاشق ، بایں ہمہ پہنائی (۱)
درشب من آفتابے آں کہن داغ بس است
ایں چراغ زیر فانوس از شبستانم برید (۲)

اقبال کی زبان میں ''دل'' ''عشق'' ہی کا نام ہے۔ کوئی قاصد مجازی محبوب کے لئے پیغام رسانی تو کر سکتا ہے لیکن محبوب حقیقی کا پیغام لانا و لے جانا قاصد کے جی کا روگ نہیں، بلکہ کوئی خود دار دل یہ سوچ کر بھی قاصد کی خدمات حاصل کرنے سے گریز کرتا ہے کہ:۔

ع زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے (آتش)

میرا خیال ہے اقبال کے نزدیک عقل کی مثال کچھ ایسے ویسے پیغامبر جیسی ہی ہے۔ جس کی نارسائی، نارسائی سی نارسائی ہے۔ اسی لئے تو اقبال کہتے ہیں:۔

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا (۳)
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر (۴)

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۶۷۔ (۲) زبور عجم۔ ۸۹۔ (۳) بال جبریل۔ ۱۴۴۔ ساقی نامہ۔ (۴) بال جبریل۔ ۸۷۔

میری خاک کو نغمہ داؤد سے چمکا دیجئے۔ میرے بدن کے ہر ذرے کو شرر بنا دیجئے کہ وہ اڑتا پھرے۔ میرے اندرون کو اس طرح کر دیں کہ میں اپنی شعلہ نوائی سے خاکیوں کے دلوں میں موجود عشق کو گرمادوں اور نوریوں کے دلوں میں گداز عشق پیدا کر دوں۔

خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد برفروز ہر ذرۂ مرا پروبالِ شرر بدہ (۱)

بضمیرم آں چناں کن کہ زشعلۂ نوائے دل خاکیاں فروزم ، دل نوریاں گدازم (۲)

اقبال نے یہ نہیں کہا کہ مجھے علم کلام یا فلسفے کے پر لگا کر اڑا، اس لئے کہ فلسفے کے پر ہوتے ہی نہیں وہ طاقت پرواز ہی نہیں رکھتا۔ فلسفہ برف کی طرح یخ بستہ ہے جبکہ عشق سوز و گداز اور تڑپنے پھڑکنے سے عبارت ہے۔ یہ دلِ مرتضیٰ اور سوز صدیق ہے۔ عقل محو تماشائے لب بام ہی رہتی ہے۔ کہ عشق آتش نمرود میں بے خوف و خطر کود پڑتا ہے۔ عشق، ایمان اور ایقان ہے جس کی تاثیر سے آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا۔ عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود، اور اگر مزید پوچھو تو۔

مردِخدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام!

عشق دمِ جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیٰؐ عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام!

عشق کی مستی سے ہے پیکر گِل تابناک عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات! عشق سے نور حیات ، عشق سے نار حیات (۳)

عشق ہی جب سب کچھ ہے تو اقبال اسی ''جذبے'' کے تمنائی نظر آتے ہیں تاکہ حسن کا قرب حاصل کر سکیں۔

عقل دادی ہم جنونے دہ مرا رہ بجذبِ اندرونے دہ مرا (۴)

عطا کن شورِ رومی، سوزِ خسرو عطا کن صدق و اخلاص سنائی

چناں با بندگی در ساختم من نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی (۵)

---

(۱) زبورِ عجم۔۴۔ (۲) زبورِ عجم۔۹۔ (۳) بالِ جبریل۔۹۴۔۹۵۔ ''مسجدِ قرطبہ''۔ (۴) جاوید نامہ۔۱۴۔ (۵) ارمغانِ حجاز۔۱۵۔

ع   مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

خرد کے مقابلے میں اقبال عشق کے اس قدر متوالے ہیں کہ:۔

اے کہ از خمخانہء فطرت بجا مم ریختی   زآتش صہبائے من بگداز مینائے مرا

عشق راسرمایہ ساز از گرمیء فریاد من   شعلہء بیباک گرداں خاک سینائے مرا

چوں بمیرم از غبار من چراغ لالہ ساز

تازہ کن داغ مرا، سوزاں بصحرائے مرا   (۱)

جس طرح یورپی عقلیت پرست فلاسفہ کی تحریکیں ، مثلاً تصوریت ، مشائیت ، رواقیت ، ابیقوریت ،فطریت اور اظہاریت وغیرہ ہیں ۔ اسی طرح مشرق میں عاشقوں اور صوفیوں کے سلسلے ہیں مثلاً چشتیہ ، قادریہ ،حنفیہ ، سہروردیہ اور رفاعیہ وغیرہ۔ بہر حال عاشق یا صاحب جنوں بنے بغیر بات نہیں بنتی ۔ اس سلسلے میں اقبال مولانا روم کے مرید ہوتے ہوئے انہی کے نقش قدم پر چلتے دکھائی دیتے ہیں ۔ جو درحقیقت عشق کے نقش قدم ہیں ۔ جس کی منزل ''حسن مطلق'' کے سوا کوئی اور نہیں ۔ فلسفے کی بھول بھلیاں صاحب عشق کو لمبی چوڑی بحثوں میں الجھانے سے قاصر ہیں ۔ مولانا روم فرماتے ہیں ۔

دفتر صوفی سواد و حرف نیست   جز دل اسپید ہمچوں برف نیست

زادِ دانش مند آثار قلم   زادِ صوفی چیست ؟ انوار قدم   (۲)

'' حکمت رومی'' از خلیفہ عبدالحکیم کے صفحہ نمبر ۸۲ پر بھی ''ہمچوں'' اور '' انوار'' لکھا ہے ۔

صوفی یا عاشق قیل و قال کے بکھیڑوں میں نہیں پڑتا۔اس کا دل صاف و شفاف ہوتا ہے ۔فلسفی کے ہاں مباحث تحریر شدہ دفتر کے علاوہ کچھ بھی نہیں ۔ جبکہ عاشق ''حسن ازل'' کے اسرار و انوار سے بھی آگاہ ہے ۔

اسی لئے تو اقبال جیسا راہ شوق کا مسافر اپنے ناقے کی مہار عشق کے سپرد کرتا ہے ۔تاکہ اپنا گوہر مقصود پا سکے ۔

الا یا خیمگی خیمہ فروہل   کہ پیش آہنگ بیروں شدزمنزل

خرد از راندن محمل فروماند   زمامِ خویش دارم درکف دل!   (۳)

علامہ اقبال حسن مطلق تک رسائی کے لئے عشق رسول اللہ کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں ۔

---

(۱) پیامِ مشرق ۔۸۴۔ (۲) مثنوی مولانا روم ۔ دفتر دوم ۔ ۲۹۔ خطبات اقبال میں ص ۱۳۷۔ پر پہلے شعر میں ہمچوں کی جگہ '' مثل '' اور '' انوار'' کی جگہ '' آثار'' لکھا ہے ۔ (۳) ارمغانِ حجاز ۔۲۳۔

دردل مسلم مقام مصطفیٰ است آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است
دل زعشق اوتوانا میشود! خاک ہمدوش ثریا میشود (۱)
ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست بحروبر درگوشہء دامان اوست
سوز صدیق ؓ و علیؓ از حق طلب ذرۂ عشق نبی از حق طلب
زانکہ ملت راحیات از عشق اوست برگ و سازِ کائنات از عشق اوست (۲)

فلسفہ خواہ ''اہل یونان'' کا ہو یا اہل ایمان کا اقبال کے ''ذوق جمال'' میں محض کھوٹا سکہ ہے۔ اس لئے کہ حسن مطلق سے نابلد ہے۔

جمال عشق و مستی نے نوازی جلال عشق و مستی بے نیازی
کمال عشق و مستی ظرف حیدرؓ زوال عشق ومستی حرف رازی! (۳)
عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو کچھ کام نہیں آتا بے آہ سحرگاہی (۴)
صحبت پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ رازفاش لاکھ حکیم سربجیب، ایک کلیم سر بکف!
مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف (۵)

مقام شوق، مقام عشق ہے یہ مقام صدق و یقین اور جبرئیل امین جیسے عاشق باصفا کی صحبت کے بغیر نہیں ملتا۔ اگر تجھے صدق ویقین حاصل ہے تو بے باکی سے قدم بڑھا، کوئی شیطان تیری گھات میں نہیں ہوگا۔

مقام شوق بے صدق ویقیں نیست یقیں بےصحبتِ روح الامین نیست
گراز صدق و یقیں داری نصیبے قدم بیباک نہ، کس درکمیں نیست (۶)

اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ جب میں نے اپنی آنکھوں سے رازی کی تفسیر کا سرمہ دھو ڈالا تو مجھے قرآن پاک کے اندر قوموں کی تقدیر کے راز نظر آئے۔

چوں سرمہء رازی را از دیدہ فروشستم تقدیر امم دیدم پنہاں بکتاب اندر (۷)

رومی فرماتے ہیں:۔

---

(۱) اسرار و رموز۔۶۰۔ (۲) پیام مشرق۔۲۰۔۲۱۔ (۳) بال جبریل۔۸۳۔ (۴) بال جبریل۔۵۶۔
(۵) ایضاً۔۳۹۔۴۰۔ (۶) ارمغانِ حجاز۔۱۴۳۔ (۷) جاوید نامہ۔۴۲۔

گر باستدلال کاردیں بدے فخرِ رازی رازدارِ دیں بدے (۱)

نے مہرہ باقی ، نے مہرہ بازی جیتا ہے رومی، ہارا ہے رازی (۲)

وقت است کہ بکشائم میخانہ رومی باز پیران حرم دیدم درصحنِ کلیسا مست!

ایں کار حکیمے نیست دامانِ کلیمے گیر صد بندۂ ساحل مست یک بندہ دریامست (۳)

مولانا جلال الدین رومی مثنوی کی چھٹی جلد میں فرماتے ہیں :۔

فلسفی خود رازاندیشہ بکشت گوبدوکورا سوی گنجست پشت

گوبدو چندانکہ افزوں میدود ازمرادِ دل جدا ترمی شود (۴)

فلسفی نے غور وفکر سے خود کو مار ڈالا ۔ اس سے کہہ دے کہ خزانہ کی جانب اس کی پشت ہے ۔ اس سے کہہ دے کہ وہ جتنا دوڑتا ہے ۔ دلی مراد سے اتنا ہی دور یا جدا ہو رہا ہے ۔ اس لئے کہ وہ مخالف سمت میں جا رہا ہے ۔

چنانچہ اقبال کہتے ہیں :۔

عشق است کہ درجانت ہر کیفیت انگیزد ازتاب و تب رومی تاحیرت فارابی (۵)

لہٰذا خوش نصیب ہے وہ شخص جس نے خرد کے لباس کو شعلہء مے یعنی آتش عشق میں جلا دیا۔ اورگلِ لالہ کی مانند آگ (عشق) کو اپنی متاع بنایا۔

خوش آں کہ رخت خرد را بہ شعلہء مے سوخت مثال لالہ متاعے زآتشے اندوخت (۶)

عشق وہ آہ سحر گاہی ہے جس کے بغیر لطف نہیں ۔اس لئے کہ حق ومعرفت کی منزلیں اسی کی بدولت طے ہوتی ہیں ۔ جب کہ عقل وفلسفہ اور منطق وعلم کلام حق ومعرفت کے سلسلے میں رہنمائی کرنے سے بالکل قاصر ہیں:۔

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے ترا دل گرمیء محفل نہیں ہے

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے (۷)

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

خدا جانے مجھے کیا ہوگیا ہے خرد بیزار دل سے دل خرد سے! (۸)

---

(۱) مثنوی معنوی ، مولوی ۔ (۲) بالِ جبریل ۔ ۷۱ ۔ (۳) پس چہ باید کرد ۔ ۷۶ ۔ (۴) مثنوی مولانا روم ۔ دفتر ششم ۔ ۲۲۳ ۔
(۵) پیام مشرق ۔ ۱۳۳ ۔ (۶) پیام مشرق ۔ ۱۵۵ ۔ (۷) بالِ جبریل ۔ ۸۳ ۔ (۸) بالِ جبریل ۔ ۸۸ ۔

اگر انسان کے سینے میں دل نہ ہوتا تو نہ وہ اپنی خودی کی قوت آزماتا اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں کے بند کھولتا۔ بلکہ خرد زنجیر بن کر اسے جکڑے رکھتی۔ یعنی کہ عشق وخرد کی باہمی کشمکش میں عشق خرد کے بندھنوں کو توڑ کر انسان کو حق شناسی کی راہ پر ڈالتا ہے۔ ورنہ انسان اسی عالم محسوسات کی دلدل میں دھنس کر رہ جاتا۔

نہ نیروے خودی را آزمودے — نہ بند از دست و پائے خود کشودے
خرد زنجیر بودے آدمی را — اگر درسینہء او دل نبودے (۱)

تو کہتا ہے کہ دل خاک وخوں سے پیدا ہوا ہے اور یہ بھی طلسم کن میں گرفتار ہے۔ نہیں یہ بات نہیں اگر چہ ہمارا دل ہمارے سینے میں ہے مگر وہ ہماری دنیا سے ماورا ہے۔

تو می گوئی کے دل از خاک و خوں است — گرفتار طلسم کاف و نون است
دل ما گرچہ اندر سینہء ماست — و لیکن از جہانِ مابرون است (۲)

عشق ہر ایک چیز پر حاوی ہے اس کے بے شمار مقام اور صورتیں ہیں۔ عشق سبھی کچھ ہے۔

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق — کبھی شاہ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش — کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق!
کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق — کبھی سوز و سرورو انجمن عشق!
کبھی سرمایہء محراب و منبر — کبھی مولا علی خیبر شکن عشق! (۳)

حد ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی
سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری (۴)

عقل و ادراک وہیں تک کام کرتے ہیں جہاں تک محسوسات کا عمل دخل ہے۔ اس کے آگے عشق کا کام ہے کہ منزل حسن کو جالیتا ہے۔ عشق حسن سے دور نہیں رہ سکتا۔ ماہی بے آب زندہ نہیں رہ سکتی تو عشق حسن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن وہ عشق، عشق ہی نہیں جو حسن کو پا نہ سکے۔ فلسفہ کے جال کا تانا بانا، مکروفریب کے تاروپود سے بنا ہوا ہے۔ اس کے سو سو حیلے بہانے اور چالبازیاں ہیں۔ جبکہ عشق سیدھا سادہ اور ہر قسم کے کھوٹ سے مبرا ہے۔ عشق کی چالیس زاہد کی

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔ ۱۱۸۔ (۲) ایضاً۔ ۱۱۸۔ (۳) بالِ جبریل۔ ۸۷۔ (۴) ایضاً۔ ۶۰۔

طرح باریک بالکل نہیں ۔ اس لئے آواز اذاں سن کر عشق پر ریاکاری کا لرزہ طاری نہیں ہوتا ۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے — عشق بے چارہ نہ ملا ہے، نہ زاہد نہ حکیم! (۱)

عشق صید از زورِ بازو افگند — عقل مکاراست و دامے می زند
عقل سفاک است و او سفاک تر — پاک تر، چالاک تر، بے باک تر
عقل درپیچاک اسباب و علل — عشق چوگاں بازِ میدان عمل
عقل را سرمایہ از بیم و شک است — عشق را عزم و یقیں لاینفک است
آں کند تعمیر تا ویراں کند — ایں کند ویراں کہ آباداں کند!
عقل چوں باداست ارزاں درجہاں — عشق کمیاب و بہائے او گراں
عقل محکم از اساس چون و چند — عشق عریاں از لباس چون و چند (۲)
عقل باغیر آشنا از اکتساب — عشق از فضل است و باخود درحساب
عقل گوید شاد شو، آباد شو — عشق گوید، بندہ شو، آزاد شو
عشق را آرامِ جاں حریت است — ناقہ اش را سارباں حریت است (۳)

بے شک:۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل — عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی (۴)

اس لئے:۔

تہی از ہائے وہومیخانہ بودے — گلِ ما از شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق وایں ہنگامہء عشق — اگر دل چوں خرد فرزا نہ بودے (۵)

اقبال یہ سب کچھ مشاہدے کی بناء پر کہتے ہیں :۔

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں — کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل (۶)

---

(۱) بالِ جبریل ۔۶۰۔ (۲) اسرار و رموز ۔ ۱۰۹۔ (۳) ایضاً۔ ۱۰۹۔
(۴) بانگِ درا ۔ ۲۷۸۔ غزل ۔ (۵) پیام مشرق ۔ ۳۱۔ (۶) بالِ جبریل ۔ ۶۳۔

رازی سے قرآن کے معنی کیا پوچھتا ہے۔ ہمارا ضمیر ہی اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول قرآن گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف (۱)

خرد نے آگ جلائی، دل اس میں کود پڑا، نمرود وخلیل کی یہی تفسیر ہے۔

زرازی معنیء قرآں چہ پرسی ضمیرِ ما بآیاتش دلیل است
خرد آتش فروزد ، دل بسوزد ہمیں تفسیر نمرود و خلیل است (۲)

اس لئے عقل مندی کا راستہ چھوڑ یہ حسن مطلق تک نہیں پہنچا سکتا۔ اللہ تعالیٰ تک نیاز مندی سے بھرپور دل اور پاکیزہ نگاہ عشق ہی پہنچا سکتی ہے۔

رہِ عاقلی رہا کن کہ باوتواں رسیدن بدلِ نیاز مندے ، بہ نگاہ پاکبازے (۳)

عقل وعشق دونوں اپنی اپنی منزل کی جانب رواں ہیں اور دونوں اپنے اپنے قافلوں کے سالار ہیں مگر عقل حیلہ بازی سے کام لیتی ہے اور عشق قوت سے آگے لے جاتا ہے۔عشق اس خیمہ شش جہات (کائنات) کی طنابیں کاٹ دیتا ہے اور کہکشاں تک پہنچ جاتا ہے۔

ہر دو بمنزلے رواں، ہر دو امیر کارواں عقل بحیلہ می برد ،عشق بروکشاں کشاں
عشق زپادرآورد خیمہ شش جہات را دست درازی کند تا بہ طناب کہکشاں (۴)

عقل کتاب حیات کے اوراق الٹتی رہی مگر اسے کچھ نہ ملا۔عشق فوراً زندگی کے معنی پا گیا۔ اس عقل مند پرندے نے بچھے ہوئے دام، علائق دنیا کے نیچے سے دانہء حقیقت اٹھالیا۔

عقل ورق ورق بگشت عشق بہ نکتہء رسید طائرزیر کے بردوانہ ء زیر دام را (۵)

عشق وہ شہباز ہے جو کیاب ولاہوت آشنا ہے۔ یہ کنجشک وحمام کی طرح دانے دنکوں کی خاطر مارا مارا نہیں پھرتا۔ یہ صدق دل سے کھری کھری تاجوری کرتا ہے۔

نگاہِ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے! شکارِ مردہ سزا وارشاہباز نہیں
ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومت عشق سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں (۶)

---

(۱) بالِ جبریل ۔ ۷۸۔ غزل۔ (۲) پیامِ مشرق ۔۴۲۔ (۳) پیامِ مشرق ۔ ۱۵۰۔
(۴) زبورِ عجم ۔۳۰۔ (۵) ایضاً۔۵۵۔ (۶) بالِ جبریل ۔ ۳۸۔ غزل ۔

عشق کے بغیر ہر چیز خام اور نامکمل ہے۔ یہاں تک کہ:۔

اگر ہو عشق ، تو ہے کفر بھی مسلمانی　　نہ ہو ، تو مرد مسلماں بھی کافروزندیق! (۱)

مولانا روم فرماتے ہیں:۔

از محبت تلخہا شیریں شود　　از محبت مسہاززیں شود
از محبت دارتختے می شود　　وز محبت بار بختے می شود
از محبت سنگ روغن می شود　　بے محبت موم آہن می شود
از محبت مردہ زندہ می شود　　وزمحبت شاہ بندہ می شود (۲)

اقبال کہتے ہیں:۔

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے　　برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے (۳)
محبت کے شرر سے دل سراپانور ہوتا ہے　　ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے (۴)

محبت سے جذبات میں بلندی پیدا ہوتی ہے یہ بے قدروقیمت کی قیمت بڑھا دیتی ہے۔ بغیر محبت کے زندگی سرتاپا ماتم ہے اس کا سارا کاروبار قبیح و ناپختہ ہے۔

از محبت جذبہ ہا گردد بلند　　ارج می گیرد ازوناارجمند
بے محبت زندگی ماتم ہمہ　　کاروبارش زشت و نامحکم ہمہ (۵)

عشق پتھروں کو بھی گداز کر دیتا ہے۔ یہ ایسی اکسیر ہے کہ ہر طرح کے زنگ اور آلودگی کو اتار کر ''صفائے قلب'' کا ایسا شاندار کارنامہ سرانجام دیتا ہے کہ دل صاف و شفاف شیشے کی طرح انوار حسن مطلق کی تجلیات منعکس کرنے لگتا ہے۔

اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق　　سنگ امروز کو آئینہ فردا کردیں (۶)

اس کے علاوہ علامہ اقبال ایک نظم ''علم وعشق'' میں فلسفے و عشق کے مابین فرق کی وضاحت کرتے ہوئے دونوں کے بارے میں اپنا نقطہ نظر کھل کر بیان کرتے ہیں۔

---

(۱) بالِ جبریل۔ ۳۵۔　(۲) مثنوی مولانا روم۔ دفتر دوم۔ ۱۵۵۔　(۳) بانگِ درا۔ ۶۲۔ ''دل''۔
(۴) ایضاً۔ ۷۴۔ تصویر درد۔　(۵) زبورِ عجم۔ ۱۹۳۔　(۶) بانگِ درا۔ ۱۳۲۔ عبدالقادر کے نام۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن!
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین وظن!
عشق کے ہیں معجزات ، سلطنت و فقرودیں!
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں!
عشق مکان و مکیں! عشق زمان و زمیں!

عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب!

شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفاں حلال ، لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال ، عشق پہ حاصل حرام

علم ہے ابن الکتاب ، عشق ہے ام الکتاب! (۱)

اقبال کے ''ذوق جمال'' میں دل ہر لحظہ خرد سے الجھتا دکھائی دیتا ہے جس سے قدم قدم پر ثابت ہوتا ہے کہ فلسفے کی خرد حسن مطلق سے دور ہی رہتی ہے ۔ اہل جنوں کی جہاں رسائی ہے وہاں فلسفے کی کیا مجال ہے کہ دم بھی مار سکے دنیا کو روشن کرنے کا طریقہ عقل نے عشق سے سیکھا ہے ۔

حکیم مری نواؤں کا راز کیا جانے ۔۔۔ ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں (۲)

عقلے کہ جہاں سوزد، یک جلوۂ بیباکش ۔۔۔ از عشق بیاموزد، آئینِ جہانتابی (۳)

اقبال کہتے ہیں کہ اہل مغرب کی دانش ہو یا اہل مشرق کا فلسفہ یہ سب بت کدے ہیں اور بتوں کے طواف سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔

دانش مغربیاں، فلسفۂ مشرقیاں ۔۔۔ ہمہ بتخانہ و درطوف بتاں چیزے نیست (۴)

اسی طرح پھر کہتے ہیں ، مشرق سے گزر جا اور مغرب سے مسحور نہ ہو ، کیوں کہ ان کے قدیم و جدید علوم کی قیمت دو جو کے برابر بھی نہیں ۔

---

(۱) ضرب کلیم ۔ ۲۰ ۔ ۲۱ ۔ (۲) ارمغان حجاز ۔ ۴۳ ۔ (۳) پیامِ مشرق ۔ ۱۳۳ ۔ (۴) زبورِ عجم ۔ ۱۳۰ ۔

بگذر از خاور و افسونیء افرنگ مشو ۔۔۔ کہ نیرزد بجوے ایں ، ہمہ دیرینہ و نو (۱)

اور مولانا روم فرماتے ہیں:۔

فلسفی را زہرہ نے تا دم زند ۔۔۔ دم زند دستِ حسّش برہم زند (۲)

عشق کی فیض رسانیاں کیا کیا بیان کی جائیں ۔ اقبال کہتے ہیں میرا وجود نامکمل نقش تھا ، نا قابل قبول ، بے قیمت اور ناکارہ ، عشق نے مجھے سان پر چڑھایا تو میں انسان بنا تو میں نے اس جہاں کی اشیاء کا علم حاصل کیا ، عشق ہی کی بدولت میں نے اعصاب فلک کی حرکت دیکھ لی ، مجھے چاند کی رگوں میں گردش خوں دکھائی دینے لگی ۔ گویا عشق ، دوریوں اور پردوں کے پیچھے بھی دیکھ سکتا ہے ۔

بود نقش، ہستیم انگارۂ ۔۔۔ ناقبولے ناکسے ناکارۂ

عشق سوہاں زد مرا آدم شدم ۔۔۔ عالم کیف وکم عالم شدم

حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام ۔۔۔ دررگ مہ گردش خوں دیدہ ام (۳)

انسان جب آتش عشق میں کندن بن جاتا ہے تو حضرت سید علی ہجویری کی طرح اس کی روشن پیشانی سے عشق کے بھید آشکار ہو جاتے ہیں ۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال نے اسرار ورموز میں ''مرو'' کے نوجوان کی حکایت سپرد قلم کی ہے ۔ جو دشمنوں سے خوف زدہ تھا ۔ سید علی ہجویری اسے عشق کے بل بوتے پر اپنے آپ کو مستحکم تر کرنے کی تلقین کرتے ہیں گویا عشق نازک شیشے کو سخت تریں پتھر اور مٹی کو شعلہء طور بنا دیتا ہے عقل اور فلسفے کی مجال نہیں کہ ایسا کر سکے ۔

عاشق و ہم قاصد طیار عشق ۔۔۔ ازجبینش آشکار اسرار عشق

سنگ چوں خود بر خود گمانِ شیشہ کرد ۔۔۔ شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد ۔۔۔ نقد جان خویش با رہزن سپرد

تا کجا خود را شماری ماء و طین ۔۔۔ از گلِ خود شعلۂ طور آفریں (۴)

آبروئے حیات پختگی اور محکمی سے ہے جو عشق کا حاصل ہیں ۔ عشق کی غیر موجودگی میں کمزوری و ناتوانی لاحق ہو جاتی ہے ۔

در صلابت آبروے زندگی است ۔۔۔ ناتوانی، ناکسی، ناپختگی است (۵)

---

(۱) زبور عجم ۔۱۳۰۔ (۲) مثنوی مولانا روم ۔ دفتر اوّل ۔۲۳۴۔ (۳) اسرار ورموز ۔۱۰۔ (۴) اسرار ورموز ۔۵۲۔ (۵) ایضاً ۔۵۷۔

اقبال فرماتے ہیں:۔

گوہرے دریائے قرآں سفتہ ام　　شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام　(۱)

گویا عشق ''صبغۃ اللہ'' ہے۔ عشق اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ یا حسن مطلق کے رنگ میں رنگنے کا نام ہے اور اقبال کے کلام کا بہت بڑا حصہ عشق کی تشریح وتوضیح پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اسرار و رموز میں لکھتے ہیں:۔

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ　　عشق را ناموس و نام ونگ دہ

طبع مسلم از محبت قاہراست　　مسلم ارعاشق نباشد کافراست　(۲)

عشق کیا ہے؟ عاشق کیا ہے؟ یہ دونوں سبھی کچھ ہیں۔ کوئی چیز یا راز عشق و عاشق سے باہر نہیں۔

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق!　　معرکہء وجود میں بدروحنین بھی ہے عشق!　(۳)

درجہاں ہم صلح و ہم پیکار عشق　　آبِ حیواں تیغ جوھر دار عشق　(۴)

سرخ رو عشقِ غیوراز خون او　　شوخیٔ ایں مصرع از مضمونِ او　(۵)

اقبال ہو یا کوئی اور عاشق ، جب عشق سینے میں اہ و فغاں کی بنیاد رکھتا ہے تو اس کی آگ سے سینہ آئینہ بن جاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں ۔میں اپنے سینے کو پھول کی طرح چیر کر اپنے دل کا آئینہ تمھارے سامنے رکھ رہا ہوں ۔حق تعالیٰ نے جب صبح ازل مجھے تخلیق فرمایا تو میرے عود کے ریشمی تاروں میں نالے تڑپنے لگے ۔ایسے نالے جو عشق کے راز کھولنے والے تھے اور جنھیں عشق کی حسرت گفتار کا خوں بہا کہنا چاہئے۔ میرا نالہء عشق خس و خاشاک کو آگ کی فطرت عطاء کرتا ہے اور خاک کو شوخی پروانہ دیتا ہے۔ عشق کے لیے گل لالہ کی طرح کا ایک داغ ہی کافی ہے۔ میرے ایک ہی نالے کے پھول سے اس کا دامن بھر جاتا ہے۔

عشق تاطرح فغاں درسینہ ریخت　　آتش او از دلم آئینہ ریخت

مثل گل از ھم شگافم سینہ را　　پیش تو آویزم ایں آئینہ را

چوں مرا صبح ازل حق آفرید　　نالہ در ابریشمِ عودم تپید

نالہ ء افشا گرِ اسرار عشق　　خونبہائے حسرتِ گفتارِ عشق

---

(۱) پس چہ باید کرد۔ ۱۲۶۔　(۲) اسرار و رموز۔ ۱۵۰۔　(۳) بالِ جبریل۔ ۱۱۲۔ ذوق وشوق۔

(۴) اسرارِ خودی۔ ۸۱۔　(۵) اسرار و رموز۔ ۱۱۰۔

فطرتِ آتش دہد خاشاک را شوخی پروانہ بخشد خاک را
عشق را داغِ مثالِ لالہ بس درگریبانش گل یک نالہ بس (۱)

اور پھر:۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق! عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات (۲)

یہ عشق ہی کا فیض ہے کہ دل اور عقل راہ راست پر رہتے ہیں۔ بغیر عشق کی رہنمائی کے شریعت و دیں تصورات و توہمات کا بت خانہ بن جاتا ہے۔ آج کل یہی حال ہے عشق کی غیر موجودگی میں اہل حرم نے مختلف سومنات تراش رکھے ہیں۔ لیکن کوئی غزنوی نہیں کہ انہیں پاش پاش کر دے۔ حالات اتنے ہی خراب ہیں جتنے معرکہ کربلا کے وقت خراب تھے۔ مگر افسوس قافلہ حجاز میں حضرت حسین علیہ السلام جیسا کوئی عاشق نہیں کہ حالات کا مقابلہ کرے۔

کیا نہیں اور غزنوی کا رگہ حیات میں بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات
قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوے دجلہ و فرات! (۳)
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں تھا براہیم پدر، اور پسر آزر ہیں (۴)

عراق کا ریگستان منتظر ہے، سرزمین حجاز پیاسی ہے۔ حالات کربلا کی طرح دگرگوں ہیں۔ منافقت اور دھوکہ دہی زوروں پر ہے۔ قربانی کی سخت ضرورت ہے۔ اپنے کوفہ و شام کو پھر خونِ حسینؓ سے شاداب کیجئے:۔

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام خون حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را (۵)
می تواں ریخت در آغوش خزاں لالہ و گل خیز و برشاخ کہن خونِ رگ تاک انداز (۶)

اقبال کہتے ہیں ساری کائنات کی بنیاد عشق پر ہے اور عشق آپؐ کے سینہ مبارک سے ملتا ہے۔ عشق کا سرور آپؐ کی شراب کہنہ پر موقوف ہے۔ میں تو جبرئیل علیہ کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا کہ وہ حضورؐ ہی کے آئینے کا ایک جوہر ہیں۔

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تستؐ سرورش ،ازمئے دیرینۂ تست
جز ایں چیزے نمیدانم زجبریل کہ اُویک جوہر از آئینۂ تست! (۷)

---

(۱) رموزِ بیخودی۔۸۲۔۸۳۔ (۲) بالِ جبریل۔۱۱۲۔ ذوق و شوق۔ (۳) بالِ جبریل۔۱۱۲۔ ذوق و شوق۔
(۴) بانگِ درا۔۲۰۰۔ جوابِ شکوہ۔ (۵) زبورِ عجم۔۱۱۔ (۶) زبورِ عجم۔۲۹۔ (۷) ارمغانِ حجاز۔۵۴۔

عشق صدق و صفا ہے، صبر و برداشت ہے، داد شجاعت اور قربانی کا نام ہے۔ عشق وہ اکسیر ہے جو مٹی کو "دل" بنا دیتی ہے۔ سوز عشق کے بغیر سینہ دل زندہ سے محروم رہتا ہے۔

چہ می پرسی میان سینہ دل چیست؟ خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد
دل از ذوق تپش دل بود لیکن چو یک دم از تپش افتاد گل شد (۱)

اقبال نے ہمیشہ دل کو عشق کی نمائندگی دی ہے۔ ان کے نزدیک دل و عشق دونوں ایک ہی ہیں۔ دل یا عشق کی منزل "حسن مطلق" یا "محبوب حقیقی" ہے۔ اس طرح عشق ہی انسان کو غیر اللہ کی غلامی سے رہائی دلا سکتا ہے۔

کنشت و مسجد و بتخانہ و دیر جز ایں مشتِ گلے پیدا نکر دی
زحکم غیر نتواں جز بہ دل رست تو اے غافل دلے پیدا نکر دی (۲)

عشق پیکر خاکی کو ایسا جام جم بنا دیتا ہے جسے جام حق کہنا چاہیئے۔ عشق کی بدولت انسان کا سارا بدن دل بن جاتا ہے جس میں وہ حسن مطلق کی ہر ادا کا دیدار کر سکتا ہے۔ عقل دماغ میں بتکدہ کھڑا کرتی ہے۔ جبکہ عشق اس بت خانے کو حرم بنا دیتا ہے۔

سفالم را مئے او جامِ جم کرد درونِ قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بتخانہء ریخت خلیل عشق دیرم را حرم کرد (۳)

عشق ایک درد نہاں ہے۔ جس پیکر خاک میں یہ پوشیدہ درد نہیں وہ بدن تو رکھتا ہے مگر جان سے، یعنی عشق سے محروم ہے۔ گویا عشق جان یا روح ہے۔ اگر تو جان کی تمنا رکھتا ہے تو ایسی تب و تاب طلب کر جس کی کوئی انتہا نہیں۔

کسے کو درد پنہانے ندارد تنے دارد ولے جانے ندارد
اگر جانے ہوس داری طلب کن تب و تابے کہ پایانے ندارد (۴)

عشق کے طفیل زمیں ہمارے مے خانہء الست کے دروازے کی خاک ہے چرخ گرداں عاشقوں کے پیمانے کی ایک گردش ہے۔ ہم عاشقوں کے سوز و ساز کی بات بہت طویل ہے۔ یہ جہاں تو ہمارے افسانے کی محض تمہید ہے۔

---

(۱) پیام مشرق۔ ۳۶۔ (۲) ایضاً۔ ۳۸۔ (۳) پیام مشرق۔ ۳۹۔ (۴) ایضاً۔ ۵۴۔

زمیں خاکِ درمیخانۂ ما فلک یک گردش پیمانۂ ما
حدیث سوز و سازِ مادراز است جہاں دیباچۂ افسانۂ ما (۱)

وہ دل جو عشق سے بے خوف و خطر اور بے باک ہوگیا ہو۔اس کے لئے شیر بھی پہاڑی بکری ہے۔ جبکہ خوفزدہ دل کے لئے ہرن بھی چیتا ہے۔ اگر تیرے اندر خوف نہیں تو تیرے لئے سمندر بھی صحرا ہے۔ اگر تو خوفزدہ ہے تو اس کی ہر موج میں تجھے مگر مچھ نظر آئے گا۔ گویا کہ عشق انسان کو بے خوف بنا دیتا ہے۔ عشق کے معجزے سے سمندر صحرا بن سکتا ہے۔

دلِ بے باک راضرغام رنگ است دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحراست اگر ترسی بہر موجش نہنگ است (۲)

عشق ہر دل میں نئے رنگ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی یہ پتھر سے موافقت کرتا ہے اور کبھی شیشے سے۔ تجھے اس نے اپنا آپ بھلا دیا اور رونا سکھایا اور مجھے اس نے اپنے آپ سے نزدیک تر کر دیا۔

بہر دل عشق رنگِ تازہ برکرد گہے باسنگ گہ باشیشہ سرکرد
ترا از خود ربود و چشمِ تر داد مرا باخویشتن نزدیک تر کرد (۳)

عشق وہ طاقت ہے جو سمندر کو ایک نہر میں ڈال دیتا ہے۔ اور پہاڑ کا جگر پھاڑ کر دودھ کی نہر نکال دیتا ہے بلکہ عشق سارے پہاڑ ہی کو اٹھا لاتا ہے۔

ریخت ہنر ہائے من بحر بیک نائے آب تیشۂ من آورد از جگرِ خارہ شیر (۴)
تیشہ اگر بسنگ زد ایں چہ مقام گفتگو ست عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کو ہسارراُ! (۵)

عشق بڑی بڑی مشکلیں آسان کر دیتا ہے۔ ''حسن مطلق'' کا عشق سب عقدہ ہائے مشکل کا گرہ کشا ہے۔ اقبال کہتے ہیں عشق نے مجھے ہستی اور عدم سے آگاہ کر دیا۔ اس نے میرے بت خانۂ عقل کو حرم بنا دیا۔ وہ میرے خرمن پر بجلی کی طرح کوندا، اس نے مجھے لذت سوز عطاء کی۔ میں سرمست ہو کر گر پڑا، اور اپنے عکس کی مانند اپنے آپ سے جدا ہوگیا۔ عشق نے میری خاک کو عرش بنا دیا۔ تب میری کشتی ساحل پر جا لگی۔ میں نے منزل مقصود پالی۔ میری بدصورتی ''طوفان جمال'' میں تبدیل ہوگئی۔ گویا کہ حسن سے عشق، عاشق کو بھی حسین بنا دیتا ہے۔ اس سے عاشق سراپا حسن و عشق بن جاتا ہے۔ اسی

(۱) پیامِ مشرق ۔ ۶۹۔ (۲) ایضاً۔ ۵۷۔ (۳) پیامِ مشرق ۔ ۷۸۔ (۴) ایضاً۔ ۸۸۔ (۵) زبورِ عجم ۔ ۵۱۔ یہ شعر'' جاوید نامہ'' بھی ہے۔

لئے میرے پاس حکایت عشق کے علاوہ اور کوئی بات نہیں اور مجھے اس سلسلے میں کسی کی ملامت کی پرواہ بھی نہیں ۔ میں علم و فلسفے کے جلووں سے بے نیاز ہوں ۔ بلکہ عشق میں جلتا ہوں ، روتا ہوں ، تڑپتا ہوں اور گداز ہوتا ہوں۔

عشقِ تو دلم ربود ناگاہ   از کار گرہ کشود ناگاہ
آگاہ زہستی و عدم ساخت   بتخانہء عقل را حرم ساخت
چوں برق بخرمنم گزر کرد   ازلذتِ سوختن خبر کرد
سرمست شدم زپا فتادم   چوں عکس زخود جدا فتادم
خاکم بفرازِ عرش بردی   زاں راز کہ بادلم سپردی
واصل بکنار کشتیم شد   طوفانِ جمال زشتیم شد
جز عشق حکایتے ندارم   پروائے ملامتے ندارم
ازجلوۂ علم بے نیازم
سوزم، گریم، تپم گدازم (۱)

میں یہ پرسرور حرف ، "شعر" گاتا ہوں اور رقص کرتا ہوں ، کہ عشق کی ساری بیتابیوں کے باوجود دل اسی سے سکون پاتا ہے ۔

ایں حرفِ نشاط آوری گویم و می رقصم   از عشق دل آساید ، باایں ہمہ بیتابی (۲)

عشق ندائے معرفت ہے وہ حرفِ دل فروز جو راز ہے بھی اور نہیں بھی ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ شبنم نے اس حرف کو آسمان سے چرایا اور پھول کو بتایا ، پھول سے بلبل نے سنا اور بلبل سے صبا نے پھر صبانے اسے عام کر دیا ۔

آں حرفِ دل فروز کہ راز است وراز نیست   من فاش گویمت کہ شنید ؟ از کجا شنید؟
دزدید از آسماں و بہ گل گفت شبنمش   بلبل زگل شنید وز بلبل صبا شنید (۳)

اگر تو بوالہوس نہیں تو میں تجھے ایک نکتہ بتاتا ہوں ، کہ نالہ ہائے بے اثر سے عشق اور پختہ ہوتا ہے ۔

اگر نہ بوالہوسی باتونکتہ گویم   کہ عشق پختہ ترازنالہ ہائے بے اثراست (۴)

جانتے ہو کہ عشق و ہوسنا کی میں کیا فرق ہے؟ وہ تیشۂ فرہاد ہے اور یہ حیلۂ پرویز۔

(۱) پیامِ مشرق ۔۱۲۲۔"عشق"۔ (۲) ایضاً ۔۱۳۳۔"عشق"۔ (۳) پیامِ مشرق ۔۱۴۔"عشق"۔ (۴) ایضاً ۔۱۲۷۔

در عشق و ہوسنا کی دانی کہ تفاوت چیست؟ آں تیشہء فرہادے، ایں حیلہء پرویزے (۱)

عشق کبھی نیچی اور پست پرواز نہیں کرتا اس لئے کہ:۔

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثل ہوس پرِ شہباز سے ممکن نہیں پروازِ مگس (۲)

عشق کی بات اہل ہوس سے نہیں کی جا سکتی۔ جیسے شعلے کے سوز وگداز کی بات خس و خاشاک سے نہیں کی جا سکتی۔

رمز عشق تو بہ ارباب ہوس نتواں گفت سخن از تاب و تب شعلہ بہ خس نتواں گفت (۳)

اقبال کے مطابق عشق بیش بہا جذبہ ہے لیکن عقل اس کی قیمت، بہت کم لگاتی ہے۔ مگر مجھے آہِ جگر گداز کے عوض تخت جم لینا بھی منظور نہیں۔

گرچہ متاع عشق را، عقل بہائے کم نہد من ندہم بہ تخت جم، آہِ جگر گداز را (۴)

نگاہِ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اڑ جائیں نہ آہِ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی! (۵)

اگر چہ جادو پیشہ عقل نے بھی لشکر تیار کیا ہوا ہے مگر تو آزردہ خاطر نہ ہو کیوں کہ عشق بھی اکیلا نہیں۔

اگر چہ عقلِ فسوں پیشہ لشکرے انگیخت تو دل گرفتہ نہ باشی کہ عشق تنہا نیست (۶)

عشق ایسی آہ ہے جو سوز دروں ہے یہ ایک ایسا آنسو ہے جو جگر کو گداز کر کے کندن بنا دیتا ہے اور عقل اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ اس لئے اقبال عقلِ گرہ کشا کے شیشے کو سنگ پر مارتے ہوئے ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔ جان کا پگھل کر آنکھوں کے راستے باہر آ جانا عشق و محبت کہلاتا ہے۔

آہِ درونہ تاب کو، اشکِ جگر گداز کو شیشہ بسنگ می زنم عقلِ گرہ کشائے را (۷)

اے جان گرفتارم دیدی کہ محبت چیست؟ در سینہ نیاسائی، از دیدہ بروں آئی (۸)

فرشتے دل و عشق کی کمند نگاہ کے اسیر ہیں۔ صوفی بھی عشق کے دلیرانہ انداز کے کشتہ ہیں محمود غزنوی جس نے کئی بت خانے توڑے وہ بھی صنم خانہء دل کا زناری ہے۔ عشق و عاشقی میں دنیاوی درجات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ راہ عشق اختیار کرنے والا اگر تنکے کی طرح کمزور ہے تو پہاڑ کی طرح مضبوط و مستحکم بن جاتا ہے۔ اگر وہ گداگر ہے تو اسے جمشید کا تاج مل سکتا ہے۔ اقلیم عشق میں فلاں ابن فلاں کے بکھیڑے نہیں۔ یہاں کلیم کا ید بیضا حبشی غلام کو عطا کر دیتے ہیں۔ کبھی

(۱) پیام مشرق۔ ۱۶۱۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۱۷۰۔ (۳) زبور عجم۔ ۶۷۔ (۴) پیام مشرق۔ ۱۴۹۔
(۵) بال جبریل۔ ۳۰۔ (۶) پیام مشرق۔ ۱۵۹۔ (۷) ایضاً۔ ۱۶۳۔ (۸) پیام مشرق۔ ۱۶۷۔

پسر سلطان کو بھی بادشاہت نہیں ملتی۔ لیکن راہ عشق میں کنوئیں میں گرے پڑے، یوسفؑ کو حکومت بخش دیتے ہیں۔

صوفی ہلاکِ شیوۂ ترکانہ دل است　　لاہوتیاں اسیرِ کمندِ نگاہِ او
زناریء بتانِ صنم خانہء دل است　　محمودِ غزنوی کہ صنم خانہ ہا شکست　(۱)

کلہء جم بہ گدائے سر راہے بخشند　　سطوت از کوہ ستانند و بکا ہے بخشند
گاہ باشد کہ بزندانیء چاہے بخشند　　گاہ شاہی بجگر گوشہء سلطاں ندہند　(۲)

دنیائے عشق میں نہ کوئی میر ہے نہ سردار۔ بلکہ اقلیم عشق میں صرف خدمت گزاری کا قانون لاگو ہے۔

جہانِ عشق نہ میری نہ سروری داند　　ہمیں بس است کہ آئینِ چاکری داند　(۳)

عشق بے سروسامان ہے۔ مگر اس کے پاس تیشہ ضرور ہے۔ وہ (فرہاد کی طرح) اس سے پہاڑ کا سینہ چیر دیتا ہے۔ مگر پرویز (رقیب) کے خون سے پاک رہتا ہے۔

ندارد عشق سامانے و لیکن تیشہ دارد　　خراشد سینہء کہساروپاک از خونِ پرویزاست　(۴)

عشق کے غم اور اس کی لذت کا اثر دوگونہ ہے۔ یہ کبھی سوز و دردمندی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی مستی و خرابی کی صورت میں۔

غم عشق و لذتِ او اثرِ دوگونہ دارد　　گہے سوزو دردمندی گہے مستی و خرابی　(۵)

عشق ایک فیصلہ ہے ارادہ ہے، عزم صمیم ہے۔ ہمارے عزم کو ایمان سے اور زیادہ پختہ کیجئے۔ کیوں کہ ہم اس معرکہء عشق میں بغیر کسی لشکر یا فوج کے ہیں۔

عزم مارابہ یقیں پختہ ترک سازکہ ما　　اندریں معرکہ بے خیل و سپہ آمدہ ایم　(۶)
فقر جنگاہ میں بے سازو یراق آتا ہے　　ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم!　(۷)

عشق بھی بازار حیات کی متاع ہے۔ کبھی یہ متاع سستی مل جاتی اور کبھی اس کی بہت قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ میں نے آہ و نالہ سے اس لئے کام لیا ہے کہ تو بیدار ہو جائے ورنہ عشق ایسا کام ہے جو آہ و فغاں کے بغیر بھی سرانجام پا سکتا ہے۔

(۱) پیامِ مشرق۔۱۷۲۔　(۲) ایضاً۔۱۷۲۔　(۳) ایضاً۔۱۷۵۔　(۴) زبورِ عجم۔۱۲۔
(۵) زبورِ عجم۔۴۱۔　(۶) ایضاً۔۵۸۔　(۷) ضربِ کلیم۔۳۰۔

عشق ماندِ متاعے است بازارِ حیات گاہ ارزاں بفروشند و گراں نیز کنند
تاتوبیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ! عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند (۱)

عقل ایک عام سی چیز ہے۔ جبکہ عشق خاص الخاص چیز ہے اس لئے عقل کے چراغ کو راستے میں رکھا جا سکتا ہے کہ سب اس سے راہنمائی حاصل کریں۔ لیکن جام عشق میں کسی محرم راز ہی کو شریک کیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ عقل تراشتی ہے۔ عشق اسے لحہ بہ لحہ توڑتا جاتا ہے۔ آگاہ رہ کہ عشق مسلمان ہے اور عقل بت پرست۔

عقل است چراغ تو؟ درراہگذارے نہ عشق است ایاغے تو؟ بابندۂ محرم زن (۲)
زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری است (۳)

خاموشی سے محبت کے الاؤ میں خاکستر ہو جانے کا نام عشق ہے۔ اس لئے فغاں چھوڑ اور دردفراق کو اپنا لے۔ جب تک عشق آہ و فغاں میں مشغول رہتا ہے۔ وہ اپنے جذب سے آگاہ نہیں ہو پاتا۔

لب '' فروبند از فغاں ، درساز بادردِ فراق عشق تا آہے کشداز جذبِ خویش آگاہ نیست (۴)
یہ نکتہ پیردانا نے مجھے خلوت میں سمجھایا کہ ہے ضبط فغاں شیری ، فغاں روباہی وپیشی (۵)
خموش اے دل ! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں (۶)
آہے کہ زدل خیزد ازبہر جگر سوزی است درسینہ شکن اورا آلودہ مکن لب ہا! (۷)

عشق نے ہمارے دل سے تڑپنے کے انداز سیکھے ہیں یہ ہمارے دل ہی کا شرر ہے جو بھڑکا اور پروانے تک پہنچ گیا۔

مجھے پھونکا ہے سوز قطرۂ اشک محبت نے غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں (۸)
عشق انداز تپیدن ازدلِ ما آموخت شرر ماست کہ برجست بہ پروانہ رسید! (۹)

لہٰذا عاشق وہ نہیں جو ہر دم آہ و فغاں میں لگا رہے، عاشق وہ ہے جو دونوں جہانوں کو اپنی ہتھیلی پر اٹھا لے۔ آداب محفل کس طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ جل جاتے ہیں مگر محبوب کے سامنے اف تک نہیں کرتے ، ہم سے یہ بات نہ پوچھیں ہم تو نگاہ سرراہ کے شہید ہیں۔

(۱) زبورِعجم۔۷۱۔ (۲) ایضاً۔۷۵۔ (۳) ایضاً۔۷۶۔ (۴) زبورِعجم۔۸۷۔ (۵) ضرب کلیم۔۱۳۴۔
(۶) بانگِ درا۔۱۰۵۔ (۷) زبورِعجم۔۱۱۷۔ (۸) بانگِ درا۔۱۳۸۔ (۹) زبورِعجم۔۹۰۔

عاشق آں نیست کہ لب گرم فغانے دارد　　عاشق آں است کہ برکف دوجہانے دارد　(۱)

چساں آداب محفل رانگہ دارندوی سوزند　　مپرس از ما شہیدانِ نگاہ برسرا ہے!　(۲)

سوز وگداز کے بغیر کوئی بھی دل دولت عشق سے مالا مال نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ اگر "طورسینا" کا اندروں برق تجلی سے خالی ہو جائے تو میری نظر میں وہ پرکاہ کے برابر بھی نہیں۔

اگر زاں برقِ بے پروادروں او تہی گردد　　بچشمِ کوہ سینائی نیرزدباپرکا ہے　(۳)

زرازی حکمت قرآں بیاموز　　چراغے از چراغ او برافروز

ولے ایں نکتہ را ازمن فراگیر　　کہ نتواں زیستن بے مستی و سوز　(۴)

اے موج شعلہ سینہ بیادصبا کشائے　　شبنم مجو کہ می دہد از سوختن فراغ　(۵)

بسوزد مومن از سوز وجودش　　کشود ہر چہ بستند از کشودش

جلال کبریائی درقیامش　　جلال بندگی اندر تجودش　(۶)

گویا کہ:۔

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو　　کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں　(۷)

بے سوز دل مردان باخدا کی صحبت سے کچھ حاصل نہیں کر پاتا جب تک تانبا تپ نہ رہا ہو اس پر اکسیر اثر نہیں کرتی۔ اگر چہ چاند کو بھی عشق ہی نے سرگرم سفر کیا ہے مگر اس کے سینے میں وہ داغ نہیں جو جگر کو سوختہ کر دے۔

دل بے سوز کم گیرد نصیب از صحبت مردے　　مسِ تابیدۂ آور کہ گیرد درتو اکسیرم　(۸)

ہر چند کہ عشق او آوارۂ راہے کرد　　داغے کہ جگر سوزد درسینہء ماہے نیست　(۹)

عشق دم شمشیر ہے۔ اس کے بغیر نے نوازی بھی نہیں کی جاسکتی۔ بانسری کا سارا سوز وگداز دل عاشق کا سوز ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں اگر تو نے نوازی کو صرف پھونک کی کارفرمائی سمجھتا ہے تو بہت نادان ہے۔ نے نوازی کے لئے سینے کے اندر دم شمشیر کی ضرورت ہے۔

اگر ایں کار را کارِ نفس دانی چہ نادانی　　دمِ شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را!　(۱۰)

(۱) زبورعجم۔۹۱۔ (۲) ایضاً۔۱۰۰۔ (۳) ایضاً۔۱۰۰۔ (۴) ارمغان حجاز۔۶۹۔ (۵) زبورعجم۔۱۳۸۔
(۶) ارمغانِ حجاز۔۱۴۴۔ (۷) بانگِ درا۔۱۰۴۔ (۸) زبورعجم۔۱۰۱۔ (۹) ایضاً۔۱۰۵۔ (۱۰) زبورعجم۔۱۰۴۔

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور مے　　اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے　(۱)

اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ اگر میرے پاس آنا ہے تو آہ سرد اور دل گرم لے کے آ ، اگر تیرے اپنے اندر جذب نہیں ہوگی تو نغمۂ داؤد کسی کام نہیں آئے گا۔

پیشِ من آئی؟ دمِ سردے ، دل گرمے بیار　　جنبش اندر تست، اندر نغمۂ داؤدنے　(۲)

عشق وہ بلند حوصلگی اور ہمت اولی ہے جس کے ذریعے انسان اس گنبد دربستہ سے باہر نکل جائے اور فلک کی چھت سے چاند کا شیشہ اتار لائے۔

عشق ازیں گنبد دربستہ بروں تاختن است　　شیشۂ ماہ زطاقِ فلک انداختن است　(۳)

میں نے عشق و مستی کے فیض سے اپنی فکر کو اس بلندی تک پہنچا دیا ہے کہ اس کی روشنی کے سامنے مہر عالمتاب بھی ہیچ ہے۔ گویا کہ آدم جس کا ضمیر دونوں جہاں کی تزئین کرتا ہے۔ اس کا وجود لذت عشق سے ہے لذت عشق کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں۔

زفیض عشق و مستی بردہ ام اندیشہ را آنجا　　کہ از دنبالہ چشم مہرعالمتاب می گیرم　(۴)

آدم کہ ضمیرِ اونقش دو جہاں ریزد　　بالذت آہے ہست، بے لذت آہے نیست　(۵)

ساقی نے میرے دل بے تاب پر عشق کی مے ناب ڈالی ہے۔ وہ کیمیا ساز ہے۔ اس نے سیماب پر اکسیر ڈال کے اسے زرخالص بنا دیا ہے۔ گویا کہ عشق سے دل کا سیماب کندن بن جاتا ہے۔ بغیر عشق کے دل محض مشت خاک ہے۔

بردلِ بے تابِ من ساقی مۂ نابے زند　　کیمیا ساز است و اکسیرے بہ سیما بے زند　(۶)

اس کے علاوہ اقبال کہتے ہیں عشق یہ ہے کہ ساری صراحئ کائنات ایک دم پی لی جائے۔ جام جہاں نما کی خواہش نہ رکھ، بلکہ وہ قوت مانگ جو معاملات جہاں درست کر دے۔ ویسے بھی دل اگر جذبۂ عشق سے لبریز ہو تو ظاہر کیا زمینوں و آسمانوں کے سربستہ راز بھی اس میں دکھائی دیتے ہیں۔

عشق بسر کشیدن است شیشۂ کائنات را　　جامِ جہاں نما مجو دستِ جہاں کشا طلب　(۷)

قوت عشق عناصر بدن یا سختیٔ اعصاب سے نہیں بلکہ عشق نے جو کی روٹی کھا کر خیبر کو فتح کیا۔ عشق نے چاند کے دو

(۱) ضرب کلیم۔۱۱۳۔ ''سرود''۔　(۲) زبور عجم۔۱۱۰۔　(۳) ایضاً۔۹۹۔　(۴) زبور عجم۔۱۰۱۔
(۵) زبور عجم۔۱۰۵۔　(۶) ایضاً۔۱۱۱۔　(۷) زبور عجم۔۱۱۵۔

ٹکڑے کر دیئے۔ عشق نے بغیر ضرب کے فرعون کا جبڑا توڑ دیا۔ اور جنگ کے بغیر فرعونی لشکر کو شکست دی۔ عشق جان میں اس طرح ہے جیسے آنکھ میں نظر۔ جو گھر کے اندر بھی ہے اور باہر بھی عشق راکھ بھی ہے اور انگارہ بھی۔ اس کا کام دین و دانش سے برتر ہے۔ عشق سلطان (قوت) بھی ہے اور واضح دلیل بھی۔ دونوں جہاں عشق کے زیرنگیں ہیں۔ عشق لازماں ہے۔ مگر ماضی و حال اسی سے ہے۔ عشق لامکاں ہے مگر بلندی و پستی اسی سے ہے۔ مقام دل، عشق سے اور زیادہ آشکارہ ہوتا ہے۔ عشق اس قدیم بت خانہ (دنیا) کی کشش کو باطل بنا دیتا ہے۔ عشاق اپنے آپ کو "حسن مطلق" کے سپرد کر دیتے اور تاویل کرنیوالی عقل کی قربانی دے دیتے ہیں۔

زور عشق از بادوخاک و آب نیست | قوتش از سختیٔ اعصاب نیست
عشق باناں جویں خیبر کشاد | عشق در اندام مہ چاکے نہاد
کلۂ نمرود بے ضر بے شکست | لشکر فرعون بے حر بے شکست
عشق درجاں چوں بچشم اندر نظر | ہم دورن خانہ ہم بیرون در
عشق ہم خاکستر و ہم اخگراست | کار او از دین و دانش برتر است
عشق سلطاں است و برہان مبین | ہر دو عالم عشق را زیر نگیں
لازمان و دوش فردائے ازو | لامکان و زیروبالائے ازو
آشکارا تر مقام دل ازو | جذب ایں دیر کہن باطل ازو
عاشقاں خود رابہ یزداں می دہند | عقل تاویلی بقرباں می دہند (۱)

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنئ پیغام ابھی (۲)

فلسفے وعقل کا کام دیکھنا اور نظریات کا ابطال کرتے رہنا ہے۔ معرفت کا کام حقیقت کو دیکھنا اور اس میں آگے بڑھنا ہے۔ فلسفہ اپنے علم کو ہنر (استدلال) کے ترازو میں تولتا ہے۔ اور عرفان اپنی کیفیات کا اندازہ نگاہ سے کرتا ہے۔

(۱) جاوید نامہ۔۲۲۔۲۳۔ (۲) بانگ درا۔ ۲۷۹۔

کار حکمت دیدن و فرسودن است　　کار عرفاں دیدن و افزودن است!
آں بسنجد درترازوے ہنر　　ایں بسنجد درترازوے نظر! (۱)

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا　　نہ ہونگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے! (۲)

محبت کیا ہے؟ تاثیر نگاہ ـ یہ تیر نگاہ کا لگایا ہوا کیسا شریں زخم ہے ـ دل کے شکار کو جا رہا ہے تو ترکش پھینک دے کہ دل کا شکار تیرو کماں سے نہیں بلکہ ناوک انداز نگاہ سے کھیلا جاتا ہے ـ

محبت چیست ؟ تاثیر نگاہیست　　چہ شیریں زخمے از تیرنگاہیست
بصید دل روی؟ ترکش بنِد از　　کہ ایں نخچیر نخچیر نگاہیست (۳)

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیروبم　　عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق　　شاخ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم (۴)

گویا کہ عشق ہی سے زندگی رواں دواں اور قائم و دائم ہے ـ تیری عقل حاصل حیات جبکہ تیرا عشق سرکائنات ہے ـ عشق کے بل بوتے پر انسان اس عالم چارسو سے دوسرے عالم کی طرف پرواز کرتا ہے ـ اور یہ پرواز اسے مبارک ہو ـ

عقلِ تو حاصل حیات ، عشق تو سر کائنات　　پیکر خاک ! خوش بیا ایں سوے عالمِ جہات (۵)

جاوید نامہ میں ہندی رشی کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ، زندہ رود یعنی اقبال عقل ، قلب و عشق ، فن ، روح ، آدم اور عالم کے بارے میں یوں گویا ہوتے ہیں ـ

گفت مرگ عقل ؟ گفتم ترک فکر　　گفت مرگ قلب ؟ گفتم ترک ذکر
گفت تن؟ گفتم کہ زاد از گردرہ　　گفت جاں؟ گفتم کہ رمز لا الہٰ
گفت آدم؟ گفتم از اسرارِ اُوست　　گفت عالم؟ گفتم اوخود روبروست (۶)

خون میں تڑپنے ہی سے عشق کی آبرو ہے اور دارورسن کی عیدیں ہیں ـ عشق خلوت میں ہو تو وہ کلیم اللہ ، جب وہ جلوت میں آتا ہے تو بادشاہت ہے ـ کیا کہا پیغمبری دردسر ہے؟ عشق جب کامل ہوتا ہے ـ تو شخصیت ساز بن جاتا ہے ـ پیغمبری عشق ہی کی انتہائی صورت ہے ـ

(۱) جاوید نامہ ـ ۱۱۵ـ　(۲) بال جبریل ـ ۴۸ـ　(۳) ارمغان حجاز ـ ۱۴۰ـ
(۴) بال جبریل ـ ۳۲ـ　(۵) جاوید نامہ ـ ۳۷ـ　(۶) ایضاً ـ ۳۷ـ

عشق را درخوں تپیدن آبروست   ارّہ و چوب و رسن عیدین اوست!
عشق درخلوت کلیم اللّٰہی است   چوں بجلوت می خرامد شاہی است!
گفتہء پیغمبری درد سر است   عشق چوں کامل شود آدم است! (۱)

اور دل کو اگر اللہ تعالیٰ سے لگایا جائے تو یہ پیغمبری ہے اگر دل اللہ تعالیٰ سے بیگانہ رہے تو یہی کافری ہے۔ اگر تو علم کو سوز عشق کے بغیر پڑھے تو شر ہے۔ ایسے علم کا نور بحروبر کی تاریکی ہے۔ اس علم کے غازے سے دنیا اندھیر نگری بن جاتی ہے۔ اس کی بہار شجر زندگی کے پتے گرا دیتی ہے۔ بحر، صحرا، کوہسار، باغ و راغ سب ایسے علم کے بموں سے داغ داغ ہو جاتے ہیں۔ اسی علم نے فرنگیوں کے سینے میں آگ بھڑکائی ہے۔ اور اسی سے انہیں شبخوں اور یلغار کی لذت حاصل ہے۔ یہ علم زمانے کو پیچھے لے جاتا ہے اور اقوام سے ان کا سرمایہ چھین لیتا ہے۔ اس علم سے حاصل شدہ قوت ابلیس کی مددگار بنتی ہے۔ اور پھر نار یعنی ابلیس کی صحبت سے علم کا نور بھی نار بن جاتا ہے۔ بغیر عشق کے علم کا تعلق شیاطین سے ہے اور باعشق علم کا تعلق عارفان الٰہی سے ہے۔ عشق الٰہی کے بغیر علم وحکمت مردہ ہے اور عقل ایسا تیر ہے جو نشانے سے دور۔

دل اگر بندد بحق پیغمبری است   ورزحق بیگانہ گردد کافری است!
علم را بے سوزِ دل خوانی شراست   نور او تاریکیء بحرو براست!
عالمے از غازِ او کور وکبود   فرودینش برگ ریز ہست وبود
بحرودشت و کوہسار و باغ وراغ   از بم طیارۂ او داغ داغ!
سینہء افرنگ را نارے ازوست   لذتِ شبخون و یلغارے ازوست
سیرواژونے دہد ایام را   می برد سرمایہء اقوام را!
قوتش ابلیس را یارے شود   نور ناراز صحبتِ نارے شود
علم بے عشق است از طاغوتیاں   علم باعشق است از لاہوتیاں!
بے محبت علم و حکمت مردۂ   عقل تیرے برہدف ناخوردۂ (۲)

دونوں جہانوں میں ہر جگہ عشق ہی کے آثار ہیں۔ آدم کا بیٹا عشق کے راز میں سے ایک راز ہے۔ سرعشق کا تعلق

(۱) جاوید نامہ۔۵۰۔۵۱۔ "زرتشت"۔   (۲) جاوید نامہ۔۷۳۔۷۵۔

ماؤں کے رحم سے نہیں ۔ نہ اس کی نسبت خاندان یا ملک سے ہے ۔

درد وعالم ہر کجا آثار عشق ابن آدم سرے از اسرار عشق!

سر عشق از عالم ارحام نیست اوزسام و حام وروم و شام نیست (۱)

شیشہء دہر میں مانندِمئے ناب ہے عشق روحِ خورشید ہے، خون رگ مہتاب ہے عشق (۲)

جہاں تک علم کا تعلق ہے تو اقبال اس مادر پدر آزاد علم سے مراد سائنس لیتے ہیں ۔ جس کے غلط استعمال کے نتیجے میں آج ساری انسانیت خون میں لت پت پڑی سسکیاں بھر رہی ہے ۔ اس علم نے دنیا کو اشکوں آہوں کی ایک منڈلی بنا رکھا ہے ۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ وہ حکمت یعنی سائنس جس نے اشیاء کی ماہیت کا عقدہ وا کیا ۔ تجھے اس نے چنگیزی سوچ کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا ۔

حکمتے کو عقدۂ اشیاء کشاد باتو غیر از فکر چنگیزی نداد (۳)

جس کے نتیجے میں :۔

جاں لاغر وتن فربہ وملبوس بدن زیب دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک (۴)

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جانِ پاک جسے یہ رنگ ونم ، یہ لہو ، آب و نان کی ہے بیشی (۵)

علم وعشق کے اس تعلق اور بے تعلقی کے نکتے کو مولانا روم نے بھی کیا خوب بیان کیا ہے ۔ اقبال پیرروی سے سوال کرتے ہیں:۔

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں علم حاضر سے ہے دیں زار و زبو ں (۶)

رومیؒ جواب دیتے ہیں ۔

علم رابرتن زنی مارے بود! علم رابردل زنی یارے بود!

اور اقبال کہتے ہیں :۔

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں جس علم کا حاصل ہے دوکف جو (۷)

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت فیصلہ تیرا ترے ہاتھ میں ہے دل یا شکم (۸)

(۱) جاوید نامہ ۔ ۶۸ ۔ محکمات عالم قرآنی ۔ خلافتِ آدم ۔ (۲) بانگِ درا ۔ ۱۱۷ ۔ (۳) جاوید نامہ ۔ ۵۳ ۔ (۴) بالِ جبریل ۔ ۱۶۲ ۔

(۵) بالِ جبریل ۔ ۳۰ ۔ (۶) ایضاً ۔ ۱۳۴ ۔ پیرومرید ۔ (۷) ضربِ کلیم ۔ ۱۶۷ ۔ (۸) بالِ جبریل ۔ ۳۳ ۔

اے طاہر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی   جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی   (۱)

اقبال مزید کہتے ہیں:۔ وہ خوبصورت مسلم نوجوان جو رنگین کلاہ پہنے تھا۔ جس کی نگاہ شیروں کی مانند بے باک تھی۔ اس نے رزق کی خاطر سکول سے بھیڑوں کا علم سیکھا۔ مگر اسے گھاس کی پتی بھی میسر نہ ہو سکی۔

جوانے خوش گلے رنگیں کلا ہے   نگاہِ او چو شیراں بے پناہے

بہ مکتب علمِ میشی رابیا موخت   میسر نایدش برگ گیا ہے   (۲)

چنانچہ ردعمل کے طور پر اقبال کہتے ہیں کہ خدایا وہ درویش خوش رہے۔ جس کے دم (تعلیم) سے ہمارے دل غنچے کی مانند کھل اٹھیں۔ اس نے ہمارے سکول کے بچوں کو یہ نصیحت کی۔ کہ روٹی کی خاطر کسی کی ذہنی غلامی میں نہ پھنسنا۔

خدایا وقتے آں درویش خوش باش   کہ دلہا از دمش چوں غنچہ بکشاد

بہ طفلِ مکتب ما ایں دعا گفت   پے نانے بہ بند کس میفتاد!   (۳)

چنانچہ اقبال ہمیشہ "تن" کی بجائے "من" کی دنیا پر توجہ دیتے ہوئے یہ پیغام دیتے ہیں۔ کہ من کی دنیا روشن ہو تو ظاہر و باطن دونوں منور ہو جاتے ہیں۔

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق   تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن   (۴)

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک   اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم   (۵)

جہاں تک علم کا تعلق ہے تو اقبال کے مطابق علم اشیائے کائنات نے ہماری خاک کو کیمیا بنا دیا۔ مگر افسوس کہ اہل فرنگ پر اس کی تاثیر مختلف انداز میں ظاہر ہوئی۔ اس کے عقل و فکر نے خوب و ناخوب کا امتیاز چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھ بے نم ہوگئی اور دل پتھر کی طرح سخت ہوگیا۔ اس کی وجہ سے علم آبادی و بیابان میں رسوا ہوگیا ہے۔ اس کی صحبت میں رہ کر ملکوتی علوم ابلیسی بن چکے ہیں۔ افرنگیوں کی دانش کندھے پر تلوار رکھے، انسان کی ہلاکت کے در پے ہے۔ یہ جہاں جو خیر و شر کا میدان جنگ ہے۔ اس کے اندر علم و حکمت کی مستی رزیلوں کے لئے سازگار نہیں۔ اس لادین تہذیب کے جادو کو توڑ دینا چاہیئے۔ فرنگ کے بدن میں مشرق کی روح پھونکنی چاہیئے۔ تاکہ قفل معنی (حقیقت) کے لئے کلید ثابت ہو۔ عقل، دل و عشق کے حکم کے اندر رہے تو وہ خدائی قوت ہے اگر دل سے آزاد ہو جائے تو وہ شیطانی قوت بن جاتی ہے اور دیو بے زنجیر کی

(۱) بالِ جبریل۔ ۵۶۔ (۲) ارمغانِ حجاز۔ ۱۰۲۔ (۳) ایضاً۔ ۱۲۱۔ (۴) بالِ جبریل۔ ۳۱۔ (۵) ایضاً۔ ۳۳۔

طرح تباہی و بربادی کا سبب بنتی ہے۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

"علم" اشیاء خاکِ مارا کیمیاست آہ! در افرنگ تاثیرش جداست
عقل و فکرش بے عیار خوب وزشت چشم او بے نم، دل اوسنگ و خشت
علم ازو رسواست اندر شہر و دشت جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
دانش افرنگیاں تیغے بدوش درہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش
باخساں اندر جہانِ خیر و شر درنسازد مستیٔ علم و ہنر
اے کہ جاں راباز می دانی زتن سحر ایں تہذیب لا دینے شکن
روح شرق اندر تنش بایدومید تا بگردد قفلِ معنی راکلید
عقل اندر حکم دل یزدانی است
چوں زدل آزاد شد شیطانی است (۱)

عشق واخلاق سے عاری علم کی بناء پر یورپ کی شریعت نے متفقہ طور پر برہ کو بھیڑیوں کے لئے حلال قرار دیا ہے۔ دنیا میں نیا قانون جاری کرنا چاہیئے۔ان کفن چوروں سے بہتری کی کوئی امید نہیں۔ جنیوا (جمعیت اقوام کا مرکز) میں سوائے مکروفن کے اور کیا ہے۔اس بھیڑ کو تو شکار کر لے اور اسے میں کرلوں۔

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش!
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش! (۲)

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار جن کی رو باہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ! (۳)

ایسی گندی اور بے درد سیاست ہی کی روشنی میں اقبال ابلیس کی زبانی حضور حق میں یہ عرضداشت پیش کراتے ہیں کہ جس کے ذریعے شیطان بھی ارباب سیاست سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے۔

(۱) پس چہ باید کرد۔۴۴۔ (۲) ضرب کلیم۔۱۴۵۔ (۳) بال جبریل۔۱۶۷۔

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست　　باقی نہیں اب میری ضرورت تہء افلاک! (۱)

اور پھر:۔

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود فقط ملت آدم!

مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام　　جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟ (۲)

کمزور اقوام کے لئے اقوام متحدہ کا ظالمانہ رویہ انتہائی شرمناک ہے۔ ان کی دوغلی پالیسی اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کے پیش نظر اقبال اقوام متحدہ سے سخت نالاں ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ جمعیت الاقوام (یو این او) کے نام سے دنیا کے بہی خواہوں نے نئی روش کی بنیاد رکھی ہے۔ تاکہ اس بزم کہن، دنیا سے جنگ کا چلن ختم ہو۔ مگر میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ چند کفن چوروں نے آپس میں قبریں بانٹنے کے لئے ایک انجمن بنائی ہے۔

برفتد تاروشِ رزم دریں بزم کہن　　دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند　　بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند (۳)

چنانچہ ایسے حالات و واقعات اور ماحول میں پروان چڑھنے والی مغربی تہذیب کے بارے میں علامہ محمد اقبال، بجا فرماتے ہیں کہ:۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی　　جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا (۴)

روحانیت سے عاری آغوش اور عقلیت کا پروردہ علم حرام و حلال کی تمیز مٹا دیتا ہے۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں جب تک تو حلال کمائی کا نکتہ نہ سمجھے، رشوت، ماردھاڑ اور غبن جیسے کریہہ افعال کی بدولت تیری زندگی معاشرے کے لئے وبال جان ہے۔ افسوس یورپ اس مقام سے آگاہی نہیں رکھتا۔ اس کی آنکھ اللہ تعالی کے نور سے نہیں دیکھتی۔ وہ حلال و حرام میں امتیاز نہیں کرتا۔ (آج کل پاکستانی رشوت خوری میں دنیا بھر کے اندر اول درجہ رکھتے ہیں) اس کا فلسفہ خام ہے۔ اور اس کا کام نامکمل۔ ایک قوم دوسری قوم پر پلتی ہے۔ دانہ یہ کاشت کرتی ہے اور حاصل وہ لے جاتی ہے۔ غریبوں سے روٹی چھین لینا اور ان کے بدن سے جان نکال لینا ان کی ڈپلومیسی ہے۔ نئی تہذیب کا شیوہ انسانوں کی چیر پھاڑ ہے۔ اور یہ کام وہ تجارت کے پردے میں سرانجام دیتے ہیں۔ ادھر خواب غفلت میں غرق دل بستہ و پرشکستہ مسلمان اپنی غریبی و مسکینی کو تقدیر کے سر

(۱) بال جبریل۔۱۶۳۔ ابلیس کی عرضداشت۔ (۲) ضرب کلیم۔۵۸۔ (۳) پیام مشرق۔۱۹۲۔ (۴) بانگ درا۔۱۴۱۔ غزل۔

تھوپ رہا ہے۔

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی؟ عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ (۱)

یہ بنک جو یہودیوں کی عیار سوچ کا نتیجہ ہیں۔ انسان کے سینے سے اللہ تعالیٰ کا نور نکال لیتے ہیں۔ جب تک یہ سودی نظام تہ و بالا نہ ہو۔ دانش، تہذیب اور دین کی باتیں بے سود ہیں۔

تاندانی نکتۂ اکلِ حلال برجماعت زیستن گرددوبال

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست چشمِ او یَنظُر بِنُورِ اللہ نیست

او نداند از حلال و از حرام حکمتش خام است و کارش ناتمام

امتے بر امتے دیگر چرد دانہ ایں می کارد، آں حاصل برد

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است از تن شاں جاں ربودن حکمت است

شیوہ تہذیب نو آدم دری است پردۂ آدم دری سوداگری است

ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود نورِ حق از سینۂ آدم ربود

تاتہ و بالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دیں سودائے خام (۲)

یہی وجہ ہے کہ اس شتر بے مہار علم پر اقبال اپنی نظم "لینن خدا کے حضور میں" کڑی تنقید کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسا علم اور اس کے نتائج انسانیت کے لئے زہر قاتل سے کم نہیں۔ ظلم و ستم، زیادتی و ناانصافی، زبردستی، چوری و سینہ زوری، دھونس دھاندلی، بیکاری، شراب نوشی، عریانی و افلاس اور ہمدردی و غمگساری کا کچومر ہوسناک علم کے آتش فشاں کا لاوا ہے۔ جس نے انسانیت کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے:۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم ہنر ہے حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات!

رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات!

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات!

(۱) ارمغان حجاز۔ ۴۴۔ ۴۵۔

(۲) پس چہ باید کرد۔ ۳۰۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت! | پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات!
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس | کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم | حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات!
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت | احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سر شام | یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات!

اور صاف ظاہر ہے کہ ایسے دگرگوں حالات میں:۔

تو قادر مطلق ہے مگر تیرے جہاں میں | ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات (۱)

عشق و دین سے بے بہرہ علم کے نتیجے میں:۔

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہہ ومیر وپیر | تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی!
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست | بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی!
دانش و دین و علم و فن بندگیء ہوس تمام | عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی!

جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگیء نیام ابھی! (۲)

راہ راست سے بھٹکے ہوئے علم کے گھناؤنے نتائج کا مقابلہ کرنے کے لئے اقبال ''جذبہ عشق'' اور سوز یقین سے لیس ہو کر قوت ارادی کے ساتھ کمربستہ ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ چنانچہ '' فرمان خدا'' کی صورت میں اقبال پکار اٹھتے ہیں:۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو | کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے | کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیء جمہور کا آتا ہے زمانہ | جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی | اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے | پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

(۱) بال جبریل۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ لینن خدا کے حضور میں۔ (۲) ایضاً۔ ۱۰۹۔ فرشتوں کا گیت۔

حق را بسجودے، صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو!

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو! (۱)

ایسے میں:۔

یہ علم وحکمت کی مہرہ بازی یہ بحث وتکرار کی نمائش — نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش

جہان مغرب کے بتکدوں میں، کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہیں عقل عیار کی نمائش (۲)

اقبال کے نزدیک بجاء طور پر نشہ قوت انتہائی خطرناک ہے۔ دین وعشق اور اخلاقی اقدار ہی اس کا تریاک ہوتے ہوئے اسے حد اعتدال میں رکھ سکتی ہیں۔

اسکندر وچنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک!
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے — صاحب نظراں! نشہ قوت ہے خطرناک!
اس سیل سبک سیرو زمیں گیر کے آگے — عقل ونظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر — ہودیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک! (۳)

لا دین علم کی بنا پر سیاست افرنگ یہاں تک آگے بڑھتی جا رہی ہے کہ:۔

تری حریف ہے یا رب سیاست افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس!
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس! (۴)

تمام اسلام دشمن طاقتیں فرزندان ابلیس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ابلیس پدر کہنہ سال اپنے فرزندوں سے کہتا ہے کہ فرزندان توحید کو ہر جگہ سے نکال دو، بلکہ انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ روح محمدؐ سے انہیں محروم کر دو۔ اسلامی روایات وعقائد سے دور کردو۔ اقبال انہیں ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرتے ہوئے، ان میں ولولہ انگیز جذبات پھونک کر ان کا لہو گرماتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایسے "دیدہ ور" کو بھی ان سے جدا کر دیا جائے۔

(۱) بال جبریل۔۱۰۹۔۱۱۰۔ (۲) ضرب کلیم۔۱۳۷۔ (۳) ضرب کلیم۔۲۹۔ "قوت اور دین"۔ (۴) ایضاً۔۱۴۲۔۱۴۳۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو!
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو!
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو! (۱)

ہر عمل کا ایک ردِ عمل ہوتا ہے۔ جب طاقت ہی معیار ٹھہری تو مسولینی اٹھا اور وہی کرنا شروع کیا۔ جو اس کے حریف کر رہے تھے۔ اقبال نے یہ حقائق مسولینی کی زبانی یوں نظم کئے ہیں:۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم؟ بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج
مرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں راجدھانی ہے، مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آلِ سیزر چوب نے کی آبیاری میں رہے اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج!
تم نے لوٹے بے نوا صحرانشینوں کے خیام تم نے لوٹی کشتِ دہقاں! تم نے لوٹے تخت تاج!
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہو آج! (۲)

عشق و دین سے عاری علم کے اثرات ہیں کہ نیکی و بدی اور خوب و ناخوب کا معیار بھی الٹ ہو کر رہ گیا ہے۔

جہاں قمار نہیں، زن تنک لباس نہیں جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مئے خواری
جسور و زیرک و پردم ہے، بچۂ بدوی نہیں ہے فیضِ مکاتب کا چشمہ جاری
نظر وران فرنگی کا ہے یہی فتوٰی وہ سرزمیں مدنیت سے ہے ابھی عاری! (۳)

عشق کا سوز و ساز اور درد و داغ ایشیا سے ہے۔ یہ شراب بھی ایشیاء سے ملی اور اسکا جام بھی۔ سارے انبیاء ایشیاء میں پیدا ہوئے۔

(۱) ضربِ کلیم۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام''۔
(۲) ضربِ کلیم۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ''مسولینی''۔ (۳) ایضاً۔ ۱۵۲۔

غربیاں را زیرکی ساز حیات   شرقیاں را عشق راز کائنات (۱)
شرق حق را دید و عالم را ندید   غرب در عالم خزید ،از حق رمید (۲)

ہم نے عشق کو دلبری اور شخصیت سازی کا انداز سکھایا۔

شرع یورپ بے نزاعِ قیل و قال   برہ راکرد است برگگاں حلال
نقش نو اندر جہاں بایدنہاد   از کفن دزداں ، چہ امید کشاد؟
درجنیوا چیست غیراز مکروفن   صیدِ تو ایں میش و آں نخچیرمن!
سوزوساز و درد و داغ از آسیاست   ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست
عشق را ما دلبری آموختیم   شیوۂ آدم گری آموختیم (۳)

اس لئے اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ اے ایشیاء! اے تہذیب و دین کی دولت کے امین اپنی آستین سے یدبیضا نکال۔ اٹھ اور قوموں کے معاملات کو سلجھا۔ فرنگیوں کے نشے کا بوجھ اپنے سر سے اتار پھینک ۔ تو فرنگیوں کو بھی سمجھتا ہے اور ان کے کام کو بھی کب تک فرنگ کے زنار میں قید رہے گا؟ زخم بھی اسی کی وجہ سے ،نشتر بھی اسی کا ہے ، پھر وہی اس زخم کو سینے والا بھی ہے ہم ہیں اور جوئے خون ، اور اسی سے زخموں کے سینے کی امید رکھے ہوئے ہیں۔

میر کیا سادا ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب   اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں   میرتقی میر
وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا (۴)

اس کے ریشم سے تیرا کھدر بہتر ہے ۔ اس کے کارخانوں کی طرف توجہ نہ دے ۔ موسم سرما میں بھی اس سے گرم کپڑے نہ خرید۔

تو اگر خود دار ہے منت کش ساقی نہ ہو   عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر (۵)
کانپتا ہے دل ترا اندیشہء طوفاں سے کیا   ناخدا تو ، بحر تو ، کشتی بھی تو ، ساحل بھی تو (۶)

اسکی مشینوں کی گردش میں کئی اموات پوشیدہ ہیں۔اپنا بوریا چھوڑ کر اس کا قالین نہ لے۔اسکے وزیر کے عوض اپنا پیادہ نہ دے۔

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں   سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر (۷)

(۱) جاوید نامہ ۔ ۶۵۔   (۲) جاوید نامہ ۔ ۳۶۔ (۳) پس چہ باید کرد ۔ ۴۵۔   (۴) بانگِ درا ۔ ۱۸۷۔ شمع اور شاعر۔
(۵) ایضاً ۔ ۱۹۱۔   (۶) بانگِ درا ۔ ۱۹۲۔ (۷) بالِ جبریل ۔ ۱۴۷۔

اس لئے کہ:۔

بیخبر ! تو جوہر آئینۂ ایام ہے　　تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے! (۱)

اس کا موتی عیب دار اور لکیردار ہے۔ یہ سوداگر اپنی کستوری کتے کی ناف سے حاصل کرتا ہے۔ وہ ہنس ہنس کے اور میٹھی زبان سے سودا بیچتا ہے۔ ہم بچوں کی طرح اور وہ مٹھائی بیچنے والے کی طرح:۔

مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری　　اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش (۲)

فرنگ نے ہمیں خرد چمکانے والی شراب کا جو پیالہ دیا ہے۔ ہے تو آفتاب مگر رات کی تاریکی کو دور نہیں کرسکتا۔

قدح خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا　　ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحرندارد (۳)

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں　　کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی (۴)

تیری آنکھ نے اس کے ظاہر سے دھوکا کھایا ہے اور اس کی ظاہری چمک دمک نے تجھے اپنے مقام سے گرا دیا ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی　　یہ صناّعی مگر جھوٹے نگوں کی مینا کاری ہے (۵)

مجھے تہذیب حاضر نے عطاء کی ہے وہ آزادی　　کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری!

تو اے مولاے یثرب آپ میری چارہ سازی کر　　مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری! (۶)

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں　　چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش (۷)

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے　　کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی (۸)

چیتے کا جگر چاہیئے، شاہیں کا تجسس　　جی سکتے ہیں بے روشنیء دانش و فرہنگ! (۹)

مغربی تہذیب کا تاریک اندروں ظاہر کرتے ہوئے اقبال مزید کہتے ہیں کہ:۔

فساد قلب نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف!

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید　　ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف (۱۰)

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر　　یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور! (۱۱)

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں　　نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے (۱۲)

(۱) بانگ درا۔۱۹۲۔شمع اور شاعر۔ (۲) ضرب کلیم۔۱۷۳۔ (۳) زبور عجم۔۵۷۔ (۴) بال جبریل۔۱۳۰۔ (۵) بانگِ درا۔۲۷۳۔طلوع اسلام۔ (۶) بال جبریل۔۳۸۔ (۷) ایضاً۔۷۵۔ (۸) ایضاً۔۵۸۔ (۹) بال جبریل۔۷۶۔ (۱۰) ضرب کلیم۔۷۱۔ (۱۱) ضرب کلیم۔۷۰۔ (۱۲) بانگِ درا۔۲۹۰۔

اقبال کہتے ہیں کیا آپ تہذیب فرنگ کو پہچانتے ہیں   ان کی دنیا میں رنگوں کے سینکڑوں فردوس ہیں ۔ اس تہذیب کے جلوؤں نے کئی خاندان اور کئی شاخیں، پتے اور آشیانے جلا دیے ہیں ۔ اس تہذیب کا ظاہر چمکدار اور دلفریب ہے مگر اس کا اندروں کمزور اور نظاروں پر فریفتہ ہے ۔ آنکھ ان کے جلوے دیکھتی ہے اور دل اندر سے لرزتا ہے اور انسان اس بت خانہ کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے ۔

می شناسی چیست تہذیب فرنگ   درجہانِ او دو صدفردوس رنگ!
جلوہ ہائش خانما نہا سوختہ   شاخ و برگ و آشیانہا سوختہ!
ظاہرش تابندہ و گیرندہ ایست   دل ضعیف است و نگہ رابندہ ایست!
چشم بیند دل بلغزد اندروں   پیش ایں بت خانہ افتد سرنگوں! (۱)

اقبال کا دعویٰ ہے کہ اشیاء کی ماہیت جاننے کا آغاز فرنگیوں سے نہیں ہوا ۔ اس کی بنیاد صرف نئی دریافت کی لذت ہے ۔ اگر تو غور سے دیکھے تو یہ چیز مسلمانوں کی پیدا کردہ ہے ۔ یہ وہ موتی ہے جو ہمارے ہاتھ سے گرا ۔ جب عربوں نے یورپ کے اندر کشور کشائی کی ۔ تو انہوں نے وہاں نئے انداز سے علم و حکمت کی بنیاد رکھی ۔ دانہ ان صحرانشینوں نے بویا اور فصل کا حاصل افرنگیوں نے اکٹھا کیا ۔ اس پری کا تعلق ہمارے آباواجداد کے شیشے سے ہے ۔ تو اسے دوبارہ شکار کر کیوں کہ یہ ہمارے کوہ قاف کی پری ہے ۔ مگر فرنگیوں کی لادین تہذیب سے بچ ۔ کیوں کہ وہ اہل حق کے ساتھ دشمنی رکھتی ہے ۔ اس فتنہ پرداز، مغربی تہذیب نے کئی فتنے پیدا کئے ہیں ۔ یہ حرم میں لات وعزیٰ کو دوبارہ لے آئی ہے ۔ اس کے جادو سے دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں ۔ اس کی بے آبی سے روح پیاسی مر جاتی ہے ۔ یہ دل سے بے تابی کی لذت چھین لیتی ہے ۔ بلکہ مٹی کے اس بدن سے دل کو نکال ہی لیتی ہے ۔ یہ کہنہ مشق چور ہے ۔ برملا غارتگری کرتی ہے ۔ یہ گل لالہ کا داغ بھی چرا لیتی ہے ۔ اور وہ کہتا رہ جاتا ہے کہ میرا داغ کہاں گیا ۔

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست   اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است   ایں گہر از دست ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پرکشاد   علم و حکمت را بنا دیگر نہاد

(۱) جاوید نامہ ۔ ۱۷۹ ۔

دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند ۔۔۔ حاصلش افرنگیاں برداشتند
ایں پری از شیشہ اسلاف ماست ۔۔۔ باز صیدش کن کہ او از قاف ماست
لیکن از تہذیب لا دینے گریز ۔۔۔ زاں کہ او بااہل حق دارد ستیز
فتنہ ہا ایں فتنہ پرداز آورد ۔۔۔ لات و عزیٰ درحرم باز آورد
از فسونش دیدۂ دل نابصیر ۔۔۔ روح از بے آبیء او تشنہ میر!
لذت بیتابی از دل می برد ۔۔۔ بلکہ دل زیں پیکر گل می برد
کہنہ دزدے غارت او برملاست ۔۔۔ لالہ می نالد کہ داغ من کجاست! (۱)

لیکن افسوس اس دریا پر جس کی موجوں میں جوش وخروش نہ رہا۔ جس نے اپنے ہی موتی کوغواصوں سے خریدا۔

اے امین دولت تہذیب و دین ۔۔۔ آں یدبیضا برآر از آستیں
خیز و از کارِ امم بکشا گرہ ۔۔۔ نشہء افرنگ را از سر بنہ
دانی از افرنگ و از کار فرنگ ۔۔۔ تا کجا درقیدِ زنارِ فرنگ؟
زخم ازو ، نشتر ازو ، سوزن ازو، ۔۔۔ ماوجوے خون و امید رفو!
گوتو میدانی حسابش را درست ۔۔۔ از حریرش نرم تر کر پاس تست
بے نیاز از کارگاہ او گذر ۔۔۔ درزمستاں پوستین او مخر
کشتن بے حرب و ضرب آئینِ اوست ۔۔۔ مرگہادرگردشِ ماشین اوست (۲)
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن ۔۔۔ افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش (۳)

چنانچہ اقبال مزید کیا خوب فرماتے ہیں کہ:۔

سوال مے نہ کروں ساقی فرنگ سے میں ۔۔۔ کہ یہ طریقہء رندانِ پاکباز نہیں (۴)

اس لئے کہ:۔

اعجاز ہے کسی کا یاگردش زمانہ ۔۔۔ ٹوٹا ہے ایشیاء میں سحر فرنگیانہ (۵)

(۱) مثنوی مسافر۔۸۴۔(۲) پس چہ باید کرد۔۴۶۔ (۳) ضرب کلیم ۔ ۱۰۸۔ (۴) بالِ جبریل ۔ ۳۸۔ (۵) ایضاً۔۵۴۔

لہٰذا اقبال کا پیغام یہی ہے کہ:۔

بوریائے خود بہ قالینش مدہ ‏ ‏ بیذقِ خود را بہ فرزینش مدہ
گوہرش تف دار ودر لعلش رگ است ‏ ‏ مشکِ ایں سوداگر از ناف سگ است
وقت سودا خند خند و کم فروش ‏ ‏ ماچو طفلانیم او شکر فروش
چشمِ تو ازظاہرش افسوں خورد ‏ ‏ رنگ و آبِ او ترا از جا برد

وائے آں دریا کہ موجش کم تپید
گوہر خود را ز غوّاصاں خرید! (۱)

چنانچہ ''ذوق وشوق''یعنی عشق و مستی کے مقام سے آگاہی حاصل کر۔ ذرے سے آفتاب و مہتاب کا شکاری بن جا ۔اس لئے کہ اقبال کے مطابق عشق ہی زندگی کا شرع و آئین ہے ۔ تہذیب کی بنیاد دین ہے اور دین کی بنیاد عشق ۔ عشق کا ظاہر سوز ناک اور آتشیں ہے مگر اس کا باطن رب العلمین کا نور ہے عشق کی اندرونی تب و تاب اور جنونِ ذوفنون سے علم وفن پیدا ہوتا ہے۔

از مقامِ ذوق و شوق آگاہ شو ‏ ‏ ذرّۂ؟ صیادِ مہر و ماہ شو! (۲)
زندگی را شرع و آئین است عشق ‏ ‏ اصل تہذیب است دیں ، دیں است عشق!
ظاہر او سوز ناک و آتشیں ‏ ‏ باطنِ او نور رب العالمین!
از تب و تاب درونش علم و فن ‏ ‏ از جنونِ ذوفنونش علم و فن! (۳)

لیکن زمانہ عشق و جنوں کی حقیقت سے بے خبر ہے۔ حالانکہ یہی وہ قبا ہے۔ جو خرد کے قدوقامت کے لئے موزوں ہے اقبال بجا کہتے ہیں کہ میں نے یہ قبا پہنی تو ایسے مقام تک پہنچ گیا کہ خرد میرے درو بام کا طواف کرنے میں اپنی سعادت سمجھتی ہے۔

زمانہ ہیچ نداند حقیقت اورا ‏ ‏ جنوں قباست کہ موزوں بقامت خرد است
بآں مقام رسیدم چودر برش کردم ‏ ‏ طوافِ بام و درمن سعادتِ خرد است (۴)

(۱) پس چہ باید کرد۔ ۴۶۔۴۷۔ (۲) ایضاً۔۶۰۔ (۳) جاوید نامہ۔۱۱۲۔ (۴) پس چہ باید کرد۔۵۔

عشق کا دریا وہ ہے جس کا کوئی کنارا نہیں ۔ وہاں سوائے دل کے، رہنمائے عاشقاں کوئی نہیں ۔ آپؐ نے فرمایا تو میں مکہؔ چلا گیا ۔ ورنہ آپؐ کے علاوہ ہماری منزل کوئی اور نہیں ۔

درآں دریا کہ اورا ساحلے نیست　　دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم　　و گر نہ جز تو مارا منزلے نیست　　(۱)

انتہائے عشق سوز و ساز ہے میں نے اس کے پیچھے نماز ادا کی ۔ اس نماز کے قیام و سجود کے راز صرف اپنوں ہی کی بزم میں بیان کئے جا سکتے ہیں ۔ میرے انگور سے روشن شراب ٹپک رہی ہے ۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس نے میرا دامن تھام لیا ۔ میں نے بھی آتش عشق سے حصہ پایا ہے ۔ جو سنائی نے پہلے پہل رومیؒ کے دل میں بھڑکائی تھی ۔

انتہائے عاشقاں سوز و گداز　　کردم اندر اقتدائے او نماز
راز ہائے آں قیام و آں سجود　　جز ببزم محرماں نتواں کشود!　　(۲)
مے روشن ز تاک من فروریخت　　خوشا مردے کہ در داما نم آویخت
نصیب از آتشے دارم کہ اول　　سنائی از دل رومی برانگیخت　　(۳)

مجھ پر دل کے دروازے کھول دیئے گئے ۔ میری خاک سے ایک نیا جہاں تعمیر کیا گیا ۔ میں نے رومی کے فیض سے وہ مرتبہ پایا کہ اب چاند ستارے میری موافقت میں چلتے ہیں ۔

بروئے من در دل باز کردند　　ز خاک من جہانے ساز کردند
ز فیضِ او گرفتم اعتبارے　　کہ بامن ماہ و انجم ساز کردند　　(۴)

علاوہ ازیں اقبال آغوش مادر کو بھی گہوارۂ تربیت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ مجھے یہ خرد پرور جنوں اپنی پاک طینت ماں کی نگاہ سے ملا ہے ۔ مکتب، گویا کہ ارسطو کی مدرسیت سے چشم بینا اور دل آگاہ حاصل نہیں کئے جا سکتے ۔ کیوں کہ مدرسہ سحر و افسوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔

مرا دادایں خرد پرور جنونے　　نگاہِ مادرِ پاک اندرونے
ز مکتب چشم و دل نتواں گرفتن　　کہ مکتب نیست جز سحر و فسونے!　　(۵)

(۱) ارمغانِ حجاز ۔ ۴۶ ۔ (۲) مثنوی مسافر ۔ ۶۳ ۔ (۳) ارمغانِ حجاز ۔ ۷۸ ۔ (۴) ایضاً ۔ ۷۷ ۔ (۵) ارمغانِ حجاز ۔ ۹۳ ۔

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا — گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا (۱)

اے کہ درمدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق — نخرد بادہ کس از کارگہ شیشہ گراں (۲)

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے؟ — خانقاہوں میں کہیں لذت اسرار بھی ہے؟ (۳)

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں — نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آزرانہ (۴)

شکایت ہے مجھے یا رب خدا وندان مکتب سے — سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا! (۵)

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غمناک — نہ زندگی نہ محبت ،نہ معرفت ، نہ نگاہ (۶)

مدرسے اورمکتب کے مقابلے میں اقبال آغوش مادر کو بہترین تربیت گاہ سمجھتے ہیں ۔لہٰذا کہتے ہیں کہ:۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی ؟ — سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی (۷)

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے — مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس (۸)

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا — کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ! (۹)

یہ مدرسہ ، یہ جواں ، یہ سرورورعنائی — انہیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد (۱۰)

پھر اقبال مرید ہندی کی حیثیت سے پیر رومی سے سوال کرتے ہیں اور مثنوی مولانا روم سے جواب دیتے ہیں ۔

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں — ساحر افرنگ کا صیدزبوں (۱۱)

مرغ پر نارستہ چوں پراں شود
طعمۂ ہر گربہ دراں شود

مثنوی مولانا روم

اور موجودہ مکتب وتعلیم کا حال ،اقبال کے نزدیک کچھ ایسا ہے کہ بس :۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر!

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر! (۱۲)

اقبال کے نزدیک ارسطو کی مدرسیت کفر والحاد کی جڑ ہے ۔ اس کے اثرات جہاں کہیں بھی گئے حالت یہ ہے کہ:۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام!

(۱) بانگِ درا ۔ ۲۲۹۔ والدہ مرحومہ کی یاد میں ۔ (۲) پیامِ مشرق ۔۱۳۳۔ (۳) بالِ جبریل ۔ ۳۶۔ (۴) ایضاً ۔ ۱۵۔ (۵) ایضاً ۔۳۲۔ (۶) بالِ جبریل ۔۳۶۔(۷)بالِ جبریل ۔۱۴۔(۸) ضرب کلیم ۔۱۷۱۔(۹) بالِ جبریل۔۳۶۔(۱۰) ایضاً۔۷۰۔ (۱۱) بالِ جبریل ۱۳۶۔ (۱۲) ضرب کلیم ۔۱۵۴۔نصیحت۔

مردہ لادینیء افکار سے افرنگ میں عشق　　عقل بے ربطئ افکار سے مشرق میں غلام! (۱)

اقبال کہتے ہیں کہ موجودہ نظام تعلیم دین اور اخلاقی اقدار سے بے بہرہ ہے اس لئے :۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف (۲)

مکتب و میکدہ جز درس نبودن ندہند　　بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود! (۳)

آج مدرسے میں وہ مردان خدا نہیں ملتے ۔ جن کی نگاہ میں عشق و مستی کی حرارت پائی جاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود، سرشت میں اگر لا الہ کی اکسیر ہو تو بے راہ روی کا کوئی خطرہ نہیں ، گویا کہ "لا الہ" ہمارا مرکز ہے۔

خالی ہوا ان سے دبستاں　　تھی جن کی نگاہ تازیانہ!

جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف　　تعلیم ہو گو فرنگیانہ! (۴)

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ :۔

اہل دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہل نظر　　کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ!

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں　　کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ (۵)

اقبال کہتے ہیں تعلیم ایسی ہونی چاہئے ، جس کی تب و تاب اور چمک ہمیشہ باقی رہے ۔ جو اسپ زندگی کے لئے تازیانہ کا کام دے ۔ اپنے فرزندوں کو یہ تب و تاب سکھا ۔ اس کے بغیر کتاب و مکتب محض افسون و فسانہ ہیں ۔ اس علم سے جو دنیاوی مسائل تو حل کرے مگر عشق کا سوز و گداز عطا نہ کرے پاکباز نگاہ کہیں بہتر ہے ۔ مگر وہ دل جو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہو پاکباز نگاہ سے بھی بہتر ہے ۔

تب و تابے کہ باشد جاودانہ　　سمند زندگی را تازیانہ

بہ فرزنداں بیاموز ایں تب و تاب　　کتاب و مکتب افسون و فسانہ! (۶)

زعلم چارہ سازے بے گدازے　　بسے خوشتر نگاہِ پاکبازے

نکوتر از نگاہے پاکبازے　　دلے ازہر دو عالم بے نیازے (۷)

مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورت کی تعلیم و تربیت بھی ایک بڑا مسئلہ ہے ۔ علامہ اقبال نے عورت کو بہت زیادہ

(۱) ضرب کلیم ۔۸۱۔ عصر حاضر۔　(۲) ضرب کلیم ۔۸۶۔ دین و تعلیم ۔　(۳) ایضاً۔۱۱۴۔

(۴) ضرب کلیم ۔۸۷۔　(۵) ایضاً۔۷۹۔　(۶) ارمغان حجاز ۔۹۸۔　(۷) ایضاً۔

اہمیت دی ہے اس لئے کہ:۔

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ　　اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں　　(۱)

تعلیم کے سلسلے میں اقبال عورت کی پردہ نشینی پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ مرد عورت کی حفاظت کا بہترین ضامن ہے ۔ جس علم کی تاثیر سے عورت کی نسوانیت جاتی رہے اقبال کے نزدیک وہ علم موت کے مترادف ہے ۔

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ　　آزادیء نسواں کہ زمرد کا گلوبند؟　　(۲)

نے پردہ ، نہ تعلیم ، نئی ہو کہ پرانی　　نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا　　اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد　　(۳)

چنانچہ اقبال قوم کی بیٹی کو خالصتہً اسلامی رنگ میں دیکھنا پسند فرماتے ہیں ۔ اور اس سے کہتے ہیں کہ اگر تو اس درویش کی نصیحت پلے باندھ لے ، تو ہزار قومیں مر جائیں ۔ مگر تو نہیں مرے گی ۔ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ بن اور اس دور سے پنہاں رہ ، تاکہ تو کسی شبیرؓ کو جنم دے سکے ۔

اگر پندے ز درویشے پذیری　　ہزار امت بمیرد تو نہ میری

بتولےؓ باش و پنہاں شوازیں عصر　　کہ در آغوش شبیرؓے بگیری　　(۴)

پھر قرآن پاک کی تلاوت سے اہل نظر کو متاثر کر کے ، ہماری شام سے سحر پیدا کر تو جانتی ہے کہ تیرے سوزِ قراءتِ نے ، حضرت عمرؓ کی تقدیر بدل دی تھی ۔

زشام ما بروں آور سحر را　　بہ قرآں بازخواں اہل نظر را

تو میدانی کہ سوز قراءتِ تو　　دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را　　(۵)

اگر تو غور سے دیکھے تو امومت رحمت ہے ۔ کیوں کہ وہ نبوت سے نسبت رکھتی ہے ۔ ماں کی شفقت پیغمبرؐ کی مانند ہے ۔ کہ وہ بھی اقوام کے کردار کی تعمیر کرتی ہے ۔ امومت نے ہمارے کردار کی تعمیر اور پختہ ہو جاتی ہے ۔ ماں کی پیشانی کی لکیروں میں ہماری تقدیر پوشیدہ ہے ۔ اگر تیری سمجھ کو معانی تک رسائی حاصل ہے ۔ تو لفظ امت ہی کے اندر بہت سے نکات پوشیدہ ہیں ۔ وہ ذات پاکؐ جو صرف کن فکاں کے مقصود ہیں ۔ انہوں نے فرمایا جنت ماؤں کے پاؤں کے نیچے ہے ۔" الجنت

(۱) ضرب کلیم ۔۹۴۔" عورت" ۔ (۲) ایضاً ۔ ۹۵۔ آزادیء نسواں ۔ (۳) ضرب کلیم ۔ ۹۶ ۔ (۴) ارمغان حجاز ۔۹۴۔ (۵) ایضاً ۔۹۴۔

تحت اقدام المحتکم '' ملت ماؤں کی تکریم ہی سے ہے ۔ اس کے بغیر زندگی کا کام ادھورا رہ جاتا ہے ۔ امومت ہی سے زندگی گرم رفتار ہے ۔ امومت ہی سے زندگی کے پنہاں راز کھلتے ہیں ۔ امومت ہی سے ہماری جوئے حیات کے اندر پیچ و تاب ہے۔ اسی سے اس میں موج ، گرداب اور حباب پیدا ہوتے ہیں ۔ وہ گنوار اور جاہل لڑکی جس کا قد چھوٹا بدن موٹا اور چہرہ کالا کلوٹا ہے ۔ جو غیر مہذب ہے ۔ جس کی اچھی تربیت نہیں ہوئی ۔ جو کوتاہ نظر، کم زباں اور سادہ مزاج ہے ۔ مگر اس نے زچگی کے مصائب سے اپنا دل خوں کیا ہے ۔ اس کی آنکھوں کے گرد نیلگوں حلقے پڑ گئے ہیں ۔ اگر اس کی آغوش سے ملت کو ایک غیور و جسور اور حق پرست مسلمان میسر آ جائے ، تو ہم سمجھیں گے کہ اس کے مصائب نے ہمارے ملی وجود کو مستحکم کر دیا ، اس کی شام سے ایسی صبح نمودار ہوئی ، جس نے ساری کائنات کو روشن کر دیا ۔ لیکن وہ بے اولاد ، خاتون نام نہاد ، شتر بے مہار ، مادر پدر آزاد ، از دواجی زندگی سے دور افتادہ ، درجنوں بوائے فرینڈز کے شانہ بشانہ استادہ ، جس کی کارستانیاں دیکھ دیکھ کر نسوانیت کرتی ہے فریاد ۔ چندے آفتاب چندے مہتاب ، اس کے افکار مغرب کی چمک دمک سے روشن ہیں ۔ بظاہر وہ عورت ہے لیکن بباطن نازن ہے اس نے ملت بیضا کی عائد پابندیاں و روایات درہم برہم کر دیں ۔ اس لئے اس کی آنکھ بے حجابانہ غمزہ زن ہے اس کی آزادی و بے راہ روی حیا سے نابلد ہے ۔ اس نے اس کے اندر شوخ چشمی پیدا کر دی ہے ۔ جس سے کئی فتنے جنم لیتے ہیں ۔ اس کے گمراہ علم نے بار امومت اٹھانے سے بیزار کر دیا ۔ اس کی شام کے افق پر ایک ستارہ بھی نہ چمکا۔

نیک اگر بینی اموت رحمت است زانکہ اورا با نبوت نسبت است
شفقت او شفقت پیغمبر است سیرت اقوام راصورت گر است
از امومت پختہ تر تعمیر ما درخط سیمائے او تقدیر ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے حرف امت نکتہ ہا دارد بسے
گفت آں مقصود حرف کن فکاں زیر پائے امہات آمد جناں
ملت از تکریم ار حام است و بس ورنہ کار زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتار حیات از امومت کشف اسرار حیات
از امومت پیچ و تاب جوے ما موج و گرداب و حباب جوئے ما (۱)

(۱) رموز بے خودی ۔ ۱۴۹ ۔ ۱۵۰ ۔

اس کے علاوہ تعلیم نسواں کی مزید وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ:۔

آں دخے رستاں زادے جاہلے | پست بالائے . سطبرے بدگلے
ناتراشے پرورشِ نادادۂ | کم نگاہے ، کم زبانے ، سادۂ
دل ز آلام اموت کردہ خوں | گرد چشمش حلقہ ہائے نیلگوں
ملت ار گیرد آغوشش بدست | یک مسلمانِ غیور حق پرست
ہستیء ما محکم از آلام اوست | صبح ما عالم فروز از شام اوست
واں تہی آغوش نازک پیکرے | خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکر او از تاب مغرب روشن است | ظاہرش زن باطنِ او نازن است
بندہائے ملتِ بیضا گسیخت | نازچشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش | از حیا ناآشنا آزاد لیش
علم او بار اموت بر نتافت | برسر شامش یکے اختر نتافت (۱)

اس قسم کا پھول ہمارے باغ میں نہ ہی کھلے تو بہتر ہے ۔ ایسی عورت بار اموت پر داغ ہے جسے دھو دینا چاہیئے ۔

ایں گل از بستانِ ما نا رستہ بہ | داغش از دامانِ ملت شستہ بہ (۲)

اس لئے کہ:۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن | کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہء زن | ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت (۳)

کلمہ گو ستاروں کی طرح لاتعداد ہیں ۔ لیکن وہ زمانے کی تاریکی میں آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں ۔ ابھی تک انہوں نے عدم سے کیف و کم کی دنیا میں قدم نہیں رکھا ۔ وہ ہماری مستور تجلیات ہماری موجودہ تاریکیوں کے اندر مضمر ہیں ۔ ایسی شبنم جو پھول کی پتی پر نہیں گری ، ایسے غنچے جنہیں صبا نے چھیڑا نہیں ۔ ممکنات کا یہ لالہ زار ماؤں کے باغ سے پھوٹتا ہے ۔ اے صاحب نظر نقدی ، لباس ، چاندی اور سونا قوم کا سرمایہ نہیں ۔ قوم کی دولت تندرست بیٹے ہیں ۔ جن کے دماغ روشن ہوں ۔ اور

(۱) رموز بے خودی ۔ ۱۵۰ ۔ (۲) ایضاً ۔ ۱۵۱ ۔ (۳) ضرب کلیم ۔ ۹۲ ۔

وہ محنتی اور چاق و چوبند ہوں ۔ اخوت کے راز کی حفاظت مائیں کرتی ہیں ۔ مائیں ہی قرآن و ملت کے لئے باعث قوت ہیں۔

لا الہ گویاں چو انجم بے شمار　　بستہ چشم اندر ظلام روزگار
پانبردہ از عدم بیروں ہنوز　　از سوادِ کیف و کم بیروں ہنوز
مضمر اندر ظلمت موجود ما　　آں تجلی ہاے ناشہود ما
شبنمے بر برگ گل نہ نشستہء　　غنچہ ہاے از صبا ناختہء!
بردمد ایں لالہ زارِ ممکنات　　از خیابانِ ریاضِ امہات
قوم را سرمایہ اے صاحب نظر　　نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مال او فرزند ہائے تندرست　　تر دماغ و سخت کوش وچاق و چست

حافظِ رمز اخوت مادراں
قوت قرآن و ملت مادراں　　(۱)

دست ہرنااہل بیما رت کند!　　سوے مادر آ کہ تیمارت کند!　　(رومی)

مائیں بیٹوں کی سیرت وکردار بناتی ہیں اورانہیں صدق وصفا کا جوہر عطا کرتی ہیں ۔ سیدہ فاطمہؓ تسلیم و رضا کی کھیتی کا حاصل اور ماؤں کے لئے اسوۂ کاملہ ہیں ۔ آپؓ نے صبر و رضا کی ادب گاہ میں پرورش پائی تھی۔ ہاتھ چکی پیتے اور لبوں پر قرآن پاک کی تلاوت ہوتی تھی ۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں ۔ شریعت حقہ کے احکام میرے پاؤں کی زنجیر بنے ہوئے ہیں ۔ مجھے جناب مصطفیٰ کے فرمان کا پاس ہے ۔ ورنہ میں سیدہ فاطمہؓ کی تربت کے گرد طواف کرتا اور ان کی قبر پر سجدہ ریز ہوتا۔

سیرت فرزند ہا از امہاتؔ　　جوہر صدق و صفا از امہات
مزرعِ تعلیم را حاصل بتولؓ　　مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
آں ادب پروردۂ صبر و رضا　　آسیا گردان و لب قرآں سرا
رشتہ آئین حق زنجیر ماست　　پاس فرمان جناب مصطفیٰ ست

(۱) رموز بے خودی ۔ ۱۵۱۔

ورنہ گرد تربتش گردیدے

سجدہ ہا برخاک او پاشیدے (۱)

اقبال کو وہ تعلیم ایک آنکھ نہیں بھاتی جو عورت کے سر پر سے چادر اتار کر اس کی آنکھوں سے حیا صاف کر دے۔ ان کے نزدیک امت میں ایسی عورت کا کوئی مقام نہیں ۔ اس کے برعکس اقبال مستورہ و مستورات کو بلند مقام دیتے ہوئے کہتے ہیں، اے مسلمان خاتون تیری چادر ہمارے ناموس کا پردہ ہے ۔ تیری روشنی سے ہمارا فانوس روشن ہے ۔ تیری پاک طینت ہمارے لئے رحمت اور ہمارے دین کے لئے قوت اور ملت کی بنیاد ہے ۔ جب تیرے بچے نے تیرے دودھ سے اپنے لب تر کئے تو تو نے سب سے پہلے اسے لا الہ سکھایا تیری محبت ہمارے اطوار یعنی ہمارے فکر، ہماری گفتار کی تربیت کرتی ہے ۔ تیرے آغوش کے بادل میں، جو بجلی آسودہ ہے ۔ وہ پہاڑوں پر چمکی اور صحراؤں میں تڑپی، تو آئین حق یعنی شریعت محمدیؐ جیسی نعمت کی امین ہے ۔ تیرے سانس میں دین حق کا سوز ملا ہوا ہے ۔ دور جدید عیار و مکار ہے ۔ اس کا کارواں متاع دین کا لٹیرا ہے ۔ اس کی عقل اندھی اور خدا ناشناس ہے ۔ ناقص اس کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں ۔ اس کی آنکھ میں بے باکی اور بے حیائی ہے۔ اس کی پلکوں کا پنجہ اپنے شکار کو چھوڑتا نہیں ۔

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی — خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ (۲)

اے ردایت پردۂ ناموس ما — تاب تو سرمایہ فانوس ما

طینت پاک تو مارا رحمت است — قوت دین و اساس ملت است

کودک ماچوں لب از شیر توشست — لا الہ آموختی اورا نخست

می تراشد مہر تو اطوار ما — فکر ماگفتار ما، کردار ما

برق ما کودر سحابت آرمید — برجبل رخشیدہ و در صحرا تپید

اے امین نعمت آئین حق — در نفسہائے تو سوز دین حق

دور حاضر ترفروش و پرفن است — کاروانش نقد دیں را راہزن است

کور و یزداں ناشناس ادراک او — ناکساں زنجیریء پیچاک او

---

(۱) رموز بے خودی ۔ ۱۵۳۔ (۲) بال جبریل ۔ ۱۱۶۔

چشم او بیباک و نا پرواستے   پنجۂ مژگانِ او گیراستے   (۱)

مگر لطف یہ ہے کہ اس کا صید زبوں اپنے آپ کو آزاد کہتا ہے اور اس کا مارا ہوا اپنے آپ کو زندہ سمجھتا ہے۔ اے مسلمان خاتون تو بھی ہماری جمعیت کے درخت کی آبیاری اور ملت کے سرمائے کی حفاظت کرنے والی ہے۔ تو معاملات دنیوی نفع ونقصان کے لحاظ سے نہ جانچ صرف اپنے آباء کے راستے پر گامزن رہ تو زمانے کی دستبرد سے ہوشیار ہو جا اور اپنے بچوں کو اپنے آغوش میں لے لے۔ ہمارے چمن کے یہ نوزائیدہ پرندے، جنہوں نے ابھی پر نہیں کھولے، اپنے آشیانے سے دور جا پڑے ہیں۔ تیری فطرت میں بلند جذبات موجود ہیں۔ تو اپنی ہوشمندی کی آنکھ سیدہ فاطمۃ الزہرؓ کے اسوہ پر رکھ۔ تا کہ تیری شاخ بھی حسینؓ جیسا پھل پیدا کرے۔ اور اسلام کے دور اول کا موسم ہمارے گلزار میں واپس لائے۔

صید او آزاد خواند خویش را   کشتۂ او زندہ داند خویش را

آب بند نخل جمعیت توئی   حافظ سرمایۂ ملت توئی

از سر سود و زیاں سودا مزن   گام جز برجادۂ آبا مزن

ہوشیار از دست برد روزگار   گیر فرزندان خود را در کنار

ایں چمن زادہ کہ پر نکشادہ اند   ز آشیانِ خویش دور افتادہ اند

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند   چشم ہوش از اسوۂ زہراؓ مبند

تا حسینؑ شاخ تو بار آورد   موسم پیشیں بگلزار آورد   (۲)

سونے چاندی کی محبت نے ان کی آنکھوں سے محبت چھین لی ہے یہاں تک کہ مائیں اپنے بیٹوں کو بوجھ سمجھنے لگی ہیں، ماتا جیسا بے لوث موتی بھی ختم ہوگیا ہے۔ افسوس اس قوم پر جو پھل کے خوف سے شجر کے اندر کی نمی کو ضائع کر دیتی ہے۔ اس خوف سے کہ اس کا مضراب تاروں سے نغمہ نہ پیدا کرے وہ نازادہ بچوں کو رحم کے اندر ختم کر دیتے ہیں۔ گویا یہ لوگ فرعون سے بھی بڑھ کر ہیں۔ وہ تو نومولود بچوں کو قتل کرتا تھا۔ اور یہ نامولود معصوموں کے قاتل ہیں۔ اگر چہ افرنگ رنگا رنگ انداز رکھتا ہے۔ مگر میں انہیں دیکھ کر صرف عبرت حاصل کرتا ہوں۔ اے وہ شخص جو ان کی تقلید کا غلام بنا ہوا ہے۔ آزاد ہو، قرآن پاک کا دامن تھام اور صحیح معنوں میں مرد حر بن جا۔

---

(۱) رموز بے خودی۔ ۱۵۴۔   (۲) رموز بے خودی۔ ۱۵۵۔

دیدہ ہائے بے نم زحب سیم وزر مادراں را بار دوش آمد پسر
وائے برقومے کہ از بیم ثمر می برد نم را زاندام شجر!
تانیارد زخمہ از تارش سرود می کشد نازادہ را اندر وجود
گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ من بجز عبرت نگیرم از فرنگ!
اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو
دامنِ قرآں بگیر آزاد شو! (۱)

اقبال کہتے ہیں کسی قوم کا کردار اور مستقبل اس قوم کی ماؤں کے کردار میں پنہاں ہوتا ہے۔ مبارک ہے وہ ملت جس کے کارناموں کے سبب اس دور نے کئی قیامتیں دیکھیں۔ کسی قوم کو کیا پیش آنے والا ہے۔ اور کیا پیش آ سکتا ہے، یہ سب اس کی ماؤں کی جبینوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

خنک آں ملتے کز واردانش قیامت ہا بہ بیند کائناتش
چہ پیش آید، چہ پیش افتاد اورا تواں دید از جبین امہاتش (۲)

عشق و عقل کی اس بحث میں یہ نکتہ واضح کرتا چلا جاؤں کہ اقبال صرف اس عقل کے مخالف ہیں جو دیوِ بے زنجیر کی طرح مست ہو کر راستے میں آنے والی ہر چیز کو کچل دیتی ہے۔ جو ایسے علم کی پروردہ ہوتی ہے کہ اپنے اندر شیطانی صفات رکھتی ہے۔ جس کے نتیجے میں بنی نوع انسان کا ہر فعل مکر و فریب کا روپ دھارتے ہوئے انسانیت کے حق میں زہر قاتل بن جاتا ہے۔ ایسے علم و عقل سے استحصالی اور غاصبانہ نظام زندگی تشکیل پاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں، صورت حال کچھ اس طرح کی ہو جاتی ہے کہ بقولِ اقبال:۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے! (۳)

اقبال اپنی نظم "پیر و مرید" میں اس نفسانفسی اور دھونس دھاندلی کا مسئلہ مولانا روم کے سامنے پیش کرتے ہوئے۔ ان کی مثنوی سے خود ہی ان کی طرف سے جواب تلاش کرتے ہیں کہ علم و حکمت اور عشق و رقت کے لئے رزق حلال ضروری ہے۔ ورنہ شیطانیت کا دور دورہ رہے گا۔

---

(۱) جاویدنامہ۔۴۲۔ (۲) ارمغانِ حجاز۔۹۴۔ (۳) بانگِ درا۔۲۷۴۔"طلوعِ اسلام"۔

مرید ہندی علم وحکمت کا ملے کیوں کر سراغ؟ کس طرح ہاتھ آئے سوزو درد و داغ؟ (۱)
پیری رومی علم و حکمت زاید از نان حلال! عشق و رقت آید از نان حلال!

اور ایسے ملعون علم وعقل پر اقبال کے حوالے سے گزشتہ اوراق میں سیر حاصل تبصرہ ہو چکا ہے۔ یہ وہی علم و عقل ہے جس کی روشنی میں ہر گرگ کو ہے برّہ معصوم کی تلاش اور اسی علم وعقل کا کمال ہے کہ ایک قوم کتے کی ناف سے کستوری بنا کر دوسری قوم پر فروخت کرنے یا زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کرتی ہے۔

ایسے ہی لادین علم وعقل کی بناء پر فرنگیوں کی سیاست بھی دیو بے زنجیر کی طرح دندناتی پھرتی ہے۔ اسی خرابی و بدمستی کے زیر اثر انہوں نے ملت کی بنیاد وطن پر رکھ دی ہے۔ جس کے نتیجے میں انسانیت۔ وطنیت، قبائل اور نسل و رنگ کے پنجروں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ انسان ایک دوسرے کے لئے کتے بن گئے۔

چنانچہ اقبال فرماتے ہیں :۔

تیرے حرم کا ضمیر اسود واحمر سے پاک ننگ ہے تیرے لئے سرخ و سپید و کبود (۲)
آں چناں قطع اخوت کردہ اند بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند نوع انساں را قبائل ساختند
ایں شجر جنت ز عالم بردہ است تلخی پیکار بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند آدمیت گم شد و اقوام ماند
تا سیاست مسندِ مذہب گرفت ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت
قصہء دینِ مسیحائی فسرد شعلہء شمع کلیسائی فسرد
آں فلارنساویء باطل پرست سرمئہ او، دیدۂ مردم شکست
نسخہء بہر شہنشاہاں نوشت در گل مادانہء پیکار کشت (۳)

جس کے زہر ناک نتیجے میں :۔

---

(۱) بال جبریل۔۱۴۲۔ (۲) ضرب کلیم۔۱۱۲۔ (۳) رموزِ بے خودی۔۱۱۵۔۱۱۶۔

مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد

اور

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری (۱)

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیراہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے (۲)

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی — خدا نے مجھ کو دیا ہے دل خبیر و بصیر

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں — کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر

ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد — فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر (۳)

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار (۴)

تری حریف ہے یا رب سیاست افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس!

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس! (۵)

خیر فرنگی جو بھی کرے، اس کے باوجود اقبال کہتے ہیں کسی دل پر فرنگی کی حکومت نہیں۔ اسکا اثاثہ صرف ممالک ہیں۔ دین نہیں۔ وہ ایسا خدا ہے جس کی بارگاہ کے طواف میں سینکڑوں ابلیس تو ہیں۔ مگر روح الامین ایک بھی نہیں۔

فرنگی را دلے زیر نگیں نیست — متاع او ہمہ ملک است، دیں نیست

خداوندے کہ در طوف حریمش — صد ابلیس است و یک روح الامیں نیست (۶)

رنگ و نسل، علاقائیت و وطنیت، خودغرضی اور لالچ و ہوس کی بجائے اقبال عالم انسانیت کو اخوت و محبت، ایثار و قربانی، ہمدردی و غمگساری اور مساوات کا پیغام دیتے ہیں۔ جو کہ دراصل اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور انسانیت کے لئے روح رواں ہے۔

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا — خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

---

(۱) بانگِ درا۔ ۲۶۱۔ ''خضر راہ''۔ (۲) ایضاً۔ ۲۰۔ وطنیت۔ (۳) ضرب کلیم۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ لادین سیاست۔

(۴) ایضاً۔ ۱۵۳۔ دام تہذیت۔ (۵) ضرب کلیم۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ سیاستِ افرنگ۔ (۶) ارمغانِ حجاز۔ ۱۳۲۔

یہ ہندی ، وہ خراسانی ، یہ افغانی ، وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا (۱)

تا کجادر خاک می گیری وطن؟ — رخت بردار و سرگردوں فگن (۲)

شروع شروع میں علامہ اقبال بھی وطنیت پر اعتقاد رکھتے تھے ۔ شاید غلامی کی وجہ سے وہ اپنے افکار میں وطن سے محبت کا انتہائی اظہار کرتے رہے ۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے (۳)

لیکن اس میں بھی ایک نکتہ ہے کہ برھمن جو بتوں کی پرستش کرتا ہے ۔ اس سے بہتر ہے کہ خاک وطن کی محبت سے سرشار ہو جائے اور ہندو مسلم مل جل کر آزادی کے لئے سرگرم عمل ہوسکیں ۔ بہر حال بعد میں ان کی سوچ ارتقائی طور پر تبدیل ہو کر آفاقی رنگ اختیار کر گئی ۔ جس کے زیر اثر اقبال نے سیاست میں اخوت اسلامی کو پروان چڑھایا تا کہ ساری انسانیت کے لئے منفعت بخش ثابت ہو سکے ۔

جوہرما بامقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بجا مے بستہ نیست

ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست — رومی و شامی گل اندام ماست

قلب ما از ہند و روم و شام نیست — مر زبوم او بجز اسلام نیست

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود — از وطن آقائے ماہجرت نمود

حکمتش یک ملتے گیتی نورد — بر اساسِ کلمہء تعمیر کرد

تا زبخششہائے آں سلطانِ دیں — مسجدِ ماشد ہمہ روئے زمیں

صورت ماہی بہ بحر آباد شو

یعنی از قید مقام آزاد شو (۴)

مطلب یہ ہے کہ :۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادوطن صورت ماہی

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

---

(۱) بانگِ درا ۔۲۷۳۔ '' طلوع اسلام'' ۔ (۲) رموزِ بے خودی ۔ ۱۶۵ ۔ (۳) بانگِ درا ۔ ۸۸ ۔ نیا شوالہ ۔ (۴) رموزِ بے خودی ۔۱۱۲ ۔ ۱۱۴ ۔

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے　　تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے　　کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے　　(۱)

طارق نے جب اندلس کی سرزمین پر کشتیاں جلائیں۔ تو اس کے ساتھیوں نے کہا تیرا یہ کام عقل کی رو سے غلط ہے ہم سرزمین وطن سے دور ہیں، واپس کیسے پہنچیں گے؟ شریعت میں کہاں ترک سبب کی اجازت ہے۔ طارق مسکرایا۔ اس نے اپنا ہاتھ تلوار کے قبضے پر رکھا اور کہا:۔ ہر ملک ہمارا ملک ہے۔ کیونکہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت　　گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟　　ترکِ سبب زروئے شریعت کجا رواست

خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست　　(۲)

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا　　(۳)

ملت اسلامیہ کی آفاقیت اور قید مقامی سے آزاد ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال اسے قید زمانی سے بھی بالاتر ثابت کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ملت کی ذات اور ہے اس کی صفات اور ہیں اور اس کی موت و حیات کا قانون مختلف ہے۔ فرد مٹھی بھر خاک سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن قوم کسی صاحب دل کے باطن سے پیدا ہوتی ہے۔ فرد کی زندگی فقط ساٹھ ستر سال ہے اور قوم کی زندگی میں سو سال ایک لمحہ کی مانند ہے۔ فرد کی زندگی جان و تن کے تعلق سے قائم ہے اور قوم کی زندگی اپنی قدیم روایات کے تحفظ سے قائم رہتی ہے۔ فرد کی موت جوئے حیات خشک ہو جانے سے واقع ہو جاتی ہے۔ اور قوم کی موت مقصود حیات ترک کر دینے سے۔ اگر چہ قومیں بھی افراد کی مانند فنا ہو جاتی ہیں۔ اور ان پر بھی فرد کی مانند قانون اجل کا نفاذ ہوتا

---

(۱) بانگِ درا۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ وطنیت۔　　(۲) پیامِ مشرق۔ ۱۲۹۔ ''الملکُ للہ''　　(۳) بانگِ درا۔ ۱۵۹۔ ''ترانۂ ملی''۔

ہے۔ امت مسلمہ اللہ تعالیٰ کی حیات میں سے ہے۔ اس کی بنیاد عہدِالست (توحید) پر ہے۔ یہ قوم دائرہ اجل سے باہر ہے۔ اس کا قیام ''نحن نزلنا'' پر مبنی ہے۔ ذکر، یعنی قرآن پاک کا قائم رہنا ذاکر (امت مسلمہ) کے مقام سے وابستہ ہے۔ اس لئے قرآن پاک کے دوام میں امت مسلمہ کا دوام موجود ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا نور نہیں بجھایا جا سکے گا۔ اس لئے چراغ ملت بھی بجھنے سے محفوظ ہے۔

ذات او دیگر صفاتش دیگر است — سنتِ مرگ و حیاتش دیگراست
فرد می برخیزد از مشت گلے — قوم زآید از دل صاحبدلے
فرد پورشصت و ہفتاد است و بس — قوم راصد سال مثل یک نفس
زندہ فرد از ارتباط جان و تن — زندہ قوم از حفظ ناموس کہن
مرگ فرد از خشکئ رود حیات — مرگ قوم از ترک مقصودحیات
گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد — از اجل فرماں پذیرد مثل فرد
امت مسلم ز آیاتِ خداست — اصلش از ہنگامہء قالوا بلیٰ ست
ازاجل ایں قوم بے پروا ستے — استوار از نحن نزلنا ستے
ذکر قائم از قیام ذاکر است — از دوام او دوام ذاکراست
تا خدا اَن یطفِئوْ فرمودہ است — از فسردن ایں چراغ آسودہ است (۱)

اقبال کہتے ہیں کہ:-

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری (۲)
تو ابھی رہگزر میں ہے قید مقام سے گزر! — مصر و حجاز سے گزر، پارس و شام سے گزر! (۳)
رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک؟ — ترا سفینہ کہ ہے بحر بیکراں کے لئے (۴)
ہے یاد مجھے نکتہء سلمان خوش آہنگ — دنیا نہیں مردانِ جفا کش کے لئے تنگ (۵)

---

(۱) رموزِ بے خودی۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ (۲) بانگِ درا۔ ۲۴۸۔ ''مذہب''۔ (۳) بالِ جبریل۔ ۲۹۔
(۴) بالِ جبریل۔ ۴۹۔ (۵) بالِ جبریل۔ ۷۶۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا مقام ہر کہیں ہے (۱)

یہ پورب یہ پچھم، چکوروں کی دنیا — مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ (۲)

ترکی بھی شیریں، تازی بھی شیریں — حرف محبت، ترکی نہ تازی! (۳)

شہید محبت نہ کافر نہ غازی — محبت کی رسمیں نہ ترکی، نہ تازی! (۴)

ہر شاخ سے یہ نکتہء پیچیدہ ہے پیدا — پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا

جرات ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے — اے مرد خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے (۵)

پاک ہے گرد وطن سے سرداماں تیرا — تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا (۶)

ہماری ملت اسلامیہ کا جوہر کسی سرزمین سے وابستہ نہیں۔ اس کی تیز و تند شراب کا دارومدار جام پر نہیں۔ ہندی اور چینی ہمارے جام کی مٹی ہیں اور رومی و شامی ہمارے ملی بدن کی خاک ہیں۔ ہمارے قلب کا تعلق ہند و روم یا شام سے نہیں۔ اسلام کے سوائے ہمارا کوئی اور وطن نہیں۔ جب حضرت کعبؓ حضور اکرمؐ کی خدمت میں قصیدہ ''بانت سعاد'' تحفہ لائے تو کعبؓ نے آپؐ کی تعریف میں چمکدار موتی پروئے۔ اور ''آنجنابؐ'' کو ہندی تلواروں میں ایک برہنہ تلوار کہا۔ آپؐ کا مقام آسمان سے بھی بلند تر ہے۔ آپ کو کسی سرزمین کے ساتھ اپنی نسبت پسند نہ آئی۔ آپؐ نے فرمایا۔ مجھے اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار کہو۔ اب تو حق پرست ہے اس لئے حق کی ہی بات کہہ۔

پیش پیغمبرؐ چو کعبؓ پاک زاد — ہدیہء آورد از بانت سعاد

در ثنائش گوہر شب تاب سفت — سیف مسلول، از سیوف الہند گفت

آں مقامش برتر از چرخ بلند — نامدش نسبت با قلیمے پسند

گفت سیف من سیوف اللہ گو — حق پرستی جز براہِ حق مپو (۷)

گویا کہ اس ساری بحث کا نچوڑ یہی ہے کہ قید مقامی، ذات پات، حسب و نسب اور علاقائی نسبتیں علامہ محمد اقبال کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ حضورؐ کی حیات سے عیاں ہوتا ہے۔ کہ سیاست کو دین سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اس طرح اقتدار غلط ہاتھوں میں چلے جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اقتدار جب غیروں کے ہاتھ میں چلا جائے تو پھر

---

(۱) بالِ جبریل۔۱۰۳۔ (۲) بالِ جبریل۔۱۶۵۔ (۳) ایضاً۔۷۱۔ (۴) ایضاً۔۱۴۸۔

(۵) ضربِ کلیم۔۵۲۔۵۳۔ (۶) بانگِ درا۔۲۰۵۔ (۷) رموزِ بے خودی۔۱۱۳۔

امت مسلمہ کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔

جلال، پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (۱)

صاف ظاہر ہے کہ یہ سارا تجزیہ علم و عشق ہی کی حوالے سے، بالواسطہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اقبال صرف اس عقل کے مخالف ہیں۔ جو عشق سے باغی ہو جاتی ہے۔ اقبال اس دیں آمیز عقل کے مداح و معترف ہیں، جو صراط مستقیم پر چلتے ہوئے، صراط مستقیم پر چلاتی اور رہنمائی فرماتی ہے۔ جامہء عشق کے بغیر عقل بالکل ننگی ہے، ایسے میں یہ دوسروں کو بھی ننگا کر دیتی ہے۔ مگر عقل نے عشق سے بنا ہوا لباس پہنا تو خود بھی عریاں نہیں ہوتی اور دوسروں کے کپڑے بھی نہیں اتارتی۔ ایسی عقل عشق الٰہی اور اس کے عشق رسول سے ہم آہنگ ہو کر جادۂ عرفان و معرفت کی طرف راغب کرتی ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں۔

زیرکی از عشق گردد حق شناس کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں زیرکی ہمبر بود نقش بند عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ عشق راباز یرکی آمیز دہ (۲)
عشق صیقل می زند فرہنگ را جوہر آئینہ بخشد سنگ را (۳)
یہ جوہر اگر کار فرما نہیں ہے تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی! (۴)

علم و عقل کے ساتھ عشق کی آمیزش ہو جائے تو انسانیت ''کلبیت'' سے دوبارہ دائرہ ''انسانیت'' میں لوٹ آئے اور یہی اقبال کا مطمح نظر ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں۔

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز اندیشہء دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز (۵)

اس سلسلے میں ہر طرح کی بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال عشق سے خالی لادین علم و دانش کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ، جس کسی نے لا الہ (توحید) کو اپنی گرہ میں باندھ لیا وہ مدرسے (ارسطو کی مدریست) یعنی فلسفے اور ملا کے بندھنوں سے آزاد ہو گیا۔ اس دین اور دانش کے حصول میں کوشاں نہ ہو۔ جو ہم سے نگاہ، دل اور قوت عمل چھین لے۔

---

(۱) بال جبریل۔۴۰۔ (۲) جاوید نامہ۔۶۵۔ سعید حلیم پاشا۔ (۳) زبور عجم۔۱۹۴۔
(۴) بال جبریل۔۱۳۶۔ (۵) ایضاً۔۲۶۔

کسے کو لا الہ رادرگرہ بست ز بند مکتب و ملا بروں جست
بآں دین و بآں دانش مپرداز کہ از ما می برد چشم و دل و دست (۱)
عشق کی تیغ جگر دار اڑالی کس نے؟ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی! (۲)
علم کا مقصود ہے پاکیء عقل و خرد فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم ، فقر مسیح و کلیم علم ہے جویائے راہ ، فقر ہے دانائے راہ

اور پھر دل و نظر یعنی عشق کی آمیزش سے علم ہادی و رہنما بن جاتا ہے۔ جس طرح شبنم نسیم کے ساتھ مل کر غنچے کا سینہ کشادہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح عشق علم کے ساتھ مل جائے تو سینہ تجلی گاہ نور بن جاتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ تجلیات کلیم میں عشق و دین اور مشاہدات حکیم یعنی علم و عشق باہم شیر و شکر نہ ہوں تو ایسا علم بے بصر و بے نظر ہوتا ہے۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم
وہ علم ، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم! (۳)

عشق و دیں شورش پنہاں کا بھی دوسرا نام ہے۔ چنانچہ جو علم یا عقل اس شورش پنہاں کی معیت اختیار نہیں کرتا تو عقل و علم کی حیثیت صفر ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ عقل، جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس لئے کہ واقعی:۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا (۴)
زندگی کچھ اور شے ہے ، علم ہے کچھ اور شئے زندگی سوز جگر علم ہے سوز دماغ

علم میں دولت بھی ہے ، قدرت بھی ہے ، لذت بھی
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ (۵)

---

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۱۰۱۔ (۲) بال جبریل ۔ ۱۲۔ (۳) ضرب کلیم ۔ ۲۶۔ ''علم اور دین''۔
(۴) ضرب کلیم ۔ ۶۹۔ (۵) ایضاً ۔ ۷۹۔

اور پھر واقعی:۔

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا کی لیکن — بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی (۱)

تیرے دیکھتے دیکھتے "مدرسیت" نے رہزنی کرتے ہوئے سارا قافلہ ہلاک کر ڈالا۔ تو پھر بھی پوچھتا ہے۔ قافلہ کیسے ہلاک ہوا؟ جو علم تو پڑھ رہا ہے، اس سے غافل نہ رہ۔ اس سے ساری قوم ہلاک کی جاسکتی ہے۔

چومی بینی کہ رہزن کارواں کشت — چہ پرسی کاروا نے راچساں کشت

مباش ایمن ازاں علمے کی خوانی — کہ از وے روح قومے میتواں کشت (۲)

عشق کی بدولت بڑے بڑے معرکے سر کیے جا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ کبوتر جیسا نازک پرندہ عشق و مستی سے وجد میں آ کر "ھوھو" کا نعرہ بلند کرے تو شاہین کے سر سے بھی تاج چھین سکتا ہے اور اگر بلبل کی صدا میں عشق و مستی آ جائے تو اس کے اثر سے بھی کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا ہو سکتا ہے۔

کبوتر بچہء خود را چہ خوش گفت — کہ نتواں زیست باخوئے حریری

اگر "یاھو" زنی از مستیء شوق — کلہ را از سرِ شاہیں گیری (۳)

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے

کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا (۴)

حیات و کائنات کے حقائق بڑے تلخ اور پر خطر ہیں۔ فطرت پانی کے ساتھ نہیں بلکہ لہو کے ساتھ کھیلتی ہے۔ ایسے میں مقابلے کے لئے ہمہ وقت مستعد و چوکس رہنا چاہیئے۔ ہمیں اپنی کانچ کو پتھر بنانا چاہئے تاکہ چور چور ہونے سے بچ سکیں۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

یہ زور دست وضربت کاری کا ہے مقام — میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایہء حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ (۵)

فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور — وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج (۶)

یہ اس لئے کہ:۔

---

(۱) ضربِ کلیم۔ ۱۷۹۔ (۲) ارمغانِ حجاز۔ ۱۰۱۔ (۳) ارمغانِ حجاز۔ ۱۰۹۔

(۴) بانگِ درا ۲۶۹۔ "طلوعِ اسلام" (۵) ضربِ کلیم۔ ۱۰۔ (۶) ارمغانِ حجاز۔ ۳۷۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے　　ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات　(۱)

یہی وجہ ہے کہ جواں مرد رنج وغم ودرد سے نہیں روتا ۔ اس کے دل پر زمانے کا غبار نہیں جمتا ۔ اس کے گریہ کو اپنے گریہ کی مانند نہ جان ۔ مرد کے آنسو تو عشق کی سوز ومستی کی وجہ سے ٹپکتے ہیں ۔

نگرید مرد از رنج و غم و درد　　زدوراں کم نشیند بردلش گرد

قیاس او رامکن ازگریہء خویش　　کہ ہست از سوز و مستی گریہء مرد!　(۲)

عشق دل ہے اور دل عشق ۔ دل وہ سمندر ہے جو ساحل نہیں رکھتا ۔ اس کی موجوں کی ہیبت سے مگرمچھ بھی ڈرتے ہیں ۔ اس کے اندر وہ سیلاب اٹھتے ہیں جو سینکڑوں فلسفوں کے بیابانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں ۔ آسمان تو اس کے سیلاب میں ایک بلبلہ ہے ۔ گویا کہ عشق ساری کائنات پر حاوی ہے ۔

دل آں بحراست کہ ساحل نہ ورزد　　نہنگ از ہیبتِ موجش بلرزد

زاں سیلے کہ صد ہاموں بگیرد　　فلک با یک حبابِ اونیرزد　(۳)

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو　　یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے!　(۴)

عشق کے سوز وگداز سے ہمارا دل، دل عشاق سراپا آگ ہے اور بدن میں اس کے دھوئیں کی موج ہے۔ مسلسل تڑپ اس دل کے وجود کا ساز ہے ۔ ذکر نیم شب سے اس کی جمعیت ہے ۔ جیسے پارے کو عود کی لکڑی ساکن کر دیتی ہے ۔

دل ما آتش و تن موج دودش　　تپید دمبدم ساز وجودش

بذکر نیم شب جمعیت او　　چوسیمابے کہ بندد چوب عودش　(۵)

میں اور تو اللہ تعالیٰ کی کھیتی ہیں دل اس کی پیداوار ہے ۔ یہی عروس زندگی کا محمل ہے ۔ غبار راہ یعنی انسان، عقل کی وجہ سے نہیں بلکہ دل یعنی "عشق" کی وجہ سے محرم راز بن گیا ۔ کام کی بات دو حرفوں میں پوشیدہ ہے ۔ مقام عشق منبر نہیں دار ہے۔ ابراہیم نمرودوں سے نہیں ڈرتے کیونکہ عود خام کے لئے آگ کسوٹی ہے ۔ عود آگ میں ڈالی جائے تو خوشبو دیتی ہے ۔

من و تو کشت یزداں، حاصل است ایں　　عروس زندگی را محمل است ایں

---

(۱) بالِ جبریل ۔ ۱۵۷۔　(۲) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۱۴۔　(۳) ایضاً ۔ ۱۱۷۔

(۴) بالِ جبریل ۔ ۱۰۔　(۵) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۱۷۔　(۶) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۱۹۔

غبار راہ شد دانائے اسرار نہ پنداری کہ عقل است ایں ،دل است ایں! (۲)

نہاں اندر دو حرفے سرّکار است مقام عشق منبر نیست ، دار است

براہیماں زنمروداں نترسند کہ عودِ خام را آتش عیار است (۱)

دل عاشق تابدار اور دل بے نیاز کا تعلق اس دنیائے رنگ و بود سے نہیں۔ رہتے ہیں زخود رفتہ جہاں وہ ہے جہاں اور،اس کے شب و روز گردش فلک سے پیدا نہیں ہوتے۔تو اپنی نماز کا وقت خود دریافت کر۔نماز عشق و مستی کی کوئی اذاں نہیں۔

دل بیگانہ خوزیں خاکداں نیست شب و روزش ز دورِ آسماں نیست

تو خود وقت قیام خویش دریاب نماز عشق و مستی را اذاں نیست (۲)

یہ صرف مقام عشق پر فائز عاشقوں کا کام ہے۔ ہر شخص اپنی شخصیت کو گداز کر کے اس کی از سر نو تعمیر نہیں کر سکتا۔ نہ ہر کوئی نیاز مندی کے اندر مستِ ناز رہ سکتا ہے۔ لا الہ کی قبا خونیں قبا ہے۔ جو کہ نامردوں کے قد سے بہت بڑی ہے۔ یہ مجاہدوں و عاشقوں کا لباس ہے۔کہ،

یہ شہادت گہء الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اور پھر کہتے ہیں ،نماز عشق و مستی کا کیا پوچھتا ہے،اس نماز کا رکوع بھی اس کے سجدے کی طرح مقام قرب ہے۔ اس کی ایک تکبیر اللہ اکبر، پانچوں نمازوں سے بڑھ کر ہے۔نماز عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں۔

چہ پرسی از نماز عاشقانہ رکوعش چوں سجودش محرمانہ

تب و تاب یکے اللہ اکبر نہ گنجد در نماز پنجگانہ! (۳)

موم دل ہی عشق و محبت جیسے لطیف جذبے کا آ بگینہ بننے کے لائق ہوتا ہے۔عشق ایسی شراب ہے جسے سنگدل آ بگینے میں رکھنا محال ہے۔ ے عشق کا آ بگینہ جتنا نرم و ملائم اور نازک و شکستہ ہوتا ہے اتنا ہی آئینہ ساز یعنی ''حسن مطلق'' کی نظروں میں عزیز تر ہوتا ہے۔

محبت کے لئے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آ بگینوں میں (۴)

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں (۵)

---

(۱) ارمغان حجاز۔۱۴۰۔ (۲) ایضاً۔۱۴۳۔ (۳) ارمغان حجاز۔۱۴۵۔

(۴) بانگ درا۔۱۰۴۔غزل۔ (۵) ایضاً۔۲۸۱۔غزل۔

اپنی ایک نظم ''اذان'' میں اقبال کہتے ہیں کہ انسان زمین کا ستارا ہے۔اگر یہ ستارہ عشق و مستی میں چور ہو کر شب زندہ دار ہو جائے تو اس کی مشت خاک اوجِ ثریا سے بھی بلند بال ہو سکتی ہے۔ بلکہ ساری کائنات اس کے وجود میں سمٹ کر سما سکتی ہے۔

بولا مہ کامل وہ کوکب ہے زمینی تم شب کو نمودار ہو ، وہ دن کو نمودار!
واقف ہو اگر لذت بیداریء شب سے اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پر اسرار!
آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار (۱)

سیدھے سادھے الفاظ میں عشق پر یہ سیر حاصل تبصرہ پیش کر دیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق سبھی کچھ ہے۔ ایسا کوئی مثبت پہلو باقی نہیں رہ جاتا ، عشق جس کا احاطہ نہ کرتا ہو۔ لیکن عشق سے متعلق ان گنت اوراق ، بلکہ پوری کائنات بھی لکھ کر سیاہ کر دی جائے تو پھر بھی تشنگی اپنی جگہ ضرور موجود رہے گی۔ لہٰذا اس سلسلے میں اقبال کا یہ اعتراف کر لینا ہی عشق کی بہترین تعریف ہے کہ:۔

زباں اگر چہ دلیراست و مدعا شیریں سخن زعشق چہ گویم جز ایں کہ نتواں گفت (۲)

مگر یہ بھی ضرور ہے کہ لمبی چوڑی بحثوں اور تجربات و مشاہدات کے علاوہ اختصار اور جامعیت کے ساتھ ، سو باتوں کی ایک بات کہ عشق:۔

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است! (۳)

راہ عشق کا مسافر خرد و فلسفے کی بیڑیوں سے بالکل آزاد ہوتا ہے۔ زمان و مکاں کے پھندے عاشق باصفا اور صاحب ذوق وشوق جیسے ''مردحر'' و مردفقیر کے لئے طوق گلو نہیں بن سکتے۔ تاثیر عشق کی بدولت عاشق ''مرد قلندر'' بن جاتا ہے اس طرح اس کے سامنے سکندر کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ ازل و ابد اس کی مٹھی میں بند ہو کر رہ جاتے ہیں۔۔اسے اس بات کا پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ:۔

اصل وقت از گردش خورشید نیست وقت جاوید است و خور جاوید نیست (۴)

یہی وجہ ہے کہ مرد حر اپنے آپ کو مٹی سے باہر نکالتا ہے اور زمانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ عاشق و قلندر کی

---

(۱) بال جبریل ۔ ۱۳۵۔ (۲) زبور عجم ۔ ۶۷۔ (۳) ارمغان حجاز ۔ ۳۹۔ (۴) اسرار و رموز ۔ ۷۲۔

ہمت تقدیر کی مشیر بن جاتی ہے۔ واقعات زمانہ اس کے ہاتھ سے صورت پذیر ہوتے ہیں۔

مرد حر خود را زگل بری کند — خویش را بر روزگاراں می تند

ہمت حربا قضا گردد مشیر — حادثات از دست او صورت پذیر (۱)

جب عشق اللہ تعالیٰ سے خودی کا طالب ہوا تو ساری دنیا سواری بنی اور صاحب ذوق وشوق اس کا سوار۔

چوں خودی را از خدا طالب شود — جملہ عالم مرکب او راکب شود (۲)

عشق بر ناقۂ ایام کشد محمل خویش — عاشقی ؟ راحلہ از شام و سحر باید کرد (۳)

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق (۴)

مہرومہ و انجم کا محاسب ہے قلندر! — ایام کا مرکب نہیں ، راکب ہے قلندر! (۵)

ہر کہ اندر دست او شمشیر لاست — جملہ موجودات را فرما نرواست (۶)

اگر مومن لا الہ سے حرارت اور چمک پالے تو سورج اور چاند اس کی اجازت کے بغیر گردش نہ کریں۔

گر بگیرد سوز و تاب از لا الہ — جز بکام او نہ گردد مہرومہ (۷)

مومن اللہ تعالیٰ کے عشق سے قائم ہے۔ اور عشق کا وجود مومن سے ہے۔ وہ چیزیں جو ہمارے لئے ناممکن ہیں وہ عشق کے نزدیک ممکن ہیں۔

مومن از عشق است و عشق از مومن است — عشق را ناممکنِ ما ممکن است (۸)

عشق مرد فقیر کا رشتہ حسن مطلق سے جوڑ دیتا ہے جب عاشق ساری کائنات کا راکب ہے تو عشق بھی لازمی طور پر ہر ایک چیز پر حاوی ہے۔ عشق سبھی کچھ ہے۔ اگر چہ دل آب وگل (بدن) کے قید خانے میں ہے، مگر جذبہ عشق کے باعث یہ سارا آفاق دل ہی کا آفاق ہے۔

گرچہ دل زندانیٔ آب و گل است — ایں ہمہ آفاق آفاق دل است! (۹)

عشق کی ابتدا چوٹ اور انتہا وہ فقر ہے جس سے اسرار جہانگیری کھلتے ہیں، اس فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری، اس فقر میں ہے میری، سرمایۂ شبیری۔ اسی لئے تو:۔

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۴۳۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۲۳۔ (۳) زبور عجم۔ ۸۵، اور جاوید نامہ میں بھی ص۔ ۹۳۔ (۴) ضرب کلیم۔ ۴۴۔ کافر و مومن۔

(۵) ضرب کلیم۔ ۴۱۔ (۶) پس چہ باید کرد۔ ۱۹۔ (۷) ایضاً۔ ۱۴۔ (۸) اسرار و رموز۔ ۱۰۹۔ (۹) جاوید نامہ۔ ۲۰۶ (۱۰) بال جبریل۔ ۵۶۔

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی (۱۰)

ایسا اس وقت ہوتا ہے جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوجاتی ہے ۔ اس ضمن میں حضرت بوعلی قلندر پانی پتی (پیدائش ۹۔۱۲۰۸ضلع کرنال پانی پت) کا ذکر ناگزیر ہے ۔"اقبال کے محبوب صوفیہ" میں اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں :۔

"ایک مرتبہ ملک نائب نے جو ایک خواجہ سرا تھا ۔ اور سلطان علاؤ الدین کا نہایت منہ چڑھا تھا ۔ اس نے حضرت بو علی قلندر کے ایک درویش کو ایذا پہنچائی ۔ حضرت بوعلی قلندر کو معلوم ہوا تو آپ نے سلطان علاؤ الدین کو ایک خط ملک نائب کے ظلم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لکھا:۔

علاؤالدین شحنہ را اعلام" آنکہ خواجہ سرائے ۔۔۔۔ یکے از درویشاں را رنجانید ، وعرش الرحمان را بلرزہ آورد ، اگراورا بسزا رسانیدی بہتر ، والا بجائے تو شحنہ دیگر بہ دہلی نشانیدہ خواہد شد" (۱)

یہ دیدہ دلیری اور خود اعتمادی آتش عشق میں کندن شدہ مرد فقیر ہی کر سکتا ہے کہ بادشاہ وقت کو نہ صرف شحنہ (کوتوال) کہے ۔ بلکہ اسے واشگاف الفاظ میں تخت و تاج سے محروم کر دینے کا بھی جراءت مندانہ اقدام کر سکے ۔ علامہ اقبال مردفقیر کے اس جراءت آموز واقعے کا ذکر اسرار خودی میں کرتے ہیں کہ جب خودی عشق الٰہی سے مستحکم ہو جاتی ہے تو اس کی قوت زمانے کی فرمانروا بن جاتی ہے ۔ بوڑھا آسمان جس نے ستاروں سے آرائش کی ہے ، اس کی شاخوں کے غنچے (ستارے) ٹوٹ گرتے ہیں ۔ عاشق کی قسمت میں ستاروں کا عمل دخل ختم ہو جاتا ہے :۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے (۲)

تو اپنی سرنوشت اپنے قلم سے لکھ خالی رکھی ہے خامہء حق نے تری جبیں! (۳)

اقبال پھر فرماتے ہیں ۔ اے وہ شخص جو یہ کہتا ہے یہ ہونا تھا یہ ہوکے رہا۔ کام ایک آئین کے پابند تھے ۔ اس لئے ایسا ہوا۔ تو تقدیر کے معنی نہیں سمجھا۔ نہ تو خودی کو سمجھا اور نہ اللہ تعالیٰ کی شان کو ۔ مرد مومن اللہ تعالیٰ کے ساتھ راز و نیاز رکھتا ہے اور کہتا ہے ہم نے آپ سے موافقت کی ۔ آپ ہم سے موافقت کریں ۔ مرد مومن کا عزم اللہ تعالیٰ کی تقدیرات کا خلاق ہے ۔ جنگ کے دن اس کا تیر اللہ تعالیٰ کا تیر بن جاتا ہے ۔

اے کہ گوئی بودنی ایں بودشد کار ہا پابند آئیں بودشد

---

(۱)اقبال کے محبوب صوفیہ ۔۲۳۱۔ (۲) بال جبریل ۔۵۵۔ (۳) ضرب کلیم ۔۱۷۶۔

معنیٔ تقدیر کم فہمیدۂ نے خودی را نے خدا رادیدۂ
مرد مومن باخدا دارد نیاز باتو ما سازیم تو باما ساز
عزم او زخلاقِ تقدیرِ حق است روز ہیجا تیرِ او تیرِ حق است! (۱)

جب بندۂ مومن اپنے آپ کو رضائے الٰہی میں گم کر دیتا ہے، تو وہ قضائے الٰہی بن جاتا ہے۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود بندۂ مومن قضائے حق شود (۲)

ایسی منزل پر اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہو جاتا ہے۔ اس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز
خاکی ونوری نہاد بندۂ مولاصفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز (۳)
بے جراءت رندانہ ہر عشق ہے روباہی بازو ہے خودی جس کا وہ عشق یداللّہی! (۴)
خرقۂ خود باراست بردوش فقیر چوں صبا جز بوے گل ساماں مگیر (۵)

ایسا شخص دنیا کے معاملات کے فیصلے کرتا ہے، دارا وجم جیسے بادشاہ بھی اس کے حکم کے تابع فرماں ہوتے ہیں۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ:۔

میں تمہیں بوعلی قلندرؒ کا واقعہ سناتا ہوں، اطراف ہند میں ان کا نام مشہور ہے۔ ''باغ کہن'' کے اس ترانے سنانے والے نے ہم سے گل رعنا کی بات کہی ہے۔ (جنت کا یہ خطہ) جو باعث بت پرستی آتش نہاد بنا ہوا تھا۔ اس کی ہوائے دامن سے واقعی بہشت کی مثال بن گیا۔ ان کا مرید بازار کی طرف گیا وہ حضرت بوعلی کی شراب معرفت سے سرمست تھا۔ اس شہر کے حاکم کی سواری بھی ادھر سے گزری، حاکم کے ساتھ کئی غلام اور چوبدار تھے۔ ان میں سے ایک نے آواز دی کہ اے بے سمجھ! حاکم کے ہمراہیوں کا راستہ نہ روک۔ مگر وہ درویش سر جھکائے اپنے افکار میں مست اسی طرح چلتا رہا، دوسری طرف چوبدار اپنے تکبر میں مست تھا، اس نے درویش کے سر پر لاٹھی دے ماری۔ فقیر حکمران کے ہاتھوں آزردہ خاطر، رنجیدہ، ناخوش اور افسردہ ہوگیا۔ اس نے بوعلی کے سامنے فریاد کی اور آنکھوں سے آنسو بہائے۔ اس کی فریاد سن کر شیخ پہاڑ

---

(۱) جاوید نامہ۔۱۲۲۔ (۲) پس چہ باید کرد۔۱۳۔ (۳) بال جبریل۔۹۷۔ ''مسجد قرطبہ''۔
(۴) ضرب کلیم۔۱۷۴۔ (۵) پس چہ باید کرد۔۹۔

پر گرنے والی بجلی کی مانند اپنی گفتگو سے شعلہ بار ہوئے ۔ ساتھ ہی اس کے اندر سے ایک اور طرح کی آگ نے سر اٹھایا۔ اپنے منشی کو بلا کر فرمایا۔ قلم اٹھا اور اس فقیر سے ، پادشاہ کی طرف فرمان لکھو۔ میرے درویش کو تیرے عامل نے سر پر لاٹھی ماری ہے۔ گویا اس نے ایسا کام کیا ہے جو اس کی متاع جان کو جلا دے گا ۔ اس بدنہاد عامل کو یہاں سے واپس بلا ، ورنہ میں تیری بادشاہت کسی اور کو دے دوں گا ۔ اس خدا رسیدہ بندے کے مکتوب نے بادشاہ کے بدن پر کپکپی طاری کر دی۔ اس کے رگ و پے میں رنج و غم کا طوفاں اٹھ آیا اور اس کا چہرہ آفتاب شام کی طرح زرد پڑ گیا ۔ اس نے حاکم کی گرفتاری کا حکم دیا اور قلندر سے اپنی غلطی کی معافی کا خواستگار ہوا ۔ اور امیر خسروؒ جو شیریں زبان اور رنگیں بیان تھے ۔ جن کی فطرت چاندنی کی مانند روشن تھی ، انہیں اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ جب امیر خسرو نے قلندر کے سامنے ساز سے نغمہ گایا تو ان کی آواز نے درویش کے شیشہ ء جاں کو پگھلا دیا ۔ وہ سطوت جو پہاڑ کی مانند مستحکم تھی ، ایک نغمے نے اسے خرید لیا۔ درویشوں کے دل زخمی نہ کر۔ ایسا کرنا اپنے آپ کو بھڑکتی آگ میں ڈالنے کے مترادف ہے ۔

از محبت چوں خودی محکم شود   قوتش فرمانده ٔ عالم شود

پیر گردوں کز کواکب نقش بست   غنچہ ہا از شاخسار او شکست

پنجہ او پنجہ حق می شود   ماہ از انگشتِ او شق می شود

در خصومات جہاں گردد حکم   تابع ء فرمان او دارا و جم

با تو میگویم حدیث بو علیؒ   در سواد ہند نام او جلی

آں نوا پیرائے گلزار کہن   گفت با ما از گل رعنا سخن

خطہ ایں جنّتِ آتش نژاد   از ہوائے دامنش مینو سواد

کوچک ابدالش سوے بازار رفت   از شراب بو علی سرشار رفت

عاملِ آں شہری آمد سوار   ہمرکاب او غلام و چوبدار

پیشرو زد بانگ اے ناہوشمند   بر جلو دارانِ عامل رہ مبند

رفت آں درویش سر افگندہ پیش   غوطہ زن اندریم افکار خویش

چوبدار از جام استکبار مست | بر سر درویش چوب خود شکست
از رہ عامل فقیر آزردہ رفت | دلگران و ناخوش و افسردہ رفت
در حضور بو علیؒ فریاد کرد | اشک از زندان چشم آزاد کرد
صورتِ برقے کہ بر کہسار ریخت | شیخ سیل آتش از گفتار ریخت
از رگ جاں آتش دیگر کشود | با دبیرے خویش ارشادے نمود
خامہ را برگیر و فرمانے نویس! | از فقیرے سوے سلطانے نویس!
بندہ ام از عاملت بر سر زدہ است | بر متاع جان خود اخگر زدہ است
باز گیر ایں عاملے بدگو ہرے | ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے
نامۂ آں بندۂ حق دستگاہ | لرزہ ہا انداخت در اندام شاہ
پیکرش سرمایۂ آلام گشت | زرد مثل آفتاب شام گشت
بہر عامل حلقۂ زنجیر جست | از قلندر عفواِیں تقصیر جست
خسروِ شیریں زباں، رنگیں بیاں | نغمہ ہائش از ضمیر کن فکاں
فطرتش روشن مثال ماہتاب | گشت از بہر سفارت انتخاب
چنگ را پیش قلندر چوں نواخت | از نوائے شیشۂ جانش گداخت
شوکتے کو پختہ چوں کہسار بود | قیمت یک نغمۂ گفتار بود

نیشتر بر قلب درویشاں مزن
خویش را در آتش سوزاں مزن (۱)

اسی لئے تو اقبال کے نزدیک:۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ | ہو جس کی فقیری میں بوئے اسدُ اللّٰہی! (۲)

کبھی کوئی کلیم، جو کلاہ اور گدڑی کے بغیر فقیری شان رکھتا ہے بادشاہت سے ٹکرا جاتا ہے۔ یہ بھی تقدیر کے کھیل

---

(۱) اسرار خودی۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۵۷۔

ہیں۔ کہ کبھی نسیم سے صرصر کا کام لے لیا جاتا ہے۔

درافتد باملوکیت کلیمے فقیرے، بے کلا ہے ، بے گلیمے
گہے باشد کہ بازی ہائے تقدیر بگیرد کار صرصر از نسیمے ! (۱)

گویا کہ سینے میں آتش عشق کی دولت رکھنے والے مرد فقیر کا درجہ بادشاہوں سے بھی بلند ہوتا ہے۔ جب کوئی اہل ایماں بادشاہ اس راز سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ بھی اپنے اندر صفات ''فقر'' پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کا یہی حال تھا۔ وہ شاہی پر فقیری کو ترجیح دیتا تھا۔ علامہ اقبال نے بوعلی قلندر کی طرح اورنگزیب عالمگیر کے عشق و تپش اور میری میں فقیری کا ایک واقعہ '' حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیرؒ'' کے عنوان سے نظم کیا ہے۔

شاہ عالمگیر گردوں آستاں اعتبار دود مان گورگاں
پایہ اسلامیاں برتر ازو احترام شرع پیغمبرؐ ازو
درمیان کار زار کفر و دیں ترکشِ ما را خدنگ آخریں
تخم الحاد کہ اکبر پرورید باز اندر فطرت دارادمید
شمع دل در سینہ ہا روشن نبود ملت ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را آں فقیرِ صاحب شمشیر را
از پے احیاے دیں مامور کرد بہر تجدید یقیں مامور کرد
برق تیغش خرمن الحاد سوخت شمع دیں در محفل ما برفروخت
کوروذوقاں داستانہا ساختند وسعت ادراک او نشناختند
شعلہ توحید را پروانہ بود چوں براہیم اندریں بتخانہ بود

درصف شاہنشہاں یکتاستے
فقرِ او از ترتپش پیدا استے

روزے آں زیبندۂ تاج و سریر آں سپہدار و شہنشاہ و فقیر

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔۹۰۔

صحگاہاں شد بہ سیر بیشہء | با پرستارے وفا اندیشہء
سرخوش از کیفیت باد سحر | طائراں تسبیح خواں بر ہر شجر
شاہ رمز آگاہ شد محو نماز | خیمہ برزد درحقیقت از مجاز
شیر ببر آمد پدید از طرف دشت | از خروش او فلک لرزندہ گشت
بوئے انساں دادش از انساں خبر | پنجہ عالمگیر رازو برکمر
دستِ شہ نادیدہ خنجر بر کشید | شرزہ شیرے را شکم از ہم درید
دل بخود راہے نداد اندیشہ را | شیر قالیں کرد شیر بیشہ را
باز سوے حق رمیدآں ناصبور | بود معراجش نماز باحضور
ایں چنیں دل خود نما و خود شکن | دارد اندر سینہء مومن وطن
بندۂ حق پیش مولیٰ لاستے | پیش باطل از نعم برجاستے
تو ہم اے ناداں دلے آوربدست | شاہدے را محملے آوربدست
خویش را درباز و خود را بازگیر | دام گستراز نیاز و نازگیر
عشق را آتش زن اندیشہ کن | روبہء حق باش و شیری پیشہ کن

خوف حق عنوان ایمان است و بس
خوف غیر از شرک پنہان است و بس (۱)

آسماں مرتبت شہنشاہ عالمگیر جو خاندان تیمور کے لئے باعث افتخار ہے ۔اس کی وجہ سے مسلمانوں کی عزت افزائی ہوئی ۔ اس کے عہد میں آپؐ کی شریعت کا احترام قائم ہوا ۔ کفر و دیں کی کشمکش میں وہ ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا ۔ اکبر نے الحاد کے جس بیج کو بویا اور اس کی نشوونما کی اس نے دوبارہ داراشکوہ کے روپ میں سر اٹھایا ۔ سینوں کے اندر دلوں کی شمعیں گل ہو چکی تھیں ۔ اور ہماری ملت اسلامیہ کو فساد کا خطرہ درپیش تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں عالمگیر کو منتخب فرما لیا۔ وہ عالمگیرؒ جو فقیر صاحب شمشیر تھا ۔ اور اسے احیاء دین وتجدید ایمان کے لئے مامور فرمایا۔ اس کی تلوار الحاد کے خرمن پر بجلی بن

---

(۱) رموزِ بیخودی ۔ ۹۸ ۔ ۹۹۔

کر گری اور اسے جلا کر ہمارے درمیاں شمع دیں روشن کر دی۔ بے سمجھ لوگوں نے اس کے بارے میں من گھڑت کہانیاں گھڑ لیں ۔ وہ اس کی ذہنی وسعت کا اندازہ نہ کر سکے ۔ وہ شمع توحید کا پروانہ تھا ۔ وہ بت خانہ ہند کے ابراہیم ثابت ہوئے ۔ وہ شہنشاہوں کی صف میں یکتا ہیں ۔ ان کا فقر ان کے صبر سے ظاہر ہے ۔ وہ زینت تخت و تاج و وہ جو بیک وقت سپہ سالار،شہنشاہ اور فقیر تھا ۔ ایک روز صبح کے وقت ایک عقید تمند اور وفادار ساتھی کے ساتھ جنگل کی سیر کو نکلا ۔ بادصبا کی کیفیت سے سرخوش ہو کر پرندے ہر درخت پر حمد کے نغمے الاپ رہے تھے ۔ وہ حقیقت شناس بادشاہ بھی نماز میں محو ہوگیا۔ اس نے مجاز سے خیمہ اٹھایا اور حقیقت میں نصب کر لیا ۔ جنگل کی طرف سے ایک ببر شیر نکلا ۔ اس کی دہاڑ سے آسماں لرزہ براندام ہوگیا۔ بوئے انسان نے اسے موجودگی آدم کی خبر دے دی۔ نزدیک آ کر شیر نے عالمگیر کی کمر پر پنجہ مارا ۔ بادشاہ نے اسے بن دیکھے ، خنجر نکالا اور غضبناک شیر کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ وہ ذرا نہ گھبرایا اور اس نے ایک ہی وار سے ، جنگل کے شیر کو شیر قالین بنا دیا ۔ بعد ازاں وہ شیدائے عبادت پھر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اسے نماز میں معراج کی سی کیفیت حاصل تھی ۔ مومن کے سینے میں ایسا ہی خودنما و خودشکن دل جاگزیں ہوتا ہے ۔ صاحب ذوق وشوق یعنی بندۂ حق اللہ تعالیٰ کے سامنے لا (خود شکن) ہے ۔ اور باطل کے سامنے "نعم" (خودنما) ہے ۔ اے نادان تو بھی اپنے سینے میں ایسا دل پیدا کر جو محبوب (حسن مطلق) کا محمل ہو۔ اپنے آپ کو قربان کر کے اپنے آپ کو پالے ۔ نیاز کا دام بچھا کر ناز کو شکار کرے۔ عشق سے وسوسوں کو جلا دے ۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور شیر بن جا ۔ اللہ تعالیٰ کا خوف ہی ایمان کا عنوان ہے اور شرک خوفِ غیر ہی سے عبارت ہے۔ مرد قلندر کا فقر عشق سے فیضیاب ہو کر شاہوں کا شاہ بن جاتا ہے ۔ اسی لئے تو مرد فقیر عشق و فقر کے مرکز یعنی دل سے کہتا ہے کہ اے دل !جب تک تو میرے پہلو میں ہے میری گودڑی شاہوں کے لباس سے بہتر ہے ۔ کیا تو مرنے کے بعد بھی میرے سینے میں رہے گا ؟ میں اس خیال سے امید و بیم میں ہوں ۔

تو اے دل تا نشینی درکنارم ‏ زتشریف شہاں خوشتر گلیم
درون سینہ ام باشی پس از مرگ؟ ‏ من از دست تو در امید و بیم (۱)

بے شک "ہرگز نمیرد" کے مصداق:۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے ‏ جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے (۲)

---

(۱) پیامِ مشرق ۔ ۶۷۔ ‏ (۲) بالِ جبریل ۔ ۱۰۔

لیکن اس کا ذکر ذرا بعد میں آئے گا۔

مردفقیر دنیا کی لالچ نہیں کرتا اس لئے اقبال کہتے ہیں مرد قلندر کے نمونے کے طور پر میں فقیر بے نیاز ہوں یہی میرا طریق ہے، میں ٹوٹ تو سکتا ہوں، لیکن مومیائی کی طرح گدائی نہیں کرسکتا۔

من فقیرے بے نیازم مشربم ایں است و بس　　مومیائی خواستن نتواں ، شکستن می تواں　(۱)

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دل فریب ، اس کی نگہ دل نواز

اس کا مقام بلند ، اس کا خیال عظیم　　اس کا سرور اس کا شوق ، اس کا نیاز ، اس کا ناز　(۲)

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات　　تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن　(۳)

جذبۂ عشق سے لبریز مردفقیر دنیا کی ہوس اور دنیا والوں کی پرواہ کیوں کرے۔ آخر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ :۔۔

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے!　　خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے　(۴)

نہ از خرابۂ ما کس خراج می خواہد　　فقیر راہ نشینم و شہریار خودیم

نگہ بلند ، سخن دل نواز جاں پرسوز　　یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے　(۵)

چہ باید مردے راطبع بلندے مشرب نابے　　دل گرمے نگاہ پاک بینے ، جان بے تابے　(۶)

خاقانی ہو یا فغفوری، جمشیدی ہو یا دارائی سب کا سورج زوال پذیر ہے۔ یہ سوراستوں سے آسمان پر چڑھتی ہیں اور سوراستوں سے زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ فقیر بذات خود سلطنت ادوار کا حکمران و بادشاہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس راہ نشین کو نگاہ کی تلوار عطاء کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردفقیر نہ بادشاہوں کے نازنخرے اٹھاتا ہے اور نہ ان کی نظر کرم کا زخم کھاتا ہے۔

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے　　انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری　(۷)

فقیر راہ کو بخشے گئے اسرار سلطانی　　بہا میری نوا کی دولت پرویز ہے ساقی　(۸)

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرت پرویز　　خدا کی دین ہے سرمایۂ غم فرہاد!　(۹)

حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج　　بے کلاں و بے سپاہ و بے خراج

حرف شوق آوردہ ام ازمن پذیر　　از فقیرے رمز سلطانی بگیر　(۱۰)

---

(۱) پیام مشرق ۔۱۶۰۔ (۲) بال جبریل ۔ ۹۷۔ مسجد قرطبہ ۔ (۳) بال جبریل ۔ ۳۱۔ (۴) ایضاً۔ ۴۸۔ (۵) ایضاً۔ ۴۹۔ (۶) بانگ درا ۔ ۲۷۲۔ "طلوع اسلام"۔ (۷) ضرب کلیم ۔۴۳۔ (۸) بال جبریل ۔ ۱۱۔ (۹) بال جبریل۔ ۷۰۔ (۱۰) پس چہ باید کرد ۔ ۸۱۔ "مثنوی مسافر"۔ (۱۱) پیام مشرق ۔ ۱۶۸۔

صدرہ بفلک برشدُ، صدرہ بہ زمیں درشد — خاقانی و فغفوری ، جمشیدی و دارائی (۱۱)

فقر را نیز جہاں بان و جہانگیر کند — کہ بایں راہ نشیں تیغ نگاہے بخشد (۱)

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے — فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنہء ملت بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے (۲)

نازشہاں نمی کشم ، زخم کرم نمی خورم — در نگرائے ہوس فریب ہمت ایں گدائے را (۳)

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے — وہ فقر جس میں ہے ،بے پردہ روح قرآنی

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی — یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار — اسی مقام سے آدم ہے ظل سبحانی

یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے — کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی (۴)

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ:۔

ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن (۵)

اگر چہ فقیر کا سر تاج وکلاہ سے مزین نہیں مگر تیری گلی کا گدا کسی پادشاہ سے کم نہیں ۔ جو ذات ایک ہی ہاتھ سے ملک سلیمان جیسی کئی سلطنتیں چھین لیتی ہے ۔ اس کا اپنے فقیرو درویش کو دونوں جہاں بخش دینا دیکھئے ۔ گویا کہ بمطابق ذوق جمالِ اقبال فقیر صاحب لولاک ہوتے ہوئے ''حسن مطلق'' تک رسائی حاصل کر سکتا ہے ۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر (۶)

اگر چہ زیب سرش افسر و کلاہے نیست — گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہے نیست (۷)

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ (۸)

ازل سے فطرت احرار میں ہیں دوش بدوش — قلندر و قباپوشی و کلہ داری! (۹)

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے — یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی (۱۰)

چوں بہ کمال می رسد فقر دلیل خسروی است — مسند کیقباد را درتہء بوریا طلب (۱۱)

---

(۱) پیامِ مشرق ۔۱۷۲۔(۲) ضرب کلیم۔ ۵۰۔ (۳) پیامِ مشرق۔۱۶۲۔ (۴) ضرب کلیم ۔ ۳۱۔۳۲۔ (۵) ضرب کلیم ۔ ۴۵۔ مومن۔ (۶) بال جبریل ۔ ۴۷۔ (۷) پیامِ مشرق ۔۱۸۱۔ (۸) بال جبریل ۔ ۷۷۔ (۹) ضرب کلیم۔ ۴۳۔ مردانِ خدا ۔ (۱۰) بال جبریل ۔ ۱۳۶۔ (۱۱) زبورِ عجم ۔ ۱۱۵۔

فقر جب کمال کو پہنچتا ہے تو پادشاہت کا ذریعہ بن جاتا ہے کیقباد کا تخت فقراء کے آستانوں میں تلاش کر فقیر کے سامنے سکندر، دارا، کیقباد اور خسرو اس پر کاہ کی مانند ہیں جو راہگزار میں پڑا ہو۔

چوں پرکاہ کہ در رہگذر باد افتاد — رخت اسکندر و دارا و قباد و خسرو (۱)

ہر کہ سنگ راہ را داند زجاج — گیرد آں درویش از سلطاں خراج (۲)

آں کہ یک دست برد ملک سلیمانے چند — بافقیراں دو جہاں باختنش را نگرید (۳)

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی — کیا ہے اس نے فقیروں کو وارث پرویز (۴)

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے! (۵)

دونوں جہاں کی وسعت بھی فقیروں کے شایان شان نہیں۔یہ بھی ہمارا راستہ ہے وہ بھی ہمارا راستہ ہے۔منزل اس سے بھی آگے ہے۔یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دو" تخت نشین بادشاہ ایک سلطنت میں نہیں سماتے، حیران کن حقیقت تو یہ ہے کہ ایک فقیر خاک نشیں دونوں جہانوں میں نہیں سماتا۔

شایانِ جنونِ ماپہنائے دوگیتی نیست — ایں راہگذر مارا آں راہگذر مارا! (۶)

اونگنجد درجہانِ چون و چند — تہمتِ ساحل بایں دریا مبند (۷)

چہ عجب اگر دو سلطاں بہ ولایتے نگنجند — عجب ایں کہ می نگنجد بہ دو عالمے فقیرے (۸)

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی — سما سکا نہ دوعالم میں مرد آفاقی (۹)

اقبال نے معمول کے مطابق اچھا لباس پہنا اور معمول کے مطابق دنیا کے کاموں میں مشغول رہا۔لیکن اس کے باوجود وہ درویش ہے۔پس سمجھ لے کہ درویشی کا تعلق فقیروں کی کلاہ وگدڑی یا مخصوص لباس سے نہیں۔

اقبال قباپوشد درکار جہاں کوشد — دریاب کہ درویشی بادلق و کلا ہے نیست (۱۰)

فقیروں وقلندروں کی نگاہ مہ وپروین سے بلند تر ہے۔وہ کہکشاں کو بھی اپنے آشیانے کے لئے پسند نہیں کرتے۔ وہ انجمن میں رہتے ہوئے بھی انجمن سے لاتعلق ہوتے ہیں۔وہ خلوت میں ہیں مگر ہر کسی کے ساتھ بھی ہیں۔ان عاشقان صادق کو بہ نظر حقارت نہیں دیکھنا چاہیئے۔کہ یہ بظاہر کم قیمت دکھائی دیتے ہیں۔لیکن دراصل یہی متاع انسانیت ہیں۔وہ

---

(۱) زبور عجم۔۱۳۰۔(۲) پس چہ باید کرد۔۲۶۔(۳) زبور عجم۔۳۶۔(۴) بال جبریل۔۱۶۔(۵) بال جبریل۔۳۴۔(۶) زبور عجم۔۴۸۔
(۷) پس چہ باید کرد۔۸۳۔مثنوی مسافر۔(۸) زبور عجم۔۱۰۔(۹) بال جبریل۔۶۶۔(۱۰) زبور عجم۔۱۰۵۔

غلاموں کو آزادی کا پروانہ عطا کرتے ہیں ۔ کیوں کہ شیخ و برہمن امیر بے قافلہ کی مانند ہیں ۔ پیالہ اٹھا کر کہتے ہیں کہ شراب حلال ہے ۔ حدیث اگر چہ غیر معروف ہے ۔ مگر راوی ثقہ ہے ۔

نگاہ از مہ و پرویں بلند تر دارند   کہ آشیاں بگریبان کہکشاں نہ نہند
بروں از انجمنے درمیان انجمنے   بخلوت اند ولے آنچناں کہ باہمہ اند
بچشم کم منگر عاشقانِ صادق را   کہ ایں شکستہ بہایاں متاع قافلہ اند!
بہ بندگاں خطِ آزادگی رقم کردند   چنانکہ شیخ و برہمن شبان بے رمہ اند
پیالہ گیر کہ مے راحلال می گویند   حدیث اگر چہ غریب است راویاں ثقہ اند   (۱)

یہ بوریا نشیں فقیر کبھی دلائل و فصاحت سے بھی کام لیتے ہیں اور کبھی حق کا بول بالا کرنے کی غرض سے شمشیر و سناں بھی استعمال کرتے ہیں ۔ کبھی خرقہ کے نیچے زرہ بھی پہن لیتے ہیں ۔ کہ اہل محبت تقاضا ہائے عشق کے مطابق عمل پیرا رہتے ہیں ۔ جب دنیا فرسودہ ہو جاتی ہے تو اس کا نام ونشاں مٹا دیتے ہیں اور پھر اسی آب وگل سے نیا جہاں پیدا کرتے ہیں ۔

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر   نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر   (۲)

اقبال کہتے ہیں کہ میں فقیر ہو کر بھی بادشاہوں سے نگاہ التفات کی آرزو کروں ؟ مسلمان مٹی کا خدا نہیں بناتا ۔ مرد فقیر کی حیثیت سے میرے سینے کے اندر جو دل بے نیاز ہے ، وہ گداؤں کو شاہانہ انداز عطا کرتا ہے ۔ ہر دم درویشی کے نشے میں مست رہ ۔ جب فقر میں پختہ ہو جائے تو پھر سلطنت جم کے خلاف معرکہ آرا ہو مجھ سے پوچھا ، کیا ہمارا جہاں تجھے موافق آیا ۔ میں نے عرض کیا موافق تو نہیں آیا ، کہنے لگے اسے زیر وزبر کر دے ۔ گویا کہ کاروبار کائنات میں بھی فقیر کی مرضی چلتی ہے ۔ اس لئے کہ وہ مقامِ معرفت پر فائز ہوتا ہے ۔

زسلطاں کنم آرزوئے نگاہے!   مسلمانم از گل نہ سازم الٰہے
دل بے نیاز ے کہ درسینہ دارم   گدارادھد شیوۂ پادشاہے
بانشہ درویشی درسازودما دم زن   چوں پختہ شوی خود رابرسلطنت جم زن
گفتند جہانِ ما ۔ آیا بتومی سازد؟   گفتم کہ نمی سازد ! گفتند کہ برہم زن!   (۳)

---

(۱) زبورِ عجم ۔ ٦٩ ۔   (۲) بالِ جبریل ۔ ١٤٧ ۔   (۳) زبورِ عجم ۔ ٧٤ ۔ ٧٥ ۔

میرا فقر سامان کلیم رکھتا ہے۔ میری گدڑی کے نیچے شوکت شہنشاہی پوشیدہ ہے۔ میں وہ مردفقیر ہوں کہ خاک ہوتے ہوئے صحرا میں نہیں سماتا۔ اگر پانی ہوں تو دریا میں نہیں سماتا۔ میرے شیشے کا دل لرزتا ہے۔ میرے افکار کا سمندر بے کنار ہے۔ میرے اندر قوموں کی تقدیر پنہاں ہے۔ میری آستیں میں قیامتیں پرورش پا رہی ہیں۔ فقیر و قلندر کی حیثیت سے میں نے ایک لحہ اپنے اندر خلوت گزیں ہو کر جہان لازوال پیدا کیا ہے۔

مرا بافقر سامان کلیم است   فرِ شہنشاہی زیر گلیم است
اگر خاکم بصحرائے نہ گنجم   اگر آبم بہ دریا ئے نہ گنجم
دلِ سنگ از زجاجِ من بلرزد   یم افکارِ من ساحل نہ ورزد
نہاں تقدیر ہا در پردۂ من   قیامت ہا بغل پروردۂ من
دمے درخویشتن خلوت گزیدم   جہانے لا زوالے آفریدم (۱)

گویا کہ:۔

دربارِ شہنشہی سے خوشتر   مردانِ خدا کا آستانہ! (۲)

مردان خدا ایک نگاہ محبت کے لئے اپنا سارا سرمایہ دے دیتے ہیں۔ یہ کیسے لوگ ہیں کہ خوشی خوشی نقصان کا سودا کر لیتے ہیں۔ جو کچھ موجِ ہوا پر کاہ سے کرتی ہے۔ یہی کچھ عاشقان خدا کوہ گراں سے بھی کر سکتے ہیں۔

تکیہ برحجت و اعجاز بیاں نیز کنند   کار حق گاہ بشمشیر و سناں نیز کنند
گاہ باشد کہ تہ خرقہ زرہ می پوشند   عاشقان بندۂ حال اند و چنا نیز کنند
چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند اورا   وزہماں آب و گل ایجادِ جہاں نیز کنند
ہمہ سرمایۂ خود رابنگاہے بدہند   ایں چہ قومے است کہ سودا بزیاں نیز کنند
آنچہ از موجِ ہوا باپرکاہے کردند   عجبے نیست کہ باکوہِ گراں نیز کنند (۳)

مردفقیر آگ ہے "میری و قیصری" خس ہے۔ بادشاہوں کے فال و فر کو مٹانے کے لئے ایک حرف برہنہ کافی ہے۔ دبدبۂ قلندری سارے کا سارا جذبۂ کلیم ہے، عشق، صداقت و قوت ہے۔ جبکہ طنطنۂ بادشاہی محض سحر سامری ہے۔ قلندر نگاہ سے

---

(۱) زبور عجم۔ ۱۴۶۔   (۲) ضرب کلیم۔ ۸۷۔   (۳) زبور عجم۔ ۷۱۔

دلوں کو فتح کرتا ہے۔ بادشاہ فوج سے کشت و خون کرتا ہے

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی (۱)

قلندری یا فقیری صلح و آشتی سے عبارت ہے۔ بادشاہت کشت و خون پر مبنی ہے۔ دونوں فتوحات کرتے ہیں۔ دونوں دوام چاہتے ہیں۔ یہ قاہری کے ذریعے وہ دلبری کے ذریعے۔ضرب قلندری پیدا کر کے سد سکندری توڑ ڈال، حضرت موسیٰ کی روایت تازہ کر۔ سامری کی رونق ختم کر دے۔

مرد فقیر آتش است میری و قیصری خس است فال و فرملوک را حرف برہنہ بس است

دبدبہء قلندری طنطنۂ سکندری آں ہمہ جذبہء کلیم ، ایں ہمہ سحر سامری

آں بہ نگاہ می کشد ،ایں بہ سپاہ می کشد آں ہمہ صلح و آشتی ، ایں ہمہ جنگ وداوری

ہر دو جہاں کشاستند ، ہر دو دوام خواستند ایں بہ دلیل قاہری ، آں بہ دلیل دلبری

ضرب قلندری بیار، سد سکندری شکن رسم کلیم تازہ کن ، رونق ساحری شکن (۲)

بشکوہِ بے نیازی زخدایگاں گزشتم

صفتِ مہِ تماشے کہ گذشت برستارہ (۳)

کافر ہے مسلماں ،تو نہ شاہی نہ فقیری مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی!

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی! (۴)

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں (۵)

اسی لئے تو:۔

اس دور میں بھی مرد خدا کو ہے میسر جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی (۶)

لیکن اگر مسلمان فقر و درویشی ، استغنا و غنا کو چھوڑ کر حرص و ہوا اور دنیاوی آلائش کی خاطر مارا مارا پھرے تو فقیری کی یہ قوت ناپید ہو جاتی ہے۔جس کے نتیجے میں اقبال کہتے ہیں کہ:۔

---

(۱) بالِ جبریل۔۱۷۔ (۲) جاوید نامہ۔۴۸۔ (۳) زبورِ عجم۔۱۵۔ (۴) بالِ جبریل۔۳۵۔

(۵) بانگِ درا۔۲۷۱۔''طلوعِ اسلام''۔ (۶) ضربِ کلیم۔۱۷۵۔ (۷) بالِ جبریل۔۶۲۔

آہ ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز — ورنہ ہے مال فقیر ، سلطنت روم و شام! (۷)

یقیں پیدا کر اے ناداں ! یقیں سے ہاتھ آتی ہے — وہ درویشی ، کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری! (۱)

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبحگاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی!

مرے حلقہء سخن میں ابھی زیر تربیت ہیں — وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ ورسم کجکلا ہی! (۲)

یہی وجہ کہ :۔

مہرو مہتاب کی حاجت نہیں کرتے فقری — جن کے سینے میں کوئی داغ جنون ہوتا ہے (نقری)

اس مے خانے میں ہر صراحی محتسب کے خوف سے لرزہ براندام ہے ۔ مگر مرد فقیر کا پیانہ ہے کہ اسے دیکھ کر پتھر پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے ۔

دریں میخانہ ہر مینا زبیم محتسب لرزد — مگر یک شیشہء عاشق کہ از وے لرزہ برسنگ است (۳)

اگر تو مرد فقیر ہے تو اپنے آپ کو تسخیر کرنے کے بعد بڑی آسانی سے تسخیر آفاق بھی کر سکتا ہے ۔ مبارک ہو گا وہ دن جب تو اس کائنات کی تسخیر کرلے اور ان نو آسمانوں کا سینہ چھیددے ۔ پھر چاند تجھے سجدہ کرے گا اور تو اپنی فکر کی موج دود سے کمند ڈال سکے گا۔

بہ تسخیر خود افتادی اگر طاق — ترا آساں شود تسخیر آفاق

خنک روزے کہ گیری ایں جہاں را — شگافی سینہء نہٗ آسماں را

گزارد ماہ پیش تو سجودے — برد پیچی کمند از موجِ دودے (۴)

مومن زندہ اور اپنے آپ سے برسر پیکار ہے وہ اپنے آپ پر اس طرح جھپٹتا ہے ، جیسے چیتا ہرن پر ۔ گویا کہ نفس کشی و مجاہدہ مرد فقیر کا خاصہ ہے ۔

مرد مومن زندہ و باخود بجنگ — برخود افتد ، ہمچو برآہو پلنگ (۵)

فقیر کسی کا محتاج نہیں ہوتا ۔ بلکہ میرو سلطاں بھی اس کے محتاج ہوتے ہیں ۔ بھوکا ، ننگا رہنا اور رقص کرنا ، یہ ''فقر'' نہیں ۔ فقر تو سلطانی ہے رہبانی نہیں ۔ اقبال اس سلسلے میں بھی حرکت و عمل کے معتقد ہیں ۔ اس لئے کہ حرکت و عمل کے بغیر

---

(۱) بال جبریل ۔ ۵۹ ۔ (۲) ایضاً ۔ ۴۵ ۔ (۳) زبور عجم ۔ ۱۲۹ ۔ (۴) ایضاً ۔ ۱۵۰ ۔ (۵) جاوید نامہ ۔ ۳۹ ۔

فقیری سلطانی نہیں، بلکہ راہبانی و گداگری بن کر رہ جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں اگر سفینۂ فقر طوفانی نہ ہوگا، فقر سلطانی نہ ہوگا۔

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست　　فقر سلطانی است رہبانی کجاست (۱)

بگذر از فقرے کہ عریانی دہد　　اے خنک فقرے کہ سلطانی دہد! (۲)

ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری　　یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں (۳)

کچھ اور چیز ہے شاید تیری مسلمانی　　تیری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار　　فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی (۴)

مومن کا فقر کیا ہے؟ کائنات کی تسخیر کرنا اور فقر کی تاثیر سے بندے کے اندر اپنے مولا کی صفات منعکس ہو جاتی ہیں۔ اسلام میں رہبانیت حرام ہے۔ اس لئے صحرا و بیاباں میں خلوت گزیں ہو جانا کافر کا فقر ہے۔ جبکہ مومن کا فقر بحر و بر پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔

فقر مومن چیست؟ تسخیر جہات　　بندہ از تاثیر او مولا صفات

فقر کافر خلوت دشت و دراست　　فقر مومن لرزۂ بحر و براست! (۵)

جناب رسول اللہؐ نے مومنوں سے فرمایا۔ میرے لئے تمام روئے زمین کو مسجد کر دیا گیا ہے۔ نو آسمانوں کی گردش سے اللہ تعالیٰ بچائیں۔ مومن کی مسجد (زمین) دوسروں کے ہاتھ میں آ گئی۔ اے پاک طینت انسان تجھے سخت کوشش کرنی چاہیئے۔ تاکہ تو اپنے آقا کی مسجد لے سکے۔ اس لئے کہ بے شک:۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو　　فروغ دیدۂ افلاک ہے تو

ترے صید زبوں افرشتہ و حور　　کہ شاہین شہِ لولاک ہے تو (۶)

اور اے وہ شخص جو ترک جہاں کی بات کرتا ہے۔ ایسا نہ کہہ اس پرانے بت خانے کے ترک کرنے کا مطلب اس کی تسخیر ہے۔ اس پر سوار ہو جانا ہی اسے ترک کرنا ہے۔ اور آب و گل کے مقام سے باہر نکل آنا ہے۔ یہ جہان آب و گل مومن کا شکار ہے۔ کیا تو باز سے کہتا ہے کہ وہ اپنا شکار چھوڑ دے۔ میں یہ مشکل نکتہ حل نہ کر سکا کہ شاہین کیوں افلاک سے گریز کرے۔ افسوس ہے اس شاہین پر جس نے شاہینی نہ کی۔ کوئی پرندہ اس کے پنجے سے زخمی نہ ہوا۔ وہ اپنے

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۷۳۔　(۲) جاوید نامہ۔ ۱۴۳۔　(۳) بانگ درا۔ ۲۷۱۔ طلوع اسلام۔

(۴) ضرب کلیم۔ ۵۰۔ فقر و راہبی۔　(۵) پس چہ باید کرد۔ ۲۲۔　(۶) بال جبریل۔ ۸۴۔

''کنام'' میں سر جھکائے عاجز بیٹھا رہتا ہے۔ فضائے نیلگوں میں پرواز نہیں کرتا۔ قرآن پاک کا فقر تو یہ ہے کہ اس دنیا کا احتساب کیا جائے۔ یہ فقر چنگ و رباب، مستی و رقص و سرود نہیں ہے۔ کافر راہب ہوتا ہے۔ اس کی زندگی غار و کوہ کا سکون ہے۔ مرد فقیر، مومن کی زندگی مرگ باشکوہ (شہادت کی موت) ہے۔ وہ ترک بدن سے خدا کو ڈھونڈتا ہے۔ یہ اپنی خودی اللہ تعالیٰ کی سان پر چڑھاتا ہے۔ وہ خودی کو مارتا اور جلا دیتا ہے۔ یہ خودی کو چراغ کی مانند روشن کرتا ہے۔ زیر فلک فقر عریاں ہو جاتا ہے تو اس کی ہیبت سے سورج، چاند اور ستارے لرزتے ہیں۔ فقر عریاں غزوات بدر و حنین کی گرمی ہے، فقر عریاں حضرت حسینؓ کی تکبیر کی آواز ہے۔ جب فقر کے اندر عریانی کا ذوق باقی نہ رہا تو مسلمانی کے اندر وہ جلال بھی باقی نہ رہا۔ افسوس صد افسوس اس کہن بت خانے (دنیا) کے اندر ''لاً'' کی تلوار نہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ نہ میرے ہاتھ میں۔

مومناں را گفت آں سلطان دیںؐ — مسجد من ایں ہمہ روئے زمیں،
الاماں از گردش نہٗ آسماں — مسجد مومن بدست دیگراں
سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش — تا بگیرد مسجد مولائے خویش
اے کہ از ترک جہاں گوئی مگو — ترک ایں دیرِ کہن تسخیر او
راکبش بودن ازو وارستن است — از مقام آب و گل برجستن است
صید مومن ایں جہانِ آب و گل — باز راگوئی کہ صید خود بہل؟
حل نشد ایں معنیء مشکل مرا — شاہیں از افلاک بگریزد چرا
وائے آں شاہیں کہ شاہینی نکرد — مرغکے ازچنگِ او نامد بدرد
درکنامے ماند زار و سرنگوں — پر نہ زد اندر فضائے نیلگوں
فقرِ قرآں احتساب ہست و بود — نے رباب و مستی و رقص و سرود
زندگی آں را سکونِ غار و کوہ — زندگی ایں را زمرگ باشکوہ!
آں خدارا جستن از ترک بدن — ایں خودی رابرفسانِ حق زدن
آں خودی راکشتن و واسوختن — ایں خودی راچوں چراغ افروختن

فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر ——— از نہیب او بلرزد ماہ و مہر
فقر عریاں گرمئ بدروحنین ——— فقر عریاں بانگ تکبیر حسینؓ
فقر را تاذوق عریانی نماند ——— آں جلال اندر مسلمانی نماند
وائے ما اے وائے ایں دیرِ کہن ——— تیغ لادر کف نہ توداری ، نہ من (۱)

اقبال کہتے ہیں کہ دنیا کے ہنگاموں سے دل برداشتہ ہو کر کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے ، گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے کے مصداق ، کسی کونے کھدرے میں گم سم بیٹھ رہنے کا نام فقر نہیں اور نہ ایسا کرنے والا کوئی ''مرد کامل'' یا ''مرد فقیر'' ہوسکتا ہے۔

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری ——— کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری!
میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا ——— تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے ——— وہ قوم جس نے گنوایا متاع تیموری (۲)

اقبال حضور کو اپنا مثالی ''انسان کامل'' سمجھتے ہیں۔ آپ کی زندگی مرد کامل کی روشن دلیل ہے۔ آپؐ نے میدان حرب و ضرب میں بھی جوہر دکھائے اور تبلیغ اسلام کرتے ہوئے حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا خیال بھی رکھا۔ غزوات نبوی ،

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا (۳)

قیدیوں سے سلوک ، یتیموں اور مسکینوں پر شفقت اور مختلف قبائل سے معاہدے آپؐ کے طرز حیات کی درخشندہ و تابندہ مثالیں ہیں۔ اور یہی مرد فقیر کا طریق ہے۔

کوہ شگاف تیری ضرب ، تجھ سے کشاد شرق و غرب
تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر! (۴)

یقیں محکم، عملِ پیہم ، محبت فاتحِ عالم ——— جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں (۵)

---

(۱) پس چہ باید کرد۔ ۲۱۔۲۲۔ ''فقر''۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۴۲۔ (۳) بانگِ درا۔ ۱۴۱۔
(۴) بالِ جبریل۔ ۲۹۔ (۵) بانگِ درا۔ ۲۷۲۔

اقبال کہتے ہیں فقر قرآنِ پاک کی کرنیں ہیں اور فقیر وہ ہے جو آفتاب قرآنِ پاک کی روحانی ضو افشانیوں کو اپنے قلب ونظر میں جذب کرلے ۔ جب وہ ایسا کر لیتا ہے تو اس کی زندگی قلبِ ونظر کی زندگی بن جاتی ہے اور وہ مرد فقیر "عقلیت" کے تیرہ وتار دشت میں صبح کا سماں باندھ دیتا ہے ۔ اس لئے کہ مرد فقیر کے دل کے چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں ہوتی ہیں۔ تو مطلب یہ کہ قرآن پاک کے بغیر شیری یعنی فقیری روباہی ہے ۔ بغیر قرآنی رہنمائی کے قلندر فقیر نہیں ، بلکہ لومڑ ہوتا ہے ۔ قرآن پاک کا فقر ہی اصل شہنشاہی ہے ۔ قرآن پاک کا فقر ذکر وفکر ، یعنی عشق وعقل (ذکر عشق ، فکر عقل) کا احتلاط ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں نے فکر کو ذکر کے بغیر مکمل نہیں دیکھا ۔ ذکر؟ ذوق وشوق کو ادب سکھاتا ہے۔ یہ جان کا کام ہے ۔ نہ کہ زبان ولب کا ۔ ذکر سے سینے کو جلا بخشنے والے شعلے پیدا ہوتے ہیں ۔ جو ابھی تیرے مزاج کے ساتھ موافقت نہیں رکھتے۔

جز بقرآں ضیغمی روباہی است　　فقر قرآں اصل شہنشاہی است

فقر قرآں اختلاف ذکر و فکر　　فکر راکامل ندیدم جز بہ ذکر

ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب　　کار جاں است ایں کار کام و لب

خیزد از وے شعلہ ہائے سینہ سوز　　بامزاج تو نمی سازد ہنوز　　(۱)

اقبال کے نزدیک بندۂ عشق اللہ تعالیٰ کا راستہ اختیار کرتے ہوئے کافر ومومن دونوں پر شفیق ہے ۔ فقر ایسی بیش بہا دولت ہے کہ خواہ تو کتنا بڑا جاگیر دار کیوں نہ ہو پھر بھی فقر کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑ۔ فقر کا سوز تیری جان میں خوابیدہ ہے ۔ یہ پرانی شراب تیرے بزرگوں کی عطا ہے ۔ دنیا میں درد دل کے علاوہ ، یعنی فقر کے علاوہ کسی اور سامان کی خواہش نہ رکھ جو بھی نعمت چاہتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ سے مانگ کسی سلطان سے نہ مانگ اور یہی عین فقر ہے ۔ امراء وسلاطین سے مانگنے والا فقیر ہو ہی نہیں سکتا ۔ اس لئے کہ جب وہ سلاطین سے مانگے گا تو ان کے آگے جھکنا پڑے گا ۔ اور جب اللہ تعالیٰ سے مانگے گا تو اللہ کے آگے جھکے گا ۔ اللہ کی ذات کے سامنے جھکنا فقر ہے ۔ نہ کہ غیر اللہ کے سامنے جھکنا۔ اس ضمن میں اقبال حضرت مجدد الف ثانی کی مثال بھی پیش کرتے ہیں ، کہ جہانگیر کے سامنے ان کی گردن نہ جھکی کہ وہ مرد فقیر تھے ۔

گرچہ باشی از خداوندان دہ　　فقر را از کف مدہ از کف مدہ

---

(۱) جاوید نامہ ۔ ۸۰۔

سوزاو خوابیدہ در جان تو ہست | ایں کہن مے از نیاگان تو ہست!
در جہاں جز درد دل ساماں مخواہ | نعمت از حق خواہ و از سلطاں مخواہ! (۱)

حاضر ہوامیں شیخ مجدد کی لحد پر | وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے | اس خاک میں پوشیدہ ہے، وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے | جس کے نفس گرم سے ہے گرمئی احرار (۲)

یہ اس لئے کہ:۔

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے | جو بات مرد قلندر کی بار گاہ میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیل | یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الہ میں ہے (۳)

مرد حق آسماں سے بجلی کی طرح گرتا ہے اور مغرب و مشرق کے شہر و صحرا کو ایندھن کی طرح جلا دیتا ہے۔ ہم ابھی تک آسمان کے اندھیروں میں پڑے ہیں۔اور وہ انتظام کائنات میں شامل ہے۔ وہی کلیم ہے، وہی مسیح ہے، وہی خلیل ہے۔ وہی محمدؐ وہی کتاب، وہی جبریلؑ ہے۔ وہ اہل دل کی کائنات کا آفتاب ہے۔ اہل دل کی زندگی اسی کی شعاع سے ہے۔ انبیاء مردان حق کی بہترین مثال ہیں۔ مرد حق پہلے تجھے آتش عشق میں جلاتا ہے، پھر تجھے سلطانی سکھاتا ہے۔ ہم سب اس کے سوز سے صاحب دل بنتے ہیں۔ورنہ آب وگل کا ہم نقش باطل ہیں۔ جس زمانے میں تو پیدا ہوا ہے میں اس سے ڈرتا ہوں۔ یہ زمانہ بدن میں غرق اور روح سے ناآشنا ہے۔ جب بدن قحط جان کے باعث بے قیمت ہو جائے تو مرد حق اپنے اندر پنہاں ہو جاتا ہے۔ جستجو اس مرد فقیر کو پانہیں سکتی۔ اگر چہ وہ سامنے موجود ہوتا ہے۔ مگر تو ذوق جستجو قائم رکھ۔ خواہ مرد حق کی تلاش میں کتنی مشکلات پیش آئیں۔ اگر تجھے کسی باخبر مرد حق کی محبت میسر نہ آےء۔ تو جو کچھ میں نے اپنے آباؤ اجداد سے پایا ہے، از تب و تابم نصیب خود بگیر، کے مصداق اسے لے لے۔ گویا کہ اقبال بذات خود بھی ایک مرد فقیر ہیں۔

مرد حق از آسماں افتد چو برق | ہیزم او شہر و دشتِ غرب و شرق
ماہنوز اندر ظلام کائنات | او شریک اہتمام کائنات
او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ | او محمدؐ او کتاب و جبرئیل!

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۳۰۶۔ (۲) بال جبریل۔ ۱۵۹۔ (۳) ایضاً۔ ۶۸۔

آفتاب کائناتِ اہل دل | از شعاع او حیات اہل دل
اول اندر نار خود سوزد ترا | باز سلطانی بیا موزد ترا
ماہمہ باسوزِ او صاحب دلیم | ورنہ نقشِ باطلِ آب و گلیم
ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں | دربدن غرق است و کم داند زجان!
چوں بدن از قحط جاں ارزاں شود | مرد حق از خویشتن پنہاں شود!
در نیا بد جستجو آں مرد را | گرچہ بیند رو برو آں مرد را!
تو مگر ذوق نظر از کف مدہ | گرچہ درکارِ تو افتد صد گرہ!
گر نیابی صحبتِ مرد فقیر | از اب و جد آنچہ من دارم بگیر! (۱)

اس سلسلے میں اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ پیر رومیؒ جیسے مردمومن، قلندر، مردفقیر اور صاحب ذوق وشوق

پیر رومی مرشد روشن ضمیر | کاروان عشق و مستی را امیر
منزلش برتر زماہ و آفتاب | خیمہ را از کہکشاں ساز و طناب
نور قرآں درمیان سینہ اش | جام جم شرمندہ از آئینہ اش (۲)

کو اپنا رفیق راہ بنا، تا کہ اللہ تعالیٰ تجھے سوز و گداز عطا فرمائے۔ چونکہ رومی مغز اور چھلکے میں امتیاز رکھتا ہے۔ اس لئے رومی کے ساغر سے وہ لالہ رنگ شراب عشق لے۔ جس کی تاثیر سنگ کو لعل عطا کرتی ہے۔ جو ہرن کو شیر دل بنا دیتی ہے۔ اور چیتے کی پشت پر سے داغ دھو ڈالتی ہے۔

بگیر از ساغرش آں لالہ رنگے | کہ تاثیرش دہد لعلے بہ سنگے
غزالے را دل شیرے بہ بخشد | بشوید داغ از پشت پلنگے! (۳)

اسرار فقیری مولانا جلال الدین رومیؒ سے سیکھ، اس کے فقر پر امیری رشک کرتی ہے۔ ایسے فقر و درویشی سے بچ جو تجھے عاجزی و درماندگی کے مقام پر پہنچا دے۔

ز رومی گیر اسرار فقیری | کہ آں فقر است محسود امیری

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۲۰۷۔ (۲) پس چہ باید کرد۔ ۷۔ (۳) ارمغانِ حجاز۔ ۷۵۔ (۴) ارمغانِ حجاز۔ ۷۷۔

حذر آں فقر و درویشی کہ ازوے رسیدی برمقام سربزیری (۴)

وہ دوست کی گلی میں مضبوطی سے قدم جماتا ہے۔ لوگوں نے اس مرد فقیر کی مثنوی کی شرح کی ہے، مگر اسے پہچانا نہیں۔ اس کے معانی غزال کی طرح ہماری گرفت سے باہر رہے ہیں۔ لوگوں نے اس مرد قلندر کے اشعار پر وجد آفریں رقص بدن تو سیکھا ہے۔ لیکن روح کے بدن سے اپنی آنکھیں بند رکھی ہیں۔ تن کا رقص صرف خاک اڑاتا ہے، لیکن جان (روح) کا رقص گردش افلاک کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ رقص جان سے علم و حکمت ہی نہیں، بلکہ آسمان و زمین بھی ہاتھ آجاتے ہیں۔ اسی سے فرد جذب کلیم حاصل کرتا ہے۔ اور ملت ملک عظیم کی وارث بنتی ہے۔ رقص جاں یا عشق سیکھنا آسان نہیں۔ یہ غیر اللہ کو جلا دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر تجھے رقص جاں نصیب ہو جائے تو یہی سر دین مصطفیٰؐ ہے، جو میں تجھے بتا رہا ہوں، پھر میں قبر میں بھی تیرے لئے دعا کرتا رہوں گا۔

پیر رومیؒ را رفیق راہ ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

زانکہ رومی مغز را داند زپوست پائے او محکم فتدر کوے دوست!

شرح او کردند و اوراکس ندید معنیء او چوں غزال از ما رمید

رقص تن از حرف او آموختند چشم را از رقص جاں بردوختند!

رقص تن درگردش آرد خاک را رقص جاں برہم زند افلاک را!

علم و حِکم از رقص جاں آید بدست ہم زمیں ہم آسماں آید بدست!

فرد ازوے صاحب جذب کلیم! ملت از وے وارث ملک عظیم!

رقص جاں آموختن کارے بود غیر حق را سوختن کارے بود

اے مراتسکین جان ناشکیب تواگر از رقص جاں گیری نصیب

سر دین مصطفیٰ گویم ترا! ہم بقبر اندر دعا گویم ترا! (۱)

نہ صرف فرد بلکہ کوئی قوم بھی اس نیلے آسمان کے نیچے جنون ذوفنون کے بغیر عظیم کارنامہ سرانجام نہیں دے سکی۔ بلکہ پہلے افراد مقام فقر تک پہنچیں گے، تب کہیں قوم اس عظیم مرتب فقر کے اہل ہوگی۔

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۲۰۸۔

(۲) ارمغان حجاز۔ ۱۵۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر   ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا   (۲)

مومن، مردِ فقیر عزم و توکل ہی سے صاحب جبروت ہے۔ اگر اس میں یہ دو صفات نہ ہوں تو وہ کافر ہے پھر جب تو عزم کر لے تو اللہ تعالیٰ پر توکل رکھ۔ مومن خیر کو شر سے الگ پہچانتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ سے دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ پہاڑ اس کی ضرب سے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

دو نیم، ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا   سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی   (۱)

اس کے گریباں میں ہزاروں ہنگامے ہوتے ہیں۔

ہیچ قوے زیر چرخ لاجورد   بے جنونِ ذوفنوں کارے نکرد

مومن از عزم و توکل قاہراست   گرندارد ایں دو جوہر کافراست

خیر را او بازمیداند زشر   از نگاہش عالمے زیروزبر

کوہسار از ضربت او ریز ریز   درگریبانش ہزاراں رستخیز   (۲)

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں   (۳)

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا!   (۴)

مردِ فقیر کی نگاہ خزاں کو بہار میں تبدیل کر دیتی ہے اس کی شراب (تعلیم) ہر خم کی تلچھٹ کو اور زیادہ نشہ آور بنا دیتی ہے۔ اس کی آہ سحرگاہی میں نئی زندگی ہے۔ اس کی صبح نمود کائنات کو تازگی عطاء کرتی ہے۔ مردِ فقیر بحر و بر میں انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ اس کی ایک ہی نگاہ کائنات میں ہلچل مچا دیتی ہے۔

---

(۱) بالِ جبریل۔۱۰۵۔   (۲) پس چہ باید کرد۔۸۔   (۳) بانگ درا۔۱۰۴۔   (۴) بالِ جبریل۔۲۵۔

از نگاہش فرودیں خیزد زدے | دُرد ہر خم تلخ تر گردد زے
اندر آہِ صبحگاہِ او حیات | تازہ از صبح نمودش کائنات
بحرو بر از زورِ طوفانش خراب | درنگاہِ او پیامِ انقلاب (۱)

مردقلندر ''لاخوف علیھم'' کا درس دیتا ہے تاکہ آدم کے سینے کے اندر دل مضبوط ہو۔ وہ اسے عزم، فرمانبرداری اور راضی بررضا رہنا سکھا کر دنیا میں چراغ کی مانند روشن کر دیتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا افسوں پھونکتا ہے۔ جس سے بدن کے اندر جو روح ہے وہ کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اس کی صحبت ہر سنگر یزے کو موتی بنا دیتی ہے۔ اور اس کی حکمت ہر ایک کا دامن بھر دیتی ہے۔ وہ گرے پڑے غلام سے کہتا ہے، اٹھ اور ہر گرے پڑے معبود کو ریزہ ریزہ کردے۔ اے بندۂ حق! ربی الاعلیٰ کے دو الفاظ سے اس پرانے بت خانہ (دنیا) کا جادو توڑ دے۔ فقر چاہتا ہے تو افلاس کی فریاد نہ کر۔ سکون کیفیت قلب پر منحصر ہے۔ اس کا تعلق جاہ و مال سے نہیں۔ اے زندہ مرد! کاؤس و کیقباد جیسے بادشاہوں کے محلات کا طواف کرنے کی بجائے اپنا طواف کر۔ تو اپنے مقام سے دور جا پڑا ہے۔ تو شاہینوں کی اولاد ہے کرگسوں جیسے کام نہ کر۔

درس لا خوف علیھم می دھد | تادلے درسینۂ آدم نہد
عزم و تسلیم و رضا آموزدش | در جہاں مثل چراغ افروزدش
من نمیدانم چہ افسوں میکند | روح را دُرتن دگرگوں میکند
صحبت او ہر خزف را دُرکند | حکمتِ او ہر تہی را پرکند
بندۂ در ماندہ را گوید کہ خیز | ہر کہن معبود را کن ریز ریز
مرد حق افسون ایں دیر کہن | از دو حرفِ ربی الاعلیٰ شکن
فقر خواہی از تہی دستی منال | عافیت در حال و نے درجاہ و مال
بگذر از کاؤس و کے اے زندہ مرد | طوف خود کن گرد ایوانے مگرد
از مقام خویش دور افتادۂ | کر گسی کم کن کہ شاہیں زادۂ (۲)

کرگسی مردار خوری کا نام ہے۔ جبکہ فقر زندہ رہتا ہے اور زندوں سے دوستی رکھتا ہے۔ بلکہ زندہ رکھتا بھی ہے۔

---

(۱) پس چہ باید کرد۔۱۲۔ حکمتِ کلیمی۔ (۲) ایضاً۔۱۲۔۱۳۔

اقبال پوچھتے اور پھر بتاتے ہیں اے مادی سامان کے غلامو جانتے ہو فقر کیا ہے۔ایک نگاہ جو صحیح راستہ دیکھ لے۔اور ایک دل جو اللہ تعالیٰ کی محبت سے زندہ ہو۔فقر اپنے کام کا محاسبہ کرتا ہے اور لا الہ کو اپنے اعمال کا مرکز بناتا ہے۔فقر جو کی روٹی کھا کر خیبر فتح کرتا ہے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری! (۱)

پادشاہ و امیر سب فقر کے پھندے میں بندھے ہوئے ہیں۔فقر ذوق وشوق وتسلیم و رضا کا نام ہے۔یہ حضورؐ اکرم کی متاع ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔فقر ایک طرف فرشتوں پر شبخوں مارتا ہے اور دوسری طرف کائنات کی پوشیدہ قوتوں پر۔فقر تجھے ایک اور مقام پر پہنچا دیتا ہے۔یہ شیشے سے الماس بنا دیتا ہے۔فقر کا سامان قرآن عظیم ہے۔مرد درویش گدڑی میں نہیں سماتا۔اگر چہ بزم میں کم بات کرتا ہے۔مگر اس کی ایک بات سینکڑوں انجمنوں کو گرما دیتی ہے۔فقر بے پروں کو ذوق پرواز اور مچھر کو تمکین شہباز عطا کر دیتا ہے۔مرد فقیر بادشاہوں کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔شکوہ بوریا سے تخت لرز جاتا ہے۔وہ اپنے جنوں سے شہر میں ہنگامہ کھڑا کر دیتا ہے اور خلق خدا کو جبر وقہر سے نجات دلاتا ہے اور حق بات کہنے سے ہرگز دریغ نہیں کرتا۔

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل — یک نگاہ راہ بیں یک زندہ دل

فقر کار خویش را سنجیدن است — بردو حرفِ لا الہ پیچدن است

فقر خیبر گیربانانِ شعیر — بستہء فتراک او سلطان و میر

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا ست — ما امینم ایں متاعِ مصطفیٰؐ ست

فقر برکروبیاں شبخوں زند — برنوا میس . جہاں شبخوں زند

برمقام دیگر اندازد ترا — از زجاج الماس می سازد ترا

برگ و ساز او زقرآن عظیم — مرد درویشے نہ گنجد در گلیم

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن — یک دم او گرمئی صد انجمن

---

(۱) بانگِ درا۔۲۵۲۔

بے پراں را ذوق پروازے دہد   پشہ را تمکینِ شہبازے دہد
باسلاطیں درفتد مرد فقیر   از شکوہؑ بوریا لرزد سریر
ازجنوں می افگند ہوے بہ شہر   وارہاند خلق را از جبر و قہر (۱)

مردفقیر صرف اس صحرا میں قیام کرتا ہے۔ جہاں شاہین کبوتر کا مقابلہ کرنے سے گریز کرتا ہے۔فقیر کا قلب جذب وسلوک سے قوت پاتا ہے۔ وہ بادشاہ کے سامنے ،کوئی بادشاہ نہیں ،کا نعرہ لگاتا ہے۔ اسی کی خاک سے ہماری آگ میں تپش ہے۔ اسی کے خس و خاشاک سے شعلہ ڈرتا ہے۔ جب تک کسی قوم میں ایک درویش باقی ہے۔ وہ جنگ میں کسی سے شکست نہیں کھاتی ۔ مردفقیر کے استغنا سے ہماری آبرو ہے۔ اور ہمارا سوز جاں اس کے شوق بے پرواہ کا مرہون منت ہے۔ اپنے آپ کو مردفقیر کے آئینہ میں دیکھ تا کہ تجھے نا قابل تسخیر قوت حاصل ہو۔فقر کی دلنوازی حکمت دین سے پیدا ہوتی ہے۔ اوراس کی بے نیازی دین کے لئے قوت بنتی ہے۔

می نگیرد جز بآں صحرا مقام   کاندروشاہیں گریزد از حمام
قلب اورا قوت ازجذب وسلوک   پیش سلطاں، نعرہؑ او لا ملوک!
آتش ما سوزناک از خاک او   شعلہ ترسد از خس و خاشاک او
برنیفتد ملتے اندر نبرد   تادرو باقیست یک درویش مرد
آبروئے ماز استغنائے اوست   سوز ما از شوق بے پروائے اوست
خویشتن را اندریں آئینہ بیں   تاترا بخشند سلطانِ مبیں
حکمت دیں دل نوازی ہائے فقر   قوت دیں بے نیازی ہائے فقر (۲)

گویا کہ:۔

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ   حلقہء آفاق میں گرمیء محفل ہے وہ (۳)

اے جواں غیر اللہ سے دل ہٹا اورکہنہ جہاں کا دروازہ کھول ۔ اے مسلماں تو کب تک غیرت دیں کے بغیر زندگی بسر کرے گا۔ یہ زندگی نہیں موت ہے۔ مردحق اپنے آپ کو از سرنو تخلیق کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو صرف حق تعالی کے نور

---

(۱) پس چہ باید کرد۔۲۰۔فقر۔   (۲) ایضاً۔۲۱۔   (۳) بال جبریل ۔۹۸۔مسجد قرطبہ۔

سے دیکھتا ہے۔

دل زغیر اللہ بہ پردازاے جواں — ایں جہان کہنہ درباز اے جواں
تا کجا بے غیرت دیں زیستن — اے مسلماں مردن است ایں زیستن
مرد حق باز آفریند خویش را — جز بہ نور حق نہ بیند خویش را (۱)

ہم دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ اقبال کے ہاں، مرد حق، مرد فقیر، قلندر، مرد مومن، مرد درویش، مرد حر یا صاحب ذوق وشوق ایک ہی سلسلہ حق کی مختلف کڑیاں ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ صرف ایک ہی کڑی ہے ناموں کے فرق کے علاوہ ان میں اور کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اقبال کہتے ہیں مرد حر یا مرد فقیر "لاتخف" کے ورد سے قوی ہے۔

دم زندگی، رم زندگی، غم زندگی سم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری! (۲)

ہم میدان میں سر جھکائے آتے ہیں۔ اور وہ سربکف نکلتا ہے۔ مرد حر کا ضمیر "لا الہ" سے روشن ہے۔ وہ کسی بادشاہ یا امیر کا غلام نہیں ہوتا۔ مرد حر اونٹ کی طرح بوجھ اٹھاتا ہے۔ اور کانٹے کھا کر گزارہ کرتا ہے۔

صاحب ذوق وشوق راہ حیات میں اتنی مضبوطی سے قدم رکھتا ہے کہ اسکے سوز سے راستے کی نبض تیز ہو جاتی ہے۔ تیری طبیعت کی گرمی ایسے درویش کی شراب سے ہے۔ تیری ندی اسی کے دریا سے پرورش پاتی ہے۔ ایسے عریاں فقیر کی ہیبت سے ریشمی قباؤں میں ملبوس پادشاہوں کے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں۔ دین کا راز ہمارے لئے سنی سنائی

چوں ز روئے خویش بر گردد حجاب — او حساب است او ثواب است، او عذاب! (۳)

بات ہے اور اس کے لئے مشاہدہ ہے۔ گویا وہ گھر کے اندر ہے اور ہم دروازے سے باہر کھڑے ہیں۔ ہم کلیسا کے دوست اور مسجد فروش ہیں اور وہ حضور اکرمؐ کے دست مبارک سے شراب الست پیتا ہے۔

مرد حر محکم ز ورد لاتخف — ما بمیداں سر بجیب او سربکف
مرد حر از لا الہ روشن ضمیر — می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
مرد حر چوں اشتراں بارے برد — مرد حر بارے برد خارے خورد

---

(۱) پس چہ باید کرد۔۲۲۔ (۲) بانگ درا۔۲۵۲۔ (۳) پس چہ باید کرد۔۸۳۔

پائے خود را آں چناں محکم نہد نبض رہ از سوز او بر می جہد
گرمیٔ طبع تو از صہبائے اوست جوے تو پروردۂ دریائے اوست
پادشاہاں درقبا ہا ے حریر زرد رو از سہم آں عریاں فقیر
سر دیں مارا خبر، او را نظر او درون خانہ ما بیرون در
ماکلیسا دوست، ما مسجد فروش! اوز دست مصطفیٰ پیمانہ نوش (۱)

ایسے ہی مرد حق کے بارے میں اقبال اندلس کی سرزمین پر" مسجد قرطبہ" میں رقمطراز ہیں کہ :۔

آہ وہ مردان حق ! وہ عربی شہسوار حامل خلق عظیم ، صاحب صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں !
جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی خوش دل و گرم اختلاط ، سادہ و روشن جبیں (۲)

مرد فقیر نہ پیر مغاں کا غلام ہے، نہ وہ ہاتھ میں جام لئے ہے۔ وہ شراب الست سے مست ہے اور ہم اس سے تہی پیانہ، پھول کی سرخی اس کے اشکوں کی مرہون منت ہے۔ اس کا دھواں ہماری آگ سے زیادہ روشن ہے۔ اس کے سینے کے اندر امتوں کی تکبیر ہے اور اس کی پیشانی پر ان کی تقدیر کندہ ہے۔ ہمارا قبلہ کبھی کلیسا ہے، کبھی بت خانہ۔لیکن وہ غیر اللہ سے رزق کا طالب نہیں ہوتا۔ ہم سب فرنگیوں کے بندے ہیں اور وہ اللہ کا بندہ ہے۔ اس لئے تو وہ اس جہان رنگ و بو میں نہیں سماتا۔ ہم صبح و شام رزق کی فکر میں رہتے ہیں۔ ہمارا انجام کیا ہے موت کی تلخی ، ہماری صحبت سے الٹا اہل دل پراگندہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ اس کی صحبت کے فیض سے مٹی بھی صاحب دل ہو جاتی ہے۔ ہمارے سارے کام ظن و تخمین سے متعلق ہیں۔وہ ہمہ کردار ہے اور تھوڑی بات کرتا ہے۔ہم کو چہ گردو فاقہ مست گدا ہیں۔ اس کا فقر لا الہ کی تلوار ہاتھ میں لئے ہے۔ ہم اس تنکے کی مانند ہیں جو بگولے میں گرفتار ہے۔ اس کی ضرب کوہ گراں کے اندر سے ندی نکال لیتی ہے۔ ہم سے کنارہ کشی اختیار کر اور اس کا دامن تھام لے۔اپنا گھر ویران کر کے اپنے خانۂ دل کا مالک بن جا۔ گردش فلک کا شکوہ چھوڑ اور اس زندہ مرد کی صحبت سے زندگی حاصل کر۔ بندگان خدا کی صحبت علم کتابی سے بہتر ہے۔ مردان حر کی صحبت ادمی کو انسان بنا دیتی

(۱) پس چہ باید کرد۔ ۲۶۔" مرد حر"۔

(۲) بال جبریل۔ ۹۸۔ مسجد قرطبہ۔

ہے۔ جبکہ سفلے اور کمینے شخص کی صحبت ہمیں کرگسی سکھاتی ہے۔ اسی لئے تو اقبال یہ بھی فرماتے ہیں کہ:۔

یوسف مارا اگر گرگے برد   بہ کہ مردے ناکسے اورا خرد (۱)

مرد حر عمیق اور بیکراں سمندر ہے۔ پر نالوں کو چھوڑ اور اس بحر سے پانی حاصل کر۔ ایسے مرد فقیر کا سینہ دیگ کی مانند جوش مارتا ہے۔ اس کے سامنے کوہ گراں بھی ریت کا تودہ ہے۔ صلح کے ایام میں وہ رونق انجمن اور باغ کے اندر باد بہار کی مانند ہے۔ جنگ کے وقت وہ اپنی تقدیر کا راز دان ہے۔ اور اپنی تلوار سے خود اپنی قبر کھودتا ہے۔ شہادت کا طالب رہتا ہے۔ میں تیرے قربان جاؤں ہم سے تیر کی طرح بھاگ اور ایسے صاحب ذوق وشوق کا دامن تھام لے اور بے تابانہ تھام لے۔

نے مغاں را بندہ، نے ساغر بدست   ما تہی پیمانہ او مست الست

چہرۂ گل از نم او احمر است   زآتش ما دود او روشن تراست!

دارد اندر سینہ تکبیر امم   درجبین اوست تقدیر امم

قبلہء ما گہ کلیسا ، گاہ دیر   او نخواہد رزق خویش از دست غیر

ماہمہ عبد فرنگ او عبدہ،   او نہ گنجد درجہان رنگ و بو

صبح و شام ما بہ فکر سازو برگ   آخرِ ماچیست ؟ تلخیہائے مرگ

اہل دل از صحبت ما مضمحل   گل زفیض صحبتش دا رائے دل

کار ماوابستہء تخمین و ظن   او ہمہ کردار و کم گوید سخن

ماگدایاں کوچہ گردو فاقہ مست   فقر او زلا الہ تیغے بدست

ما پر کا ہے اسیر گرد باد   ضربش از کوہ گراں جو ے کشاد

محرم او شو زما بیگانہ شو   خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

شکوہ کم کن از سپہر گرد گرد   زندہ شو از صحبت آں زندہ مرد

صحبت علم کتابی خوشتر است   صحبت مردان حر آدم گراست

مرد حر دریائے ژرف و بیکراں   آب گیر از بحر و نے از ناوداں

---

(۱) پس چہ باید کرد۔ ۸۔

سینہء ایں مرد می جوشد چودیگ　　پیش او کوہ گراں یک تودہ ریگ!
روز صلح آں برگ و سازِ انجمن　　ہم چوباد فرودیں اندر چمن
روز کیں آں محرم تقدیر خویش　　گورِ خود می کند و از شمشیر خویش
اے سرت گردم گریز از ما چوتیر
دامن او گیر و بے تابانہ گیر　　(۱)

مردفقیر منبر و دار کا آشنا ہے۔ وہ اپنی آتش عشق کوسنبھال کر رکھتا ہے۔

آشنائے منبر و دار است او　　آتش خود رانگہدار است او　　(۲)

صاحب ذو وشوق ،مردحر، مرد آزاد ، مرد قلندر ، مرد مومن ، مرد درویش ، عاشق باصفا یا مرد فقیر جب سجدے میں گرتا ہے تو یہ نیلا آسماں اس کے طواف میں سرگرم ہو جاتا ہے ۔ ہم غلام ایسے مرد آزاد کے ''جلال'' اور ''لازوال'' جمال سے ناآشنا ہیں ۔

مردے آزادے چو آید درسجود　　در طوافش گرم رو چرخ کبود
ماغلاماں از جلالش بے خبر　　از جمالِ لازوالش بے خبر　　(۳)

اس سلسلے میں علامہ اقبال اورنگزیب عالمگیر کی طرح نادرشاہ افغانی کو بھی مرد فقیر مانتے ہیں ۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ فقیر کا رتبہ بادشاہی سے بلند ہے اس لئے کہ جب بادشاہ فقیر بنتا ہے تو وہ اپنے پہلے مقام سے بلند ہونا پسند کرتا ہے۔

مقام فقر ہے کتنا بلند شاہی سے　　روش کسی کی گدایا نہ ہو تو کیا کہئے　　(۴)

تاج وتخت کے باوجود فقیری ہو تو ، اسے خلافت کہتے ہیں ۔ خوشا وہ دولت خلافت جسے کبھی زوال نہیں ۔اے جواں بخت بادشاہ ! یہ فقر ہاتھ سے نہ دے ۔ کیوں کہ اس کے بغیر بادشاہت جلد فنا ہو جاتی ہے ۔ ویسے بھی فقر کی رو سے بادشاہت حرام ہے ۔

خلافت ، فقر باتاج و سریر است　　زہے دولت کہ پایاں ناپذیر است
جواں بختا ! مدہ از دست ایں فقر　　کہ بے او پادشاہی زود میر است!　　(۵)

مسلمان نے فقر اور حکمرانی کو یکجا کر دیا تھا، اس کے ضمیر میں باقی (آخرت) اور فانی (دنیا) اکٹھے ہوگئے تھے ۔ لیکن عصر حاضر سے خدا بچائے ،اس نے سلطانی اور شیطانی کو اکٹھا کر دیا ہے ۔

---

(۱) پس چہ باید کرد ۔ ۲۷ ۔ ۲۸ ۔　　(۲) ایضاً ۔۳۴ ۔　　(۳) ایضاً ۔ ۳۷ ۔
(۴) ضرب کلیم ۔۵۳ ۔　　(۵) ارمغانِ حجاز ۔ ۷۹ ۔

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
و لیکن الاماں از عصر حاضر کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد (۱)

______ نادرشاہ افغان درویش خو بادشاہ تھا۔ اس کی روح پاک پر اللہ تعالٰی کی رحمت ہو۔ ان کی نگاہ میں ارباب ذوق کی مستی تھی۔ جذب وشوق ان کی جان کا جوہر تھا۔ان کی تلوار خسروانہ تھی اور نگاہ درویشانہ۔ اور یہ دونوں موتی انہیں لا الہ کے بحر سے ملے تھے۔فقر وشاہی آنحضورؐ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ یہ حضورؐ کی ذات بابرکات کی تجلیات سے قائم ہیں۔ یہ دونوں قوتیں صاحب ذوق وشوق کے وجود سے قائم ہیں۔شاہی کا تعلق قیام سے اور فقر کا سجدے سے۔فقر سوز، درد، داغ اور آرزو سے مرکب ہے۔ اپنے خون میں تڑپنا فقر کی آبرو ہے۔ نادرشاہ کا فقر آخر اپنے خون میں تڑپا، اس مرد شہید کے فقر پر آفریں صد آفریں۔ گویا کہ اقبال کے نزدیک شہادت فقر کا بلند ترین رتبہ ہے۔ اور شہید اعلٰی و ارفع مرد فقیر ہے۔

سرخاک شہیدے برگہائے لالہ می پاشم کہ خونش بانہالِ ملتِ ما سازگار آمد! (۲)

اللہ تعالٰی کا بندہ شیر ہے اور موت ہرن۔ موت اس کے سینکڑوں مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ وہ مرد کامل موت پر اس طرح جھپٹتا ہے۔ جیسے شاہین کبوتر پر۔ مرد مومن اللہ تعالٰی سے اس موت (شہادت) کا طالب رہتا ہے۔جو اسے خاک سے اوپر اٹھا لیتی ہے۔ وہ موت جو راہ عشق کی انتہا ہے جو میدان عشق (جہاد) میں بلند کیا جانے والا آخری نعرہ تکبیر ہے۔ اگر چہ مومن ہر موت کو شکر سے قبول کرتا ہے۔مگر سید نا حسینؓ کی موت اور چیز ہے۔ دنیا کے بادشاہ لوٹ مار کے لئے جنگیں لڑتے ہیں۔ لیکن مومن کا جہاد آنحضورؐ کی سنت کی پیروی ہے۔ مومن کا جہاد کیا ہے؟ اپنے محبوب حقیقی کی طرف ہجرت کر جانا۔ دنیا چھوڑ دینا اور کوے دوست اختیار کر لینا۔ وہ ذاتؐ جنہوں نے قوموں کو عشق کی بات بتائی، انہوں نے جہاد کو اسلام کی رہبانیت فرمایا۔ مگر اس نکتے کو شہید کے سوا اور کوئی نہیں سمجھتا کیونکہ وہ اس کو اپنا خون دے کر پاتا ہے۔

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ یک مقام از صد مقام اوست مرگ!
مرد مومن خواہداز یزدان پاک آں دگر مرگے کہ برگیرد زخاک!
آں دگر مرگ! انتہائے راہ شوق آخریں تکبیر درجنگاہِ شوق!
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر! مرگ پور مصطفٰیؐ چیزے دگر!

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔ ۹۲۔ (۲) بانگِ درا۔ ۲۷۶۔ "طلوعِ اسلام"۔

جنگ شاہانِ جہاں غارت گری است   جنگ مومن سنت پیغمبریؐ است!
جنگ مومن چیست ؟ ہجرت سوے دوست   ترک عالم، اختیار کوے دوست!
آنکہ حرف شوق با اقوام گفت   جنگ را رہبانیء اسلام گفت!
کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بخون خود خرید ایں نکتہ را (۱)

پھر کہتے ہیں شہیدوں کے مزار پر ذرا اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ۔ ہماری بے زبانی کی باتیں بھی سننے کے قابل ہیں۔

سر مزار شہیداں یکے عناں درکش   کہ بے زبانیء ما حرفِ گفتنی دارد (۲)

اور جہاں تک نادر شاہ افغانی کا تعلق ہے :۔

نادر افغاں شہ درویش خو   رحمت حق برروانِ پاک او
درنگاہش مستیٔ ارباب ذوق   جوہر جانش سراپا جذب و شوق
خسروی شمشیر و درویشی نگہ   ھر دو گوہر از محیط لا الہ!
فقر و شاہی واردات مصطفیٰؐ ست   ایں تجلیہائے ذات مصطفیٰؐ ست!
ایں دو قوت از وجود مؤمن است   ایں قیام و آں سجود مؤمن است
فقر سوز و درد و داغ وآرزوست   فقر را در خوں تپیدن آبروست
فقر نادر آخراندر خوں تپید   آفریں بر فقرآں مرد شہید (۳)
سرشک دیدہ ء نادر بہ داغ لالہ فشاں!   چناں کہ آتش او را دگر فرونہ نشاں (۴)

مرد فقیر کائنات کے علاوہ اپنے آپ کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے وہ سارے جہاں سے برتر ہے۔ دین کیا ہے اپنی شخصیت کے اسرار دریافت کرنا۔ اپنے دیدار کے بغیر زندگی موت ہے۔ خود شناس مسلمان ہی ضمیر کائنات سے آگاہ ہوتا ہے۔

اے خوش آں کو از خودی آئینہ ساخت   وندرآں آئینہ عالم راشناخت (۵)

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔   (۲) پیام مشرق۔ ۱۶۳۔   (۳) پس چہ باید کرد۔ ۵۵۔
(۴) بال جبریل۔ ۱۵۳۔   (۵) مثنوی مسافر۔ ۸۰۔

وہی لا موجود الا اللہ کی تیغ بنتا ہے ۔ مکان و لا مکاں میں اسی کا غوغا ہے ۔ یہ سارے آسمان اسی کی وسعت و بیکرانی میں پھرتے ہیں چونکہ مسلمان کا قلب اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایک راز ہے ۔ اس لئے ایسے مسلمان پر افسوس ہے جو اپنے آپ سے بے خبر ہو ۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ ، پیغمبروں کا وارث ہے ۔ وہ دوسروں کے جہان میں نہیں سماتا ۔ اپنا جہاں خود پیدا کرتا ہے ۔ چونکہ وہ نیا جہان پیدا کرتا ہے اس لئے پہلے اس پرانے جہان کو درہم برہم کر دیتا ہے ۔ مرد فقیر غیر اللہ سے چھٹکارا حاصل کر چکا ہوتا ہے ۔ اس کے وجود کے اندر خودی کا چراغ روشن ہوتا ہے ۔

خیر و شر کی جنگ میں وہ ثابت قدم رہتا ہے ۔ ذکر اس کی شمشیر ہے اور فکر اس کا سپر ۔ اس کی صبح آفتاب مشرق کی روشنی سے نہیں ، بلکہ اس بانگ ازل سے ہے ۔ جو اس کی جان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے ۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز — نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود — ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا (۱)

اس جہان چارسو کے اندر اس کی فطرت جہات سے بالاتر ہے ۔ وہ حریم ہے اور ساری کائنات اس کا طواف کرتی ہے ۔ اس کی گرد راہ کا ہر ذرّہ آفتاب ہے ۔ کتاب اللہ اس کے عروج پر گواہ ہے ۔

چیست دیں؟ دریافتن اسرار خویش — زندگی مرگ است بے دیدار خویش
آں مسلمانے کہ بیند خویش را — از جہانے بر گزیند خویش را
از ضمیر کائنات آگاہ اوست — تیغ "لاموجود" الا اللہ اوست
در مکان و لامکاں غوغائے او — نہ سپہر آوارہ در پہنائے او
تا دلش سرے از اسرار خداست — حیف اگر از خویشتن نا آشناست
بندۂ حق وارث پیغمبراں — او نگنجد در جہان دیگراں
تا جہانے دیگرے پیدا کند — ایں جہانِ کہنہ را برہم زند
زندہ مرد از غیرِ حق دارد فراغ — از خودی اندر وجودِ او چراغ
پائے او محکم برزمِ خیر و شر — ذکر او شمشیر و فکر او سپر

---

(۱) ضرب کلیم ۔ ۱۴ ۔ "صبح" ۔

صبحش از بانگے کہ برخیزد زجاں　　نے زنور آفتاب خاوراں!
فطرت او بے جہات اندر جہات　　او حریم و در طوافش کائنات
ذرّۂ از گرد راہش آفتاب　　شاہد آمد برعروج او کتاب　　(۱)

صاف ظاہر ہے کہ معدن فقر کے یہ گوہر ہائے آبدار و دیدار اقبال جیسا فقیر ہی بکھیر سکتا ہے۔ اقبال کو یہ دولت فقر آنحضورؐ کے آستانہ سوز و گداز سے عنایت ہوئی ہے۔ جس کا وہ برملا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ مجھے یہ سوز آپؐ کے فیض سے ملا ہے میرے انگور میں شراب عشق کی جو موج پائی جاتی ہے، وہ آپؐ کے زمزم کی بدولت ہے۔ میری درویشی سے سلطنت جم شرمندہ ہے۔

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی　　نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں　　(۲)

کیوں کہ میرے سینے میں جو دل ہے۔ وہ آپؐ کا محرم ہے۔

مرا ایں سوز از فیض دم تست　　بتاکم موجِ مے از زمزمِ تست
خجل ملکِ جم از درویشئ من　　کہ دل درسینۂ من محرم تست!　　(۳)

پھر اقبال حضورﷺ کے حضور میں عرض کرتے ہیں کہ سوز و گداز اور عشق و فکر کی بدولت، میری مشتِ غبار سے وہ سراپا عشق گلِ لالہ، یعنی دل پیدا ہوگیا ہے کہ اس کا خون میرے پہلو سے ٹپک رہا ہے، یعنی آپؐ کے عشق کے طفیل میرا دل خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ از راہ دل نوازی اسے قبول فرمایئے کیونکہ میرے پاس اس دل کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے، جو پیش کر سکوں۔

دمید آں لالہ از مشتِ غبارم　　کہ خونش می تراود از کنارم
قبولش کن ز راہِ دل نوازی　　کہ من غیر از دلے چیزے ندارم!　　(۴)

اے حضور اکرمﷺ میری خاک سے گلستاں پیدا فرمایئے، خون لالہ میں میری آنکھ کی نمی بھی ملا دیجئے، اگر میں تیغِ علیؓ کی شان کے شایان نہیں تو مجھے ایسی نگاہ عطا فرما دیجئے جو تیغ علیؓ کی مانند تیز ہو۔

گلستانے ز خاکِ من بر انگیز　　نم چشمم بخونِ لالہ آمیز

---

(۱) پس چہ باید کرد۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ''مثنوی مسافر''۔ (۲) بانگ درا۔ ۱۰۴۔ غزل۔　(۳) ارمغان حجاز۔ ۵۴۔　(۴) ایضاً۔ ۵۵۔

اگر شایانِ نیم تیغ علیؓ را نگاہے دہ چو شمشیرِ علیؓ تیز! (۱)

شاہی وفقیری کا تقابل کرتے ہوئے اقبال، ابن سعود سے کہتے ہیں، تو حجاز کا سلطان ہے اور میں ایک فقیر ہوں۔ ہوں فقیر مگر ولایت کا امیر ہوں۔ آ، میرے آغوشِ ضمیر میں وہ جہان دیکھ، جو ''لاالہ'' کے بیج سے پیدا ہوا ہے۔

تو سلطانِ حجازی من فقیرم ولے در کشور معنی امیرم

جہانے کو ز تخم لاالہ رُست بیا، بنگر با آغوشِ ضمیرم (۲)

اگر چہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تو نگری سے نہیں
سب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوھر آشکارا ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں (۳)

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر (۴)

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر (۵)

جس نے اپنی خودی پر ''لاالہ'' کی ضرب لگائی اس نے اپنی مردہ خاک (بدن) سے نگاہ پیدا کر لی۔ ایسے مردِ فقیر کا دامن نہ چھوڑ۔ میں نے مہر ومہ کو اس کی کمند (تصرف) میں دیکھا ہے۔

کسے کو برخودی زد لاالہ را ز خاکِ مردہ رویاند نگہ را

مدہ از دست دامان، چنیں مرد کہ دیدم درکمندش مہر و مہ را (۶)

مردِ فقیر ایسا شہسوار ہے جس کی نگاہ ہی سے خالی سبو پُر ہو جاتے ہیں۔ وہ آرزو کے انگور میں شراب دوڑا دیتا ہے۔

---

(۱) ارمغانِ حجاز ۔ ۵۶۔ (۲) ارمغانِ حجاز ۔ ۶۱۔ (۳) ارمغانِ حجاز ۔ (اردو) ۲۹۔

(۴) بالِ جبریل ۔ ۱۴۷۔ (۵) بالِ جبریل ۔ ۱۲۵۔ ساقی نامہ۔ (۶) رمغانِ حجاز ۔ ۲۹۔

دلوں میں آرزوئیں مچلنے لگتی ہیں۔ جو طوفان وہ یونہی برپا کر دیتا ہے، اس سے ندیاں سمندر کے مدِ مقابل آ جاتی ہیں۔

نگا ہش پر کند خالی سبوہا دواند مے بتاکِ آرزوہا

ز طوفانے کہ بخشد را یگانی حریفِ بحر گردد آبجوہا (۱)

جب وہ شہسوار قافلے کی قیادت سنبھالتا ہے تو ہر پوشیدہ کو ذوقِ تجلی عطا کرتا ہے۔ وہ آسمان والوں کے راز اس طرح فاش کر دیتا ہے، کہ نو کے نو آسمان اس کے قدموں میں بچھ جاتے ہیں۔

چو بر گیرد زمامِ کارواں را دھد ذوقِ تجلی ہر نہاں را

کند افلاکیاں را آنچناں فاش بہ پامی کشد نہ آسماں را (۲)

مبارک باد کی مستحق ہے وہ پاک جاں (ماں) جس نے ایسے امیر کارواں و صاحب ذوق وشوق کو جنم دیا، ایسی خوش قسمت ماں کی آغوش حوارانِ خلد کو شرمسار کرتی ہے۔

مبارکباد کن آن پاک جاں را کہ زایدآں امیرِ کارواں را

ز آغوشِ چنیں فرخندہ مادر خجالت می دہم حورِ جناں را (۳)

اس میں شک نہیں کہ اقبال کے ذوق جمال کی مجلسِ میں بھی قلندرانہ جام گردش کرتے ہیں۔ اسی لیے تو اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند۔ جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا اقبال ہی کی زبانی کہتے ہیں کہ مردِ حق یعنی اقبال جو اس جہانِ چارسو (دنیا) کی جان ہے اور آج کل خلوت نشین ہے۔ اسے میری طرف سے کہو۔ تیرے افکار سے مومن کی زندگی وابستہ ہے اور تیری گفتار سے ملت ثبات پاتی ہے۔ قرآن عظیم کی حفاظت تیرا آئین ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کو واضح طور پر بیان کرنا تیرا دین ہے۔ تو "کلیم" ہے کب تک سرنگوں بیٹھا رہے گا۔ اپنا ہاتھ (ید بیضا) آستیں سے باہر نکال۔ ملتِ اسلامیہ کی سرگزشت بیان کر۔ آہو کو وسعتِ صحرا سے آگاہ کر۔ تیری فطرت نورِ مصطفیٰ سے منور ہے۔ پھر سے بیاں کر کہ آخر ہم مسلمانوں کا مقام کہاں ہے؟ اللہ تعالیٰ کا بندہ کسی اور سے رنگ و بو نہیں لیتا وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا رنگ اختیار کرتا ہے۔ عشق کی وجہ سے ہر لحہ اس کی جان کا انداز نیا ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرح ہر زمانے میں نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔

مردِ حق جانِ جہانِ چار سوے آں بخلوت رفتہ را از من بگوے

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔ ۸۸۔ (۲) ایضاً۔ ۸۸۔ (۳) ایضاً۔ ۸۹۔

اے ز افکارِ تو مؤمن را حیات　　از نفسہائے تو ملت راثبات
حفظِ قرآنِ عظیم آئین تست　　حرفِ حق را فاش گفتن دینِ تست
تو کلیمی چند باشی سر نگوں　　دستِ خویش از آستیں آور بروں
سرگزشت ملتِ بیضا بگوے　　باغزال از وسعت، صحرا بگوے
فطرتِ تو مستنیر از مصطفیٰ ست　　باز گو آخر مقامِ ما کجاست؟
مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بو　　مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر　　ہر زماں او را چوحق شانے دگر　(۱)

چنانچہ بجا فرماتے ہیں کہ مشرق میرے شعلے سے روشن ہے۔ مبارک ہے وہ شخص جو میرے دور میں زندہ ہے۔

خاوراں از شعلۂ من روشن است　　اے خنک مردے کہ در عصرِ من است　(۲)

زمانہ خود بخود مردِ فقیر کے کام کو آگے بڑھاتا ہے۔ کیونکہ خود دار شخص مردِ درویش ہے۔ یہی فقر ہے اور یہی سلطانی کہ تو اپنے دل کی اس طرح حفاظت کرے جیسے دریا اپنے گوہر کی حفاظت کرتا ہے۔

زمانہ کارِ اورا می برد پیش　　کہ مردے خود نگہداراست درویش
ہمیں فقر است و سلطانی کہ دل را　　نگہ داری چو دریا گوہرِ خویش!　(۳)

اس کے بعد اقبال مردِ حق سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ____ اس دور کے انسانی ابلیسوں کا شکار نہ بن، ان کا غمزہ کم ظرفوں کے موافق ہے، عالی ظرف انسانوں کے لیے وہی ابلیس بہتر ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہوا ہے، اور جو اپنے فن میں کامل ہے۔

مشو نخچیر ابلیسانِ ایں عصر　　خساں را غمزۂ شاں ساز گار است
اصیلاں را ہماں ابلیس خوشتر　　کہ یزداں دیدہ و کامل عیار است!　(۴)

اس اصلی ابلیس کی ضرب کاری کو ''مردِ کامل'' یعنی صاحب ذوق وشوق ہی برداشت کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ آتش نسب شیطنیت میں بلند مقام رکھتا ہے۔ ہر خاکی اس کے شکار کی ڈوری کے قابل نہیں۔ وہ کمزور شکار کو اپنے اوپر حرام سمجھتا ہے۔

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۷۶۔ ۷۷۔　(۲) مثنوی مسافر۔ ۸۵۔　(۳) ارمغانِ حجاز۔ ۱۸۸۔　(۴) ایضاً۔ ۱۲۸۔

بالکل اسی طرح جس طرح:۔

چیتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن!
افلاک سے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن! (۱)

شیطانِ اعلیٰ مردِ مومن کے شکار میں مچان لگائے رہتا ہے۔ چھوٹے موٹے شکار کے لیے اس نے اپنے چیلے وغیرہ چھوڑ رکھے ہیں۔

حریفِ ضربِ او مردِ تمام است — کہ آں آتش نسب والا مقام است
نہ ہر خاکی سزاوارِ نخِ اوست — کہ صیدے لاغرے بروے حرام است (۲)

اگر چہ پست فطرت لوگ اسے نہیں سمجھ پائیں گے مگر یہ نقطہ کہہ دینا ضروری ہے کہ غیور طبیعت گنہگار کو یہ نوزائیدہ ابلیس راس نہیں آتے۔

ز فہمِ دوں نہاداں گرچہ دور است — ولے ایں نکتہ را گفتن ضرور است
بہ ایں نوزادہ ابلیساں نسازد — گنہگارے کہ طبعِ او غیور است (۳)

اقبال کہتے ہیں کہ اگر فقیر دانا دل اور صاف باطن ہے تو وہ مفلسی میں بھی امیر ہے۔ وہ دولت مند جو بے دین اور بے دانش ہو۔ اس کے کندھوں پر قبا نہیں، بلکہ ریشم کا تھڑا ہے۔ یعنی وہ ریشمی لباس میں گدھا ہے۔

اگر دانا دل و صافی ضمیر است — فقیرے باتہی دستی امیر است
بدوشِ منعمِ بے دین و دانش — قبائے نیست پالان حریر است! (۴)

قلندر لمبی چوڑی تقریروں کا میلان نہیں رکھتا۔ وہ زبانی دعوؤں سے زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملاتا۔ بلکہ میدان عمل کا شہسوار ہے۔ وہ ایک ہی نکتہ جانتا ہے، جو اکسیر کا کام کرتا ہے کہ ایسی ویران کھیتی سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا، جس کی آبیاری خونِ حسینؓ سے نہ کی گئی ہو۔ یعنی قلندر سر ہتھیلی پر سجائے رکھتا ہے۔ وہ سر کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

---

(۱) ضرب کلیم ۔ ۴۵۔ ''مومن''۔ (۲) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۲۸۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۳۹۔

قلندر میل تقریرے ندارد بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد
ازاں کشت، خرابے حاصلے نیست کہ آب از خونِ شبیر ے ندارد! (۱)

قلندر جز دو حرفِ لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا! (۲)

سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو کیا کہیئے! (۳)

فقر زندگی و تابندگی کی علامت ہے۔ اس لیے مردِ فقیر سکوں پرستی سے بیزار ہوتے ہوئے ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ راہِ شوق یا راہِ عشق کا مسافر، مردِ قلندر پارے کی طرح بے تاب رہتا ہے۔ اس کے لیے طویل سفر دو قدموں سے زیادہ نہیں۔ مسافر عشق صاحب ذوق وشوق قیام سے تنگ آجاتا ہے۔

شوق را راہِ دراز آمد دو گام ایں مسافر خستہ گردد از مقام (۴)

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں (۵)

فضا تیری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں (۶)

آں کہ بر افلاک رفتارش بود بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود (رومی)

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور! (۷)

مردِ فقیر مسافر راہِ عشق اور صاحب ذوق وشوق کی حیثیت سے ہر وقت متحرک رہتا ہے چنانچہ اقبال منصور حلاج کی زبانی کہلواتے ہیں کہ ہم کسی ایک مقام کے ساتھ موافقت نہیں کر سکتے۔ ہم سراپا ذوقِ پرواز ہیں اور بس۔ ہر لحہ دیکھنا اور تڑپتے رہنا ہمارا کام ہے۔ ہم بغیر پروبال کے اڑتے رہتے ہیں۔

---

(۱) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۴۶۔ (۲) بالِ جبریل ۔ ۳۲۔ (۳) ضربِ کلیم ۔ ۵۳۔ (۴) جاوید نامہ ۔ ۴۵۔
(۵) بالِ جبریل ۔ ۱۸۔ (۶) ایضاً ۔ ۵۰۔ (۷) بالِ جبریل ۔ ۱۵۶۔ ''حال و مقال''۔

با مقامے در نمی سازیم و بس ما سراپا ذوقِ پرواز یم و بس
ہر زماں دیدن تپیدن کارماست بے پروبالے پریدن کارماست! (۱)

اسی طرح پشتو زبان کے معروف شاعر اور درویش و مردِ فقیر رحمان بابا بھی اس حقیقت کو ایسے دل نشیں انداز میں ادا کرتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

پہ یوہ قدم تر عرش پورے رسی مالیدلے دے رفتار د درویشاں (۲)

لیکن دورِ حاضر میں ایسا متحرک و سیار پیکرِ ایثار و قربانی مردِ فقیر ناپید ہے۔ وجوہات اس کی مختلف ہوسکتی ہیں مگر:

ناپید ہے بندۂ عمل مست باقی ہے فقط نفس درازی!
ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر اللہ کی شانِ بے نیازی
روشن اس سے خرد کی آنکھیں بے سرمۂ بو علی و رازی!
حاصل اس کا شکوہِ محمود فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تیری دنیا کا یہ سرافیل رکھتا نہیں ذوقِ نے نوازی
ہے اس کی نگاہِ عالم آشوب در پردہ تمام کار سازی!
یہ فقرِ غیور جس نے پایا بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی!

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری (۳)

مگر وہ فقر و عشق جو انسان کو غیور و جسور اور صاحب ذوق و شوق بنا دے، جس کی اصل ایازی نہیں بلکہ حجازی ہو۔ جس فقر سے بندے میں اللہ کی شانِ بے نیازی جلوہ آرائی کرنے لگے اور بوعلی سینا و فخرالدین رازی کی خردمندی کا شرمندہ احسان ہوئے بغیر ہی بصیرت افروز ہو جائے۔ بغیر سور پھونکنے کے جو فقر اسرافیلی کرتے ہوئے قبرستانوں میں بھی زندگی کی ہلچل مچا دے اور جس فقر کے بل بوتے پر مردِ مومن بغیر تیغ و سناں کے فتح یاب ہوکر مردِ غازی کا اوجِ کمال حاصل کرے۔ وہ فقر اتنی آسانی سے نہیں ملتا اور نہ ایسا مردِ فقیر روز روز پیدا ہوتا ہے۔ جس کے دیگر اوصافِ حمیدہ کے علاوہ اس کی غیرت و

---

(۱) جاوید نامہ۔۱۳۴۔ (۲) دیوانِ عبدالرحمان بابا۔ ص ۱۳۔ (۳) ضربِ کلیم۔۸۸۔۸۹۔

حمیت سے متعلق یہ کہا جا سکے کہ:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا (۱)

حامل صفاتِ ھذا مردِ فقیر وہ گوہر نایاب ہے جس سے متعلق خود علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ زندگی ہزاروں برس کعبہ و بت خانہ میں فریاد کرتی ہے۔ تب کہیں بزمِ عشق سے ایک دانائے راز ظاہر ہوتا ہے۔

عمر ہا درکعبہ و بت خانہ می نالد حیات تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں! (۲)

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد (۳)

عمر ہا بر خویش می پیچد وجود تا یکے بے تاب جاں آید فرود (۴)

ہزروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (۵)

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں میر تقی میر

بہرحال اقبال دعا گو ہیں کہ ہمارے اندر عشق و محبت کی وہی قوت زندہ کیجئے جس کی قوت سے بوریا پوش فقیر راہ نشیں، تختِ کیکاؤس کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے۔

زندہ کن باز آں محبت را کہ از نیروے او بوریاے رہ نشینے در فتد با تختِ کے! (۶)

اس لیے کہ لاریب:

با سلاطیں در فتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر

اس کے بعد ہم فقر، مردفقیر گویا صاحب ذوق وشوق کے عروج و زوال کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔ ۱۵۔ (۲) زبورِ عجم۔ ۷۳۔ (۳) پیامِ مشرق۔ ۸۵۔
(۴) جاوید نامہ۔ ۹۔ (۵) بانگِ درا۔ ۲۶۸۔ طلوعِ اسلام۔ (۶) زبورِ عجم۔ ۴۷۔

مگر یہ ایک انوکھی حقیقت ہے کہ فقر و عشق اور عاشق یعنی مردِ کامل، مردِ قلندر یا مردِ فقیر کی تقدیر میں شاندار عروج تو ہے مگر زوال اور موت ہرگز نہیں۔ جبکہ بادشاہوں کی بادشاہی زوال پذیر ہو کر گدائی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ نیرنگئی دوراں کا گلہ کرتے ہوئے یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ، یا تو مرا افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا، یا مرا تاجِ گدایانہ بنایا ہوتا، لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں، کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں۔ اور وہ شاہاں کہ جن کی گرد پا سرمے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی، انہیں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں اور جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا، کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا۔ بے شک آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت، اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا۔ ہاں ___ لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام، آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا۔ ملکہ نور جہان ہندوستان میں جس کے نہ صرف ''حسن و جمال'' بلکہ حکومت کا بھی سکہ چلتا تھا، آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئی۔

برمزار ما غریباں نے چراغ و نے گلے
نے پرِ پروانے سوزد نے صدائے بلبلے

اور علامہ اقبال اپنی نظم ''گورستانِ شاہی'' میں بجا فرماتے ہیں کہ :

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور
موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے (۱)

اور پھر ایک دوسری نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' لکھتے ہیں:

---

(۱) بانگِ درا۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔

آہ یہ دنیا یہ ماتم خانہٴ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں
کلبہٴ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقت گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے!
قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدہٴ تر کے سوا کچھ بھی نہیں (۱)

لیکن صاحب ذوق وشوق یا مردِ فقیر کا معاملہ اور ہی ہے۔ اس سلسلے میں حافظ شیرازی نے کیا خوب فرمایا ہے:

ہر گز نمیرد آں کہ دلش زندہ شُد بعشق ثبت است بر جریدہٴ عالم دوامِ ما

اقبال بھی یہ ثابت کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ آتش عشق ایک ایسی قوت و اکسیر ہے کہ جس میں کود جانے والا مردِ عاشق یا فقیر کندن بنتے ہوئے زوال وموت کے پھندوں سے بالا تر ہو جاتا ہے۔ سازگاری یا ناسازگاریٔ حالات کا مردِ فقیر پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

---

(۱) بانگِ درا۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش　　میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانہء اسپند　(۱)

اس کی بے نیازی اس کا دوام بن جاتی ہے اور وہ زمانے کی تختی پر امر ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مردِ فقیر کا ظاہر و باطن سب روحانیت میں ڈھل جاتا ہے۔ اور روح لافانی و لازوال ہوجاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر مردِ فقیر لافانی ہو جاتا ہے۔ نقطۂ نور جس کا نام خودی ہے، یہی ہمارے بدن میں زندگی کا شرر ہے۔ خودی کا یہ شرر ''حسن مطلق'' کے عشق و محبت سے زیادہ زندہ، زیادہ پائندہ، زیادہ تابندہ اور زیادہ سوزندہ ہوتا ہے۔ محبت ہی سے اس کا جوہر نکھرتا ہے اور محبت ہی سے اس کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کی نشو ونما ہوتی ہے۔ اس کی فطرت عشق ہی سے حرارت حاصل کرتی ہے اور عشق ہی سے دنیا کو جگمگا دینے کا طریقہ سیکھتی ہے۔ عشق کو تیغ و خنجر کا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ اس کی اصل (عناصر) آب و باد و خاک سے نہیں۔ گویا کہ تیغ و خنجر یا دوسرے ہتھیار عشق یا عاشق کی زندگی کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ صاحب ذوق و شوق، ''حسن مطلق'' کی طرف معرفت کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است　　زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

از محبت می شود پائندہ تر　　زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر

از محبت اشتعالِ جوہرش　　ارتقائے ممکناتِ مضمرش

فطرتِ او آتش اندوزد ز عشق　　عالم افروزی بیآموزد ز عشق

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست　　اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست　(۲)

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے　(۳)

عشق کے فیوض و برکات سے مردِ فقیر موت و زوال سے محفوظ رہتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں اگر تو مجھ سے زندگی کا سبق لینا چاہتا ہے تو میں ایک ایسا نکتہ بیان کرتا ہوں، جو سر بستہ راز ہے۔ اگر تیرے بدن میں روح، یعنی عشق نہیں تو تو مر جاتا ہے۔ اگر روح ہے تو تو کبھی نہیں مرتا۔ موت مردِ فقیر پر حملہ آور ضرور ہوتی ہے۔ مگر عشق کی جوابی کاروائی سے، اجل خود اپنی جان ہار بیٹھتی ہے۔

---

(۱) بالِ جبریل۔ ۲۱۔　　(۲) اسرارِ خودی۔ ۱۸۔　　(۳) بانگِ درا۔ ۱۵۶۔ ''فلسفۂ غم''۔

ترا یک نکتۂ سر بستہ گویم اگر درس حیات از من بگیری
بمیری ، گر بہ تن جانے نہ داری وگرجانے بہ تن داری، نمیری (۱)

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا؟

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی، شکارِ قضا ہو گئی وہ (۲)

مردِ فقیر ہرگز نمیرد کے حوالے سے، اقبال ایک دوسرے موقعے پر بھی بڑی خوبصورت بات کہتے ہیں ____ چراغ کے نیچے گرے پڑے پروانے کی کہانی چھوڑ۔ اس کے جلنے کی بات کانوں کے لیے تکلیف دہ ہے۔ میں تو اس پروانے کو پروانہ سمجھتا ہوں جو اتنا سخت کوش ہو کہ شعلے کو کھا جائے۔

بہل افسانہء آں پا چراغے حدیثِ سوزِ او آوازِ گوش است
من آں پروانہ را پروانہ دانم کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است (۳)

تیرا دل موت کے ذکر سے لرز رہا ہے۔ اس کے خوف سے تو ہلدی کی مانند زرد ہے۔ اپنے آپ میں واپس آ۔ اپنی خودی کو مستحکم کر، اگر ایسا کرے گا، تو مرنے کے بعد بھی نہیں مرے گا۔ شرط یہ ہے کہ تو اپنی روح کو عشقِ الٰہی میں عشق بنا لے۔

دلت می لرزد از اندیشۂ مرگ زبیمش زرد مانند زریری
بخود باز آ، خودی را پختہ تر گیر اگر گیری، پس از مردن نمیری (۴)

ہے ابد کے نسخہ ٔ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی زندہ ٔ جاوید عشق (۵)

زمیں پر رہتے ہوئے بھی ہم فقیروں اور درویشوں کا مرتبہ اوجِ ثریا سے بلند تر ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ شرر کی طرح چند روزہ زندگی ہمارے شان کے شایان نہیں۔

---

(۱) پیامِ مشرق۔ ۳۳۔ ''لالہ طور''۔ (۲) بانگِ درا۔ ۵۸۔ ''عشق اور موت''۔ (۳) پیامِ مشرق۔ ۳۴۔
(۴) ایضاً۔ ۴۱۔ (۵) بانگِ درا۔ ۱۵۶۔ فلسفہء غم۔

ہر چند زمیں سائیم بر تر زثریا ئیم　　دانی کہ نمی زیبد عمرے چوشرر مارا　(۱)

اور نہ تجھے (خالقِ حقیقی) ہی زیب دیتا ہے کہ مجھے ایک بار زندگی دے کر مٹا دے۔ خالق حقیقی جسے زندگی دے وہ کبھی نہیں مٹتا۔

زیب دیتا ہی نہیں ہے تجھ کو　　زندگی دے کے مٹانا مجھ کو　(فقرؔی)

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں
شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟　(۲)

جب کوئی ''حسن مطلق'' کا عاشق بن جاتا ہے، تو حسن مطلق ہی کی طرح دائمی ہو جاتا ہے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ دائمی کے عشق میں، عشق یا عاشق زندۂ جاوید نہ ہو۔ اقبال کہتے ہیں اس زندگیء مستعار کے دو چار لمحوں میں آپ کی محبت کی بات پوری طرح بیان نہیں ہوسکتی اور ''حسن مطلق'' یہ کبھی نہیں چاہتا کہ عاشق اس کے عشق میں پوری بات نہ کہے۔ لہذا عشق کو حیات ابدی سے نوازا جاتا ہے۔ بلکہ وہ عشق، عشق ہی نہیں جو زندہ جاوید نہ ہو جائے۔ اگر اسے موت آجاتی ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ عشق یا عاشق ہی نہ تھا۔

شوق اگر زندۂ جاوید نہ باشدعجب است　　کہ حدیث تو دریں یک دونفس نتواں گفت　(۳)

کیا عشق ایک زندگیء مستعار کا!
کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا!!
وہ عشق، جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا!
میری بساط کیا ہے تب و تابِ یک نفس
شعلے سے بے محل ہے الجھنا شرار کا

---

(۱) زبورِ عجم۔ ۴۸۔　(۲) بانگِ درا۔ ۲۳۱۔　(۳) زبورِ عجم۔ ۴۶۔

یوں لگتا ہے کہ اقبال جادۂ عشق پر گامزن ہونے سے پہلے ''حسن مطلق'' کے حضور میں دعا کر رہے ہیں کہ فی الحال میری کوئی حیثیت نہیں ہے مگر میرے عشق کو شرفِ قبولیت عطا فرماتے ہوئے:

کر پہلے مجھ کو زندگیء جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بیقرار کا!
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لا زوال ہو
یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو (۱)

پھر جاوید نامہ میں اقبال ''حسن مطلق'' سے کہتے ہیں آپ کا نور جاوداں ہے جبکہ ہماری زندگی شرارے کی مانند ایک دو مستعار لمحوں کی ہے۔ میری ایک لمحے کی زندگی کو جاوداں کر دیجئے۔ میرا تعلق زمین سے ہے مجھے آسمانی بنا دیجئے۔ گویا کہ مجھے اپنے عشق میں لافانی بنا دیجئے۔

تو فروغِ جاوداں ماچوں شرار یک دو دم داریم و آں ہم مستعار!
آنیم من جاودانی کن مرا از زمینی آسمانی کن مرا (۲)

ارمغانِ حجاز میں اقبال کہتے ہیں، سنا ہے کہ موت نے اللہ تعالیٰ سے کہا۔ یہ انسان جو مٹی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ کیسی بے نم ہے۔ جب میں اس کی جان قبض کرتی ہوں تو مجھے شرم آتی ہے مگر اسے مرنے سے شرم نہیں آتی۔ گویا کہ یہ مردِ فقیر ہی ہوسکتا ہے جو عام آدمی سے ہٹ کر مرنا اپنی توہین سمجھتا ہے۔

شنیدم مرگ با یزداں چنیں گفت چہ بے نم چشمِ آں کز گل بزاید
چو جانِ او بگیرم شرمسارم ولے اورا زمردن عار ناید! (۳)

اسی لئے تو اقبال کہتے ہیں کہ اس طرح زندگی بسر کر کہ اگر ہماری موت مرگ دوام ثابت ہو تو خالق کو بھی اپنی اس تخلیق پر افسوس ہو کہ اس نے عارضی شاہکار بنایا تھا۔

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام خدا زکردۂ خود شرمسار تر گردد! (۴)

مجھے عشق پر ناز ہے کہ اس کے وجود کو مٹ جانے کا غم نہیں۔ کیونکہ وہ زمان و مکان کی زنار داری کے کفر سے بچا

---

(۱) بالِ جبریل۔ ۹۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۱۰۔ (۳) ارمغانِ حجاز۔ ۱۴۳۔ (۴) زبورِ عجم۔ ۸۴۔

ہوا ہے۔ اگر عشق حکم دے تو جانِ شیریں سے بھی گزر جا، عشق ہمارا محبوب و مقصود ہے، جان تو عارضی چیز ہے۔

عشق را نازم کہ بودش را غمِ نابود نے
کفر او زنار دارِ حاضر و موجود نے
عشق اگر فرماں دہد از جانِ شیریں ہم گزر
عشق محبوب است و مقصود است و جاں مقصود نے! (۱)

اسی طرح عشق کے ثبات و دوام سے متعلق ''مسجد قرطبہ'' میں فرماتے ہیں:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام (۲)
اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود (۳)

مردِ فقیر موت سے نہیں ڈرتا، تو زندۂ جاوید ہو کر موت سے ڈرتا ہے؟ موت تیرا شکار ہے اور تو اس کی گھات میں ہے۔ جان عطا کر کے پھر اسے واپس نہیں لیتے۔ آدم اگر مرتا ہے تو بے یقینی یعنی عشق سے خالی ہونے کے باعث مرتا ہے۔

از مرگ ترسی اے زندۂ جاوید؟ مرگ است صیدے تو درکمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند آدم بمیرد از بے یقینی (۴)

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل (۵)

اگر تو مردِ قلندر و صاحب ذوق و شوق کی حیثیت سے ایام کا راکب ہوتے ہوئے، ان دونوں جہانوں کو اپنی گرفت میں لے آئے یعنی اگر تو مردِ قلندر بن جائے تو پھر ساری کائنات کی موت سے بھی تو نہیں مرتا۔ گویا کہ مردِ فقیر سے موت دور رہتی ہے۔

اگر ایں ہر دو عالم را بگیری ہمہ آفاق میرد تو نمیری (۶)

بے شک مردِ فقیر کو موت نہیں آتی، اس لیے کہ ''دلش زندہ شد بعشق''۔ چنانچہ اقبال اپنی ایک نظم ''موت''

---

(۱) زبورِ عجم۔ ۱۱۰۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۹۴۔ (۳) ایضاً۔ ۹۵۔
(۴) زبورِ عجم۔ ۱۱۶۔ (۵) بالِ جبریل۔ ۹۶۔ (۶) زبورِ عجم۔ ۱۵۰۔

میں لکھتے ہیں:

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے!
اگر ہو زندہ تو دل نا صبور رہتا ہے!
مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس
مے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے!
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے! (۱)

اسی طرح ارمغانِ حجاز میں کہتے ہیں:

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقام حیات ۔ کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات! (۲)

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی (۳)

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے ۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (میر)

ختم مرنے سے مصائب نہیں ہوتے پاگل!
موت کہتے ہیں جسے زیست کی انگڑائی ہے (نقری)

آنسو اسی طرح کے آنکھوں سے بہ رہے ہیں ۔ مرنے کے بعد بھی ہم دکھ درد سہہ رہے ہیں (نقری)

جب فقیر مرتا ہی نہیں تو دردِ عشق کیونکر ختم ہوسکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مرنے سے قلندر اور زیادہ زندہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کا دردِ عشق بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔

موت بھی کر نہ سکی کوئی مداوا بلکہ ۔ درد پہلے سے مرے دل میں فزوں ہوتا ہے (نقریؔ)

عشق ایک ایسا ستارہ ہے جس کا تعلق نہ مشرق سے نہ مغرب سے اور نہ وہ کبھی غروب ہوتا ہے اور نہ اس کے مدار میں شمال و جنوب ہے۔

---

(۱) ضربِ کلیم ـ ۶۴ ـ ۶۵ ـ (۲) ارمغانِ حجاز ـ ۲۵ ـ (۳) بانگِ درا ـ ۲۵۴ ـ

کوکب بے شرق و غرب و بے غروب نے مدارش نے شمال و نے جنوب (۱)

عشق جب انتہا کو پہنچتا ہے تو ذرّے کو بھی مہر بنا جاتا ہے اور اس کے سینے میں نو آسمان سما جاتے ہیں۔ جب عشق جہاں پر شبخوں مارتا ہے تو پل بھر کی زندگی رکھنے والوں کو دائمی زندگی عطا کر دیتا ہے۔

ذرّهٔ از شوقِ بے حد رشکِ مہر گنجد اندر سینهٔ او نُہ سپہر!
شوق چوں بر عالمے شبخوں زند آنیاں را جاودانی می کند! (۲)

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی (۳)

رہے نہ ایبکؔ و غوریؔ کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسروؔ! (۴)

سوزِ عشق میں جس کی خودی تابندہ و پائندہ ہو جائے وہ مردِ فقیر بن جاتا ہے۔ فقیر خود گرے خود شکنے و خودنگرے ہوتا ہے۔ اس کی زندگی صدف کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی خودی قطرۂ نیساں ہے۔ اب جو صدف قطرۂ نیساں کو موتی نہ بنا سکے وہ صدف نہیں، حذف ہے۔ لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ فقیر کی زندگی صدف ہی ہوتی ہے اور زندہ و پائندہ رہتے ہوئے اپنی حیاتِ ابدی کا مسلسل ثبوت بہم پہنچاتی رہتی ہے۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گرو خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے! (۵)

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۶۸۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۱۲۰۔ (۳) بالِ جبریل۔ ۷۳۔
(۴) ایضاً۔ ۷۴۔ (۵) ضربِ کلیم۔ ۳۱۔

بابِ سوئم

چشم در کشتِ محبت کاشتم
از تماشا حاصلے برداشتم

فلسفۂ جمالیات میں موضوع (Subject) اور معروض (Object) دو ایسے عناصر ہیں جن پر جملہ ''جمالیات'' کا محل استادہ دکھائی دیتا ہے۔ موضوع و معروض کو موضوعیت(Subjectivity) اور معروضیت (Objectivity) بھی کہا جاتا ہے۔ معروضی نقطہ نظر کے مطابق حسن ظاہر یا خارج میں فی الواقع پایا جاتا ہے۔ اسے اپنی ہستی کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے موضوع ــــ یعنی باطن ، اندرون ، حسیات یا ذہن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی مانے یا نہ مانے حسن معروض میں اپنی جگہ موجود ہوتا ہے۔ نصیر احمد ناصر وحدت الوجود اور معروضیت پر روشنی ڈالتے ہوئے دونوں کو باہمی منسلک کرتے دکھائی دیتے ہیں:

''جہاں تک جمالیات کا تعلق ہے وحدت الوجودی اور معروضی نظریوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ کیونکہ دونوں دبستان حسن کی آزاد معروضیت کے قائل ہیں۔ یعنی دونوں موضوع سے آزاد حسن کے خارجی وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔''(۱)

لیکن وحدت الوجود اور معروضیت میں قدرے مشترک صرف اس حد تک ہے کہ دونوں خارجی یعنی معروضی حسن کی حقیقت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پھر وحدت الشہود بھی معروضیت سے میل کھاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے کہ وحدت اور کثرت کے امتیازات سے ہٹ کر وحدت الشہود کا مطلب بھی تو ظہور ہی ہے۔ قطرے میں سمندر ہے، ذرے میں بیاباں ہے سے لے کر:

ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پر تو خورشید نہیں

تک بات وہی ہے۔

ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی رو سے یہ عالم طبیعی یا کائنات اس لیے حسین ہے کہ اس میں حسنِ مطلق جاری و ساری ہے۔ اس لحاظ سے ''حسن الوہی''، حسن کائنات کی علت ٹھہرتا ہے۔ ادھر معروضی مکتبہ فکر کے نزدیک کائنات اس لیے خوبصورت ہے کہ اس کی تکوین میں ہم آہنگی، اعتدال اور تناسب پایا جاتا ہے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ فلاطینوس نے اس کے برعکس نور وظلمت کے حوالے سے حسن کائنات کو سمجھنے سمجھانے کی دلچسپ کوشش کی ہے۔ حسن جب کسی ظاہری صورت یا معروض میں نظر آتا ہے تو ہم اسے ، حسین و نظر افروز ، دلکش، جنت نگاہ، خوبصورت و قشنگ، جمیل وجلیل،

---

(۱) اقبال اور جمالیات ۔ ۷۷۔ نصیر احمد ناصر

دلآویز اور برق ریز جیسے بے شمار جلیل و جمیل ناموں سے پکارتے ہیں۔

''معروضی نظریے کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ حسن صرف خارجی دنیا میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ حسن موضوعی کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک حسن چونکہ امر واقعی ہے۔اس کے احساس و شعور کے لیے حسِ جمال یا کسی باطنی قوت کی ضرورت نہیں''۔(۱)

ثریا حسین لکھتی ہیں'' جمالیاتی قدر معروضی نظریات کے مطابق وہ مخصوص صفت ہے جو بذاتِ خود تخلیق میں موجود ہو۔''(۲) جب یہی حسن زندگی کے کسی سانچے میں موضوعی شکل و صورت اختیار کرتا ہے تو ہم اسے ،لذت حظ، طرب و نشاط، سکون و اطمینان، راحت و مسرت اور کیف و سرور کہتے ہیں۔ گویا کہ حسن کو ہم معروضی لحاظ سے جلال و جمال ، دلکشی و جاذبیت اور موضوعی اعتبار سے کیف و سرور اور لذت و حظ کہتے ہیں۔

موضوعیت پسندوں نے ظاہری و باطنی فرق کو نہ سمجھتے ہوئے جمالیات میں ''مکتبِ تصوریت'' کی طرح ڈالی۔ ان کے نزدیک حسن صرف موضوعی ہے، معروضی نہیں۔ وہ حسن فی الذات کے قائل نہیں، یعنی ان کے نزدیک حسن کا اپنا کوئی وجود نہیں، بلکہ حسن فی الذہن سے ہے۔نصیر احمد ناصر اس ضمن میں اپنی کتاب ''جمالیات قرآن حکیم کی روشنی میں'' رقم طراز ہیں کہ:

''حسن کے موضوعی نظریے کے حامی مفکرین اس بات کے مدعی ہیں کہ حسن خارجی دنیا میں نہیں۔ بلکہ انسان کے اپنے اندر ہے یعنی اس کے قلب و نظر میں ہے اور اس کے اظہار سے موجودات حسین و نظر افروز نظر آتی ہیں۔''(۳)

اسی طرح پروفیسر ثریا حسین اپنی کتاب ''جمالیاتِ شرق و غرب'' میں تحریر کرتی ہیں کہ:

''موضوعیت کے نظریے (Subjective Theories) کے مطابق کوئی بھی شے جمالیاتی قدر کی حامل نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار مشاہدہ کرنے والے کے زاویہ نظر پر ہوتا ہے۔''(۴)

---

(۱) جمالیات قرآن حکیم کی روشنی میں ۔ ۱۰۶۔نصیر احمد ناصر (۲) جمالیات شرق و غرق۔۱۲۳ (۳) جمالیات قرآن حکیم کی روشنی میں۔۱۰۶
(۴) جمالیات شرق و غرب۔۱۲۲۔

یوں لگتا ہے کہ موضوعیت افلاطون کے تعقلات فی الذہن، تصوریت ہی کا دوسرا نام ہے ۔ گویا کہ موضوعی تصوریت کے ڈانڈے افلاطونی ''عینیت'' سے جا ملتے ہیں۔ بہر حال موضوعی مکتبہ فکر یا موضوعین کے مطابق حسن ہمارے اپنے ہی تصور و تخیل کی تخلیق ہے۔ اس لیے یہ فقط موجود فی الذہن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موضوعیت یا تصوریت کے پیروکار کائنات کی موجودگی فی الذات نہیں مانتے۔ اس طرح موضوعیت کی رو سے کائنات اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ موجود فی الذہن ہوتے ہوئے ہمارے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔ اس طرح موضوعیت کے تحت حسن بھی کائنات کی طرح موجود فی الذات کوئی چیز نہیں۔ بلکہ یہ بھی ہماری ذہنی حسیات ہی کی اختراع ہے۔ نصیر احمد ناصر موضوعیت کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

> ''حسن ایک صورت تو ہے ۔ لیکن وہ موضوعی صورت ہے۔ یہ عرض تو ہے لیکن ایسا عرض جس کا تعلق صرف ہمارے ذہن ہی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ ہمارا ذہن ہی خالق رنگ و صورت ہے۔ لہٰذا حسن بھی معروضی نہیں بلکہ موضوعی ہوا کرتا ہے۔ فرائیڈ نے اسی نظریے سے متاثر ہو کر کہا ہے کہ حسن جنسی جبلت کا ایک کرشمہ ہے۔ ورنہ کائنات میں کوئی شے بذاتِ خود حسین ہے اور نہ قبیح''(۱)

نصیر احمد ناصر نے ان الفاظ کی صورت میں موضوعین کا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ ورنہ ان کا اپنا نقطہ نظر یہ نہیں دکھائی دیتا۔ بلکہ وہ موضوعیت و معروضیت کے اتحاد یعنی ''وحدت جمال'' پر یقین رکھتے ہیں۔ جسے ''قرآنِ حکیم'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے حسن معروضی و موضوعی ہے نہ کہ تصوریت کے تحت صرف موضوعی۔

جمالیات کی دنیا میں جمالیاتی حس اور جمالیاتی ذوق بنیادی عناصر ہیں۔ ان میں بھی جمالیاتی حس اپنی اصلیت میں اصل اور جمالیاتی ذوق فروعی حیثیت رکھتا ہے۔ جمالیاتی حس اپنی فطرت میں لافانی اور قلب کی قوتوں میں سے ایک فطری قوت ہے۔ یہ زمان و مکان سے بالاتر قوت ہے۔ جس کا تعلق رنگ و نسل یا کسی مخصوص خطے سے نہیں۔ بلکہ ہر قوم و نسل اور کائنات کے کسی بھی حصے میں بسنے والے انسانوں میں لازمی طور پر پائی جاتی ہے۔ ہاں کمی بیشی کا احتمال ضرور ہے مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ بعض لوگوں میں جمالیاتی حس بالکل ہی نہ پائی جاتی ہو۔ گویا کہ یہ قدرے مشترک، عطیہ خداوندی ہے۔

---

(۱) تاریخ جمالیات ۔ جلد اول ۔۲۷۔

جہاں تک جمالیاتی ذوق کا تعلق ہے تو اس کا تعلق ہر ایک کے اپنے اپنے معیار سے ہے گویا اس مسئلے میں ذاتی پسند و ناپسند ملوث ہو جاتی ہے۔ اور اردگرد کا ماحول رسم و رواج کے سانچے میں ڈھل کر ''جمالیاتی ذوق'' کے الگ الگ پیمانے یا معیارات قائم کرتا ہے۔ نتیجے کے طور پر مختلف لوگوں اور اقوام کا علیحدہ علیحدہ جمالیاتی ذوق نشو ونما پاتا ہے۔ مثال کے طور پر ول ڈیورانٹ نشاطِ فلسفہ (The pleasures of philosophy) میں لکھتے ہیں:

> ''حسن اخلاق کی طرح جغرافیے کے ساتھ بدلتا ہے۔ ڈارون ہمیں بتاتا ہے کہ تاہتی کے وحشی، چپٹی ناک کو پسند کرتے ہیں اور حسن کی خاطر اپنے بچوں کے نتھنے اور پیشانیاں دبا دیتے ہیں۔ مایا قبیلے کے لوگ زیورات سے اپنے بچوں کے ناک اور کان چھید دیتے ہیں۔ اور ان کے دانتوں کو گھس کر ان کے اوپر کچھ چڑھا دیتے ہیں۔اور ان کے سروں کو تختے کے نیچے دبا دیتے ہیں اور انہیں بھینگا پن سکھاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اسی میں حسن نظر آتا ہے۔ منگو پارک حیران رہ گیا کہ افریقہ کے کالے حبشی اس کی سفید جلد کا مذاق اڑاتے تھے۔ جب مشرقی افریقہ کے ساحل پر حبشی بچوں نے رچرڈ برٹن کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے ''ذرا سفید آدمی کو دیکھو کیا وہ ایک سفید بندر کی طرح معلوم نہیں ہوتا؟'' اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زولو حبشی ایک کالے گوریلے کی مانند ہے۔ غالباً ہم دونوں صحیح ہیں۔۔۔ اکثر لوگ یہ جانتے ہیں کہ بہت سی ہاٹن ٹوٹ عورتوں کے کولہے بے حد بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔۔۔ یہ خصوصیت مردوں کے لیے بہت کشش رکھتی ہے''(۱)

صورت کی بھولی بھالی، نقشے کی پیاری پیاری
سکھیاں بھی کون؟ جن کے کولہے ہیں بھاری بھاری

پروفیسر ثریا حسین اپنی کتاب ''جمالیات شرق و غرب'' میں رقم کرتی ہیں '' بھاری کولہوں والی لڑکیوں کا گیت عہد کے مجسموں، تصویروں اور ادبیات میں بڑا عمل دخل ہے'' (۲)

---

(۱) نشاط فلسفہ۔ ۲۲۵۔ (۲) جمالیات شرق و غرب۔ ۴۱۔

تو مطلب یہ ہے کہ مختلف علاقوں ،نسلوں، قوموں اور لوگوں میں انفرادی طور پر حسن کے معاملے میں ذاتی پسند و ناپسند کا بڑا عمل دخل ہے۔ عورت میری ذاتی رائے میں مرد کی مردانگی یا طاقت وقوت کو حسن سمجھتی ہے۔ جبکہ مرد کے نزدیک عورت کی لطافت ونزاکت حسن ہے۔ اس مقام پر میں یہ نکتہ اجاگر کرنا چاہوں گا کہ حسن کو سمجھنے اور سمجھانے میں ذاتی پسند و ناپسند کی روشنی میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے کہ حسن کے معاملے میں لوگ ایک نکتے پر متفق نہیں لہٰذا حسن ناقابل فہم ہوتے ہوئے کسی آفاقی و کائناتی مقام کا مالک ہی نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ حسن کو اپنے اپنے ذاتی معیار کی کسوٹی پر نہ جانچیں بلکہ حسن کو حسن کی ہی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ صاف ظاہر ہے حبشیوں اور وحشیوں کا معیار حسن بھی وحشی ہی ہوگا۔ جس کے مطابق ناک چپٹی ، پیشانی چپکی ہوئی، بھینگا پن اور دانت گھسے ہوں گے۔ یہ ذہنی اور ماحولیاتی معیارات ہیں۔ ہم لاکھ سمجھتے رہیں کہ حسن ہمارے قائم کردہ معیارات یا ذہنی رویوں کا پابند ہوگیا ہے درحقیقت ایسا ہوتا نہیں۔ ہمارے معیار کے بدل جانے سے حسن بدل نہیں جاتا اور نہ اس کی حیثیت و نوعیت پر کوئی آنچ آتی ہے۔ اس لیے کہ، حسن انسان نے نہیں بنایا، حسن نے انسان بنایا ہے۔ پس حسن، حسن ہے لوگوں کے معیار کا محتاج نہیں کیونکہ حسن کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کائنات کی روح ہے۔

جمالیاتی حس نہ صرف انسانوں بلکہ ہر ذی روح میں پائی جاتی ہے اس سلسلے میں اگر ذرا باریک بینی سے کام لیا جائے تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔ ول ڈیورانٹ لکھتے ہیں:

> ''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ احساسِ حسن فقط ہم رکھتے ہیں کہ ہم حسن کو نظر اور بینائی کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ حیوانوں میں بھی جمالیاتی لرزش شامہ کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔'' (۱)

صاف ظاہر ہے کہ جس طرح زندگی کے مختلف روپ اپنے اپنے انداز میں زندگی بسر کرتے ہیں، اسی طرح ان کی جمالیاتی حسِ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ کتے کے لیے حسین وجمیل دوشیزہ نہیں بلکہ دوسرے کتے کی بو ہی خوبصورت ہے۔ اسی طرح شہد کی مکھی کے لیے انسان یا کوئی خوبصورت پرندہ نہیں بلکہ پھول حسین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان کی جمالیاتی حسِ زیادہ وسیع ہے۔ کہ وہ خوبصورت کتے کو خوبصورت سمجھتا ہے۔ خوبصورت پرند و چرند بھی انسان کا دل لبھاتے ہیں۔ ورنہ انسان اپنی محبوبہ کی آنکھوں کو غزال کی آنکھوں سے تشبیہہ نہ دیتا۔ اسی طرح شہد کی مکھی اور پھول بھی

---

(۱) نشاطِ فلسفہ۔۳۳۳۔

انسان کے نزدیک حسن کا ایک درجہ رکھتا ہے۔ ڈارون لکھتا ہے: ''کچھ پرندے اپنے گھونسلوں کو رنگین پتوں، گھونگوں، پتھروں، پروں اور کپڑے کے ان ٹکڑوں سے سجاتے ہیں جو انسانوں کے گھروں میں پائے جاتے ہیں۔''(۱)

اسی طرح:

''مرغ فردوس اپنی شریک زندگی کے لیے خاص گھونسلہ بناتا ہے۔ جو گھنی جھاڑی سے ڈھکا ہوتا ہے اور اس کے فرش پر گھاس پھونس چنی ہوتی ہے۔ وہ قریبی چشمے سے سفید کنکر لا کر فن کارانہ طریق پر دو رویہ رکھتا ہے۔ وہ دیواروں کو چمکدار پروں، سرخ بیریوں اور دوسری خوبصورت چیزوں سے آراستہ کرتا ہے۔ آخر میں وہ دروازے کو دریائی صدفیوں اور درخشاں سنگریزوں سے ایک خاص حسن و وقار بخشتا ہے۔'' (۲)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ وہ ''تاج محل'' ہے جسے شاہجہان نے اپنی ملکہ ممتاز محل کے لیے استوار کیا تھا۔ اور جمالیاتی حسِ کی یہی مشابہت انسانوں و حیوانوں میں پائی جاتی ہے۔

یہ بحث مجازی حسن کے بارے میں ہو رہی ہے جسے کبھی ماہرین جمالیات نے خوشی و انبساط اور حظ کا ایک بہترین وسیلہ بتایا ہے۔ لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجازی حسن خوشی و مسرت کا نہیں بلکہ صدمے کا فوری ذریعہ بنتا ہے۔ حسن ہمیں ملے تو بھی صدمہ ہے اور اگر نہ ملے تو بھی صدمہ ہے۔ دراصل انسان خوشی کے آنسو کبھی نہیں بہاتا، بلکہ جب اسے کوئی انہونی ہوتی دکھائی دینے لگتی ہے تو اپنی گزشتہ محرومیوں اور پل دو پل کی عارضی کامیابی پر لاشعوری طور سے رونے لگتا ہے۔ ہم اس کے چھلکتے آنسوؤں کو عیش و نشاط اور خوشی و مسرت کے انمول ہیرے جواہرات یا ستارے سمجھنے لگتے ہیں۔ جو درحقیقت اس کی آتشِ دل کے دہکتے شرارے و انگارے ہوتے ہیں۔

موضوعیین یا تصوریت کے پیرو حواس پر یقین رکھتے ہیں۔ اور حواس کا تعلق مجاز سے ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ حضرات اسی چیز پر یقین رکھتے ہیں جو دکھائی دیتی ہو یا محسوس کی جاسکتی ہو۔ گویا کہ کائنات اور اس میں اشیاء کا ہونا نہ ہونا حواس کا مرہونِ منت ہے، اسی لیے ہابز کہتا ہے:

---

(۱) نشاطِ فلسفہ۔۲۳۳۔ ول ڈیورانٹ۔ (۲) ایضاً۔۲۳۳۔

''اگر دنیا میں آنکھیں یا حساس جسم نہ ہوتا تو روشنی کیونکر ہوتی؟ اگر دنیا میں کان نہ ہوتے تو آوازیں کیونکر ہوتیں۔ حسین قوسِ قزح ہماری نظروں میں ہے نہ کہ آسمان میں (۱)

اس کے جواب میں میں یہ عرض کروں گا کہ دکھائی دینے میں صرف آنکھوں کا کمال نہیں اگر آنکھیں ہوتیں اور روشنی نہ ہوتی تو پھر کیسے نظر آتا؟ آنکھیں ہوتی ہیں مگر اس کے باجود رات چھا جاتی ہے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح آواز نہیں ہوتی مگر کان پھر بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح کان نہ ہوتے تو آوازیں اس کے باوجود ہوتیں۔ گونگے اور بہرے سامع سے محروم ہوتے ہیں، وہ اپنی آواز بھی نہیں سن سکتے لیکن ان کی آواز ہوتی ہے اور ہم سب سنتے ہیں۔ کانوں یا سامع کا نہ ہونا ہماری کمزوری ہے نہ کہ آواز کی۔ اسی طرح ہم اپنی اپنی آنکھوں میں اپنی ہی پتلی کو تو دیکھ نہیں پاتے اور یہ دعویٰ بہ آسانی کرتے ہیں کہ قوسِ قزح ہماری آنکھوں میں ہے۔ اگر قوسِ قزح ہماری آنکھوں میں ہے تو پھر ہم اسے ہر وقت کیوں نہیں دیکھ سکتے؟ یہ تو صرف کہیں سال میں ایک آدھ دفعہ برکھا رت میں نظر آ جاتی ہے۔ اور وہ خوبصورت قوس قزح جو مئی ۱۹۹۴ء میں راقم الحروف نے ترکی کے علاقے ارزروم سے استنبول کی طرف جاتے ہوئے دیکھی تھی، اب کیوں نہیں دکھائی دیتی؟

یہی معاملہ رنگوں وغیرہ کا ہے۔ رنگوں کے سلسلے میں بھی موضوعیت پرست حواس ہی کو سند ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

''یہ خارجی دنیا جسے ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری ذات سے الگ رہ کر قائم ہے رنگوں کی دنیا ہے۔ لیکن رنگ داخلی ہیں۔ وہ ہم میں ہیں۔ ان چیزوں میں نہیں جنہیں ہم دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ چند رنگوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ مثلاً قدرت میں انہیں سرخ رنگ نظر نہیں آتا۔ اگر ہم سب ان کی طرح ہوتے تو کیا گلاب کبھی سرخ ہوتا۔ ۔۔حیوانوں کی آنکھیں ہماری آنکھوں سے مختلف ساخت رکھتی ہیں اور شاید وہ اور رنگوں اور شکلوں کی شہادت دیتی ہیں۔ کون سی شکل یا رنگ حقیقی ہے، ہماری آنکھیں

---

(۱) نشاطِ فلسفہ۔ ۳۰۔ ول ڈیورانٹ۔

قوسِ قزح کے بڑے حصے کو نہیں دیکھ سکتیں۔ بہتر آنکھیں رکھنے والے حیوان دنیا کے رنگ اور شکلیں ہم سے بہتر طریقے پر دیکھ سکتے ہیں۔"(۱)

موضوعیت کے حوالے سے اپنے اپنے انداز میں دیکھنے کے ضمن میں علامہ اقبال نے بھی اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ___ کہ یہ وادیٔ گل وہی نظر آتی ہے جو وہ ہے؟ کیا ہم جانتے ہیں کہ لالۂ آتشیں کے اندر کیا ہے؟ ہمیں تو چمن ایک موجِ رنگ نظر آتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ بلبلوں کی آنکھ اسے کیا دیکھتی ہے؟

نماید آنچہ ہست ایں وادیٔ گل — درونِ لالۂ آتش بجاں چیست؟
بچشمِ ما چمن یک موج رنگ است — کہ می داند بچشم بلبلاں چیست؟(۲)

اگر ایسا ہے تو ہم یہی کہیں گے کہ قدرت نے مختلف جانداروں کا نظام بصارت مختلف بنایا ہے۔ رنگ کا رنگ وہی ہے جو ہے۔ اگر ہمیں مختلف نظر آتا ہے تو ہمارے نظامِ بینائی کا اختلاف ہے۔ یا یوں بھی ہوسکتا ہے کہ حسن مطلق نے ایک ہی رنگ میں ہر رنگ بھر دیا ہے تا کہ ہر رنگ میں اسی کا رنگ دکھائی دے۔ کہ ہر رنگ اسی کا رنگ ہے۔ جیسا کہ اقبال کہتے ہیں:

کرن چاند میں ہے، شرر سنگ میں — یہ بیرنگ ہے ڈوب کر رنگ میں
چمک اس کی بجلی میں، تارے میں ہے — یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول — اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور — کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور!
کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں نا صبور!(۳)

دراصل چشمِ بلبلاں چیست؟ سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ ہوسکتا ہے بلبل کی آنکھ کو موجِ رنگ حسن مطلق دکھائی دیتا ہو۔ دوسرا مطلب اس سے یہ نکلتا ہے کہ اقبال نے موضوعی فلسفیوں کی طرف سے یہ نقطہ اجاگر کیا ہے کہ مظاہر دھوکہ و سراب

---

(۱) نشاطِ فلسفہ۔۴۰۔۴۱۔ ول ڈیورانٹ۔ (۲) پیامِ مشرق۔۴۸۔ (۳) بالِ جبریل۔۱۲۶۔۱۲۷۔ "ساقی نامہ"۔

ہیں، کسی کو کیا اور کسی کو کیا دکھائی دیتے ہیں اور پھر خود ہی اس کا جواب بھی دیتے ہیں کہ درحقیقت ان ظاہری آنکھوں سے مہر و ماہتاب کی روشنی کے بغیر ہم کچھ دیکھ بھی نہیں سکتے۔ حالانکہ مظاہر تو اندھیرے میں بھی موجود ہوتے ہیں۔ روشنی میں سبز دکھائی دینے والا میدان ،جنگل یا صرف ایک پتااندھیرے میں سیاہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح لال و زرد رنگ بھی اندھیرے میں کالے نظر آتے ہیں۔چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ:

نگاہ وہ ہے کہ محتاج مہر و ماہ نہیں   نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے (۱)

ظاہری نگاہ کے سہارے تجزیاتی فلسفی حقیقت کو نہ دیکھ پانے کی بناء پر اس کا انکاری ہے اور تصوراتی فلسفی کو مظاہر دھوکہ و فریب دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت میری رائے کے مطابق تو سراب بھی سراب نہیں۔ ہماری آنکھوں کو اگر ریت کی مخصوص چمک پانی دکھائی دیتی ہے تو اس میں ریگستان پہ دھوکہ دہی کا الزام لگا کر اسے ''سراب'' کیوں قرار دیا جائے۔لہذا میں یہ کہوں گا کہ جسے ہم سراب سمجھتے ہیں وہ درحقیقت ،حقیقت اس لیے ہے کہ پانی دکھائی دیتے وقت بھی وہ ریت ، ریت ہی ہوتی ہے۔ ریت خود کو پانی بنا کرنہیں دکھاتی بلکہ ہماری یہ ظاہری آنکھیں اسے پانی بنا کر دکھاتی ہیں۔جن پر فلسفیوں نے اندھا یقین قائم کر رکھا ہے۔

موضوعی ماہرین جمالیات بنیادی طور پر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر ہم کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتے تو وہ موجود ہی نہیں ہوتی لیکن اس سلسلے میں وہ تضاد بیانی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا حوالے کی رو سے موضوعیت کو خود بھی اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے۔کہ بہتر آنکھیں ہوں تو رنگوں کو اور بہتر انداز سے دیکھا جا سکتا ہے۔گویا کہ اگر قصور ہماری آنکھوں کا ہو تو اس میں رنگوں کی کون سی غلطی ہے۔ایک شخص بذاتِ خود رنگ کور ہے تو اس میں رنگ بے چارہ کیونکر مارا جائے؟ صلاحیت دیکھنے والے میں نہ ہو اور سزائے موت رنگ کو دے دی جائے۔ میں یہاں ایک سوال اٹھانا چاہوں گا کہ صاف ظاہر ہے رنگوں کی آنکھیں نہیں ہوتیں اس لیے رنگ ہمیں دیکھ نہیں سکتے تو کیا ہم موجود نہیں؟ یا اگر ہم تنہائی میں ہوں تو کیا نہیں ہوتے، ناپید ہو جاتے ہیں؟ اس ضمن میں ول ڈیورانٹ کیا خوب لکھتے ہیں کہ:

''عینی فلسفے کے فریب کا راز یہ ہے کہ وہ مطلب کو''وجود'' کے ساتھ الجھا دیتا ہے۔
وہ چیزیں جن کا کوئی مشاہدہ نہیں کرتا ، ان کا مطلب نہیں، لیکن شاید ان کا کوئی وجود

---

(۱) ضرب کلیم ۔۱۷۷۔

ہو۔ بریڈلے نے کہا تھا کہ کسی چیز کے حقیقی ہونے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کا مشاہدہ کیا جائے۔ لیکن کیا وہ دور کے سیارے دوربین کی ایجاد سے پہلے وجود نہیں رکھتے تھے۔اور ہم یہ یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ایسا سیارہ موجود نہیں جو ہمیں موجودہ آلوں سے بھی نظر نہ آتا ہو؟۔۔۔۔دوربینوں نے دیکھا اور ایک نیا سیارہ دریافت کیا۔ کیا اس طرح ہم نے نیپتون کو تخلیق کیا تھا؟" (۱)

اس سلسلے میں اقبال کیا خوب فرماتے ہیں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں   یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر   چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں(۲)

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود (۳)

اور پھر اقبال ہی کے مطابق حقیر چیونٹی کی آنکھ پر ہزاروں ایسے راز منکشف ہیں جو ہماری آنکھوں سے اُوجھل ہیں۔

چشمِ مورفرومایہ آشکار آید   ہزار نکتہ کہ از چشمِ ما نہاں بود است۔ (۴)

اور پھر:

آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں (۵)

پھر مولانا رومؒ تو موضوعی فلسفیوں کو بالکل ہی لاجواب کر دیتے ہیں۔ جیسے موضوعیت (Subjectivity) کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہو:

حسن یوسف دیدۂ اخواں ندید   از دلِ یعقوب کے شد نا پدید (۶)

موضوعی نظریہ جمال پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرنا انتہائی ضروری ہے کہ بارکلے موضوعیت کا سرگرم

---

(۱) نشاطِ فلسفہ۔۴۳۔ ول ڈیورانٹ۔ (۲) بالِ جبریل۔۶۱۔ (۳) ایضاً۔۱۲۸۔"ساقی نامہ"
(۴) زبورِ عجم۔۸۶۔ (۵) بانگِ درا۔۱۷۴۔ (۶) مثنوی مولوی معنوی۔۳۹۴۔ دفتر پنجم۔

ترجمان ہے ____ اس نے اجسام کی ہستی کے لئے مشاہدے کو لازم وملزوم قرار دے دیا۔ اور جب درخت کے حوالے سے اس پر اعتراض ہوا کہ اگر درخت کو دیکھنے والا کوئی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ درخت معدوم ہے۔ تو بارکلے نے جواب دیا کہ خدا ہر وقت درخت کو دیکھ رہا ہے۔

عینی و موضوعی فلسفے کے مطابق کوئی درخت سبز نہیں ہوتا جب تک کوئی اسے دیکھنے والا نہ ہو۔ لیکن درحقیقت جب تک درخت خود سبز نہ ہو وہ سبز دکھائی نہیں دیتا۔ ورنہ وہ درخت جن کے پتے خزاں میں جھڑ جاتے ہیں۔خزاں میں بھی سرسبز وشاداب دکھائی دیتے۔ اسی طرح جنگل یا باغ میں ایک ہی قسم کے سرسبز اشجار میں خشک درخت ہرا بھرا نظر نہیں آتا۔ ول ڈیورانٹ لکھتے ہیں۔

''اگر مشاہدے سے سبز رنگ پیدا ہوتا تو مشاہدہ کرنے والے کو درخت، بادل، گلاب اور سنہری بال سب کچھ سبز نظر آسکتا ہے۔ دائی حقیقت یہ ہے کہ جہاں متضاد تصورات کے درمیان صحت کا فیصلہ کرنا ہو، حقیقت ان تصورات کو وحدت کے رشتہ میں منسلک کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔'' (۱)

بات دراصل یہ ہے کہ دیکھنے نہ دیکھنے سے کوئی چیز پیدا و ناپید نہیں ہوجاتی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمیں کوئی گدھا دیکھتا ہے۔ تو کیا وہ ہمیں پیدا کر لیتا ہے؟ اس کے بعد کوئی کتا یا بھیڑ یا دیکھتا ہے تو کیا وہ ہمیں دوبارہ تخلیق کرتا ہے؟ یا درحقیقت ہم پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ نہ ہم کسی کے دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ کوئی چیز ہمارے دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کیا ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی وہ کوہستانی پگڈنڈیاں، جن پر چلتے چلتے ہمارے اباؤ اجداد اس دنیا سے گزر گئے۔ ہمارے دیکھنے سے معرض وجود میں آگئی ہیں یا یہ کہ ہمارے بیٹوں کے دیکھنے سے پیدا ہوجائیں گی۔؟ ہونے نہ ہونے کا مسئلہ یہ ہے کہ جب راقم الحروف یعنی میں نہیں تھا تو مجھے کچھ یاد نہیں لیکن زمانے کو میرا نہ ہونا یاد ہے۔ اور جب میں نہیں ہوں گا تو مجھے کیا یاد ہوگا؟ لیکن زمانے کو معلوم ہوگا کہ میں نہیں ہوں:۔

جس وقت نہیں تھا میں پھر بھی تو کہیں تھا میں
یا زیرِ زمیں تھا میں یا عرش نشیں تھا میں
ہو سکتا ہے یہ بھی کہ خود عرش بریں تھا میں

---

(۱) نشاطِ فلسفہ۔۴۵۔

اک پختہ یقیں تھا میں
گویا کہ یہیں تھا میں
لیکن یہ حقیقت ہے ہونے کی طریقت ہے
جس وقت نہیں تھا میں بس یاد یہی ہے کہ
کچھ یاد نہیں مجھکو
جس وقت نہیں ہوں گا کیا یاد مجھے ہوگا؟ (فقرؔی)

غور کیا جائے تو موضوعیت، عینیت یا تصوریت کے رشتے سوفسطائیت سے بھی جا ملتے ہیں۔ کہ وہ بھی فقط اپنے حواس پر اعتماد رکھتے تھے۔ لیکن متشکیکن کہتے تھے!" یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہمارے حواس کو سورج شلجم کی طرح چھوٹا معلوم ہوتا ہے اور ستارے آسمان کے جسم پر پھوڑے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ہم اپنے حواس پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ پرہو نے کہا، کوئی بات بھی یقینی نہیں ہے۔ اور جب وہ مرگیا تو اس کے شاگردوں نے، جو اس سے بہت عقیدت رکھتے تھے، اس کی موت پر افسوس نہیں کیا، کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ مرگیا ہے"۔ (۱)

معروضی مکتبہء فکر خارجی دنیا یعنی عالم محسوسات کو حقیقت سمجھتا ہے جبکہ موضوعیت کے مطابق داخلی عالم، گویا کہ عقل وحواس حقیقت پر مبنی ہیں۔ خارج میں کائنات اور دوسری اشیاء سب واہمہ اور طلسم ہے۔ موضوعی مکتبہ فکر کا لب لباب یہ ہے کہ:۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے (غالبؔ)

اقبال نے دونوں مکاتب فکر یعنی موضوعیت ومعروضیت کا نچوڑ اس طرح پیش کیا ہے:۔

ہے حقیقت یا مری چشم غلط بیں کا فساد یہ زمیں، یہ دشت، یہ کہسار، یہ چرخ کبود!
کوئی کہتا ہے نہیں ہے، کوئی کہتا ہے کہ ہے کیا خبر! ہے یا نہیں ہے تیری دنیا کا وجود !(۲)

یعنی موضوعی کہتے ہیں کہ دنیا کا وجود نہیں ہے بلکہ حقیقت کا وجود ہے۔ جبکہ معروضیوں کے نزدیک دنیا تو ہے مگر حقیقت نہیں ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں قدم قدم پر دونوں مکاتب کا جواب دیا ہے اور ثابت کر دکھایا ہے کہ دنیا بھی

---

(۱) نشاط فلسفہ۔ ۳۵۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔

ہے اور حقیقت بھی ہے ۔ ان کا یہ ''ذوق جمال'' قرآن کی رو سے '' وحدت جمال'' کہلاتا ہے ۔

جمالیات کے معروضی و موضوعی دبستانوں میں اپنی اپنی جگہ بہت سے سقم پائے جاتے ہیں ۔ جن میں سے موضوعیت کے نقائص کا جائزہ ہم لے چکے ہیں ۔ جہاں تک معروضیت کا تعلق ہے ۔ تو اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ بلاشبہ حسن معروض و خارج میں موجود ہے مگر اس سے لطف و سرور کی صورت میں استفادہ حاصل کرنا داخلی یا موضوعی حسن کے بغیر ناممکن ہے ۔ موضوعی و معروضی دونوں نظریے اپنی اپنی جگہ ناقص و نامکمل دکھائی دیتے ہیں ۔ اس لئے کہ ان دو میں سے ہر ایک نظریہ حقیقت کے صرف ایک ہی پہلو کی ترجمانی و عکاسی کرتا ہے ۔ گویا کہ تصویر کا یہ ایک رخ جمالیاتی مشاہدے میں ہماری مکمل رہنمائی نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ موضوعیت و معروضیت دونوں کو یکجا کر کے قرآن حکیم نے آج سے تیرہ سو سال پہلے '' وحدت جمال'' کا نظریہ پیش کیا تھا ۔ جس کے نتیجے میں معروضیت و موضوعیت میں ہم آہنگی اور وحدت پیدا ہو جانے کی بناء پر حقیقت کے دونوں رخ اجاگر ہو کر سامنے آگئے ۔

'' وحدت جمال'' سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان حسن معروض کا مشاہدہ حسن موضوع کے بل بوتے پر کرتا ہے ۔ جس سے انسان میں احساس و شعور کی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔

''قل ھوالذی انشاء کم و جعل لکم السمع و الابصار و الافدۃ ○قلیلا ما تشکرون○

(۲۷۔۲۳)

کہہ دو وہی (باری تعالیٰ) ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لئے سننے اور دیکھنے کے حواس اور (احساس و شعور کی قوتوں کا مبداء) قلب بنا دیا ۔ تم شکر بھی کرتے ہو تو بہت تھوڑا ۔

سقراط سے پہلے کے قدیم یونانیوں کے تصور حسن پر بات کرتے ہوئے نصیر احمد ناصر کہتے ہیں کہ:۔

'' ان کا عقیدہ تھا کہ حسن کی لاتعداد انواع اور درجے ہیں ۔ مگر ان سب کی اصل صرف '' حسن مطلق'' ہے ۔ جو یگانہ و یکتا ہے ۔ حسن فطرت یا مجازی حسن تو قابل تغیر اور بے ثبات ہے ۔ لیکن الوہیتی حسن ابدی ہے ۔ اس اعتبار سے ہر حسین شئے میں بھی ابدیت کی شان پائی جاتی ہے ۔ کیوں کہ وہ الوہیتی حسن میں فی الجملہ

شریک ہوتی ہے۔ یا یہ کہ الوہیتی حسن اس شے میں ظہور پذیر ہوتا ہے"۔ (۱)

یونانیوں کے اس تصورِ حسن کے بارے میں، مجھے یہ کہنا ہے کہ جب ہر حسین شے میں ابدیت کی شان پائی جاتی ہے۔ تو پھر حسن فطرت یا حسن مجازی بے ثبات کیسے ہوا؟ اس لحاظ سے تو حسن بے شک متغیر لیکن پائیدار و لافانی ثابت ہوتا ہے۔ "قل یوم ھو فی شان"۔ دراصل حسن جس صورت، پیکر، سانچے، ڈھانچے یا مظہر میں ظاہر ہوتا ہے وہ متغیر و بے ثبات ہوتا ہے۔ بذات خود حسن متبدل ہوتے ہوئے بھی بے ثبات نہیں ہوتا۔ حسن اپنا مظہر اور سانچہ تو تبدیل کر لیتا ہے مگر فناہ ہرگز نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک پھول یا حسین وجمیل چہرہ ختم ہو جائے تو دوسرا پھول یا حسین وجمیل چہرہ معرض وجود میں آ جاتا ہے۔ یہ نیا پھول یا چہرہ، ہرگز پہلے والا پھول یا چہرہ نہیں ہوتا، لیکن حسن پہلے والے پھول اور چہرے ہی کا ہوتا ہے۔ مرقعہ حسن وجمال، "نور جہاں" اگر مٹ گئی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے بعد قدرت نے نور جہاں ثانی حسینائیں پیدا نہیں کیں۔ یا یہ کہ جہانگیر پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں۔ نور جہانیں بھی بے شمار ہیں اور ان کے اپنے اپنے جہانگیر بھی لاتعداد۔ یہ اور بات کہ ہم جہانگیر نہیں ہیں۔

دل کی تعبیر نہیں ہوں فقرؔی اپنی تقدیر نہیں ہوں فقرؔی
نورجہانوں کی کمی کیا لیکن میں جہانگیر نہیں ہوں فقرؔی

علامہ محمد اقبال اپنی ایک نظم "حقیقت حسن" میں فرماتے ہیں:۔

خدا سے حسن نے اک روز سے یہ سوال کیا — جہاں میں کیوں نہ مجھے تونے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا — شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی — وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی — فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو — فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے — کلی کا ننھا سا دل خون ہوگیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا! (۲)

(۱) تاریخ جمالیات۔۳۵۔ جلد اول۔ (۲) بانگِ درا۔۱۱۲۔

سطحی نظر سے دیکھا جائے تو بظاہر اس نظم سے تاثر ملتا ہے کہ حسن فانی و زوال پذیر ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ساری حقیقت حسن

وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

میں پوشیدہ ہے۔ یعنی وہی بات کہ حسین فانی ہیں۔ حسن فانی نہیں۔ بے شک حسین چہرہ بوڑھا ہو کر جھریوں کے مضبوط جال میں جکڑ کر رہ جاتا ہے۔ یا عالم شباب ہی میں خاک میں مل کر خاک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا حسن فنا نہیں ہوتا وہ کسی دوسرے روپ میں ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ ایک پھول مرجھاتا ہے تو دوسرا پھول کھل اٹھتا ہے۔ ایک کلی کی جگہ دوسری کلی نمو پذیر ہوتی ہے۔ شبنم کا ایک قطرہ ختم ہو جائے تو دوسرا قطرہ گلاب کے گال پر سنہرا خال بن کر چمکنے لگتا ہے۔ ایک موسم بہار گزرتا ہے تو دوسرا موسم بہار آ جاتا ہے۔ اسی طرح شباب گزرتا ضرور ہے مگر ایسا نہیں کہ دنیا سے جوانی ہی ختم ہو جائے۔ جمادات و نباتات و حشرات و حیوانات میں ہر وقت چار انواع کی زندگی موجود رہتی ہے۔ جن میں بچپنہ، جوانی، ادھیڑ عمر اور بڑھاپا ہے اگلے بچے جوان ہو جاتے ہیں تو دوسرے بچے بچپنے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں۔ جو ان ادھیڑ عمر کے ہوتے ہیں تو اگلے ادھیڑ عمر والے بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس طرح زندگی کے ہر روپ میں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس مضمون پر

زندگی مرغ نشیمن ساز نیست طائر رنگ است و جز پرواز نیست (۱)

اقبال نے جاوید نامہ میں بیان کیا ہے کہ چمن میں پھول ایک لمحے کا مہمان ہے اسکا رنگ اور آب و تاب بس ایک نفس کی نمود ہے۔ موسم گل؟ ماتم بھی ہے اور دعوت عیش بھی کلی اس کی آغوش میں ہے اور پھول کی نعش اس کے کاندھے پر۔ میں نے گل لالہ سے کہا تھوڑی دیر اور جلتا رہ۔ اس نے جواب دیا شاید تو نے ابھی تک ہمارا راز نہیں پایا۔

در چمن گل میہمانِ یک نفس رنگ و آبش امتحان یک نفس!
موسم گل؟ ماتم و ہم نائے و نوش غنچہ در آغوش و نعش گل بدوش!
لالہ را گفتم یکے دیگر بسوز گفت راز ما نمی دانی ہنوز! (۲)
کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات کلی نے یہ سن کر تبسم کیا (میر)

گل لالہ ایک شعاع آفتاب کے لئے شاخ کے اندر کتنے پیچ و تاب کھاتا ہے لیکن جب بہار اسے ظاہر کر دیتی ہے،

---

(۱) رموز بے خودی۔ ۱۳۴۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۱۸۴۔

تو کہتی ہے کہ ایک لمحہ سے زیادہ تو نے یہاں نہیں رہنا۔

لالہ بہر یک شعاع آفتاب دارد اندر شاخ چندیں پیچ و تاب
چوں بہار اوراکند عریان و فاش گویدش جز یک نفس اینجا مباش (۱)

گویا کہ یہ وہی سانچوں اور ڈھانچوں کے بدلنے کی بات ہے، اقبال حسن کو زندگی بھی کہتے ہیں جسے فناو زوال ہرگز نہیں۔

حسن ایک ہی ہے اس لئے فناہ نہیں ہوتا۔صورتیں بے شمار ہیں اس لئے فناہ ہو جاتی ہیں۔حسین فناہ ہو جاتے ہیں لیکن حسن فناہ نہیں ہوتا۔مجازی حسین، حسن نہیں صرف حسین ہیں۔اس لئے مٹ جاتے ہیں۔جبکہ ''حسن مطلق'' حسن بھی ہے اور بذات خود حسین بھی، اس لئے ازلی و ابدی ہے۔کیوں کہ حسن فناہ نہیں ہوتا ورنہ اب تک رفتہ رفتہ فناہ ہو چکا ہوتا۔ حسن کائنات کی ازلی و ابدی حیثیت اور قوت ہے۔اس لئے لازوال ہوتے ہوئے عام انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہے میری ذاتی رائے میں:۔

''حسن خدا ہے اور خدا حسن ہے۔خدا اس لئے خدا ہے کہ خدا حسن ہے
اور حسن اس لئے خدا ہے کہ حسن خدا ہے''۔

احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں کہ:۔

نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا (احمد ندیم قاسمی)

لیکن یہ ایک عام آدمی یا فلسفی وحکیم کی بات تو ہو سکتی ہے۔عاشق ایسا ہرگز نہیں کہتا۔اس لئے کہ فلسفی موضوعیت و معروضیت کے چکروں میں پھنس کر حسن مطلق تک نہیں پہنچ سکتا چونکہ معروضی فلسفی اللہ تعالی کی حقانیت سے انکاری ہے اور موضوعی فلسفی اس کی صفات کا انکار کرتا ہے۔اپنی اپنی جگہ دونوں منکر ہیں۔پس اقبال کہتے ہیں کہ:۔

ھر کہ بے حق زیست جز مردار نیست گرچہ کس در ماتم او زار نیست(۲)

وہ مرد مومن، مرد فقیر یا عاشق ہے کہ حسن تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔اس لئے کہ عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفی، عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام ہے، لہٰذا ہر حالت میں حسن کو پا لیتا ہے۔اور پا لینے کے بعد زیادہ اچھے طریقے

---

(۱) پس چہ باید کرد۔۳-۷۷۔''مثنوی مسافر''۔ (۲) ایضاً۔ ۸۵۔

سے حسن کو سمجھتا ہے ۔ یہ کیا بات ہوئی ، جب حسن ہاتھ نہ آئے تو خدا کہلائے؟ اور ہاتھ آجائے تو خدا نہ کہلائے ، ہاتھ آجائے تو پھر تو اس کی عظمت و تقدیس کا پاس و لحاظ اور بھی زیادہ ہو جانا چاہئے ۔لیکن ایسا عاشق کے ہاں ہوتا ہے، فلسفی کے ہاں نہیں ہوسکتا ۔

تکمیل حسن اس وقت ہوتی ہے ۔ جب جمال کے ساتھ جلال بھی باہم شیر وشکر ہو جائے ۔ اقبال نے جلال و جمال کے ملاپ کا خاص خیال رکھا ہے اور کہا ہے کہ جلال کے بغیر نرا جمال کوئی چیز نہیں ۔ مرد مومن جلال و جمال کا مجموعہ ہوتا ہے ۔ مومن کی بنائی ہوئی مسجد قرطبہ اسی لئے جلال و جمال کی شان سے آراستہ و پیراستہ ہے ۔

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل(۱)

یہ اس لئے ہے کہ خود حسن مطلق یا حسن الوہی ''جلال و جمال'' کی شان کبریائی رکھتا ہے ۔ اور اس کے جلال و جمال کا پرتو جس شے یا صورت میں جتنا زیادہ ہوگا ، وہ صورت اتنی ہی زیادہ جلیل و جمیل ہوگی ۔ ورنہ اقبال کہتے ہیں:۔

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک(۲)

حسن الوہیتی یا حسن مطلق سے مراد ذات باری تعالیٰ ہی کی شان ہے ۔ اس جمالیاتی انتہا کا اگر اجمالاً جائزہ لینے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے نباتات و جمادات اور چرند و پرند بھی خالق حقیقی کا احساس رکھتے ہیں :۔

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم! تری شجر ، حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں(۳)

لیکن انسان اس سلسلے میں مختلف مراحل اور نظریات و تصورات سے گزرتا چلا آیا ہے ۔ اور اب تک یہی سلسلہ جاری و ساری ہے۔

انسان نے جب پہلے پہل اس وسعت افلاک کے نیچے قدم رکھنے کے بعد اپنے آپ کو تیز و تند صرصر ، رعد و برق اور دوسرے پر ہیبت مناظر میں گھرا پایا تو اپنے سے قوی ، ہر ہیبت ناک و خطرناک اور جلالی و جمالی چیز کو اپنا معبود مانتے ہوئے اسے پوجنا شروع کر دیا ۔ کوئی دریا عبور کرتے ڈرتا تھا کہ یہ خدا ہے ،اس کی توہین نہ ہو جائے ۔ کسی نے بلند و بالا برگد اور پیپل کے درختوں کو پوجنا شروع کیا ۔ آتش پرستی و سورج پرستی بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ۔

تاریخ جمالیات کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی پہلے حسن کو'' تنزیہی '' سمجھتے تھے ۔ بعد میں ''تجسیمی '' یا''

---

(۱) بال جبریل ۔ ۹۶۔ مسجد قرطبہ ۔ (۲) ضرب کلیم ۔ ۱۲۳۔ ''جلال و جمال''۔ (۳) بانگ درا ۔ ۱۳۹ ۔

مجسم'' سمجھنے لگے ۔ چنانچہ مظاہر فطرت کی پرستش کے ساتھ ساتھ اصنام پرستی بھی کرنے لگے ۔ جس کے نتیجے میں بت گری یا سنگ تراشی کا فن ظہور پذیر ہوا ۔ تمام اصناف فن مثال کے طور پر شاعری ، سنگ تراشی ، موسیقی اور رقص مذہبی عقائد کی تشفی اذریعہ بن گئے ۔ اور اسی کو فن کا فرض منصبی اور مقصود و منتہا مقرر کیا گیا ۔ اسی لئے تو حکیم الامت علامہ محمد اقبال کہہ گئے ہیں کہ :۔

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں معبود تھے پتھر کہیں مسجود شجر(۱)

بہر حال ہومر اور ہیسوئڈ کے اساطیری خدا زمانے بھر میں مشہور ہیں ۔ انہوں نے اپنی نظموں میں متعدد خداؤں کا ذکر کیا ہے ۔ جن کی شکلیں ، عادتیں اور خصلتیں انسانوں سے ملتی جلتی ہیں ۔ گویا کہ انہوں نے خدا یا خداؤں کو تجسیم (Anthropomorphism) کے طور سے پیش کیا۔ چنانچہ ایلیائی مفکر زینوفینیز اس نظریے کی شدید مخالفت میں لکھتا ہے :۔

'' ہومر اور ہسوئیڈ دونوں نے ایسی تمام باتیں خدا کی طرف منسوب کر دی ہیں ۔ جو انسانوں میں شرمناک اور قابل نفرت سمجھی جاتی ہیں ۔ مثلاً چوری ، ، زنا اور دغا بازی وغیرہ''۔ (۲)

'' ایتھوپیا والوں کے خدا پچکی ہوئی ناک اور سیاہ بالوں والے ہیں ، تھریس والوں کے خدا بھوری آنکھوں اور سرخ بالوں والے ہیں ۔۔۔ اس طرح اگر گھوڑے اور بیل خدا کا تصور قائم کر سکتے تو وہ بھی اپنی ہی طرح کے خدا بنا لیتے''۔ (۳)

ہومر اور ہسوئڈ کے خداؤں پر بجا طور سے یہ کڑی نکتہ چینی کرنے کے بعد زینوفینیز اپنا تصور خدا پیش کرتا ہے ۔

'' اگر تم آسمان کی لامحدود وسعتوں میں دیکھو تو صرف خدائے واحد کو پاؤ گے ___ خدا ہر گز فانی مخلوقات کے مماثل نہیں ..... نہ ہی جسم میں اور نہ ہی ذہن میں ۔ خدا تمام آنکھ ہے ۔ تمام کان ہے ۔ خدا بغیر کسی دقت کے اپنے فکر سے ساری کائنات پر حکمرانی کرتا ہے ۔'' (۴)

صاف ظاہر ہے کہ زینوفینیز کا یہ تصور خدا اسلام یا قرآن پاک کے عین مطابق ہے جس میں اللہ تعالی کی وحدانیت ، اس کے سمیع البصیر ہونے ، ہر چیز پہ قادر ہونے اور ازلی و ابدی حقیقت ہونے پر خلوص دل سے اظہار تیقن کیا گیا ہے ۔ بے شک قرآن حکیم کے مطابق لیس کمثلہ شی (۴۲ ۔ ۱۱)

ان اللہ علی کل شی قدیر

---

(۱) بانگ درا ۔ ۱۶۳ ۔ ''شکوہ''۔ (۲) Fragment II۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ارسطو کی مابعد الطبیعات ۔ کتاب اوّل ۔ باب پنجم ۔

زینوفینز وحدت الوجود (Pantheism) کا قائل تھا۔ جس کی رو سے کائنات اور خدا میں کوئی فرق نہیں۔ گویا کہ وحدت الوجود کے مطابق کائنات خدا ہے اور خدا کائنات۔ یعنی کہ "ہمہ اوست"۔ اس کے علاوہ پارمینڈیز بھی وحدت الوجودی تھا۔ اس کے نزدیک ہستی (خدا) ایک ہے اور موجود ہے اور نیستی غیر حقیقی ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ بہر حال جب حسن مطلق کے دیدار کی خواہش نے انسانوں میں بے چینی و اضطراب کی انتہا کر دی تو ان کے تجسس و جستجو اور عقل نے ذات باری تعالیٰ کو مجسم صورت میں پیش کر کے اس کی پرستش کرنے کی ترغیب دی۔ جس کے نتیجے میں بت گری، آزری اور تجسیم کا ظہور ہوا۔ ناصر علی سرہندی نے ایسی ہی صورت حال کے پیش نظر بت کی زبانی اپنے پجاری برہمن سے کہا ہے کہ:۔

مرا برصورت خویش آفریدی
بروں از خویشتن آخر چہ دیدی (ناصر علی سرہندی)

ان الله خلق الانسان علی صورته ٥ الحدیث، راوی حضرت ابو ہریرہ رضؓ کنز العمال۔*

اقبال کہتے ہیں کہ:۔

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر(۱)
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے(میر)

اقبال کہتے ہیں، میں بت کو اپنی صورت میں تراشتا ہوں، میں اپنا معبود اپنی ہی صورت پر بناتا ہوں۔ میرے لئے اپنے آپ سے باہر نکلنا محال ہے۔ ہر رنگ میں اپنی ہی پرستش کرتا ہوں۔

تراشیدم صنم بر صورت خویش بشکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود بروں رفتن محال است بہر رنگے کہ ہستم، خود پرستم (۲)

یہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں کہ ایسے لوگ پہلے بھی تھے اور آج کل بھی ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کو سرے سے مانتے ہی نہ تھے۔ اس کی وجہ علامہ محمد اقبال یہ بتاتے ہیں کہ:۔

خوگر پیکر محسوس تھی انسان کی نظر مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر؟(۳)

اور ایسے بھی تھے جو محبوب حقیقی پر ایمان رکھتے تھے لیکن اس کا دیدار کرنے کے شوق میں، بت گری شروع کر دی کہ

---

(۱) بال جبریل۔ ۱۲۸۔ "ساقی نامہ"۔ (۲) پیام مشرق۔ ۶۸۔ (۳) بانگ درا۔ ۱۶۳۔ "شکوہ"۔ * "مفردات القرآن" از امام راغب اصفہانی جلد دوم۔ ص ۵۹۹۔ مترجم شیخ الحدیث محمد عبدہ فیروز پوری۔ پبلشر شیخ شمس الحق کشمیر بلاک اقبال ٹاؤن لاہور جون ۱۹۸۷ء۔

وہ ایسا ہوگا۔ اقبال کہتے ہیں "حسن مطلق" کی دید کی خواہش نے انسان کو اس طرح فریب میں مبتلا کر دیا۔ دل اور آنکھ دونوں لذت نظارہ کے لئے بیتاب ہیں۔ اس لئے اگر میں پتھر سے صنم تراش لیتا ہوں تو اس میں میرا کیا گناہ ہے۔

ذوق حضور درجہاں رسم صنم گری نہاد عشق فریب می دہد جان امیدوار را(۱)

دل ودیدۂ کہ دارم ہمہ لذت نظارہ چہ گنہ اگر تراشم صنمے زسنگ خارہ(۲)

ذوق دیدار ہی کی خاطر کسی نے بت خانے وسومنات کا رخ کیا اور کوئی کعبے وطور کی طرف کشاں کشاں چلا گیا۔ گویا کہ اللہ تعالی کی طلب میں ہمارا دل تڑپا تو اس نے دیروحرم بنا لیے۔ ہم اس کی تمنا میں مرے جا رہے ہیں اور وہ ہمارا نظارہ کر رہا ہے۔

در طلبش دل تپید، دیروحرم آفرید

ما بہ تمنائے او، او بتماشائے ماست (۳)

کھینچے خود بخود جانب طور موسیٰ کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی!(۴)

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں ! (۵)

ہمارا فکر ہر دم ایک نیا بت (معبود) تراشتا ہے۔ ایک بندھن سے آزاد ہوتا ہے تا کہ دوسرے میں گرفتار ہو جائے۔

می تراشد فکر ماہردم خداوندے دگر رست ازیک بند تا افتاددربندے دگر(۶)

کبھی ہم پتھر سے اس کی تصویر بناتے ہیں اور کبھی اسے دیکھے بغیر سجدے کرتے ہیں۔

گہے از سنگ تصویرش تراشیم گہے نادیدہ بروے سجدہ پاشیم(۷)

کبھی مچل کر کہنے لگتے ہیں:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرم گوش ہو

وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں (۸)

---

(۱) زبورِ عجم۔۵۱۔ (۲) ایضاً۔۱۴۔ (۳) پیام مشرق۔۱۷۰۔ (۴) بانگِ درا۔۹۹۔ (۵) بالِ جبریل۔۵۔

(۶) پیام مشرق۔۱۳۵۔ (۷) زبورِ عجم۔ ۱۵۸۔ (۸) بانگِ درا۔۲۸۰۔

اور کبھی یوں گویا ہوتے ہیں:

چھوڑ کیا پہنے گا تو بھیس مجازی میرا
سر تری یاد کے آگے بھی نگوں ہوتا ہے (فقرؔی)

علاوہ ازیں جہاں تک اقبال کا تعلق ہے تو وہ بھی انسان تھے اس لیے دوسرے شاعروں کی طرح وہ بھی محبوبِ حقیقی کی مجازی تجسیم الفاظ کے سہارے یوں پیش کرتے ہیں:

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دل بیقرار را یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را (۱)

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر (۲)

اور پھر اقبال حسن مطلق کو مخاطب کر کے بہ اندازِ مجاز کہتے ہیں کہ میں لا اُبالی بندہ ہوں، کہیں پھر بھاگ نہ جاؤں۔ اپنی پیچدار زُلف کو میری گردن میں ڈال کر مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لیں:

من بندۂ بے قیدم شاید کہ گریزم باز ایں طرۂ پیچاں را در گردنم آویزی (۳)

کندھے پر زلفوں کا جال ڈالے باغ میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے بام پر جو پرندہ یعنی اقبال بیٹھا ہے اسے کیوں نہیں شکار کر لیتے۔

دام ز گیسواں بدوش زحمت گلستاں بری صید چرانمی کنی طائرِ بامِ خویش را (۴)

اگر میری ساری باتیں مجنونانہ ہیں تو اس میں تعجب کیا ہے، کہ جس نے بھی اس کے گیسوئے پریشاں کی بات کی اس نے یہی کہا:

اگر سخن ہمہ شوریدہ گفتہ ام چہ عجب! کہ ہر کہ گفت ز گیسوئے او پریشاں گفت (۵)

اس ضمن میں اقبال ''حسن مطلق'' کی عادات و اطوار اور نفسیات بھی مجازی محبوب کی طرح اجاگر کرتے ہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے مجاز و حقیقت گلے مل رہے ہوں۔ یہ اس لیے کہ عام انسان ذوقِ جمال کا یہی انداز سمجھ سکتے ہیں:

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟ کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر!

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر (۶)

---

(۱) زبورِ عجم۔۵۱۔ بالِ جبریل۔۱۱۳۔ (۲) بالِ جبریل۔۷۔ (۳) زبورِ عجم۔۸۔ (۴) ایضاً۔۱۱۔
(۵) زبورِ عجم۔۶۸۔ (۶) بالِ جبریل۔۷۔

جیسا کہ حسن و عشق کی کشمکش میں اقبال حرکت و آرزو اور جہد مسلسل کے قائل ہیں ۔ اس لئے وہ برہمن کی لگن اور زور بازو کے قائل بھی ہیں ۔ کہتے ہیں کہ میں برہمن کو نکما نہیں کہتا ۔ وہ تو بھاری پتھر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے ۔ آخر زور دست و بازو کے بغیر پتھر سے خدا نہیں تراشا جا سکتا ۔

برہمن را نگویم ، ہیچ کارہ کند سنگ گراں را پارہ پارہ
نباید جز بہ زور دست و بازو خدائے را تراشیدن زخارہ!(۱)

خیر یہ بت گری اس لئے ہے کہ آپ نظروں سے پنہاں ہیں ۔ ایسے میں یا تو برہمن سے کہہ کہ وہ نیا خدا تراشے ، جس کی صورت کوئی اور ہو۔ اور یا بت پرستوں کے سینے میں خود خلوت نشیں ہو جائیں تا کہ وہ بت پرستی چھوڑ دیں ۔ یا یہ کریں یا وہ کریں ۔

بابرہمن را بفر ما نو خدا وندے تراش یا خود اندر سینہ زناریاں خلوت گزیں
یا چناں کن یا چنیں!(۲)

لیکن پھر اقبال کہتے ہیں کہ محبوب کے ناز و ادا کا کوئی گناہ نہیں ۔ برہمن کی سرشت ہی میں بتوں کا طواف موجود ہے۔ وہ ہر دم ایک نیا آقا تراشتا ہے کیوں کہ پرانے خداؤں سے بیزار ہو جاتا ہے ۔

گناہ عشوہ و ناز بتاں چیست! طواف اندر سرشت برہمن ہست
دما دم نو خداونداں تراشد کہ بیزار از خدایان کہن ہست(۳)

انسان چونکہ حقیقت کے بارے میں ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ اس لئے شبیہ سازی و بت گری معرض وجود میں آئی ۔ یہی وجہ ہے کہ بذات خود اقبال بھی جب محبوب حقیقی سے شکوہ شکایت اور راز و نیاز کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی مجازی محبوب سے بات کر رہے ہیں :۔

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں ہم وفادار نہیں ، تو بھی تو دلدار نہیں!
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جائی ہے (۴)

اقبال ان الفاظ میں حسن مطلق کی ایسی تجسیم گری کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ایک مجسم پیکر دکھائی دینے لگتا

(۱) ارمغانِ حجاز ۔ ۹۷۔ (۲) زبورِ عجم ۔۴۴۔ (۳) پیامِ مشرق ۔۲۱۰۔ (۴) بانگِ درا ۔ ۱۶۶۔ ۱۶۸۔ شکوہ۔

ہے ۔ جس کا چہرہ انتہائی حسین و جمیل ہے ۔

آئے عشاق ، گئے وعدہ فردا لے کر اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر ! (۱)

اسی طرح پیام مشرق میں کہتے ہیں میں مہ و مہر سے اوپر نکل گیا اور اللہ تعالٰی کی جناب میں حاضر ہوا ۔ اور عرض کی : آپ کے جہاں میں ایک ذرۃ بھی میرا آشنا نہیں ۔ جہان دل سے خالی ہے اور میری مشت خاک ساری کی ساری دل ہے ۔ باغ دنیا خوب ہے ۔ لیکن میری نوا کے لائق نہیں ۔ ان کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا ۔ مگر کچھ نہ کہا ۔

شدم بحضرت یزداں گذشتم از مہ و مہر کہ درجہان تو یک ذرۂ آشنایم نیست

جہاں تہی زدل و مشت خاک من ہمہ دل چمن خوش است ولے درخور نوایم نیست

تبسمے بہ لب اورسید و ہیچ نگفت (۲)

حسن مطلق کے سلسلے میں اقبال کی تجسیم نگاری کا یہ عالم ہے کہ وہ اسے بھی مجازی محبوب کی طرح جلوہ آرائی کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سر بام آ اور بے باکانہ انداز میں اپنے چہرے سے نقاب ہٹا ۔ تیرے کوچے میں میرے جیسا تیرا اور کوئی چاہنے والا نہیں ۔ چونکہ میں اپنی دیکھنے والی آنکھ سے غیرت کھاتا ہوں ۔ اس لئے تمہارے رخسار پر اپنی نگاہ سے ہر بار ایک نیا نقاب بن دیتا ہوں ۔ ایک نگاہ ، ایک وزدیدہ مسکراہٹ ، ایک چمکتا ہوا آنسو ، محبت کے اقرار کے علاوہ کوئی اور حلف نہیں ۔

برسر بام آ ، نقاب از چہرہ بیباکانہ کش نیست درکوے تو چوں من آرزومندے دگر

بس کہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش از نگہ بافم بہ رخسار تو روبندے دگر

یک نگہ ، یک خندۂ دزدیدہ ، یک تابندہ اشک بہر پیان محبت نیست سوگندے دگر (۳)

حسن مطلق کو اقبال بہ انداز تجسیم یوں پیش کرتے ہیں کہ تمام تر مجازی اصطلاحیں بروئے کار لاتے ہوئے کہتے ہیں :۔ آپ اپنی نگاہ سرگیں سے میرے دل و جگر کے اندر اتر گئے ۔

کیا نگاہ سرمہ سا ہے ! جس نے ایک تیر سے دو شکار کر لیئے ۔

زنگاہ سرمہ سائے بدل و جگر رسیدی چہ نگاہ سرمہ سائے ! دو نشانہ زدبہ تیرے (۴)

---

(۱) بانگ درا ۔ ۱۶۷ ۔ (۲) پیام مشرق ۔ ۱۱۸ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۱۳۵ ۔ (۴) زبور عجم ۔ ۱۰ ۔

اقبال چونکہ تغزل کے شاعر ہیں ان کی نظموں میں بھی بلا کا تغزل پایا جاتا ہے ۔ اس لئے وہ جہاں کہیں "حسن مطلق" کی بات کرتے ہے ۔تو مجاز خود بخود ان کے لب و لہجے میں درآتا ہے ۔ گویا کہ شان تغزل حسن مطلق کی تجسیم گری کا بھی ایک باعث ہے ۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں، اپنے چاند جیسے چہرے سے بند نقاب اٹھا دیجئے ۔ کفر و دیں دونوں پر اپنی رحمت عام کی بارش کیجئے ۔ تاکہ دین میں مزید تازگی پیدا ہو اور کفر اس بارش سے ختم ہو جائے ۔ بہر حال حسن مطلق سے چاند جیسا چہرہ منسوب کرنا تجسیم نگاری کے زمرے میں آتا ہے ۔

بند نقاب بر کشا ماہ تمام خویش را   برسر کفر و دیں فشاں رحمت عام خویش را (۱)

اور پھر کوئی دل نہیں جو اس چاند کے پرتو سے روشن نہ ہو ۔ ہزار ہا آئینوں میں اس کی اپنی آرائش دیکھنا ملاحظہ ہو۔

روشن از پرتو آں ماہ دلے نیست کہ نیست   باہزار آئینہ پر داختنش رانگرید(۲)

علاوہ ازیں اقبال حسن مطلق کی لفظی تجسیم گری یوں پیش کرتے ہیں کہ وہ مجازی محبوب کی طرح راستے میں بیٹھے ہوؤں پر ایک نظر ڈال کر سوار گزر جاتا ہے ۔ اقبال کہتے مجھے سنبھالیئے کہ اس کی ایک نظر نے میرا تو کام تمام کر دیا ہے ۔

نظر بہ راہ نشیناں سوارہ می گزرد   مرا بگیر کہ کارم زچارہ می گزرد(۳)

دراصل ہم مجاز ہیں اس لیے حقیقت کو مجاز ہی کے روپ میں دکھا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے اسے اپنی صورت کی صورت میں بنا ڈالا۔ پھول ، پتا، درخت، شاخ، سورج، چاند، ستارہ ، باغ و ویرانہ حتیٰ کہ ذرۂ حسن مطلق کو اپنی صورت کے مطابق پیش کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت خود بھی اپنے آپ کو حقیقت کی صورت میں پیش نہیں کرتی اور اگر کرے تو پھر طورِ سینا کی خاکستر ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے نباتات و جمادات اور قلزم و قطرہ اور معمولی ذرہ اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنی شکل میں اس کی شکل پیش کرتے ہیں۔اسی لیے تو جب غالب کا کوئی اور بس نہ چلا تو ہومر اور ہیسوئڈ کے خداؤں کی طرح اس نے بھی اپنے محبوب حقیقی کو اپنے خلوت کدے میں اس انداز سے ہار سنگھار کرتے دکھایا جیسے کوئی مجازی محبوب ہو۔ اور صاف ظاہر ہے کہ ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرنے والا یہی کچھ کر سکتا ہے۔:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں (۴)

---

(۱) زبور عجم ۔۱۱۔ (۲) زبور عجم ۔۳۶۔ (۳) ایضاً ۔۲۲۔ (۴) دیوان غالب ۔۵۲۔

چنانچہ اقبال بھی کہتے ہیں کہ آپ کا جلوہ نقاب میں چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ آپ کا حسن لطیف نگاہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ اے میرے چاند اگر میں نالہ و فریاد نہ کروں تو کیا کروں۔ اگر آپ میرے کارواں سرائے میں تشریف لے آئیں تو کیا حرج ہے۔ میری معمولی سی متاع یہی چھوٹا سا دل ہے۔ جو آپ کے ہجر میں پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ میں اس لیے غزل کہتا ہوں کہ شاید غزل سے قرار آ جائے۔ مگر شعلے کے اندر سے شرارہ نکل جائے تو بھی اس کی تپش کم نہیں ہوتی۔ (اقبال کا بھی یہی حال ہے) آپ نے مجھے جو دلِ زندہ عطا فرمایا ہے اس کا حجاب میں رہنا مناسب نہیں۔ مجھے ایسی نگاہ بھی عطا ہو جو سنگِ خارہ کے اندر چھپے ہوئے شرارے کو دیکھ سکے۔ یعنی اقبال کے نزدیک دلِ زندہ وہ ہے جو پردوں کے پیچھے حسن معنی کو دیکھ لے۔ آپ نے میرے دلِ ہزار پارہ میں اپنا غم اس طرح سمو دیا ہے کہ دل کا ہر ٹکڑہ اس سے سرور حاصل کر رہا ہے۔

تو بجلوہ در نقابی کہ نگاہ بر نتابی   مہِ من ! اگر ننالم تو بگو دگر چہ چارہ
چہ شود اگر خرامی بسرائے کاروانے   کہ متاع نا روانش دلکے است پارہ پارہ
غزلے زدم کہ شاید بنوا قرارم آید   تپ شعلہ کم نگردد زگسستن شرارہ
دلِ زندہ کہ داری بہ حجاب در نسازد   نگہے بدہ کہ بیند شررے بسنگِ خارہ
ہمہ پارۂ دلم را ز سرور او نصیبے   غمِ خود چساں نہادی بدلِ ہزار پارہ(۱)

بہرحال یہ ساری جستجو اور تجسیم گری اس لیے ہے کہ ''محبوبِ حقیقی'' بلا واسطہ کہیں دکھائی نہیں دیتا جس کے نتیجے میں کسی نے کعبہ بنایا ہوا ہے تو کسی نے بت خانہ۔ چنانچہ:

سرگرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ
اُڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو کہ بت خانہ (اصغرؔ گونڈوی)

یعنی کہ اگر:

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے
پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے (اصغر گونڈوی)

انسان کا مذہب خواہ کوئی بھی ہو حسن مطلق کے ذوق حضوری میں کبھی دیر میں عجز و نیاز اختیار کرتا ہے اور کبھی کعبہ

(۱) زبورِ عجم۔۱۴۔

میں نماز پڑھتا ہے ۔ کبھی اس کے کاندھے پر زنار ہوتا ہے اور کبھی اس کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے ۔ یعنی کہ انسان حسن مطلق کی جستجو میں مختلف مذاہب کا پیروکار بنتا ہے ۔ اقبال اس نکتے کو یوں بیان کرتے ہیں :۔

در دیر نیاز من ، درکعبہ نماز من　　زنار بدوشم من ، تسبیح بدستم من (۱)

حسن مطلق کی تلاش میں انسان لاشعوری طور پر یا مجبوراً مجاز کا پرستار بن جاتا ہے ۔ اسی لئے تو برہمن نے محمود غزنوی سے کہا : میری کرامت دیکھ تو جس نے پتھر کے بت توڑ دیئے تھے ، ایاز کا پرستار ہوگیا۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ اقبال کہتے ہیں کہ اہل دیر کے ساتھ نرمی سے بات کر کیوں کہ عشق غیور نے محمود جیسے بت شکن کے دل میں بت کدے کی بنیاد ڈال دی تھی ۔ یعنی کہ محمود نے ان بتوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا ، جو کسی کے عشق میں تراشے گئے تھے ۔ محمود کو اس سنگ دلی کا خمیازہ یوں بھگتنا پڑا ۔ کہ غیرت مند عشق نے بدلہ لینے کی خاطر الٹا بت شکن کے دل ہی میں ایاز کی صورت میں بت کدہ بنا ڈالا ۔ گویا کہ محمود بھی بت پرست بن گیا ۔

برہمنے بہ غزنوی گفت کرامتم نگر　　تو کہ صنم شکستہ ء ، بندہ شدی ایاز را

بہ دیریاں سخن نرم گو کہ عشق غیور　　بنائے بتکدہ افگندردل محمود (۲)

اقبال کہتے ہیں بت گری و بت پرستی کی رسم تو اس وقت چلی تھی جب انسان کائنات میں نووارد تھا ۔ اور الہام ، وحی اور نور ہدایت کا کوئی سلسلہ نہ تھا ۔ لیکن اب تو حالات بدل گئے ہیں ۔ اب تو نور حقیقت تک پہنچنے کے لئے نور ہدایت کے مختلف آفتاب روشن ہیں ۔ آج کل تو ہر قسم کی صنم گری وصنم پرستی ہرگز نہیں ہونی چاہئے ۔

تجھ کو خبر نہیں ہے کیا ؟ بزم کہن بدل گئی

اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے (۳)

یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اگر ''حسن مطلق'' پردوں میں نہ ہوتا تو نہ بت پرستی ہوتی ، نہ آتش پرستی اور نہ اشجار کی پوجا پاٹ ۔ لیکن درحقیقت اللہ تعالی کی ذات قدیم ازل ہی سے ہے اس کی مثال یوں ہے کہ پھول تو چمن میں ہو مگر اس کی خوشبو گلشن دہر میں ابھی نہ پھیلی ہو۔ اسلام نے ''حسن مطلق'' کے نام کا بول بالا کیا۔ ترک آتش پرستی کا حکم دیا ، رسم بت گری و بت پرستی کی مخالفت کرتے ہوئے خانہ کعبہ کو تین سو ساٹھ بتوں سے پاک کر دیا ۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں :۔

---

(۱) پیام مشرق ۔۱۵۲۔ (۲) ایضاً ۔۱۴۴۔۱۴۹۔ (۳) بانگ درا ۔۱۱۳۔

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذات قدیم — پھول تھا زیب چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم (۱)

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا ؟ — قوت بازوے مسلم نے کیا کام ترا! (۲)

کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایران کو ؟ — کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزدان کو؟ (۳)

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے — منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے (۴)

اس ضمن میں اقبال مزید کہتے ہیں کہ ہم مسلمان قید مکان سے آزاد ہیں ہم نو آسمانوں کے حلقے سے باہر ہیں ہمیں ایسا سجدہ سکھایا گیا ہے ۔ جس سے ہم ہر باطل معبود کی قیمت پہچان جاتے ہیں ۔

مسلمانیم و آزاد از مکانیم — بروں از حلقۂ نہ آسمانیم

بما آموختند آں سجدہ کزوے — بہائے ہر خداوندے بدانیم (۵)

وہی سجدہ ہے لائق اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام (۶)

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات (۷)

اقبال بھرتری ہری کی زبانی کہلواتے ہیں کہ یہ بے اختیار خدا جو پتھر یا اینٹ کے بنے ہوئے ہیں ـــــ برتر وہی ہے ، جو بتخانہ و کلیسا سے دور ہے ۔ لیکن میں کہوں گا کہ بت خانہ میں بھی وہی ہے ۔ کلیسا اور کعبہ میں بھی وہی ہے ۔

ایں خدایان تنک مایہ زسنگ اند و زخشت!

بر ترے ہست کہ دور است زدیرو زکنشت! (۸)

اقبال اللہ تعالی کی حقانیت پر مکمل ایمان رکھتے ہیں ۔ ایسا ایمان کہ انہوں نے لینن سے بھی ذات باری کی قدرت کا اعتراف کرالیا مگر لینن کی زبانی اقبال یہ تلخ حقیقت اجاگر کرتے ہیں ۔ کہ پہلے زمانے کے لوگوں نے بتوں کی صورت میں اور طرح کے خدا تراش رکھے تھے لیکن آج کل خدا کو تجسیم کے طور پر تبدیل کر دیا گیا ہے ۔ چنانچہ اس ضمن میں موجودہ صورتحال یہ ہے کہ مشرق نے خالق حقیقی کی بجائے ٹوپ والے انگریزوں کو اپنا خدا سمجھ رکھا ہے اور خود انگریز مشینوں ، کارخانوں اور مصنوعات کو خدا سمجھ بیٹھے ہیں :۔

مشرق کے خداوند سفیر ان فرنگی! — مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات! (۹)

---

(۱) بانگ درا ۔ ۱۶۳ ۔ ''شکوہ'' ۔ (۲) ایضاً ۔ ۱۶۴ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۱۶۵ ۔ (۴) ایضاً ۔ ۱۶۵ ۔ (۵) ارمغان حجاز ۔ ۶۳ ۔
(۶) بال جبریل ۔ ۱۲۸ ۔ ''ساقی نامہ'' ۔ (۷) ضرب کلیم ۔ ۳۷ ۔ (۸) جاوید نامہ ۔ ۱۷۰ ۔ (۹) بال جبریل ۔ ۱۰۷ ۔ ''لینن خدا کے حضور'' ۔

تجسیم پرستی کے حوالے سے اہل مشرق بالخصوص مسلمانوں کی حالت بڑی دگرگوں ہے۔ کچھ عرصے تک تو انہوں نے روس و امریکہ کی صورت میں خدا کے دو بت بنا رکھے تھے گویا کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی موجودگی میں، مسلمانوں نے اہرمن و یزداں گھڑ لیئے۔ گویا یوں کہ اقبال سے معذرت کے ساتھ:۔

پاسباں مل گئے کعبے سے صنم خانے کو

ان مجسم خداؤں میں سے روسی خدا کا بت دور حاضر کے ''غزنویوں'' نے افغانستان میں پاش پاش کر دیا تو اقبال کی روح کو معلوم ہوگیا کہ کارگہ حیات میں بچے کھچے غزنوی موجود ہیں، جو اہل حرم کے سومناتوں کو ریزہ ریزہ کر سکتے ہیں۔ باقی رہ گیا امریکی خدا، جس کی پرستش بڑے زوروں پر ہے، مسلمان ممالک خصوصاً پاکستان اس امریکی خدا کا انتہائی مطیع و فرمانبردار پجاری ہے۔ لیکن آنجہانی روسی خدا کی دیرینہ یادوں کی پاکستانی مسلمانوں نے ابھی تک اپنے دل میں لو لگا رکھی ہے۔

اگر چہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات ومنات (۱) بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں

لیکن اللہ تعالیٰ تو انسان کے قلب میں ہے اسے بت گری کے ذریعے'' معروض'' میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ:

''مَن عَرَفَ نَفسَہ، فَقَد عَرَفَ رَبَّہ،

چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل(۲) حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا

نیابم!(۳) راہے بے نصیبے من منزلگۂ من نیست بیرون ازمن

اگر تو کمزور ہے تو تسخیر نفس سے زبردست ہو جا۔ اگر تو اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتا ہے تو پہلے اپنے قریب ہو۔

اگر زیری ز خود گیری زبر شو خدا خواہی؟ بخود نزدیک تر شو(۴)

اپنے سینے میں داغِ محبت روشن رکھ کیونکہ ہستی کی رات میں اس چراغ کے بغیر اپنے آپ کو پہچانا نہیں جا سکتا۔

داغے بسینہ سوز کہ اندر شب وجود خود را شناختن نتواں جزبایں چراغ(۵)

---

(۱) ضرب کلیم۔۳۷۔ (۲) بانگِ درا۔۶۱۔''دل''۔ (۳) زبورِ عجم۔۴۰۔ (۴) زبورِ عجم۔۱۵۰۔ (۵) زبورِ عجم۔۱۳۸۔

آرزو نورِ حقیقت کی ہمارے دل میں ہے

لیلیٰ ذوقِ طلب کا گھر اسی محمل میں ہے (۱)

اقبال کہتے ہیں اگر تو اپنے دل پر توجہ کرے تو تجھے اپنے سینے میں اپنی منزل نظر آئے گی۔ یہی سفر اندر حضر ہے یہی اپنے آپ سے اپنے اندر سفر کرنا ہے۔

اگر چشمے کشائی بر دلِ خویش درونِ سینہ بینی منزلِ خویش

سفر اندر حضر کردن چنیں است سفر از خود بخود کردن ہمیں است (۲)

ماترا جوئیم و تو از دیدہ دور نے غلط ما کور و تو اندر حضور (۳)

ایک دوسرے مقام پر اقبال کہتے ہیں تجھ پر افسوس تو نے نئے نئے بت تراش لیے ہیں مگر ''معدن قلب'' کی کھدائی نہ کی کہ اسی کان میں حسن مطلق کا موتی پایا جاتا ہے۔ تو فرنگی فلاسفہ کے تجزیاتی فلسفے کے چکروں میں پھنس کر ظاہر و باطن سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ تیری اس حالت پر افسوس ہے۔

بتانِ تازہ تراشیدۂ دریغ از تو درونِ خویش نہ کاویدۂ دریغ از تو

چناں گداختۂ از حرارتِ افرنگ زچشمِ خویش تراویدۂ دریغ از تو (۴)

اسی مضمون کو وحدت الوجود کی حیثیت سے باندھتے ہوئے مرزا بیدلؔ کہتے ہیں کہ حسن مطلق نے اپنی ساری تجلی، حسن کی ساری شراب دل کی صراحی میں ڈالی۔ مگر دل کی صراحی تنگ تھی اس لیے کچھ شراب حسن چھلک کر باہر گر گئی، جس کے نتیجے میں یہ دنیا، موجودات و محسوسات معرضِ وجود میں آ گئے۔ مینائے دل اگر تنگ نہ ہوتی تو ساری مے حسن اسی میں سما جاتی اور یوں اس دنیا کا کوئی نام و نشاں تک نہ ہوتا جسے ہم مجاز کہتے ہیں۔ گویا کائنات تو چھلکی ہوئی تھوڑی سی شراب کے نتیجے میں بنی ہے۔ مے حسن کی ایک بڑی مقدار تو مینائے دل میں ہے۔ اس لیے دل کی دنیا ظاہری دنیا سے زیادہ وسیع و عریض ہے۔ شان ربوبیت اور حسن مطلق کی پہچان و معرفت ظاہر کے بجائے باطن، یعنی اپنے نفس کی شناخت میں ہے۔ قلب میں تجلیاتِ حسن کی قوسِ قزح پورے آب و تاب کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔

---

(۱) بانگ درا۔ ۴۹۔ آفتاب صبح (۲) زبور عجم۔ ۱۲۶۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۹۔ (۴) پیام مشرق۔ ۱۸۳۔

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بودایں چمن

رنگِ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود (بیدلؔ)

اقبال بھی کہتے ہیں کہ تیرے حسن کا پرتو رنگ کی مانند شیشے سے باہر چھلکا پڑتا ہے، تو نے شراب کی طرح دیوارِ مینا سے پردہ بنایا:

پرتوِ حسن تو می افتدبروں مانند رنگ　　صورتِ مے پردہ از دیوارِ مینا ساختی (۱)

پھر کہتے ہیں کسے ڈھونڈتے ہو، کیوں پیچ و تاب میں ہو؟ وہ تو ظاہر ہے تم خود زیرِ نقاب ہو۔ اس کی تلاش کرو گے تو اپنے سوا اور کچھ نہیں دیکھو گے۔ اپنی تلاش کرو گے تو اس کے سوائے کسی اور کو نہیں پاؤ گے۔

کرا جوئی، چرا در پیچ و تابی؟　　کہ او پیدا ست تو زیرِ نقابی

تلاش او کنی، جز خود نبینی　　تلاشِ خود کنی، جز او نیابی (۲)

ع حسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن (۳)

اُٹھ اور اپنے آپ پر توجہ مرکوز کرنا سیکھ۔ اپنے ناخن سے اپنا سینہ زخمی کرنا سیکھ۔ اگر اللہ تعالیٰ کو بے پردہ دیکھنا چاہتا ہے تو اپنی خودی کو فاش تر دیکھنا سیکھ۔

بیا بر خویش پیچیدن بیا موز　　بناخن سینہ کاویدن بیا موز

اگر خواہی خدا را فاش بینی　　خودی را فاش تر دیدن بیا موز (۴)

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم!

اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر (۵)

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو　　تیری نگاہ توڑ دے آئینہ مہر و ماہ (۶)

تیری قندیل ہے ترا دل　　تو آپ ہے اپنی روشنائی (۷)

حسنِ بے پایاں درونِ سینۂ خلوت گرفت　　آفتابِ خویش را زیرِ گریبانے نگر! (۸)

حسن را از خود بروں جستن خطاست　　آنچہ می بائیست پیشِ ما کجاست (۹)

---

(۱) پیامِ مشرق۔۱۵۴۔ (۲) ایضاً۔۵۲۔ ''لالہ طور''۔ (۳) بانگِ درا۔۲۵۱۔ (۴) ارمغانِ حجاز۔۱۰۹۔ (۵) بانگِ درا۔۲۷۹۔

(۶) بالِ جبریل۔۷۷۔ (۷) بالِ جبریل۔۵۴۔ (۸) زبورِ عجم۔۵۹۔ (۹) زبورِ عجم۔۱۸۷۔ ''مصورق''۔

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے (۱)

دل اگر حسنِ حقیقی کے عشق سے منور ہو تو اس اجالے کے ذریعے حسنِ مطلق تک پہنچا جا سکتا ہے۔

دل میں ہو نورِ حقیقت کا وہ چھوٹا سا شرر نور سے جس کے ملے رازِ حقیقت کی خبر (۲)

اس کے علاوہ اقبال مزید کہتے ہیں کہ تو نے کعبے کا طواف بھی کیا۔ بت خانے کے گرد بھی پھرا مگر افسوس کہ تو نے اپنے آپ پر نگاہ نہ ڈالی کہ تجھے ''حسنِ مطلق'' کا قرب حاصل ہوتا۔

طوافِ کعبہ زدی گردِ دیر گردیدی نگہ بخویش نہ پیچیدۂ دریغ از تو (۳)
بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے (۴)

گویا کہ اقبال کے نزدیک بجا طور پر، یہ رنگ و بو کی دنیا دل کی دنیا نہیں۔ دل کی دنیا میں نہ پستی و بلندی ہے، نہ محل و کوچہ۔ نہ وہاں زمین و آسمان ہیں، نہ چہار سو۔ جہانِ دل میں سوائے اللہ ہو کے اور کچھ نہیں۔:

جہانِ دل جہانِ رنگ و بو نیست درو پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست دریں عالم بجز اللہ ھو نیست! (۵)

ایک موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے

واذ قال ابراهيم لابيه آزر اتتخذ اصناما الهته انى ارك و قومك فى ضلل مبين ٥ و كذلك نرى ابراهيمه ملكوت السموت و الارض و ليكون من الموقنين٥فلما جن عليه اليل راكوكباج قال هذا ربىج فلما افل قال لا احب الافلين ٥ فلما رالقمر بازغا قال هذا ربىج فلما افل قال لئن لمه يهدنى ربى لا كونن من القوم الضالين٥ فلما را الشمس بازغه قال هذا ربى هذا اكبر فلما افلت قال يقوم انى برى مما تشركون٥ (آیت ۷۵ سے آیت ۷۹ تک سورۃ الانعام :۔ پارہ ۷)

ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جبکہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا۔ ''کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری

---

(۱) بانگِ درا۔ ۷۶۔ تصویرِ درد۔ (۲) بانگِ درا۔ ۳۹۔ آفتابِ صبح۔ (۳) پیامِ مشرق۔ ۱۸۳۔ (۴) بانگِ درا۔ ۱۰۶۔ (۵) ارمغانِ حجاز۔ ۱۲۰۔

قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں"۔ ابراہیمؑ کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اٹھا "اے برادران قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔

اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے۔ کہ حسن مطلق ہرگز زوال پذیر نہیں اور نہ ہی مظاہر کی حیثیت "حسن مطلق" کی سی ہے۔ بلکہ مظاہر "حسن ازل" کی تخلیق ہیں۔ چنانچہ مندرجہ بالا قرآنی آیات ہی کی روشنی میں علامہ محمد اقبال "رموز بے خودی" میں کہتے ہیں کہ غروب ہوجانے والوں کو ترک کر دینے والا ابراہیمؑ خلیل اللہ جن کا نقشِ پا انبیاء کے لیے راہنما ہے۔ وہ خدائے زوال ناپذیر کی آیت تھے:

تارکِ آفل براہیم ِ خلیل   انبیاء را نقشِ پائے او دلیل

آن خدائے لم یزل را آیتے (۱)

حسن خدا ہے اور خدا حسن اس لیے لازوال ہے۔ عشق چونکہ حسن یا خدائے لا یزال سے ہوتا ہے اس لیے عشق بھی لازوال ٹھہرا۔ یہی وجہ ہے کہ جل کر خاکستر ہو جانے کے بجائے، عشق نے آتشِ نمرود کو بھی گل و گلزار بنا دیا۔ چنانچہ اقبال کیا خوب فرماتے ہیں۔

حسن می گفت کہ شامے نہ پذیرد سحرم   عشق می گفت تب و تابے دوامے دارم (۲)

حسن ازل نے سورج، چاند، ستاروں، درختوں اور پتھروں بلکہ اپنی ہر ایک تخلیق کو اپنے کرشمے کے طور پر دکھایا کہ وہ اس کی خدائی کا یقین کر لیں۔ لیکن انسانوں نے الٹا اللہ تعالیٰ کی تخلیقات ہی کو اپنا معبود بنا کر انہیں سجدے کرنا شروع کر دیئے اور یوں "بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا" اگر چہ حضرت ابراہیمؑ بت پرستی کی ممانعت فرماتے رہے لیکن اس کے باوجود خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش جاری تھی۔ حتیٰ کہ حضور ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کو

---

(۱) رموز بے خودی۔ ۱۰۰۔ (۲) پیام مشرق۔ ۱۶۴۔

بتوں سے پاک کیا۔ اس سلسلے میں اقبال کیا خوب کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پرانے لات ومنات جلا دیئے۔ آپ ﷺ نے قدیم دنیا کو جدید رنگ عطا فرمایا۔ انسانوں اور جنوں کے جہانِ ذکر وفکر میں آپ ﷺ صبح کی نماز ہیں۔ آپؐ بانگِ اذاں ہیں۔ سوز وسرور کی لذت لاالہ سے ہے۔ اندیشوں کی رات کو لاالہ کا نور روشن کرتا ہے۔ نہ ہم نے گائے یا گدھے کی پوجا کی ،نہ کاہنوں کے سامنے اپنا سر جھکایا۔نہ پرانے خداؤں کو سجدہ کیا، نہ بادشاہوں اور امراء کے محلات کا طواف کیا۔ یہ سب آپؐ کے لطفِ بے پایاں کے طفیل ہے۔ ہمارے فکر نے آپؐ کے احسان سے پرورش پائی ہے۔

سوختی لات و منات کہنہ را   تازہ کردی کائنات کہنہ را

درجہانِ ذکر و فکر انس و جاں   تو صلوٰۃ صبح، تو بانگِ اذاں

لذتِ سوزو سرور از لاالہ   در شبِ اندیشہ نور از لاالہ

نے خداہا ساختیم از گاوٗ خر   نے حضورِ کاہناں افگندہ سر

نے سجودے پیشِ معبودانِ پیر   نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست   فکر ما پروردۂ احسانِ تست(۱)

نورِ مطلق کا نور جب سینۂ آدم کے اندر ظہور پذیر ہو جائے تو اس کا غیاب بھی حضور بن جاتا ہے۔ میں نے اسے جامد بھی دیکھا ہے اور متحرک بھی۔ مجھے اس میں نور بھی نظر آیا ہے اور نار بھی۔ یعنی حسن مطلق ''جلال و جمال'' ہے۔ یہ کیا نور ہے جو جان کو یعنی روح کو چمکا دیتا ہے اور سینے میں تپش پیدا کرتا ہے۔ اس کی صرف ایک شعاع آفتاب سے بڑھ کر ہے۔ یہ فکر مکانی ہونے کے باوجود لامکان ہے۔ یہ روز وشب کے بندھن میں گرفتار ہونے کے باوجود ماورائے زمان ہے۔

درونِ سینۂ آدم چہ نور است   چہ نور است ایں کہ غیبِ او حضور است

من اورا ثابتِ سیار دیدم   من اورا نور دیدم نار دیدم!

چہ نورے جاں فروزے سینہ تابے   نیرزد با شعاعش آفتابے

بخاک آلودہ و پاک از مکان است   بہ بندِ روز و شب پاک از زمان است

قرآن حکیم میں نورِ مطلق خود فرماتا ہے۔

---

(۱) پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔ ۴۸۔

اللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ والاَرض۔ مَثَلُ نُورِہ کَمِشکٰوۃٍ فِیھَا مِصبَاحٌ'' المِصبَاحُ فِی زُجاجۃ الزجاجۃُ کانھا کوکب دری (۳۵:۲۴) سورہ النور۔ قداَفلح۔۱۸۔

مجو مطلق دریں دیرِ مکافات کہ مطلق نیست جز نورا لسموات (۱)

اس آیت کریمہ کا سیدھا سا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالٰی زمینوں و آسمانوں کا نور ہے جبکہ علامہ اقبال ''تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ'' (خطباتِ اقبال) میں لکھتے ہیں کہ:

''اس آیت کے ابتدائی حصے سے تو بے شک یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہاں بھی ذاتِ الٰہیہ کو انفرادیت سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن جب ہم اس استعارے کا تا آخر مطالعہ کرتے ہیں تو یہ امر واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے کہ اس کا مقصد اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس لیے کہ جوں جوں یہ استعارہ آگے بڑھتا ہے۔ اس خیال کی نفی ہوتی جاتی ہے کہ ذاتِ الٰہیہ کا قیاس کسی لاصورت کونی عنصر پہ کیا جائے ، کیونکہ اول تو اس استعارے نے نور کو شعلے پر مرتکز کر دیا اور پھر اس کی انفرادیت پر مزید زور اس طرح دیا ہے کہ یہ شعلہ ایک شیشے میں ہے اور شیشہ ستارے کی مانند۔ جس کا ظاہر ہے ایک مخصوص اور متعین وجود ہے اور جس کے پیش نظر میری رائے یہ ہے کہ اسلامی ، مسیحی اور یہودی صحف میں اگر اللہ کے لیے نور کا لفظ استعمال کیا گیا تو ہمیں اس کی تعبیر کسی دوسرے رنگ میں کرنی چاہیئے۔ طبیعاتِ حاضرہ کی رو سے نور کی رفتار میں کوئی اضافہ ممکن نہیں ہے اور اس لیے ناظر کا تعلق خواہ کسی نظامِ حرکت سے ہو اس کی یکسانی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ بہ الفاظِ دیگر تغیر کی اس دنیا میں نور ہی وہ شے ہے جس کو ذاتِ مطلق سے قریب ترین مماثلت حاصل ہے۔ (۲)''

یہ بات تو طے شدہ ہے کہ اللہ تعالٰی ''حسن مطلق'' ہے اور حسن ایک زبردست قوت ہے۔ لہٰذا میں نور سے مراد حسن لیتے ہوئے عرض کروں گا کہ اللہ تعالٰی زمینوں اور آسمانوں کا ''حسن و جمال'' ہے، گویا کہ ''حسن مطلق'' ہوتے ہوئے ، قادرِ

---

(۱) زبورِ عجم۔۱۵۴۔ (۲) تشکیل جدید الہیات اسلامیہ۔ تیسرا خطبہ۔ ۹۷۔ ۹۸۔ علامہ محمد اقبال۔

مطلق قوت و طاقت ہے۔ جس کا کوئی ثانی و شریک نہیں۔ وہ خالق ہے ہم مخلوق۔ اس لیے ہم اس پر محیط نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اس کی مکمل و اکمل تعریف کرنے سے عاجز ہیں:

ہرچہ اندیشی پذیرائے فنا ست آنچہ در اندیشہ ناید آں خداست

میں جب سوچتا ہوں کہ حسن ایک ''توانائی'' (Energy) ہے تو ذہن میں خود بخود یہ آرزو مچلنے لگتی ہے کہ اگر وسائل اجازت دیتے ہوں تو ایٹم اور طورسینا کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے، ہوسکتا ہے اس طرح ''حسن مطلق'' کے بارے میں کوئی پیش رفت ہو۔ بہرحال:

جھلک پردے کی دیکھی ہو گی جس پر لوٹ ہیں موسیٰ
وہ صورت کب دکھاتے ہیں یہ سب کہنے کی باتیں ہیں (حافظ جلیل حسن جلیل)

اور پھر یہ کہ:

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کر بھلا طور پر کلیم طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی (۱)

ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر (۲)

اقبال کہتے ہیں کہ تو نے یہ کہہ کر کہ میرے وصال کی جستجو نہ کر، میں تیرے خیال سے بالاتر ہوں۔ میرے آنسوؤں کو جو پہلے ہی ٹپکنے کے لیے بہانے کی تلاش میں رہتے ہیں، نیا عذر مہیا کر دیا ہے۔ میں تیرے تغافل کے سبب خام اور تیری راہ میں نا تمام ہوں۔ ادھر میں ہوں اور میری جانِ نیم سوز ادھر تو ہے اور تیری چشم نیم باز۔

گفتی مجو وصالم ، بالاتر از خیالم عذرِ نو آفریدی اشکِ بہانہ جورا (۳)

من و جانِ نیم سوزے، تو و چشم نیم بازے بہ رہ تو ناتمام ، زتغافل تو خام (۴)

الله جمیل و یحب الجمال کے مصداق حسن ازل نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ:

وصور کم فاحسن صور کم (۳:۶۴) اور تمہاری صورتیں بنائیں تو کیا ہی حسین صورتیں بنائیں؟

چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر میرے وجود کی ترکیب میں سے ایک ذرہ بھی کم ہو جائے تو میں اس قیمت پر حیات جاوداں لینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ **و نفخ فی الروح الله** کے مصداق ہماری صورتیں کیونکر خوبصورت نہ ہوں؟ اسی لیے تو چاند

---

(۱) بانگِ درا۔۱۰۲۔ (۲) ایضاً۔۱۰۵۔ (۳) پیامِ مشرق۔۱۵۴۔ (۴) ایضاً۔۱۵۰۔

ستاروں کو حسن مطلق سے شکایت ہے کہ اس نے آدم کی خاک تیرہ میں اپنی روح کا شرارہ پھونک دیا۔

مہ و انجم ز تودارد گلہ ہاشنیدہ باشی کہ بخاکِ تیرہ ٔما زدۂ شرارے خود را (۱)

ایسی ہی حسین وجمیل صورتوں کی بناء پر امام خمینی نے کیا خوب فرمایا:

من بہ خالِ لبت ای دوست گرفتار شدم

چشمِ بیمارِ توراد یدم و بیمار شدم (امام خمینی)

بلا شبہ وہ ہر چیز کو خوبصورت سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس لیے:

الذی احسن کل شیء خلقه (۳۲۔۷) اس نے جو چیز بھی بنائی حسین بنائی۔ اس کے علاوہ

ولكم فيها جمال حين تريحون و حين تسرحون۝ (۱٦۔٦)

اور تمہارے لیے چوپاؤں میں جب شام کے وقت چراگاہ سے واپس لاتے ہو اور صبح کو لے جاتے ہو جمال ہے۔

یہاں موقع ومحل کی مناسبت سے مجید امجد کی نظم ''ریوڑ'' دلچسپی سے خالی نہیں۔

شام کی راکھ میں لتھڑی ہوئی ڈھلوانوں پر
ایک ریوڑ کے تھکے قدموں کا مدھم آہنگ
جن کی ہر لہر دھندلکوں میں لڑھک جاتی ہے
مست چرواہا چراگاہ کی اک چوٹی سے
جب اترتا ہے تو زیتون کی لانبی سونٹی
کسی چلتی ہوئی بدلی میں اٹک جاتی ہے
بکریاں دشت کی مہکار میں گوندھا ہوا دودھ
چھاگلوں میں لیے جب رقص کناں آتی ہیں
کوئی چوڑی خمِ دوراں پہ چھنک جاتی ہے
جست بھرتی ہے کبھی اور کبھی چلتے چلتے

---

(۱) زبورِ عجم۔۵۳۔

ناچتی ڈار مہکتے ہوئے بزغالوں کی
ہر جھکی شاخ کی چوکھٹ پہ ٹھٹک جاتی ہے
سان پر لاکھ چھری سیخ پہ صد پارہ گوشت
پھر بھی مدہوش غزالوں کی یہ ٹولی ہے کہ جو
بار بار اپنے خطِ راہ سے بھٹک جاتی ہے
شام کی راکھ میں لتھڑی ہوئی ڈھلوانوں پر
کھیلتی ہے غمِ ہستی کی وہ شاداں سی اُمنگ
جس کی رو وقت کی پہنائیوں تک جاتی ہے (۱)

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ:

''وہ لا متناہی ہے تو ان معنوں میں کہ اس کی تخلیقی فعالیت کے ممکنات جو اس کے اندرونِ وجود میں مضمر ہیں، لا محدود ہیں اور یہ کائنات جیسا کہ ہمیں اس کا علم ہوتا ہے۔ ان کا جزوی مظہر۔ حاصل کلام یہ کہ ذاتِ الٰہیہ کی لامتناہیت، اس کی افزونی اور توسع میں ہے، امتداد اور پہنائی میں نہیں۔ وہ ایک سلسلۂ لا متناہیہ پر تو ضرور مشتمل ہے لیکن بجائے خود یہ سلسلہ نہیں۔ (۲)

گویا کہ اقبال حسن مطلق کی تجسیم کے قائل ہیں اور وہ اس سلسلے میں پیکریت (Abstractism) پر یقین رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیقات میں لا محدود ہے۔ جو کہ لحظہ بہ لحظہ پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر بھی علامہ محمد اقبال ذات باری تعالیٰ سے متعلق رقم طراز ہیں ''میری رائے میں حقیقت مطلقہ کا تصور بطور ایک انا ہی کے کرنا چاہیے'' (۳)

اور پھر یوں بھی ہوا کہ نطشے یہاں تک کہہ جاتا ہے کہ:

"But of course God was dead all the Gods were dead. For the old Gods came

---

(۱) کلیات مجید امجد۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ''ریوڑ''۔ (۲) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۹۹۔ تیسرا خطبہ۔ (۳) ایضاً۔ ۱۰۹۔

to an end long ago. An verily it was a good and joyful end of Gods"(1)

خدا مر چکا ہے (معاذاللہ) ہاں سچ تو یہ ہے کہ خدا مر چکا ہے۔ تمام دیوتا مر چکے تھے۔ مدت ہوئی پرانے دیوتاؤں کا دور ختم ہو گیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اچھا ہی ہوا کہ تمام خدا مر گئے ۔ ان کا یہ انجام دل خوش کن ہے۔

دراصل نطشے ___ ''**ھوالحیی والقیومْ**'' خدا پر ایمان ہی نہیں رکھتا تھا۔ وہ جن خداؤں کا عقیدت مند تھا وہ فانی ہی تھے۔ ان خداؤں کو مارنے کے بعد نطشے فوق البشر (Superman) کو اپنا خدا ماننے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ اور وہ اپنے آپ ہی کو فوق البشر مانتا ہے۔ کسی اور کو فوق البشر کا درجہ دینے کو تیار بھی نہیں۔ چنانچہ اقبال نے نطشے کو'' مجذوب'' فرنگی کہتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھا تا مقام کبریا کیا ہے! (۲)

مگر بات دراصل یہ ہے کہ انسان جو کہ بذات خود مٹی کی ایک مورت ہے۔ خدا کیسے بن سکتا ہے۔ خدائی کا دعویٰ کرتے وقت وہ اتنا سوچ لے کہ جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے۔ ''کرمک و مور'' کے حوالے سے :

چاٹ جائیں گے وہ مورت میری
حیف مٹ جائے گی صورت میری (نقوی)

___ تو کبھی ایسا دعویٰ نہ کرے گا شاید موت ہی کے خوف سے ردِ عمل کے طور پر، فرعون اور نطشے جیسے لوگ یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ مجید امجؔد کے لاشعور میں بھی کچھ ایسے ہی محرکات اٹھتے ہیں لیکن وہ انسان کی موت اور بے ثباتی کے مدِ نظر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خدا ہی کو خدائی کا حق دار ٹھہراتے ہیں۔ مر جانے والے انسان کے بس میں نہیں کہ وہ خدا بنا پھرے۔

اگر میں خدا اس زمانے کا ہوتا   تو عنواں کچھ اور اس فسانے کا ہوتا
مگر ہائے ظالم زمانے کی رسمیں   ہیں کڑواہٹیں جن کی امرت کے رس میں
نہیں میرے بس میں نہیں میرے بس میں

---

(۱) The story of philosophy . 317. will durant۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۵۶۔ غزل۔

مری عمر بیتی چلی جا رہی ہے دو گھڑیوں کی چھاؤں ڈھلی جا رہی ہے
ذرا سی یہ بتی جلی جا رہی ہے

جونہی چاہتی ہے مری روحِ مدہوش کہ لائے ذرا لب پہ فریادِ پر جوش
اجل آ کے کہتی ہے خاموش خاموش! (۱)

اقبال کہتے ہیں کہ نطشے عقل سے کام لے رہا تھا۔ اس کی عقل نے اسے سمجھایا کہ تو اپنے راستے پر چل، تیرا راستہ ہی بہتر ہے۔ لیکن مقام کبریا کی تلاش عقل کے جی کا روگ نہیں۔ یہ مقام عقل و حکمت سے ماورا ہے۔ اس مسافر کو کسی نے راستہ نہ بتایا اس لیے اس کی واردات میں سینکڑوں خلل پیدا ہو گئے۔ وہ ''لا'' ہی میں رہ گیا ''الا'' تک نہ پہنچا۔ اس لیے مقامِ ''عبدہ'' سے نا آشنا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے مطابق نہ جبرائیل، نہ جنت، نہ حور اور نہ خدا ہے۔ بلکہ آدم ہی سب کچھ ہے۔ جو اپنی جان آرزومند سے سلگ رہا ہے۔

عقل او با خویشتن در گفتگو ست تو رہِ خود رو کہ راہِ خود نکوست!
آنچہ او جوید مقام کبریا ست ایں مقام از عقل و حکمت ماوراست
او بہ لا درماند و تا الا نرفت از مقامِ عبدہٗ بیگانہ رفت!
نہ جبریلے، نہ فردوسے، نہ حورے ،نے خدا وندے
کفِ خاکے کہ می سوزد ز جانِ آرزو مندے! (۲)

علامہ محمد اقبال اور نطشے کے مابین ایک فرق یہ بھی ہے کہ نطشے صرف جلال کا قائل دکھائی دیتا ہے۔ وہ قوت و جبروت اور طاقت کا فسطائیت کی حد تک مبلغ ہے۔ جبکہ اقبال کے ہاں جلال و جمال کی وحدت جمال کا اعتدال اور تسویہ و تعدیل پائی جاتی ہے۔ جس میں نری کڑکتی اور کوندتی بجلیاں ہی نہیں بلکہ بارانِ رحمت کی گوہرانہ پھوار و آبشار کی آغوش میں لہکتی ہریالی اور فصلِ بہار کے دامن میں مہکتے گل و گلزار بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:

زندہ رودؔ: نقشِ حق را در جہاں اندا ختند من نمی دانم چساں اندا ختند؟
حلاجؔ: یا بزورِ دلبری اندا ختند یا بزور قاہری اندا ختند!

---

(۱) شب رفتہ۔ مجید امجد۔ (۲) جاوید نامہ۔۱۵۲۔۱۵۳۔

زانکہ حق در دلبری پیدا تر است
دلبری از قاہری اولیٰ تر است! (۱)

اے۔کریسی ماریسن اپنی کتاب ''خدا ہمارے ساتھ ہے'' میں لکھتا ہے:

''ہیگل نے کہا تھا کہ مجھے ہوا ، پانی، کیمیائی عناصر اور وقت مہیا کر دو میں انسان کی تخلیق کر دوں گا''(۲)

ماریسن ہیگل کے اس دعوے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہیگل ؔ جین اور زندگی بھول گئی تھی۔ گویا کہ اسے چاہیے تھا کہ یہ دونوں بھی مانگتا۔لیکن میں یہ کہوں گا کہ ہیگل کا مطلب تھا کہ مجھے خدا بنا دو۔ میں انسان بنا دوں گا۔اور اگر کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو خدا بنا سکتا ہے تو وہ ہیگل کو کیوں؟، اپنے آپ ہی کو خدا کیوں نہ بنائے۔ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کسی کو چاہے تو خدا بنا سکتا ہے۔ جبکہ وہ خود ہی خدا ہے۔ اکیلا ہی رہنا پسند کرتا ہے۔

ماریسنؔ نے اپنی کتاب میں شانِ کبریائی کو ایک عظیم الشان ''ناظم اعلیٰ'' کے طور پر جگہ جگہ ثابت کر دکھایا ہے لیکن میں طوالت سے بچنے کی غرض سے صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ چنانچہ پیلےؔ کے حوالے سے ماریسنؔ رقمطراز ہے:

''وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے ایک بار ایک گھڑی راستے میں پڑی پائی۔ گھر پہنچ کر جب میں نے اس کے پرزوں کو بغور دیکھا تو میں نے اس مشینی ساخت کو ان منصوبہ بندیوں سے بدرجہا کم حیرت انگیز پایا جو فطرت کے نہایت معمولی مظاہر میں پائی جاتی ہیں۔لیکن یہ ایک نہایت عجیب بات ہے کہ ہم ''آہنگ ونظم'' کی ان کیفیتوں کو انسان کی بنائی ہوئی اشیاء میں تو فوراً تسلیم کر لیتے ہیں ،لیکن فطرت کے مظاہر میں ان سے بدرجہا بہتر کیفیتوں کو پہچاننے سے گریز کرتے ہیں۔ پھر بالفرض انسانی ساخت کی کسی چیز مثلاً اسی گھڑی میں اپنا ثانی پیدا کرنے کی اہلیت اور خوبی بھی ہو تو کیا اس کی حیرت انگیز اور بظاہر محال صنعت ایک معمولی مکھی کے نظام جسمانی سے زیادہ حیرت انگیز ہوگی؟''۔ (۳)

---

(۱) جاوید نامہ۔۱۳۱۔ (۲) خدا ہمارے ساتھ ہے۔۱۲۲۔اے کیریسی ماریسن۔ (۳) خدا ہمارے ساتھ ہے۔۸۔

واقعی یہ حیران کن بات ہے کہ ہم انسان کی فنکاری اور صنعت گری تو مانتے ہیں ۔مگر خالق الکائنات کی تخلیقات کو جھٹلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ہمارے لیے سنگ تراش کی مجسمہ سازی و بت گری ، مصور کی مصوری اور مرغ فردوس کا گھنی جھاڑی میں تاج محل تو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔لیکن جس ہستی نے سنگ تراش ، مصور اور مرغ فردوس کو اپنے شاہکار کے طور پر تخلیق کیا اس عظیم ہستی کی عظمت سے ہم یکسر انکاری ہو جاتے ہیں۔

کریسی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''انسان کے لیے اپنی روحانی اہلیتوں اور حدود کے اندر رہ کر بالکل ممکن ہے کہ وہ لقائے ربانی سے سرفراز ہو جائے۔ پھر جوں جوں اس کی روحانیت کو فروغ حاصل ہو ۔ وہ اس ذاتِ عظیم و کبیر کے ''جلال و جمال'' سے قریب تر ہوتا اور اس کے احساسِ بے نہایت میں اپنے آپ کو گم کرتا چلا جائے۔'' (۱)

گویا کہ روحانیت ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ سے اپنی نا رسائی کو رسائی میں بدل سکتا ہے۔ قرآن کریم میں قادرِ مطلق اپنی قدرت کا ثبوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: **''ولین سالتم من خلق السموات والارض و سخرالشمس والقمر لیقولن اللہ فانی یوفکون''** اور اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ وہ کون ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے۔تو وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ اللہ ہے۔ پھر کدھر الٹے چلے جا رہے ہیں۔مولانا جلال الدین رومیؒ ''معمار عمارت سے لطیف تر ہے'' کے عنوان کے تحت اس مسئلے کو بڑے خوبصورت انداز میں حل کرتے ہیں:

''ایک شخص نے کہا بیشتر اس کے کہ زمین و آسمان اور کرسی پیدا ہوئے۔تعجب ہے کہ خدا کہاں تھا؟ ہم نے کہا یہ سوال ابتداء ہی سے فاسد ہے۔اس لیے کہ خدا وہ ہے ، جس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔تو پوچھتا ہے کہ وہ اس سے بھی پہلے کہاں تھا؟ آخر تیری سب چیزیں جگہ کے بغیر ہیں۔ جو چیزیں تجھ میں ہیں کیا تو ان کو جانتا ہے۔ جو تو اس کی جگہ پوچھتا ہے۔ جو بے جگہ ہے۔ تیرے حالات و افکار کی جگہ کا تصور کیسے بندھتا ہے۔آخر افکار کا خالق افکار سے لطیف تر ہے۔ مثلاً یہ معمار جس نے گھر بنایا اس گھر سے لطیف تر ہے۔اس لیے کہ وہ سینکڑوں ایسے گھر بنا چکا ہے۔ یہ سب کچھ یک بیک نہیں ہو جاتا وہ ایک

---

(۱) خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ۱۵۷۔

ایک کر کے بنا سکتا ہے۔ پس معمار عمارت سے لطیف تر اور عزیز تر ہے۔ لیکن وہ لطافت نظر نہیں آتی سوائے عمارت کے ذریعے کے اور وہ عمل جو عالم حسِ میں آتا ہے، اس لیے ہے کہ اس لطافت اور جمال کو ظاہر کرے۔ یہ سانس (بخارات کی صورت میں) موسمِ سرما میں ظاہر ہوتا ہے اور موسم گرما میں ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہ گرما میں سانس منقطع ہو جاتا ہے اور سانس باقی نہیں رہتا۔ بلکہ گرم لطیف ہے اور سانس بھی لطیف ہے۔ اس لیے یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ سرما میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اسی طرح تیرے سب اوصاف اور معانی لطیف ہیں۔ وہ نظر نہیں آتے۔ وہ فعل سے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً تجھ میں ''حلم'' موجود ہے لیکن نظر نہیں آتا۔ جب تو کسی خطا کار کو بخشتا ہے تو حلم معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تیری قہاری نظر نہیں آتی جب تو کسی مجرم پر غصے ہوتا ہے اور اسے پیٹتا ہے، تو تیرا قہر نظر آ جاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ انتہائی لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتا۔ اس نے زمین اور آسمان پیدا کر دیئے تا کہ اس کی قدرت اور اس کی صنعت نظر آئے۔'' (۱)

تاریخ فلسفہ ومذہب میں ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' ایسی اصطلاح ہیں جن کے ذریعے ''حسن مطلق'' کو سمجھنے سمجھانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ ان دونوں میں وحدت الوجود کا مسئلہ قدیم ہے۔

وحدت الوجود (Pantheism) یعنی کل وجود صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ وجود اللہ تعالیٰ کی عظیم ہستی ہے۔ کوئی دوسرا وجود ہے ہی نہیں۔ یونانی زبان میں ''پین'' (Pan) کل کے اور ''تھیوس'' خدا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ''کل خدا ہے'' یا ''خدا کل ہے''۔ خدا ہی سب کچھ ہے اور سب کچھ ہی خدا ہے۔ اس طرح وحدت الوجود کو کثرت میں وحدت کہیں گے۔ جو بھی روپ ہے وہ خدا ہی ہے۔

راتوں کو ستاروں میں تجھے دیکھا ہے سرشار بہاروں میں تجھے دیکھا ہے
زیبا تیری وحدت کو ہے کثرت کا لباس ہم نے تو ہزاروں میں تجھے دیکھا ہے (۲)

خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب ''حکمت رومی'' میں لکھتے ہیں کہ'' اسلامی تصوف میں جو نظریہ وحدت وجود ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کسی چیز کا وجود نہیں ''ہمہ اوست''، جو کچھ ہے وہ خدا ہی کی ذات کا مظہر ہے۔ ہستی ایک ہی ہے۔ تمام مختلف ہستیوں میں ہستی مشترک ہے اور وہ ہستی خدا ہے۔ ایک فارسی متصوف شاعر کے دو اشعار کا مضمون یاد رہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے خدا تو مجھے دھمکی دیتا ہے کہ میں تجھے دوزخ میں ڈال دوں گا۔ مجھے یہ بتا دوزخ کا وجود ہے کہ نہیں۔ اگر

---

(۱) ملفوظاتِ رومی ۳۲۱ ۔۳۲۲۔ از عبدالرشید تبسم۔ (۲) صبوحی ۔ ۹۸ ۔ سید ضیاء جعفری۔

اس کا وجود حقیقی ہے تو وہ تیرے بغیر نہیں ہوسکتا۔ لیکن جہاں تو ہے۔ اسے دوزخ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اگر وہاں نہیں ہے تو دوزخ معدوم ہے" (۱)

ابن عربی اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دوزخیوں کو نارجحیم میں لطف آئے گا۔

"وان دخلو دادرالشقافانهم علی لذة فیها نعیم مبائن

نعیم جنان الخلدفالامرواحد وبینهما عندالنحلی تبائن

یسمی عذاباً من عذوبته طعمه وذاك له كالقشرو القشرصائن" (۲)

اگر مجرمین وگناہگار بدبختی کی جگہ یعنی دوزخ میں بھی جائیں تو وہ ایک لذت خاص میں ہیں اور نعمت جداگانہ سے بہرہ یاب ہیں۔ جعل یعنی پاخانے کے کیڑے کو پاخانے کی بدبو باعث حیات ہے اور گلاب کی خوشبو اس کے لئے باعث موت ہے۔ دوزخ کی نعمت جنت خلد کی نعمت سے جدا ہے۔ کیونکہ منشا سب کا ذات واحدہ ہے۔ جمال ہے تو اس کا، جلال ہے تو اس کا۔ گویا جنت حسن مطلق کا جمال ہے اور دوزخ اس کا جلال ہے۔ دوزخیوں کے عذاب کا مزہ ان کی فطرت کے لحاظ سے دیکھو تو شیریں ہے۔ جو بظاہر عذاب معلوم ہوتا ہے۔ وہی بباطن براقتضائے فطرت باستعداد عین، مناسب ہے۔ یہ صورت ہے جو اپنی حقیقت کی صیانت وحفاظت کرتی ہے اور بظاہر عذاب معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اگر شیخ کی بات تسلیم کرلی جائے تو گناہ وثواب کے حوالے سے سارا کچھ الٹ پلٹ ہوجائے گا اور جزا وسزا کے لحاظ سے گناہ بھی ثواب بن جائے گا۔ بہر حال وحدت الوجود کا اثر ونفوذ اس حد تک سرایت کرگیا کہ بعض صوفیاء نے کلمے میں تبدیلی کرتے ہوئے لا الہ الااللہ کی بجائے لا موجود الا اللہ اور لاموثر فی الوجودالااللہ کہنا شروع کردیا۔ جبکہ اسلامی توحید کے مطابق، خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ لیکن وحدت الوجود کے تحت لوگ کہنے لگے کہ خدا کے سوا اور کوئی موجود ہی نہیں۔ اگر یہی بات ہے تو پھر عابد ومعبود کی تمیز بھی ختم ہوتے ہوئے پرستش وعبادت بے حقیقت ہوکر رہ جائے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی اور موجود یا وجود نہیں تو پھر "ہستی مطلق" کس پر قادر مطلق ہے۔ آیا اپنے آپ پر؟ اور اگر وہ ہی وہ ہے تو ایک خدا کیوں کر کہا جاتا ہے۔ خالق کیوں کہلاتا ہے؟ جنت ودوزخ کیا ہے۔ قاتل ومقتول کیا ہے۔

---

(۱) حکمتِ رومی۔ ۱۰۷۔ (۲) فصوص الحکم۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ محی الدین ابن عربی۔ مترجم مولانا عبدالقدیر صدیقی۔

سزائیں کیوں ہیں؟

فصوص الحکم کے "فص آدمیہ" میں ابن عربی مسئلہ خلافت بیان کرتے ہوئے "تمام عالم کو بمنزلہ جسد کے فرض کرتے ہیں اور تجلی اعظم اور شان الوہیت کو بمنزلہ روح کے۔ شیخ تمام عالم کو انسان کبیر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ عالم میں جو کچھ ہے وہ مظاہر اسمائے الٰہیہ ہیں انسان جب تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ عالم تن سے بے جان تھا۔ اس میں حاکمانہ شان کا مظہر نہ تھا۔ انسان پیدا ہوا تو گویا عالم کے تن میں جان آ گئی۔ اور وہ مکمل انسان ہوگیا۔ جس طرح انسان میں قویٰ ہے اور ان کے محل ہیں۔ اسی طرح انسان کبیر یعنی عالم میں ملائکہ ہیں۔ انسان میں قوت علمی ہے اور اس کا مرکز دماغ ہے۔ انسان کبیر یا عالم میں بھی قوت علمی ہے۔ اور اس کا مرکز جبرائیل ہیں۔ انسان میں قوت حیات ہے۔ انسان کبیر میں بھی قوت حیات ہے۔ اور اس کا محل میکائیلؑ ہیں۔ انسان کے ساتھ موت لگی ہوئی ہے۔ انسان کبیر کی موت کا مرجع عزرائیلؑ ہیں۔ انسان میں خیال ہے۔ انسان کبیر کا خیال عالم امثال ہے۔ اور اس کا مرکز اسرافیل ہیں" (۱)

عبد اور معبود کے حوالے سے ابن عربی فرق مراتب کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر بندہ وجود باری تعالیٰ کی طرح نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ مرتبہ صرف انسان کامل و مرد فقیر ہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ لکڑیاں یا لوہے کے ٹکڑے تو بہت ہیں، مگر آگ وہی لکڑ یا لوہا بنے گا جسے آگ میں ڈالا جائے۔

"فانت عبد وانت رب   لمن له فيه انت عبد   (۲)

تو بندہ ہے اور تو رب سے جدا نہیں۔ کس کا بندہ، اس کا بندہ جس میں تو فنا ہوگیا"

الرب رب وانتزل   والعبد عبد وان ترقی

اللہ تعالیٰ تنزلات کے باوجود ربّ ہی رہتا ہے۔ اور بندہ اوج کمال تک پہنچ کر بھی عبد ہی رہتا ہے۔ چنانچہ مولانا رومی بھی فرماتے ہیں۔

رنگ آہن محورنگ آتش است   زآتشے می لافدوآہن وش است

چوں بہ سرخی گشت ہمچوزرکاں   پس انا النار است لافش بے گماں

شدزرنگ وطبع آتش محتشم   گویداو من آتشم من آتشم

---

(۱) فصوص الحکم۔ ۳۔ تمہید فص آدمیہ۔ (۲) ایضاً۔ ۱۲۹۔ فص اسمٰعیلیہ۔

آتشم من گرتراشک است وظن		آزموں کن دست را برمن بزن

آگ میں پڑے ہوئے لوہے کا رنگ آگ کی طرح ہوجاتا ہے ۔ وہ لوہا ہوتے ہوئے بھی نار ہونے کا دعویٰ بیانگ دہل کرسکتا ہے۔ جب خوب آتش فام ہوکر وہ زرخالص کی مانند دکھنے لگتا ہے تو بلاشبہ، میں آگ ہوں، میں آگ ہوں پکارنے لگتا ہے۔ ہیئت کی تبدیلی سے اس کا رنگ بھی آگ سا ہوجاتا ہے اور اس میں بھی آگ کی طرح جلانے کی خاصیت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ سراپا آتش ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے شک کرنے والے سے کہتا ہے کہ اگر تجھے یقین نہیں تو ذرا مجھے ہاتھ لگا کر دیکھ لے۔

افلاطون کے بھانجے وجان نشین ''سپے سپس'' کے ذریعے نظریہ وحدت الوجود فلاطینوس سے ہوتا ہوا دست بدست یا سینہ بہ سینہ شیخ الکبیر یعنی ابن عربی تک پہنچا۔ ابن عربی کی متحرک شخصیت ،شعلہ بیانی اور موثر تحریروں کے طفیل نظریہ وحدت الوجود بہت مقبول ہوا ۔ مولانا رومؒ بھی ابن عربی کے حلقہ درس وتدریس میں بیٹھتے تھے۔ چنانچہ رومی بھی وحدت الوجود سے متاثر ہوئے۔ لیکن خلیفہ عبدالحکیم ٹھیک کہتے ہیں کہ جو شخص ''بہتر'' فرقوں سے متنفق ہو وہ صرف وحدت الوجودی نہیں ہوسکتا۔ دراصل مولانا کے کلام میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود، دونوں کی موجودگی پائی جاتی ہے۔

وحدت الوجود کا نظریہ قرآنی توحید سے متصادم نظر آتا ہے۔ اس لئے مسلمان صوفیاء کا ایک گروہ وحدت الشہود (Panantheism) کا قائل ہے۔ جس کے معنی ہمہ اوست کی بجائے ''ہمہ ازوست'' کے ہیں۔ یعنی سب کچھ اس سے ہے۔ سب اس کی تخلیق ہے۔ وہ خالق الکائنات ہے۔ وحدت میں کثرت ہے۔

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر !		مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر! (۱)

''وجود موجودات کا بھی ہے اور خدا کا بھی۔ لیکن جن معنوں میں خدا موجود ہے۔ ان معنوں میں موجودات موجود نہیں۔خدا اور مخلوقات کی باہمی نسبت کسی جسم اور اس کے سایہ کی نسبت ہے۔ سائے کا بھی وجود ہے، لیکن جسم کے وجود کے مقابلے میں بے مایہ ہے اور اپنی ذات کے لئے جسم کا محتاج ہے۔ تمام ممکنات وحوادث ہستی مطلق کے اظلال وپرتو ہیں۔خدا کی ہستی کے مقابلے میں تمام اشیاء کی ہستی ہیچ اور کالعدم ہے''۔ (۲)

اقبال کہتے ہیں ہمارا وجود یا عدم وجود ایک شعلۂ حیات سے ہے۔خودی کی لذت سے ہم شرر کی مانند ٹکڑے ٹکڑے

---

(۱) بال جبریل ۔۱۳۵۔ساقی نامہ ۔ (۲) حکمت رومی ۔۱۱۳۔۱۱۴۔خلیفہ عبدالحکیم ۔

ہوئے ہیں۔

بود ونابود ماست یک شعلۂ حیات   ازلذت خودی چو شرر پارہ پارہ ایم (۱)

شبلی نعمانی کے مطابق وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں فرق یہ ہے کہ وحدت الوجود کی رو سے ہر چیز کو خدا کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ حباب اور موج کو پانی کہہ سکتے ہیں۔ مگر وحدت الشہود میں ایسا نہیں، کہ انسان کا سایہ انسان نہیں ہوسکتا۔ بہر حال وحدت الوجودی کائنات ہی کو خدا سمجھتے ہیں۔ جبکہ وحدت الشہودی کے نزدیک کائنات اور کائنات کی ہر چیز تجلیات حسن مطلق کا مظہر ہے۔

ایسے فرسودہ مظاہر سے نکل کر اب تو   مجھ سے ملنے وہ کسی اور بہانے آئے (فقری)

وحدت الوجودی نظریئے کے مطابق خالق اور مخلوق میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ چنانچہ ردعمل کے طور پر وحدت الوجود کی رو سے اگر کوئی چیز مٹ جائے تو نعوذباللہ کیا خدا میں کوئی کمی واقع ہوجاتی ہے؟ اس لئے کہ وہ چیز تو اس واحد وجود ہی کا حصہ تھی۔ اس مسئلے کو سلجھانے کے لئے یا تو یہ کہنا پڑے گا کہ سانچے کے مٹنے سے حسن نہیں مٹتا یا پھر ایک دوسرا نکتہ میرے ذہن میں آیا ہے کہ وحدت الوجود سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حسن مطلق کا واحد وجود ازلی وابدی ہے۔ اسے کوئی زوال نہیں۔ باقی تمام وجود فانی وزوال پذیر ہیں۔

دراصل بات وحدت الوجود کی ہو یا وحدت الشہود کی۔ دونوں حوالے ذات باری ومحبوب حقیقی کی معرفت کے ہیں۔ تمام گلیاں اور راستے اسی نور کی طرف جاتے ہیں، جو پتلی کی طرح آنکھ سے مستور ہے۔ بلکہ نہ وہ ہم سے دور ہے اور نہ ہم اس سے دور ہیں یہ اور بات کہ ہم بے بضاعت وبے بصارت لوگ اسے دیکھ نہیں سکتے تو کہہ دیتے ہیں کہ:-

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو (۲)

اور پھر کمال یہ ہے کہ:-

ان لربکم فی ایام دھرکم نفحات الافتعرضو

تمہارے رب کی تمہارے زمانے میں خوشبوئیں ہیں۔ آگاہ اس سے وابستہ ہوجاؤ!

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۷۸۔ (۳) دیوان غالب۔ ۶۵۔ مرزا غالب۔

دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے
تیری گلی کا رستہ پوچھا تری گلی میں (امجد حیدرآبادی)

مولانا روم کیا خوب فرماتے ہیں:-

دہ چراغ ارحاضر آری درمکاں ہر یکے باشد بصورت غیر آں
فرق نتواں کرد نور ہر یکے چوں بنورش روئے آری بے شکے (۱)

اگر تم کسی مکان میں دس چراغ رکھ دو اور ہر ایک چراغ جداگانہ شکل کا ہو۔ مگر کمرے میں ان چراغوں کی جو روشنی پھیل رہی ہے۔ اسے تم الگ الگ نہیں کر سکتے۔ ان سبھی چراغوں کا نور ایک غیر منقسم وحدت بن جاتا ہے۔ عالم ارواح عالم نور وشعور ہے، اس کو بھی تم اسی پر قیاس کرلو، جب چراغوں کا مادی نور اپنی کثرت میں یہ وحدت پیدا کر سکتا ہے تو عالم ارواح کی کثرت میں جو وحدت ہے اس میں بدرجہ اولیٰ یگانگی ہوگی۔ عالم ارواح عالم معانی ہے اور معانی میں تقسیم وتعدد نہیں ہوتا۔ سو الفاظ کی عبارت کے بھی جب کوئی شخص معنی بیان کرتا ہے تو الفاظ کی کثرت معنی کی کثرت کے آگے ناپید ہو جاتی ہے۔

درمعانی قسمت واعداد نیست در معانی تجزیہ وافراد نیست (۲)

علاوہ ازیں پیر رومی ایک دوسری دلچسپ مثال سے بھی مطلب واضح کرتے ہیں۔ کہ اگر تو سو سیب اور سو بہی لے اور ان کا عرق نچوڑے، تو اس افشردۂ عرق میں سے ہر سیب اور ہر بہی کے قطرے الگ نہیں کر سکتے۔

اگر تو صد سیب وصد آبی بشمری صد نماند یک شود چوں بفشری (۳)

صورتوں کے تفاوت وامتیاز نے من وتو کی تفریق اور دھوکا پیدا کر رکھا ہے۔ تو کچھ ایسی معنوی ریاضت اور ایسی بصیرت پیدا کر کہ ہر کثرت میں وحدت کی حقیقت تجھ پر ظاہر ہو جائے____ خیر وحدت الوجود کی بات ہو یا کہ وحدت الشہود کا مسئلہ ہو، عشق ووجدان کے ان دونوں سرچشموں کا مقصد ''حسن مطلق'' تک رسائی ہے۔ منزل دونوں کی ایک ہی ہے ۔راستے صرف جدا جدا ہیں مگر ان مختلف راستوں کا نام بھی ایک ہی ہے، جسے عشق کہتے ہیں اور ان راہگزاروں کا مسافر عاشق کہلاتا ہے جس کا محبوب، محبوب حقیقی ہے ۔جس تک رسائی اکثر اوقات مجازی محبوب کے راستے سے ہوتے ہوئے حاصل کی جاتی ہے۔اور قرآن پاک اس محبوب حقیقی کی گواہی دیتا ہے کہ :-

---

(۱) مثنوی مولوی معنویؒ۔ دفتر اوّل۔۹۷۔ (۲) ایضاً۔ ۹۷۔ دفتر اوّل۔ (۳) ایضاً۔

هو الاول والاخر والظاہر والباطن

وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر اور وہی باطن ہے اور جس نے اپنے محبوب بندوں سے جنت میں اپنے دیدار کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کبھی تو وہ موج کے لباس میں چھپ کر چپکے سے باغ میں آ جاتا ہے۔ کبھی پھول کی مہک میں ملا ہوتا ہے اور کبھی غنچے کے تبسم میں۔

درموج صبا پنہاں دزدیدہ بباغ آئی   دربوئے گل آمیزی باغنچہ درآویزی! (۱)

علامہ اقبال نے شروع شروع میں "وحدت الوجود" کو حسن مطلق کے اظہار کا ذریعہ اظہار بنایا۔ اور بڑے بھرپور انداز بیان میں محبوب حقیقی کی شان کبریائی کے اوصاف اپنے کلام میں کھل کر بیان کئے۔

برسر ایں باطل حق پیرہن   تیغ لاموجود الا ھو بزن (۲)

بعد میں اقبال نے وحدت الوجود کا رستہ ترک کردیا لیکن یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت ہر رنگ میں سپرد قلم کرتے رہے۔

گہے جز یکی ندیدن بہ ہجوم لالہ زارے   گہے خار نیش زن راز گل امتیاز کردن (۳)

وحدت الوجود کے سلسلے میں اقبال کہتے ہیں۔ اے نادان! تو دل آگاہ حاصل کر اور اپنے بزرگوں کی مانند اپنے آپ تک رسائی حاصل کر۔ مومن پوشیدہ رازوں کو کس طرح فاش کرتا ہے۔ یہ نکتہ لاموجود الا اللہ سے سیکھ۔

تو اے ناداں دل آگاہ دریاب   بخود مثل نیاگاں راہ دریاب
چساں مومن کند پوشیدہ رافاش   زلا موجود الا اللہ دریاب (۴)

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من وتو + پلا کے مجھ کو مے لا الہ الا ھو (ھوالذی لا الہ الا ھو، (سورہ حشر)

محبوبہ گل کے لباس میں کانٹے کی سوئی ہے۔ ہے تو خار مگر محبوب کے پاس بیٹھنے والوں میں سے ہے۔ عشق سے نحیف وزار ہے۔ مگر یار کے پہلو میں ہے۔ یہ بھی بہار کا ایک رنگ ہے۔

درپیرہن شاہد گل سوزن خار است   ، ولیکن زندیمان نگار است

---

(۱) زبور عجم ۔ ۸ ۔ (۲) رموز بیخودی ۔ ۱۴۰ ۔ (۳) پیام مشرق ۔ ۸۷ ۔ (۴) ارمغان حجاز ۔ ۶۹ ۔

از عشق نزار است
در پہلوئے یار است
ایں ہم ز بہار است (۱)

اصل شہود وشاہد ومشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں (۲)

وحدت الوجود ہو یا وحدت الشہود معاملہ دونوں صورتوں میں حسن وعشق کا ہے۔عشق کیا ہے؟ یہ تو گزشتہ باب میں ہم بہ تفصیل دیکھ آئے ہیں۔حسن اور حسن مطلق پر بھی پچھلے اوراق میں کچھ تبصرہ کردیا گیا ہے۔لیکن اگر میں اپنے مطالعے کے مختلف مراحل اور سوچ بچار کا نچوڑ پیش کروں تو یہی کہوں گا کہ:۔

''حسن طلب ہے اور عشق اس طلب کو پالینے کی طلب میں ایک تڑپ ہے۔حسن کشش ہے اور عشق اس کشش میں مدغم ہوجانے کی حسرت وارمان ہے۔عشق وہ قوت مسخرہ ہے جو کائنات کی سب سے بڑی قوت یعنی حسن کو مسخر کرنے کی تگ وتاز میں لگا رہتا ہے''۔حسن کائنات کی سب سے بڑی قوت ہے اسی لئے تو یہ خدا ہے۔ بہر حال عشق کے پاس ہزاروں منتر ہیں اور حسن نے رکھ رکھاؤ کے ہزاروں قواعد بنا رکھے ہیں نہ میں شمار میں آتا ہوں نہ تو:۔

عشق است وہزار افسوں، حسن است وہزار آئیں نے من بہ شمار آیم، نے تو بہ شمار آئی (۲)

اور اگر مزید وضاحت کی جائے تو حسن مجازی دل آویز صدمہ ہے جبکہ حسن حقیقی ایک دل آویز نغمہ۔عشق مجازی ہو یا حقیقی دونوں حالتوں میں فنافی الحسن ہوجانا چاہتا ہے۔عشق فنافی الحسن ہو جانے کی خاطر سراپا آرزو ،تمنا، خواہش اور اضطراب ہوکر تڑپتا، پھڑکتا دل ناصبور، سوز دروں سے بھرپور، حسن سے دور ہمیشہ حسن کی طرف متحرک رہتا ہے۔

ہمہ سوز ناتمام، ہمہ درد آرزویم بگماں دہم یقیں را کہ شہید جستجو یم (۳)

شادم کہ عاشقاں راسوز دوام داری درماں نیا فریدی آزار جستجو را (۴)

اگر زرمز حیات آگہی ، مجوے دیگر دلے کہ از خلش خار آرزو پاک است (۵)

اقبال کہتے ہیں کہ عشق کے سوز آرزو ہی سے گل لالہ نے حسن وجمال پایا ہے۔ ورنہ لالے کا پھول زمین ہی میں خاک کی کسی منزل پہ مٹ جاتا۔ پھول خود ہی کہتا ہے میرے دل نے شاخ کی تنگی کے اندر بہت پیچ وتاب کھائے۔تب کہیں

---

(۱) پیام مشرق ۱۳۱۔ (۲) دیوان غالب ۔۵۲۔ (۳) پیام مشرق ۔ ۱۶۸۔
(۴) پیام مشرق ۔ ۸۷۔ (۵) پیام مشرق ۔۱۵۴۔ (۶) ایضاً۔ ۹۴۔

جا کر میرا جوہر، رنگ وبو کی جلوہ گاہ تک پہنچا۔

در تنگنائے شاخ بسے پیچ وتاب خورد   تا جوہر م بہ جلوہ گہ رنگ وبورسید(۱)

حسن وعشق کے سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا ''تصورات عشق وخرد'' میں فرید الدین عطار کے حوالے سے مثال پیش کرتے ہیں کہ :۔

''تب تیسرا پروانہ اڑا، اور یہ پروانہ عشق کے نشے میں سرشار تھا۔ وہ گیا اور اس نے جاتے ہی خود کو شمع کے حوالے کردیا۔ پھر جب وہ شعلے سے ہمکنار ہوگیا تو شمع کی طرح لو دینے گا۔ جب عقل مند پروانے نے دور سے دیکھا کہ شمع نے پروانے کو خود میں جذب کرلیا ہے اور پروانے کو اپنی روشنی عطا کردی ہے تو اس نے کہا :۔ اس پروانے نے اپنے عشق کی تکمیل کردی ہے۔ لیکن اس تجربے کو صرف وہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جان سکتا'' (۲)

اور آج تک جو پروانہ آتا ہے، شمع کے حسن میں حسن بن جاتا ہے۔ عاشق وہی ہوگا جو سوز حسن میں جذب ہوجائے گا۔ عقل مند پروانہ عقل سے کام لیتے ہوئے خود شمع کے نزدیک نہیں جاتا تھا۔ اپنے آپ کو بھول کر ہی محبوب تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ علامہ اقبال نے اسی خیال کو یوں باندھا ہے۔

پروانہ بے تاب کہ ہرسوتگ وپوکرد   بر شمع چناں سوخت کہ خود راہمہ اوکرد

ترک من وتو کرد (۳)

اقبال کے ہاں یہی کیفیت بڑی آب وتاب کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ کہ عشق ایک آرزو اور لگن کے طور پر سراپا آرزو دکھائی دیتا ہے۔ حرکت وآرزو کا یہ نکتہ عشق کے گزشتہ باب میں بھی بیان ہوسکتا تھا۔ مگر چونکہ اس باب میں عشق کے ساتھ ساتھ حسن اور اسے پالینے کا مذکور بھی ہے۔ اس لئے عشق بطور حرکت وآرزو جان بوجھ کر مؤخر کردیا تھا۔ بہر حال اس سلسلے میں اقبال فرماتے ہیں، عشق خودی ہے روح ہے، روح عشق ہے خودی ہے اور حسن اس کا مقصود ومنتہیٰ۔

زندگانی را بقاازمدعاست   کاروانش را دراازمدعاست

زندگی درجستجو پوشیدہ است   اصل اودر آرزو پوشیدہ است

آرزو را درد دل خود زندہ دار   تا نگردد مشت خاک تو مزار

(۱) پیام مشرق۔۱۰۵۔ (۲) تصورات عشق وخرد۔۱۵۲۔ بحوالہ Reading from the Mystic of Islam P-4 by Margret Smith

(۳) پیام مشرق۔۱۰۷۔

آرزو جان جهان رنگ و بوست   فطرت هر شے امین آرزوست

ازتمنا رقص دل در سینه ها   سینه ها ازتاب او آئینه ها

طاقت پرواز بخشد خاک را   حضر باشد موسیٰ ادراک را

دل زسوز آرزو گیرد حیات   غیر حق میرد چو اوگیرد حیات

چوں زتخلیق تمنا باز ماند   شهپرش بشکست و از پرواز ماند

آرزو ہنگامه آرائے خودی   موج بیتابے زدریائے خودی

آرزو صید مقاصد را کمند   دفتر افعال را شیرازه بند

زنده رانفئ تمنا مرده کرد   شعله را نقصانِ سوز افسرده کرد

چیست اصلِ دیدهٔ بیدار ما؟   بست صورت لذتِ دیدار ما

کبک پاازشوخی رفتار یافت   بلبل ازسعیٔ نوا منقار یافت

نے بروں ازنیستاں آباد شد   نغمه از زندان او آزاد شد

عقل ندرت کوش وگردوں تازچیست   ہیچ میدانی که ایں اعجاز چیست؟

زندگی سرمایه دار از آرزوست   عقل از زائیدگان بطن اوست

چیست نظم قوم و آئین ورسوم   چیست راز تازگیہائے علوم

اے زراز زندگی بیگانه خیز   از شراب مقصد مستانه خیز

مقصدے مثل سحر تابندهٔ   ماسویٰ را آتشِ سوزندهٔ

مقصدے از آسماں بالاترے   دل ربائے دلستانے دلبرے

باطل دیرینه راغارتگرے   فتنه درجیبے، سراپا محشرے

ماز تخلیق مقاصد زنده ایم

از شعاع آرزو تابنده ایم (۱)

---

(۱) اسرار خوری ۔۱۵۔۱۶۔۱۷۔ علامه محمد اقبال ۔

گویا کہ اقبال کے "ذوق جمال" میں عشق ہی ایک ایسا متحرک جذبہ ہے جو آرزو، تمنا اور تڑپ بن کر انسان اور قوموں کے دلوں کو گرماتا اور انہیں سوز زندگی سے سرفراز فرماتا ہے۔ تمنا سرد پڑ جائے تو مردنی چھا جاتی ہے۔ آرزو، یعنی عشق پرواز کے لئے شہپر کا کام دیتی ہے۔ جس کے بغیر پرواز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ آرزو کے داغ سے انسان کے اندر جوش پیدا ہوتا ہے۔ اس کی خاک (انسان) کی آگ آرزو سے روشن ہوتی ہے۔ تمنا جام حیات کی شراب ہے۔ گویا تمنا نہ ہو تو زندگی کا جام خالی ہے۔ جس کا کوئی مقصد نہیں اور ساغر زیست مے تمنا سے لبریز ہے تو زندگی سرگرم عمل اور مستعد ہے۔ زندگی کا مقصد قوت ہائے کائنات کی تسخیر ہے اور کائنات کی سب سے بڑی قوت "حسن" ہے۔ آرزو اسے مسخر کرنے میں افسوں کا کام دیتی ہے۔ زندگی شکار کھیلتی ہے اور اس کا جال آرزو ہے۔ آرزو حسن کے لئے عشق کی طرف سے پیغام ہے۔ تمنا ہر لحظہ کیسے ابھرتی ہے؟ یہ زندگی کے نغمے کا زیرو بم ہے۔ جو چیز خوبصورت، زیبا اور حسین وجمیل ہے، وہی طلب کے بیابان میں ہمارے لئے راہنما بنتی ہے۔ تیرے دل میں اس کا نقش پکی طرح جم جاتا ہے۔ اور وہ تیرے اندر آرزوئیں پیدا کرتی ہے۔ حسن بہار آرزو کا خلاق ہے۔ اس کے جلوؤں سے آرزو یعنی عشق پرورش پاتا ہے۔

گرم خوں انساں زداغ آرزو   آتش ایں خاک از چراغ آرزو
ازتمنا ے بجام آمد حیات   گرم خیز وتیز گام آمد حیات
زندگی مضمون تسخیراست وبس   آرزو افسون تسخیر است وبس
زندگی صید افگن و دام آرزو   حسن رااز عشق پیغام آرزو
ازچہ روخیزد تمنا دمبدم؟   ایں نوائے زندگی رازیر و بم
ہرچہ باشد خوب وزیبا وجمیل   دربیابان طلب مارا دلیل
نقش اومحکم نشیند دردلت   آرزوہا آفریند در دلت
حسن خلاق بہار آرزو ست   جلوہ اش پروردگار آرزوست(۱)

حسن حق ہے، جسے پانے کے لئے اپنی خودی یعنی روح کی تربیت کرنی چاہئے۔ جس کے تین مرحلے ہیں۔ جن میں پہلا مرحلہ اطاعت، دوسرا ضبط نفس اور تیسرا نیابت الٰہی ہے۔ اقبال کہتے ہیں اے ہوش مند انسان اپنی آنکھ، کان اور لب

---

(۱) اسرار خودی۔ ۳۴۔ ۳۵۔

کھلے رکھ۔ یعنی ان تینوں کو ہمہ آرزو بنادے اگر پھر بھی تجھے حسن مطلق کا رستہ نظر نہ آئے تو بے شک میری ہنسی اڑانا۔

چشم وگوش ولب کشا اے ہوشمند   گر نہ بینی راہ حق برمن بخند (۱)

اگر خودی مضبوط ہو، انسان روحانی و باطنی طور سے مستحکم ہو تو اس کے قلب ونظر میں امید وعشق اور تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان اندر سے کمزور اور کھوکھلا ہو تو یہ روحانی کمزوری اس کی بے خودی پر دلالت کرتی ہے۔ یہی بے خودی یاس وناامیدی وناکامی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں، امید یعنی اپنی خودی وعشق سے دستبردار ہوجانے میں سامان مرگ پوشیدہ ہے۔ زندگی کا استحکام اسی میں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ چونکہ مسلسل آرزو ہی سے امید قائم رہتی ہے اس لئے ناامیدی زندگی کے لئے زہر قاتل ہے۔ ناامیدی تجھے قبر کی طرح ریزہ ریزہ کردیتی ہے۔ اگر تو پہاڑ بھی ہے تو یہ تجھے گرا دیتی ہے۔ ناتوانی ناامیدی ہی کی لونڈی ہے اور ناکامی بھی اسی کے دامن سے وابستہ ہے۔ ناامیدی زندگی کے لئے خواب آور ہے۔ یہ قویٰ کی کمزوری کی دلیل ہے۔ ناامیدی کا سرمہ، جان یعنی روح کی آنکھ کو اندھا کردیتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے روز روشن اندھیری رات میں بدل جاتا ہے۔ اس کے افسوں سے زندگی کی صلاحیتیں مٹ جاتی ہیں۔ اور زندگی کے چشمے خشک ہوجاتے ہیں۔ ناامیدی غم کے ساتھ ایک چادر کے اندر سوئی رہتی ہے۔ غم رگ جان کے لئے نشتر کی مانند ہے۔

اے وہ شخص جو غم کے قیدخانے میں قید ہے۔ جناب رسول پاکؐ کے ارشاد، ''لاتحزن'' (غم نہ کھا) سے سبق حاصل کر۔ غیر اللہ کا خوف عمل کا دشمن اور قافلۂ حیات کا رہزن ہے۔ اس سے عزم محکم تشکیک کا شکار ہوجاتا ہے اور ہمت عالی تذبذب میں پڑ جاتی ہے۔ جب غیر اللہ کے خوف کا بیج تیری مٹی (بدن) میں بیٹھ جاتا ہے تو زندگی اپنی قوتوں کے اظہار سے باز رہتی ہے۔ اس کی فطرت کمزور اور لرزنے والے دل اور کانپنے والے ہاتھ کے مطابق ہوجاتی ہے۔ خوف اس کے پاؤں سے چلنے کی طاقت چرالیتا ہے اور اس کے دماغ سے اعلیٰ افکار چھین لیتا ہے۔ جب دشمن تجھے خوفزدہ دیکھتا ہے تو ایسے توڑ لیتا ہے جیسے کیاری سے پھول توڑا جاتا ہے۔ تیرے دل کے اندر جو بھی برائی پنہاں ہے۔ اگر تو غور سے دیکھے تو اس کی بنیاد خوف ہے۔ خوشامد، مکاری، کینہ، جھوٹ یہ سب برائیاں خوف ہی سے فروغ پاتی ہیں۔ خوف کا پیراہن جھوٹ اور ریاکاری کا پردہ ہے۔ اور اس کا دامن فتنے کے لئے آغوش مادر ہے۔ جو کوئی ہمت سے محکم نہیں وہ ناسازگار چیزوں سے بھی خوشی خوشی موافقت پیدا کرلیتا ہے۔ جس کسی نے حضور اکرمؐ کے ارشادات کی حقیقت سمجھ لی اس نے شرک کو خوف کے اندر

---

(۱) اسرار خودی۔ ۵۱۔

پوشیدہ دیکھ لیا ہے۔

مرگ را ساماں زقطع آرزوست　　زندگانی محکم از لاتقنطواست

ناامید از آرزوے پیہم است　　ناامیدی زندگانی را سم است

ناامیدی ہمچو گور افشاردت　　گرچہ الوندی، زپا می آردت

ناتوانی بندۂ احسان او　　نامرادی بستہ دامان او

زندگی را یاس خواب آور بود　　ایں دلیل سستئ عنصر بود

چشم جاں را سرمہ اش اعمیٰ کند　　روز روشن راشب یلدا کند

ازدمش میرد قوائے زندگی　　خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

خفتہ باغم درتہ چادر است　　غم رگ جاں را مثال نشتر است

اے کہ در زندان غم باشی اسیر　　از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر

بیم غیراللہ عمل را دشمن است　　کاروان زندگی را رہزن است

عزم محکم ممکنات اندیش ازو　　ہمت عالی تامل کیش ازو

تخم اوچوں درگلت خود رانشاد　　زندگی از خود نمائی باز ماند

فطرت اوتنگ تاب و سازگار　　بادل لرزان و دست رعشہ دار

دزدد ازپا طاقت رفتار را　　میر باید ازدماغ افکار را

دشمنت ترساں اگر بیند ترا　　ازخیابانت چوگل چیند ترا

ہرشر پنہاں کہ اندر قلب تست　　اصل او بیم است اگر بینی درست

لابہ ومکاری وکین و دروغ　　ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ

پردۂ زُور و ریا پیراہنش　　فتنہ راآغوش مادر دامنش

زانکہ ازہمت نباشد استوار　　می شود خوشنود با ناسازگار

ہرکہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را درخوف مضمر دیدہ است (۱)

اسی طرح "محاورہ تیر وشمشیر" میں اقبال تیر کی زبانی تلوار سے کہلاتے ہیں کہ میں جب کمان سے دشمن کے سینے کی جانب آتا ہوں تو پہلے اس کی سینے کے اندر غور سے دیکھتا ہوں۔ اگر اس کے اندر یاس وبیم کے اندیشوں سے فارغ قلب سلیم نہ ہوتو میں اسے اپنی نوک سے ٹکڑے ٹکڑے کردیتا ہوں اور خون کی پوشاک پہنادیتا ہوں۔ لیکن اگر اس کے اندر قلب مومن کی صفائی ہو۔ اور اس کا ظاہر نور باطن سے روشن ہوتو اس کی گرمی سے میری جان پانی پانی ہوکر میرے پیکان سے شبنم کی مانند ٹپک جاتی ہے۔گویا کہ عشق بے خوفی و بیباکی کا دوسرا نام ہے۔

از کماں آیم چوسوے سینہ من نیک می بینم بہ توے سینہ من
گرنباشد درمیاں قلب سلیم فارغ از اندیشہ ہاے یاس وبیم
چاک چاک ازنوک خود گردانمش نیمۂ از موج خوں پوشانمش
ورصفاے اوزقلب مومن است ظاہر ش روشن زنور باطن است
ازتف او آب گردد جان من
ہمچو شبنم می چکد پیکان من (۲)

اقبال کے "ذوق جمال" کے مطابق بے شک آرزوئے عشق ہی سے حسن مطلق تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اقبال نہ صرف فرد بلکہ پوری امت مسلمہ کو اس کی ترغیب دیتے ہیں کہ اے امت مسلمہ جس نے لامحدود سے جونظر نہیں آتا پیان وفا باندھا ہوا ہے اور اس طرح تو قید ساحل سے سیلاب کی مانند آزاد ہوچکی ہے حسن سے یہی پیان وفا، عشق ہے۔ اور حسن کا عشق سے پیان وفا بھی عشق ہے۔ گویا کہ حسن بھی عشق کرتا ہے۔ اور عشق بھی عشق کرتا ہے۔ اس باغ (دنیا) سے باہر شجر کی طرح اٹھ، اپنے دل کا تعلق غائب سے استوار کر اور کائنات سے جو حاضر ہے مسلسل جدوجہد کر۔ وجود کائنات (حاضر) غیب یعنی حسن مطلق کا مظہر ہے۔ اور کائنات کی تسخیر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دیباچہ بن جاتی ہے۔ ماسوا صرف اس لئے ہے کہ اس کی تسخیر کی جائے اور اس کے سینے کو انسانی جدوجہد کے تیر کا ہدف بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے کن کہنے سے ماسوا (کائنات)

(۱) رموز بیخودی۔۹۴۔۹۵۔۹۶۔ (۲) رموز بیخودی۔۹۷۔

وجود میں آیا تا کہ تیرے تیر کا پیکان آہرن کو چھوڑ دے ۔ دھاگہ گرہ درگرہ ہونا چاہئے تا کہ انہیں کھولنے میں زیادہ لطف آئے۔ اگر تو غنچہ ہے تو اپنے آپ کو چمن سے تعبیر کر۔ اگر تو شبنم ہے تو سورج کی گرمی سے اڑ جانے کی بجائے اس کی تسخیر کر۔ اگر تو کوئی اچھا کام کرسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس شیر برف (کائنات) کو اپنے دم گرم سے پگھلا دے۔ اس لئے کہ جس نے محسوسات کو تسخیر کرلیا وہ ایک ذرے سے جہاں تعمیر کرسکتا ہے۔ لیکن تمنا وعشق کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں کرسکتا۔

اے کہ بانا دیدہ پیماں بستہ ہمچو سیل ازقید ساحل رستہ
چوں نہال ازخاک ایں گلزار خیز دل بغائب بند وباحاضر ستیز
ہستئ حاضر کند تفسیر غیب می شود دیباچہ تفسیر غیب
ماسوا از بہر تفسیر است وبس سینہ اوعرصہ تیر است وبس
ازکن حق ماسوا شد آشکار تاشود پیکان تو سنداں گزار
رشتہ باید گرہ اندر گرہ تاشود لطف کشودن رافرہ
غنچہ ازخود چمن تعبیر کن شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن
ازتو می آید اگر کار شگرف ازدمے گرمے گداز ایں شیر برف
ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے ازذرۂ تعمیر کرد (۱)

عاشقانہ تڑپ وبے قراری ہی کی بناء پر موتی شوخی سے سمندر کی تہہ میں تڑپا، یہاں تک کہ اس نے صدف کا گریبان پھاڑ ڈالا۔

او زشوخی درتہ قلزم تپید تاگریبان صدف را بردرید (۲)

عشق باغوں کو بادبہاری عطا کرتا ہے اور گلزاروں میں ستاروں کی مانند سفید غنچے پیدا کرتا ہے۔ آفتاب عشق کی شعاع سمندر چیر جاتی ہے۔ وہ اس کی تہہ میں مچھلی کو دیدۂ راہ بیں عطا کرتی ہے۔ عشق کی نظر میں عقاب کوئی شے نہیں۔ وہ تدرو کو بازوں سے لڑا دیتا ہے۔ ہمارے دل نے اپنی بہت حفاظت کی مگر عشق نے اپنی گھات سے اس پر حملہ کردیا۔ گل لالہ

(۱) رموز بیخودی۔ ۱۴۱۔ (۲) پیام مشرق۔ ۱۶۔

کے پتوں میں عشق کی رنگ آمیزی ہے۔ ہماری جان کے اندر عشق کا شور ہے اگر تو اس دنیا کو چیرے، تو تجھے اس کے اندر عشق ہی کی خونریزی نظر آئے۔

باغاں بادِ فروردیں دہد عشق ‏ ‏ براغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق

شعاع مہر اُوقلزم شگاف است ‏ ‏ بماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

عقاباں را بہاے کم نہد عشق ‏ ‏ تدرواں را ببازاں سر دہد عشق

نگہ دار د دل ما خویشتن را ‏ ‏ ولیکن از کمینش بر جہد عشق

بہ برگ لالہ رنگ آمیزیء عشق ‏ ‏ بجان ما بلا انگیزیء عشق

اگر ایں خاک داں را واشگافی ‏ ‏ درونش بنگری خونریزیء عشق (۱)

اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ صبا کی مانند گل لالہ کے اندر داخل ہوکر دیکھا جاسکتا ہے کہ پھول کے پردے میں کون محمل نشیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ حسن مطلق ہی ہے۔ عشق کی ایک ہی گرم پھونک سے غنچے کا راز کھولا جاسکتا ہے۔

درون لالہ گزر چوں صبا توانی کرد ‏ ‏ بیک نفس گرۂ غنچہ توانی کرد (۲)

جب میں نے حقیقت کی نگاہ سے لالہ کے اندر دیکھا تو اسے ''حسن قدیم'' کے حضور میں ہمہ ذوق وشوق اور ہمہ آہ ونالہ پایا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مظاہر بذات خود حسن مطلق کے گرویدہ ہیں لیکن تجزیاتی فلسفی مظاہر ہی کو حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں۔

بہ نگاہ آشنائے چو درون لالہ دیدم ‏ ‏ ہمہ ذوق وشوق دیدم ہمہ آہ ونالہ دیدم (۳)

دراصل اقبال کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو کائنات کے سینے میں داخل نہ ہوسکے تو پھر نگاہ کو اسے دیکھنے کے لئے چھوڑ دینا ستم ہے۔ اس لئے کہ معروضی وموضوعی فلسفیوں کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ انہوں نے کائنات کی حقیقت کو جانے بغیر اسے تخلیق بالحق سمجھنے کی بجائے حقیقت اور واہمے وسراب کا نام دیا۔ اگر وہ کائنات کے سینے میں داخل ہوکر دیکھتے تو ایسا ہرگز نہ کہتے۔

اگر بسینۂ ایں کائنات در نروی ‏ ‏ نگاہ رابہ تماشا گزاشتن ستم است (۴)

---

(۱) ایضاً۔ ۳۶۔ لالہء طور۔ (۲) زبور عجم۔ ۶۳۔ (۳) زبور عجم۔ ۸۸۔ (۴) زبور عجم۔ ۸۸

اپنی نگاہ کو خورشید سحر کی مانند روشن کیا جاسکتا ہے اور پھر اس کی مدد سے اس خاک سیاہ، مراد دنیا یا انسان کے اپنے بدن کو اللہ تعالیٰ کے جمال کی جلوہ گاہ بنایا جاسکتا ہے۔اپنی نگاہ کو سوئی کی نوک کی طرح تیز بنالے۔ پھر اس کی مدد سے ہر آئینے یعنی مظہر کے اندر راستہ بنایا جاسکتا ہے۔ اور اندر داخل ہوکر حسن ازل کی معرفت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اگر تیرے اندر دیکھنے کی تاب ہے تو دونوں جہانوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ پھر تیرے لئے نہ یہ دنیا پردہ رہے گی، نہ دوسری دنیا۔

چو خورشید سحر پیدانگاہ می تواں کردن ہمیں خاک سیہ را جلوہ گاہے می تواں کردن

نگاہ خویش را ازنوک سوزن تیز ترکردن چو جوہر دردلِ آئینہ را ہے می تواں کردن

نہ ایں عالم حجاب اورا نہ آں عالم نقاب اورا اگر تاب نظر داری نگاہے می تواں کردن (۱)

اقبال کا ذوق جمال انہیں ''حسن مطلق'' کی آرزو یا عشق میں خوشبو کی مانند پریشاں رکھتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں مجھے معلوم نہیں میں کیا چاہتا ہوں، کسے تلاش کررہا ہوں، میری آرزو پوری ہو یا نہ ہو، مگر آرزو کے سوز وساز پر مرتا ہوں:-

دریں گلشن پریشاں مثل بویم نہ می دانم چہ می خواہم جہ جویم

برآید آرزو یا برنیاید شہید سوز و ساز آرزویم (۲)

اقبال کے ذوق جمال کے مطابق عشق ہی وہ جذبہ اولیٰ ہے جو عاشق کو محبوب حقیقی کی معرفت سے سرفراز فرماتا ہے چنانچہ اس ضمن میں کہتے ہیں کہ عشق شورانگیز نے جو بھی راستہ اختیار کیا، اس راستے نے اسے آپ کی گلی تک پہنچادیا۔ عشق کو اپنی تلاش پر بہت ناز ہے کہ وہ بالاخر ''حسن مطلق'' تک پہنچ ہی جاتا ہے۔

عشق شورانگیز را ہر جادہ درکوے توبرد برتلاش خود چہ می نازدکہ رہ سوے توبرد ! (۳)

عشق ایک شاہراہ اعظم ہے جو سیدھی ''حسن مطلق'' تک جاپہنچتی ہے اور اقبال کے نزدیک مذہب دعا وعبادات مسافت عشق کے راہی کا زاد راہ ہیں۔ اقبال صوم وصلوٰۃ اور دوسری عبادات کو بھی دعا ہی کہتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ دعا کے ذریعے سے ہی معرفت حق حاصل کی جاسکتی ہے۔

''حقیقت مطلقہ اپنی کنہ میں محض روح ہے .....مذہب کے عزائم فلسفہ سے بلند تر ہیں۔ فلسفہ عبارت ہے حقائق کے عقلی ادراک سے لہٰذا وہ کسی ایسے تصور سے آگے نہیں بڑھتا، جو ہمارے محسوسات ومدرکات کی گوناگوں دنیا کو ایک نظام میں

---

(۱) زبور عجم۔۱۰۶۔ (۲) پیام مشرق۔۲۶۔ ''لالہ طور''۔ (۳) زبور عجم۔۵۔

مدغم کردے۔ وہ گویا دور ہی سے حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ برعکس اس کے مذہب اس سے قرب واتصال کا آرزومند ہے۔ ایک نظریہ ہے دوسرا حقیقت، تقرب واتصال۔ لیکن یہ تقرب واتصال جب ہی ممکن ہے کہ فکر اپنے حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ جس میں اسے کامیابی ہوگی تو اس ذہنی روش کی بدولت جسے مذہب نے دعا سے تعبیر کیا ہے اور جو پیغمبرؐ اسلام صلعم کے لب مبارک پر تادم آخر موجود تھی'' (۱)

تاک خویش از گریہ ہائے نیم شب سیراب دار کز درون او شعاع آفتاب آید بروں (۲)

پھر کہتے ہیں میں نے اس گنبد دربستہ سے اوپر نکل جانے کا راستہ پیدا کرلیا ہے۔ کیونکہ آہ سحرگاہ یعنی دعائے سحر کی پرواز فکر سے بلند تر ہے۔

بروں زیں گنبد دربستہ پیدا کردہ ام راہے کہ از اندیشہ برتر می پرد آہ سحر گاہے (۳)

زاشک صبحگاہی زندگی را برگ وساز آور شود کشت تو ویراں تانہ ریزی دانہ پے درپے (۴)

اس کے علاوہ اہل صدق وصفا کی صحبت بھی محبوب حقیقی کی معرفت کا ایک وسیلہ بن سکتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں اگر تو محبوب کی نگہ محرمانہ کا خواہاں ہے تو اہل محبت کی صحبت اختیار کر۔

یکے بدامن مردان آشنا آویز زیار اگر نگہ محرمانہ می خواہی (۵)

عشق وآرزو ایک بات ہے۔ اگر دل میں عشق یا آرزو کی چنگاری ہو تو جلوہ دوست یعنی حسن مطلق کا دیدار کیا جاسکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں یہ گمان نہ کر کہ تیرے نصیب میں جلوہ دوست نہیں، بلکہ ابھی تیرے سینے میں آرزو ناپختہ ہے۔

گماں مبر کہ نصیب تو نیست جلوۂ دوست درون سینہ ہنوز آرزوے تو خام است! (۶)

تجزیاتی فلسفیوں کے دل میں عشق نہیں ہوتا اس لئے وہ کہتے ہیں کہ مجاز کے پس پردہ کوئی حقیقت نہیں۔

دراصل اقبال بنیادی طور پر زندگی ہی کو حسن وعشق کا نام دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یا رب زندگی میں کیا لذت ہے، ہر ذرے کا دل شوق نمود سے جوش میں ہے۔ جب کلی شاخ کو پھاڑ کر سامنے آتی ہے تو ذوق وجود کی تسکین سے مسکرا رہی ہوتی ہے۔

چہ لذت یا رب اندر ہست وبود است دل ہرذرہ درجوش نمود است

---

(۱) تشکیل جدید الہیات اسلامیہ۔ ۹۳۔ ۹۴۔ محمد اقبال۔ ترجمہ سید نذیر نیازی۔ (۲) زبور عجم۔ ۹۷۔ (۳) ایضاً۔ ۱۰۰۔
(۴) ایضاً۔ ۱۰۷۔ (۵) زبور عجم۔ ۶۵۔ (۶) ایضاً۔ ۲۶۔

شگافد شاخ راچوں غنچہء گل تبسم ریز ازذوق وجود است (۱)

اسی مضمون کو ایک اور انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ خاکی ہے اور اسے خاک ہی میں دفن کردیا جاتا ہے، کہنے لگا جب دانہ خاک کو پھاڑتا ہے تو گل تر بن جاتا ہے۔

گفتم کہ خاکی است وبخاکش ہمی دہند گفتا چودانہ خاک شگافد گل تراست (۲)

سنا ہے عدم میں پروانہ کہتا تھا مجھے ایک لمحے کے لئے زندگی کی چمک اور حرارت عطا کردیں، صبح کے وقت بیشک میری راکھ بکھیر دینا۔ بس ایک رات کا سوزو ساز مل جائے۔ گویا کہ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ عشق کا سوز و گداز ایک ایسا بیش بہا سرمایا ہے کہ اگر ایک رات کے لئے بھی میسر آجائے تو غنیمت ہے۔

شنیدم در عدم پروانہ می گفت دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را و لیکن سوزو سازیک شبم بخش (۳)

جبرئیل کو میری طرف سے سلام دو کہ مجھے تم جیسا پیکر نوری تو عطا نہیں ہوا۔ لیکن ذرا ہم خاکیوں کی چمک دمک بھی دیکھ! حسن مطلق سے دوری کا جو سوز و لطف اور آرزو کی تپش ہمیں ملی ہے، نوری اس سے محروم ہیں۔

بگو جبریل را از من پیامے مرا آں پیکر نوری ندا دند
ولے تاب و تب ماخاکیاں بیں بنوری ذوق مہجوری ندادند (۴)

حسن و عشق کی کشمکش میں ساحل پر بزم آراستہ نہ ہو۔ یہاں زندگی کی نوا مدہم ہے۔ دریا میں کود اور اس کی موجوں سے زور آزمائی کر، حیات جاوداں کشمکش میں ہے۔

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز حیات جاوداں اندر ستیزاست (۵)
انجام ہے اس خرام کا حسن آغاز ہے عشق انتہا حسن (۶)

اقبال پھر کہتے ہیں کہ میں سراپا معنی سربستہ ہوں مجھے حرف بافوں کی نگاہ نہیں پاسکتی۔ نہ مجھے بااختیار کہا جاسکتا ہے نہ مجبور میں ایسی خاک زندہ ہوں جو ہر دم تغیر پذیر ہے۔

---

(۱) پیام مشرق۔ ۳۷۔ (۲) ایضاً۔ ۱۳۵۔ "زندگی"۔ (۳) پیام مشرق۔ ۳۲۔ (۴) ایضاً۔ ۴۰۔ (۵) ایضاً۔ ۴۵۔
(۶) بانگ درا۔ ۱۱۹۔ "چاند اور تارے"۔

سراپا معنیء سربستہ ام من نگاہ حرف بافاں برنتابم
نہ مختارم تواں گفتن ، نہ مجبور کہ خاک زندہ ام ، در انقلا بم (۱)

حسن و عشق کی تب و تاب میں اقبال ہمیشہ ہمیشہ کی تمنا و جستجو کے قائل دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ اس سلسلے میں راستے کے مصائب و تکالیف میں لطف محسوس کرتے ہیں ۔ اس لئے منزل پہ پہنچنا ہی نہیں چاہتے ۔ کیوں کہ

تکمل عشق ہجر و فراق میں ہے ۔ منزل پہ پہنچ کر تو انسان ہاتھ پاؤں کاٹ کر بیٹھ رہتا ہے ۔ جبکہ اقبال کا پیغام یہ ہے ، انسان کو چاہیئے کہ اوج ثریا کو بھی اپنی منزل نہ بنائے اس سے بھی آگے ، اس سے بھی آگے اور اس سے بھی آگے پرواز کرتا چلا جائے ، چنانچہ کہتے ہیں ، آنکھوں میں اس کا تصور خوب ہے ، بڑھتا ہوا غم اور گھلتی ہوئی جان کیا خوب ہے ۔ مجھے ایک صاحب دل نے یہ نکتہ سکھایا ، پیچیدہ راہ کا سفر منزل پر پہنچ جانے سے بہتر ہے ۔

خیال او درون دیدہ خوشتر غمش افزود ، جاں کا ہیدہ خوشتر
مرا صاحبدلے ایں نکتہ آموخت زمنزل جادۂ پیچیدہ خوشتر (۲)

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ! ہجر میں لذت طلب !
گرمئی آرزو فراق ! شورش ہائے و ہو فراق!
موج کی جستجو فراق ! قطرہ کی آبرو فراق! (۳)

میں نے اس حریم (کائنات) کے پردے ہٹا دیئے ہیں وصل سے ڈرتا ہوں اور فراق میں اہ وزاری کرتا ہوں ۔ اگر وصل سے شوق ختم ہو جائے ، تو خدا اس سے بچائے ۔ اس سے بے اثر اہ و فغاں کہیں بہتر ہے ۔ اگر راہرو کو فراغت راس آجائے تو پھر وہ راستہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا ۔ میں وہ دل رکھتا ہوں جو ذوق نظر کے سبب ہر لحہ جہان تازہ کا طلب گار رہتا ہے ۔

برکشیدم پردہ ہائے ایں وثاق ترسم از وصل و بنالم از فراق!
وصل اگر پایان شوق است الحذر اے خنک اہ و فغان بے اثر!

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۴۵ ۔ (۲) ایضاً ۔ ۴۹ ۔ (۳) بال جبریل ۔ ۱۱۴ ۔ "ذوق و شوق" ۔

راہ رواز جادہ کم گیردسراغ گر بجانش سازگار آید فراغ
آں دلے دارم کہ از ذوق نظر ھر زماں خواہد جہانے تازہ ترا (۱)

فراق ہماری جان کو راس آتا ہے کیوں کہ اس سے ہماری آتش شوق اور بڑھ جاتی ہے۔

آتش ما را بیفزاید فراق جان مارا سازگار آید فراق! (۲)

اسی طرح پھر کہتے ہیں ''حسن مطلق'' سے جدائی نے میرے شوق و محبت کی آنکھیں روشن کر دیں۔ جدائی نے عشق و آرزو کی جستجو اور بڑھا دی۔ مجھے معلوم نہیں کہ تمہارا کیا حال ہے۔ مگر مجھے تو اس دنیا نے خود آگاہ بنا دیا۔

جدائی شوق را روشن بسر کرد جدائی شوق را جوینده تر کرد
نمید انم کہ احوال توچون است مرا ایں آب و گل از من خبر کرد (۳)

کس قدر لذت کشود عقدۂ مشکل میں ہے
لطف صد حاصل ہماری سعئی بے حاصل میں ہے (۴)

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں (۵)
ہمیشہ صورت بادسحر آوارہ رہتا ہوں محبت میں ہے منزل سے بھی خوشتر جادہ پیمائی (۶)
حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوے محبت کو مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی (۷)

جدائی آدم خاکی کو نگاہ عطا کرتی ہے۔ یہ تنکے کو پہاڑ کی سطوت عطا کرتی ہے۔ جدائی عشق و آرزو پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ جدائی عاشقوں کو راس آتی ہے۔ اگر ہم زندہ ہیں تو عشق وتمنا کی درمندی کے سبب زندہ ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے ہمیں پائندگی حاصل ہے۔ میں اور وہ کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں۔ میرا اوراس کا الگ الگ وجود ہمارے دوام کا ثبوت ہے۔ خلوت اور جلوت دونوں جگہ ذات باری تعالیٰ کا نور ہے۔ انجمن میں ہونا ہی زندگی ہے۔ انجمن کے بغیر محبت صاحب نظر نہیں ہوسکتی۔ نہ انجمن کے بغیر محبت اپنے آپ کو دیکھ سکتی ہے۔

ہماری بزم میں اس کی تجلیات ہیں۔ دیکھ جہاں موجود نہیں، صرف وہی موجود ہے۔ دیکھ یہ درودیوار، یہ محل اور شہر نہیں ہیں۔ یہاں اس کے اور ہمارے سوائے اور کچھ نہیں کبھی وہ اپنے آپ کو ہم سے بیگانہ رکھتا ہے اور کبھی ہمیں ساز کی

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۸۸۔ (۲) ایضاً۔ ۱۲۰۔ (۳) ارمغان حجاز۔ ۱۲۵۔ (۴) بانگ درا۔ ۴۹۔ (۵) ایضاً۔ ۱۰۵۔
(۶) ایضاً۔ ۱۵۴۔ (۷) بال جبریل۔ ۱۴۔ ''آفتاب صبح''

طرح نوازتا ہے۔

کبھی ہم پتھر سے اس کی تصویر تراشتے ہیں، اور کبھی اسے دیکھے بغیر سجدے کرتے ہیں ۔کبھی ہم فطرت کے ہر پردے کو چاک کر دیتے ہیں ۔ اور دوست کے جمال کا بے باکانہ نظارہ کرتے ہیں ۔ مشت خاک کے سر میں کیا سودا سمایا ہے۔ اسی سودا سے تو اس کا اندرون روشن ہے ۔ یہ کیسا پیارا سودا ہے کہ انسان اس کے فراق میں نالہ وفریاد بھی کرتا ہے لیکن یہی فراق اسے ترقی کے مدارج بھی طے کراتا ہے فراق نے اسے اتنا صاحب نظر کر دیا کہ اس نے اپنے فراق کی رات کو اپنے لئے سحر بنا لیا۔انسانی خودی کو امتحان ہجر میں ڈال کر دردمندی عطا کی اور اس طرح اس کے پرانے غم کو عیش جواں بنا دیا۔

جدائی خاک ۔ را بخشد نگاہے | دہد سرمایہ کوہے بکاہے
جدائی عشق را آئینہ داراست | جدائی عاشقاں را سازگار است
اگر مازندہ ایم از دردمندی است | و گرپائندہ ایم از درد مندی است
من داد چیست؟ اسرار الٰہی است | من داد بردوامِ ما گواہی است
بخلوت ہم بجلوت نور ذات است | میان انجمن بودن حیات است
محبت دیدہ ور بے انجمن نیست | محبت خود نگر بے انجمن نیست
بربزم ما تجلی ہاست بنگر | جہاں ناپید و اُوپیداست بنگر
درودیوار و شہرو کاخ و کونیست | کہ اینجا ہیچکس جزما و او نیست
گہے خود را زما بیگانہ ساز د | گہے مارا چو سازے می نوازد
گہے از سنگ تصویرش تراشم | گہے نادیدہ بروے سجدہ پاشم
گہے ہر پردۂ فطرت دریدم | جمال یار بے باکانہ دیدم
چہ سودا در سر ایں مشت خاک است؟ | ازیں سودا درونش تابناک است
چہ خوش سودا کہ نالد از فراقش | و لیکن ہم ببالد از فراقش
فراق او چناں صاحب نظر کرد | کہ شام خویش را برخود سحر کرد

خودی را دردمند امتحاں ساخت غم دیرینہ را عیش جواں ساخت (۱)

''حسن مطلق'' سے جدائی میں انسان کے لئے جو لذت ہے وہ وصل میں نہیں اسی لئے تو اقبال کے ہاں حضرت جبرئیلؑ بھی انسان کی سی فرقت اور اہ وفغاں کی آرزو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

منزل کا خیال چھوڑ اور دائمی سفر اختیار کر، البتہ سفر کے دوران میں اپنی نگاہ کو مہرومہ کی طرح پاک رکھ۔ عقل و دیں کا سرمایہ دوسروں کے لئے رہنے دے۔ ہاں غم عشق ہاتھ آجائے تو اسے سنبھال کے رکھ۔ عشق کی یہی حرکت وعمل اور آرزو وجستجو اقبال کو جاوید نامہ میں حواران خلد کے پاس بھی نہیں رکنے دیتی اور پیر رومیؒ کے ساتھ وہاں سے بھی آگے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا ذکر آئندہ حقیقت ومجاز کے زمرے میں مناسب مقام پر کروں گا۔ بہر حال یہاں:۔

دل از منزل تہی کن ، پابرہ دار نگہ را پاک مثل مہرو مہ دار
متاع عقل و دیں باذیگراں بخش غم عشق ار بدست افتد نگہ دار (۲)

ہمارے سوز ناتمام ہی سے ہمارا دوام ہے۔ مچھلی کی مانند ہم سوائے تپش وحرکت کے اور کچھ نہیں رکھتے ساحل تلاش نہ کر، کیونکہ ساحل کی آغوش میں ایک دم کی تڑپ ہے اور پھر ہمیشہ کی موت جبکہ حسن وعشق کو موت زیب نہیں دیتی۔

دوام ما زسوز نا تمام است چوماہی جز تپش برما حرام است
مجو ساحل کہ درآغوش ساحل تپید یک دم و مرگ دوام است (۳)

تو ابھی نہیں سمجھتا کہ دائمی وصال سے شوق کی موت ہے۔ حیات دوام کیا ہے؟ محبت میں جلتے رہنا۔

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد زوصل چیست حیات دوام ؟ سوختن ناتمام (۴)

اپنی ایک نظم ''جدائی'' میں اقبال کہتے ہیں کہ انسان کے علاوہ دوسرے موجودات کو ''حسن مطلق'' کی حضوری نصیب ہے۔ اس لئے ان میں تڑپ اور عشق کی آرزو نہیں پائی جاتی۔ یہ انسان خوش نصیب ہے کہ اسے غم جدائی سے سرفراز کیا گیا ہے۔ جس کی بدولت وہ حسن مطلق سے عشق کرتا ہے۔

سورج بنتا ہے تارزر سے دنیا کے لئے ردائے نوری!
عالم ہے خموش و مست گویا ہر شے کو نصیب ہے حضوری!

---

(۱) زبور عجم۔ ۱۵۸۔ (۲) پیام مشرق۔ ۵۵۔ (۳) ایضاً۔ ۶۴۔ (۴) ایضاً۔ ۸۷۔

دریا ، کہسار ، چاند ، تارے کیا جانیں فراق و ناصبوری!
شایاں ہے مجھے غم جدائی
یہ خاک ہے محرم خدائی (۱)

یوں لگتا ہے کہ اقبال عشق کو نہ صرف حسن کا حاصل بلکہ حسن کا خالق بھی قرار دیتے ہیں۔ عشق وہ جستجو، تمنا اور آرزو ہے کہ موجودہ آدم سے بھی زیادہ حسین وجمیل انسان تخلیق کر سکتا ہے۔ اس لئے اقبال بیانگ دھل کہہ رہے ہیں کہ، اے عشق، اے ہمارے دل کے راز آ! اے ہماری کھیتی، اے ہمارے حاصل آ! یہ آدمِ خاکی پرانا ہو چکا ہے۔ ہماری مٹی سے نیا آدم بنا۔

بیا اے عشق ، اے رمز دل ما بیا اے کشت ما ، اے حاصل ما
کہن گشتند ایں خاکی نہاداں دگر آدم بنا کن از گل ما (۲)

دل کیا ہے؟ بس عشق ہے جو منزل کو پسند نہیں کرتا۔ اسے یہ بدن جو عناصر اربعہ سے بنا ہے۔ پسند نہیں۔ یہ مت سمجھو کہ دل بدن کے اندر خوش ہے۔ کیوں۔ کہ یہ ایسا دریا ہے جو ساحل کے اندر نہیں سماتا، حسن مطلق میں جا ملتا ہے۔

بمنزل رہرودل در نسازد بآب و آتش و گل درنسازد
نہ پنداری کہ درتن آرمیداست کہ ایں دریا بسا حل درنسازد (۳)

اقبال وہ عاشق بےقرار ہے کہ جس کا دل آرزو سے بے چین ہے۔ کہتے ہیں میرے سینے میں ہا و ہو بپا ہے۔ اے ہمنشیں تو مجھ سے ہم کلامی کی توقع نہ رکھ میں تو ہر وقت اپنے آپ سے گفتگو میں مشغول ہوں۔

دل من بے قرار آرزوے درون سینۂ من ہاے و ہوے
سخن اے ہمنشیں ازمن چہ خواہی کہ من باخویش دارم گفتگوے (۴)

خوش نصیب ہے وہ شخص جو بیقرار جان رکھتا ہے۔ یعنی عشق کرتا ہے، زمانے کے گھوڑے پر سوار ہے۔ ایسے ہی فرد کی قامت پر زندگی کی قبا موزوں ہے کیوں کہ وہ نئی نئی ایجادات اور نئی دریافتیں کرتا ہے۔

---

(۱) بال جبریل۔۱۶۱۔ (۲) پیامِ مشرق۔۵۵۔ (۳) ایضاً۔۵۹۔ (۴) ایضاً۔۶۳۔

خنک انساں کہ جانش بیقرار است سوار راہوار روزگار است

قبائے زندگی برقامتش راست کہ او نو آفرین و تازہ کار است (۱)

کرمک شب تاب یعنی جگنو ایک حقیر ذرہ تھا۔ لیکن جب اس نے متاع سانس حاصل کی تو شوق (سوز عشق و آرزو) نے اسے اس قدر جلایا کہ اس نے طاقت پرواز حاصل کر لی اور سوز عشق نے اسے نور سا حسن عنایت کیا گویا عشق کی بدولت نور کی صورت میں جگنو نے حسن شب تاب پالیا۔ جس سے وہ تیرہ و تار رات کو بھی روشن کر لیتا ہے۔

یک ذرۂ بے مایہ متاع نفس اندوخت شوق ایں قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت

پہنائے شب افروخت (۲)

اقبال کہتے ہیں رات کو روشن و منور کرنے والے جگنو کی مسلسل پرواز سوز عشق اور واردات قلبی کی وجہ سے ہے۔ مسلسل حرکت اور آرزو اسے "حسن مطلق" سے غیب و حضور یعنی معرفت کا رتبہ عطا کرتی ہے۔ جگنو ایک لمحہ نظر آتا ہے اور دوسرے ہی لمحے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ گویا کبھی تو عالم مجاز میں ہوتا ہے اور کبھی حقیقت میں مدغم ہو جاتا ہے۔ جب مجاز میں آتا ہے تو دکھائی دینے لگتا ہے۔ جب حقیقت سے ہمکنار ہوتا ہے، تو حقیقت کی طرح ہماری ظاہری آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے۔ غیب و شہود کی یہ شان جگنو نے مسلسل تڑپ اور تمنا کے طفیل حاصل کی ہے۔

اے کرمک شب تاب سراپاے تو نوراست پرواز تو یک سلسلۂ غیب و حضور است (۳)

اقبال جگنو سے کہتے ہیں، ایک ہم ہیں کہ اگر چہ تیری طرح خاک سے پیدا ہوئے ہیں، حقیقت کو دیکھیں تو بھی تڑپتے ہیں، نہ دیکھیں تو بھی تڑپتے ہیں، مگر کہیں پہنچتے نہیں، جواباً جگنو کہتا ہے، میں تم سے ایک بات کہتا ہوں جو پختہ اور بامعنی ہے، منزل گم گشتہ کی بات نہ کر اپنا سفر جاری رکھ اور اس جلوۂ حقیقت کو ہمیشہ مدنظر رکھ۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ تب و تاب جاودانہ ہو تو "حسن مطلق" کی معرفت ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔

مائم کہ مانند تو از خاک دمیدم دیدیم تپیدیم ، ندیدیم تپیدیم

جائے نرسیدم؟

گویم سخن پختہ و پروردہ و تہ دار از منزل گم گشتہ مگو ، پاے برہ دار

---

(۱) پیام مشرق۔۹۶۔ (۲)۔ پیام مشرق۔۱۰۶۔ (۳) ایضاً۔۱۰۷۔

ایں جلوہ نگہ دار (۱)

حرکت وعمل اور عشق کی بدولت انسان موتی بن کر چاند ستاروں سے زیادہ تابدار ہو کر دریائے معرفت کی آغوش میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔

چو جو ہر درخش قلزم بزی فروزاں تر از ماہ و انجم بزی (۲)

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا (۳)

کل یوم ھو فی الشان کے مصداق حسن حرکی ہے۔ اس لئے عشق بھی حرکی ہے۔ ہم جیسے لوگ جو جستجو میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم نے علم میں روح پھونک کر اسے عمل بنا لیا ہے۔

ما کہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم علم را جاں بدمیدیم و عمل ساختہ ایم (۴)

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام درنسازد دل ناصبور دارم چوصبا بہ لالہ زارے (۵)

لذت پرواز مجھے آشیانے میں نہیں بیٹھنے دیتی کبھی میں شاخ گل پر ہوتا ہوں اور کبھی ندی کے کنارے۔ گویا کہ ہمیں بھی پرندے کی طرح حسن کی جستجو میں بے قرار رہنا چاہئے۔

بہ آشیاں نہ نشینم ز لذت پرواز گہے بہ شاخ گلم ، گاہ برلب جویم (۶)

گویا کہ شاخ میں بھی حسن مطلق ہے، پھول میں بھی اور اس ندی میں بھی وہی ہے جس سے شاخ و پھول و پتوں کو پانی مل رہا ہے۔ ہر جگہ ہر چیز میں حسن مطلق ہے۔ اس لئے:۔

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں یا معدن وکوہ و دشت و دریا دیکھوں

ہرسو تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں (میر انیس)

اقبال مزید کہتے ہیں کہ میرا دل ابھی تک جستجو کا تقاضا کر رہا ہے کہ حسن مطلق کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ میں نے عشق جیسے بال سے باریک راستے پر قدم رکھا ہے۔ عشق ہی بتا سکتا ہے کہ حسن کیا ہے؟

دلم ہنوز تقاضائے جستجو دارد قدم بہ جادۂ باریک تر زمو زدہ ام (۷)

عشق وہ تحرک و سراسیمہ لگن ہے کہ ملاح طوفانی سمندر میں وہ خطرہ محسوس نہیں کرتا جو عشق کو ساحل پر سلامتی سے

---

(۱) پیام مشرق۔۱۰۸۔ (۲) ایضاً۔۱۱۳۔ ''قطرہ آب''۔ (۳) بانگِ درا۔۱۹۰۔شمع اور شاعر۔ (۴) پیام مشرق۔۱۲۴۔جہانِ عمل۔
(۵) پیامِ مشرق۔ (۶) پیامِ مشرق۔۱۴۸۔ (۷) پیامِ مشرق۔۲۱۹۔

بیٹھ رہنے میں نظر آتا ہے۔ حرکت کے بغیر عشق عشق نہیں رہتا۔ گویا اقبال کے نزدیک عشق بڑے سے بڑے خطرے میں بھی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔

نکشد سفینہ کس بہ یمے بلند موجے خطرے کہ عشق بیند بسلامت کنارہ! (۱)

میں رات کے حادثات سے بالکل نہیں ڈرتا، رات کیسی بھی ہو بالآخر ستاروں کی گردش اسے سحر میں تبدیل کر ہی دیتی ہے۔

من ہیچ نمی ترسم از حادثہ ء شب ہا! شب ہا کہ سحر گردد از گردش کوکب ہا! (۲)

پھر کہتے ہیں ہم خاک مردہ سے پیدا ہوئے اور دل زندہ کے سزاوار بن گئے۔ کہاں دل زندہ کی تڑپ اور کہاں ہم! بس اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔

مردہ خاکیم و سزا وار دل زندہ شدیم! ایں دل زندہ و ما! کار خدا سازے ہست (۳)

میری خاک سے شرارے اٹھ رہے ہیں۔ انہیں کہاں گراؤں، کسے جلاؤں؟ میری جان میں آپ نے محبت کا سوز بھر دیا۔ کیا کر دیا۔

شر ر از خاک من خیزد، کجا ریزم، کرا سوزم
غلط کردی کہ در جانم فگندی سوز مشتاقی (۴)

عاشق ہونے کے ناطے جو راہ، میں طے کر لیتا ہوں۔ پھر اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتا۔ زمانے کی طرف ہر روز نئی صبح کا متلاشی رہتا ہوں۔ دریائے عشق ہی میری کشتی ہے۔ دریائے عشق ہی میرا ساحل ہے۔ نہ مجھے سفینے کا غم ہے اور نہ کنارے کی خواہش۔

نکنم دگر نگاہے بہ رہے کہ طے نمودم بسراغ صبح فردا روش زمانہ دارم
یم عشق کشتی من، یم عشق ساحل من نہ غم سفینہ دارم، نہ سر کرانہ دارم (۵)

اور جو لوگ مسافت عشق میں خام ہوتے ہیں۔ موجوں کے ڈر سے کنارے ہی کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کی کشتی کو طوفان میں ڈال دیا جائے تو وہ بے باک و نڈر بن جاتے ہیں۔

---

(۱) زبور عجم۔۱۵۔ (۲) ایضاً۔۱۱۷۔ (۳) ایضاً۔۱۲۔ (۴) ایضاً۔۲۸۔ (۵) زبور عجم۔۲۱۔

یکے سفینہ ایں خام را بطوفاں دہ — زترس موج نگاہم بساحل است ہنوز (۱)

اس سلسلے میں اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اس سے ہر لحہ ایک نئی جولاں گاہ کا متمنی رہتا ہوں۔ یہاں تک کہ مجھے جنون بخشنے والا کہہ دے کہ اب اور کوئی ویرانہ باقی نہیں رہا۔ یعنی ہر کہیں "حسن مطلق" کی تلاش و جستجو میں رہتا ہوں۔ کسی مقام کو منزل نہیں بناتا۔

ہر زماں یک تازہ جولاں گاہ خواہم ازو
تاجنوں فرمائے من گوید دگر ویرانہ نیست (۲)

پھر کہتے ہیں اگر چہ میں جانتا ہوں کہ منزل کا خیال میری اپنی ایجاد ہے۔ لیکن سفر چھوڑ کے بیٹھ رہنا ہمت مردانہ کے منافی ہے۔

گرچہ میدانم خیال منزل ایجاد من است — درسفر از پانشستن ہمت مردانہ نیست (۳)

اے مسافر! قیام سے روح مر جاتی ہے۔ اور پرواز مدام سے روح اور زندہ ہوتی ہے:۔

اے مسافر جاں بمیرد از مقام — زندہ تر گردد ز پرواز مدام (۴)

اس لئے:۔

ہمیشہ صورت بادِ سحر آوارہ رہتا ہوں — محبت میں ہے منزل سے بھی خوشتر جادہ پیمائی (۵)

چنانچہ اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ تڑپنا اور مقصود تک نہ پہنچنا، کیا لطف رکھتا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جو ابھی محمل کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

تپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد — خوشاکسے کہ بدنبال محمل است ہنوز (۶)

اس سفر و ساز اور تپش آرزو کے مضمون کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں ۔ مجھے گھر کی خواہش ہے نہ منزل کی ۔ ہمیشہ کا مسافر اور ہر شہر میں اجنبی ہوں۔

ہوائے خانہ و منزل ندارم — سرراہم غریب ہر دیارم (۷)

گویا کہ:۔

تیری بستی سے میں نکلا ہوں جلا کر خیمہ — اپنے دیوانے کی تم نقل مکانی دیکھو

---

(۱) زبور عجم ۔ ۳۷ ۔ (۲) ایضاً ۔ ۲۶ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۲۶ ۔ (۴) جاوید نامہ ۔ ۳۱ ۔
(۵) بانگ درا ۔ ۱۵۴ ۔ (۶) زبور عجم ۔ ۳۷ ۔ (۷) زبور عجم ۔ ۳۹ ۔

آج یادوں کی ہیں بپھری ہوئی موجیں آ کر　　تم مرے سر سے گزرتا ہوا پانی دیکھو (فقری)

اور اقبال کے مطابق :۔

عیش منزل ہے غریبان محبت پہ حرام　　سب مسافر ہیں بظاہر، نظر آتے ہیں مقیم! (۱)

اگر تو بحر محبت کا ساحل چاہتا ہے تو گویا، ہزار شعلے دے کر ایک شرر لے رہا ہے۔ مجھے تو لذت پرواز سے آشنا کیا گیا ہے اور تو چمن میں آشیانے کی سوچ رہا ہے۔

اگر بہ بحرمحبت کرانہ می خواہی　　ہزار شعلہ دہی یک زبانہ می خواہی !

مرا زلذت پرواز آشنا کردند　　تو درفضائے چمن آشیانہ می خواہی ! (۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی :۔

دما دم رواں ہے یم زندگی　　ہر اک شے سے پیدا رم زندگی (۳)

مزید کہتے ہیں کہ آپ نے میرے دل بے قرار کو جو تسلی دی تھی کہ میں رگ جان سے بھی قریب ہوں ۔ اس سے اس کی بے چینی دو نہیں ہوئی ، چنانچہ میں پھر اسے آپ ہی کے سپرد کرتا ہوں ۔ اے ''دریائے بے پایاں''! میں تیری موجوں سے کشمکش کا خواہاں ہوں ۔ نہ مجھے گوہر کی طلب ہے نہ ساحل کی گویا کہ اقبال صرف اور صرف حسن ازل کی شیدائی ہیں ۔

بہ تسلیء کہ دادی نگذاشت کار خود را　　بتو بازمی سپارم دل بیقرار خود را (۴)

من اے دریائے بے پایاں بہ موج تو درافتادم　　نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را (۵)

سوز و گداز ایسی حالت ہے کہ اگر میں آپ کے سامنے اس مقام کی مستی کا حال بیان کروں تو آپ بھی مجھ سے اس بادہ کے طلب گار ہوں گے ۔

سوز و گداز حالتے است ! بادہ زمن طلب کنی　　پیش تو گر بیاں کنم مستیٔ ایں مقام را (۶)

اے مہر و مہ کے مالک و خالق ! ہم انسانوں کی خاک پریشاں کی طرف بھی دیکھئے ، ذرا اس بیابان پر نظر ڈالئے ۔ اس کا ایک ایک ذرہ اپنے اندر پیچ و تاب کھا رہا ہے ۔ کہ آپ کا دیدار کرے ۔

اے خدا ے مہر و مہ خاک پریشانے نگر　　ذرۂ درخود فرو پیچد بیابانے نگر (۷)

---

(۱) بالِ جبریل ۔۶۱۔ (۲) زبورِ عجم ۔۶۵۔ (۳) بالِ جبریل ۔۱۲۵۔ (۴) زبورِ عجم ۔۵۳۔ (۵) ایضاً ۔۵۴۔
(۶) ایضاً ۔۵۵۔ (۷) زبورِ عجم ۔۵۹۔

اگر چہ میں جانتا ہوں کہ مجھے ایک اور دیدار ذات میسر آجائے گا۔ مگر یہ نہ سمجھ کہ دیدار کے بعد مجھے قرار آجائے گا۔

گرچہ می دانم کہ روزے بے نقاب آید بروں تانہ پنداری کہ جاں از پیچ و تاب آید بروں (۱)

بپایاں نارسیدن زندگانی است سفر مارا حیات جاودانی است (۲)

پھر کہتے ہیں آپ کا حسن بے پایاں ہمارے سینے میں خلوت گزیں ہے۔ اپنے آفتاب جمال کو ہمارے سینے کے اندر ملاحظہ فرمائیے۔ ہمارے سینے کے اندر کوئی اور! حیرانی کی بات ہے کیا خبر کہ یہ آپ ہیں یا ہم خود اپنے آپ سے دو چار ہیں۔

حسن بے پایاں درون سینہ خلوت گرفت آفتاب خویش را زیر گریبانے نگر (۳)

درون سینہء ما دیگرے ! چہ بو العجبی است ! کرا خبر کہ توئی یا کہ ما دو چار خودیم (۴)

اسی طرح :۔

حیراں آئینہ وار ہیں ہم
کس سے یارب دو چار ہیں ہم (۵)

ہم سے پہلے دنیا میں کوئی چہل پہل و رونق نہ تھی۔ اس باغ (دنیا) کا گل لالہ تمنا نہ رکھتا تھا۔ یہاں کی نرگس طناز چشم نظارہ سے محروم تھی۔ عشق نے ہماری فریاد سے ہنگامے تعمیر کئے۔ ورنہ اس بزم خموشاں (کائنات) میں کوئی شور و غوغا نہ تھا۔ یعنی کہ انسان کے عشق نے کائنات میں ہل چل مچاتے ہوئے اسے چہل پہل اور رونق بخشی۔

لالہء ایں گلستاں داغ تمنائے نداشت نرگس طناز او چشم تماشائے نداشت

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد ورنہ ایں بزم خموشاں ، ہیچ غوغائے نداشت! (۶)

اور یہ یوں ہوا کہ عشق نے جستجو اختیار کی ، جس کا حاصل آدم ہے۔ پھر اس کا جلوہ آب و گل کے پردے سے ظاہر ہوا۔ حسن مطلق نے خود ہی اپنے لئے آدم کی صورت میں عاشق پیدا کیا۔ تا کہ حسن مطلق کی شناخت ہو سکے۔ گویا حسن ہی عشق کو تحریک دیتا ہے۔

---

(۱) زبور عجم۔ ۹۷۔ (۲) ایضاً۔ ۱۲۶۔ (۳) ایضاً۔ ۵۹۔ (۴) ایضاً۔ ۵۱۔ (۵) دیوانِ درد۔ ۴۲۔ (۶) زبور عجم۔ ۱۳۶۔

عشق اندر جستجو افتادہ و آدم حاصل است جلوۂ او آشکار از پردۂ آب و گل است (۱)

''اللہ تعالیٰ'' ''الحی'' ہیں گویا حسن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے۔ حسن مطلق بے شک ہماری سوچ بوجھ سے بڑھ کر مکمل و اکمل ہے۔ لیکن وہ کوئی ہیرے جواہرات سے مزین بت نہیں کہ خاموش بیٹھا ہو۔ بلکہ وہ ذوق سخن رکھتا ہے۔ اسی لئے تو محفل سجانے کے لئے اس نے انسان پیدا کیا۔ کہ راز و نیاز ہو سکے۔ انسان کے علاوہ کس نے اس کے ''جلوہ و جمال'' کے نور کو اپنے جگر پر برداشت کیا۔ کس نے اس کے عشق کی شراب پی اور کون سارا پیالہ چڑھا گیا؟ کس کا دل حسن و خوبی کا معیار ٹھہرا، اس کا چاند کس کی منزل کے طواف میں ہے؟ کس کی خلوت ناز سے الست کی صدا بلند ہوئی۔ کس کے پردہ ساز سے ''بلیٰ'' کی آواز اٹھی۔ عشق نے ہماری خاک میں کیا آگ روشن کر دی کہ ہماری ایک آواز ''بلیٰ'' نے ہزاروں پردے جلا دیئے۔ اگر ہم ہیں تو جام ساقی کا دور بھی ہے۔ ہم ہیں تو اس کی بزم میں گرمی ہے۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترانام رہے کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے (۲)

باوہو بھی ہے۔ اس کی تنہائی پر میرا دل جلتا ہے۔ چنانچہ میں اس کی بزم آرائی کا سامان کرتا ہوں۔ میں اپنی خودی کو دانے کی مانند کاشت کرتا ہوں۔ میں اسی کی خاطر اپنی خودی کا تحفظ کرتا ہوں۔ تاکہ میری خودی پختہ ہو کر اس کی معرفت حاصل کرے اور اس سے راز و نیاز کر سکے۔

خدائے زندہ بے ذوق سخن نیست تجلّی ہائے او بے انجمن نیست
کہ برق جلوۂ او بر جگر زد؟ کہ خورد آں بادہ و ساغر بسرزد
عیار حسن و خوبی از دل کیست؟ مہ او درطواف منزل کیست؟
الست، از خلوت نازے کہ برخاست! بلیٰ، از پردۂ سازے کہ برخاست؟
چہ آتش عشق درخاکے برافروخت! ہزاراں پردہ یک آواز ماسوخت
اگر مائیم، گرداں جام ساقی است بیزمش گرمئی ہنگامہ باقی است!
مرا دل سوخت برتنہائی او کنم سامان بزم آرائی او

---

(۱) زبور عجم۔۱۰۸۔ (۲) بانگِ درا۔۱۶۷۔شکوہ۔

مثال دانہ می کارم خودی را
برائے او نگہدارم خودی را (۱)

عاشق ہے تو حسن کی بزم میں رونق ہے، ادھر حسن ہے تو عشق ہے۔ حسن عشق کی جستجو میں ہے اور عشق حسن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس سات رنگھا دنیا میں انسان ہر لمحہ سارنگی کی طرح فریاد کناں ہے۔ محرم راز، حسن مطلق کی آرزو اسے ہمہ وقت جلاتی اور نالہ ہائے دل نواز سکھاتی ہے۔

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں　　نغمہ انسانیت کا مل نہیں غیر از فغاں (۲)
آدمی اندر جہان ہفت رنگ　　ہر زماں گرم فغاں مانند چنگ!
آرزوے ہم نفس می سوزدش　　نالہ ہائے دل نواز آموزدش (۳)
دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغ آرزو رہنا　　علاج زخم ہے آزاد احسان رفو رہنا (۴)

لہذا:۔

متاع بے بہا ہے دردو سوز آرزو و مندی　　مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی (۵)

عشق و جنوں کی بدولت آرزو نے مجھے متحرک رکھا ہوا ہے۔ میں اپنے دل دیوانہ کے قربان جاؤں جو مجھے ہر لمحے ایک نیا ویرانہ عطا کرتا ہے۔جس میں، میں حسن کی جستجو میں جادہ پیمائی کرتا رہتا ہوں۔جب میں کسی ایک جگہ بیٹھ جاتا ہوں تو کہتا ہے، اٹھ جو شخص اپنے آپ کو پہچانتا ہے۔ وہ سمندر کو بھی معمولی چیز سمجھتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ (حسن مطلق) کی نشانیاں لا انتہا ہیں اس لئے مسافر کے سفر کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

من فدائے ایں دل دیوانہء　　ہر زماں بخشد دگر ویرانہء
چوں بگریم منزلے گوید کہ خیز　　مرد خود رس بحر را داند قفیز
زانکہ آیاتِ خدا لاانتہاست　　اے مسافر جادہ را پایاں کجاست؟ (۵)

اس طرح اقبال کے نزدیک عشق عاشق کو حسن مطلق کے نو بہ نو جلوؤں کی تمنا میں جنت میں بھی دیوانہ وار متحرک رکھتا ہے۔ ملا کی جنت، شراب و حور و غلمان کی جنت ہے۔ آزاد لوگوں کی جنت سیر دوام ہے۔ گویا کہ عاشقوں کے لئے

---

(۱) زبور عجم۔۱۷۳۔۱۷۴۔ (۲) بانگِ درا۔۱۵۵۔ (۳) جاوید نامہ۔۷۔ (۴) بانگ درا۔۷۴۔تصویر درد۔ (۵) بال جبریل۔۱۴۔غزل۔
(۶) جاوید نامہ۔۱۱۵۔

تجلیات حسن مطلق کے دیدار میں شراب اور حور و غلمان سے بھی زیادہ لطف اندوزی ہے ۔ ملا کی جنت میں کھانا ، پینا ،سونا اور راگ سننا ہے ۔ عاشق کی جنت موجودات کا نظارہ ہے ۔ ملا کا حشر بانگ صور وشق قبر ہے ۔عشق شور انگیز خود صبح قیامت ہے ۔

جنت ملاے و حور و غلام جنت آزاد گاں سیر دوام!
جنت ملا خوروخواب و سرود جنت عاشق تماشائے وجود!
حشر ملا شق قبر و بانگ صور عشق شور انگیز خود صبح نشور (۱)

زندگی بذات خود ہر لحہ نیا انقلاب اور تبدیلی چاہتی ہے ۔ چونکہ وہ نئے عالم کی جستجو میں رہتی ہے ۔ راستے بھی سفر میں مسافروں کی مانند ہیں ۔ ہر کہیں حضر (قیام) ظاہر اور سفر پوشیدہ ہے ۔ قافلہ ہو، ناقہ ہو، صحرا ہو یا درخت ۔ جو کچھ تجھے نظر آ تا ہے ۔ وہ سب آرزوے سفر میں فریاد کناں ہے ۔

زندگانی انقلابے ہر دمے ست زانکہ او اندر سراغ عالمے ست
جادہ ہا چوں راہرواں اندر سفر ہر کجاپنہاں سفر پیدا حضر!
کاروان و ناقہ و دشت و نخیل ہر چہ بینی نالد از درد رحیل! (۲)

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا ، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے ! نگار خانہ ہے آرزو کا (۳)

چاند گردش کرتا ہے تا کہ بدر بن جائے ۔لیکن سیر آدم کی کوئی منزل نہیں ۔ اس کے درجات بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں ۔ زندگی لذت پرواز کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔ آشیانہ اس کی فطرت کو راس نہیں آ تا ۔

ماہ گردد تاشود صاحب مقام سیر آدم را مقام آمد حرام!
زندگی جز لذت پروازنیست آشیاں بافطرت اوساز نیست! (۴)

سکوں ناآشنا رہنا اسے سامان ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یارب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں (۵)

---

(۱) جاوید نامہ ۔۱۳۰۔ (۲) ایضاً۔۱۸۴۔ (۳) بانگ درا ۔۱۳۷۔ (۴) جاوید نامہ ۔۲۰۴۔ (۵) بانگ درا ۔۱۳۸۔

اسی لئے :۔

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے　　پی کے شراب لالہ گوں میکدۂ بہار سے
مست مئے خرام کا سن تو ذرا پیام تو　　زندہ وہی ہے ،کام کچھ جس کو نہیں قرار سے (۱)
نہ ہو طغیان مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی　　کہ میری زندگی کیا ہے ؟ یہی طغیان مشتاقی (۲)

حرکت و آرزو کا تقاضا ہے کہ اگر تو سمندر ہے تو آبادی و ویرانے سے مسلسل نبرد آزما ہو۔ اگر شبنم ہے ،تو پھول کی پتی پر ٹپک :۔

قلزمی؟ بادشت و در پیہم ستیز　　شبنمی ؟ خود رابہ گلبر گے بریز (۳)

اس سلسلے میں فرسودہ آرزؤں سے پاک ہو جا صرف '' حسن مطلق '' ہی کی آرزو رکھ ۔ آرزو پر ہی زندگی کی بنیاد ہے ۔ اپنے آپ کو اپنی آرزو سے پہچان ۔ آرزو کی نوعیت ہی انسان کا مقام متعین کرتی ہے۔ آرزو ہی سے آنکھ ، کان اور فہم تیز ہوتا ہے ،گویا آرزو ہی کے تحت انسان دیکھتا ،سنتا اور سوچتا سمجھتا ہے ۔ آرزو ہی سے اس مشت خاک (انسان) کے اندر لالے کے پھول پیدا ہوتے ہیں ۔ جس نے اپنے دل کے اندر آرزو کا بیج نہ بویا وہ سنگ وخشت کی طرح دوسروں کے پاؤں تلے روندا جاتا ہے ۔ آرزو ہی سلطان و میر کا سرمایہ ہے ۔ اور یہی فقیر کے لئے جام جہاں بین ہے ۔ آرزو ہی مشت خاک کو آدم بناتی ہے ۔ آرزو ہی ہمیں اپنے آپ سے آگاہ کرتی ہے ۔ آرزو ہماری خاک سے شرر کی مانند بھڑکتی ہے ۔ اور اس ذرے کو آسماں کی وسعت عطا دیتی ہے ۔

درگذر از رنگ وبوہائے کہن　　پاک شواز آرزو ہائے کہن
زندگی برآرزو دارد اساس　　خویش را از آرزو ے خود شناس
چشم و گوش و ہوش تیز از آرزو　　مشت خاکے لالہ خیز از آرزو
ہر کہ تخم آرزو دردل نہ کشت　　پائمال دیگراں چوں سنگ و خشت!
آرزو سرمایہء سلطان و میر　　آرزو جام جہاں بین فقیر
آب و گل را آرزو آدم کند　　آرزو مارا زخود محرم کند

---

(۱) بانگ درا ۔۲۱۰ ۔شاعر ۔ (۲) بال جبریل ۔۵۸ ۔غزل ۔ (۳) پس چہ باید کرد ۔۹ ۔

چوں شرر از خاک ما برمی جہد ذرہ را پہنائے گردوں می دہد! (۱)

اس طرح ''اقبال کا ذوق جمال'' عشق اور آرزو میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ یہی وہ چیز ہے جو عاشق کو حسن مطلق سے راز و نیاز کا موقع فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ اقبال محبوب حقیقی سے کہتے ہیں۔ جبرئیل اس ہائے وہو سے آگاہ نہیں کہ اس نے فرقت دیکھی ہی نہیں۔ آپ اپنے اس بندۂ ناچیز کی خبر گیری کریں۔ جو آرزو کے زہر وتریاق سے آگاہ ہے۔

نداند جبرئیل ایں ہائے وہورا کہ نشناسد مقام جستجورا!
بپرس از بندۂ بیچارۂ خویش کہ داند نیش و نوش آرزو را! (۲)

عشق میں ہجر و فراق اور سوز و گداز ہی قلب ونظر کی ''دستار'' ٹھہرتے ہیں۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں اے ساربان! تو مسافر کے غم عشق کو اور زیادہ نشاط آمیز بنا۔ اس کی آہ و فغاں کو اور زیادہ جنوں انگیز کر دے۔ اس مقصد کی خاطر کوئی طویل راستہ اختیار کر اور اس طرح ہجر کے سوز کو زیادہ تیز کر۔

غم راہی نشاط آمیز تر کن فغانش راجنوں انگیز تر کن
بگیر اے سارباں راہ درازے مرا سوز جدائی تیز تر کن (۳)

حرکت و آرزو عاشق کی رگ رگ میں خون کی طرح متحرک رہتی ہے۔ لہذا اقبال کہتے ہیں کہ صبح کے وقت جب آبادی وصحرا میں روشنی پھیل گئی۔ تو درخت کی شاخ سے پرندے نے آواز دی۔ اے فرزند صحرا! خیمہ چھوڑ! ذوق سفر کے بغیر کوئی زندگی نہیں۔

سحر گاہاں کہ روشن شد در ودشت صدا زد مرغے از شاخ نخیلے
فروہل خیمہ اے فرزند صحرا کہ نتواں زیست بے ذوق رحیلے (۴)

طبیب عشق نے دیکھا تو فرمایا ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی! (۵)
نخچیر محبت کا قصہ نہیں طولانی لطف خلش پیکاں، آسودگی فتراک (۶)
پاک ہوتا ہے ظن و تخمین سے انسان کا ضمیر کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغ آرزو (۷)

اور پھر سبحان اللہ اقبال کیا خوب فرماتے ہیں کہ:۔

---

(۱) پس چہ باید کرد۔ (۲) ارمغان حجاز۔ ۱۴۔ (۳) ایضاً۔ ۲۹۔ (۴) ایضاً۔ ۸۵۔ (۵) بال جبریل۔ ۳۰۔ غزل۔
(۶) ایضاً۔ ۴۱۔ غزل۔ (۷) ارمغان حجاز۔ ۳۶۔

رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو
فطرت ہی صنوبر کی محروم تمنا ہے! (۱)

اسی لئے اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ امید وتمنا کا چراغ ہاتھ سے نہ چھوڑ کہ یہ راستہ روشن کرتا ہے۔اور ہاؤ ہو یعنی عشق الٰہی کا مقام حاصل کر۔اس جہاں کی چہار اطراف میں نہ کھو جا۔ بلکہ اپنے آپ میں آ اور ان حدود کو توڑ کر ان سے اوپر نکل جا۔

منہ از کف چراغ آرزو را بدست آورمقام ہاؤ ہورا
مشودر چار سوئے ایں جہاں گم بخود باز آ وبشکن چار سورا (۲)

حسن وعشق کی تڑپ اور دل ناصبور کی اس ساری پھڑک کا مقصد و مدعا یہی ہے کہ:۔

فرقت آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صبح — چشم شفق ہے خوں فشاں اختر شام کے لئے
رہتی ہے قیس روز کو لیلیٰ شام کی ہوس — اختر صبح مضطرب تاب دوام کے لئے
کہتا تھا قطب آسماں قافلۂ نجوم سے — ہمرہو! میں ترس گیا لطف خرام کے لئے
سوتوں کو ندیوں کا شوق ، بحر کا ندیوں کو شوق — موجۂ بحر کو تپش ماہ تمام کے لئے

چنانچہ:۔

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے — زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے (۳)
بے خلشہا زیستن نازیستن — باید آتش درتہ پازیستن! (۴)

لہٰذا اقبال کے نزدیک ضروری ہے کہ:۔

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے (۵)

اب ہم اس مقام پر پہنچ آئے ہیں کہ عصری تجزیاتی فلسفے (Analytical - Philosophy) پر بات کرتے ہوئے ،حسن و معرفت کے حوالے سے ''اقبال کے ذوق جمال'' کا جائزہ لیں ۔مگر اس سے قبل اجمالاً مادیت و روحیت ، عقلیت و تجربیت کا تجزیہ کرتے ہیں ۔مغرب میں کانٹ ،شلر اور برگسان نے روحانیت کی داغ بیل ڈالی ۔کانٹ نے سب

---

(۱) بانگِ درا ۔ ۱۷۹۔ ''انسان''۔ (۲) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۱۲۔ (۳) بانگِ درا ۔ ۱۲۳۔ ''کوششِ ناتمام''۔ (۴) جاوید نامہ ۔ ۱۲۰۔
(۵) بانگِ درا ۔ ۲۶۸۔

سے پہلے اپنی کتاب تنقید عقل محض (Critique of absolute reason) لکھ کر عقلیت پرستی پر کاری ضرب لگائی ۔کانٹ نے ثابت کیا کہ عقل کے علاوہ وجدان بھی ایک قوت ہے جو" معرفت حقیقت"میں مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے ۔ بعد میں شلر اور برگساں نے وجدانیت کو مزید آگے بڑھایا۔ اقبال نے عشق و وجدان کا یہی تصور چودہ سو سال پہلے نازل شدہ قرآن حکیم سے اخذ کیا اور مولانا جلال الدین رومیؒ سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے اپنی مشت خاک کو اکسیر کرلیا۔

مادئین میں ولیم جیمز ،شوپن ہار ، ڈارون اور اسپنسر پیش پیش ہیں ۔ مادّیت کہتی ہے کہ دنیا فانی ہے اور دوسری دنیا یا اخروی زندگی کا کوئی وجود نہیں ۔ اس سے ایک تو مایوسی و بزدلی پھیلی اور دوسرے گناہ وثواب اور جزا وسزا کی کایا پلٹ گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ اقبالؔ جیسے "روحیت" پسند کے لئے یہ مادیت بالکل نا قابل قبول ہے ___ جو سبق دیتی ہے شاہین بچوں کو خاکبازی کا ۔ چنانچہ اقبالؔ کے نزدیک حسن وحقیقت روحانی قوت ہے ۔

جہاں تک عقلیت پسندی (Rationalism) کا تعلق ہے تو ڈیکارٹ ، اسپنوزا اور لائبنز اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ کے حوالے سے عقل وعشق کا موازنہ کرتے ہوئے ہم دیکھ چکے ہیں ۔ کہ عقلیت پسندی حقیقت کی معرفت ہر گز حاصل نہیں کرسکتی ۔ اس کی اپنی ایک حد ہے جس سے آگے پرواز کرتے ہوئے ،اس کے پر جلتے ہیں ۔لہٰذا پردم نہیں رہ سکتی اور عاجز آ کر افتادگی کا شکار ہو جاتی ہے ۔ آیونی اور ایلیائی مفکروں کے حوالے سے ہم دیکھ آئے ہیں کہ ایک ہی حقیقت کے بارے میں مختلف فلسفیوں کی مختلف آراء ہیں ۔ اگر عقل ،علم ومعرفت کا ذریعہ ہوتی تو ان فلسفیوں کی آراء مختلف نہ ہوتیں ۔ مثلاً تھیلس حقیقت کو پانی ، انکسیمنز ، ہوا اور ہراقلیتوس اسے آگ سے منسوب کرتا ہے ۔ زینو فینز اور پارمنڈیز حقیقت کی احدیت اور ناقابل تقسیم ہونے پر ایمان رکھتے ہیں ۔ جبکہ ہراقلیتوس اسے متغیر ومتحرک سمجھتا ہے ۔ حقیقت کے بارے میں عقلیت کے ان بہت سے تضادات کے علاوہ یہ بھی ہے کہ فیثا غورثیہ حقیقت کو کثرت اور پارمنڈیز اسے وحدت سمجھتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک ہی حقیقت سے متعلق متضاد آراء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عقل علم ومعرفت کا ذریعہ نہیں بن سکتی ۔

تجزیاتی فلسفے کے ضمن میں عقلیت پسندی کے مدمقابل تجربیت (Empiricism) کے نمائندے لاک ، برٹرنڈرسل ، جان سٹارٹ مل ، برکلے اور ہیوم ہیں ۔ یہ مفکرین عقل کی بجائے ، تجربے یا حسی ادراک کو علم کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔یعنی ان کے

نزدیک جس چیز کو تجربے سے چھوا جا سکتا ہے ۔ وہی حقیقت ہے ۔ اس طرح حقیقت ایک نہیں بلکہ کثرت اشکال کی صورت میں بے شمار حقیقتیں ٹھہرتی ہیں ۔ معروضیت پسند (Objectivist) ہونے کے ناطے تجربیت پسندوں کے مطابق جو دکھائی دیتا ہے ، یہی حقیقت ہے ۔ اس کے پیچھے دھوکا ہے ۔ انہوں نے ظاہری اشیاء کی حقیقت پر زور دیا ۔ ''تجزیاتی فلسفے'' کا آغاز جی ۔ امور (G-E-Moore) اور برٹرنڈرسل سے ہوا ۔ انہوں نے حقیقت کا استخراجی یعنی کل کا ''جزویاتی تجزیہ'' کرنا شروع کیا ۔ تجزیاتی فلسفہ مابعد الطبیعاتی فلسفے کی نفی کرتا ہے ۔

اس کے برعکس پروفیسر بریڈلے تصوریت (Idealism) کا قائل ہوتے ہوئے افلاطونی ''عینیت'' کا پیرکار دکھائی دیتا ہے ۔ بریڈلے وحدت الوجود (Wholeness) پر یقین رکھتا ہے ۔ گویا اس کے نزدیک حقیقت ایک ہے ۔ تجزیہ سے یکتائی ختم ہوتی ہے ۔ لہٰذا تجزیہ تخریب کاری کے مترادف ہے ۔ تجزیاتی فلسفے (Analytical Philosophy) کے برخلاف تصوریت پسند بریڈلے کے نزدیک حقیقت محسوسات کے پیچھے اور ماورا ہے ۔ ظاہر دھوکا ہے ۔ اور یہی افلاطون کا نظریہ اعیان ہے ۔ گویا کہ بریڈلے کا نظام فکر افلاطون و فلاطینوس کی صدائے بازگشت ہوتے ہوئے پوشیدہ و نہاں اشیاء کو حقیقت تسلیم کرتا ہے ۔ اصغر گونڈوی نے اس اندازِ فکر کی کیا خوب ترجمانی کی ہے ۔

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے   پردے میں مصورر ہی تنہا نظر آتا ہے   (اصغر گونڈوی)

پردے میں اس ''تنہا مصور'' کی معرفت کے لئے بریڈلے ، آئیکن ، برگساں اور کروچے الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ وجدان ہی کو بہترین ذریعہ قرار دیتے ہیں ۔ کروچے ''اظہاریت'' (Expressionism) کو وجدان ہی کہتا ہے ۔ جیسا کہ مجنوں گورکھپوری ایک جامع بحث کے بعد رقم طراز ہیں :۔

''مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وجدان اظہار اور صورت آفرینی کے ملکہ کو کہتے ہیں ۔۔۔۔ وجدان اور صناعی دو چیزیں نہیں ۔۔۔۔ وجدان صناعی ہے اور صناعی وجدان (۱)

بہر حال تجزیاتی فلسفیوں کے مطابق جو دکھائی دیتا ہے ، یہی حقیقت ہے اور اس کے پیچھے کچھ بھی نہیں یا اگر ہے تو دھوکہ ہے ۔ ادھر تصوراتی فلسفی ظاہر کو دھوکہ اور اس کے پیچھے جو کچھ ہے اسے حقیقت مانتے ہیں ۔ اور یہ افلاطون کی تصوریت کے مطابق ہے ۔ جس کا رشتہ افلاطون کے ''نظریہ اعیان'' سے جا ملتا ہے ۔ اگر چہ پہلے باب میں نظریہ اعیان اور تصوریت پر

---

(۱) تاریخ جمالیات ۔ ۱۷ ۔ مجنوں گورکھپوری

خوب بحث ہو چکی ہے۔ مگر یہاں موقع و محل کے مطابق غزل چھڑ جانے کے باعث پھر سے، ذرا عمر رفتہ کو آواز دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد اپنی کتاب ''اقبال اور مغربی مفکرین'' میں رقم کرتے ہیں:۔

''افلاطون کا نظریہ اعیان مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ یہ دنیا جو ہمیں نظر آرہی ہے۔ اصل دنیا نہیں ہے۔ بلکہ یہ اصل دنیا کا پرتو ہے یا مجاز ہے۔ افلاطون کے نزدیک صور علمیہ یا اعیان ثابتہ ہی حقیقی وجود رکھتے ہیں اور عالم محسوس یا عالم مادی اس حقیقی عالم یعنی عالم اعیان کا محض عکس یا پرتو ہے۔ ظاہر ہے کہ افلاطون کا یہ نظریہ اقبال کے فلسفہ عمل سے متصادم ہے کیوں کہ اگر یہ ساری دنیا جس میں ہم سانس لے رہے ہیں محض عکس یا پرتو، یا دھوکہ ہے تو اس میں رہ کر کسی قسم کی جدوجہد بیکار ہو جاتی ہے''۔ (۱)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال نہ تجزیاتی فلسفے سے متفق ہیں اور نہ بریڈلے کے تصوراتی خیالات سے۔ بلکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق '' وحدت جمال'' پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا اقبال کے نزدیک نہ ظاہر دھوکا ہے اور نہ ظاہر کے عقب میں دھوکا ہے۔ بلکہ ظاہر تخلیق ہے۔ اور اس تخلیق میں ایک خالق حقیقی کا ہاتھ ہے۔ جس نے اپنی تخلیق کو اپنے ''مظہر'' کے طور پر پیش کیا ہے۔ حسن کی دو قسمیں ہیں۔ (1) حقیقی یا مطلق (۲) مجازی یا اضافی۔ مجازی اپنی ہستی و نمود کے لئے حسن الوہی کا، جو حقیقی بھی ہے اور مطلق بھی، مرہون منت ہے۔ حسن حقیقی، حقیقی ان معنوں میں ہے کہ یہ ازلی، ابدی اور لافانی ہے۔ اسی کے نور ظہور سے کائنات حسن و رنگ کا مرقع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے کائنات کو'' تخلیق بالحق'' کہا ہے۔ کائنات جب تخلیق بالحق ہے تو نہ باطل ہے اور نہ فریب نظر۔ وہ حسن مطلق یا حسن حقیقی کیا؟ جو فریب یا دھوکے سے کام لے۔ اس لئے اقبال کیا خوب فرماتے ہیں کہ زندگی اور کائنات کا حسن وجود، حسن حقیقی یا خودی مطلق، یعنی اللہ تعالیٰ کے آثار و نشانات میں سے ہے۔ جو کچھ تو دیکھتا ہے یہ خودی مطلق ہی کے اسرار کا اظہار ہے:۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است   ہر چہ می بینی زاسرار خودی است (۲)

ہر چہ می بینی زانوار حق است   حکمت اشیا زاسرار حق است

ہر کہ آیات خدابیند حراست   اصل ایں حکمت زحکم **انظر** است (۳)

خودی اللہ تعالیٰ کے نور سے روشن ہے۔ اس کی کوشش ناتمام ہی میں اس کی کامیابی ہے۔ اس کا ہجر اس کے

---

(۱) اقبال اور مغربی مفکرین۔ ۴۳۔ جگن ناتھ آزاد۔ (۲) اسرار خودی۔ ۱۲۔ (۳) پس چہ باید کرد۔ ۴۳۔

مقامات وصال میں سے ہے اور اس کا وصال، مقامات جدائی میں سے ہے۔

خودی روشن زنور کبریائی است   رسائی ہائے او نارسائی است
جدائی از مقامات وصالش   وصالش از مقامات جدائی است   (۱)

ہمارا وصال، وصال اندرفراق ہے۔ جب تک انسان میں نظر پیدا نہ ہو یہ عقدہ وانہیں ہوتا۔ بے شک گوہر خودی آغوش دریائے باری تعالیٰ میں گم ہے۔ مگر بحر اور آب گوہر میں بہت فرق ہے۔ گوہر دریا میں رہتے ہوئے بھی دریا سے الگ ہے۔

وصال ما وصال اندر فراق است   کشودِ ایں گراہ غیر از نظر نیست
گہرگم گشتہء آغوش دریااست   و لیکن آبِ بحر آب گہر نیست!   (۲)

خودی کا وجود حق تعالیٰ کے وجود سے ہے، خودی کی نمود حق تعالیٰ کے اظہار یا نمود سے ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اگر دریا نہ ہوتا تو خودی کا یہ تابندہ گوہر کہاں ہوتا۔ جس طرح موتی دریا کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح حق تعالیٰ کی ذات کے بغیر خودی کی نمود نہیں ہوسکتی۔

خودی را از وجودِ حق وجودے   خودی را از نمود حق نمودے
نمیدانم کہ ایں تابندہ گوہر   کجا بودے اگر دریا نبودے   (۳)

خودی کائنات کی حفاظت کے لئے تعویز ہے۔ خودی کا پہلا پر تو حیات ہے۔ جب حیات کے اندر وحدت کثرت بنی تو وہ گہری نیند سے بیدار ہوئی۔ نہ ہماری نمود کے بغیر اس کی صفات کا اظہار ہے اور نہ اس کے اظہار کے بغیر ہماری نمود ہے۔ خودی کا ضمیر بحر ناپیدا کنار ہے اس بحر کے ہر قطرے کے اندر موج بیقرار پوشیدہ ہے۔ خودی سکون ناآشنا ہے۔ اس کا اظہار انسان کے علاوہ اور کسی شے میں نہیں۔ حسن مطلق آگ ہے اور انسانی خودی شراروں کی مانند ہے۔ یہ شرارے ستاروں کی طرح اپنی اپنی جگہ قائم بھی ہیں اور اپنا سفر بھی جاری رکھتے ہیں۔

خودی کے لئے پیکر خاکی حجاب ہے۔ یہ بدن کے اندر سے ایسے طلوع ہوتی ہے جیسے سورج۔ ہمارا سینہ اس کا مطلع ہے، ہماری خاک کی تابانی اس کے جوہر کی مرہون منت ہے۔ تو کہتا ہے کہ مجھے ''میں'' کی خبر دو۔ مجھے بتاؤ کہ اپنے اندر سفر کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اپنے اندر سفر؟ ماں باپ کے بغیر از سرنو پیدا ہونا ہے، یہ چھت کے کنارے سے ثریا کو پکڑ

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔۱۲۱۔ (۲) ایضاً۔۱۲۲۔ (۳) ایضاً۔ ۱۲۱

لینا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لامکاں سے اس طرح واپس آنا ہے کہ سینے کے اندر وہ ہو اور اس کا جہاں مٹھی میں ہو۔

خودی تعویذ حفظ کائنات است نخستیں پرتوِ ذاتش حیات است
حیات از خواب خوش بیدار گردد درونش چوں یکی بسیار گردد
نہ اورا بے نمود ما کشودے نہ مارا بے کشود او نمودے
ضمیرش بحر ناپیدا کنارے دل ہر قطرہ موج بیقرارے
سرِ برگِ شکیبائی ندارد بجز افراد پیدائی ندارد
حیات آتش ، خودی ہا چوں شرر ہا چو انجم ثابت واندر سفر ہا
خودی را پیکر خاکی حجاب است طلوع او مثال آفتاب است
درون سینہء ما خاورِ او فروغ خاک ما از جوہر او
تو می گوئی مرا از "من" خبر کن چہ معنی دارد اندر خود سفر کن؟
سفر درخویش ؟ زادن بے اب و مام ثریا راگرفتن از لب بام
چناں باز آمدن از لا مکانش درون سینہ او ، درکف جہانش

خودی پہچان عشق کے ذریعے مستحکم ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر ایک لمحہ اضطراب سے ابد پالینا ہے۔ یہ سورج کی روشنی کے بغیر اپنے اندر کی روشنی سے نظارہ کرنا ہے۔ یہ ہر امید و خوف کا نقش مٹا دینا اور موسیٰ کی طرح دریا کو دو ٹکڑے کر دینا ہے۔ یہ بحر و بر کے طلسم کو توڑنا اور انگلی کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دینا ہے۔

ابد بردن بیک دم اضطرابے تماشا بے شعاع آفتابے
ستردن نقش ہر امیدے و بیمے زدن چاکے بدریا چوں کلیمے
شکستن ایں طلسم بحرو بررا زانگشتے شگافیدن قمررا (۱)

جب خودی نے اپنے آپ کو بیدار کیا تو یہ عالم پندار ظاہر ہوا۔ خودی کی ذات میں سینکڑوں جہاں مخفی ہیں۔ جب خودی اپنا اثبات یعنی اپنی قوت کا اظہار کرتی ہے تو ایک نیا جہاں پیدا ہو جاتا ہے جو خودی کی ذات سے علیحدہ ہوتا ہے۔ پھر وہ

---

(۱) زبور عجم۔۱۶۰۔۱۶۱۔

اپنی قوت بازو سے، بعض اشیاء کو فنا کر دیتی ہے۔ تا کہ اسے اپنی قوت سے آگاہی حاصل ہو۔

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد　　آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او　　غیر او پیداست از اثبات او
میکشد از قوت بازوے خویش　　تاشود آگاہ . از نیروے خویش　　(۱)

لیکن پھر اقبالؔ کہتے ہیں کہ بات دراصل یہ ہے کہ:۔

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے　　ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب　　موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ!　　کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ!
پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا　　توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو　　خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو　　(۲)

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات　　(۳)

خودی مطلق، خالق مطلق اور قادر مطلق ہے۔ جو خوب سے خوب تر پیکر تراشتی رہتی ہے۔ یعنی تخلیق کرتی ہے۔ اسی شوق میں یہ خودیوں کی خودیاں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ جیسا کہ پانی کے قطرے کو موتی بنا دیتی ہے۔ اور قطرے کی خودی کی بھی یہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ خوب سے خوب تر بن جائے۔

قطرہ چوں حرف خودی از برکند　　ہستی ء بے مایہ را گوہر کند　　(۴)

ہر خودی اظہار چاہتی ہے۔ ہماری خودی، ہستی مطلق کے اظہار ہی کا نتیجہ ہے۔ قلزم حسن مطلق نے خود نمائی کے جوش میں انسان جیسے چمکدار موتی کو کنارے پر پھینک دیا۔

بضمیرت آرمیدم تو بجوش خود نمائی　　بکنارہ برفگندی درآب دارخودرا　　(۵)
تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا　　میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں　　(۶)

---

(۱) اسرار خودی۔ ۱۳۔ (۲) بانگ درا۔ ۲۳۱، ۲۳۲۔ والدہ مرحومہ کی یاد میں۔ (۳) بال جبریل۔ ۱۲۷۔ ساقی نامہ

(۴) اسرار خودی۔ ۱۴۔ (۵) زبور عجم۔ ۵۳۔ (۶) بال جبریل۔ ۵۔

جاوید نامہ میں اقبالؒ موجود و ناموجود اور اظہار ذات کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مولانا رومیؒ سے پوچھتے ہیں کہ :۔

گفتمش موجود و ناموجود چیست؟ معنی محمود و نامحمود چیست؟

مولانا رومی جواب دیتے ہیں کہ موجود وہ ہے ، جو نمود چاہتا ہے اپنے آپ کو ظاہر کرنا وجود کا تقاضا ہے ۔ زندگی اپنے آپ کو اپنی نظروں میں آراستہ کرنا اور اپنے وجود پر شہادت طلب کرتا ہے ۔ حق تعالی نے بھی ''روز الست'' انجمن آراستہ کی اور اپنے وجود پر شہادت چاہی۔ تو زندہ ہے یا مردہ یا جاں بلب ہے ۔ تین شاہدوں سے شہادت طلب کر ۔ شاہد اپنا شعور ہے ۔ یعنی اسے اپنے آپ کو اپنے نور سے دیکھنا ۔ شاہد دوم دوسروں کا شعور ہے یعنی اپنے آپ کو دوسروں کے نور سے دیکھنا ۔ شاہد سوم حق تعالی کا شعور ، یعنی اپنے آپ کو حق تعالی کے نور سے دیکھنا ۔ اگر تو اللہ کے نور کے سامنے قائم رہے ۔ تو اپنے آپ کو اللہ تعالی کی طرح حی و قیوم سمجھ ۔ اپنے مقام پر پہنچنا اور ذات باری تعالی کو بے پردہ دیکھنا زندگی ہے ۔ مرد مومن صفات پر قناعت نہیں کرتا ، حضور اکرم ﷺ دیدار ذات ہی سے مطمئن ہوئے ۔

گفت موجود آنکہ می خواہد نمود آشکارائی تقاضائے وجود
زندگی خود را بخویش آراستن بر وجود خود شہادت خواستن
انجمن روز الست آراستند بروجود خود شہادت خواستند
زندۂ یا مردۂ یا جاں بلب از سہ شاہد کن شہادت را طلب
شاہد اول شعور خویشتن خویش را دیدن بنور خویشتن
شاہد ثانی شعور دیگرے خویش را دیدن بنور دیگرے
شاہد ثالث شعور ذات حق خویش را دیدن بنور ذات حق
پیش ایں نور از بمانی استوار حی و قائم چوں خدا خود را شمار!
برمقام خود رسیدن زندگی است ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
مرد مومن درنسازد باصفات مصطفیٰ راضی نشد الا بذات

معراج کیا ہے؟ شاہد کی آرزو کہ اس کے رو برو اپنا امتحان کیا جائے ۔ ایسا شاہد عادل ، جس کی تصدیق کے بغیر ،

زندگی ہمارے لئے ایسی ہے، جیسے پھول کے لئے رنگ و بو، حق تعالی کے حضور میں کوئی شخص قائم نہیں رہا۔ اور جو رہا ہے وہ کامل و اکمل ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ۔ اگر تو ذرہ بھی ہے تو اپنی چمک کو ہاتھ سے نہ دے۔ بلکہ اسے اپنی گرہ میں مضبوطی سے باندھ کے رکھ۔ ذرہ کے لئے اپنی چمک میں اضافہ کرنا اور اسے آفتاب کے سامنے آزمانا خوشتر ہے۔ اپنے پیکر فرسودہ کی نئے سرے سے تراش خراش کر۔ اپنے امتحان کے ذریعے اپنے آپ کو موجود ثابت کر۔ جس نے اپنے آپ کو اس طرح موجود ثابت کیا وہی محمود ہے۔ اس کے بغیر زندگی کی آتش محض دھواں ہے۔

چیست معراج آرزوے شاہدے ۔۔۔ امتحان رو بروے شاہدے
شاہد عادل کہ بے تصدیق او ۔۔۔ زندگی مارا چوگل را رنگ و بو
در حضورش کس نما ند استوار ۔۔۔ ور بماندہست او کامل عیار
ذرہٴ از کف مدہ تابے کہ ہست ۔۔۔ پختہ گیراندر گرہ تابے کہ ہست
تاب خود را برفروختن خوشتراست ۔۔۔ پیش خورشید آزمودن خوشتراست
پیکر فرسودہ را دیگر تراش ۔۔۔ امتحان خویش کن موجود باش
ایں چنیں موجود، محمود ، است و بس
ورنہ نار زندگی دود است و بس

اس کے بعد اقبال کہتے ہیں کہ پھر میں نے پوچھا اللہ تعالی کے سامنے پیش ہونا کیسے ہے؟ اس خاک و آب، یعنی دنیا (موجودات و محسوسات) کے پہاڑ کو کیسے توڑا جا سکتا ہے؟ مطلق العنان خالق (اللہ تعالی) امر وخلق سے باہر ہے۔ ہمارے حلق میں زمانے کا کانٹا پھنسا ہوا ہے۔ رومی نے کہا کہ اگر تجھے، اجازت یا قوت میسر آجائے تو افلاک کی حدود کو بھی توڑا جا سکتا ہے۔ انتظار کر یہاں تک کہ کائنات بے پردہ سامنے آجائے اور اپنے دامن سے مکاں کی گرد دھوڈالے۔ اور تو اس کے وجود کو نہ کم دیکھے نہ زیادہ۔ اپنی تعین اس سے کر اور اس کی تعین اپنے آپ سے۔

یامحشر الجن و لا نس ان استطعکم ان تنفذ و من اقطار السموات و لا رض فانفذو لاتنفذون الا بسلطان (سورة الرحمن القرآن)

''الا بسطان'' کا نکتہ یاد رکھ ۔ ورنہ کیڑوں مکوڑوں کی طرح مٹی کے اندر ہی مر جائے گا ۔ اے نیک شخص تو اس جہان چارسو میں پیدائش کے ذریعے آیا ۔ اس سے باہر نکلنا اور اپنے بند کھولنا بھی ایک نئی پیدائش کے ذریعے ہی ممکن ہے ۔

باز گفتم پیش حق رفتن چساں؟ کوہ خاک و آب راگفتن چساں؟
آمرو خالق بروں ازامرو خلق ماز شست روزگاراں ختہ حلق؟
گفت اگر ''سلطاں'' ترا آیدبدست می تواں افلاک را از ہم شکست
باش تا عریاں شود ایں کائنات شوید از دامان خود گرد جہات
نکتہء ''آلابسلطاں'' یاد گیر ورنہ چوں مور و ملخ درگل بمیر
از طریق زادن اے مردنکوے آمدی اندر جہان چار سوے
ہم بروں جستن بزادن می تواں بندہا از خود کشادن می تواں (۱)

زندگی یعنی ''حسن مطلق'' نے غیب وحضور کی لذت کی خاطراس جہان زمان و مکان کے نقوش بنائے ۔ حسن مطلق نے ، تارنفس کو اپنے آپ سے علیحدہ کیا یوں اپنی صفات کا اظہار فرمایا اور کائنات کو وجود بخشا ۔ ہر کہیں خودگری کا ذوق وشوق دکھائی دیتا ہے ۔ ہر کہیں یہ نعرہ سنائی دیتا ہے'' میں اور ہوں'' اور تو اور ہے ۔ چاند ستاروں کو خرام ناز سکھایا گیا اور ان کی صورت میں سینکڑوں چراغ روشن کر دیئے گئے ۔ یہاں اقبآل وحدت الوجود سے اختلاف کر رہے ہیں ۔ کہ اللہ تعالی نے اپنی تخلقیات کو اپنے سے علیحدہ وجود کی حیثیت سے تخلیق فرمایا ہے ۔

زندگی از لذت غیب و حضور بست نقش ایں جہان نزدو دور
آں چناں تارنفس از ہم گسیخت رنگ حیرت خانہ ء ایام ریخت
ہر کجا از ذوق و شوق خود گری نعرۂ من دیگرم ، تو دیگری
ماہ و اختر را خرام آموختند صد چراغ اندرفضا افروختند (۲)

اب ہم ایسے موڑ پر پہنچے ہیں کہ علامہ محمد اقبآل کے کشف حسن ومعرفت پر گفتگو کا آغاز کریں ۔ چونکہ اقبآل عقل وفلسفے کو معرفت حق کے لئے نارسا سمجھتے ہیں ۔ اس لئے میں اقبآل کے فکر یا افکار کی بجائے کشف یا عشق کا لفظ استعمال کرتا ہوں ۔

---

(۱) جاوید نامہ ۔ ۱۹ ۔ ۲۰ ۔ ۲۱ ۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۱۳ ۔

حسن مطلق کی معرفت کا آغاز حسن مجازی سے ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حسن فطرت ہو یا حسن انسان ہر دو صورتوں میں حسن مطلق ہی کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ بلکہ میں تو خوبصورت انسان کو بھی حسن فطرت ہی کا ایک حصہ سمجھتا ہوں ، اور حسن فطرت بلاحیل و حجت ، حسن مطلق سے جا ملتا ہے ۔ اور اقبالؔ فطرت کو حسن مطلق کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ قرار دیتے ہیں

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے   یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے   (۱)

وادیٔ کہسار میں غرق شفق ہے سحاب   لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب   (۲)

عنابی شفق ، کالے سفید اور گلابی بادل ، جھومتے گرجتے و برستے ابر ، گاتی ہوائیں و مترنم ندیاں سبھی حسن مطلق کی نشانیاں ہیں ۔ انہی کے ذریعے حسن مطلق کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے ۔ اگر اجازت ہو تو میں حسن فطرت کو بھی انسان کی طرح محبوب مجازی کا نام دے دوں ۔ یعنی اگر ہم انسان کو مجازی محبوب کہتے ہیں تو فطرت کو بھی مجازی محبوب کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے ۔ اس لئے کہ محبوب مجازی ہی کی طرح حسن فطرت بھی محبوب حقیقی کی معرفت کا ایک وسیلہ ہے ۔ اور اقبالؔ کہتے ہیں کہ :۔

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے   ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟   (۳)

برخیز کہ فروردیں افروخت چراغ گل   برخیز و دمے بنشیں بالالہ ء صحرائی   (۴)

ٹھہرا ہے منتظر وہیں جنگل میں آج تک

بچھڑے ہوئے ہیں حسن کے جس کارواں سے ہم   (فقرؔی)

اقبالؔ مزید کہتے ہیں :۔

کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی   مئے گلرنگ خم شام میں تو نے ڈالی

رتبہ تیرا ہے بڑا ، شان بڑی ہے تیری   پردۂ نور میں مستور ہے ہر شے تیری

صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا   زیر خورشید نشان تک بھی نہیں ظلمت کا

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر   جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیوں کر؟

---

(۱) بانگ درا ۔ ۲۰۵ ۔ جواب شکوہ ۔ (۲) بال جبریل ۔ ۱۰۰ ۔ مسجد قرطبہ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۳۱ ۔ (۴) پیام مشرق ۔ ۱۶۷

نو ر سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہو ں میں
کیوں سیہ روز ،سیہ بخت ، سیہ کار ہوں میں ؟

گویا کہ انسان بھی فطرت کا حصہ ہے تو پھر کیوں ہر انسان فطرت کی طرح روشن نہیں؟

فطرت کہتی ہے :۔

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے ‏ ‏ بارجو مجھ سے نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے
نور خورشید کی محتاج ہے ہستی میری ‏ ‏ اور بے منت خورشید چمک ہے تیری
ہائے غفلت ! کہ تری آنکھ ہے پابند مجاز ‏ ‏ ناززیبا تھا تجھے تو ہے مگر گرم نیاز
تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر ، نہ سیہ کا رہے (۱)

جس طرح حسن مطلق اپنے اظہار کے لئے دشت و کہسار اور گل وگلزار کا انتخاب کرتا ہے۔ اسی طرح عشق کے لئے بھی ہو بہو فطرتی ماحول سازگار ہوتا ہے۔ عشق جنوں پرور کا شعلہ شہر کے شوروغل میں بجھ جاتا ہے۔ اس لئے حسن کی طرح، وہ بھی یا تو دشت و کہسار میں خلوت ڈھونڈتا ہے یا بحر بیکراں کے ساحل پر۔

عشق شور انگیز بے پروائے شہر ‏ ‏ شعلۂ او میرد از غوغائے شہر
خلوتے جوید بدشت و کوہسار ‏ ‏ یا لب دریاے ناپیدا کنار (۲)

درصل فطرت کے نباتات و جمادات روز ازل کی طرح آج بھی معصوم ہیں۔ اس لئے ''نور مطلق'' سے قریب تر ہیں۔ جبکہ انسان مصنوعیت کا شکار ہوتے ہوئے ،فطرت سے دور ہو کر ،اپنے آپ سے دور ہوتے ہوئے ،حسن مطلق سے بھی دور ہو کر ظلمت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں آدم نے پہلے محسوسات و موجودات یعنی فطرت کا عقدہ کھولا اور موجودات کی تسخیر سے اپنی ہمت کو آزمایا۔ کوہ وصحرا، دشت و دریا، بحر و بر ارباب نظر کیلئے تعلیم حاصل کرنے کا میدان ہیں، اے وہ شخص جو افیون کی تاثیر سے سویا پڑا ہے اور عالم اسباب و مجاز کو حقیر کہتا ہے۔ اٹھ اپنی خوابیدہ آنکھ کھول اس عالم مجبور کو حقیر نہ کہہ۔ اس لئے کہ یہ حسن مطلق کی نشانیاں ہیں۔ انہیں تسخیر کر ان کی تسخیر میں ''حسن مطلق'' کا قرب ہے۔

---

(۱) بانگ درا۔۵۴۔۵۵۔ انسان اور بزم قدرت۔ (۲) جاوید نامہ۔۱۷۔

عقدۂ محسوس را اول کشود همت از تسخیر موجود آزمود
کوہ و صحرا دشت و دریا بحرو بر تختۂ تعلیم ارباب نظر
اے کہ از تاثیر افیوں خفتۂ عالم اسباب را دوں گفتۂ
خیز و وا کن دیدۂ مخمور را دوں مخواں ایں عالم مجبور را

افلاطون اور اس سے متاثر بریڈلے موجودات کو عکس و سراب کہتے ہیں ۔ عکس و سراب کو مسخر نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لئے اقبالؔ فطرت کو تخلیق بالحق کہتے ہوئے اسے تسخیر کرنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ چنانچہ افلاطون اور اس کے حواری ''تصوراتیوں'' سے متفق نہ ہوتے ہوئے کہتے ہیں ۔ کوئی شخص سراب اور جلوۂ آب کے درمیان امتیاز نہیں کرتا ۔ یعنی تصوراتی فلسفی کی مثال یہ ہے کہ الٹا پانی کو سراب سمجھ رہا ہے ۔

ع کس نداند جلوۂ آب از سراب (۱)

یوں لگتا ہے کہ تصوراتی فلسفی حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا ، ورنہ پیاسا تو سراب کو بھی آب سمجھتا ہے ۔

زنقص تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز دلت فریب اگر از جلوۂ سراب نخورد (عرفی)

بہرحال یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ ''حسن مطلق'' حسن فطرت کے پردے میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے ۔ چراغ لالہ سے پرنور کوہ و دمن اور شاعر کو نغموں پہ اکسانے والا مرغ چمن ، برگ گل پر پڑا شبنم کا موتی ، موتی کو رکھنے والی بادصبا اور پھر اس موتی کو چمکانے والی سورج کی کرن ، دراصل حسن مطلق ہی کی نشانیاں ہیں ۔ محبوب حقیقی کو حسن معنی کہیں یا حسن مطلق بات ایک ہی ہے ۔ کہ اسے کسی ہار سنگھار کی ضرورت نہیں ۔ اس لئے کہ لالے کی حنا بندی میں حسن مطلق بذات خود شامل ہے ۔

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی! (۲)

لہٰذا نہ تو ہم ''لالے'' کے ظاہر کو دھوکہ قرار دے سکتے ہیں اور نہ ''حسن معنی'' کے بارے میں یہ فتویٰ دے سکتے ہیں کہ وہ نہیں ہے ۔ دونوں اپنی اپنی حیثیت میں موجود ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک خالق ہے اور دوسرا تخلیق ۔

چوں حیات عالم از زور خودی است پس بقدر استواری زندگی است (۳)

صنوبر اس ذات کا بندۂ آزاد ہے پھول کے چہرے کی چمک اس کی شراب کی مستی کی وجہ سے ہے ۔ سورج و چاند

---

(۱) پس چہ باید کرد ۔ ۳۴ ۔ (۲) بال جبریل ۔ ۱۴ ۔ (۳) اسرار خودی ۔ ۱۴ ۔

ستارے سب اس کے مظاہر ہیں ۔ مگر انسان کا دل اس کا سربستہ راز ہے ۔

صنوبر بندۂ آزادۂ او فروغ روے گل از بادۂ او

حریمش آفتاب و ماہ و انجم دل آدم درکشادۂ او (۱)

علامہ اقبالؔ بانگ درا کی ایک نظم "جگنو" میں روشنی و نور اور رنگ و سرور کے مختلف حوالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ حسن ازل کس طرح ہر چیز میں نمایاں دکھائی دیتا ہے ۔

حسن قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی پروانے کو تپش دی ، جگنو کو روشنی دی

رنگیں نوابنایا مرغان بے زباں کو گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی

رنگیں کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی

سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو پانی کو دی روانی ،موجوں کو بے کلی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری

جگنو کا دن وہی ہے ، جو رات ہے ہماری (۲)

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے انساں میں وہ سخن ہے ، غنچے میں وہ چٹک ہے

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا واں چاندنی ہے جو کچھ ، یاں درد کی کسک ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ نغمہ ہے بوے بلبل ، بو پھول کی چہک ہے

کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی جگنو میں جو چمک ہے ، وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو ؟

ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشئ ازل ہو (۳)

حسن فطرت وہ ملبوس ہے ، جس میں حسن مطلق اپنے آپ کو بڑے خفیف سے انداز میں ظاہر کرتا ہے ۔ چنانچہ

---

(۱) پیامِ مشرق ۔ ۴۹ ۔ (۲) بانگِ درا ۔۸۴ ۔۸۵ ۔ "جگنو" ۔ (۳) بانگِ درا ۔ ۸۶ ۔ ۸۵ ۔ "جگنو"

اقبالؔ کہتے ہیں ۔ آ، حسن فطرت پر نگاہ ڈال تو ایک گوشے میں کیوں خلوت گزیں بیٹھا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے چشم پاک بیں عطا فرمائی ہے ۔ تا کہ تو اس کے نور سے، حسن فطرت میں حسن مطلق کا دیدار کر سکے ۔

بیابا شاہد فطرت نظر باز چرا درگوشہ ، خلوت گزینی
ترا حق داد چشم پاک بینے کہ از نورش نگاہے آفرینی (۱)

گویا کہ:۔

نگاہ ہو تو بہائے نظارا کچھ بھی نہیں کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی (۲)

حسن ازل کی ، ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں! (۳)

خالق نے روز و شب پیدا کئے اور ان کے ذریعے اپنی صفات کا جلوہ دیکھا و دکھایا ۔ صوفی! تاریک خانقاہ سے باہر نکل کے دیکھ فطرت نے اپنا سارا متاع بازار میں لا کر سجا دیا ہے ۔ صبح ،شفق ، ستارے ، چاند اور آفتاب کا بے پردہ جلوہ فقط ایک نگاہ سے خریدا جا سکتا ہے ۔ یعنی دیکھنے والی آنکھ ہو تو حسن فطرت کے پردوں کے پیچھے ''حسن مطلق'' کا دیدار کیا جا سکتا ہے ۔ تجزیاتی فلسفہ اپنی کور بینی کے باعث کہتا ہے کہ ظاہر کے پس منظر میں کچھ نہیں ۔ اور تصوراتی فلسفہ اس مغالطے میں ہے کہ ظاہر دھوکہ و سراب ہے ۔

صورت گرے کہ پیکر روز و شب آفرید از نقش این و آں بہ تماشاے خودرسید
صوفی ! بروں زہنگۂ تاریک پابنہ فطرت متاع خویش بسوداگری کشید!
صبح و ستارہ و شفق و ماہ و آفتاب بے پردہ جلوہ ہا بنگاہے تواں خرید! (۴)

اور پھر:۔

درکہستاں چوں کلیم آوارہ شو نیم سوزِ آتشِ نظارہ شو (۵)

جیسا کہ فطرت حسن ازل کا لباس ہے لہٰذا اے تجزیاتی فلسفیو (لاک ، برٹرنڈرسل ، جی مور ، جان سٹارٹ مل ، (ہیوم) اور تصوراتی فلاسفرو (افلاطون ، بریڈلے ، بارکلے) چشم خرد سے کثرت کا تماشا کرو کہ تم ''احد'' کا نظارہ کر سکو ۔ کائنات حسن

---

(۱) پیام مشرق ۔۶۰ ۔ (۲) ضرب کلیم ۔۱۰۴۔''نگاہ'' (۳) بال جبریل ۔ ۱۱۱۔ ''ذوق و شوق'' (۴) زبور عجم ۔ ۱۳۴۔
(۵) جاوید نامہ ۔ ۴۹ ۔

ازل کا پیرہن ہے۔ اس پیرہن سے محبوب حقیقی کی خوشبو آ رہی ہے۔ جیسے یعقوبؑ نے کنعاں میں بیٹھے ہوئے قمیض یوسفؑ کی خوشبو پالی تھی۔

بہ بسیاری کشاچشم خرد را کہ دریا بی تماشائے احد را
نصیب خود زبوے پیرہن گیر بہ کنعاں نکہت از مصرو یمن گیر (۱)

لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ارسطو کی مدرسیت ہو یا تجزیاتی و تصوراتی فلسفہ، سبھی فلسفوں نے مل کر انسان کو راہ راست سے بھٹکاتے ہوئے، اس کی نگاہ سے حسن مطلق کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش! (۲)

حسن فطرت اور حسن مطلق کے حوالے سے ''اقبال کے ذوق جمال'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر قاضی عبدالحمید رقم طراز ہیں کہ:-

'' علامہ موصوف کو قیمتی پتھروں خصوصاً ہیروں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس لئے نہیں کہ ان کی مادی قیمت زائد ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں شاعر کی نگاہ ''حسن ازل'' کی ایک جھلک دیکھتی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا کہ کس طرح ان کو حکیم اجمل خان صاحب مرحوم سے یہ خبر ملی کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے پاس ایک بیش بہا ہیرا ہے، جو نہایت چمکیلا ہے۔ جس وقت علامہ اقبال کی ملاقات اعلی حضرت سے ہوئی تو انہوں نے اس ہیرے کے دیکھنے کی خواہش کی۔ اعلی حضرت نے فوراً اس ہیرے کو منگوایا۔ اقبالؔ نے پھر اس ہیرے کی چمک اس کے وزن اور اس کے حسن کا مکمل تذکرہ کیا۔ وہ یہ واقعہ جس جوش و خروش سے بیان کر رہے تھے۔ اور جس طرح ان کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی چمک پیدا ہو رہی تھی۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ حسن کا ہر مظہر کس طرح شاعر کی روح کے عمیق ترین جذبات کو چھیڑ دیتا ہے اور پھر وہ اسی سرمستی میں حسن ازلی کے گیت الاپنا شروع کر دیتا ہے۔'' (۳)

اقبالؔ کی نگاہ جمال پرست اور دل عشق پرور ہے۔ وہ اس فضائے بسیط میں حسن فطرت کے حسین و جمیل مرقعے دیکھتے ہیں تو حسن مطلق کی جھلکیوں سے مدہوش ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں، اے دل! راز حیات کلی سے سمجھ۔ اس کے مجاز میں حقیقت بے نقاب ہے۔ کلی خاک تیرہ سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس کی نظر آفتاب کی شعاع پر رہتی ہے۔ اسی طرح

---

(۱) زبور عجم۔۱۵۳۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۸۳۔ ''مدرسہ''۔ (۳) ''اقبال''۔۱۹۳۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی۔۱۹۴۴ء۔

دل بدن کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس کی زندگی اللہ تعالیٰ سے تعلق سے وابستہ ہے۔

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب حقیقت درمجازش بے حجاب است
زخاک تیرہ می روید و لیکن نگاہش برشعاع آفتاب است (۱)

گویا کہ بے شک:۔

حسن ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکس گل ہو شبنم کی آرسی میں (۲)

اللہ تعالیٰ کا نور باغ و راغ میں پھیلا ہوا ہے۔ مٹی کا یہ بدن اس کی محبت کی شراب سے روشن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کسی شخص کے جہان کو تاریک نہیں چھوڑا۔ ہر دل کے اندر، اس کی محبت کے داغ کا چراغ شعلہ طور بنا ہوا ہے۔

فروغ او بہ بزم باغ و راغ است گل از صہبائے او روشن ایاغ است
شب کس درجہاں تاریک نگذاشت کہ در ہر دل زداغ او چراغ است (۳)

حسن مطلق کی حسن پاشایاں دیکھنا ہوں تو حسن فطرت کا نظارہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ بھی اس کی دید کا ایک طریقہ ہے اقبالؔ کہتے ہیں، اٹھ! کہ کوہ و دشت میں ابر بہار نے خیمہ گاڑا ہے۔ بلبل، طوطی، دراج، تلیر سب مست ترنم ہیں، محبوب حقیقی کی شان میں نغمے الاپ رہے ہیں۔ ندی کے کنارے پھولوں کی کیاریاں اور گل لالہ کے تختے ہیں۔ دیکھنے والی آنکھ پیدا کر، اٹھ! کہ کوہ و دشت میں ابر بہار نے خیمہ گاڑا ہے۔

خیز کہ درکوہ و دشت، خیمہ زد ابر بہار
مست ترنم ہزار
طوطی و دراج و سار
کشت گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار
خیز کہ درکوہ و دشت، خیمہ زد ابر بہار

---

(۱) پیام مشرق۔ ۶۱۔ (۲) بانگ درا۔ ۱۷۴۔ (بزم انجم)۔ (۳) پیام مشرق ۶۱۔۔۔

اٹھ! کہ باغ و راغ میں پھولوں کا قافلہ پہنچ گیا ۔ باد بہاری چلی ۔ پرندے نے صدا بلند کی ۔ لالے نے گریبان پھاڑ ڈالا ۔ حسن نے تازہ پھول چنے ۔ عشق نے نیا غم خریدا ۔ اٹھ کہ باغ و راغ میں پھولوں کا قافلہ آ پہنچا ۔

خیز کہ درباغ و راغ ، قافلہ گل رسید

باد بہار ان وزید

مرغ نوا آفرید

لالہ گریباں درید

حسن گل تازہ چید

عشق غم نو خرید

خیز کہ درباغ و راغ ، قافلہ ء گل رسید

بلبلیں نغمہ ریز ہیں ، فاختائیں محو ترنم ہیں ۔ خون چمن جوش میں ہے ۔ تو جو خموش بیٹھا ہے ۔ آئین ہوش کی پابندی چھوڑ ۔ حقیقت کی شراب پی ۔ گیت گا ، پھولوں سے لطف اندوز ہو ۔ بلبلیں نغمہ ریز ہیں ، فاختائیں محو ترنم ہیں ۔

بلبلگاں درصفیر ، صلصلگاں درخروش

خون چمن گرم جوش

اے کہ نشینی خموش

درشکن آئین ہوش

بادۂ معنی بنوش

نغمہ سرا ، گل بپوش

بلبلگاں درصفیر ، صلصگاں درخروش

حجرہ نشینی چھوڑ ۔ گوشہ ء صحرا اختیار کر ۔ ندی کے کنارے بیٹھ ۔ آب رواں کو دیکھ ۔ ناز آفریں نرگس جو بہار کے دل کا ٹکڑا ہے ۔ پانی کی جبیں پر بوسہ دے رہی ہے ۔ حجرہ نشینی چھوڑ ۔ گوشہ صحرا اختیار کر ۔

حجرہ نشینی گزار ، گوشہ ء صحرا گزیں

بر لب جوئے نشیں

آب رواں را بہ بیں

نرگس ناز آفریں

لخت دل فرو دیں

بوسہ زنش برجبیں

حجرہ نشینی گزار ، گوشہ ء صحرا گزیں

تو جو حسن عیاں سے بے خبر ہے حقیقت بیں آنکھ کھول ۔ گل لالہ کمر در کمر ۔ آتشیں لباس پہنے ہے ۔ شبنم اس کے جگر پر اشک سحر ٹپکاتی ہے ۔ شفق کے پس منظر میں روشن ستارہ کو دیکھ ۔ تو جو حسن عیاں سے بے خبر ہے ، حقیقت بیں آنکھ کھول ۔

دیدۂ معنی کشا، اے زعیاں بیخبر

لالہ کمر در کمر

نیمۂ آتش بہ بر

می چکدش برجگر

شبنم اشک سحر

درشفق انجم نگر

دیدۂ معنی کشا ، اے زعیاں بیخبر

خاک چمن نے راز حیات ظاہر کر دیا ؟ جلوۂ صفات کا کہیں ہونا ، کہیں نہ ہونا ۔ ذات باری تعالی کی جلوہ گری ، جسے تو حیات سمجھتا ہے ۔ جسے تو موت کہتا ہے ۔ کسی کو ثبات نہیں ۔ خاک چمن نے راز حیات ظاہر کر دیا۔

خاک چمن وا نمود راز دل کائنات

بود ونبود صفات

جلوہ گر یہائے ذات

آنچہ تو دانی حیات

آنچہ تو خوانی ممات

ہیچ ندارد ثبات

خاک چمن وا نمود ، راز دل کائنات (۱)

گویا کہ ''اقبال کا ذوق جمال'' گواہی دیتا ہے کہ'' حسن مطلق''، محبوب حقیقی کی صورت میں گل وگلزار اور ابر بہار کے روپ میں مجسم ہوہو کر جلوہ آرائی کر رہا ہے۔

بیاساقی نوائے مرغ زار ازشا خسار آمد

بہار آمد ، نگار آمد ، نگار آمد قرار آمد! (۲)

گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں یہ سبھی سورۂ و الشمس کی تفسیریں ہیں (۳)

ابر بہار نے وادی وصحرا میں خیمے گاڑ دیئے ہیں ۔ بادوباراں کا سماں ہے۔ فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور، ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور۔ پہاڑی اٹھانوں اور ڈھلوانوں سے آبشاریں صدائیں دے رہی ہیں۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ نہ ہم دھوکہ و فریب ہیں۔ نہ حقیقت، بلکہ تخلیق بالحق ہیں۔

کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد (۴)

چنانچہ اگر کہیں سے پردہ دریا پردہ سوز نگاہ مل جائے تو موسم بہار اور گل وگلزار کے پردوں میں حسن مطلق کا دیدار کیا جاسکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک بجا طور پر شراب عشق کے ذریعے موجودات ومحسوسات کے پردوں کو ہٹایا جا سکتا ہے۔

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز کہ آتی نہیں فصل گل روز روز

وہ مئے جس سے روشن ضمیر حیات وہ مئے جس سے ہے مستی کائنات

---

(۱) پیام مشرق۔ ۹۱ تا ۹۳۔ ''فصل بہار''۔ (۲) بانگِ درا ۲۷۵۔ (۳) بانگِ درا۔ ۵۴۔ انسان اور بزم قدرت۔
(۴) بانگِ درا۔ ۲۷۵۔

وہ مے جس میں ہے سوز و ساز ازل!   وہ مے جس سے کھلتا ہے راز ازل! (۱)

چاند اور نور آفتاب کے درمیان تہ درتہ فضا کے کئی حجاب ہیں ۔ اسی طرح ہمارے سامنے بھی حسن مطلق نے کئی پردے لٹکا کر اپنے آتشیں جلوؤں کو پیچ در پیچ بنا دیا ہے ۔ تاکہ کم سوزی سے دل میں اور زیادہ سوز پیدا ہو ۔ اور اس سوز سے ذوق وشوق وعشق وآرزو میں تڑپ پیدا ہو ۔ اسی حسن مطلق کی تپش سے گل لالہ کی رگوں میں خون ہے ۔ اسی کے رقص سے ندی پارے کی طرح بے قرار رہتی ہے ۔

درمیان ماہ و نور آفتاب   از فضائے تو بتوچندیں حجاب!
پیش ماصد پردہ را آویختند   جلوہ ہائے آتشیں را بیختند
تازکم سوزی شوددل سوز تر   ساز گار آید بشاخ و برگ و بر
از تب او درعروق لالہ خوں   آبجو از رقص او سیماب گوں (۲)

اقبالؔ حسن فطرت کے جوبن کی مختلف مثالوں سے تجزیاتی فلسفیوں اور تصوراتی فلاسفہ پر ثابت کر رہے ہیں کہ نہ یہ دھوکہ ہے اور نہ فریب ۔ بلکہ دیکھنے والی آنکھ ہو تو حسن فطرت کے پس منظر میں حسن مطلق جلوہ گر ہے ۔

باغ ہے فردوس یا اک منزل آرام ہے ؟   یارخ بے پردۂ حسن ازل کا نام ہے ؟ (۳)

اے تجزیاتی فلسفی یہ کائنات بے شک تخلیق بالحق ہے اور اے تصوراتی فلسفی موجودات دھوکہ وفریب نہیں بلکہ یہ اس ہستی کی نمودی صفات ہیں ۔ جو نظام دہر میں ، پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے ۔

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی   تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی! (۴)

گویا کہ تجزیاتی وتصوراتی فلسفی راندۂ درگاہ ، بھٹکے ہوئے راہی ہیں ۔ ان کے انداز فکر نے انہیں حقیقت سے دور کر دیا ہے ۔ چنانچہ اقبالؔ کھل کر کہنے میں باک نہیں رکھتے کہ :۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود   مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا!
وجود کیا ہے؟ فقط جوہر خودی کی نمود   کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا (۵)

چنانچہ :۔

---

(۱) بانگِ جبریل ۔ ۱۲۳۔ ''ساقی نامہ'' ۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۸۷۔ (۳) بانگِ درا ۔ ۳۹۔ ''خفتگانِ خاک سے استفسار''
(۴) بالِ جبریل ۔ ۳۵۔ (۵) ضربِ کلیم ۔ ۳۴۔

بیا کہ بلبل شوریدہ نغمہ پرداز است　　　عروس لالہ سراپا کرشمہ و ناز است　　(۱)

حسن ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں　　　کہتے ہیں بے قرار ہے جلوہ عام کے لئے　　(۲)

اقبالؔ اپنے کلام کے ذریعے جگہ جگہ تجزیاتی فلسفے سے اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ اگر مانی مصور کے نقوش ، مانی کے بنانے کے بغیر نہیں بن سکتے تو دنیائے چمن کے یہ زندہ و تابندہ آثار بھی خود بخود معرض وجود میں نہیں آگئے ۔ آخر کوئی ہستی ہے کہ جس نے گل لالہ کی دلہن کو رنگ روپ اور موسم بہار کو نکہت و خوشبو سے سرفراز کیا ۔ اے تجزیاتی فلسفی آ اور حسن فطرت پر غور وفکر کر ، تاکہ تجھے حسن مطلق کی کرشمہ سازی کا یقین ہو جائے ۔ اور تو پھر یہ نہ کہے کہ جو کچھ ہے ظاہر ہے ۔ پس پردہ کچھ بھی نہیں ۔

بیا کہ ساقیء گل چہرہ دست برچنگ است　　　چمن زبادبہاراں جواب ارژنگ است

حنا زخون دل نو بہار می بندد　　　عروس لالہ چہ اندازہ تشنہ رنگ است !

نگاہ می رسد از نغمہء دل افروزے　　　بمعنئی کہ برو جامہء سخن تنگ است　　(۳)

اگر تیرا دل فطرت شناس ہوتو ، تو گل و لالہ سے گفتگو کر سکتا ہے ۔ وہ تجھے محبوب حقیقی سے آگاہ کر سکتے ہیں ۔ تو فطرت کی زبان ہی نہیں سمجھتا ، اور بڑی آسانی سے کہہ دیتا ہے کہ مجاز کے علاوہ کچھ بھی نہیں ۔

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو　　　سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر　　(۴)

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں　　　یہ شیریں بھی ہے گویا بیستوں بھی ،کوہکن بھی ہے　　(۵)

اسی طرح اقبالؔ ہیگل کی زبانی اپنے کلام میں کہتے ہیں کہ باغ و راغ نے چھپے ہوئے معنی ظاہر کر دیئے ۔ یہ چھپے ہوئے معنی ''حسن مطلق'' کے علاوہ کچھ بھی نہیں ۔ چنانچہ حنظل اور انگور کو عین حقیقت دیکھ ۔ اگر حقیقت نہ ہوتی تو ان کا بھی کوئی وجود نہ ہوتا ۔

جلوہ دہدباغ و راغ معنئی مستور را　　　عین حقیقت نگر حنظل و انگور را　　(۶)

تجزیاتی فلسفے کے ردعمل میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ'' حسن مطلق ''ہی عین حقیقت ہے ۔ بلبل شیریں نوا ہو یا شاہین شکاری ، یہ سب اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں ۔ جمال حیات ہو یا جلال حیات سب اللہ تعالیٰ کی شان کی شان کے رہین منت

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۱۷۷۔　　(۲) بانگِ درا ۔ ۱۴۳۔　　(۳) پیام مشرق ۔ ۱۵۱۔

(۴) بالِ جبریل ۔ ۱۴۷۔　　(۵) بانگِ درا ۔ ۷۶۔تصویر درد　　(۶) پیام مشرق ۔ ۱۹۷۔

ہیں

مرغ خوش لہجہ و شاہین شکاری از تست　　زندگی را روش نوری و ناری ازتست　　(۱)

سورج بجلی، آگ، شرارے اور بحر میں "حسن مطلق" کا جلال ہے۔ جبکہ چاند کی ٹھنڈک، آسمانوں کی بلندی، بحر کے کنارے، انسان کی صورت، شجر، پھول، نگینے اور ستارے میں اس کا جمال پایا جاتا ہے۔ تجزیاتیوں اور تصوراتیوں کے برخلاف یہ سب صفات ہیں۔ اور حقیقت کے بغیر نہیں۔

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں شرارے میں　　جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

بلندی آسمانوں میں زمینوں میں تری پستی　　روانی بحر میں افتادگی تیری کنارے میں

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے　　شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں　　(۲)

آفتاب و مہتاب کے علاوہ چھوٹے سے چھوٹا ذرہ اور طورسینا بھی "حسن مطلق" ہی کی تجلی کا مظہر ہے۔ دیکھنے والی آنکھ کے لئے، طورسینا تو ہے ہی طورسینا، ہمالہ بھی اس کی شان کبریائی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے جلوۂ حسن مطلق کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے　　تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے　　(۳)

حسن مطلق فطرت کے تمام مظاہر میں ظاہر ہے۔ اس کی یہ نمود انسان کی دید کی خاطر بھی ہے۔ یعنی وہ انسان کو دیکھنا چاہتا ہے گویا کہ نرگس کی آنکھ کے پردے میں "حسن مطلق" کی آنکھ محو تماشا رہتی ہے اور گلزار ہست و بود کے پردے میں محبوب حقیقی اپنا جلوہ بھی انسان پر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ قدم قدم پر حسن مطلق کی نشانیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اسی لئے تو اقبال کہتے ہیں:۔

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ　　ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر　　ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ　　(۴)

ریاض ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوا پیدا

حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیاں ہے رنگ و بو کا　　(۵)

---

(۱) زبور عجم۔۳۴۔ (۲) بانگ درا۔ ۱۳۸۔ (۳) بانگ درا۔ ۲۱۔ "ہمالہ" (۴) بانگ درا۔ ۹۸۔ (۵) بانگ درا۔ ۱۳۷۔

یہ ذوق دید عشق ہے، عشق کے بغیر تجلی حسن مطلق نصیب نہیں ہوسکتی۔ پھر کہتے ہیں ہم اللہ تعالی کی گم شدہ متاع ہیں، وہ ہماری جستجو میں ہے کہ ان میں سے کوئی صاحب عشق میری معرفت حاصل کرے ۔ یہ ہے اس کی آرزو اور خواہش ، جس کے لئے کائنات تخلیق فرمائی ۔ کبھی وہ برگ لالہ پر اپنا پیام لکھتا ہے اور کبھی وہ پرندوں کے سینوں میں بیٹھ کر ان کی ہا و ہو کا سبب بننے کے ساتھ ساتھ صدا کی صورت میں اپنی جھلک دکھاتا ہے کبھی وہ نرگس میں بیٹھ کر ہمارے جمال کا نظارہ کرتا ہے۔ اور ہمیں اپنی دید کی دعوت دیتا ہے ۔ یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ نرگس کی آنکھ گفتگو کرتی ہے ۔ اس نے صبحدم ہمارے فراق میں جو آہ بھری ، وہ کائنات کے باہراندر ، اوپر نیچے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے ۔ کائنات کی یہ ساری ہنگامہ آرائی آدم خاکی کے دیدار کے لئے ہے ۔تماشائے رنگ و بو اسی کے نظارے کا بہانہ ہے ۔ لیکن افسوس اس بے خبر کو اس کی خبر تک نہیں کہ اس کی حیثیت کتنی زیادہ ہے ۔ اسی لئے تو یہ خسارے میں رہتا ہے، حسن مطلق ذرے ذرے میں پنہاں ہے ۔ گویا کہ فطرت یا کائنات وحدت الشہود کا ایک لامحدود سلسلہ ہے ۔ حسن مطلق چاند کی طرح ظاہر ہے ۔ اور کاخ و کو پر چھایا ہوا ہے ۔ مگر ہم سے پھر بھی ناآشنا ہے ۔ اس لئے کہ ہم نے اس سے رخ موڑا ہوا ہے ۔ ہمارے خاکدان میں زندگی کا موتی گم ہے ۔ یہ گم شدہ موتی ہم ہیں یا وہ ؟

ماز خدائے گم شدہ ایم او بجستجوست — چوں مانیاز مند و گرفتار آرزوست

گاہے بہ برگ لالہ نویسد پیام خویش — گاہے درون سینۂ مرغاں بہ ہا وہوست

درنرگس آرمید کہ بیند جمال ما — چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگوست!

آہے سحر گہے کہ زندور فراق ما — بیرون و اندروں ، زبر و زیروچار سوست!

ہنگامہ بست از پے دیدار خاکئے — نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بوست

پنہاں بہ ذرہ ذرہ نا آشنا ہنوز — پیدا چوماہتاب و آغوشِ کاخ و کوست

درخاکدان ماگہر زندگی گم است — ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست؟ (۱)

فطرت خاموش اپنے آپ میرے دل پر یورش کرتی ہے ۔ گویا نوائے شوق سے ساز خود مضراب سے ٹکراتا ہے ۔

بردل من فطرت خاموش می آرد ہجوم — ساز از ذوق نوا رابمضرابے زند (۲)

---

(۱) زبور عجم ۔ ۹۳ ۔ (۲) زبور عجم ۔ ۱۱۱ ۔

جہان رنگ وبو سامنے ہے اور تو کہتا ہے یہ راز ہے ۔ ذرا اس کے تار کو چھیڑ کے دیکھ یہ جہان تو ساز ہے ۔ اور تو اس کا مضراب نگاہ جلوہ بدست ،تو جلوے کی صفائی کے باعث قدم قدم پر پھسل رہی ہے ۔ اور تو کہتا ہے یہ حجاب ہے ، یہ نقاب ہے ، یہ مجاز ہے ۔ اٹھ اور اس نیلگوں پردے کی طنابیں کاٹ دے کیوں کہ نگاہ پاکباز پر حقیقت مثل شعلہ عریاں ہے ۔ میرے لئے میری دنیا فردوس بریں سے خوش تر ہے ۔ کیوں کہ یہ مقام ذوق وشوق بھی ہے اور حریم سوز و ساز بھی ۔ کبھی میں اپنے آپ کو گم کر دیتا ہوں اور کبھی اس کو گم کر دیتا ہوں اور کبھی دونوں کو پا لیتا ہوں ۔ معلوم نہیں یہ کیا راز ہے ؟

جہان رنگ و بو پیدا تو می گوئی کہ راز است ایں — یکے خود را بتارش زن کہ تو مضراب و ساز است ایں

نگاہ جلوہ بدست از صفائے جلوہ می لغزد — تو می گوئی حجاب است ایں نقاب است ایں مجاز است ایں

بیادرکش طناب پردہ ہائے نیلگو نش را — کہ مثل شعلہ عریاں برنگاہ پاکباز است ایں

مرا ایں خاکدان من زفردوس بریں خوشتر — مقام ذوق و شوق است ایں ، حریم سوز ساز است ایں

زمانے گم کنم خود راز مانے گم کنم اورا — زمانے ہر دورا یابم ! چہ راز است ایں ! چہ راز است ایں (۱)

جاوید نامہ میں جب زندہ رود (اقبالؔ) مولانا رومیؒ کے ہمراہ سیر افلاک کے دوران میں مریخ پر پہنچتے ہیں تو ''زندہ رود'' اپنے تعارف میں رومی کی زبانی ایسا کلام پیش کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبالؔ نے انگور والی عام شراب تو نہیں پی ،لیکن کرۂ ارض پر موجودات وحسن فطرت کے نظارے کے باعث زندہ رود میں سرخوشی پائی جاتی ہے۔ اقبالؔ رومی کی زبانی کہلواتے ہیں کہ ہم زمین پر ''حسن فطرت'' کے پردوں میں حسن مطلق کے جلوؤں سے اس قدر سرمست ہوئے ہیں کہ تازہ بہ تازہ جلوؤں کی جستجو میں آسمانوں پر نکل آئے ہیں ۔ گویا کہ یہاں بھی اقبالؔ ''زندہ رود'' کی صورت میں تجزیاتی و تصوراتی فلسفیوں کو جواب دے رہے ہیں کہ یہ موجودات ومحسوسات تخلیق ہیں اور ایک ہستیٔ مطلق نے انہیں تخلیق کیا ہے۔ تصوراتی افلاطون و بریڈلے کے لیے یہ جواب ہے کہ اگر موجودات محض عکس یا سراب ہوتے تو، انہیں دیکھ کر عاشقِ حسن مطلق پر سرخوشی ہرگز نہ طاری ہوتی ___ دوسری بات یہ بھی ہے کہ زمینوں کے علاوہ آسمانوں پر بھی ، ہر جگہ ''حسن مطلق'' ہی حسن مطلق ہے۔

من ز افلاکم ، رفیق من زخاک — سر خوش و نا خوردہ از رگہائے تاک!

---

(۱) زبور عجم ۔ ۱۳۱۔

مردے بے پرواہ .و نامش زندہ رود مستی ٔ او ، از تماشائے وجود!
ما کہ در شہرِ شما افتادہ ایم در جہان و از جہاں آزادہ ایم

در تلاشِ جلوہ ہائے نو بنو
یک زماں مارا رفیق راہ شو (۱)

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں ، دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں
گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں (۲)

حسن ایک ہی ہے اس کے جلوے اور روپ مختلف ہیں۔ اس لیے میں حسنِ کل کو اجزاء میں تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن تجزیاتیوں کی طرح میں ان اجزاء کا تجزیہ نہیں کرتا کہ ایسا کرنے سے حسن یکجا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ اور پلے کچھ بھی نہیں پڑتا۔

جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہو گا (۳)

اللہ تعالیٰ بھی کیا بے پرواہ ذات ہے۔ تجزیاتی و تصوراتی فلسفیوں کی صورت میں انسان پیدا کر کے اس نے خود ہی اپنے نکتہ چیں پیدا کر لیے ہیں۔ تصوراتی اس کی صفات کو جھٹلاتے ہیں جبکہ تجزیاتی صفات کو حقیقت قرار دیتے ہیں۔ مگر حقیقت کو جھٹلاتے ہیں۔ عجیب بات ہے یہ لوگ مصور کی تصویریں ہو کر اپنے مصوّر کو جھٹلا رہے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ مصور کے بغیر تصویر نہیں بن سکتی۔ حسن اگر صرف موجودات تک محدود ہوتا تو انسان کا تخیل ہرگز اس قدر لا انتہا نہ ہوتا۔

جستجو کُل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے حسن بے پایاں ہے ، درد لا دوا رکھتا ہوں میں
مجکو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا نقش ہوں اپنے مصور سے گلا رکھتا ہوں میں
محفلِ ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن پھر تخیل کس لیے لا انتہا رکھتا ہوں میں (۴)

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۰۴۔ (۲) بانگِ درا۔ ۱۲۳۔ (۳) بانگِ درا۔ ۱۴۱۔ (۴) بانگِ درا۔ ۱۲۳۔

حسن مطلق پر مر مٹنے والا موجودات کے پردوں میں ضم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کے مطابق جہاں جہاں حسن مطلق ہے، وہاں وہاں منصور حلاج ہے۔

آخر از دار و رسن گیرد نصیب   برنگردد زندہ از کوئے حبیب!
جلوۂ او بنگر اندر شہر و دشت   تانہ پنداری کہ از عالم گزشت!
در ضمیر عصر خود پوشیدہ است
اندریں خلوت چساں گنجیدہ است؟ (۱)

تجزیاتی اور تصوراتی فلسفی تصویر کا صرف ایک ایک رُخ دیکھتے ہیں۔ اقبالؔ ان کو مشاہدہ حسن فطرت کی دعوت دے کر حسنِ مطلق کے دیدار کی ترغیب اور ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اقبالؔ تجزیاتیوں اور تصوراتیوں سے کہہ رہے ہیں کہ گو حسن فطرت ہر جگہ ہے مگر خاص کر، کشمیر کے برف پوش پہاڑ اور آتشیں دستِ چنار دیکھو۔ یہ خطہ فصلِ بہار میں پتھروں سے لعل رنگ پھول اگاتا ہے اور اس کی خاک سے ایک طوفانِ رنگ اٹھتا ہے۔ اس کے پہاڑوں اور وادیوں میں بادل کے ٹکڑے اس طرح پھرتے ہیں جیسے دھنیے کی کمان سے دھنی ہوئی روئی۔ وہاں کے پہاڑ، دریا اور غروبِ آفتاب کا منظر اتنا خوبصورت ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ کا جمال بے نقاب نظر آتا ہے۔

کوہ ہائے خنگ سارِ او نگر   آتشیں دستِ چنارِ او نگر!
در بہاراں لعل می ریزد زسنگ   خیزد از خاکش یکے طوفانِ رنگ!
لکہ ہائے ابر در کوہ ودمن   پنبہ پرّاں از کمانِ پنبہ زن!
کوہ و دریا و غروب آفتاب!   من خدا را دیدم آنجا بے حجاب! (۲)

یہی وجہ ہے کہ ''اقبالؔ کا ذوقِ جمال'' اس حقیقت کی بھی غمازی کرتا ہے کہ:

عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے!   حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے (۳)
خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں   صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکین
دلِ ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی   نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۲۴۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۱۶۱۔ (۳) بانگِ درا۔ ۴۸۔ ''آفتاب صبح''۔ (۴) بانگِ درا۔ ۱۱۷۔ کی گود میں بلی دیکھ کر

کہیں سامانِ مسرت، کہیں سازِ غم ہے کہیں گوہر ہے، کہیں اشک، کہیں شبنم ہے (۴)

اور پھر اقبالؔ کے مطابق:

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگاہ کو نظارے کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا (۱)

اقبالؔ کہتے ہیں، پہلے آب و گل یعنی مادی دنیا کے اسرار سے واقفیت حاصل کر۔ پھر اس پر اکسیرِ دل یعنی عشق کا آبِ حیات ڈال۔ اس طرح معرفت ''حسنِ مطلق'' حاصل ہو جائے گی۔

باخبر شو از رموز آب و گل پس بزن بر آب و گل اکسیر دل (۲)

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ایک فضا میں سینکڑوں جہاں مخفی ہیں۔ ایک ایک ذرے میں کئی کئی خورشید پنہاں ہیں۔ ان آفتابوں کی شعاعوں سے نا معلوم کو دریافت کر اور ایسے اسرار کھول جو ابھی تک انسان کے فہم سے بالا ہیں۔ اپنی آنکھ کھول اور اشیاء کی ماہیت سمجھ۔ یعنی شراب کے پردے میں چھپے ہوئے نشے کو دیکھ۔

صد جہاں در یک فضا پوشیدہ اند مہر ہا در ذرّہ ہا پوشیدہ اند
از شعاعش دیدہ کن نادیدہ را وانما اسرار نا فہمیدہ را
چشمِ خود بکشا و در اشیاء نگر نشّہ زیرِ پردۂ صہبا نگر (۳)

تجزیاتی و تصوراتی فلسفیوں کے برعکس اقبالؔ کہتے ہیں کہ حسنِ مطلق وہ ہے، جن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے۔ یہ حسنِ مطلق ہی کا کمال ہے کہ اس نے ابرِ کوہسار کو گوہر بار بنایا اور پھر اس کے ذریعے نباتات و جمادات میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

سر پہ سبزے کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے (۴)

---

(۱) بانگِ درا۔ ۱۳۷۔ (۲) مثنوی مسافر۔ ۶۸۔ (۳) رموزِ بیخودی۔ ۱۴۳۔ (۴) بانگِ درا۔ ۲۷۔ ''ابرِ کہسار''

تصوراتیوں کے لیے جواب یہ ہے کہ بادل اگر عکس یا دھوکہ ہوتا تو زندگی کے موتی ہرگز نچھاور نہ کرسکتا۔اور نہ بارش کے موتیوں میں ایسی تاثیر ہوتی کہ ان سے انواع واقسام کی فصلیں ومیوے اور گل وگلزار پھلتے پھولتے۔ پھر وہی پانی پی کر انسان وحیوان بھی پروان چڑھتے اور زندہ رہتے ہیں۔ ظاہر اگر دھوکہ ہے تو پھر ہم بھی دھوکہ ٹھہرتے ہیں۔ کیا افلاطونؔ اور بریڈلےؔ بھی سراب تھے؟

تجزیاتیوں کے لیے جواب یہ ہے کہ کوئی بھی چیز خود بخود نہیں بن جاتی۔مصور کے موقلم ، رنگ اور اس کی بنائی ہو تصویر اگر خود بخود نہیں بن سکتی تو موجودات کی یہ وسیع وعریض کائنات کیسے وجود میں آ گئی۔ یقیناً کائنات اور اس پر برسنے والے بادلوں کو ''واجب الوجود'' ہستی نے بنایا۔ جو مظاہرِ فطرت کے پس پردہ موجود ہے مگر افسوس تجزیاتی فلسفی مصور اور تصویر کو تو مانتا ہے ،لیکن جس خالق نے مصور کو پیدا کیا اسے یہ فلسفی ماننے سے انکاری ہے۔ اقبال کے نزدیک آخر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ ساز گار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوے انقلاب؟ (۱)

اور پھر

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدہ ٔ عبرت کہ گل
ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا (۲)

چنانچہ:

(۱) بالِ جبریل ۔ ۱۱۹۔ (۲) بانگِ درا ۔ ۱۰۰۔ (۳) ایضاً۔

حسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیونکر ہوا (۳)

اقبالؔ انجان بن کر معروضیوں سے پوچھتے ہیں کہ معلوم نہیں موجِ دریا کو یہ چشمِ بینا کس نے عطا کی ہے کہ وہ سنگریزے ساحل پر پھینک دیتی ہے اور موتی دریا کے سینے میں دفن کر دیتی ہے۔ یقیناً تجزیاتیوں کے لیے سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ کوئی ہستی (اللہ تعالیٰ) ضرور ہے جس نے دریا بنایا اور دریا کو ایسی ''دیدہ وری'' بھی عطا کی۔

نمیدانم کہ داد ایں چشمِ بینا موج دریا را گہر در سینۂ دریا، حزف بر ساحل افتاداست (۱)

تجزیاتی فلسفی ظاہر پرست ہیں اور ان کی مثال طفلِ شیر خوار کی سی ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک تجزیاتی فلسفی چھوٹے بچے کی طرح نادان ہیں۔ اگر ان کی ظاہر پرست آنکھ چشمِ بینا بن جائے تو حقیقت کو اپنے خانۂ دل ہی میں دیکھ لیں۔

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسن ظاہری کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری (۲)
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے (۳)

تجزیاتی فلسفیوں کو ظاہر کی آنکھ سے جب حسن مطلق نظر نہیں آتا۔ تو اس سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ اقبالؔ نے ان کی مثال اس تصویر سے دی ہے۔ جو اپنے مصور کو دیکھ نہ سکنے کی بنا پر، مصور کی ہستی سے ہی انکار کر دے۔ ارمغانِ حجاز (اردو) میں کہتے ہیں:

کہا تصویر نے تصویر گر سے نمائش ہے مری تیرے ہنر سے
ولیکن کس قدر نا منصفی ہے کہ تو پوشیدہ ہو میری نظر سے!

جواباً مصور کہتا ہے:

تو ہے میرے کمالات ہنر سے نہ ہو نو مید اپنے نقش گر سے
مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے (۴)

گویا کہ اگر کوئی اپنے آپ کو دیکھ لے، پا لے تو حسن مطلق کو بھی پا سکتا ہے۔ جمالیات کی اس بحث میں، اقبالؔ نے کیسے خوبصورت انداز میں تجزیاتی فلسفے کا توڑ پیش کیا ہے۔ وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ بزمِ کائنات میں، حسن فطرت کے

---

(۱) زبورِ عجم۔ ۱۰۳۔ (۲) بانگِ درا۔ ۶۷۔ ''طفلِ شیر خوار'' (۳) ایضاً۔ ۸۲۔ ''سرگزشت آدم''۔ (۴) ارمغانِ حجاز۔ ۱۸۔ ۱۹۔

پردوں میں نورِ مطلق کی ''لو'' یا ''روشنی'' ہے۔

صبح ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق — آوازِ کن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق
یہ حکم تھا کہ گلشنِ کن کی بہار دیکھ — ایک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ
مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب ِ وجود کی — شامِ فراق، صبح تھی میری نمود کی (۱)

جس طرح مہٗ کامل سے پانیوں میں مدو جزر ہوتا ہے۔ اسی طرح ''حسن ازل'' کے جزب یا تجلّی سے بذاتِ خود مہٗ کامل اور فطرت کی دوسری اشیاء میں حسن کی ہلچل اور مد و جزر رونما ہوتا رہتا ہے۔ موج کا ساحل یا منزل ''حسن مطلق'' کی ذات سے وصال ہے۔ ہر چیز اسی کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے۔

میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہٗ کامل سے — جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے — کیوں تڑپتی ہوں، یہ پوچھے کوئی میرے دل سے (۲)

اقبالؔ کہتے ہیں کہ مظاہر فطرت نہ سراب ہیں اور نہ حقیقت سے خالی۔ وہ کائنات کیونکر سراب ہوسکتی ہے؟ اور حقیقت سے عاری کیسے ہوسکتی ہے، جس کی ہر چیز کے اندر حسن و عشق کی کشاکش پائی جاتی ہو۔ ان کی نظم ''شمع و پروانہ'' تجزیاتی وتصوراتی فلسفے سے اختلاف کا مدّلل جواب ہے۔ جسے ''طور وکلیم'' کی اصطلاح میں پیش کیا گیا ہے۔

گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذتِ سوز و گداز ہے
کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسن قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو ، یہ ذرا سا کلیم ہے (۳)

اقبالؔ نے بانگِ درا میں'' حسن مطلق'' کے حوالے سے ان گنت انداز اپنائے ہیں اور مختلف حوالوں و اصطلاحوں سے ثابت کر دکھایا ہے کہ حسنِ مطلق کی جھلک ہر شے میں مستور ہے۔ اور ہر شے اگرچہ وہی نہیں مگر اسی کا نورِ ظہور ہے۔ یوں لگتا ہے کہ " **اللہ نور السمواتِ والارض** '' کے مصداق اقبالؔ نے روشنی ، چمک، تڑپ، آفتاب، سورج، چاند، ستارہ، شرارہ، صبح، شمع، کرن، شعلہ، ذرہ، بجلی، کڑک، آگ، آتش، نار، شفق، لو اور ضو جیسے الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ ''حسنِ

---

(۱) بانگِ درا۔ ۴۵۔ شمع۔ (۲) ایضاً۔ ۶۳۔ ''موجِ دریا''۔۔ (۳) ایضاً۔ ۴۱۔ ''شمع و پروانہ''۔

مطلق''، کو نورِ مطلق یا نورِ ازل کے طور پر بیان کیا ہے اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ موجودات کی ہر شے، نورِ مطلق سے وصال کے لیے بے قرار ہے۔

اے چاند حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے — طوفِ حریمِ خاکی تیری قدیم خو ہے
یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں — عاشق ہے تو کسی کا ؟ یہ داغ آرزو ہے؟
میں مضطرب زمیں پر بے تاب تو فلک پر — تجھکو بھی جستجو ہے مجکو بھی جستجو ہے

انساں ہے شمع جس کی محفل وہی ہے تیری
میں جس طرف رواں ہوں منزل وہی ہے تیری؟

تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں — پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں
استادہ سرو میں ہے سبزے میں سو رہا ہے — بلبل میں نغمہ زن ہے، خاموش ہے کلی میں
آ میں تجھے بتاؤں رخسارِ روشن اس کا — نہروں کے آئینے میں، شبنم کی آر سی میں

صحرا و دشت و در میں کہسار میں وہی ہے
انساں کے دل میں ، تیرے رخسار میں وہی ہے (۱)

اسی بناء پر اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ پیامِ شوق جو میں سرِ عام کہہ رہا ہوں۔ قطرۂ شبنم نے اسے گل و لالہ کے پاس آ کر پوشیدہ طور سے کہہ دیا:

پیامِ شوق کہ من بے حجاب می گویم — بہ لالہ قطرۂ شبنم رسید و پنہاں گفت (۲)

پھر اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ تیرے بغیر خواب عدم سے آنکھ کھولی نہیں جا سکتی۔ نہ تیرے بغیر ہمارا کوئی وجود ہے، البتہ تو ساتھ ہو تو ہمیں فنا نہیں۔ ہمارا دل دنیا میں ہے، یا جہاں ہمارے دل میں ہے، منہ بند رکھ کیونکہ یہ عقدہ حل نہیں کیا جا سکتا۔

بے تو از خوابِ عدم دیدہ کشودن نتواں — بے تو بودن نتواں ، باتو نبو دن نتواں
در جہاں است دل ما کہ جہاں دردلِ ماست — لب فروبند کہ ایں عقدہ کشودن نتواں (۳)

---

(۱) بانگِ درا۔ ۱۷۱۔ ''چاند'' (۲) زبورِ عجم۔ ۶۸۔ (۳) پیامِ مشرق۔ ۱۲۶۔

بہر حال "نور" ہی کی مناسبت سے علامہ محمد اقبال اپنی نظم "حکیم آئن سٹائن" میں لکھتے ہیں کہ اس نے روشنی کی رفتار دریافت کی تھی۔ وہ کلیمؑ ناصبور کی مانند جلوۂ حقیقت کا خواہاں ہوا۔ اس کوشش میں اس کے روشن ذہن نے، نور کے اسرار کھولے۔ روشنی آسمان کی بلندی سے آدم کی آنکھ تک ایک لمحے میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ اتنی زود پرواز ہے کہ اس کی پرواز سمجھ سے بالا تر ہے۔ روشنی کی خلوت کان میں پڑے ہوئے سیاہ رنگ کوئلے میں بصورت ہیرا ہے۔ اور اس کی جلوت طور پر درخت کو خس کی مانند جلا دیتی ہے۔ یہ روشنی کمی بیشی اور کیوں اور کیسے کے طلسم (اس دنیا) میں تبدیلی کے بغیر ہے۔ اسی طرح یہ اس جہاں کے پست و بلند (مکاں) دیروزود (زماں) اور نزدیک و دور (مسافت فاصلہ) سے بھی بالا تر ہے۔ اندھیرا، اجالا، سوز و ساز اور حیات و موت، سب اس کی نہاد میں پوشیدہ ہیں۔ ابلیس اس کی حرارت کے سوز سے ہے اور جبرائیل و حور اس کی ٹھنڈک کے ساز سے۔ یہاں ابنِ عربی کی طرح اقبال بھی دوزخ کی آگ کو نورِ مطلق کا جلال اور جنت کو اس کا جمال ظاہر کر رہے ہیں۔

جلوۂ می خواست مانندِ کلیم ناصبور　　تا ضمیرِ مستنیرِ او کشود اسرارِ نور
از فرازِ آسماں تا چشمِ آدم یک نفس!　　زود پروازے کہ پروازش نیاید در شعور!
خلوتِ او در زغال تیرہ فام اندر مغاک　　جلوتش سوزد درختے را چوخس بالائے طور!
بے تغیر در طلسمِ چون و چند و بیش و کم!　　بر تراز پست و بلند و دیر و زود و نزد و دور!
در نہادش تاروشید و سوز و ساز و مرگ و زیست!　　اہرمن از سوزِ او و زساز او جبریل و حور! (۱)

اقبال کہتے ہیں آئن سٹائن نے صرف نور کی رفتار معلوم کی اور آیت کریمہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہو سکتا ہے کہ نورِ مطلق اس ظاہری نور کا بھی نور ہو۔ جو ہماری نظروں سے پنہاں ہو۔ نظروں سے پنہاں تو ہے ہی۔ اس لیے کہ یہ ظاہری روشنی، جس کی رفتار معلوم کی گئی ہے، اگر یہ وہی نورِ مطلق ہو تو پھر کائنات کی ہر چیز درخت طور کی مانند جل کر خاکستر ہو جائے۔ شاید اسی لیے تو نورِ مطلق پردوں میں نہاں ہے۔

گل و رنگ و بہار پردے ہیں　　ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ (میر)

اس ضمن میں سقراط نے بھی کہا ہے کہ:

---

(۱) پیامِ مشرق۔ ۱۹۹۔

''اگر حسن مطلق کے علاوہ بھی کوئی چیز حسین ہوتی ہے، تو وہ اس وقت تک حسین نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ حسنِ مطلق میں شرکت نہیں کرتی۔۔۔۔تمام خوبصورت چیزیں حسن مطلق میں شریک ہونے کی وجہ سے حسین بنتی ہیں۔''(۱)

اور اقبال کہتے ہیں:

جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں نے
خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدے میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
جس کی چمک ہے پیدا، جس کی مہک ہویدا
شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں
ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ تیری کمال اس کا (۲)

گویا کہ فطرت کے سب ہی مظاہر میں حسن مطلق کی شان پائی جاتی ہے۔ہر سانچے اور ڈھانچے کے مطابق وہ اوراس کی جھلک ہر کہیں موجود ہے۔ وہ رنگ میں رنگ ہے اور بے رنگ میں بے رنگ۔ خاموشی میں خاموشی ، چہک میں چہک، مہک میں مہک اور نور میں نور ہے۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا خورشید میں بھی اس ہی کا ذرّہ ظہور تھا (میرؔ)

اقبال تصوراتیوں سے کہتے ہیں کہ بحر و بر اور دشت و کہسار دھوکہ و فریب نہیں۔ اور تجزیاتیوں سے کہتے ہیں کہ نورِ حقیقت کے بغیر ان مظاہر کی کوئی حقیقت نہیں۔ اگر مظاہر ہیں تو خود بخود ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت مطلق بھی ہے۔

---

(۱) مکالمات افلاطون۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ (۲) بانگِ درا۔ ۱۲۱۔ سلیمیٰ۔

دشت میں ، دامن کہسار میں، میدان میں ہے

بحر میں موج کی آغوش میں طوفان میں ہے

چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے

اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے (۱)

تجزیاتی و تصوراتی فلسفیوں اور موضوعیت و معروضیت کے برعکس اقبال ''وحدت جمال'' کے قائل ہیں۔ وہ ہر چیز کو خالق حقیقی کی تخلیق سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ جمالیاتی یقین ہے کہ سارے کے سارے کارخانہ قدرت میں ''حسن مطلق'' کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ''ایک پرندہ اور جگنو'' میں انہی خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

تجھے جس نے چہک گل کو مہک دی — اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی

لباسِ نور میں مستور ہوں میں — پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں

چہک تیری بہشتِ گوش اگر ہے — چمک میری بھی فردوسِ نظر ہے

پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی — تجھے اس نے صدائے دلربا دی

تری منقار کو گانا سکھایا — مجھے گلزار کی مشعل بنایا

چمک بخشی مجھے، آواز تجھ کو — دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو

مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز — جہاں میں ساز کا ہے، ہمنشیں سوز (۲)

بالِ جبریل میں علامہ اقبال کا یہ شعر:

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں! — باقی ہے نمودِ سیمیائی! (۳)

کبھی کبھار اقبال کے تصوریت پسند ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ مگر نصیر احمد ناصر رقم طراز ہیں کہ:

''علامہ اقبال جیسے وحی و تنزیل کی روشنی میں حیات و کائنات کا مطالعہ کرنے والے مفکر و حکیم سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہندوؤں کی طرح اس کائنات کو ''مایا'' اور تصوریت پسندوں کی طرح اسے فریبِ نظر سمجھتے ہوں۔ جبکہ قرآن مجید

---

(۱) بانگِ درا۔ ۲۰۷۔ ''جواب شکوہ''۔ (۲) بانگِ درا۔ ۹۲۔ ایک پرندہ اور جگنو۔ (۳) بالِ جبریل۔ ۵۳۔

صاف الفاظ میں اس نظریے کا بطلان کرتا ہے۔ اور علی الاعلان کہتا ہے کہ یہ کائنات
خدا کی تخلیق ہے، یہ نہ تو کھیل تماشا ہے اور نہ باطل ہے، بلکہ یہ "تخلیق بالحق" ہے۔
واقعہ یہ ہے کہ علامہ بھی کائنات کو تخلیق بالحق ہی مانتے ہیں۔ انہوں نے تو محض
مادیت پسندوں کے اس مسلک کا بطلان کرنے کے لیے کہ یہ مادہ ازلی، ابدی اور
قائم بالذات ہے یا ان کی اصطلاح میں قدیم ہے۔ اسے نمودِ سیمیائی کہہ دیا" (۱)

نصیر احمد ناصر کی یہ رائے اپنی جگہ اور اپنے انداز میں بالکل درست ہے۔ بلکہ اقبال کی ساری شاعری کا مطالعہ اقبال کے ذوق جمال کے تحت کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصوریت سے اختلاف رکھتے ہیں۔ نظریۂ اعیان اور تصوریت ہی کی بناء پر انہوں نے افلاطون کی مخالفت کی۔ خود حسن فطرت و مجاز کے حوالے سے رواں، اس بحث میں یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ اقبال تصوریت پر یقین نہیں رکھتے۔ چونکہ اس غزل سے بھی ثابت ہے، جس کے شعر پر نصیر احمد ناصر نے بات کی ہے۔ مذکورہ غزل کا مطلع اور دوسرا شعر یہ ہے:

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی!
بے ذوقِ نمود زندگی موت تعمیرِ خودی میں ہے خدائی! (۲)

مجاز کا ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی ہے۔ خالقِ حقیقی پر فریفتہ ہے۔ محبوبِ حقیقی پر شہید ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی پا لیتا ہے۔ مظاہر اگر دھوکہ یا فریب ہوں تو، اقبال انہیں شہیدِ کبریائی کیوں کر کہہ سکتے ہیں؟ اقبال کے نزدیک خالقِ حقیقی ہی قائم بالحق ہے۔ باقی ہے نمودِ سیمیائی سے مراد یہ نہیں کہ مجاز دھوکہ ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ حسن مطلق کے بغیر حسن کے جتنے سانچے یا پیکر ہیں وہ تغیر پذیر ہیں۔ لیکن حسن دائمی ہے۔ نئی نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے، ہوتا رہے گا۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

ہر شے مسافر، ہر چیز راہی کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی (۳)

سکوں نا آشنا رہنا اسے سامان ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یارب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں (۴)

ہر چہ از محکم و پائندہ شناسی، گزرد کوہ و صحرا و بحر و بر و کراں چیزے نیست (۵)

---

(۱) اقبال اور جمالیات۔ ۱۵۹۔ (۲) بالِ جبریل۔ "وہی غزل"۔ (۳) بالِ جبریل ۔ ۵۳۔ (۴) بانگِ درا۔ ۱۳۸۔
(۵) جاوید نامہ۔ ۳۶۔

اور پھر:

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز (۱)

اسی طرح ''ضربِ کلیم'' کی ایک نظم ''دنیا'' میں اقبال کہتے ہیں:

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بو قلمونی — وہ چاند یہ تارا ہے، وہ پتھر یہ نگیں ہے
دیتی ہے مری چشمِ بصیرت بھی یہ فتویٰ — وہ کوہ، یہ دریا ہے، وہ گردوں، یہ زمیں ہے
حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا — تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے! (۲)

گویا کہ:

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر — کہ تو ہستی و وجودِ دوجہاں چیزے نیست (۳)

اس نظم کے حوالے سے، پہلی نظر میں اقبال موضوعی اور تصوری دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لیکن دراصل اقبال جیسا عاشق حق، تخلیق بالحق پر پختہ یقین رکھنے والا مردِ فقیر موضوعی و تصوری ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ اس نظم کی بنا پر کوئی انہیں تضاد بیانی کا شکار قرار دے سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ مظاہر عارضی و فانی ہیں لیکن وہ انسان جو مردِ فقیر ہو وہ لازوال و لافانی ہوتا ہے۔ اسے موت نہیں آسکتی۔ وہی کائنات کو پرکھنے کی ''کسوٹی'' بنتا ہے۔

وجود صیرفیِ کائنات ہے اس کا — اسے خبر ہے یہ باقی ہے اور وہ فانی
اسی سے پوچھ پیشِ نگاہ ہے جو کچھ — جہاں ہے یا فقط رنگ و بو کی طغیانی! (۴)
یہ کافری تو نہیں کافری سے کم بھی نہیں — کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود (۵)

کائنات کا خالق ''حسن'' ہے اس لیے یہاں کی ہر چیز حسین و جمیل ہے۔ صرف صورتوں کا فرق ہے۔ شمع، شمع کی صورت میں خوبصورت ہے، پھول پھول کی صورت میں اور معصوم بچہ اپنی جگہ بچے کی صورت میں حسنِ مطلق کی ایک جھلک ہے۔ ہر جگہ اور ہر روپ میں نورِ مطلق کی ذوافشانیاں ہیں۔ چنانچہ اقبال اپنی نظم ''بچہ اور شمع'' میں کہتے ہیں:

---

(۱) بالِ جبریل۔ ۱۲۶۔ ساقی نامہ۔ (۲) ضربِ کلیم۔ ۳۷۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۳۶۔ (۴) ضربِ کلیم۔ ۵۱۔ (۵) ضربِ کلیم۔ ۱۱۰۔

شمع اک شعلہ ہے لیکن تو سراپا نور ہے
آہ! اس محفل میں یہ عریاں ہے، تو مستور ہے
دستِ قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا!
تجھ کو خاکِ تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا
نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقابِ آگہی!
ہے غبارِ دیدۂ بینا حجابِ آگہی!
محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
حسن کوہستان کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضوگستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت، شفق کی گلفروشی میں ہے یہ
عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلکِ نا آشنا کی کوششِ گفتار میں ہے
ساکنانِ صحن کی گلشن کی ہم آوازی میں ہے
ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس؟

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثال ماہی بے آب ہے (۱)

تجزیاتی وتصوراتی فلسفے کے برعکس علامہ محمد اقبال فطرت یا کائنات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمائی ہوئی "آیت" سمجھتے ہیں ۔ جس کے معنی ہی "حسن مطلق" کے ہیں ۔ بلکہ اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ زمانہ بذات خود محبوب حقیقی کا تیز رو قاصد ہے ۔ کیا قاصد ہے کہ اس کا سارا وجود ہی "حسن مطلق" کا پیغام ہے اور مظاہر بھی زمانے کے اندر ہی آتے ہیں ۔

زمانہ قاصدِ طیارِ آں دلآرام است چہ قاصدے کہ وجودش تمام پیغام است! (۲)

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات (۳)

پیام مشرق میں اقبال وقت کی زبانی بتاتے ہیں کہ میرے ضمیر کے اندر سینکڑوں عالم رعنا پنہاں ہیں ۔ کئی ستارے آوارہ ہیں ۔ کئی آسمان گردش میں ہیں ۔ میں انسان کا لباس ہوں ۔ میں یزدان کا پیراہن ہوں ۔

پنہاں بہ ضمیر من ، صد عالم رعنا ہیں صد کوکب غلطاں ہیں ، صد گنبد خضرا ہیں
من کسوت انسانم ، پیراہن یزدانم (۴)

جنت سے نکلنے کے بعد جب روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے ۔ تو اس وقت بھی اقبال تجزیاتی فلسفے کے برخلاف معروض کو حقیقت کی بجائے ، حقیقت ازلی کے پردے قرار دیتے ہیں ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجاز تخلیق بالحق ہے ۔ اور تصوراتی فلسفے کے مطابق دھوکہ یا سراب نہیں ۔ انسان حقیقت سے جدا ہوا ہے اور جتنا وقت اس دنیا میں رہے گا ۔ جدائی کی مشکلات برداشت کرے گا ۔ بہر حال مرکزی بات یہی ہے کہ مظاہر کے پردوں میں "حسن مطلق" پنہاں ہے ۔

کھول آنکھ ، زمیں دیکھ ، فلک دیکھ ، فضا دیکھ ! مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ !
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ! ایام جدائی کے ستم دیکھ ، جفا دیکھ! (۵)

اس باب میں اب تک ہم نے اقبال کے عشق جمال کے حوالے سے حسن مطلق کے حسن فطرت سے تعلق و مجاز میں

---

(۱) بانگ درا ۔ ۹۳ ۔ ۹۴ ۔ (۲) زبور عجم ۔ ۶۶ ۔ (۳) بال جبریل ۔ ۹۳ ۔ "مسجد قرطبہ" ۔ (۴) پیام مشرق ۔ ۹۰ ۔ "نوائے وقت"
(۵) بال جبریل ۔ ۱۳۲ ۔

اس کی جھلک پر بات کی ہے۔ اس کے بعد فطرت کے ایک دوسرے پہلو یعنی حسن نسوانی کے نورانی قوس قزح اور جاودانی و روحانی سرور وحضور کی روشنی میں صنف لطیف کے نکہت و نور سے تشکیل شدہ نرم و نازک و شبنمی کوہ طور پر بات کرتے ہیں ۔ بے شک نسوانی حسن مرد کے لئے دوسرے مظاہر سے زیادہ دلکش و پر کشش ہے۔ ایک حسین وجمیل دوشیزہ چلتا پھرتا طور دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا ایسی حسینہ سے ہمکلام ہونا کسی حد تک کلیم اللہ ہو جانا ہے۔ اس لئے کہ اقبال کے نزدیک :۔

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا　　آنکھوں میں ہے سلیمٰی تیری کمال اس کا　(۱)

چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے　　وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں　(۲)

مجاز میں کوئی حسن فطرت تک پہنچے یا حسن نسوانی کا قرب حاصل کرے، حسن مطلق سے قریب تر ہونے لگتا ہے۔ اس لئے کہ حسن نسوانی بھی حسن مطلق کا ایک بے مثال کرشمہ ہے۔ چنانچہ نسوانی حسن بھی قرب الٰہی کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے۔ اس ضمن میں میر صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں　　معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا　(میر)

اسی طرح:۔

نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پہ عریاں کی　(اصغر گونڈوی)
یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی

واقعی مجاز کو پائے بغیر حقیقت نہیں مل سکتی ۔ اقبال بھی کہتے ہیں کہ آدم کے مقام کو تو تو پا نہیں سکا۔ خدا تعالیٰ کو کیا ڈھونڈتا ہے۔ اپنے آپ سے تو دور ہے۔ دوست کی تلاش کیسی؟

بآدمے نرسیدی ، خدا چہ می جوئی　　زخود گریختہ ء آشنا چہ می جوئی!　(۳)

گویا کہ جتنا کوئی مجاز سے دور ہوتا ہے۔ اتنا ہی حقیقت سے دور ہوتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ:۔

جتنا کوئی مجاز کو مانتا ہے اتنا ہی حقیقت کو مانتا ہے۔ مجاز کا انکار کرنے والا درحقیقت ،حقیقت سے انکار کرتا ہے۔ اور مجاز کو حقیقت جاننے والا ، دراصل منکر حقیقت ہوتا ہے۔ اس بات میں تجزیاتی وتصوراتی ، دونوں ہی فلسفوں کا توڑ موجود ہے۔ محبوب مجازی کو بھی یقین کی آنکھ سے دیکھ لیا جائے تو "حسن مطلق" یا محبوب حقیقی کا خود بخود یقین آ جاتا ہے اور اس

---

(۱) بانگِ درا۔ ۱۳۱۔　(۲) بانگِ درا۔ ۱۰۴۔　(۳) جاوید نامہ۔ ۱۸۷۔

طرح کفر و ایماں کے سارے جھگڑے خود بخود نکتہ ایمان پر مرکوز ہو کر ختم ہو جاتے ہیں ۔ لہٰذا اس میں شک نہیں کہ محبوب مجازی، حقیقت تک رسائی کا وسیلہ بنتا ہے ۔ کہ خوباں میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ اسی لئے تو کوئی خوبصورت چہرہ دیکھ کر انسان بے اختیار ''سبحان اللہ'' پکار اٹھتا ہے ۔

دا ستاد حسن جلوہ بلہ م پہ زرہ پرتہ دہ   حکہ م ستر کے ھر یو سکلی تہ کرے پاتے شی

بلکہ ابھی ابھی ذہن میں ایک نکتہ آیا ہے کہ جب حسن مطلق نے کلیم اللہ کے اصرار پر اپنی تجلی کی ایک جھلک دکھائی تو اس وقت بھی، کوہ طور کی صورت میں بالواسطہ طور پر مجاز ہی کو وسیلۂ ظہور ٹھہرایا ۔ قرآن پاک میں متعدد جگہوں پر حسن مطلق نے مجاز کو اپنی نشانیاں گنوا کر اپنی حقانیت کا یقین دلایا ہے ۔ اسی طرح :۔

والتین و الزیتون و طور سینین وھذالبلد الامین

کے علاوہ مجاز کی قسمیں کھا کر حسن مطلق نے اپنے قادر مطلق ہونے کا باور کرایا ہے ۔ جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں ۔ کہ مجاز حسن ازل کا اور حسن ازل بذات خود مجاز کا عاشق ہے ۔ مجاز کے آئینہ دل میں وہ اپنا عکس دیکھتا ہے ۔

روشن از پر تو آں ماہ دلے نیست کہ نیست   باحزار آئینہ پرداختنش رانگرید (۱)

مجاز ہی کو حقیقت نے پیغمبری کا رتبہ عطا کیا ۔ مجاز ہی کی خاطر اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب فرشتے عزازیل کو دھتکارتے ہوئے ابلیس کا نام دیا، جسے اقبال ''خواجہ اہل فراق'' کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ شجر و حجر کے علاوہ پیغمبروں نے واضح الفاظ میں ''حسن ازل'' کا پیغام سنایا اسی لئے تو اقبال کہتے ہیں :۔

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد   ایں مشت غبارے را انجم بسجود آمد!
آں راز کہ پوشیدہ درسینہ ہستی بود   ازشوخئی آب و گل درگفت وشنود آمد! (۲)

اور پھر اس سے آگے اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ مجاز کا خالق بھی تو ''حسن ازل'' ہی ہے ۔

یہ عالم ، یہ بتخانہ شش جہات !   اسی نے تراشا ہے یہ سومنات (۳)

بلکہ دوسری الہامی کتابوں سمیت سارا قرآن مجید بھی مجازی صورت میں ہے ۔ گویا کہ حقیقت میں مجاز اور مجاز میں حقیقت ہے ۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مجاز، خواہ کسی بھی روپ میں ہو حقیقت کے عین قریب ہے ۔ مجازی

---

(۱) زبور عجم ۔۳۶۔ (۲) ایضاً ۔ ۶۳۔ (۳) بال جبریل ۔ ۱۲۵۔

حسن کے بارے میں ،قرآن کریم میں حسن مطلق فرماتا ہے۔

ولو اعجبک حسنھن (۳۳۔۵۲) اور اگر چہ ان (عورتوں) کا حسن تجھے تعجب انگیز خوشی بخشے۔

خیر سوسوالوں کا جواب ایک ہی ہے کہ مجاز کا راستہ حقیقت کی طرف جاتا ہے۔ بلکہ عاشق بذات خود مجاز ہوتا ہے۔

دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انسان ہوں میں (اقبال)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت و مجاز میں ضرور کوئی رشتہ پہلے سے موجود ہے۔ جس کی بنا پر رشتہء عشق استوار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے حسن نسوانی کی صورت میں محبوب حقیقی سے قبل محبوب مجازی سے بھی لو لگائی ہے۔ اگر چہ کلام اقبال میں محبوب حقیقی کے مقابلے میں ،مجازی محبوب کی مثالیں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ اس ضمن میں علامہ اقبال خود بھی کہتے ہیں کہ عرب شعراء کو (جن کی شاعری میں نسوانی حسن بہت زیادہ ہے) میری طرف سے کہہ دو، میں نے لب لعلیں یعنی مجازی محبوب کو بہت کم اہمیت دی ہے۔ البتہ اس نور سے جو میں نے قرآن پاک سے حاصل کیا ہے۔ میں نے ہندی مسلمان کی ایک سوتیس سالہ لمبی رات کو صبح میں تبدیل کر دیا ہے۔

بگو از من نوا خان عرب را بہاے کم نہادم لعل لب را
ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم سحر کردم صدوسی سالہ شب را (۱)

اقبال اپنی مثال ثبوت کے طور پر پیش کرنے کے بعد ،عرب شاعر سے کہتے ہیں ،تو بھی روایتی محبوبوں کی صورت نگاری اور خال و لب و لعل پرستی چھوڑ۔ صرف اپنے ضمیر سے دوستی رکھ۔ تو نے ہمارے باغ اسلام میں پروبال نکالے ہیں۔ تیرے پاس جو سوز ہے۔ اسے مسلمان کی زندگی میں بھر دے۔

تو ہم بگذر آں صورت نگاری مجو غیر از ضمیر خویش یاری
بباغ ما برآوردی پروبال مسلماں را بدہ سوزے کہ داری! (۲)

علامہ محمد اقبال قرآن و سنت اور حدیث نبوی کی روشنی میں عورت کے مختلف مقامات و درجات بیان کرتے ہیں۔

ان کی ابتدائی و روایتی اور نواب مرزا خان داغ کے زیر اثر شاعری :۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

---

(۱) ارمغان حجاز۔ ۸۱۔ (۲) ایضاً۔ ۸۲۔

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد   مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی (۱)

خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی؟ وغیرہ سے ہٹ کر دیکھا جائے تو حسن نسوانی کے تقدس و عظمت کا کچھ اور ہی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ۔ مرد کا ساز عورت کے ساز سے نغمہ پیدا کرتا ہے۔ عورت کے نیاز سے مرد کا ناز دوبالا ہو جاتا ہے۔ مردوں کی عریانی کی پوشاک عورت ہے۔ دل لبھانے والا حسن عشق کا لباس بن گیا۔ اللہ تعالیٰ کا عشق عورت ہی کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔ یہ نوا اس کے خاموش مضراب ہی سے اٹھتی ہے۔ آپ ﷺ کے وجود پر کائنات ناز کرتی ہے۔ انہوں نے خوشبو اور نماز کے ساتھ عورت کا ذکر فرمایا۔ ایسا مسلمان جس نے عورت کو اپنی لونڈی بنا رکھا ہے۔ اس نے حکمت قرآن سے حصہ نہیں پایا۔

نغمہ خیز از زخمہ زن ساز مرد   از نیاز او دوبالا نازمرد

پوشش عریانیء مرداں زن است   حسنِ دلجو عشق را پیراہن است

عشق حق پروردۂ آغوش او   ایں نوا از زخمہء خاموش او

آنکہ نازد بروجودش کائنات   ذکر او فرمود باطیب و صلوٰۃ

مسلمے کو را پرستارے شمرد   بہرہ از حکمت قرآں نبرد (۲)

شیخ محی الدین ابن عربی نے بھی سنت نبویؐ کے حوالے سے اپنی کتاب ''فصوص الحکم'' میں عورت کا ذکر کیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا عورتیں اور خوشبو۔ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ حضرتؐ نے پہلے عورتوں کا ذکر فرمایا اور بعد میں نماز کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت مرد کا جزو ہے۔ اپنی اصل ظہور میں ۔۔۔۔ عورت میں مرد اپنی خوشبو محسوس کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ مرد سے بنی ہے۔ عربی مثل ہے۔ الطیب الطیب عناف الحبیب ۔ بہترین خوشبو دوست کے گلے ملنا ہے۔ معانقہ یار نہ کہ گلاب کا ہار''۔ (۳)

حضور ﷺ نے خود فرمایا:۔ الجنۃ تحت اقدام امھتکم ۔

اور اقبال کہتے ہیں وہ ذات جو حرف ''کن فکاں'' کے مقصود ہیں، انہوں نے فرمایا کہ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

گفت آں مقصود حرف ''کن فکاں''   زیر پائے امہات آمد جناں (۴)

---

(۱) بانگِ درا۔ ۹۸۔ ۹۹۔ (۲) رموزِ بیخودی۔ ۱۴۹۔ (۳) فصوص الحکم۔ ۴۲۶۔ ۴۳۴۔ مترجم عبدالقدیر صدیقی۔

(۴) رموزِ بیخودی۔ ۱۵۰۔

علاوہ ازیں اقبال کے نزدیک عورت اور مرد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور زندگی کی تصویر کے دو روخ ہیں۔ تصویر حیات کی رنگینی وجود زن ہی سے ہے۔ یہ دونوں مل کر کائنات شوق کی نقش بندی کرتے ہیں۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے یہ نار حیات کی محافظ ہے۔ اس کی فطرت ایسی ''لوح'' ہے جس پر اسرار حیات رقم ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے عشق کو اپنی جان میں سموتی ہے، چنانچہ اس کا وجود ہر خاک کو آدم بنا دیتا ہے۔ اس کے ضمیر کے اندر امکانات زیست پنہاں ہیں۔ اس کی تب و تاب سے زندگی دوام پاتی ہے۔ وہ ایسا شعلہ ہے جس سے کئی شرر ٹوٹتے ہیں۔ اس کے سوز کے بغیر روح و بدن صورت پذیر نہیں ہوتے۔ ہماری توقیر اس کے وقار سے ہے۔ ہم سب اس کی نقشبندی سے وجود میں آئے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے دیکھنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے تو پاکیزہ نگاہ سے اس کی قدسیت دیکھ۔

مرد و زن وابستہ یک دیگراند — کائنات شوق را صورت گراند!
زن نگہ دارندۂ نار حیات — فطرت او لوح اسرار حیات
آتش ما را بجان خود زند — جوہر او خاک را آدم کند
در ضمیرش ممکنات زندگی — از تب و تابش ثبات زندگی
شعلۂ کزوئے شرر ہا در گسست — جان و تن بے سوز او صورت نہ بست
اوج ماز ارجمند یہائے او — ماہمہ از نقشبندیہائے او
حق ترا داد است اگر تاب نظر — پاک شو قدسیت اورانگر (۱)

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی — خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ (۲)

اقبال کوچۂ مجاز میں قدم رکھتے ہیں تو مدتوں تک یاد کرتے ہیں کہ، کہاں ہے وہ نگاہ ناز جس نے پہلے پہل مجھ سے میرا دل چھین لیا تھا، تیری عمر دراز ہو مجھے پھر اسی تیر نظر کی آرزو ہے کہ اس کی خلش بڑی لطف اندوز تھی۔

کوآں نگاہِ ناز کہ اول دلم ربود — عمرت دراز بادہماں تیرم آروزست (۳)

وہ کیا دن تھے جب میں چنگ و نے کے ساتھ ساتھ شراب پیتا تھا۔ جام شراب میرے ہاتھ میں ہوتا اور مینائے مے محبوب کے ہاتھ میں

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۶۹۔ (۲) بال جبریل۔ ۱۱۶۔ (۳) پیام مشرق۔ ۱۵۷۔

یاد ایامے کہ خوردم بادہ ہا باچنگ و نے　　جام مے دردست من ، مینائے مے دردست وے　　(۱)

اقبال کے مطابق تین چیزیں آنکھ کی بینائی میں اضافہ کرتی ہیں ۔ سبزہ ، آب رواں اور خوبصورت چہرہ ۔

چشم رابینائی افزاید سہ چیز　　سبزہ و آب رواں و روے خوش　　(۲)

پھر کہتے ہیں وہ جوانمرد ۔ جس نے اپنے آپ سے دل لگا لیا ۔ وہ بحر ودریا میں کانٹے سے محفوظ اتر گیا ۔ نگاہ کے لئے جلوۂ حسن سے لطف اندوز ہونا جائز ہے ۔ مگر دل اور ہاتھ کو ضبط کے تحت رکھنا چاہئے ۔

جوانمردے کہ دل باخویشتن بست　　رود در بحر ودریا ایمن از شست

نگہ را جلوہ مستی ہا حلال است　　ولے باید نگہ داری دل و دست!　　(۳)

پھر کہتے ہیں کہ میں اس کے الفاظ کی لذت پر سرمست ہوں ، کہ اس نے مجھے عتاب زیرلبی سے خانہ ویران کہا ۔

خراب لذت آنم کہ چوں شناخت مرا　　عتاب زیر لبی کرد و خانہ ویراں گفت　　(۴)

محبوب مجازی کے زمرے میں اقبال کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ دوست کی سادہ دلی کیا ہوسکتی ہے کہ ، میرے سرہانے بیٹھ کر علاج کی باتیں کر رہا ہے ۔

وگرز سادہ دلیہائے یار ، نتواں گفت　　نشستہ برسر بالینِ من زدرماں گفت　　(۵)

لیکن یہ ایک حقیقت ہے ۔ اقبال حسن فطرت ، حسن نسوانی بلکہ دنیا کی ہر ایک شے سے بڑھ کر آنحضوعلیہ کی محبت کو حسن مطلق تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ میری خاک بدن کے اندر یہ تمنا موتی بن کر چمکتی رہی ۔ میری زندگی کی تاریک رات اسی ایک ستارے سے روشن رہی ۔ اگر چہ ایک عمر تک میں نے حسینوں سے راہ و رسم رکھی اور گھنگریالے بالوں والے معشوقوں سے عشق کرتا رہا۔ ماہ وحور کے ساتھ میں نے شراب کے جام لنڈھائے اور اطمینان وسکون کا چراغ بجھاتا رہا ۔ میرے خرمن کے گرد بجلیاں رقص کرتی رہیں اور ان رہزنوں نے میرے دل کی دولت لوٹ لی ۔ مگر اس دوران میں بھی عشق رسول علیہ کی شراب میری جان سے نہ نکل سکی ۔ یہ زرخالص میرے دامن میں محفوظ رہا ۔

آرزوئے من جواں ترمی شود　　ایں کہن صہبا گراں ترمی شود

مد تے بالالہ رویاں ساختم　　عشق بامرغولہ مویاں باختم

(۱) زبورعجم ۔ ۴۷۔　(۲) پیامِ مشرق ۔ ۲۱۹۔　(۳) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۱۵۔　(۴) زبورعجم۔ ۶۷۔　(۵) ایضاً۔۶۷۔

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم بر چراغ عافیت داماں زدم
برقہا رقصید گرد حاصلم رہزناں بزدند کالائے دلم
ایں شراب از شیشہ جانم نہ ریخت ایں زرسارازِ دامانم نہ ریخت

مگر حضورﷺ کی تمنا میرے دل میں خوابیدہ رہی اور صدف میں موتی کی طرح پوشیدہ رہی۔ آخر یہ میری آنکھوں کے پیمانے سے چھلک پڑی اور اس نے میرے ضمیر کے اندر سے نغمے پیدا کئے۔ میری جان آپﷺ کی یاد کے علاوہ کسی اور کی یاد سے خالی ہے۔ اگر اجازت ہوتو میں وہ آرزولبوں تک لے آؤں۔

ایں تمنا دردلم خوابیدہ ماند درصدف مثل گہر پوشیدہ ماند
آخر از پیمانہ چشمم چکید درضمیر من نواہا آفرید
اے زیاد غیر تو جانم تہی برلبش آرم اگر فرماں دہی (۱)

اس موقع پر اقبال کا اپنا ہی شعر صادق آتا ہے کہ ہمارے پیر نے مصلحتاً مجاز کی طرف رخ کیا ہوا ہے۔ ورنہ اسے حسینوں سے کوئی سروکار نہیں۔

پیر ما مصلحتاً رو بمجاز آوردا ست ورنہ با زہرہ و شاں ہیچ سروکارش نیست (۲)

اقبال کو معلوم ہے کہ مجازی محبوب آخری منزل نہیں اس لئے وہ ان میں حسن مطلق کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ذرا سا رک جاتے ہیں۔ تلاش وجستجو کے راستے سے کنارہ کشی نہیں کرتے۔ اور کہتے ہیں کہ پیر نکتہ داں نے مجھے فرمایا ہے کہ تیرا ہر آج گزشتہ کل کا پیغام ہے۔ اپنے دل کو ان بے پروا محبوبوں سے بچا۔ دل اللہ تعالیٰ کا آستانہ ہے، اسے کسی اور کے حوالے کرنا گنا ہے۔

مرا فرمود پیر نکتہ دانے ہر امروز تو از فردا پیام است
دل از خوباں بے پروانگہدار حریمش جز بادوادن حرام است (۳)

کتنے دلبر، زہرہ وش، گلبدن اور سیم بر، میری قبر کے گرد حلقہ بنائے نوحہ گری میں لگے ہوئے ہیں۔

---

(۱) اسرار رموز۔ ۱۶۹۔ (۲) پیام مشرق۔ ۱۷۶۔ (۳) پیام مشرق ۴۲۔

حلقہ بستند سر تربت من نوحہ گراں
دلبراں ، زہرہ و شاں ، گلبدناں ، سیم براں (۱)

جمع ہوئے ہیں کچھ حسین گرد مرے مزار کے
پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے بہار کے (سید انور حسین آرزو لکھنوی)

دلبروں کی بات میں اتنے اشارے پنہاں ہیں کہ ہوس کا رقیب بھی مست ہے، عاشق بھی مست ہے اور قاصد بھی۔ گویا کہ یہ بے اعتبار لوگ ہیں۔ جو محبوب اپنے عاشق کے لئے رقیب پالتا ہو، وہ کیا محبوب ہوگا؟

رقیب خام سودا مست و عاشق مست و قاصد مست کہ حرف دلبراں دارائے چندیں محمل افتاد است (۲)

تجھے دنیا میں کوئی ایسا دوست نہیں ملے گا جو دلنوازی جانتا ہو۔ اس لئے عشق کی آبرو بچا اور اپنے آپ میں گم ہو جا۔

نہ یابی در جہاں یارے کہ داند دلنوازی را بخودگم شو نگہدار آبروے عشق بازی را (۳)

یہی وجہ ہے کہ اقبال کہتے ہیں۔ دلبروں کے کوچے سے مجھے کوئی کام نہیں، نہ میرے پاس دل زار ہے نہ غم یار نہ میری خاک غبار راہ ہے، نہ میرے بدن میں دل بے اختیار ہے۔ یہ دل مجبور نہیں اور نہ ہی نگاہ حور کے تیر سے چھلنی ہوتا ہے

ایں دل مجبور ما مجبور نیست ناوک ما از نگاہ حور نیست! (۴)

جب کہ :۔

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا (میر)
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر اور بھی خاک میں ملا لا یا (میر)
کوئی مصحفی کو اٹھاتا نہیں ہے نظر کیجیوٹک خدا راز میں پر (غلام ہمدانی مصحفی)

اقبال کہتے ہیں میں تو جبرائیل امین کا ہم داستان ہوں۔ میرا کوئی رقیب، قاصد یا دربان نہیں، اللہ تعالیٰ سے براہ راست فیضیاب ہوں۔

بکوے دلبراں کارے ندارم دل زارے غم یارے نہ دارم
نہ خاک من غبار رہگذارے نہ درخاکم دل بے اختیارے

---

(۱) پیام مشرق۔۱۴۴۔ (۲) زبور عجم۔۱۰۲۔ (۳) ایضاً۔۱۰۳۔ (۴) جاوید نامہ۔۱۲۰۔

جبریل امیں ہم داستانم رقیب و قاصد و درباں ندانم (۱)

نسوانی حسن کے بارے میں اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ ،مست آنکھ، نگاہ غلط انداز اور حسین نغمہ سب خوب ہیں ،مگر ان سے خوب تر چیز بھی ہے (حسن مطلق) چہرے کا حسن ایک لمحہ ہے۔ دوسرے لمحے نہیں ہے۔ البتہ حسن کردار اور بلند افکار ضرور اہمیت رکھتے ہیں۔

چشم مخمور و نگاہ غلط انداز و سرود ہمہ خوب است ولے خوشتر ازاں چیزے ہست
حسن رخسار دمے ہست و دمے دیگر نیست حسن کردار و خیالات خوشاں چیزے ہست (۲)

پھر فرماتے ہیں ، ذرا کجکلاہ فرنگی حسینوں کو دیکھیں ، گویا چندے آفتاب چندے مہتاب ہیں۔ میرا سادہ دل نوجوان گرم خون ہے۔ ان کا فرنگاہوں سے اس کی حفاظت فرمایئے۔

یکے بنگر فرنگی کج کلاہاں تو گوئی آفتا بانند و ماہاں
جوانِ سادۂ من گرم خون است نگہدارش ازیں کافر نگاہاں (۳)

گویا کہ:۔

گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار طائرک بلند بال دانہ ودام سے گزر! (۴)
یہ حوریان فرنگی ، دل و نظر کا حجاب بہشت مغربیاں جلوہ ہائے پارکاب!
دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا مہ وستارہ ہیں بحرِوجود میں گرداب (۵)

لیکن آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ اور اقبال کہتے ہیں کہ تو اپنے آپ کو فرنگی حسیناؤں کے حوالے کر کے بت کدہ میں کیا نامردوں کی موت مرا! تیری عقل عشق سے بیگانہ اور سینہ نور سے خالی ہے۔ کیوں کہ تو نے اپنے بزرگوں کی شراب روحانیت سے فیض نہیں اٹھایا۔

بہ افرنگی بتاں خود را سپردی چہ نامردانہ دربتخانہ مردی
خرد بیگانہء دل ، سینہ بے نور کہ از تاکِ نیاگاں مئے نخوردی (۶)

تیری نظر فرنگی حسیناؤں کے سرخ سرخ رخساروں پر ہے۔ حالانکہ نوع آدم ان کے فریب سے آب و رنگ کھو چکی ہے۔

---

(۱) زبورِعجم۔ ۱۴۶۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۴۷۔ (۳) ارمغانِ حجاز۔ ۶۰۔
(۴) بالِ جبریل۔ ۲۹۔ (۵) ایضاً۔ ۳۶۔ (۶) ارمغانِ حجاز۔ ۱۴۴۔

چشم تو برلالہ رویانِ فرنگ　　آدم از افسون شاں بے آب و رنگ　(۱)

میں نے اے اقبال ! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی　(۲)

پھر کہتے ہیں ان چاند چہرہ نوجوانوں کی اداؤں میں کیا رکھا ہے؟ مجھ جیسے پیر کے حلقہ میں آ جو دلبری جانتا ہے۔

بعشوہ ہائے جوانان ماہ سیما ں چیست　　درآ بحلقۂ پیرے کہ دلبری داند　(۳)

علامہ اقبال کشمیری النسل ہونے کے ناطے انتہائی خوبصورت اور وجیہہ تھے'' حسن مطلق '' نے انہیں ایسی شکل و صورت عطا کی تھی کہ بس سبحان اللہ ،اور پھر ایک مفکر و شاعر کی حیثیت سے وہ اس قدر مقبول تھے کہ ہر کوئی ان پر دل و جاں سے فریفتہ تھا۔ لیکن اس سلسلے میں اقبال کا اپنا یہ حال تھا کہ بقول طفیل درا:۔

'' عطیہ بیگم کے خطوط، اقبال کے مزاج اور ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل کسی ''حسین'' کا نہیں بلکہ '' حسن'' کا فدائی و شیدائی تھا''۔ (۴)

لہٰذا یہ بات درست ہے کہ:۔

صورت نہ پرستم من ، بتخانہ شکستم من　　آں سیل سبک سیرم ، ہر بند گسستم من　(۵)

اور بکوے دلبراں کا رے نہ دارم کے مصداق اقبال کے سینے میں نہ تو مجازی محبوب کے لئے کوئی دل مجبور تھا۔ اور نہ اقبال نے کسی صورت کی خاطر اپنے آپ کو خاک میں ملایا۔وہ تو بس حسن کے متوالے تھے اور وہ حسن ،'' حسن مطلق'' ہی ہے۔ کہ اس کی جھلک جہاں کہیں اقبال نے دیکھی ٹھٹھک کر رہ گئے ۔ وہ مجاز کے راستے سے گزرے ضرور ہیں ،لیکن حرکت و عمل کے اس پیامبر نے مجاز کو اپنی منزل ہرگز نہیں بنایا۔ جب ہم سروجنی نیڈو (انگریزی زبان کی شاعرہ) کے اقبال سے لگاؤ اور اظہارِمحبت کا حال عطیہ بیگم کی زبانی سنتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ اقبال ایسے بھی دل پھینک نہیں تھے کہ ہر کہیں دل دے بیٹھتے بلکہ اس سلسلے میں ان کا اپنا ایک معیار تھا۔

'' ۲۹ جون ۱۹۰۷ء کو لیڈی ایلیئس کے ہاں ایک فیشن ایبل پارٹی دی گئی ۔ جہاں اقبال کو دیکھ کر مجھے قدرے اچنبھا ہوا ۔ جب میں ان سے مصروف گفتگو تھی۔ عین اس وقت سروجنی داس جو نہایت قیمتی لباس میں ملبوس تھی اور ضرورت سے

---

(۱) مثنوی مسافر ۔۷۳۔ (۲) بانگِ درا ۔ ۱۳۹۔ (۳) پیامِ مشرق ۔ ۱۷۵۔ (۴) اقبال اور نسوانی حسن ۔ ۱۹۔ طفیل دارا۔
(۵) پیامِ مشرق ۔ ۱۵۲۔

زیادہ ہیرے جواہرات سے لدی ہوئی تھی اور بھدے طریقے سے بنی ٹھنی تھی۔ ایک دم اندر آ گئی ۔ مس موصوف اپنے آپ کو تمام خوبیوں کا مجموعہ سمجھتی تھی ۔ مجھے اور اس شخص کو جو اس کی راہ میں آیا کلیتاً نظر انداز کرتے ہوئے پیکر جذبات بنے ہوئے ، سیدھی اقبال کے پاس پہنچی ۔ اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "میں صرف آپ سے ملنے کے لئے آئی ہوں"۔ اقبال نے اس عزت افزائی کا جو جواب دیا وہ یہ تھا :۔ یہ صدمہ اس قدر فوری اور اچانک (ہوا) ہے کہ مجھے تعجب ہوگا کہ اگر میں اس کمرے سے زندہ باہر نکل سکوں"۔ (۱)

لیکن اقبال جب حسن سے متاثر ہو جاتے ہیں تو پھر تخیلات وجذبات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سنہرا قلزم گرمی عشق سے بادل بن بن کر سونے کی بارش برساتا چلا جاتا ہے۔ ایسے میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ساری کائنات ایک "طور" ہے۔ جس پہ نکہت وحسن کا نور برس رہا ہے ۔ بلا شبہ اقبال "حسن و عشق" کا ساز چھیڑتے ہیں تو مسحور کن فضا میں حسن و عشق دونوں ہی متشکل ہو کر سامنے آجاتے ہیں ۔ جو اپنے اپنے پیکر میں تمام تر دلی جذبات و احساسات لئے ہوتے ہیں ۔ مثال کے طور پر:۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتئ سیمین قمر — نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر
جیسے ہوجاتا ہے گم نور کا لیکر آنچل — چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدبیضائے کلیم — موجہء نکہت گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیل محبت میں یو نہیں دل میرا

تو جو محفل ہے تو ہنگامہء محفل ہوں میں — حسن کی برق ہے تو، عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے تو مرے اشک ہیں شبنم تیری — شام غربت ہوں اگر میں ، تو شفق تو میری
مرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے — تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے
حسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا

ہے مرے باغ سخن کے لئے تو بادبہار — میرے بے تاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں — نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

---

(۱) اقبال از عطیہ بیگم ۔ ۲۹۔۳۰۔ مترجم ضیاء الدین احمد برنی۔

حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال　　　تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال
قافلہ ہوگیا آسودۂ منزل میرا　(۱)

اقبال حسن ازل کے شیدائی ہیں ۔ صاف ظاہر ہے اس حسن کے آثار حسین چیزوں اور خوبصورت چہروں میں ہی ہوتے ہیں ۔ چنانچہ فطرت کے ساتھ ساتھ اقبال خوبصورت صورتوں میں بھی حسن کا کھوج لگاتے ہیں ۔ لیکن ہر خوبصورت چہرہ خواہ وہ پھول کا ہو یا انسان کا، دیکھنے کے بعد وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں مجازی محبوباؤں سے آگے اور آگے نکلتے چلے جاتے ہیں ۔

ہر نگارے کہ مرا پیش نظری آید　　　خوش نگارے است ولے خوشتر ازاں می بائیست　(۲)

تا کہ ان کا انتہائی عشق ، انتہائی حسن سے بغلگیر ہو سکے ۔ اقبال ایسے حسن کے متوالے ہیں ، جس کے عشق میں عاشق بھی سراپا حسن بن جاتا ہے اور ایسا حسن مجازی نہیں بلکہ "حسن مطلق" ہی ہو سکتا ہے ۔

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق　　　بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں ؟　(۳)

پھر کہتے ہیں وہ مجھ سے دلبری کی بات چاہتا ہے، وہ مجھ سے روایتی شاعری کی چمک اور رنگ طلب کرتا ہے۔ کم نظر نے میری جان کی بیتابی کو نہ دیکھا۔ اس نے صرف میرا ظاہر دیکھا۔ میرے اندرون کو نہ دیکھا۔ میری فطرت نے عشق کو اپنے اندر سمولیا ہے ۔ میں نے آگ اور تنکے دونوں کو اپنے اندر اکٹھا کرلیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ملک اور دین کے رموز منکشف کئے ہیں اور میری آنکھ پر سے غیر اللہ کا پردہ ہٹا دیا ہے۔

او حدیث دلبری خواہد زمن　　　رنگ وآب شاعری خواہد زمن
کم نظر بیتابیء جانم ندید　　　آشکارم دید و پنہانم ندید
فطرت من عشق رادربرگرفت　　　صحبت خاشاک و آتش در گرفت
حق رموز ملک ودیں برمن کشود　　　نقش غیر از پردۂ چشمم ربود　(۴)

ان کا عشق زمین سے اٹھتا ہے اور زمینی مجاز سے ہوتا ہوا گل وگلزار سے آگے حسن نسوانی کی حدود پھلانگتا ہوا ، افلاک کے مہر و ماہ و مشتری اور دوسرے ستاروں کو پیچھے چھوڑتا ہوا ، بغیر رکے کہ رکنے میں موت ہے ۔ حسن مطلق کی طرف

---

(۱) بانگِ درا ۔ ۱۱۶۔ "حسن و عشق"۔ (۲) زبور عجم ۔ ۱۳۵۔ (۳) بانگِ درا ۔ ۱۰۵۔ (۴) پیام مشرق ۔ ۱۷۔

رواں دواں ہے۔ چنانچہ اقبال راستے میں حوروں کے پاس بھی نہیں ٹھہرتے، نسوانی حسن کے پاس کیا رکتے؟

چوں نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروے — تپد آں زماں دل من پے خوبتر نگارے
زشرر ستارہ جویم، زستارہ آفتابے — سرمنزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو زبادۂ بہارے، قدحے کشیدہ خیزم — غزلے دگر سرائم بہ ہوائے نو بہارے (۱)

یعنی کہ:۔

عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا — نقش و نگار دہر میں خون جگر نہ کر تلف (۲)

نباتات و جمادات کے شرر انگیز نگینوں و مہر و ماہ کے علاوہ ستاروں سے ہوتے ہوئے گل و گلزاروں و گاتی آبشاروں اور نکہت ریز بہاروں کے بعد حسن نسوانی کی صورت میں "لالہ رویاں" اور "مرغولہ مویاں" میں حسن کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد اقبال حسن ازل کی تڑپ میں دل صد فگار لئے حوروں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہ ہمارے مقالے کا اقبال کے جمالیاتی ذوق کی روشنی میں نقطہ عروج ہے۔ اس لئے کہ جنت میں بھی "حسن مطلق" اپنے عاشقوں کو حوروں و فرشتوں کا دیدار کرانے کے بعد اپنا دیدار کرائے گا۔ یہاں جب اقبال حور و مقصورات کو خاطر میں نہیں لاتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عاشق، حسن مطلق سے ہم آغوش ہونے کو ہے۔ چنانچہ پیام مشرق اور خاص کر جاوید نامہ میں بات نسوانی حسن سے آگے بڑھ کر حوروں تک جا پہنچتی ہے۔ اب "ویگے ناست"، "سروجنی داس" اور "عطیہ فیضی" کہیں کرۂ ارض پر ہی کھو گئی ہیں۔ ان کی بجائے حوریں اقبال کو دل دے بیٹھتی ہیں۔ جن کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:۔ حوریں جو محلوں اور خیموں میں قیام پذیر تھیں۔ انہیں میری آواز نے سوز تمام عطا کیا۔ کوئی خیمے سے باہر سر نکال کر دیکھنے لگی۔ کسی نے بالا خانہ سے اپنا چہرہ دکھایا۔ گویا کہ حوریں بھی اقبال کو اپنا دل دے بیٹھیں۔

حوریاں را در قصور و در خیام — نالہ ء من دعوت سوز تمام!
آں یکے ازخیمہ سربیروں کشید — واں دگراز غرفہ رخ بنمود و دید! (۳)

اقبال چونکہ حسن مطلق کی تلاش میں متحرک ہیں۔ اس لئے جاوید نامے میں انہوں نے اپنا نام بھی زندہ رود رکھا ہوا ہے۔ جب زندہ رود حوروں کے حسن کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پیر رومی کے کہنے پر مزید آگے بڑھنے کے لئے تیار ہوتے

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۲۷۔ (۲) بال جبریل۔ ۳۹۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۱۲۸

ہیں تو متاع دل ہار بیٹھنے والی حوروں کے لبوں پر زندہ رود، اے زندہ رود، زندہ رود اے صاحب سوز و سرود کے الفاظ تھے۔ زندہ رود کے دائیں اور بائیں جانب سے شوروغوغا اٹھ رہا تھا کہ اے زندہ رود براہ مہربانی ہمارے پاس ایک دو پل کے لئے بیٹھ جا۔

برلب شاں ، زندہ رود ، اے زندہ رود   زندہ رود ، اے صاحب سوز و سرود
شوروغوغا از یسار و از یمیں   یک دودم با ما نشیں، باما نشیں! (۱)

زندہ رود یعنی اقبال جواب دیتے ہیں۔ وہ مسافر جو سفر کی لذت جانتا ہے۔ وہ رہزن سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا منزل سے ڈرتا ہے۔ عشق مجاز کے ہجر و وصال میں آسودگی نہیں پاتا۔ اسے صرف ''حسن ازل'' کے ''جمال لا یزال'' کے وصل مدام سے سکون و راحت ملتی ہے۔ عشق کی ابتداء حسن مجازی میں گرفتاری سے ہے۔ اور اس کی انتہا مجازی حسینوں سے آزاد ہو جانا ہے۔ اس لئے مبارک ہے وہ شخص جس نے کسی کو دل نہ دیا۔ جس کے پاؤں غیر اللہ کے بند سے آزاد رہے۔

اے خوش آں مردے کہ دل باکس نداد   بند غیر اللہ را از پاکشاد (۲)

عشق بے نیاز ہے اور مکان و لامکان دونوں میں ہر دم سفر کرتا ہے۔ ہمارا مسلک موج تیز گام کی مانند راستہ اختیار کرنا اور ترک مقام ہے۔

راہرو کو داند اسرار سفر   ترسد از منزل زرہزن پیشتر
عشق بے پروا و ہردم در رحیل   درمکان و لامکاں ابن السبیل!
کیش ماما نند موج تیز گام
اختیار جادہ و ترک مقام (۳)

یہ اس لئے کہ:۔

دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جا ودانے   نہ نوائے دردمندے، نہ غمے، نہ غمگسارے! (۴)

چنانچہ عشق عاشق کو جنت میں بھی قیام نہیں کرنے دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ:۔

عشق درہجرو وصال آسودہ نیست   بے جمال لایزال آسودہ نیست

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۸۶۔ (۲) پس چہ باید کرد۔ ۸۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۱۸۷۔ (۴) پیام مشرق۔ ۱۲۸۔

ابتدا پیش بتاں افتادگی انتہا از دلبراں آزادگی (۱)

طلسم نہایت آں کہ نہایتے ندارد بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امیدوارے (۲)

حسرت جلوۂ آں ماہ تمامے دارم دست بر سینہ نظر برلب بامے دارم (۳)

بگزر از گفت و شنود اے زندہ رود غرق شو اندر وجود اے زندہ رود (۴)

زندہ رود کسی مجازی محبوب سے نہیں بلکہ ''حسن مطلق'' سے عرض کرتے ہیں کہ:۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں (۵)

اقبال کہتے ہیں اگر اس جہاں میں نہیں تو آخرت میں ''نور مطلق'' کا دیدار عاشقوں کو ضرور نصیب ہوتا ہے۔ اس ضمن میں علامہ جنت الفردوس، اس کے ماحول اور حور و قصور کا ایسا دلکش نقشہ پیش کرتے ہیں کہ سورہ رحمٰن کی یاد تازہ ہو جانے کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

اندراں عالم جہانے دیگرے اصل او از کن فکانے دیگرے!

لازوال و ہر زماں نوح دگر ناید اندر وہم و آید درنظر!

ہر زماں اورا کمالے دیگرے ہر زماں اورا جمالے دیگر ے!

روزگارش بے نیاز از ماہ و مہر گنجد اندر ساحت او نہ سپہر!

ہر چہ درغیب است آیدروبرو پیش ازاں کزدل بروید آرزو!

در زبان خود چساں گویم کہ چیست ایں جہاں نوروحضور و زندگی ست

لالہ ہا آسودہ درکہسار ہا نہرہا گروندہ درگلزار ہا!

غنچہ ہائے سرخ و اسپیدو کبود از دم قدو سیاں اورا کشود!

آب ہاسیمیں ، ہوا ہا عنبریں قصر ہا باقبہ ہائے زمردیں!

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۸۷۔ (۲) پیام مشرق۔ ۱۲۸۔ (۳) ایضاً ۱۶۳۔ (۴) جاوید نامہ۔ ۱۲۹۔ (۵) بانگ درا۔ ۱۰۵

خیمہ ہا یا قوت گوں زریں طناب　　شاہداں باطلعت آئینہ تاب!
گفت رومی اے گرفتار قیاس　　درگذراز اعتبار است حواس
از تجلی کار ہائے خوب وزشت　　می شود آں دوزخ ایں گردد بہشت!
ایں کہ بینی قصر ہائے رنگ رنگ　　اصلش از اعمال و نے از خشت و سنگ !
آنچہ خوانی کوثر و غلمان وحور　　جلوۂ ایں عالم جذب و سرور!
زندگی ایں جادیدار است وبس
ذوق دیدار است و گفتار است و بس　　(۱)

اقبال مزید کہتے ہیں کہ اگر چہ جنت بھی اللہ تعالی کی تجلیات میں سے ایک تجلی ہے مگر ''محبوب حقیقی'' کے دیدار کے بغیر جان تسکین نہیں پاتی ۔ ہم اپنی اصل سے پردے میں ہیں ہم اس پرندے کی مانند ہیں جو اپنا آشیاں گم کر چکا ہے ۔ لیکن عشق تمام حجابات و پردوں کو پھاڑ دیتا ہے ۔ وہ عاشق پر چودہ طبق روشن کر دیتا ہے ۔ اور عاشق محبوب حقیقی تک جا پہنچتا ہے ۔ بلکہ عشق سراپا حق بن جاتا ہے ۔

از نگاہ عشق خارا شق شود　　عشق حق آخر سراپا حق شود　　(۲)
آزر کا پیشہ خارا تراشی　　کار خلیلاں خارا گدازی!　　(۳)

عشق کسی کو اپنے ساتھ خلوت میں کیسے لے جا سکتا ہے ۔ اس کی غیرت تو اپنی نظر کو بھی برداشت نہیں کرتی ۔ آغاز عشق میں رفیق بھی ہے اور طریق بھی مگر اس کا آخر بغیر رفیق کے راہ طے کرنا ہے ۔ چنانچہ اقبال کے مطابق وہ حور وقصور سے آگے بڑھ گئے اور اپنی کشتی جان کو بحر نور میں ڈال دیا ۔ کہتے ہیں میں جمال ذات کے نظارہ میں غرق ہوگیا ۔ وہ جمال لایزال ہر لحہ نئے رنگ میں جلوہ گر تھا ۔ میں ضمیر کائنات میں گم ہوگیا میں نے زندگی (حسن مطلق) کو رباب کی مانند دیکھا ۔ حق تعالی اپنے سارے اسرار کے ساتھ ظاہر تھے ۔ بلکہ وہ میری نگاہ سے اپنا دیدار کر رہے تھے ۔ اللہ تعالی کے دیدار سے وہ افزونی ملتی ہے ۔ جس میں کمی کا احتمال نہیں ۔ ان کے ''نظارہ جمال'' سے بندہ تن کی قبر سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھتا ہے ۔

گرچہ جنت از تجلی ہائے اوست　　جاں نیا ساید بجز دیدار دوست!

---

(۱) جاوید نامہ ۔ ۱۵۵ ۔ (۲) اسرار خودی ۔ ۱۸ ۔ (۳) بال جبریل ۔ ۴۷ ۔

ماز اصل خویشتن درپردہ ایم　　طائریم و آشیاں گم کردہ ایم
عشق کس را کے بخلوت می برد　　اوز چشم خویش غیرت می برد!
اول اوہم رفیق و ہم طریق　　آخرِ اوراہ رفتن بے رفیق!
درگذشتم زاں ہمہ حور و قصور　　زورقِ جاں باختم در بحر نور!
غرق بودم درتماشائے جمال　　ہر زماں در انقلاب و لا یزال!
گم شدم اندر ضمیر کائنات　　چوں رباب آمدبچشم من حیات!
حق ہویدا باہمہ اسرار خویش　　بانگاہ من کند دیدار خویش!
دیدنش افزودنِ بے کاستن!　　دیدنش از قبرتن برخاستن!　　(۱)

لہٰذا :۔

سینا است کہ فاران است ؟ یا رب چہ مقام است ایں ؟
ہر ذرہ خاک من چشمے است تماشا مست!　　(۲)

میری جان سے اللہ ھو کا نغمہ بکھرا تو یہ جہان چارسو میرے وجود سے غبار کی مانند جھڑ گیا۔ میرے ہاتھ سے ساز لے لو کہ اب اس کے تار، مضراب کے سوز سے میرے آنسوؤں کی مانند نیچے گر رہے ہیں۔

زجانم نغمہ اللہ ھو ریخت　　چو گرداز رخت ہستی چار سو ریخت
بگیر از دست من سازے کہ تارش　　زسوز زخمہ چوں اشکم فروریخت!　　(۳)

عشق اپنی تڑپ و پھڑک اور برقی کڑک کی بناء پر وہ متحرک جذبہ ہے۔ جو عاشق کو کسی ایک مقام پر قرار نہیں کرنے دیتا۔ یہی حال ''زندہ رود'' کا ہے۔ اس لئے کہ عشق اقبال کے دل و جان اور ذوق جمال میں برقی رو کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ ان کے کلام میں جمالی و جلالی دنیا انتہائی متحرک رہتے ہوئے، ہر وقت رواں دواں رہتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی کھل کر سامنے آ گیا ہے کہ عشق کا آغاز مجاز سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا محبوب مجازی سے آزادی حاصل کرنے پر ہوتی ہے۔ عشق حوروں سے بھی گزر کر'' حسن مطلق'' تک جا پہنچتا ہے۔ اسی لئے تو ہر حور کہتی ہے۔

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔　(۲) مثنوی مسافر۔ ۷۷۔　(۳) ارمغانِ حجاز۔ ۱۳۱۔

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی — عجب ایں کہ تو ندانی رہ ورسم آشنائی (۱)

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن — حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن ! (۲)

"لیکن حوریں جو بھی کہتی رہیں، اقبال کو اس کی پراوہ نہیں۔ بلکہ وہ ایک شعر میں، جو اس بحث کا نچوڑ دکھائی دیتا ہے، ساری بات ختم کر دیتے ہیں۔

ے دیرینہ و معشوقِ جواں چیزے نیست — پیش صاحب نظراں حورِ جناں چیزے نیست (۳)

ع — حور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر (۴)

اب ہم اس مقام پر آ گئے ہیں کہ بلاواسطہ حسن و عشق پر بات کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ جمالیات کے بنیادی عناصر معروضیت و موضوعیت یا تجزیاتی و تصوراتی فلاسفی پر بحث کرتے ہوئے اقبال کے قرآنی نقطہ نظر، "وحدت جمال" کو اجاگر کرتے چلے جائیں۔

افلاطون سے ہٹ کر دیکھا جائے تو تصوریت نو کے بانی کانٹ ہیں۔ شلر نے کانٹ کی تصوریت کی مخالفت کی اور بعد میں لپس نے تصوریت کے خلاف شروع کردہ شلر تحریک کو حد کمال تک پہنچایا۔ چنانچہ نصیر احمد ناصر "اقبال اور جمالیات" میں لکھتے ہیں۔

"تاریخ جمالیات میں جس فلسفی نے سب سے پہلے قرآن حکیم کے نظریہ موضوعیت و معروضیت کی دانستہ یا نادانستہ، پر زور تائید کی وہ شلر (Schiller) ہے۔ اس عظیم الشان عالم جمالیات کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے زبردست دلائل و براہین سے المانی دبستان تصوریت کی تردید کی اور اس کے دبستان نو کے بانی کانٹ کے نظریہ موضوعیت پر زبردست تنقید کی۔ وہ اپنے نظریہ حسن کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے! "حسن اس لئے ہمارے لئے معروضی یا خارجی شے ہے کہ غور و فکر جس کے تحت ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی ایک ضروری شرط ہے۔۔۔۔ شلر کے بعد اس سرزمین میں لپس (Lipps) ایسا عظیم مفکر پیدا ہوا۔ جس نے دبستان تصوریت کی بنیادیں ہلا دیں۔ لپس اسلامی افکار بالخصوص اسلامی تصوف سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔" (۵)

نصیر احمد ناصر ہی اپنی دوسری کتاب، "تاریخ جمالیات" میں شلر کے بارے میں ایسی رائے دیتے ہیں۔ جس سے

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۲۶۔ "حور"۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۴۵۔ "جنت میں"۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۴۶۔ زبور عجم میں بھی ہے۔ ۱۲۰۔
(۴) بال جبریل۔ ۲۹۔ (۵) اقبال اور جمالیات۔ ۱۳۳۔ ۱۳۵۔ نصیر احمد ناصر۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ موضوعیت و معروضیت دونوں ہی کا قائل تھا۔

''وہ حسن کو نہ تو مطلقاً معروضی ہی سمجھتا ہے اور نہ مطلقاً موضوعی ۔ اس کے تصورحسن کی اساس اگر چہ معروضیت ہی پر رکھی ہوئی ہے لیکن وہ معروضیت بھی ایسی ہے جو ہمارے حواس و قلب سے تعلق رکھتی ہے ۔ شلر بے شک کانٹ کی موضوعیت کی مخالفت و بطلان میں بعض اوقات بہت دور نکل جاتا ہے ۔لیکن وہ موضوعیت کی ہستی اور اہمیت کا منکر نہیں ۔ اس کے اس رجحان کے پیش نظر یہ بات یک گونہ وثوق سے کہی جا سکتی ہے ۔کہ اگر اسے قرآن حکیم کے نظریہ وحدت جمال سے آگاہی ہو جاتی تو وہ یقیناً اس نظریے کو قبول کر لیتا اور اس کی تصدیق کرتے ہوئے برملا کہہ اٹھتا کہ حسن تو معروضی بھی ہے اور موضوعی بھی ۔'' (۲)

یہ تو ہیں کانٹ ،شلر اور لپس کی باتیں جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے وہ ہم پہلے بھی تفصیلاً دیکھ چکے ہیں کہ عقل و فلسفے پر بالکل یقین ہی نہیں رکھتے اور قدم قدم پر'' عقلیت'' کی مخالفت کرتے ہیں ۔ اس کے برعکس اقبال عشق ووجدان کو حسن مطلق تک رسائی کا مکمل و اکمل ذریعہ سمجھتے ہیں ۔اور اس سلسلے میں طرح طرح کے دلائل وثبوت پیش کرتے ہیں ۔ یہاں ہم ایک نئے انداز میں اس بحث کا آغاز کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ اقبال نے معروضیت و موضوعیت کا گہرا مطالعہ کیا ۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب فلسفیانہ بحثیں قرآن حکیم کے ''ذوق وحدت جمال'' کے سامنے ناقص و نامکمل ہیں ۔جس کی بنا پر اقبال'' ذوق وحدت جمال'' کو اپناتے ہیں اور عشق کے بل بوتے پر پرواز کرتے ہیں ۔ اور فلسفیوں کی بجائے حضورﷺ سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں ۔

میں کیا کروں میری بہانہ ساز عقل الجھنوں پر الجھنیں بڑھا رہی ہے ۔حضورﷺ !مجھ پر نظر کرم فرمائیں کہ آپﷺ کی نگاہ سے میرے مجاز کا طلسم ٹوٹ جائے ۔ چونکہ عقل لنگڑی ہے اس لئے وہ بیٹھ رہنا پسند کرتی ہے ۔ وہ مغز کو نہیں دیکھتی صرف چھلکے سے لگاؤ رکھتی ہے ۔ جب ہم نے یعنی تجزیاتی فلاسفہ نے حقیقت کے سینکڑوں ٹکڑے کر دیے تو اس سے ثابت و سیار کی تمیز پیدا ہوئی ۔خرد و تجزیاتی فلسفے نے لامکاں کے اندر مکاں کی بنیاد رکھی اور پھر زمان کو زنار کی طرح مکاں کے گرد لپیٹ لیا ۔ہم نے اپنے اندر زماں کو دیکھنے کی کوشش کی! اور مہ وسال اور شب و روز پیدا کر لیے ۔ تجزیے سے ہر چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ۔عقل و فلسفہ ابد یعنی اللہ تعالی کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ۔ وحدت تجزیاتی فلسفے کی پکڑ دھکڑ سے ہزاروں

---

(۱) تاریخ جمالیات ۔جلد دوئم ۔۷۰۔ ۷۱۔

ٹکڑوں میں منقسم ہوجاتی ہے ۔ گویا تجزیاتی فلسفہ اقبال کے نزدیک تخریب کاری ہے ۔

ابد را عقل ما ناساز گار است یکی از گیر و دار او ہزار است (۱)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک وقت ایک بسیط آن ہے ۔ وہ ماضی ، حال اور مستقبل میں منقسم نہیں ۔ تجزیاتی فلسفے کے خلاف اقبال بھی یہی کہتے ہیں کہ حقیقت سالم و ثابت ہے ۔ اُن کے نزدیک ، حیات ایک زماں ایک کائنات بھی ایک ، اور ، دلیل کم نظری قصہ قدیم و جدید ۔

اس مسئلہ پر سوچ بچار کرنے کے بعد ذاتی طور پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ۔ جو پیدا نہیں ہوئے ان کا کچھ بھی نہیں اس لیے کہ وہ نہیں ۔ وقت اُن کا کچھ نہیں اور وہ وقت کے کچھ نہیں ۔ جو مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں ، میرا ماضی ان کا مستقبل ہے ۔ جبکہ میرا حال اُن کا بھی حال ہے ۔ اُن کا ماضی اُن سے چھوٹوں کا مستقبل ہے ۔ اُن کا حال اُن سے چھوٹوں کا بھی حال ہے ۔ مجھ سے بڑوں کا ماضی میرا مستقبل اور اُن کا حال میرا بھی حال ہے ۔ گویا کہ کائنات میں موجود سبھی اشیاء کا حال ایک ہی ہے ، مشترک ہے ۔ مگر ماضی و مستقبل جدا جدا ہیں ۔ حال کا مشترکہ ہونا وقت کی ''وحدانیت'' کا ثبوت ہے ۔ جبکہ ماضی و مستقبل محض تجزیاتی تخریب کاری ہے ۔

چہ کنم کہ عقل بہانہ جو گرہے بروے گرہ زند نظرے ! کہ گردشِ چشمِ تو شکند طلسم مجاز من (۲)

چو لنگ است او سکوں رادوست دارد نہ بیند مغزودل برپوست دارد

حقیقت را چوما صد پارہ کردیم تمیز ثابت و سیارہ کردیم

خرد ورلا مکاں طرح مکاں بست چوزنارے زماں را برمیاں بست

زماں را در ضمیر خود ندیدم مہ وسال و شب و روز آفریدم (۳)

اقبال کہتے ہیں ۔ مہ و سال کی کوئی اہمیت نہیں قرآن حکیم کے الفاظ ''**کم لبثتم**'' پر غور کر ۔ قیامت کے روز کفار سے پوچھا جائے گا کہ تم دنیا میں کتنا عرصہ رہے ہو تو وہ کہیں گے کہ ایک دن یا اس سے بھی کم ۔ اپنے آپ تک پہنچ ۔ باہر کے ہنگامے چھوڑ ، تو اپنے ضمیر کے اندر اتر جا ۔

مہ و سال نمی ارزد یک جو بحرف کم لبثتم غوطہ زن شو

---

(۱) زبورِ عجم ۔ ۱۵۴ ۔ (۲) پیامِ مشرق ۔ ۱۷۴ ۔ (۳) زبورِ عجم ۔ ۱۵۵ ۔

بخود رس از سر ہنگامہ برخیز تو خود را در ضمیر خود فروریز (۱)

مبارک ہے وہ دن، جو سورج کے ایام سے نہیں۔ جس کی صبح شام میں تبدیل نہیں ہوتی ۔ یعنی حسن مطلق کو زوال نہیں ۔ اگر ایسے دن کے نور سے جان منور ہوجائے تو آواز کو رنگ کی طرح دیکھا جاسکتا ہے۔ یعنی حسن مطلق کا قرب حاصل ہوجائے تو نہ دکھائی دینے والی چیز بھی نظر آسکتی ہے ۔ ایسے دن کی روشنی سے غیب حضوری میں بدل جاتا ہے ۔ وہ دن ہمیشہ رہتا ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتا ۔ گو" حسن مطلق" کی حضوری میں جب صبح، شام ہی نہیں ہوتی تو دن کیسے گزر سکتا ہے ؟ اقبال دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ مجھے وہ دن نصیب فرمایئے۔ اور اس بے سوز دن سے رہائی دلایئے ۔ جہاں وقت کا تجزیہ کر کے اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے پھینک دیا جاتا ہے ۔

اے خوش آں روزے کہ از ایام نیست صبح اورانیم روز و شام نیست

روشن از نورش اگر گردوں رواں صورت راچوں رنگ دیدن می تواں

غیب ہا از تاب او گردد حضور نوبت او لایزال و بے مرور!

اے خداروزی کن آں روزے مرا (۲)

وار ہاں زیں روز بے سوز ے مرا

گویا کہ:

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری نہ ہے زماں ، نہ مکاں الاالہ الااللہ (۳)

مقام فکر ہے پیائش زمان و مکاں مقام ذکر ہے سبحان ربی الا علیٰ (۴)

تجزیاتی فلسفیوں کی ظاہری نگاہ کے برخلاف اقبال کہتے ہیں کہ حقیقت ایک ہے اور اسے ہرگز منقسم نہیں کیا جاسکتا ۔ وہ حقیقت ہی کیا ؟ جو کسی کے تقسیم کرنے سے تقسیم ہوجائے ۔

جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا ؟ (۵)

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے

یقیں ہے مجھ کو گرے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا (۶)

---

(۱) زبور عجم ۔ ۱۵۵۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۸۔ (۳) ضرب کلیم ۔ ۱۵۔ (۴) ایضاً ۔ ۲۳ ۔ (۵) بانگ درا ۔ ۱۴۱۔ (۶) ایضاً ۔ ۱۳۷۔

تمیز لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل　　جہاں میں وانہ کوئی چشم امتیاز کرے　(۱)

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں　(۲)

حرکت اعصاب گردوں دیدہ ام　　در رگ مہ گردش خوں دیدہ ام　(۳)

گویا کہ:

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہ سحر میں وہ

چشم نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے　(۴)

جہاں چھپ گیا پردہ رنگ میں　　لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں　(۵)

بہرحال اقبال کہتے ہیں کہ خرد نے آج کل کا تجزیاتی و تصوراتی اور معروضی و موضوعی زنار پہن رکھا ہے۔ وہ چشم وگوش کے بتوں کی پجاری ہے، حواس ظاہر سے حاصل شدہ تاثرات کو سب کچھ سمجھتی ہے۔ اس نے اپنی آستین میں بت چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ زنار پوش کسی برہمن کی اولاد معلوم ہوتی ہے۔ بتوں ہی سے دل بہلا لیتی ہے۔ عقل مجاز میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔

خرد زنجیری ء امروز و دوش است　　پرستار بتان چشم و گوش است

صنم در آستیں پوشیدہ دارد　　برہمن زادہء زنار پوش است　(۶)

پھر اقبال محبوب حقیقی سے کہتے ہیں کہ، عقل نے تیرے چہرے پر پردے بن رکھے ہیں اور میری نگاہ تشنہ دیدار ہے۔ ہر لحہ عقل اور عشق میں جنگ رہتی ہے۔ میری جان زار میں کیا شور قیامت ڈال دیا ہے۔

خرد بر چہرہ تو پردہ ہا بافت　　نگاہے تشنہء دیداردارم

درافتد ہر زماں اندیشہ باشوق　　چہ آشوب افگنی در جان زارم　(۷)

عقل بھی اگر پختہ ہوجائے تو عشق ہے اور ذوق نگاہ سے بیگانہ نہیں۔ البتہ اس بیچاری میں جراء ت رندانہ نہیں ہوتی۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے۔

---

(۱) بانگِ درا۔۱۰۶۔　(۲) بانگِ درا۔۲۷۱۔ طلوع اسلام　(۳) اسرار خودی۔۱۰۔　(۴) بانگِ درا۔ ۱۱۳۔

(۵) بال جبریل۔۱۳۲۔ ''ساقی نامہ''　(۶) پیامِ مشرق۔۳۹۔　(۷) پیام مشرق۔۴۱۔

عقل ہم عشق است واز ذوق نگہ بیگانہ نیست
لیکن این بیچارہ راآں جراءت رندانہ نیست (۱)

جبکہ:

میری میں فقیری میں ، شاہی میں ، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأت رندانہ (۲)

عشق در صحبت میخانہ بگفتار آید زانکہ دردیر و حرم محرم اسرارش نیست (۳)

اس کے بعد تجزیاتی توڑ پھوڑ اور تقسیم کے حوالے سے اقبال کہتے ہیں کہ تن و جاں کو الگ الگ کہا تو جا سکتا ہے مگر انہیں الگ الگ سمجھنا حرام ہے۔ جان کے اندر کائنات کا راز پوشیدہ ہے، بدن احوال حیات میں سے ایک حال ہے۔

تن و جاں را دو تاگفتن کلام است تن و جاں را دو تا دیدن حرام است
بجاں پوشیدہ رمز کائنات است بدن حالے زاحوال حیات است (۴)

اقبال تجزیاتی فلسفہ سے اختلاف کرتے ہوئے طنزاً کہتے ہیں کہ ہم نے وحدت کو اس طرح سینکڑوں ٹکڑوں میں منقسم دیکھا، کہ اسے شمار کرنے کے لیے اعداد ایجاد کر لیے۔ یہ کہن دیر یعنی کائنات یا مکان جسے تو دیکھتا ہے، محض ایک مشت خاک ہے۔ لیکن یہ "حسن مطلق" کی سرگزشت کا ایک لمحہ ہے۔ فلسفی مردے کے بدن کی آرائش کرتے رہے۔ کیوں کہ ان کے پاس نہ ید بیضا تھا، نہ دم عیسیٰ علیہ السلام۔ میرے دل نے ان کی حکمت میں کچھ نہیں دیکھا۔ وہ ایک اور حکمت کے لیے تڑپ رہا ہے جو کہ دانش نورانی ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کائنات انقلاب میں سے گزر رہی ہے۔ اس کا اندرون زندہ ہے اور پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ ارسطو نے کائنات کو مردہ ڈھیر کہا تھا۔ اقبال ارسطو سے متفق نہ ہوتے ہوئے اس کا جواب دے رہے ہیں۔ تو اعداد و شمار سے آگے نکل ذرا اپنے اندر نظر ڈال اور آگے بڑھتا جا۔ یہ عالم جہاں جز (انساں) کل (کائنات) سے بڑھ کر ہے۔ رازی اور طوسی کا قیاس محض جنوں ہے۔ بے شک تھوڑی دیر کے لیے ارسطو سے دوستی رکھ، کچھ وقت بیکن کے ساز کا ہمنوا رہ۔ لیکن انکے مقام سے آگے نکل جا، ان کی منزل میں گم نہ ہو جا۔ اپنا سفر جاری رکھ۔ وہ عقل جو بیش و کم جانتی ہے اور جو کان اور سمندر کے اندرون کو پہچانتی ہے۔ تو اُس کی مدد سے اس جہان چند و چوں کو اپنے تحت لا۔ اور آسماں کے ماہ و

---

(۱) زبور عجم۔ ۲۶۔ (۲) بال جبریل۔ ۶۸۔ (۳) پیام مشرق۔ ۱۷۷۔ (۴) زبور عجم۔ ۱۵۵۔

پروین کی گھات میں بیٹھ۔ لیکن وہ جو اور حکمت ہے اسے بھی سیکھ اور اپنے آپ کو ایّام کا راکب بنا کر رات دن کے فریب سے رہائی حاصل کر۔ تیرا مقام اس کائنات سے باہر ہے، تو وہ یمین طلب کر جو یسار کے بغیر ہو۔ یعنی وہ جہاں جو چار سو سے آزاد ہو۔

یکی را آں چناں صد پارہ دیدم عدد بہر شمارش آفریدم
کہن دیرے کہ بینی مشت خاک است؟ دمے از سر گزشت ذات پاک است
حکیماں مردہ را صورت نگار اند! ید موسیٰ دمِ عیسیٰ ندا رند!
دریں حکمت دلم چیزے ندید است برائے حکمتِ دیگر تپید است
من ایں گویم جہاں در انقلاب است درونش زندہ و در پیچ و تاب است
ز اعداد و شمارِ خویش بگذر یکے از خود نظر کن پیش بگذر
دراں عالم کہ جزو از کل فزوں است قیاسِ رازیؔ و طوسیؔ جنوں است
زمانے با ارسطوؔ آشنا باش دمے باسازِ بیکنؔ ہمنوا باش
ولیکن از مقامِ شاں گزر کن مشوگم اندریں منزل سفر کن
باں عقلے کہ داند بیش و کم را شناسد اندرونِ کان و یم را
جہانِ چند و چوں زیرِ نگیں کن بگردوں ماہ و پرویں را کمیں کن
ولیکن حکمتِ دیگر بیا موز رہاں خود را ازیں مکرِ شب و روز

مقامِ تو بروں از روز گار است
طلب کن آں یمیں کو بے یسار است (۱)

"اقبال وحدت جمال" کے قائل ہیں جبکہ عقل و فلسفہ تجزیاتی ہوتے ہوئے حواسِ ظاہری سے سامان حاصل کرتے ہیں۔ اور فغاں عشق سے روشنی حاصل کرتی ہے۔ خرد جزو کو اور عشق کُل کو گرفت میں لاتا ہے۔ فلسفہ و خرد یا معروضی ہے یا موضوعی، جبکہ عشق ظاہر و باطن دونوں کو مانتا ہے۔ خرد فانی ہے، عشق لا فانی۔ خرد کا ظرف اتنا نہیں کہ ابد کو سمجھ سکے۔ وہ گھڑی

(۱) زبورِ عجم۔ ۱۵۶

کی سوئی کی طرح وقت کے شمار میں رہتی ہے۔ حالانکہ وقت گھڑی کے اندر کہیں بھی نہیں۔ جب گھڑی نہیں بنی تھی تو بھی وقت تھا، ساری دنیا سے گھڑیاں ختم ہو جائیں تو بھی وقت ہو گا۔ گھڑی جس کے پاس نہیں ہوتی، وقت کا احساس اسے بھی ہوتا ہے۔ خرد دن رات اور صبح تراشتی ہے۔ وہ شعلے کو نہیں پکڑتی، شرر چنتی رہتی ہے۔ اہلِ عشق کا انجام کارِ فغاں ہے۔ فغاں کے ایک لمحے میں پورا زمانہ نہاں ہے۔ حواس عقل یا فلسفہ ہیں، فغاں عشق ہے۔

خرد را از حواس آید متاعے　　فغاں از عشق می گیرد شعاعے
خرد جز را فغاں کل را بگیرد　　خرد میرد فغاں ہر گز نمیرد
خرد بہر ابد ظرفے ندارد　　نفس چوں سوزن ساعت شمارد
تراشد روز ہا شب ہا سحر ہا　　نگیرد شعلہ و چیند شرر ہا
فغانِ عاشقاں انجام کارے است
نہاں در یک دمِ او روز گارے است (۱)

علمِ حق اول حواس، آخر حضور　　آخرِ او می نگنجد در شعور! (۲)

اس کے بعد بظاہر تو یوں لگتا ہے کہ اقبال موضوعی فلسفے کے حق میں بول رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ جان بوجھ کر موضوعیت و تصوریت کی ہاں میں ہاں ملاتے چلے جاتے ہیں۔ جیسا کہ کبھی کبھار بحث کے دوران میں ہر کوئی کرتا ہے۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد پینترا بدل کر موضوعی فلسفیوں پر سوالات و دلائل کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ جس سے موضوعیت و تصوریت کا سارا بھرم کھل جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں اے موضوعی فلسفی! تیری یہ چشمِ بیدار بھی خواب ہے، تیری گفتار و کردار بھی خواب ہے، جب وہ بیدار ہو تو کوئی اور باقی نہیں۔ متاعِ شوق کا کوئی خریدار نہیں۔ ہماری عقل قیاس سے بڑھتی ہے اور ہمارا قیاس ہمارے حواسِ خمسہ پر مبنی ہے۔ جب حس بدل جائے تو دنیا بدل جاتی ہے۔ اس کے سکون، حرکت اور کمی بیشی میں فرق آ جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہانِ رنگ و بو نہیں ہے، نہ زمین و آسماں ہیں اور نہ محل اور گلی کوچے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جہاں خواب یا افسوں ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس بے چگوں (ذات باری تعالیٰ) کے چہرے کا نقاب ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب ہوش کا طلسم ہے، اور چشم و گوش (دید و شنید) کے پردوں کا فریب ہے۔

---

(۱) زبورِ عجم۔ ۱۶۵۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۲۰۳۔

مگر خودی کا تعلق اس کائناتِ رنگ و بو سے نہیں۔ ہمارے اور اس کے درمیان حواس کا تعلق ہی نہیں۔ خودی کے حریم میں ظاہری نگاہ کا گزر نہیں۔ تو بغیر نگاہ کے اس کا نظارہ کرتا ہے۔ خودی کے زمان کا حساب گردشِ افلاک سے نہیں جب تو خود ہی اپنی خودی و ذات کو دیکھ رہا ہو تو اس میں ظن وتخمین و شک وشبہ کہاں باقی رہ جاتا ہے۔ اگر تو کہے کہ ''میں'' ''وہم و گماں'' ہے، میں کی نمود بھی ایں وآں کی نمود کی مانند ہے۔ پھر مجھے بتا کہ گمان کرنے والا کون ہے۔ ذرا اپنے اندر نظر ڈال کر مجھے بتا کہ وہ بے نشاں کون ہے؟ جو اپنے اندر گماں پیدا کر رہا ہے۔ جہاں گرچہ ظاہر ہے مگر پھر بھی معاملاتِ دنیا میں دلیل سے کام چلتا ہے اور دلیل کا یہ سلسلہ فکرِ جبرائیل میں بھی نہیں سماتا۔ مگر خودی پنہاں ہونے کے باوجود، دلیل کی محتاج نہیں، ذرا سوچ اور سمجھ کہ یہ کیا راز ہے؟

خودی کو حق سمجھ اسے باطل نہ کر۔ نہ اسے کشتِ بے حاصل خیال کر، خودی جب پختہ ہو جائے تو پھر وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ عشاق کا فراق ہی عینِ وصال ہے۔ شرر کو پرواز تیز اور ہمیشہ کی چمک بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دوام اس کی کوشش کا نتیجہ نہیں۔ اس نے یہ دوام جستجو سے نہیں پایا۔ وہ از خود الحیّ والقیوم ہے۔ ہمارا دوام اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ یہ جانِ مستعار اللہ تعالیٰ کے عشق اور اس کی مستی کے ذریعے پائیداری حاصل کرتی ہے۔ کوہسار و دشت و در کا وجود کچھ نہیں۔ جہان فانی ہے۔ صرف خودی کو بقا ہے۔ باقی کچھ نہیں۔ اب شنکر اور منصور کی بات نہ کر۔ اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے آپ کے ذریعے ڈھونڈ۔ خودی کی تحقیق کے لیے اپنے اندر گم ہو جا۔ ''انا الحق'' کہہ اور خودی کا صدیق بن۔

ترا ایں چشمِ بیدارے بخواب است — ترا گفتار و کردارے بخواب است
چو او بیدار گردد دیگرے نیست — متاعِ شوق را سودا گرے نیست
فروغِ دانش ما از قیاس است — قیاسِ ماز تقدیرِ حواس است
چو حس دیگر شد ایں عالم دگر شد — سکون و سیروکیف و کم دگر شد
تواں گفتن جہانِ رنگ و بو نیست — زمین و آسمان و کاخ و کو نیست
تواں گفتن کہ خوابے یا فسونے است — حجابِ چہرۂ آں بے چگونے است
تواں گفتن ہمہ نیرنگِ ہوش است — فریب پردہ ہائے چشم و گوش است

خودی از کائنات ِ رنگ و بو نیست — حواسِ ما میانِ ما و او نیست
نگہ را در حریمش نیست راہے — کنی خود را تماشا بے نگاہے
حسابِ روزش از دورِ فلک نیست
بخود بینی ظن و تخمین و شک نیست
اگر گوئی کہ "من" وہم و گمان است — نمودش چوں نمودِ این و آں است
بگوبامن کہ دارائے گماں کیست؟ — یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست؟
جہاں پیدا و محتاجِ دلیلے! — نمی آید بفکرِ جبرئیلے
خودی پنہاں زحجت بے نیاز است! — یکے اندیش و دریاب ایں چہ راز است!
خودی را حق بداں باطل مپندار — خودی را کشتِ بے حاصل مپندار
خودی چوں پختہ گردد لا زوال است — فراقِ عاشقاں عینِ وصال است!
شرر را تیز بالے می تواں داد — تپیدِ لا یزالے می تواں داد
دوام حق جزاے کارِ او نیست — کہ اورا ایں دوام از جستجو نیست
دوام آں بہ کہ جانِ مستعارے — شود از عشق و مستی پائیدارے!
وجودِ کوہسار و دشت و در ہیچ! — جہاں فانی، خودی باقی، دگر ہیچ!
دگراز شنکر و منصور کم گوے! — خدارا ہم براہِ خویشتن جوے
بخود گم بہر تحقیقِ خودی شو
اناالحق گوے و صدیقِ خودی شو (۱)

علاوہ ازیں پیامِ مشرق میں بھی اقبال موضوعی فلسفیوں یعنی موضوعیت وتصوریت کے ساتھ بظاہر متفق ہوتے ہوئے، آخر میں اچانک چونکا دینے والا سوال کر دیتے ہیں۔ کہ اگر یہ سب کچھ تمھاری نگاہ نے بنایا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے کیا بنایا ہے؟ بات کا آغاز موضوعی وتصوراتی فلسفی کی زبانی اس طرح سے کرتے ہیں:

---

(۱) زبورِ عجم ۔۱۷۰۔ ۱۷۱۔

یہ جہاں کیا ہے؟ فقط میرے پندار کا صنم خانہ ہے۔ اس کا جلوہ صرف میری دید کا رہین منت ہے۔ یہ سارا آفاق جس کا احاطہ میں ایک نگاہ سے کر لیتا ہوں، یہ گویا میری نگاہ کی گردش پرکار کا دائرہ ہے۔ اشیائے کائنات کا ہونا نہ ہونا میرے دیکھنے یا نہ دیکھنے پر موقوف ہے۔ زماں ہو یا مکاں سب میری شوخیٔ افکار کے مرہونِ منت ہیں۔ اشیاء کا چلنا یا ٹھہرنا، نظر آنا یا نظر نہ آنا سب میرے فکر کی فسوں کاری ہے۔ یہ جہاں فقط میرے اسرار کا غماز اور انہیں افشا کرنے والا ہے۔ وہ جہانِ آخرت جس میں یہاں بوئے گئے اعمال کی فصل کاٹیں گے۔ اس کی جنت کا نور یا دوزخ کی نار میری ہی تسبیح و زنار (ایمان و کفر) کا اثر ہے۔ میں سازِ تقدیر ہوں اور میرے سینکڑوں نغمے ہیں۔ میرا تار وہاں تک پہنچتا ہے۔ جہاں تک میرے مضرابِ فکر کی رسائی ہے۔ اے وہ ذات جس کے فیض سے میں پائندہ ہوں! آپ کا نشان کہاں ہے؟ یہ دونوں جہان تو میرے اثر سے ہیں۔ آپ کا جہان کہاں ہے؟

یہیں نکتے کی بات ہے کہ انسان بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کے فیض و کرم سے پیدا ہوتا ہے اور فیض پاتا ہے۔ مگر موضوعی فلسفی خالقِ حقیقی کی تخلیقات بالحق کو اپنی اس نظر کا کرشمہ قرار دیتا ہے جس نظر کو بھی اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ اقبال کے نزدیک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سب کچھ موضوعی فلسفی کا کرشمہ ہے تو پھر، حق تعالیٰ نے کیا تخلیق کیا ہے؟ جس سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ ___ دراصل سب کچھ اللہ تعالیٰ کا تخلیق کردہ ہے۔

این جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است — جلوہ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاہے اورا — حلقہ است کہ از گردش پرکارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من! — چہ زماں و چہ مکاں شوخیٔ افکارِ من است
از فسوں کاریٔ دل، سیر و سکوں، غیب و حضور — ایں کہ غماز و کشائندۂ اسرارِ من است
آں جہانے کہ درو کاشتہ راے دروند — نور و نارش ہمہ از سجہ و زنارِ من است
سازِ تقدیرم و صد نغمۂ پنہاں دارم! — ہر کجا زخمۂ اندیشہ رسد تارِ من است

اے من از فیض تو پائندہ ! نشانِ تو کجا است؟
ایں دو گیتی اثر ماست ، جہان تو کجا ست؟ (۱)

---

(۱) زبورِ عجم۔ ۱۷۔

یعنی کہ؛

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لا مکاں ہے؟
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی؟ (۱)

مکانی ہوں کہ آزادِ مکاں ہوں؟ جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں؟
وہ اپنی لا مکانی میں رہیں مست مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں! (۲)

خودی کو لازوال بنایا جا سکتا ہے اور جمال لا یزال ،یعنی حسن مطلق سے فراق کو وصل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح موت سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ چراغِ خودی کو دمِ گرم (عشق) سے روشن کیا جا سکتا ہے اور اس کی سوئی سے گردوں (فنا، موت) کا چاک سیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو "الحی" ہیں ذوقِ سخن رکھتے ہیں۔ ان کی تجلیات بغیر انجمن کے نہیں۔

خودی را لازوالِ می تواں کرد فراقے او وصالے می تواں کرد
چراغے ازدمِ گرمے تواں سوخت
بسوزن چاکِ گردوں می تواں سوخت
خدائے زندہ بے ذوقِ سخن نیست تجلی ہائے او بے انجمن نیست (۳)

زندہ اور بے جان یہ کیا راز ہے، اقبال کہتے ہیں دیکھ تو میں تجھے اس کے مزیدار معنی بتاتا ہوں، اے نکتہ رس! موت اور زندگی سب اعتباری (اضافی) ہیں۔ مچھلیوں کے لیے کوہ وصحرا کا کوئی وجود نہیں۔ پرندوں کے لیے دریا کی تہہ موجود نہیں، لیکن درحقیقت موجود ہے۔ یہاں اقبال ساتھ ساتھ موضوعیت کے خلاف دلائل بھی دے رہے ہیں ۔ کہ گویا موضوعی فلسفیوں کی مثال (افلاطونؔ، بریڈلےؔ، کانٹؔ، برکلےؔ) مچھلیوں، پرندوں اور حشرات الارض کی سی ہے جو محدود سوچ رکھتے ہیں ___ بہرہ شخص سوز نوا کی نسبت سے مردہ ہے۔ کیونکہ وہ صوت وصدا کی لذت سے محروم ہے۔ ساز کے سامنے اندھا شاداں و فرحاں ہے۔ مگر رنگ کے سامنے زندہ درگور ہے۔ روح اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہی سے زندہ و پائندہ ہے۔ اگر یہ تعلق نہ رہے تو وہی ایک اعتبار سے زندہ ہے اور دوسرے اعتبار سے مردہ۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کی زندگی ایسی ہے جسے موت نہیں۔

---

(۱) بالِ جبریل ۔ ۱۷۔ (۲) ایضاً ۔ ۸۱۔ (۳) زبورِ عجم ۔ ۱۷۳۔

اس لیے اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے ہی سے حیاتِ جاوداں حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے تعلق منقطع کر لیتا ہے وہ مردہ ہے۔ اگر چہ کوئی اس کا ماتم گسار نہیں۔ اس کی نگاہ سے قابل دید چیزیں پنہاں رہتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک فلسفے اور فلسفی کی یہی حالت ہے۔ اس کی تقدیر میں حضور اس لیے نہیں کہ وہ مردہ ہے۔ اس کا قلب ذوق و شوقِ انقلاب (عشق) سے خالی ہوتا ہے۔ اس کا کردار سوزِ عشق اور اس کی گفتار نورِ حسن مطلق سے خالی ہے۔ اس کا مذہب اس کے ذہنی افق کی مانند تنگ ہے۔ اس کی اشراق (سورج طلوع ہونے کا وقت) اس کی عشا (رات) سے بھی زیادہ تیرہ و تار ہے۔ زندگی اس کے کندھوں پر بوجھ ہے۔ اور اپنی آغوش میں اپنی موت کی پرورش کرتا ہے۔ یہاں ''شوپن ہار'' جیسے قنوطی فلسفیوں کی طرف اشارہ ہے۔

تہِ گردوں مقامِ دلپذیر است — ولیکن مہر و ماہش زود میر است
فنا را بادۂ ہر جام گردند — چہ بیدردانہ او را عام کردند
بدوشِ شام نعشِ آفتابے — کواکب را کفن از ماہتابے
گلاں را در کمیں بادِ خزاں است — متاعِ کارواں از بیم جاں است (۱)

اس کی محبت میں عشق کو کئی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اس کی سانس عشق کو افسردہ کر دیتی ہے۔ عشق سے عاری انسان کی مثال ایسے کیڑے کی سی ہے جو مٹی سے باہر نہیں نکلتا۔ وہ مہر و ماہ اور آسمان کو کیا جانے اور الٹا یہ بھی کہتا ہے کہ سورج، چاند، ستارے ہے ہی نہیں:

زندہ و بے جان چہ راز است ایں نگر — باتو گویم معنیٔ رنگیں نگر
مردن و ہم زیستن اے نکتہ رس — ایں ہمہ از اعتبار است و بس
ماہیاں را کوہ و صحرا بے وجود — بحر مرغاں قعرِ دریا بے وجود
مردِ کر سوزِ نوارا مردۂ! — لذتِ صوت و صدا را مردۂ
پیشِ چنگے مست و مسرور است کور — پیشِ رنگِ زندہ درگور است کور
روح باحق زندہ و پائندہ ایست — ورنہ ایں مردہ آں را زندہ ایست
آنکہ حیٌ لایموت آمد حق است — زیستن با حق حیاتِ مطلق است

---

(۱) زبورِ عجم ۱۷۲۔ ۱۷۳۔

از نگاہش دیدنی ہا در حجاب ‌ ‌ ‌ قلبِ او بے ذوق و شوقِ انقلاب
سوزِ مشتاقی بکردارش کجا ‌ ‌ ‌ نورِ آفاقی بگفتارش کجا!
مذہبِ او تنگ چوں آفاقِ او ‌ ‌ ‌ از عشا تاریک تر اشراقِ او
زندگی بارِ گراں بردوشِ او ‌ ‌ ‌ مرگِ او پروردۂ آغوشِ او
عشق را از صحبتش آزار ہا ‌ ‌ ‌ از دمش افسردہ گردد نارہا

نزدِ آں کرمے کہ از گل بر نخاست
مہر و ماہ و گنبدِ گرداں کجاست (۱)

گویا کہ:

تو بہ پروازے پرے نکشودۂ ‌ ‌ ‌ کرمک استی زیرِ خاک آسودۂ (۲)

جاوید نامہ میں بھی ''زندہ رود'' نے ''جمال'' سے مختلف سوالات کرتے ہوئے حیات و موت کی مختلف گرہیں کھولی ہیں۔مثلاً ''زندہ رود''،''جمالِ مطلق'' سے سوال کرتے ہیں۔اس جہانِ رنگ و بو کا قانون صرف یہ ہے کہ گزرا ہوا پانی پھر ندی میں واپس نہیں آتا۔ نہ حیات میں تکرار کی خو ہے نہ شوق۔ میں کون ہوں؟ آپ کی شان کیا ہے۔ کائنات کہاں واقع ہے؟ میرے اور آپ کے درمیان یہ دوری کیوں ہے؟ فرمایئے میں کیوں تقدیر کے بندھن میں گرفتار ہوں۔ میں کیوں مرتا ہوں؟ آپ کس طرح ''حیی و قیوم'' ہیں۔

چیست آئینِ جہانِ رنگ و بو ‌ ‌ ‌ جز کہ آبِ رفتہ می ناید بجو!
زندگانی را سرِ تکرار نیست ‌ ‌ ‌ فطرتِ او خوگرِ تکرار نیست!
من کیم؟ تو کیستی؟ عالم کجا ست ‌ ‌ ‌ درمیانِ ماوتو دوری چراست؟

من چرا دربندِ تقدیرم بگوے
تو نمیری من چرا میرم بگوے! (۳)

جواباً ''ندائے جمال'' آتی ہے کہ تو اس جہانِ چار سو میں رہا ہے۔ جو اس میں سما جاتا ہے، وہ اس میں مر جاتا

---

(۱) زبورِ عجم۔۱۹۱۔ (۲) رموزِ بیخودی۔ ۱۶۵۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۱۹۱۔۱۹۳۔ ''زندہ رود''

ہے۔ زندگی چاہتا ہے تو خودی کو مستحکم کر۔ اور اس جہانِ چار سو کو اپنے اندر سمیٹ لے۔ پھر تو دیکھ لے گا کہ میں کون ہوں اور تو کیا ہے۔ تو دنیا میں کیسے مرتا ہے اور کیسے زندہ رہتا ہے۔ زندگی سانس کے آنے جانے کا نام نہیں۔ اس کی اصل خدائے ''حیی و قیوم'' سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''میں قریب ہوں''۔ لہٰذا ان سے قرب حاصل کرنا حیاتِ جاوداں سے حصہ پانا ہے۔ حسن لا زوال ہے اس لیے لازوال بنتا ہے۔ جس نے عشق کے طفیل ''حسن مطلق'' کا قرب حاصل کر لیا وہ کبھی نہیں مرتا۔

بودهٔ اندر جہانِ چار سو ہر کہ گنجد اندرو میرد درو
زندگی خواہی خودی را پیش کن چار سو را غرق اندر خویش کن
باز بینی من کیم تو کیستی!
در جہاں چوں مردی و چوں زیستی!
زندگانی نیست تکرارِ نفس اصلِ او از حیی و قیوم است و بس!
قربِ جاں با آں کہ گفت انی قریب از حیاتِ جاوداں بردن نصیب! (۱)

قرآنِ پاک میں جو اللہ تعالیٰ کی شان میں ''حیی'' لا یموت'' آیا ہے، حق ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ لو لگا کر زندہ رہنا ہی حیاتِ مطلق پا لینا ہے۔

آنکہ حیی'' لا یموت آمد حق است زیستن با حق حیاتِ مطلق است (۲)

اقبال کے دل میں اکثر زندگی جاوداں کا خیال پیدا ہوتا رہتا ہے۔ جس کا احساس ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ یہاں بھی وہ بات کا آغاز اسی مقصد کے تحت کرتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مختلف جگہوں پر خود ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قربِ خداوندی حاصل کر کے ''لافانی'' ہو جانے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کرتے ہیں، آپ جانتے ہیں حیاتِ جاوداں کیا ہے؟ مگر آپ یہ نہیں جانتے کہ مرگِ ناگہاں کیا ہے؟ آپ کے اوقاتِ حیات میں سے ایک گھڑی بھی کم نہ ہو گی، اگر میں غیر فانی ہو جاؤں تو اس میں آپ کا کیا نقصان؟

تو می دانی حیاتِ جاوداں چیست نمی دانی کہ مرگِ ناگہاں چیست!

---

(۱) جاوید نامہ۔۱۹۲۔ ۱۹۴۔ ''ندائے جمال'' (۲) پس چہ باید کرد۔۸۵۔ ''مثنوی مسافر''۔

ز اوقاتِ تو یکِ دم کم نہ گردد   اگر من جاوداں باشم ،زیاں چیست؟ (۱)

علاوہ ازیں جاوید نامہ میں بھی اقبال کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ موت سے ماورا اور عینِ حیات ہیں۔ بندہ جب مرتا ہے تو نہیں جانتے کہ موت کیا ہے؟ اگر چہ ہم بے بال و پر پرندوں کی مانند ہیں، لیکن موت کے علم میں اللہ تعالیٰ سے بڑھے ہوئے ہیں ــــــ دراصل یہ تو اقبال کا محض شاعرانہ انداز ہے۔ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ ''حسن مطلق'' لازوال و لا فانی ہے۔

حق و رائے مرگ و عینِ زندگی است   بندہ چوں میرد نمی داند کہ چیست!

گرچہ ما مرغانِ بے بال و پریم   از خدا در علمِ مرگ افزوں تریم! (۲)

ایک دوسرے موقع پر بھی اقبال محبوب حقیقی کے حضور عرض کرتے ہیں کہ آپ مرگ و حیات کی کشمکش سے بے خبر ہیں۔ یہ بندہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر رشک کرتا ہے۔ گویا کہ آپ جاودانی ہیں اور میں آنی۔

اے تو نشناسی نزاعِ مرگ و زیست   رشک بر یزداں برد ایں بندہ کیست؟ (۳)

تو زندگی ہے پائندگی ہے   باقی ہے جو کچھ سب خاک بازی (۴)

دیدارِ ''حسن مطلق'' کے حوالے سے اقبال کہتے ہیں کہ فلسفی کے علاوہ گداگر اور غلام بھی حسن مطلق کے دیدار سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ فطرت جو آسمان پر نظر رکھتی ہے۔ دوسرے کے احسان سے پست ہو جاتی ہے۔ سوال کرنے سے خودی کے اجزا بکھر جاتے ہیں۔ اور خودی کا ''نخلِ سینا'' تجلی سے محروم ہو جاتا ہے۔ سوال سے مفلسی اور ذلیل ہو جاتی ہے۔ گدائی سے گداگر اور نادار ہو جاتا ہے۔

فطرتے کو بر فلک بندد نظر   پست می گردد ز احسانِ دگر

از سوال آشفتہ اجزائے خودی   بے تجلی نخلِ سینائے خودی

از سوال افلاس گردد خوارتر   از گدائی گدیہ گر نادار تر (۵)

اقبال کہتے ہیں یہی حال غلامی میں غلام کا ہے۔ غلام بھی مجبور و بے بس اور گداگر ہی ہوتا ہے۔ ہم سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی غلام قوموں اور آج کل آئی ۔ ایم ایف کی غلام قوموں کا حال ہمارے سامنے ہے۔ بے شک غلامی میں عشق و مذہب کو علیحدہ علیحدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کے شہد کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ عاشقی کیا ہے توحید کو دل پر منقش کرنا اور

---

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۱۸۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۳۸۔ (۳) ایضاً ۔ ۱۰۔ (۴) بال جبریل ۔ ۷۲۔ (۵) اسرار خودی ۔ ۲۳۔

ہر مشکل کے مقابلے پر ڈٹ جانا۔ غلامی میں عشق گفتار کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ غلامی میں عمل گفتار کا ساتھ نہیں دیتا۔ قافلۂ عشق میں سفر کا ذوق باقی نہیں رہتا۔ اور عشق کی آرزو و حرکت کے بغیر محبوب ''حقیقی'' تک رسائی ناممکن ہے۔ وہ بے یقین، بے راہ اور بغیر راہبر کے رہ جاتا ہے۔ غلام دین و دانش کو ستا بیچ دیتا ہے، بدن کو زندہ رکھنے کے لیے جان فروخت کر دیتا ہے۔ اگر چہ اس کی زبان پر'' محبوب حقیقی'' کا نام ہوتا ہے مگر اس کا قبلہ حکمران کی طاقت ہے۔ اس بت کے سامنے جب تک سجدے میں پڑے رہیں تو وہ خدا ہے۔ اگر ایک بار اس کے سامنے اٹھ کھڑے ہوں تو وہ ختم ہے۔ خدائے حقیقی روٹی بھی دیتا ہے، جان بھی عطا کرتا ہے۔ یہ جھوٹا خدا جان لے کر روٹی دیتا ہے۔ گویا کہ حقیقی خدا کی موجودگی میں بھی چھوٹے موٹے بہت سے خدا دندناتے پھرتے ہیں۔

اے خداؤں کے خدا جانے دے! تو نے بھی درد نہ جانا میرا (فقریؔ)

وہ خدا یکتا ہے، تجزیے سے مبرا ہے۔ جھوٹا خدا ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ وہ سب کا چارا ساز ہے۔ یہ بے چارہ ہے۔ وہ خدا قول و فعل کے تضاد کی بیماری کا علاج ہے۔ اس خدا کے اپنے کلام کے اندر نفاق ہے۔ یہ خدا اپنے بندے کو اپنے آپ سے خوگر بنا لیتا ہے اور اس کی چشم و گوش کو تجزیاتی و تصوراتی فلاسفر و کافر بنا دیتا ہے۔

در غلامی عشق و مذہب را فراق   انگبین زندگانی بد مذاق

عاشقی ؟توحید را بردل زدن   وانگہے خود را بہر مشکل زدن

در غلامی عشق جز گفتار نیست   کارِ ماگفتار مارا یار نیست

کاروانِ شوق بے ذوقِ رحیل

بے یقین و بے سبیل و بے دلیل

دین و دانش را غلام ارزاں دہد   تابدن را زندہ دارد جاں دہد

گرچہ برلب ہائے او نام خدا ست   قبلۂ او طاقتِ فرمانروا ست

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست   چوں یکے اندر قیام آئی فناست

آں خدا نانے دہد جانے دہد   ایں خدا جانے برد نانے دہد

آں خدا یکتاست ایں صد پارہ ایست　　آں ہمہ را چارہ ایں بیچارہ ایست
آں خدا درمانِ آزارِ فراق　　ایں خدا اندر کلامِ او نفاق
بندہ را با خویشتن خوگر کند　　چشم و گوش و ہوش را کافر کند　　(۱)

غلام مردِ فقیر، مردِ قلندر، مردِ کامل یا مردِ حق نہیں ہوسکتا۔ اس لیے عشق نہیں کر سکتا۔ جب وہ عاشق نہیں ہوسکتا تو پھر اقبال کہتے ہیں کہ اس کے اندر حق تعالیٰ کے جمال کے دیدار کا عشق تلاش نہ کر۔ نہ اس کے اندر جانِ بیدار کی جستجو کر۔ غلام کی آنکھ ''حقیقت مطلق'' کو دیکھنے کے لیے کوشش و محنت نہیں کرتی، دنیا میں اس کا کام کھانا، غفلت کی نیند سونا اور مر جانا ہے۔

از غلامے ذوقِ دیدارے مجوے　　از غلامے جانِ بیدارے مجوے
دیدۂ او محنتِ دیدن نبرد　　درجہاں خورد وگراں خوابید و مرد　　(۲)

علم و فلسفہ تجزیاتی ہو یا تصوراتی۔ ان کا مقام سوچ سے آگے نہیں۔ جبکہ کاشانہ عشق قلبِ بیدار ہے۔ علم و فلسفہ جب تک عشق سے فیض یاب نہ ہوں۔ وہ تماشائے خانہ افکار کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ تماشائے خانہ سحر سامری ہے۔ جبکہ روح القدس کے بغیر علم شعبدہ بازی ہے۔ مردِ دانا تجلّی ''حسنِ مطلق'' کے بغیر راہ نہیں پاتا۔ بلکہ اپنے فلسفے کی دولتیوں ہی سے مر جاتا ہے۔

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی　　(۳)

تجلّی کے بغیر زندگی بیماری ہے۔ عقل ''محبوبِ حقیقی'' سے دور لے جاتی ہے اور اس کا دین مجبوری بن کر رہ جاتا ہے۔ پہاڑوں، صحراؤں اور خشکی و تری کا یہ جہاں ہمیں صرف ''حسن مطلق'' کی خبر دیتا ہے۔ مگر ہم اس کے دیدار کے مشتاق ہیں۔

علم در اندیشہ می گیرد مقام　　عشق را کاشانہ قلبِ لا ینام
علم تا از عشق برخوردار نیست　　جز تماشا خانۂ افکار نیست
ایں تماشا خانہ سحر سامری است　　علم بے روح القدس افسونگری است

---

(۱) زبورِ عجم ۱۹۰۔　(۲) زبورِ عجم۔ ۱۹۲۔　(۳) بانگِ درا۔ ۱۳۹۔

بے تجلی مردِ دانا رہ نبرد | از لکد کوبِ خیالِ خویش مُرد
بے تجلی زندگی رنجوری است | عقل مہجوری و دیں مجبوری است
ایں جہانِ کوہ و دشت و بحر و بر! | ما نظر خواہیم و او گویدٔ خبرٔ (۱)

ٹھیک ہے عقل بھی اس کائنات سے نبرد آزما ہوتی ہے تا کہ مادّیت کا طلسم توڑ دے۔ ہر پتھر اسے نیا سبق سکھاتا ہے۔ بجلی اور بادل اس کے لیے مدرس بنتے ہیں۔ عقل کی آنکھ "ذوقِ نگاہ" سے عاری نہیں۔ مگر وہ جراءت رندانہ سے محروم ہے۔ اس لیے وہ راستے کے خطرات سے ڈرتی ہوئی اندھے کی مانند چلتی ہے۔ اس کی رفتار چیونٹی کی طرح آہستہ آہستہ ہے۔ چونکہ عقل یا فلسفہ رنگ و بو کا دلدادہ ہے۔ (محسوسات) اس لیے وہ "حسن مطلق" کی راہ میں بھی آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ اس کا کام تدریجاً آگے بڑھنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کب اپنا مقصد پائے گی۔ مگر عشق ماہ و سال اور زمان و مکاں کو کچھ نہیں سمجھتا۔ عقل پہاڑ میں شگاف ڈال دیتی ہے یا اس کے گرد طواف کرتی ہے۔ عشق کے سامنے پہاڑ تنکے کی مانند ہے۔

ع عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

عشق سے قلب چاند کی طرح تیز رفتار ہو جاتا ہے۔ عشق لا مکاں پر شبخوں مارنا اور اس دنیا سے قبر دیکھے بغیر رخصت ہو جانا ہے۔ یعنی ہرگز نمیرد والی بات ہے۔ گویا کہ عشق "حسن مطلق" کا دیدار کرتا ہے اور اسی کی طرح لازوال ہو جاتا ہے۔

عقل ہم خود را بدیں عالم زند | تا طلسم آب و گل را بشکند
می شود ہر سنگِ راہ اورا ادیب | می شود برق و سحاب اورا خطیب
چشمش از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست | لیکن اورا جرأتِ رندانہ نیست
پس ز ترس راہ چوں کورے رود | نرم نرمک صورت مورے رود
تاخرد پیچیدہ تر بررنگ و پوست | می رود آہستہ اندر راہ دوست
کارش از تدریج می یابد نظام | من نہ دانم کے شود کارش تمام!
می نداند عشق سال و ماہ را | دیروزود و نزد و دورِ راہ را

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۰۔

عقل در کوہے شگافے می کند　　　یا بگردِ او طوافے می کند
کوہ پیشِ عشق چوں کاہے بود　　　دل سریع السیر چوں ماہے بود
عشق شبخونے زند بر لامکاں　　　گور را نادیدہ رفتن از جہاں (۱)

لیکن عقل و فلسفہ کچھ اور کہتے ہیں۔ تجزیاتی فلسفے کی طرح تو ابو جہل بھی غائب پر یقین نہیں کرتا۔ گویا کہ اقبال کے نزدیک تجزیاتی فلسفی ابو جہل سے کم نہیں۔ جیسا کہ اقبال ابو جہل کی زبانی کہلواتے ہیں کہ غائب پر نگاہ مرکوز کرنا غلطی ہے۔ کوئی ایسی چیز نہیں جو آنکھ سے نہ دیکھی جا سکے۔ غائب کے سامنے سجدہ کرنا اندھا پن ہے۔ یہ نیا دین اندھا ہے اور اندھا پن حقیقت سے دور لے جاتا ہے۔ خدائے لا مکاں کے سامنے جھکنا، یہ نماز بندے کو ذوق عطا نہیں کرتی۔

دیدہ بر غائب فروبستن خطاست　　　آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست!
پیشِ غائب سجدہ بردن کوری است　　　دینِ کور است و کوری دوری است
خم شدن پیشِ خدائے بے جہات!
بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوٰت! (۲)

اقبال کہتے ہیں کہ ابو جہل کے علاوہ تجزیاتی فلاسفہ کے خیالات لات و منات سے بھی ملتے جلتے ہیں۔ جیسا کہ جاوید نامے میں ''نغمۂ بعل'' کے حوالے سے دراصل اقبال یہ بتاتے ہیں کہ انسان نے آسمان کو پھاڑ ڈالا مگر اسے آسمان کی پرلی طرف خدا نظر نہ آیا۔ گویا کہ ''تجزیاتی فلسفیوں'' کے نزدیک سائنس نے اس قدر ترقی کی کہ ہر چیز کا سراغ لگایا۔ اگر خدا ہوتا تو وہ بھی کہیں دکھائی دیتا۔ آدم کی روح کو اسی چیز سے قرار حاصل ہوتا ہے جو حواس خمسہ سے محسوس کرتا ہے۔ چونکہ سائنس کا دارومدار اسی پر ہے۔ اس لیے ہمیں امید ہے کہ ہم ''خدایانِ باطل'' کا دور واپس آ جائے۔ تجزیاتی فلسفی گویا کہ اسی کوشش میں ہیں۔ مغرب کے تجزیاتی فلسفیوں کے جادو نے شیطان کو زندہ کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دن رات کے خوف سے زردی مائل ہے۔ ''بعل'' ہو یا تجزیاتی فلسفی، ان کے نزدیک وہ خدا جسے غیب میں رہنا پسند ہے۔ اس سے ایسا شیطان بہتر ہے جو سامنے آئے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس فلسفے کا یہ عقیدہ ہو وہ ''حسن مطلق'' تک کیونکر پہنچ سکتا ہے۔ اسی لیے تو اقبال عشق کے مقابلے میں فلسفے کو لنگڑا اور اندھا سمجھتے ہیں۔ یہ فلسفہ شیطان کا پیرو ہے اللہ تعالیٰ کا نہیں۔

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۲۱۔ ۲۲۔ (۲) ایضاً۔ ۵۴۔ ''نوحہ روح ابو جہل در حرم کعبہ''۔

آدم ایں نیلی تتق را بردرید　آنسوے گردوں خدائے را ندید
جانش از محسوس می گیرد قرار　بو کہ عہد رفتہ باز آید پدید
اہرمن رازندہ کرد افسونِ غرب　روزِ یزداں زرد رو از بیم شب!
از خدا وندے کہ غیب اورا سزد　خوشتر آں دیوے کہ آید در شہود!　(۱)

یہ ان" تجزیاتیوں" کا مقام ہے کہ جوزور مست اور سرکش ہوتے ہوئے غائب کے منکر اور حاضر کے پرستار ہیں۔تجزیاتیوں کا شجرہ دراصل فرعون سے جا ملتا ہے۔ وہ بھی منکر حسنِ مطلق تھا۔مشرق و مغرب میں دو بڑے منکرِ خدا ہو گزرے ہیں۔ ان میں ایک وہی فرعون ،جس کی گردن پر عصائے موسیٰؑ نے ضرب لگائی اور دوسرا___ درویش مہدی سوڈانی کی تلوار سے دولخت ہوا۔ ایک مقام پر نوری ندی دیکھ کر فرعون پوچھتا ہے۔ یہ صبح ، یہ نور کی ندی، یہ سحر اور یہ نور وظہور کہاں سے آیا!۔ پیر رومی اسے جواب دیتے ہیں، جوبھی پنہاں ہے وہ اس نور سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اس نور کی اصل ید بیضا ہے۔گویا تجزیاتی فلسفیوں یا منکرین حقیقت کو جواب یہ ہے کہ سبھی مظاہر حسن مطلق کے مظہر ہیں اور عشق اس کو پہچان سکتا ہے۔

این مقامِ سرکشانِ زور مست　منکرانِ غائبؔ و حاضر پرست!
آں یکے از شرق و آں دیگر زغرب　ہر دو با مردانِ حق درحرب و ضرب
آں یکے بر گردنش چوبِ کلیم　واں دگر از تیغِ درویشے دو نیم!
گفت فرعون ایں سحر! ایں جوئے نورا!　از کجا این صبح و ایں نور وظہور!

ہر پنہاں است ازو پیدا ستے
اصل ایں نور از یدِ بیضاستے!　(۲)

فلسفہ وسائنس جہانِ آب و خاک کو اپنی گرفت میں لاتے ہیں اور عشق ومعرفت جہانِ روح کو۔ ایک اپنی نگاہ تجلی پر رکھتا ہے اور دوسرا تجلی کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔

آں بدست آورد آب و خاک را　ایں بدست آورد جانِ پاک را!

(۱) جاوید نامہ۔ ۹۱۔ ۹۲۔ "نغمۂ بعل"۔ (۲) ایضاً۔ ۹۳۔۹۴۔

آں نگہ را بر تجلّی می زند ایں تجلّی را بخود گم می کند! (۱)

علم و فلسفے کا دارومدار خوف و امید پر ہے۔ عشاق بیم و رجا سے بے نیاز ہیں۔ علم کائنات کے جلال سے خوف زدہ رہتا ہے۔ عشق حسن کائنات میں محو رہتا ہے۔ علم و فلسفے کی نظر ماضی و حال پر ہے۔ عشق جو دیکھتا ہے وہی کہتا ہے۔ علم نے جبر کے قانون کو تسلیم کر رکھا ہے۔ اس کے لیے سوائے جبر پر صبر کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ جبکہ عشق جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے، وہ حسین کی صورت میں کارزار کربلا گرم کر دیتا ہے اور ابراہیم کے روپ میں آتش نمرود کو گل و گلزار بنا دیتا ہے۔ عشق آزاد، غیور اور ناصبور ہے اور موجودات کا نظارہ کرنے میں دلیر ہے۔

علم بر بیم و رجا دارد اساس عاشقاں را نے امید و نے ہراس!
علم ترساں از جلال کائنات عشق غرق اندر جمال کائنات
علم را بر رفتہ و حاضر نظر عشق گوید آنچہ می آید نگر!
علم پیماں بستہ با آئینِ جبر چارۂ او چیست غیر از جبر و صبر!
عشق آزاد و غیور و ناصبور در تماشائے وجود آمد جسور! (۲)

لیکن اس دور کے بیشتر لوگوں پر تجزیاتی فلسفے کا اثر ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی عقل بے باک ہے اور دل بے سوز، آنکھیں حیا سے خالی ہیں۔ اور وہ حسن مجاز میں غرق ہیں۔ گویا تجزیاتیوں نے مجاز کو مشعل راہ بنانے کے بجائے اسے منزل سمجھ لیا ہے۔ مجاز کو حقیقت سمجھنے لگے ہیں۔ عقل کے متوالے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

عقلہا بے باک و دلہا بے گداز چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز! (۳)

زمانہ اپنے حوادث چھپا نہیں سکتا
ترا حجاب ہے قلب و نظر کی ناپاکی (۴)

روشن تو وہ ہوتی ہے، جہاں بیں نہیں ہوتی
جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہ پاک (۵)

اقبال کہتے ہیں فلسفہ و عقل حقیقت کی پہچان نہیں رکھتے۔ فلسفی کی ساری سوچ مادی اشیاء کے گرد گھومتی ہے۔ اس

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۱۵۔ (۲) ایضاً۔ ۱۲۰۔ (۳) ایضاً۔ ۲۰۱۔ (۴) ضرب کلیم۔ ۱۱۔ (۵) ارمغان حجاز۔ ۲۸۔

نے اپنی آنکھ کو دل کے، یعنی عشق کے چراغ سے روشن نہیں کیا۔ اس لیے اس نے تصوریت و موضوعیت کے تحت صرف نیلے، سرخ اور زرد رنگ دیکھے۔ اور ان کے دیکھنے میں بھی اپنی آنکھوں پر فخر کرتا ہے۔ کہ رنگ موجود نہیں بلکہ اس کی نظروں کا کمال ہے کہ وہ نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتا کہ اس کی آنکھیں کس نے بنائی ہیں۔ اس ضمن میں مولانا روم نے ''انکار فلسفی بو قرآن ان اصبح ماءُ کم غورًا'' قرآن کی آیت اگر تمھارا پانی نیچے اتر جائے پر فلسفی کے انکار سے متعلق فرمایا ہے کہ، ایک قاری قرآن میں پڑھ رہا تھا، ماءُ کم غورًا ،یعنی اس چشمے سے پانی بند کر دوں۔ اگر پانی کو گہرائی میں پوشیدہ کر دوں، چشموں کو خشک اور ریگستان بنا دوں تو پانی کو چشمے میں دوسرا کون لا سکتا ہے؟ مجھ بے مثال، بزرگ اور عظیم کے علاوہ۔ ایک ذلیل، فلسفی، منطقی اس وقت مکتب کی جانب سے گزر رہا تھا۔ جب اس نے آیت سنی تو ناپسندیدگی سے بولا کہ ہم پھاوڑے سے پانی نکال لائیں گے۔ ہم بیلچے کی ضرب اور تبر کی تیزی سے پانی کو نیچے سے اوپر لے آئیں گے۔ وہ رات کو سویا اور اس نے ایک بہادر مرد کو دیکھا۔ اس مرد نے اس کے منہ پر طمانچہ مار کر دونوں آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ اس نے کہا اے بد بخت، آنکھوں کے ان دو چشموں سے اگر تو سچا ہے تو تبر کے ذریعے روشنی نکال لے۔ دن ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھوں کو اندھا دیکھا۔ بہنے والا نور اس کی دونوں آنکھوں سے غائب ہو گیا۔

مقرئی میخواند از روئے کتاب	ماء کم غوراً ز چشمہ بندم آب
آب را در غور اگر پنہاں کنم	چشمہارا خشک خشکستاں کنم
آب را در چشمہ کہ آرد دگر	جُز منِ بیمثل با فضل و خطر
فلسفی، منطقی، مستہاں	میگزشت از سوئے مکتب آں زماں
چونکہ بشنید آیت او از ناپسند	گفت آریم آب را ما با کلند
مابزخمِ بیل و تیزیٔ تبر	آب را آریم از پستی زبر
شب بخفت و دید او یک شیر مرد	زد طمانچہ ہر دو چشمش کور کرد
گفت زیں دو چشمہ چشم اے شقی	باتبر نورے برآر ار صادقی
روز گشت و چشم خود را کور دید	نورِ فائض از دو چشمش ناپدید (۱)

(۱) مثنوی مولوی معنوی ۔۱۶۲۔ ۱۶۳۔ دفتر دوم۔

یہ فلسفی اللہ تعالیٰ کا رنگ نہ دیکھ سکا، چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

فلسفی ایں رمز کم فہمیدہ است　　فکر او بر آب و گل پیچیدہ است
دیدہ از قندیل دل روشن نکرد　　پس ندیدالا کبود و سرخ و زرد　　(۱)

فلسفی کی آنکھ، سوائے گل و لالہ کے رنگ کے اور کچھ نہیں دیکھ سکتی، ورنہ جو کچھ رنگ کے پردے میں ہے، وہ زیادہ ظاہر ہے۔

چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند،ورنہ　　آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدارتر است　　(۲)

وہ جو (حسن مطلق) داناؤں کے دل و دیدہ پر شبخوں مارتا ہے، یعنی جس تک داناؤں کے ذہن کی رسائی نہیں اور جسے داناؤں کی نظر نہیں پا سکتی وہ اپنے نادان عشاق کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے۔ انہیں اپنے دیدار سے نوازتا ہے۔

آنکہ شبخوں بدل و دیدہ ٔداناياں ریخت　　پیش ناداں سپر انداختنش رانگر ید　　(۳)

پھر کہتے ہیں موضوعیت و معروضیت کے بھنور میں ہمارا دل، ہمارے پہلو سے جا چکا ہے۔ وہ ظاہر میں پھنس کر رہ گیا ہے اور حقیقت کو نہیں دیکھتا۔ اور یہ تجزیاتی فلسفے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے کہ تجزیاتی فلسفہ یہی کہتا ہے کہ:

شیدائی غائب نہ رہ، دیوانہ موجود ہو　　غالب ہے اب اقوام پر معبودِ حاضر کا اثر　　(۴)

لیکن فلسفے کے برخلاف اقبال عاشق ہیں۔ اور تجزیاتی فلسفیوں سے کہتے ہیں کہ غائب یعنی اللہ تعالیٰ پر یقین و ایمان اور بے یقینی کا مطلب یہ ہے کہ:

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی!　　یقیں اللہ مستی، خود گزینی!
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار　　غلامی سے بتر ہے بے یقینی!　　(۵)

اس طرح تجزیاتی فلسفی سے تو وہ مردودِ بارگاہ یعنی شیطان ہی اچھا ہے کہ اس نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہوا ہے۔ اور ہم نے صرف اس کے بارے میں سن رکھا ہے۔

دلِ ما از کنارِ ما رمیدہ　　بصورت ماندہ و معنی ندیدہ
زماآں راندۂ درگاہ خوشتر　　حق او را دیدہ و مارا شنیدہ　　(۶)

---

(۱) پس چہ باید کرد۔ ۸۔ (۲) پیامِ مشرق۔ ۱۸۸۔ "نقشِ فرنگ"۔ (۳) زبورِ عجم۔ ۳۶۔ (۴) بانگِ درا۔ ۲۴۲۔
(۵) بالِ جبریل۔ ۸۱۔ (۶) ارمغانِ حجاز۔ ۱۴۔

دورِ حاضر کی نگاہ کافرانہ نقوش کی خالق ہے۔ اس کی صنعت کا کمال نئے نئے بت گھڑنا ہے۔ یہی موضوعی و معروضی فلسفے کا مقصد ہے۔

نگاہش نقشبند کافری ہا کمالِ صنعتِ او آزری ہا (۱)

اقبال کہتے ہیں تجزیاتی و معروضی فلسفیوں کی مثال اونٹ کے اس بچے کی سی ہے۔ جس نے صحرا میں اپنی ماں سے کہا، مجھے کہیں کائنات کا مالک (اللہ تعالیٰ) دکھائی نہیں دیتا۔ باپ نے جواب دیا! بیٹے، جب پاؤں پھسلتا ہے تو اونٹ اپنے آپ کو بھی دیکھ لیتا ہے اور خدا کو بھی۔ یعنی جو خود کو دیکھ سکتا ہے وہ خدا کو بھی دیکھ سکتا ہے۔

شتر را بچۂ او گفت در دشت نمی بینم خدائے چار سو را
پدر گفت اے پسر چوں پا بہ لغزد شترہم خویش رابیند، ہم اورا (۲)

اقبال تجزیاتی فلسفے کی طرف سے اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ اے باغباں! اقبالؔ سے کہہ دے کہ وہ چمن سے اپنا بستر گول کرے۔ اس جادو نوا نے تو ہمیں پھول سے بیگانہ کر دیا ہے۔ یعنی اقبال مظاہر کی بجائے حقیقت کو حقیقت سمجھتے ہیں۔

بگو اقبال را اے باغباں رخت از چمن بندد
کہ ایں جادو نوا مارا زگل بیگانہ می سازد (۳)

خلوت اختیار کرنے سے انسان اپنے آپ کو پہچانتا ہے۔ اور جب اپنے آپ کو پہچانتا ہے تو پھر ''حسن مطلق'' کو بھی پہچاننے لگتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں خواہ تیرا قلب موسیٰؑ کی طرح روشن کیوں نہ ہو۔ خلوت کے بغیر تیرے افکار بانجھ رہیں گے۔ کم آمیزی سے قلب کے اندر زندگی، جستجو اور دریافت بڑھتی ہے۔ علم اور عشق دونوں زندگی کے مقامات میں سے ہیں۔ ہر دو کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے ہے۔ علم تحقیق سے لذت پاتا ہے اور عشق تخلیق سے۔ صاحب تحقیق کو جلوت پسند ہے اور صاحب تخلیق کو خلوت۔ موسیٰؑ کی آنکھ ذات باری تعالیٰ کے دیدار کی خواہاں ہوئی۔ یہ سب لذت تحقیق کا کرشمہ تھا۔ لن ترانی، گویا کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا گہرے معنی رکھتا ہے، ذرا اس بحرِ عمیق میں غوطہ لگا کے دیکھ۔ جہاں کہیں آثارِ حیات، یعنی حسنِ مطلق کی نشانیاں دکھائی دیتی ہیں، ان کا سرچشمہ ضمیرِ کائنات کے اندر ہے۔ پس تو ہنگامۂ آفاق دیکھ۔ اس کے خلاق کو جلوت کی زحمت نہ دے۔ ہر نقش آفریں کی حفاظت خلوت سے ہے، خلوت ہی اس کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔ ۹۵۔ (۲) ایضاً۔۱۰۲۔ (۳) پیام مشرق ۔۱۵۳۔

دراصل موسیٰؑ کا ایمان تھا کہ ''حسن مطلق'' موجود ہے۔ انہوں نے عشق کی بدولت اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی آرزو ظاہر کی۔ یہاں اقبال تجزیاتی فلسفی سے کہہ رہے ہیں کہ تم ''حسن مطلق'' پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ وہ غیب ہے۔ تم اسے ظاہری آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہو۔ ایسا مت کرو اس لیے کہ وہ خلوت پسند ہے اور تم عقل و فلسفے کے بل بوتے پر اسے نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے لیے دل کی آنکھ یعنی قوتِ عشق کی ضرورت ہے۔

گرچہ داری جانِ روشن چوں کلیم ہست افکارِ تو بے خلوت عقیم!

از کم آمیزی تخیل زندہ تر زندہ تر جویندہ تر، پایندہ تر!

علم و ہم شوق از مقاماتِ حیات ہر دوی گیرد نصیب از واردات!

علم از تحقیق لذت می برد عشق از تخلیق لذت می برد

صاحبِ تحقیق را جلوت عزیز صاحب تخلیق را خلوت عزیز

چشمِ موسیٰ خواست دیدارِ وجود ایں ہمہ از لذتِ تحقیق بود

لن ترانی نکتہ ہا دارد دقیق اند کے گم شو دریں بحر عمیق

ہر کجا بے پردہ آثارِ حیات چشمہ زارش در ضمیرِ کائنات

در نگر ہنگامۂ آفاق را زحمت جلوت مدہ خلاق را

حفظِ ہر نقش آفریں از خلوت است

خاتمِ اورا نگیں از خلوت است (۱)

عقل و عشق اور دید و نادید کی اس ''تجزیاتی'' و ''تصوراتی'' بحث کے حوالے سے مزید غور کیا جائے تو اقبال کے مطابق، نگاہ نے جہاں کا مشاہدہ کیا اور خرد پیمانہ لے آئی، کہ اس چہار اطراف کی پیمائش کرے، مگر وہ مے کش، جسے دل کہتے ہیں، اس جہانِ رنگ و بو کو ایک ہی جام میں پی گیا۔ گویا خرد کا دامن تنگ ہے وہ موجودات کو ناپ بھی نہیں سکتی جب کہ عشق کے لیے کائنات ایک جام سے زیادہ نہیں۔ جہاں عشق کی رسائی ہے، خرد وہاں کا سوچ بھی نہیں سکتی۔

نگہ دید و خرد پیمانہ آورد کہ پیماید جہانِ چار سو را

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۷۰۔

بخویش اند کشید این رنگ و بو را　　ے آشائے کہ دل گردند نامش (۱)

خرد، ذوق یقیں سے بے نصیب ہے۔ علم و حکمت کا جواً بد آموز ہے۔ اس ان پڑھ کے سامنے سینکڑوں غزالی اور رازی ہیچ ہیں۔ جس کی آنکھ سیدھی راہ دیکھتی ہے۔ اقبال نے مغربی فلاسفہ کے ساتھ ساتھ مشرقی فلسفیوں اور منطقیوں سے بھی اختلاف کیا ہے۔

خرد بیگانۂ ذوقِ یقیں است　　قمارِ علم و حکمت بد نشیں است!

دو صد بوحامد و رازی نیرزد　　بنادانے کہ چشمش راہ بین است! (۲)

دانشِ حاضر یعنی تجزیاتی و تصوراتی فلسفہ، معروضیت و موضوعیت، زندگی، گویا کہ "حسن مطلق" یا حقیقت کی راہ میں عاجز آکر گری پڑی ہے۔ اس نے خود ہی اپنی گردن پر خنجر رکھا ہے۔ فلسفے کی آگ گلِ لالہ کی مانند اور اس کا شعلہ "اولے" کی مانند ٹھنڈا ہے۔ اس کی فطرت "سوزِ عشق" سے تہی دامن ہے۔ اس لیے یہ جہانِ جستجو میں نامراد ہے۔ عقل کی بیماریوں کا معالج صرف عشق ہے۔ عقل کا جنوں عشق کے نشتر ہی سے شفا پاتا ہے۔ ساری دنیا عشق کے سامنے، سربسجود ہے، عشق ہی عقل و فلسفے کے سومنات کو بتوں سے پاک کرتا ہے۔ مگر دانش حاضر کی تجزیاتی و تصوراتی صراحی میں شرابِ عشق بالکل نہیں، یارب کہہ کر نالہ و فریاد کرنا اس کی راتوں میں نہیں۔

من آں شمعم کہ درشب زندہ داری　　ہمہ شب می کنم چو شمع زاری (نظامی گنجوی)

اگر کافر نےء اے مرغ شبگیر　　چرابر ناوری آوازِ تکبیر (نظامی گنجوی)

در صراطِ زندگی از پافتاد　　بر گلوے خویشتن خنجر نہاد

آتشے دارد مثالِ لالہ سرد　　شعلۂ دارد مثالِ ژالہ سرد

فطرتش از سوز عشق آزاد ماند　　درجہانِ جستجو آزاد ماند

عشق افلاطونِ علتہائے عقل　　بہ شود از نشترش سودائے عقل

جملہ عالم ساجدو مسجود عشق　　سومناتِ عقل را محمود عشق

---

(۱) ارمغانِ حجاز۔ ۱۴۰۔ (۲) ایضاً۔ ۱۳۷۔

ایں مئے دیرینہ در میناش نیست
شورِ "یا رب" قسمتِ شبہاش نیست (۱)

فلسفے، عشق اور "حسن مطلق" ہی کے سلسلے میں اقبال اپنی نظم "جلال و ہیگل" میں رقمطراز ہیں کہ: ایک رات میں اپنے فکر کے ناخن سے اس جرمنی فلسفی (ہیگل) کے عقدے کھول رہا تھا۔ وہ جس کے فکر نے "آنی" کے لباس سے "ابدی" کو نمودار کیا۔ اس کے خیال کے میدان کے سامنے زمانہ بھی اپنی تنگ دامانی کے باعث شرمندہ ہے۔ جب میں اس کے دریائے فکر کے اندر داخل ہوا تو میری عقل کی کشتی طوفانی لہروں کی نذر ہوگئی۔ مجھ پر نیند نے اپنا فسوں پھینکا اور میں نے باقی اور فانی سے آنکھ بند کر لی۔ خواب میں نگاہ عشق اور زیادہ تیز ہوگئی اور پیر ربانی (رومیؒ) ظاہر ہوئے۔ ایک آفتاب تھا، جس کی تجلی سے روم و شام کا افق نورانی ہوگیا۔ رومیؒ کا شعلہ اس تاریک فطرت دنیا کے اندر یوں روشن ہے جیسے بیاباں کے اندر درویش کا چراغ۔ اس کے الفاظ سے معانی اس طرح پھوٹتے ہیں جیسے باغ کے اندر خونیں لالہ کے پھول۔ انہوں نے مجھ سے کہا! کیا سویا پڑا ہے، اٹھ! اور دیکھ کہ تو سراب کے اندر اپنی کشتی چلا رہا ہے۔ خرد کے ذریعے راہ عشق طے کرتا ہے؟ چراغ لے کر آفتاب ڈھونڈتا ہے؟

می کشودم شبے بناخنِ فکر عقدہ ہائے حکیم المانی
آنکہ اندیشہ اش برہنہ نمود ابدی را زسکوتِ آنی
پیشِ عرضِ خیال او گیتی خجل آمد ز تنگ دامانی
چوں بدریائے او فرو رفتم کشتیِ عقل گشت طوفانی
خواب بر من دمید افسونے چشم بستم زباقی و فانی
نگہِ شوق تیز تر گردید چہرہ بنمود پیر یزدانی
آفتابے کہ از تجلیِ او افقِ روم و شام نورانی
شعلہ اش درجہانِ تیرہ نہاد بہ بیاباں چراغ رہبانی
معنی از حرفِ او ہمی روید صفتِ لالہ ہائے نعمانی

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۷۹۔

گفت با من، چہ خفتہٗ بر خیز! بہ سرابے سفینہ می رانی؟
بہ خرد راہ عشق می پوئی؟ (۱)
بہ چراغ آفتاب می جوئی؟

اس نظم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو سب سے پہلی بات جو کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حقیقت کے راستے میں عقل و فلسفے سے جو بھی کام لے گا، اس کے عقل کی کشتی دریائے حقیقت میں ہچکولے کھانے لگے گی، خواہ وہ اقبال ہی کیوں نہ ہو۔ عقل کے ذریعے حقیقت تک رسائی ناممکن ہے۔ مولانا رومی وہ عاشق ہیں کہ عشق کی علامت بن چکے ہیں۔ اقبال نے اپنے کلام میں رومیؔ کو کئی مواقع پر عشق ہی کہہ کر پکارا ہے۔ رومی کی ہر بات عشق سے بنی ہوئی ہے۔

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک!
ترا وجود تیرے واسطے ہے راز اب تک!
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک!
کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک!
گسستہ تار ہے تری خودی کا تار اب تک!
کہ تو ہے نغمہ ' رومی " سے بے نیاز اب تک! (۲)

عشق سے عقل وخرد کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اور عشق سے پھیلائے ہوئے اجالے میں حقیقت دکھائی دینے لگتی ہے۔ عقل و فلسفے کے چراغ سے آفتاب حقیقت کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ اقبال مزید کہتے ہیں کہ ہیگل کا فلسفہ معقول ہے لیکن وہ محسوسات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔ اگرچہ اس کے فکرِ نو نے عروس کا لباس پہنا ہوا ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ اس کا فلک پرواز طائرِ عقل کیا ہے؟ یہ ایسی مرغی کی مانند ہے جو زورِ مستی میں بغیر مرغ کے انڈا دے دیتی ہے۔

حکمتش معقول و با محسوس در خلوت نرفت گرچہ بکرِ فکرِ او پیرایہ پوشد چوں عروس
طائرِ عقلِ فلک پرواز او دانی کہ چیست؟ ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروس (۳)

اقبال کہتے ہیں تجزیاتی و تصوراتی فلسفیوں سے لالے کا وہ پھول اچھا ہے جو اپنے اندر داغِ عشق رکھتا ہے۔ اور اس

---

(۱) پیامِ مشرق۔ ۲۰۲۔ (۲) ضربِ کلیم۔ ۱۲۱۔ "رومی"۔ (۳) پیامِ مشرق۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔

کی بدولت حق شناسی کے مقام تک پہنچا ہوا ہے۔ اسے معرفت حق حاصل ہے ۔مگر فلسفی انسان ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے دور ہے۔ چنانچہ اقبال گلِ لالہ سے کہتے ہیں، اے لالۂ صحرائی تنہائی میں جلنا مناسب نہیں۔اپنے داغِ جگر سے آدم کے سینے کے اندر بھی ''سوزِ عشق'' پیدا کر، کہ اسے بھی تیری طرح معرفت حاصل ہو سکے۔

اے لالۂ صحرائی تنہا نتوانی سوخت　　این داغِ جگر تابے بر سینۂ آدم زن　　(۱)

عروسِ لالہ، مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں　　(۲)

پھر کہتے ہیں اے لالۂ صحرائی! مجھے تجھ سے ایک بات کہنی ہے، یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فراق کے داغوں سے میرا دل باغ بنا ہوا ہے۔ ویسے تو یہ آہ جگر سوز خلوت صحرا ہی میں بہتر ہے۔مگر میں کیا کروں۔ میرا معاملہ! انجمن سے آ پڑا ہے۔ جس میں کوئی میرا ہمراز نہیں۔ سب عقل وخرد کے مارے ہوئے ہیں۔

اے لالۂ صحرائی با تو سخنے دارم　　از داغِ فراقِ او در دل چمنے دارم
این آہ ِ جگر سوزے در خلوتِ صحرا بہ　　لیکن چہ کنم کارے با انجمنے دارم　　(۳)

بہار آ چکی ہے اور نگاہ آتش لالہ میں غلطاں ہو رہی ہے۔ میرے دل لخت لخت سے ہزاروں نالے اٹھتے ہیں ۔ گویا کہ عاشق کا دل ، آتش لالہ میں ''حسن مطلق'' کو دیکھ لیتا ہے۔مگر اے تصوراتی فلسفی تو حق تعالیٰ کی اس نشانی کو دھوکہ سمجھتا ہے۔ اور اے تجزیاتی فلاسفر تو اسے حقیقت کیوں سمجھتا ہے؟ تو جہان رنگ و بو کو تو جانتا ہے ۔لیکن کیا تو یہ بھی جانتا ہے کہ دل کیا ہے۔ دل وہ چاند ہے جو حلقہ آفاق یعنی ''حسن مطلق'' سے اپنی چاندنی منعکس کرتا ہے۔گویا دلِ بیدار ''حسنِ ازل'' کی تجلی سے منور ہوتا ہے۔

بہار آمد نگہ می غلط اندر آتشِ لالہ　　ہزاراں نالہ خیزداز دلِ پرکالہ پرکالہ!
جہانِ رنگ و بو دانی، ولے دل چیست می دانی؟　　مہے کز حلقۂ آفاق سازدگردِ خود ہالہ!　　(۴)

اقبال کے نزدیک موجودات ومحسوسات اور انسان کی اصل ایک ہی ہے۔گل لالہ اور انسان دونوں ''حسن ازل'' کی تجلی ہیں۔لالے کا پھول جو شاخ سے پھوٹا ہے، انسان اسی شاخ سے ٹوٹا ہے۔ دونوں مسافروں کی منزل ''حسن مطلق'' ہے۔

---

(۱) زبورِ عجم۔ ۷۵۔　(۲) بالِ جبریل۔ ۸۷۔　(۳) زبورِ عجم۔ ۱۳۲۔　(۴) ایضاً۔ ۱۳۴۔

بس اتنا ہے کہ گلِ لالہ جذبہء پیدائی اور میں لذتِ یکتائی کی بنا پر یہاں آ نکلے ہیں۔ہم دونوں عاشق ہونے کے ناطے ''شعلہ سینائی'' ہیں۔مگر کلیموں کے بجائے یہاں تجزیاتی وتصوراتی فلسفیوں کا راج ہے۔ جو ''حسن مطلق'' کی تجلیات کی شناخت نہیں رکھتے۔

بھٹکا ہوا راہی میں ،بھٹکا ہوا راہی تو! — منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی؟
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ — تو شعلہ سینائی ،میں شعلہ سینائی!
تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا — اک جذبہ پیدائی! اک لذت یکتائی! (۱)

بہرحال تجزیاتی یا معروضی فلسفہ ظاہر پرست ہے۔ یہ اپنے آپ کو تخیلاتی طور پر بڑا بلند پرواز سمجھتا ہے۔ یہ فلسفہ مجاز کا گرویدہ ہے۔ حقیقت تک نہ یہ پہنچ سکتا ہے اور نہ پہنچنا چاہتا ہے۔ اقبال کے نزدیک تجزیاتی فلاسفر عجیب وغریب لوگ ہیں۔ظاہر پرستی سے تو یہ نکل نہیں سکے اور اپنے آپ کو کلیم سے کم نہیں سمجھتے۔

اے دردِ عشق!ہے گہر آب دار تو — نا محرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو!
پنہاں تہِ نقاب تری جلوہ گاہ ہے — ظاہر پرست محفل نو کی نگاہ ہے
رہنے دے جستجو میں خیالِ بلند کو — حیرت میں چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو
جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں — قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں
یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز — مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز

ہر دل مئے خیال کی مستی سے چُور ہے
کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے (۲)

اللہ تعالیٰ کا نور ہر عیاں میں اس طرح نہاں ہے، جس طرح پتھر میں شرر:

بہ رہن شرم ہے باوصفِ شوخی اہتمام اس کا — نگیں میں جوں شرر ہے ناپیدا ہے نام اس کا (غالب)

اقبال کہتے ہیں ہر ظاہر کا تعلق ''غیب'' سے ہے۔ اس لیے کہ اے راگ کی مصطلحات جاننے والے آواز کا تعلق پردۂ غیب سے ہے۔ نہ یہ غزل خواں کے گلے سے ہے۔ نہ ساز کے تار سے۔ جو شخص سازِ حیات کے تار تک اپنا مضراب پہنچاتا

---

(۱) بالِ جبریل۔۱۳۱۔ (۲) بانگِ درا۔۵۰۔۵۱۔دردِ عشق۔

ہے وہی محرم راز ہے۔ میری یہ بات پلے باندھ لے۔

نوا زپردۂ غیب است اے مقام شناس — نہ از گلوے غزل خواں، نہ از رگِ ساز است
کسے کہ زخمہ رساند بتارِ سازِ حیات — زمن بگیر کہ آں بندہ محرمِ راز است (۱)

چنانچہ اقبال کے مطابق تجزیاتی اور معروضی فلسفیوں کے فلسفے کے خلاف عشق خلیل کی ضرورت ہے۔ اگر یہ عشق ہو تو حاضر و غائب اور ظاہر و حقیقت کا عقدہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔

ذوق حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمان خلیل — ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن
ہے اگر دیوانہء غائب تو کچھ پروا نہ کر — منتظر رہ وادی فاراں میں ہو کر خیمہ زن
عارضی ہے شان حاضر سطوت غائب مدام — اس صداقت کو محبت سے ہے ربط جان وتن
نور ما چوں آتش سنگ از نظر پنہاں خوش است (۲)

حکیم و عارف و صوفی تمام مست ظہور — کسے خبر کہ تجلّی ہے عین مستوری! (۳)

کچھ بھی ہو اقبال کہتے ہیں عقل و فلسفہ حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کہ عقل ظاہر کی آنکھ سے دیکھتی ہے اور تجزیاتی فلسفی کو جو کچھ بظاہر نظر آتا ہے۔ اسی کو حرف آخر سمجھتا ہے۔ اور تصوریت کے تحت تصوراتی فلسفی ظاہر کو دھوکہ سمجھنے لگتا ہے۔ لہٰذا عقل و فلسفے کا ہر راستہ گمراہ کن ہے۔ علم و فلسفہ بے شک سرور دلاتا ہے۔ لیکن فلسفہ ایسی جنت ہے جس میں نہ حسن ہے اور نہ عشق۔ اس لئے اگر حسن کا دیدار کرنا ہے تو ایسا دل بینا، محبوب حقیقی سے مانگ جو عشق کے نور سے منور ہو۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں (۴)

جبکہ:۔

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں — نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی!

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۷۷۔ (۲) بانگ درا۔ ۲۴۰۔ "تضمین بر شعر میر رضی دانش"۔ (۳) بال جبریل۔ ۴۲۔ (۴) بال جبریل۔ ۴۳۔

نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھکو ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی ! (۱)

اقبال کہتے ہیں فلسفی راہ حقیقت سے واقف ہی نہیں اس لئے یہ دوسروں کی کیا رہنمائی کرسکتا ہے۔ وہ بھٹکا ہوا ہے دوسروں کو بھی بھٹکانے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا۔

نہ دیا نشان منزل مجھے اے حکیم تو نے مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے، تو نہ رہ نشین، نہ راہی ! (۲)

فلسفی کی عقل محبوب حقیقی کی خبر تو دے سکتی ہے۔ لیکن چونکہ فلسفی عاشق نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی چشم دل کا نور نہیں ہوتا۔ جبکہ عقل کی کور نگاہی کا علاج صرف ''نظر'' ہے۔

خرد کے پاس ''خبر'' کے سوا کچھ اور نہیں ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں (۳)

عشق کے مقابلے میں عقل وخرد یا فلسفہ کمزور سی چیز ہے۔ لہٰذا خبر بھی ناتوانی کا ایک ثبوت ہے۔ آج کل فلسفے کی بڑی شہرت ہے۔ عشق ناپیدا ہے۔ لہٰذا کلیم اللہ اور طور سینا کی گرما گرمی نہیں۔

خبر، عقل و خرد کی ناتوانی نظر، دل کی حیات جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز سزا وار . حدیث لن ترانی (۴)

لہٰذا اقبال مزید کہتے ہے کہ:۔

یہی زمانہ حاضر کی کائنات ہے کیا؟ دماغ روشن و دل تیرہ ونگہ بیباک!
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک (۵)

اور پھر:۔

فقر مقام نظر، علم مقام خبر فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ!
علم کا 'موجود 'اور، فقر کا 'موجود 'اور اشھد ان لا الہ، اشھد ان لا الہ (۶)

دور حاضر کے تجزیاتی وتصوراتی فلسفے کے حوالے سے اقبال مولانا روم کے شعر کی صورت میں مولانا روم سے سوال کرتے ہیں اور پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ تجزیاتی وتصوراتی فلسفے ''حسن مطلق'' کو نہیں پہچان سکتے۔

خشک مغز و خشک تارو خشک پوست از کجامی آید ایں آواز دوست

(۱) ضرب کلیم۔ ۱۱۱۔ ''نگاہ شوق''۔ (۲) بال جبریل۔ ۴۵۔ (۳) ایضاً۔ ۴۷۔ (۴) ارمغان حجاز۔ ۱۸۔ (۵) بال جبریل۔ ۶۷۔
(۶) ایضاً۔ ۷۷۔

دور حاضر مست چنگ و بے سرور! بے ثبات و بے یقین و بے حضور!
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا! دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا! (۱)

ظاہری آنکھ محسوسات و موجودات میں الجھی ہوئی ہے۔ اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ یہی حال خرد و فلسفے کا بھی ہے۔ کہ ظاہری آنکھ اور فلسفے کا باہم چولی دامن کا تعلق ہے۔ لہٰذا مرض نارسائی کا علاج صرف "اللہ ہو" یعنی عشق الٰہی میں ہے۔

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں! خرد کھوئی ہوئی ہے چار سو میں!
نہ چھوڑ اے دل فغانِ **صبحگاهی** اماں شاید ملے اللہ ھو میں! (۲)

نکوملکیت ملک **صبحگاهی** درآں کشور بیابی ہر چہ خواہی (نظامی گنجوی)

بخواب رفتہ جواناں و مردہ دل پیراں نصیب سینہ کس آہِ **صبحگاهے** نیست (۳)

میں نے پایا ہے اشک صبحگاہی میں جس درناب سے خالی ہے صدف کی آغوش (۴)

گراں بہا ہے ترا گریہء سحر گاہی اسی سے ہے ترے نخل کہن کی شادابی (۵)

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا جہان تازہ مری آہِ صبحگاہ میں ہے! (۶)

مطلب یہ کہ:۔

شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغان سحر خیز (۷)

بے اشک سحر گاہی تقویم خودی مشکل یہ لالہء پیکانی خوشتر ہے کنار جو! (۸)

خرد ظاہر کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ لہٰذا نہ تجزیاتی فلسفہ حقیقت کو سمجھ سکتا ہے اور نہ تصوریت حقیقت سے باخبر ہو سکتی ہے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے خرد کیا ہے؟ چراغ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے! (۹)

ترے سینے میں دم ہے، دل نہیں ہے ترا دم گرمیء محفل نہیں ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے! (۱۰)

---

(۱) بالِ جبریل۔ ۱۳۴۔ "پیر و مرید"۔ (۲) بالِ جبریل۔۸۳۔ (۳) پیامِ مشرق۔ ۱۸۱۔ (۴) بالِ جبریل۔ ۷۵۔ (۵) ایضاً۔۱۳۱۔
(۶) ایضاً۔ ۶۹۔ (۷) ضربِ کلیم۔ ۵۴۔ (۸) ایضاً۔ ۱۷۳۔ (۹) بالِ جبریل۔ ۸۵۔ (۱۰) بالِ جبریل۔۸۴۔

چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ اے بادصبا! میری طرف سے فرنگ کے دانا سے کہو، جب سے تمہاری عقل نے بال و پر کھولے ہیں وہ اور زیادہ گرفتار ہے۔ عقل بجلی کو رام کرنے کی کوشش کرتی ہے جبکہ عشق برق کو اپنے جگر پر برداشت کرتا ہے لہٰذا عشق عقل کے مقابلے میں زیادہ حوصلہ مند ہے۔ تعجب اس پر نہیں کہ تو اعجاز مسیحا رکھتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ تیرے مریض کا مرض اور بڑھ گیا ہے۔ اے تجزیاتی و تصوراتی فلسفی تو نے دانش تو جمع کر لی، مگر دل کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ افسوس اس قیمتی سرمائے پر جو تو نے ہار دیا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ عشق سے مدد لیں۔ اس کے سامنے سجدہ کریں اور اس سے مراد مانگیں۔

ازمن اے بادصبا گوے بدانائے فرنگ   عقل تا بال کشود است گرفتار تراست
برق را ایں بجگری زند، آں رام کند   عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دارتراست
عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری   عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تراست
دانش اندوختہء دل زکف انداختہ   آہ زاں نقد گرانمایہ کر درباختہ ء

چارہ ایں است کہ از عشق کشادے طلبیم   (۱)
پیش او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

گویا کہ:۔

عشق جاں را لذت دیدار داد   باز بانم جراءت گفتار داد   (۲)

اقبال نے ہمیشہ دل کو عشق کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اپنی ایک نظم "عقل و دل" میں عقل و دل کے مکالمے کے ذریعے، فلسفے و عشق کی جولانگاہ کو اجاگر کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ عشق جو کچھ کر گزرتا ہے وہ فلسفہ نہیں کر سکتا۔

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا   بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گزر فلک پر مرا   دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا   مثل خضر خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسر کتاب ہستی کی   مظہر شان کبریا ہوں میں

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ "نقش فرنگ"، (۲) جاوید نامہ۔ ۱۹۰۔

بونداک خون کی ہے تو لیکن غیرت لعل بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے پر مجھے بھی دیکھ کیا ہوں میں!
راز ہستی کو تو سمجھتی ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں!
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی حسن کی بزم کا دیا ہوں میں (۱)

بزم حسن کا چراغ، عشق ہے۔ جس کی روشنی میں حسن دکھائی دیتا ہے۔ عشق نہ ہو تو تاریکی ہے۔ اسی لئے فلسفیوں کو صرف تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ جس کا وہ اعتراف بھی کرتے ہیں۔

ایک سرمستی و حیرت ہے سراپا تاریک! ایک سرمستی و حیرت ہے تمام آگاہی! (۲)
تراتن روح سے ناآشنا ہے عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تن بے روح سے بیزار ہے حق خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے (۳)

حسن مطلق مردہ دل فلسفیوں کو اپنا دیدار نہیں کراتا۔ وہ زندہ ہے اور عشق سے زندہ دلوں کو اپنے نور سے منور کرتا ہے۔

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور (۴)
ہر اک ذرہ میں ہے شاید مکیں دل اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل
اسیر دوش و فردا ہے و لیکن غلام گردش دوراں نہیں دل (۵)

تجزیاتی وتصوراتی حقیقت کو پا سکتا ہے۔ مگر اس وقت جب وہ اپنے دل کی محفل میں چراغ عشق روشن کر لے۔ اور جو کوئی حق تعالیٰ کی ذات کے حسن کا عاشق ہوا۔ وہی ساری موجودات کا سردار ہے۔

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را اوست سید جملہ موجودات را (۶)

---

(۱) بانگِ درا۔ ۴۱۔۴۲۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۷۶۔ (۳) ایضاً۔ ۹۰۔ (۴) ایضاً۔ ۱۵۶۔ (۵) بالِ جبریل۔ ۸۲۔
(۶) جاوید نامہ۔ ۱۵۔

تو اے اسیر مکاں ! لا مکاں سے دور نہیں　　وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں
وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں　　غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں　(۱)

دل جب عشق و مستی سے دور رہتا ہے تو فلسفے کی آماجگاہ بن کر خود بخود مردہ ہو جاتا ہے ۔ حسن تو ہر وقت اپنے حسن کا اظہار کرتا رہتا ہے ۔ اس لئے کہ حسن ضمیر کائنات ہے ۔ مگر ہم دیکھنے والی آنکھ ہی نہیں رکھتے ۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا　　کہ ذرّہ ذرّہ میں ہے ذوق آشکارائی　(۲)
یہ محبت کی حرارت یہ تمنا یہ نمود!　　فصل گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیر حجاب!　(۳)
حد ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی　　سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری　(۴)
نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو　　یہ دل کی موت ! وہ اندیشہ و نظر کا فساد!　(۵)

حسن مطلق جذبہ نمود کی وجہ سے مجبور پیدائی ہے اگر کوئی دیکھنے کی تاب رکھتا ہوتو ہر کہیں جلوہ بینائی دکھائی دیتا ہے۔

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبور پیدائی　　مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسباب مستوری!　(۶)

معنی کی دلہن یا حسن معنی ، کوئی نہ کوئی صورت اختیار کرکے ، اس سے اپنی آرائش کرتی ہے ۔ گویا وہ اپنی نمود کے لئے مختلف لباس پہنتی ہے ۔ حقیقت اپنے چہرے پر پردے ڈالتی ہے ۔ کیوں کہ اسے منکشف ہونے سے لذت حاصل ہوتی ہے ۔

عروس معنی از صورت حنابست　　نمود خویش را پیرایہ ہابست
حقیقت روے خود را پردہ باف است　　کہ اورا لذتے در انکشا ف است　(۷)
آفریدن؟ جستجوے دلبرے!　　وانمودن خویش را بردیگرے!　(۸)

اس نے اپنے شعلے کو چنگاریوں میں تقسیم کر دیا ۔ اب عقل ایک ایک چنگاری کو سمجھنے کے پیچھے پڑی ہوئی ہے ۔ یہی عقل کی خبر پرستی ہے ۔ خودی نے اپنے آپ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اجزاء پیدا کر دیئے ۔ ذرا آشفتہ ہوئی تو صحرا بنا دیئے ۔ پھر آشفتگی سے بیزار ہوئی تو باہم پیوستگی سے پہاڑ بن گئی۔ اپنا اظہار خودی کی عادت ہے ۔ ہر ذرّے میں خودی کی قوت خوابیدہ

---

(۱) بال جبریل ۔ ۵۰۔ (۲) ضرب کلیم ۔ ۱۱۱۔ ''نگاہ شوق'' (۳) بال جبریل ۔ ۱۵۱۔ (۴) بال جبریل ۔ ۶۰۔ (۵) ایضاً ۔ ۷۰۔
(۶) بال جبریل ۔ ۲۰۔ (۷) زبور عجم ۔ ۱۵۵۔ (۸) جاوید نامہ ۔ ۱۹۰۔

ہے ۔ جب وہ بیدار ہوتی ہے تو اظہار چاہتی ہے۔ خودی قوت خاموش ہے ۔ مگر عمل کے لئے بے تاب ہے ۔ وہ عمل ہی کی خاطر اسباب عمل کی پابندی اختیار کرتی ہے ۔

شعلہ خود در شرر تقسیم کرد جز پرستی عقل را تعلیم کرد
خود شکن گردید و اجزا آفرید اند کے آشفت و صحرا آفرید
باز از آشفتگی بیزار شد وز بہم پیوستگی کہسار شد
وانمودن خویش را خوے خودی است خفتہ در ہر ذرہ نیروے خودی است
قوت خاموش و بے تاب عمل
از عمل پابند اسباب عمل (۱)

تجزیاتی اور تصوراتی فلسفے نے زمانہ قدیم کی طرح جادو کا رنگ جما رکھا ہے ۔ عشق کے بغیر اس سحر انگیز شعبدہ بازی کا مقابلہ ممکن نہیں ۔

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم (۲)
جراءت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے!
کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار جب تک تو اسے ضرب کلیمی سے نہ چیرے (۳)
غارت گر دیں ہے یہ زمانہ ہے اس کی نہاد کافرانہ
لیکن یہ دور ساحری ہے انداز ہیں سب کے جادوانہ (۴)
چمن میں رخت گل شبنم سے تر ہے سمن ہے ، سبزہ ہے ، باد سحر ہے
مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم یہاں کا لالہ بے سوز جگر ہے (۵)

خرد تو کہتی ہے کہ اسے آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ اس سے نگاہ شوق ، امید و بیم میں ہے۔ اہلِ عشق کی طرف سے ''طور'' کا واقعہ اب بھی دہرایا جا رہا ہے۔ کیوں کہ ہر دل میں وہی تمنا ہے جس کا اظہار موسیٰ نے کیا۔

خرد گفت! او بچشم اندر نگنجد نگاہِ شوق در امید و بیم است

---

(۱) اسرار خودی ۔۱۴۔ (۲) بالِ جبریل ۔ ۲۰۔ (۳) ایضاً۔ ۱۶۷۔ (۴) ضرب کلیم ۔۸۶۔ ۸۷۔ (۵) بالِ جبریل ۔ ۸۵۔

نمیگردد کہن افسانۂ طور   کہ در ہر دل تمنائے کلیم است   (۱)

دل طور سینا و فاراں دو نیم   تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم!   (۲)

یہ دیر کہن کیا ہے؟ انبار خس و خاشاک!   مشکل ہے گزر اس میں بے نالہ آتشناک!   (۳)

اقبال کہتے ہیں بندۂ مومن جب علم و فلسفے کے چکر سے آزاد ہو کر حسن مطلق کا عاشق بن جاتا ہے تو پھر:۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے   لذت شوق بھی ہے، نعمت دیدار بھی ہے   (۴)

تو بے بصر ہو تو یہ مانع نگاہ بھی ہے   وگر نہ آگ ہے مومن، جہاں خس و خاشاک   (۵)

اقبال کے نزدیک عقل بہانہ جو ہے۔ اس کی فطرت میں روباہی ہے۔ جبکہ عشق بذات خود اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ اس طرح عشق اختیار کرنا گویا اپنا ہاتھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔ عقل و خرد سے جو کوئی بھی کام لے گا ''حسن مطلق'' تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا۔ اس لئے کہ خرد و فلسفے اور سائنس کے نظریات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ نہ کوئی فلسفی اور نہ کوئی سائنس دان حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ بلکہ یہ عشق اور عاشق ہے۔ کہ پختہ یقین اور ایمان سے، حقیقت کو پا لیتا ہے۔ اقبال نے اپنی نظم ''لینن خدا کے حضور'' میں، کے ذریعے لینن کی زبانی انہی خیالات کی روشنی میں لینن سے اس ''جمال لایزال'' کی ہستی کا اعتراف کرایا ہے۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات   حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے   ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے   بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت!   میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

ہم بندشب و روز میں جکڑے ہوئے بندے

تو خالق اعصار و نگارندۂ آنات   (۶)

یہاں اقبال نے منکرین خدا اور فلسفیوں پہ ثابت کیا ہے کہ اگر انسان جیتے جی عشق کی ایک جست سے زمان و مکاں

---

(۱) پیام مشرق۔ ۳۸۔ (۲) بال جبریل۔ ۱۲۳۔ ''ساقی نامہ''۔ (۳) بال جبریل۔ ۴۱۔ (۴) ایضاً۔ ۶۴۔ (۵) بال جبریل۔ ۶۷۔
(۶) ایضاً۔ ۱۰۶۔

کی حدود کو عبور کرلے۔ یا پھر لینن کی طرح موت کی صورت میں اس جہاں سے رخصت ہو جائے تو اسے خود بخود اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا یقین ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے فلسفیوں کے تحقیقی مقالات حل نہیں کر سکتے۔ فلسفیوں کے علمی مقالات، تخمین وظن اور فلسفی کرم کتابی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ تجزیاتی وتصوراتی فلسفہ صفات کے بحث ومباحثہ اور قیاس آرائی سے آگے نہیں دیکھ سکتا۔ جبکہ عشق ''حسن مطلق'' کا دیدار بھی کر لیتا ہے۔ فلسفہ سوالات واعتراضات ہی کر سکتا ہے۔ جبکہ عشق صفات میں پوشیدہ جواب ہے۔

بندۂ تخمین و ظن ! کرم کتابی نہ بن! عشق سراپا حضور ، علم سراپا حجاب!
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات! علم مقام صفات ، عشق تماشائے ذات!
عشق سکون و ثبات ، عشق حیات و ممات!
علم ہے پیدا سوال ، عشق ہے پنہاں جواب! (۱)

یعنی کہ:۔

مقام ذکر کمالات رومی و عطار مقام فکر مقالات بوعلی سینا! (۲)

اقبال خوب فرماتے ہیں کہ ''حسن مطلق'' اپنے حسن کمال سے جب حسن فطرت کی کتاب تحریر کرتا ہے تو پھر فلسفیوں کی علمی وعقلی بحثیں اور ملاؤں کی منطقی دلیلوں کی کتابیں ہیچ دکھائی دیتی ہے۔ یعنی کتاب فطرت ''حسن مطلق'' کی طرف بہترین رہنمائی کرتی ہے۔ اور لالہء آتشیں بجا طور پر کہتا ہے:۔

کھلا جب چمن میں کتب خانہء گل نہ کام آیا ملا کو علم کتابی
کہا لالہء آتشیں پیرہن نے کہ اسرار جاں کی ہوں میں بے حجابی (۳)

لالہء خونیں پیالہ کے داغ سے میں اندازہ کرتا ہوں کہ یہ خاموش زبان بھی کبھی صاحب فغاں رہ چکا ہے۔ اب یہ اس لئے خاموش ہے۔ کہ اسے اسرار جاں، یعنی ''حسن مطلق'' کی معرفت حاصل ہو چکی ہے۔

زداغ لالہ خونیں پیالہ می بینم کہ ایں گسستہ نفس صاحب فغاں بود است ! (۴)

بے شک:۔

---

(۱) ضرب کلیم۔۲۱۔ ''علم وعشق''۔ (۲) ایضاً۔۲۳۔ (۳) ارمغان حجاز۔ ۳۹۔ (۴) زبور عجم۔۸۶۔

علم ناسوز ے نگیرد از حیات　　دل نگیرد لذتے ازواردات!
صد کتاب آموزی از اہل ہنر　　خوش ترآں در سے کہ گیری از نظر
ہر کسے زاں مے کہ ریزد از نظر　　مست میگردد بانداز دگر!
از دم باد سحر میرد چراغ　　لالہ زاں باد سحر مےء در ایاغ ! (۱)

پھر کہتے ہے:۔

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کورذوق اتنا　　صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوے گل کا سراغ !

افلاطون کی تصوریت اور ارسطو کی مدرسیت نے عہد حاضر کو اس قدر کور ذوق کر دیا ہے۔ کہ حقیقت سے بہت دور ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے میں اقبال دعائیہ انداز میں کہتے ہیں۔

فروغ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے　　تری نظر کا نگہباں ہو صاحب ما زاغ! (۲)

ویسے تو گزشتہ صفحات میں موسم بہار، حسن فطرت اور گل وگلزار کے حوالے سے یہ بات ہو چکی ہے کہ مظاہر فطرت بذات خود ''حسن مطلق'' کی دلیل وثبوت ہیں۔ لیکن یہاں بھی موقعے کی مناسبت سے ''حکمت رومی'' کا ایک حوالہ ناگزیر ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم رقمطراز ہیں۔

''ہر پودے کی آفرینش ایک خرق عادت ہے۔ اس لئے قرآن کریم معجزہ طلب کرنے والوں کو بار بار کہتا ہے کہ دیکھو جمادی زمین میں سے نباتی زندگی کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ انگریزی کا مشہور مصنف ''بیورے نکلو'' اپنے سوانح میں لکھتا ہے، کہ میں نے دین کی تلاش میں تمام ادیان اور فلسفوں کا مطالعہ کر ڈالا لیکن کسی بیان اور کسی استدلال نے مجھ کو خدا کی ہستی کا یقین نہ دلایا۔ آخر میں نے کتابوں سے روگردانی کر کے باغبانی شروع کی۔ جب زمیں سے رنگارنگ کے پھول نکلے تو میں خدا کا قائل ہوگیا۔ حیات آفرینی اور جمال آفرینی کا یہ حیرت انگیز معجزہ تمام دلائل سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ وہ کہتا ہے کوئی باغباں منکر خدانہیں ہوسکتا۔'' (۳)

گویا کہ اتنے بڑے کائناتی نظام کو تو چھوڑیں صرف نباتاتی حسن و جمال ہی ''حسن مطلق'' کے خالق کل ہونے کا بڑا ثبوت ہے۔ اسی لئے تو اقبال کہتے ہیں، نہ کام آیا ملا کو علم کتابی۔

---

(۱) جاوید نامہ۔۲۰۳۔ (۲) ضرب کلیم۔۸۵۔ (۳) حکمتِ رومی۔۲۱۲۔

عشق ’’حسن ازل‘‘ کا دیدار چاہتا ہے ۔ جس کی وجہ سے وہ سراپا نظر ہے ۔ ادھر’’ حسن مطلق‘‘ بھی اپنے اظہار کا شوق رکھتا ہے اور لالہ وگل کے پردوں کے علاوہ ایک نہ ایک دن بے حجابانہ ظاہر ہوگا ۔

عشق از لذت دیدار سراپا نظر است　　　حسن مشتاق نمود است و عیاں خواہد بود　(۱)

تجزیاتی فلسفی الفاظ کا بھی تجزیہ کرتے ہیں اور اقبال ان کے اس رویے سے بھی اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا　　　غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے　(۲)

تو نے جونقوش بنائے ہیں وہ اوہامِ باطل ہیں ۔ ایسی عقل پیدا کر جو دل یعنی عشق سے تربیت یافتہ ہو ۔

نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است　　　عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است　(۳)

اس ساری بحث اور کلام اقبال سے بے شمار مثالوں کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک فلسفہ وعقل نہیں بلکہ عشق ’’حسن مطلق‘‘ کا دیدار کرسکتا ہے ۔ عقل وخرد خبر ہے ۔ اور عشق یا ذوق وشوق نظر ہے ۔ فلسفہ فکر ہے جبکہ عشق ذکر ۔ اس طرح عشق دیدار’’حسن مطلق‘‘ کا مکمل و اکمل وسیلہ ٹھہرتا ہے ۔ اور یہی عشق ہے جسے ’’ وحدت جمال‘‘ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ اس طرح نہ تجزیاتی وتصوراتی اور نہ معروضیت وموضوعیت بلکہ ’’ وحدت جمال‘‘ حق ومعرفت کے راستے میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ چنانچہ اقبال جس چیز کو’’دل بینا‘‘ اور دل کا ’’ نور‘‘ کہتے ہیں وہ دراصل ’’عشق‘‘ یا ’وحدت جمال‘‘ ہی ہوسکتا ہے ۔ اور اسی کی تقدیر میں حضور ہے ۔

علامہ محمد اقبال نے دنیا جہاں کے فلسفے اور منطق کا بغور مطالعہ کیا تھا ۔ اپنے تجربے اور مشاہدے کے طفیل وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فلسفہ وعقل معرفت حق میں رہنمائی کی بجائے انسان کو راستے سے بھٹکا دیتے ہیں ۔ اس لئے اقبال خود کہتے ہیں ،کہ اقبال کے دلکش اشعار سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ درس فلسفہ تو دیتا رہا مگر خود اس نے عاشقی اختیار کئے رکھی ۔

زشعر دلکش اقبال می تواں دریافت　　　کہ درس فلسفہ میداد و عاشقی ورزید　(۴)

فلسفے اور عشق کا موازنہ اقبال نے قدم قدم پر عملی طور سے اس طرح کر دکھایا ہے کہ اس سے زیادہ واضح اور دوٹوک انداز اختیار کرنا ممکن نہیں ۔ یوں لگتا ہے کہ اقبال کا دماغ فلسفے سے بخوبی آگاہ ہے اور عشق کا نور ان کے واردات قلبی کی روح رواں ہے ۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنے شعر کے ذریعے کیا ہے :۔

---

(۱) پیامِ مشرق ۔ ۱۹۳ ۔ (۲) ضربِ کلیم ۔ ۴۲ ۔ ’’فلسفہ‘‘ ۔ (۳) پیامِ مشرق ۔ ۲۰۷ ۔ (۴) ایضاً ۔ ۱۵۶ ۔

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ　　سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں　　(۱)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ!　　سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ!　　(۲)

خرد افزود مرا کے مصداق، اقبال یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ میری عقل آزر پیشہ نے زنار باندھا اور میری جان کی ولایت میں اس کا نقش بیٹھ گیا۔ کئی برس تک میں شکوک میں گرفتار رہا۔ اور یہ شکوک میرے خشک دماغ کا جزو لاینفک بن گئے۔ میرے دماغ نے علم الیقین کا کوئی حرف نہ پڑھا۔ وہ فلسفے کے ''گماں آباد'' ہی میں بھٹکتا رہا۔ میرے دماغ کی سیاہی حق کی روشنی سے ناآشنا تھی۔ میری شام رونق شفق سے بیگانہ تھی۔

عقل آزر پیشہ ام زنار بست　　نقش اودر کشور جانم نشست

سالہا بودم گرفتار شکے　　از دماغ خشک من لاینفکے

حرفے از علم الیقیں ناخواندۂ　　در گماں آباد حکمت ماندۂ

ظلمتم از تاب حق بیگانہ بود　　شامم از نور شفق بیگانہ بود　　(۳)

پھر کہتے ہیں میں نے یورپ میں علم کی جو شراب پی اس نے میری سوچ کو تاریک کر دیا ہے۔ اپنی منزل کے مسافر کو ایسی نگاہ عطا فرمائیے۔ جو صحیح راہ پہچان لے۔

زمینائے کہ خوردم در فرنگ اندیشہ تاریک است

سفر ورزیدۂ خودرا نگاہ راہ بینے دہ　　(۴)

میں نے فلسفے کے فرنگی بتوں کو دل ہار دیا، اور اہل بت کدہ کی گرمی سے پگھل گیا۔ میں اپنے آپ سے اس قدر بیگانہ ہوگیا کہ جب میں نے اپنے آپ کو دیکھا، تو پہچان نہ سکا۔

بہ افرنگی بتاں دل باختم من　　زتاب دیریاں بگداختم من

چناں از خویشتن بیگانہ بودم　　چو دیدم خویش را نشناختم من!　　(۵)

میں نے یورپ کے میکدے سے شراب چکھی۔ اپنی جان کی قسم! صرف دردِ سر ہی خریدا۔ یورپ کے اچھے لوگوں کی

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۴۵۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۵۱۔ (۳) رموزِ بیخودی۔ ۱۶۹۔ (۴) زبورِ عجم۔ ۳۰۔ (۵) ارمغانِ حجاز۔ ۴۷۔

صحبت میں بیٹھا مگر بے سود وقت گنوایا۔

مے از میخانہء مغرب چشیدم بجان من کہ دردسر خریدم
نشستم بانکویانِ فرنگی ازاں بے سودتر روزے ندیدم! (۱)

اس کے بعد اقبال حضورؐ کی خدمت میں التجا کرتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے دروازے کا فقیر ہوں ۔ جو مانگتا ہوں آپ سے مانگتا ہوں ، میری التجا ہے کہ میرے برگ کاہ سے پہاڑ کا دل کاٹ دیا جائے ۔ فلسفیوں کے لیکچر میرے لئے دردسر ثابت ہوئے ۔ کیوں کہ میں فیض نگاہ کا پروردہ ہوں ۔

فقیرم از تو خواہم ہر چہ خواہم دل کوہے خراش از برگ کاہم
مرا درس حکیماں درد سر داد کہ من پروردۂ فیض نگاہم (۲)

یعنی کہ :۔

بیااقبال جامے از خمستان خودی درکش تو از میخانہ ء مغرب زخود بیگانہ می آئی (۳)

یورپی فلسفیوں سے انہوں نے فلسفہ سیکھا اور مشرقی عشاق کے فیض سے ان کا دل ''نور مطلق'' کی تجلی سے منور ہوا۔ گویا کہ ایسا شخص جب عشق کے مقابلے میں فلسفے وعقل کو زمان و مکاں سے رشتہ بپا اورعشق کو طائر سدرہ آشنا بتاتا ہے تو بجا فرماتا ہے کہ وہ دونوں راستوں سے بخوبی واقف ہے اور اس نے بڑی جانچ پڑتال کے بعد عقل وخرد کے خلاف فتویٰ دیتے ہوئے اسے یہ کہہ کرخیر باد کہہ دیا ہے کہ :۔

بالآخر اقبال نے عقل چالاک کو چھوڑ دیا اور اپنے خودسر دل کوعشق سے رام کیا۔ اقبال فلک پیا کے بارے میں کیا پوچھتا ہے۔ ہمارے اس نکتہ داں فلسفی نے ، عقل کی نہیں عشق و جنوں کی باتیں کی ہیں ۔

گریز آخر زعقلِ ذوفنوں کرد دل خود کام را از عشق خوں کرد
ز اقبال فلک پیا چہ پرسی حکیم نکتہ دانِ ما جنوں کرد (۴)
چساں بسینہ چراغے فروختی اقبال بخویش آنچہ توانی بما توانی کرد! (۵)

نشیمن دونوں کا بدن ہے مگر یہ کیا راز ہے ۔عقل کومٹی کی صحبت پسند ہے ۔ یعنی عقل آب وگل یا موجودات میں

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۴۷۔ (۲) ارمغانِ حجاز ۔ ۴۷۔ (۳) پیامِ مشرق ۔ ۱۷۳۔ (۴) پیامِ مشرق ۔ ۷۹۔ (۵) زبورعجم ۔ ۶۴۔

الجھی رہتی ہے ۔ جبکہ دل مٹی سے پرے رہتا ہے ۔ گویا دل عشق کی بناء پر محسوسات کے پردے میں جلوہ افروز "حسن مطلق" تک جا پہنچتا ہے ۔

نشیمن ہر دو را در آب و گل لیکن چہ راز است ایں   خرد را صحبت گل خوشتر آید، دل کم آمیز است (۱)

بروں کشید زپیچاک ہست و بود مرا   چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا (۲)

تجزیاتی و تصوراتی فلسفی معروض اور موضوع کی بحثوں میں پڑے رہتے ہیں ، جبکہ عاشق کی خاک تیرہ "نور حقیقت" کی ضو سے جگمگا اٹھتی ہے ۔

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے   کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے

غازۂ الفت سے یہ خاکِ سیہ آئینہ ہے   اور آئینے میں عکس ہمدم دیرینہ ہے

ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے

چاندنی جس کے غبار راہ سے شرمند ہے (۳)

اقبال مزید کہتے ہیں کہ دانش حاضر کے تجزیاتی و تصوراتی فلسفے سے سوز عشق کی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ اس کافر کے جام میں شراب حقانی کی کیفیت تلاش نہ کر ۔ میں ایک مدت تک سعی و کوشش میں لگا رہا اور دور جدید کے علوم کا راز دان ہوا۔ پروفیسروں نے میرے امتحانات لے کر مجھے فلسفے کے گلستان کا محرم راز بنایا ۔ مگر میں نے اس گلزار یعنی مغربی علوم و فلسفے کو عبرت کا لالہ زار خاردار پایا ۔ یہ کاغذی پھول کی خوشبو کا سراب ہے ، یعنی معرفت کی خوشبو سے عاری ہے ۔ اسی بناء پر میں نے اس گلستان (فلسفے) کے بندھن سے اپنے آپ کو چھڑایا ہے اور شاخ طوبیٰ (عشق و معرفت) پر اپنا آشیانہ بنایا ہے ۔ جدید علوم کی معروضیت و موضوعیت اور تجزیاتی و تصوراتی فلسفہ " حسن مطلق " اور انسان کے درمیان حجاب اکبر کی طرح حائل ہیں ۔ یہ غلط نظریات کے بت بنا کر انہیں پوجتے اور فروخت کرتے ہیں ۔ انہوں نے مظاہر فطرت کے قید خانے میں اپنے آپ کو قید کر رکھا ہے ۔ یہ حواس ظاہری کی حدود سے باہر نہیں نکلتے ۔ انہیں خبر ہی نہیں کہ " خبر " سے آگے " نظر " ہے جو صرف اور صرف "عشق" یا "وحدت جمال" کا کمال ہے ۔

سوزش عشق از دانش حاضر مجوے   کیف حق از جام ایں کافر مجوے

---

(۱) زبورِ عجم ۔ ۱۳ ۔ (۲) زبور عجم ۔ ۱۹ ۔ (۳) بانگِ درا ۔ ۱۲۰ ۔ "وصال" ۔

مدتے محوِ تگ و دو بودہ ام — راز دانِ دانشِ نو بودہ ام
باغباناں امتحانم کردہ اند — محرم ایں گلستانم کردہ اند
گلستانے لالہ زارِ عبرتے — چوں گلِ کاغذ سراب نکہتے
تا ز بندِ ایں گلستاں رستہ ام — آشیاں برشاخِ طوبےٰ بستہ ام
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است — بت پرست و بت فروش و بت گر است
پابزندانِ مظاہر بستہء — از حدودِ حس بروں نا جستہء (۱)

اقبال اپنی ایک دوسری نظم ''میخانہ فرنگ'' میں بھی یورپی ماحول اور فلسفے سے اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے ، بعد میں کہتے ہیں کہ فلسفہ وعقل میں وہ بات نہیں جو عشق اور عاشق میں ہے :۔ مجھے وہ دن یاد ہیں ۔ جب میں میخانہ فرنگ میں تھا ۔ وہاں کے جام آئینہ سکندر سے بھی زیادہ چمکدار ہیں ۔ مے فروش کی چشم مست ،شراب کی پرودگار ہے ،یعنی شراب میں نشہ پیدا کرتی ہے ۔ اور ساقی کی نگاہ بادہ نوشوں کیے لئے پیغامبر ہے ۔ مے فروش ان کا رب ہے اور ساقی ان کا پیغمبر لیکن وہاں کا جلوہ بغیر کلیم کے ہے اور شعلہ بغیر خلیل ، گویا محبوب حقیقی وہاں اپنی تجلی نہیں دکھاتا کہ وہاں کلیم وخلیل جیسے عاشقوں کا عشق نہیں ۔ اس لئے وہاں کوئی طور سیناء نہیں اور آگ کا کوئی انداز گلستان نہیں ۔ ان کی لاپرواہ عقل متاع عشق کو برباد کر دیتی ہے ۔ وہاں کی ہوا میں کسی آہ بے تاب کی گرمی نہیں ، نہ اس شراب خانے کا رند کوئی لغزش مستانہ رکھتا ہے ۔

یاد ایامے کہ بودم درخمستانِ فرنگ — جام اوروشن تر از آئینہ اسکندر است
چشمِ مست مے فروشش بادہ را پروردگار — بادہ خواراں رانگاہ ساقی اش پیغمبر است
جلوۂ او بے کلیم و شعلہء او بے خلیل — عقل نا پروا متاع عشق را غارت گر است
درہوائش گرمیٔ یک آہ بیتابانہ نیست — رند ایں میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست (۲)
پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر — اس میں وہ کیف غم نہیں ، مجھ کو تو خانہ ساز دے (۳)

اس لئے کہ :۔

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغ سینہ ہے — روح کو سامانِ زینت اہ کا آئینہ ہے (۴)

---

(۱) اسرارِ خودی۔ ۶۸۔ (۲) پیامِ مشرق۔ ۲۰۸۔ (۳) بانگِ درا۔ ۱۱۳۔ (۴) ایضاً۔ ۱۵۵۔

مغرب کا فکر تجزیاتی فلسفے کی صورت میں ظاہر و مجاز کے سامنے سر بسجود ہے۔ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا ہے اور اندھا تماشائے رنگ و بو ہی میں مست ہے۔

فکر فرنگ پیشِ مجاز آورد سجود بینائے کو روست تماشائے رنگ و بوست! (۱)

حقیقت کی جستجو سے اس لئے بیگانہ ہے کہ فلسفہ و خرد ظاہر کی آنکھ سے دیکھتا ہے جبکہ اقبال جیسا عاشق کہتا ہے کہ:۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی (۲)

مولانا روم فرماتے ہیں کہ جو شخص بیدار دل رکھتا ہے، اس کے سر کی آنکھ اگر سو بھی جائے تو اس کی جگہ سو بینائیاں کھل جاتی ہیں۔

وا نکہ دل بیدار دارد چشم سر گر بخسپد بر کشاید صد بصر (۳)

ظاہر کی آنکھ سے ظاہر ہی نظر آتا ہے، ظاہر میں پنہاں دیدۂ دل سے دکھائی دیتا ہے۔ دل کی آنکھ اگر وا ہو تو ظاہری آنکھیں بند کر لینے سے بھی ''حسن مطلق'' دکھائی دے سکتا ہے۔ اور اگر دل کی آنکھ میں نور ہی نہ ہو تو ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود دکھائی نہیں دیتا۔ اقبال کہتے ہیں تجزیاتی فلاسفہ ظاہر کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جبکہ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں۔ مولانا رومیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ حسی یا ظاہری آنکھ کو خدا نے اندھا کیا ہے۔ اس کو بت پرست اور ہمارا دشمن کہا ہے۔

دیدۂ حس را خدا اعماش خواند بت پرستش گفت و ضدِ ماش خواند (۴)

اقبال کے ہاں مولانا روم چونکہ علامت عشق ہیں۔ اس لئے علامہ نے آپ کے اکثر اشعار اپنے کلام میں موقع و محل کے مطابق پیش کئے ہیں۔ جاوید نامہ میں جیسا کہ مولانا روم، سیر افلاک کے دوران میں زندہ رود کے ہمراہ ہیں۔ اس لئے، زندہ رود رومی کا کلام اُن ہی کی زبانی مکالماتی انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

''اپنی ان دو آنکھوں اور دو کانوں کو اور تیز کر اور جو کچھ دیکھے اسے ہوشمندی سے اپنا۔ جو شخص چیونٹی کی آواز سن لیتا ہے۔ وہ زمانے سے اس کے اسرار بھی سن سکتا ہے۔ مجھ سے وہ نگاہ حاصل کر۔ جو آنکھ میں مقید نہیں رہتی۔ بلکہ مظاہر کے پردوں کو جلا کر، پردوں کے پیچھے کار فرما اور جلوہ ''آراء حسن ازل'' کو دیکھ لیتی ہے۔ آدمی سراپا نگاہ، یا آنکھ ہے، یعنی

(۱) زبور عجم۔ ۴۹۔ (۲) بانگِ درا۔ ۱۰۲۔ (۳) مثنوی، معنوی، مولوی۔ ۱۲۵۔ ''دفتر سوم''۔ (۴) مثنوی معنوی، مولوی۔ ۱۶۰۔ ''دفتر دوم''۔

انسان وہ ہے جو سر سے لے کر پاؤں تک نگاہ ہی نگاہ ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ناک، کان اور سر وغیرہ سب نگاہ ہے۔ باقی بدن تو نرا چھلکا ہے۔ اور نگاہ وہ ہے جو محبوب حقیقی یعنی ''حسن مطلق'' کا دیدار کر سکے۔ اپنے سارے بدن کو پگھلا کر نگاہ میں بتدیل کر لے اور پھر نگاہ کے اندر ہی اندر چلتا جا تیرا راستہ بھی دیدار کا راستہ بن جائے گا۔

تیز تر کن ایں دو چشم و ایں دو گوش — ہر چہ می بینی بنوش از راہ ہوش (۱)

آں کسے کو بانگ موراں بشنود — ہم زدوراں سر دوراں بشنود

آں نگاہ پردہ سوز از من بگیر — کو بچشم اندر نمی گردد اسیر

آدمی دید است باقی پوست است — دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

جملہ تن را درگداز اندر بصر — در نظر رو،درنظررو ، در نظر (۲)

''حسن مطلق'' تک رسائی کے لئے رومی سے سند حاصل کرنے کے لئے اقبال خود بھی یہی کہتے ہیں کہ پردہ سوز اور پردے پھاڑ دینے والی نگاہ کے ساتھ اس کائنات کے مظاہر میں سے گزر، پھر تجھے ہر جگہ ''حسن ازل'' ہی جلوہ فرما نظر آئے گا۔

بانگاہِ پردہ سوز و پردہ در — از درونِ میغ و ماغ او گذر (۳)

پھر کہتے ہیں اپنے اندر ایسی نگاہ پیدا کر، جو بدن میں موجود روح کو دیکھ لے۔ جو ان ان کھلے پھولوں کو دیکھ سکے، جو ابھی شاخ کے اندر ہیں یا پھر کمان پر چڑھے ہوئے تیر کی مانند تیر زن کی نظر سے ہدف دیکھ۔

نگاہے آفریں ، جاں در بدن بیں — بشاخاں نادمیدہ یاسمن بیں

وگر نہ مثل تیرے در کمانے — ہدف را بانگاہ تیر زن بیں (۴)

اقبال کہتے ہیں نرگس کی مانند اس چمن کو دیکھے بغیر یہاں سے نہ گزر جا، تو اس خوشبو کی مانند نہ ہو جو غنچہء پیچیدہ ہی میں رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان سے روشن تر آنکھ دی ہے تو دنیا میں بیدار خرد اور خوابیدہ دل کے ساتھ زندگی بسر نہ کر۔ صرف عقل ہی کو سب کچھ نہ سمجھ، یہ تجھے تجزیاتی و تصوراتی فلسفے کی بھول بھلیوں میں بھٹکا دیتی ہے۔ دل بیدار یعنی عشق سے لبریز دل بھی حاصل کر، تا کہ ''حسن مطلق'' کا دیدار حاصل کر سکے۔

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۲۳۔ (۲) مثنوی معنوی، مولوی۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۸۸۔ (۴) ارمغانِ حجازی۔ ۱۳۷۔

چو نرگس ایں چمن نادیدہ مگذر چو بودر غنچۂ پیچیدہ مگذر
ترا حق دیدۂ روشن ترے داد خرد بیدار و دل خوابیدہ مگذر (۱)

اسی نکتے کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ محمد اقبال کہتے ہیں کہ اے گل لالہ! تو نے اپنے خوبصورت چہرے سے نقاب اٹھا کر، اپنے آپ کو ہم پر ظاہر کیا ہے۔ جب تو شاخ سے پھوٹا تو تجھے لالہ کہا گیا۔ مگر جب تو شاخ کے اندر تھا، اس وقت کیا تھا، کیسا تھا؟

بما اے لالہ خود را وا نمودی نقاب ! از چہرۂ زیبا کشودی
ترا چوں بردمیدی لالہ گفتند بشاخ اندرچساں بودی؟ چہ بودی؟ (۲)

یعنی جس طرح شاخ سے پھوٹنے سے قبل بھی لالے کا پھول شاخ کے پردے میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتا ہے، مگر دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح ''حسن مطلق'' مختلف پردوں میں موجود ہے۔ یہ پردے تو دکھائی دیتے ہیں، لیکن وہ دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ پھول کی طرح حسن مطلق بھی بے حجابانہ جلوہ آرائی کرے گا۔ فی الحال پھول اور دوسرے مظاہر ''حسن ازل'' کے قاصد اور گواہ ہیں جو اس کی شان کبریائی پر گواہی دے رہے ہیں۔

آتش اودم بخودم اندر کشید لالہ گردید و زشاخے بردمید (۳)

اہل مغرب نے روحانیت کو گم کر دیا ہے وہ جان پاک دل کی بجائے پیٹ میں تلاش کرتے ہیں۔ تجزیاتی کی طرح تو پھول کے رنگ و بو کے طلسم سے نکل۔ اس صورت کو چھوڑ اور عشق اختیار کرتے ہوئے معنی پر غور کر۔

غربیاں گم کردہ اند افلاک را درشکم جویند جان پاک را!
از طلسم د رنگ و بوے او گذر ترک صورت گوے و درمعنی نگر (۴)

فرنگ بغیر مضراب اور ساز کے کوئی آواز نہیں رکھتا۔ نہ وہ طیارے کے بغیر پرواز کر سکتا ہے۔ یعنی تجزیاتی و تصوراتی فلسفی دل کی آواز اور روحانی پرواز سے محروم ہے۔ عقل کے ذریعے طیارے میں بیٹھ کر مشینی پرواز تو کی جا سکتی ہے مگر عشق کی روحانی پرواز عقل و خرد کے جی کا روگ نہیں۔

فرنگی فلسفی کے باغ سے ویراں کھیتی اور اس کے شہروں سے بیابان بہتر ہیں۔ اس کے کارواں کی کوشش رہزن کی

---

(۱) پیام مشرق۔ ۶۸۔ (۲) ارمغان حجاز۔ ۱۱۳۔ (۳) رموز بیخودی۔ ۱۳۴۔ (۴) جاوید نامہ۔ ۶۴۔

طرح ہے ۔ کہ وہ دولت عشق و ایمان کا غارت گر ہے ۔ ان کے پیٹ روٹی کی دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے ہیں ۔ دل ساکن و جامد ہو چکے ہیں ۔ ان کی روح خوابیدہ ہے اور تن بیدار ہے ۔ دین و دانش کے ساتھ تجزیاتی وتصوراتی فلسفیوں کا ہنر بھی خوار ہو چکا ہے ۔ معروضی و موضوعی فلسفی کی خرد کافری اور کافرگری کے سوا اور کچھ نہیں ۔

نوا بے زخمہ و سازے ندارد　　　ابے طیارہ پروازے ندارد
زباغش کشت ویرانے نکوتر　　　زشہر او بیابانے نکوتر
چو رہزن کاروانے درتگ و تاز　　　شکم ہا بہر نانے درتگ و تاز
رواں خوابیدہ و تن بیدار گردید　　　ہنر بادین و دانش خوار گردید
خرد جز کافری کافرگری نیست　　　فن افرنگ جز مردم دری نیست　(۱)

ایسے فلسفیوں کے مقابلے میں تو خواجہ اہل فراق (شیطان) ہی بہتر جو ''حسن مطلق'' کو بطور حقیقت مانتے ہوئے اعترافاً کہتا ہے :۔

''مجھے اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ سمجھ ۔ باطن پر نظر ڈال ظاہر پر نہ جا ۔ اگر میں کہوں کہ حق تعالیٰ نہیں ہیں تو یہ حماقت ہوگی کیوں کہ ان کی دید کے بعد ایسا کہا نہیں جا سکتا ۔

گر بگویم نیست ، ایں ا ز ابلہی است　　　زانکہ بعد از دید نتواں گفت نیست!　(۲)

فرنگیوں کے عقلی انگور سے سوز و مستی نہ ڈھونڈ ان کے افلاک میں کوئی اور زمانہ نہیں ۔ ان کی تجزیاتی وتصوراتی شراب وحدت جمال کی سرمستی و سرشاری سے خالی ہے ۔

سوز و مستی را مجو از تاک شاں　　　عصرِ دیگر نیست در افلاک شاں!　(۳)

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت ، کہاں حجاب و دلیل!　(۴)

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک　　　اگر چہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک　(۵)

---

(۱) زبور عجم ۔ ۱۶۸ ۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۱۳۵ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۲۶ ۔ (۴) بال جبریل ۔ ۶۳ ۔ (۵) ایضاً ۔ ۲۶ ۔

تجزیاتی و تصوراتی فلسفی دل کی آنکھ نہیں رکھتے اس لئے اقبال ان سے کہتے ہیں کہ :۔

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ — کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل!

اور اگر گرمی عشق برداشت کر سکو تو میری آواز کا شعلہ مشعل کی طرح تمہاری رہنمائی کر سکتا ہے ۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو — تیرے لئے ہے میرا شعلۂ نوا قندیل! (۱)

تجزیاتی و تصوراتیوں کی کور نگاہی کا یہ عالم ہے کہ اقبال نے پردۂ اسرار کو بھی نمایاں کر دیا مگر عقل و خرد کے ماروں پر کوئی اثر نہ ہوا ۔ اور وہ معروضیت و موضوعیت ہی کے اسیر رہے ۔

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک — دیرینہ ہے ترا مرض کور نگاہی! (۲)

اس سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ اقبال فلسفے اور فلسفیوں کی ''خبر'' سے ہرگز متاثر نہیں ۔ بلکہ وہ ''عشق و نظر'' اور صاحب نظر عشاق سے متاثر ہیں ۔ جن کے فیضان نظر سے اقبال کا دل منور ہو کر'' نور مطلق'' کے جلوے سے جگمگانے لگا ۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ میں اہل مغرب میں رہا بہت جستجو کی ۔ مگر ایسا مرد نہ دیکھا جس کے مقامات بے حساب ہوں ۔

بامغربیاں بودم برجستم و کم دیدم — مردے کہ مقاماتش ناید بہ حساب اندر! (۳)

کھلتا نہیں مرے سفر زندگی کا راز — لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں ! (۴)

باطل دوئی پسند ہے ، حق لا شریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول (۵)

کے مصداق اقبال بغیر کسی پیش و پس کے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ جب میں نے اپنے آئینہ قلب کا جوہر دیکھا تو میں اپنے سینے کے اندر خلوت نشیں ہو گیا ۔ اور اپنے غم دیرینہ (عشق) کو لے کر ان اندھے اور بے ذوق تجزیاتی و تصوراتی دانشوروں سے دور بھاگ گیا ۔

چو دیدم جوہر آئینۂ خویش — گرفتم خلوت اندر سینۂ خویش

ازیں دانشوران کور و بے ذوق — رمیدم باغم دیرینۂ خویش (۶)

اس لئے کہ :۔

رہ و رسم کلیسا کی نامحرمانہ! ادا سوداگرانہ

(۱) بال جبریل ۔۶۳ ۔ (۲) بال جبریل ۔ ۳۶ ۔ (۳) جاوید نامہ ۔ ۴۲ ۔ (۴) بال جبریل ۔ ۱۴۸
(۵) ضرب کلیم ۔ ۷۳ ۔'' سلطان ٹیپو کی وصیت'' ۔ (۶) ارمغان حجاز ۔ ۱۳۸ ۔

تبرک ہے مرا پیراہن چاک نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ! (۱)

اور:۔

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن (۲)

پھر کہتے ہیں کہ میں نے آب وگل کے جہان کے اندر خلوت اختیار کی ہے۔افلاطون و ابونصر فارابی سے علیحدہ رہا ہوں۔ میں نے کسی سے دیکھنے کی بھیک نہیں مانگی۔ دنیا کو اپنی ہی آنکھ سے دیکھا ہے۔ گویا کہ اقبال افلاطون کی تصوریت، موضوعیت اور فطریت کے پیروکار ہرگز نہیں۔ وہ کسی فلسفی کی نظر سے محسوسات و موجودات کو نہیں دیکھتے۔ بلکہ اپنی نگاہ عشق سے مظاہر پر ''پردہ سوز'' نظر ڈالتے ہیں۔ اقبال نہ افلاطون کے مرہون منت ہیں اور نہ فارابی کے۔ یعنی کہ مغربی و مشرقی ہر دو فلسفوں سے بیزار ہیں۔

میان آب وگل خلوت گزیدم ز افلاطون و فارابی بریدم
نہ کردم از کسے دریوزۂ چشم جہاں را جز بچشم خود ندیدم (۳)

یعنی کہ:۔

میں صورت گل دست صبا کا نہیں محتاج کرتا ہے مرا جوش جنوں میری قبا چاک (۴)

اسی سلسلے میں کہتے ہیں۔ تیرا مقام ایسے صحرا میں ہے جس کی شام بھی صبح کی مانند روشن و شفاف ہے۔ جہاں چاہے اپنا خیمہ لگا۔ مگر اتنا خیال رکھ، دوسروں سے طناب مانگنا حرام ہے۔ یعنی فرنگیوں پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے۔

ترا اندر بیابانے مقام است کہ شامش چوں سحر آئینہ فام است
بہر جاے کہ خواہی خیمہ گستر طناب از دیگراں جستن حرام است (۵)

جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا (۶)

اس ضمن میں پھر کہتے ہیں:۔ اگر رات چشم غزال سے بھی زیادہ کالی ہو تو میں اپنا راستہ روشن کرنے کے لئے خود اپنا چراغ جلاتا ہوں۔

اگر شب تیرہ تر از چشم آہوست خود افروزم چراغ راہ خویشم (۷)

---

(۱) بال جبریل۔۸۰۔ (۲) بال جبریل۔۳۱۔ (۳) پیام مشرق۔۶۰۔ ''لالہ طور''۔ (۴) بال جبریل۔۹۰۔
(۵) ارمغان حجاز۔ ۶۳۔ (۶) ارمغان حجاز۔ ۱۵۔ (۷) پیام مشرق۔ ۱۱۷۔

اور پھر میرے اشعار کے معانی کو ہند و عجم کے معیار پر نہ پرکھ۔ اس گوہر کی اصل "نیم شب" یعنی عشق کے آنسوؤں سے ہے۔

مسنج معنیء من درعیار ہند و عجم   کہ اصل ایں گہرا ز گریہ ہائے نیم شبی است   (۱)

اور مجھ سے یہ بات سن لے کہ اندھا آدمی اس بینا سے بہتر ہے جو معاملات کو غلط رنگ میں دیکھے۔ یہ بھی سن لے کہ نیک نیت نادان شخص اس دانشمند سے بہتر ہے۔ جو دین و ایمان سے خالی ہو۔

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے   ز بینائے غلط بینے نکوتر

زمن گیرایں کہ نادانے نکوکیش   ز دانشمندِ بے دینے نکوتر!   (۲)

غرض علامہ محمد اقبال ہی کی زبانی حاصل کلام یہ کہ:۔

تعلیم پیر فلسفہء مغربی ہے یہ   ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا   ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی   اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام   ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور   مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش

" باہر کمال اند کے آشفتگی خوش است   (۳)

ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

مطلب یہ کہ:۔

سنگ شو آئینہ اندیشہ را   برسر بازار بشکن شیشہ را   (۴)

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں   عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ   (۵)

از دیر مغاں آیم بے گردش صہبا مست   در منزل لا بودم از بادۂ الا مست!   (۶)

پس علامہ محمد اقبال مغربی حکماء سے کہتے ہیں کہ میرے پاس جو جام عشق و معرفت ہے اس میں دونوں جہاں دیکھے

---

(۱) پیامِ مشرق۔۱۶۴۔ (۲) ارمغان حجاز۔ ۹۹۔ (۳) بانگِ درا۔ ۲۳۶۔ "مذہب"۔ (۴) اسرار خودی۔ ۱۰۔
(۵) بانگ درا۔۲۸۲۔ (۶) مثنوی مسافر۔ ۷۶۔

جا سکتے ہیں ۔یعنی دونوں جہانوں کی حقیقت جام عشق میں صاف دکھائی دیتی ہے ۔ کہاں ہے وہ آنکھ جو وہ دیکھے جسے میں دیکھ رہا ہوں۔

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم ۔۔۔ کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم (۱)

نظر آئے گا اسی کو یہ جہان دوش و فردا! ۔۔۔ جسے آگئی میسر مری شوخیٔ نظارہ! (۲)

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے ۔۔۔ وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے (۳)

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں ۔۔۔ میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!

گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل و جود ۔۔۔ گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں! (۴)

پروردۂ عشق نگاہ ،پردوں کے اندر دیکھ لیتی ہے ۔ اور عقل وخرد سے فریب خوردہ نگاہ تجزیاتی وتصوراتی توہمات میں الجھ کر رہ جاتی ہے ۔ اگر کوئی فلسفے کی نظر سے دیکھے تو ایک معمولی تنکا بھی آنکھ کے لئے پردہ بن جاتا ہے لیکن میری طرح نگاہ عشق کی بدولت دونوں جہاں ایک ہی نظر میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔ وادیٔ عشق کا راستہ بڑا دور دراز ہے ۔مگر کبھی سو سال کی راہ ایک آہ سے بھی طے ہو جاتی ہے ۔تو بھی اسے پانے کی کوشش کر اور دامن امید نہ چھوڑ ، یوں بھی ہوتا ہے کہ سر راہ دولت عشق مل جائے ۔

می شود پردۂ چشم پرکاہے گاہے ۔۔۔ دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگاہے گاہے

وادیٔ عشق بسے دور دراز است ولے ۔۔۔ طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

در طلب کوش و مدہ دامن امید زدست ۔۔۔ دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے! (۵)

اس کے بعد اقبال تجزیاتی فلاسفہ سے کہتے ہیں کہ تم اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے ، درخت سدرہ کی شاخ ہو۔ اپنے آپ کو باغ کا خاروخس نہ بناؤ۔ اگر اللہ تعالیٰ کے منکر ہو تو کم از کم اپنی عظمت کا تو انکار نہ کرو۔

شاخ نہال سدرۂ خاروخس چمن مشو ۔۔۔ منکر او اگرشدی منکر خویشتن مشو (۶)

تجزیاتی وتصوراتی دانایان فرنگ کو چھوڑ ،کلیم سے سبق سیکھ ۔ انہوں نے بحر کا سینہ تو چاک کیا ہے مگر'' طور سینا'' تک نہیں پہنچ سکے ۔ گویا فرنگیوں نے عقل وخرد کے بل بوتے پر مادی ترقی تو بہت کی ہے ۔مگر عشق سے لاتعلقی کی بناء پر'' حسن

(۱) زبور عجم۔ ۶۳۔ (۲) ضرب کلیم ۔۳۶۔ (۳) بانگ درا ۔۷۰۔ (۴) بال جبریل ۔۵۔ (۵) زبور عجم۔ ۲۔ (۶) زبور عجم۔ ۶۱۔

مطلق'' کی تجلی سے بے نصیب رہے۔

از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ جگر بحر شگافید و بہ سینا نرسید (۱)

معروضی و موضوعی دانائے فرنگ کو دل بیدار تو عطا نہیں ہوا۔ اتنا ہے کہ اسے دیکھنے والی آنکھ مل گئی ہے۔ اس ظاہری آنکھ سے وہ موجودات و محسوسات میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ اگر وہ دل کی آنکھ رکھتا تو حقیقت تک پہنچ سکتا۔ تجزیاتی و موضوعی فلسفی کے ہاں عشق ناپید ہے اور خرد اسے سانپ کی مانند ڈس رہی ہے۔ حالانکہ وہ جام زریں میں شراب ارغواں رکھتا ہے مگر یہ شراب، شراب معرفت نہیں۔ یہ جسمانی و بدنی شراب جسم کو بدمست تو کرتی ہے مگر روح کو وجد میں نہیں لا سکتی۔ یورپ کے فلافسر اپنی کور ذوقی کی تلافی یوں کرتے ہیں کہ حرام شراب کو سرخ جام میں ڈال کر اس کی رنگت بڑھا دیتے ہیں۔

کند تلافیٔ ذوق آں چناں حکیم فرنگ فروغ بادہ فزوں تر کند بجام عقیق (۲)

چنانچہ اقبال کہتے ہیں، ان تجزیاتی اور تصوراتی دانایان فرنگ کو چاہیئے کہ میری شراب عشق کی تلچھٹ سے فیضیاب ہوں، کیوں کہ اب میکدوں میں کوئی ایسا پیر مرد باقی نہیں جو میری طرح، تند و تیز شراب معرفت رکھتا ہو میرا دل سراپا عشق ہے۔ اس لئے عشق نے بذات خود میرے دل سے تڑپنے کے انداز سیکھے ہیں۔ بلکہ یہ میرے دل ہی کا شرر ہے، جو بھڑکا تو پروانے تک پہنچ گیا اور پروانہ شمع کے حسن کی لو میں لو بن گیا۔ یعنی عشق کے بغیر پروانہ شمع تک نہیں پہنچ سکتا اور انسان ''حسن مطلق'' تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

دل بیدار نداند بہ دانائے فرنگ ایں قدر ہست کہ چشم نگرانے دارد
عشق ناپید و خردمی گزدش صورت مار گرچہ درکاسہء زر لعل روانے دارد
دودِ من گیر کہ درمیکدہ ہا پیدا نیست پیرِ مردے کہ مئے تندو جوانے دارد!
عشق اندازِ تپیدن زدلِ ما آموخت شرر ماست کہ برجست بہ پروانہ رسید (۳)

یہی وجہ ہے کہ اقبال بجا فرماتے ہیں، پس میرے سوز و گداز کی بدولت مشرقیوں نے ''ذوق جمال'' میں ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ میری پیروی میں اہل مشرق فلسفے کے ''نظریہ جمال'' سے بیزار ہو کر عشق کے ''ذوق جمال'' کی طرف کھنچے لگے ہیں۔ اسی لئے اب تجزیاتی و تصوراتی فلسفے کا بت پاش پاش کر دیا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں عشق و مستی کے طفیل خاک

(۱) زبورِ عجم۔ ۹۰۔ (۲) زبورِ عجم۔ ۱۱۳۔ (۳) زبورِ عجم۔ ۹۰۔۹۱۔

راہ کے ذرے بھی لذت نظارہ لئے ، دل بن کر شرر کی مانند اٹھے ہیں تا کہ ''حسن مطلق'' کا دیدار کر سکیں ۔ ان کا ذوق وشوق دیدنی ہے ۔

بیا کہ خاوریاں نقش تازہ بستند   دگرمر و بطواف بت کہ بشکستند
چہ جلوہ ایست کہ دلہا بلذت نگہے   زخاکِ راہ، مثال شرارہ برجستند! (۱)

گویا کہ عشق و فلسفے کی اس کشمکش میں اقبال تجزیاتی وتصوراتی فلسفیوں سے بالکل متاثر نہیں ہوتے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خلوص نیت اور صدق دل کے ساتھ کیا خوب فرماتے ہیں :۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ   سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

مغربی فلسفہ وفلسفی اقبال کو ہرگز متاثر نہ کر سکے ۔ صاف ظاہر ہے کہ زاغ و زغن اور کرگس کی طرح پرواز کرنے اور لنگڑا لنگڑا کر چلنے والی عقل و فلسفہ، شاہین بساں بلند بال عشق کے مقابلے میں اقبال جیسے عاشق و مرد فقیر کے شایان شان نہیں ۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال نے متعدد جگہ عقل و خرد اور فلسفے سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کرتے ہوئے ،عشق سے پختہ و گہرا تعلق جوڑنے کا اعتراف کیا ہے ۔ تا کہ '' ایمان بالظاہر'' کی بجائے ''ایمان بالغیب'' کو اپنایا جا سکے ۔ خاک مدینہ و نجف سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اقبال فلسفہ کی بجائے آنحضورؐ کے غلام ہیں ۔ اور اپنے آپ کو نبی آخر زمان کی غلامی ہی میں آزاد سمجھتے ہیں ۔ کیوں کہ اقبال عاشق ہیں اور حضورؐ کی ذات گرامی عشق کا سرچشمہ ہے ۔ اس لئے اقبال کے کلام کا ایک بہت بڑا حصہ نعتیہ شاعری پر مشتمل ہے جس سے عشق و معرفت کی مستانہ وار شعاعیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں ۔

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست   بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست
ہر کہ حرفے لا الہ از برکند   عالمے را گم بخویش اندر کند (۲)
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست   اگر بہ او نرسیدی تمام بو لہبی است!
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ   ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب! (۳)
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا   عشق تمام مصطفیٰ ! عقل تمام بولہب! (۴)
تری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے   عقل غیاب و جستجو ! عشق حضور و اضطراب! (۵)

---

(۱) زبور عجم ۔ ۱۰۹ ۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۷۳ ۔ (۳) بال جبریل ۔ ۱۱۳ ۔ ''ذوق وشوق'' ۔ (۴) بال جبریل ۔ ۱۱۴ ۔
(۵) بال جبریل ۔ ''ذوق وشوق''

آیہ ء کائنات کا معنیء دیریاب تو | نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو (۱)
تجھ سے گریباں مرا مطلع صبح نشور | تجھ سے مرے سینے میں آتش اللہ ھو!
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ | تو ہی مری آرزو ، تو ہی مری جستجو!
پاس اگر تو نہیں ، شہر ہے ویراں تمام | تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو!
پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر ، کہ میں | ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو! (۲)
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول ، وہی آخر | وہی قرآں ،وہی فرقاں ، وہی یسٰیں ، وہی طاہا (۳)

پھر کہتے ہیں شہسوار ﷺ! ایک لمحے کے لئے اپنے گھوڑے کو روکیئے ۔ الفاظ آسانی سے میری زبان پر نہیں آرہے ۔ کائنات آپ ﷺ کے حریم ناز کا طواف کرتی ہے ۔ میں آپ ﷺ کی ایک نگاہ التفات کا بھکاری ہوں ۔ میرا ذکر و فکر و علم و عرفان آپ ﷺ ہی ہیں میری کشتی بھی آپ ﷺ ہیں ۔ دریا بھی اور طوفان بھی ۔ میں ایک زار و زبوں و ناتواں آہو ہوں ۔ دنیا میں مجھے کسی نے اپنے فتراک میں نہیں باندھا۔ میں اس امید پر آپ ﷺ کی طرف دوڑتا چلا آرہا ہوں ۔ کہ آپ ﷺ کے کوچے کے حریم میں مجھے پناہ مل جائے ۔

شہسوار ا! یک نفس درکش عناں | حرف من آساں نیاید بر زباں
گرد تو گردد حریم کائنات | از تو خواہم یک نگاہ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی | کشتی و دریا و طوفانم توئی
آہوئے زار و زبون و ناتواں | کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں

اے پناہ من حریم کوے تو
من بامیدے رمیدم سوے تو (۴)

گناہگاروں پر آپ ﷺ کی شفقت زیادہ ہوتی ہے ۔ اور خطائیں معاف کرتے ہیں۔ آپؐ کی شفقت ماں کی شفقت کی مانند ہے ۔میرا مقابلہ رات کے پرستاروں سے ہے ۔ میرے چراغ میں اور تیل ڈال دیجئے ۔ آپ ﷺ کا وجود مبارک جہاں کے لئے نو بہار ہے ۔ اپنے ''عکس جمال'' سے مجھے محروم نہ رکھیئے ۔ آپ جانتے ہیں کہ بدن کی قدر جان سے

(۱) بال جبریل ۔۱۱۴۔ ''ذوق وشوق''۔ (۲) بال جبریل۔ ۹۱۔۹۲۔ (۳) بال جبریل ۔ ۲۵۔ (۴) پس چہ باید کرد۔ ۵۰۔

ہے اور جان کی قدر محبوب کے عکس جمال سے ہے ۔ چونکہ میں غیر اللہ سے کوئی امید نہیں رکھتا ۔ اس لئے مجھے یا شمشیر بنا دیجئے ۔ یا کلید ۔ میرا فکر دین کے فہم میں تیز اور چست ہے ۔ مگر میری خاک بدن سے عمل کا بیج نہیں پھوٹا ۔ میرے شیشے کو اور تیز کر دیجئے کیونکہ مجھے فرہاد سے زیادہ محنت درپیش ہے ۔ میں صاحب ایمان ہوں ۔ کافر نہیں ہوں ۔ مجھے سان پر لگائیے ۔ میں اصل فولاد کی شمشیر ہوں ۔ اگر چہ میری عمر کی کھیتی بے حاصل ہے مگر میں ایک چھوٹی سی چیز رکھتا ہوں ، جس کا نام دل ہے ۔ میں نے اسے لوگوں کی نظر سے پنہاں رکھا ہوا ہے ۔ کیوں کہ اس پر آپ ﷺ کے اسپ مشکیں کے سم کا نشان ہے ۔

مہر تو برعاصیاں افزوں تراست ۔۔۔ درخطابخشی چوں مہر مادر است

باپرستاران شب دارم ستیز ۔۔۔ بازروغن درچراغ من بریز

اے وجود تو جہاں را نو بہار ۔۔۔ پر تو خود را دریغ از من مدار

خود بدانی قدر تن از جاں بود ۔۔۔ قدر جاں از پر تو جاناں بود ۔۔۔ رومی

تاز غیر اللہ ندارم ، ہیچ امید ۔۔۔ یا مرا شمشیر گرداں یا کلید

فکر من درفہم دیں چالاک و چست ۔۔۔ تخم کردارے زخاک من نہ رست

گرچہ کشت عمر من بے حاصل است ۔۔۔ چیز کے دارم کہ نام او دل است

دارمش پوشیدہ از چشم جہاں ۔۔۔ کزسم شبدیز تو دارد نشاں! ۔۔۔ (۱)

علاوہ ازیں اقبال کا عشق رسولؐ یہ بھی کہتا ہے کہ چاند سورج کی گردش لا الہ ہی سے ہے ۔ کوہ و کاہ میں بھی میں نے اسی کا سوز دیکھا ہے ۔ لا الہ کے دو حروف محض گفتار نہیں ، بلکہ تیغ بے زنہار ہیں ۔ لا الہ کے ساتھ جینا قہاری ہے ۔ لا الہ محض ضرب نہیں ، بلکہ ضرب کاری ہے ۔

مہر و ماہ گردد زسوز لا الہ ۔۔۔ دیدہ ام این سوزرا درکوہ و کہ!

ایں دو حرف لا الہ گفتار نیست ۔۔۔ لا الہ جز تیغ بے زنہار نیست!

زیستن باسوز او قہاری است

لاالہ ضرب است و ضرب کاری است! ۔۔۔ (۲)

---

(۱) پس چہ باید کرد ۔ ۵۱ ۔ ۵۲ ۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۱۹۹ ۔ ۲۰۰ ۔

لا کے جنوں سے ہر گریباں چاک نہیں ۔ ہر خاشاک اس شعلے کے لائق نہیں ۔ اس کا جذبہ ایک زندہ مرد کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہ سینکڑوں راہ نشینوں کو، منزل کی طرف گامزن کر دیتا ہے ۔ جس شخص کے جگر میں اس کا سوز ہوگا اس کی ہیبت قیامت کی ہیبت سے بڑھ کر ہوگی۔

از جنونش ہر گریباں چاک نیست　　درخور ایں شعلہ ہر خاشاک نیست
جذبہء او دردل یک زندہ مرد　　می کند صدرہ نشیں رارہ نورد
ہر کرا ایں سوز باشددر جگر　　ہولش از ہول قیامت بیشتر　　(۱)

جنگ میں آپؐ کا انداز تکبیر، صلوات کی سطوت اور سورۃ الصّٰفّٰت (جس میں نمازیوں کی صف بندی اور یلغار کا ذکر ہے) کی قراءت کا مظہر تھا ۔ تیغ ایوبی ہو یا نگاہ بایزید جو دونوں جہانوں کے خزانوں کی کنجیاں ہیں ۔ ایک جام مے سے عقل و دل دونوں کو سرمست کر دینا، روم ورے کے ذکر وفکر کا اختلاط ۔ علم وحکمت شرع و دین، معاملات کا انتظام، سینوں کے اندر دلوں کی ناصبوری ۔ الحمرا و تاج کا حسن عالم سوز جو فرشتو ں سے بھی خراج تحسین وصول کرتا ہے ۔ یہ سب کچھ حضورؐ کے اوقات میں سے ایک لمحہ اور آپؐ کی تجلیات میں سے ایک تجلی ہے ۔ یہ دلفروز جلوئے آپؐ کی عظمت کا ظاہری پہلو ہیں ۔ آپؐ کی شخصیت عظیمہ کا باطن ابھی تک عارفوں سے پنہاں ہے ۔ جناب رسول پاکؐ بے حد تعریف کے مستحق ہیں ۔ کیونکہ آپؐ کی وجہ سے مشت خاک، یعنی انسان کو دولت ایمان نصیب ہوئی ۔

سطوت بانگ صلوات اندر نبرد　　قراء ت الصّٰفّٰت اندرنبرد
تیغ ایوبی نگاہ بایزید　　گنجہائے ہر دو عالم را کلید
عقل و دل را مستی از یک جام مے　　اختلاط ذکر و فکرِ روم ورے
علم و حکمت ، شرع و دیں ، نظم امور　　اندرون سینہ دل ہا ناصبور
حسن عالم سوز الحمرا و تاج　　آنکہ از قدوسیاں گیرد خراج
ایں ہمہ یک لحظہ از اوقات اوست　　یک تجلی از تجلیات اوست
ظاہرش ایں جلوہ ہائے دلفروز　　باطنش ازعارفاں پنہاں ہنوز　　(۲)

---

(۱) پس چہ باید کرد۔ ۱۷۔　(۲) ایضاً۔ ۴۰۔

حمد بیحد مر رسولؐ پاک را
آں کہ ایماں داد مشت خاک را[1]

(یہ شعر خواجہ عطار کا ہے۔ یہاں بتغیر لفظی)

معلوم نہیں دل کس کا جلوہ دیکھ کر مرمٹا ہے۔ کہ اس کے نصیب میں لمحہ بھر کا چین نہیں ہے۔ میں اسے صحرا میں لے گیا مگر وہاں اور زیادہ افسردہ ہوگیا۔ ندی کے کنارے وہ زار و قطار رویا۔ یہ سب حضورؐ کے عشق میں ہے۔

ندانم دل شہید جلوۂ کیست نصیب او قرار یک نفس نیست
بصحرا بردمش ، افسردہ تر گشت کنار آبجوے زار بگریست (۱)

اس کے بعد اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ، میری آنکھ میں نگاہ آپ ﷺ کی بدولت ہے، میرے قلب میں لا الہ کا نور آپ ﷺ کی عنایت سے ہے۔ آپ ﷺ ہی نے میری رات کو چاندنی عطا فرمائی ہے۔ اب مجھے اپنے دیدار کی صبح سے بھی مشرف فرمائیے!

بچشم من نگہ آوردۂ تست فروغ لا الہ آوردۂ تست
دو چار م کن بہ صبح من رآنیء شبنم را تاب مہ آوردۂ تست! (۲)

حقیقت کے بارے میں دنیا جہاں کے فلسفی سوچ بچار کرتے رہے مگر کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ الٹا کسی نے تصوریت و موضوعیت اور کسی نے معروضیت و تجزے کے بت گھڑ لئے۔ مگر حضورؐ کے طفیل سے کلمہ طیبہ کی صورت میں ''حسن ازل'' کے بارے میں مکمل و اکمل نشاندہی کی گئی ہے، جسے علامہ محمد اقبالؒ نے ایسے عاشقانہ لب و لہجے میں بیان کیا ہے کہ تجزیاتی و تصوراتی فلسفے کو لاجواب کر کے رکھ دیا ہے۔

خودی کا سرنہاں لا الہ الا اللہ خودی ہے تیغ فساں ، لا الہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں ، لا الہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاع غرور کا سودا فریب سودو زیاں ! لا الہ الا اللہ
یہ مال و دولت دنیا ، یہ رشتہ و پیوند بتان و ہم و گماں ! لا الہ الا اللہ

(۱) ارمغان حجاز۔ ۴۴۔ (۲) ایضاً۔ ۵۲۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند   بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ   (۱)

یعنی کہ بے شک :۔

تاعصائے لا الہ داری بدست   ہر طلسم خوف را خواہی شکست   (۲)

پس سبھی کچھ "لا الہ" ہے ، اس لئے جس کے ہاتھ میں "لا" کی تلوار ہے وہ ساری موجودات کا فرمانروا و شناسا ہے ۔گویا کہ اسے "حقیقت" کی شناخت ہے ۔

ہر کہ اندر دست او شمشیر لاست   جملہ موجودات را فرمانرواست   (۳)

یہی وجہ ہے کہ اقبال نہ تو یورپی فلسفیوں ومنطقیوں سے متاثر ہیں ۔ اور نہ مشرق کے فلاسفہ و اہل منطق انہیں مرعوب کر سکے ۔ بلکہ اقبال عاشق ہیں اور عاشقوں میں سب سے پہلے حضورؐ کی غلامی کا دم بھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے جو کچھ پایا آپؐ ہی کے فیض اور نظر کرم کا رہین منت ہے ۔

دارم اندر سینہ نور لاالہ   در شراب من سرور لا الہ

فکر من گردوں مسیر از فیض او   جوئے ساحل ناپذیر از فیض او

اس لئے :۔

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے   لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب   (۴)

اقبال آپﷺ کی ذات بابرکات سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ دنیاجہاں کے کسی فلسفے اور فلسفی کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ حضورﷺ کی تعلیمات ہی کو اپنے لئے مشعل راہ سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:۔

میں کیا کہوں کہ آپؐ کی محبت کیا ہے ۔ آپؐ کے فراق میں خشک لکڑی (حنانہ کا ستون) رونے لگی ۔ مسلمان کا وجود آپؐ کی تجلیات سے عبارت ہے ۔ آپؐ کی گرد راہ سے کئی طور پیدا ہوتے ہیں ۔ آپؐ کے آئینہ قلب نے مجھے وجود بخشا ۔ میری صبح آپؐ کے سینے کے آفتاب کی مرہون منت ہے ۔ پیہم تڑپ ہی میرے لئے تسکین کا باعث ہے ۔ میری شام صبح محشر سے بھی زیادہ گرم ہے ۔ آپؐ ابر بہار ہیں اور میں آپؐ کا باغ ہوں ۔ میرے تاکستان کی طراوٹ آپ کی باران رحمت سے ہے۔ میں نے محبت کی کھیتی میں نگاہ شوق بوئی اور نظارہ جمال کی صورت میں پیداوار حاصل کی ۔ مدینہ منورہ کی خاک

---

(۱) ضرب کلیم۔ ۱۵۔ ۱۶۔ (۲) اسرار خودی ۔ ۴۲۔ (۳) پس چہ باید کرد۔ ۱۸۔ (۴) بال جبریل ۔ ۱۰۰۔

دونوں جہانوں سے پیاری ہے۔ کیا ٹھنڈک پہنچانے والا ہے وہ شہر جہاں محبوب آرام فرما ہے۔

من چہ گویم از تولائش کہ چیست خشک چوبے در فراق او گریست
ہستی مسلم تجلی گاہ او! طور ہابالد زگرد راہ تو
پیکرم را آفرید آئینہ اش صبح من از آفتاب سینہ اش
درتپید دمبدم آرام من گرم تر از صبح محشر شام من
ابر آذار است و من دبستان او تاک من نمناک از باران او
خاک یثرب ازدوعالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبراست (۱)

آپ ﷺ کے نور سے اپنی نگاہ کے لیے روشنی حاصل کر رہا ہوں تا کہ مہر و ماہ کا اندرون دیکھ سکوں۔ جب کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ کیوں کہ میں لا الہ کی مشکلات کو جانتا ہوں۔

بنورِ تو برافروزم نگہ را کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چہ میگویم مسلمانم، بلرزم کہ دانم مشکلاتِ لا الہ را (۲)

گویا کہ اقبال تجزیاتی و تصوراتی فلسفیوں کی بجائے حضور ﷺ سے ایسی نگاہِ عشق حاصل کرتے ہیں جو مہر و ماہ کے پردوں کے پیچھے، تخلیق فرما حقیقت کو دیکھ لیتی ہے۔ نہ میں ملا کے پاس بیٹھا نہ صوفی کے پاس۔ آپ جانتے ہیں کہ نہ میں ان سے ہوں، نہ ان سے۔ میرے دل کی تختی پر لفظ اللہ رقم فرما دیں تا کہ میں خود کو اپنے آپ سے بے حجاب دیکھ لوں اور اللہ تعالیٰ کو بھی۔ یہاں بھی اقبال مغربی حکماء کے ذریعے نہیں بلکہ حضور ﷺ کے طفیل ''حسن مطلق'' کی معرفت حاصل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

نہ باملا نہ با صوفی نشینم تو میدانی کہ من آنم، نہ اینم
نویس 'اللہ' بر لوحِ دلِ من کہ ہم خود را ہم اورا فاش بینم (۳)

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ علامہ محمد اقبال قرآن پاک سے بے حد متاثر تھے۔ سحر خیزی، نماز تہجد اور تلاوت کلام

(۱) اسرار خودی۔۲۱۔ (۲) ارمغانِ حجاز۔ ۵۹۔ (۳) ارمغانِ حجاز۔ ۴۸۔

پاک روزانہ کا معمول تھا۔ تلاوت کلام کرتے ہوئے روتے روتے آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ اور پھر جس ہستیؐ پر قرآن پاک نازل ہوا تھا۔ اس سے عشق و عقیدت مندی اقبال کے ایمان کا ایک فطری نتیجہ ہے۔ اسی مناسبت سے تمام عاشقان رسولؐ سے بھی اقبال کو والہانہ محبت ہے۔ رحمت للعٰلمین اور نبی آخر الزماں ہونے کی وجہ سے اقبال کے ''ذوق جمال'' میں آپ کو اولیت حاصل ہے، کہ حضورؐ کی معرفت کے بغیر ''حسن مطلق'' کی معرفت ممکن نہیں۔

چنانچہ اقبال کہتے ہیں، تیرے دل کے اندر ایک محبوب نہاں ہے اگر نگاہ رکھتا ہے تو میں تجھے دکھاؤں اس سے محبت کرنے والے، محبوبوں سے زیادہ حسین، زیادہ خوش وضع اور پیارے ہو جاتے ہیں۔ اس سے محبت کرنے والے محبوب تر ہو جاتے ہیں۔ آپؐ کے عشق سے دل قوت پاتا ہے اور خاکی انسان کا رتبہ ثریا جتنا بلند ہو جاتا ہے۔ نجد کی خاک نے آپؐ کے فیض سے بلند رتبہ پایا اور افلاک تک پہنچ گئی۔ حضورؐ کا مقام ہمارے دل میں ہے۔ حضورؐ ہی کے نام سے ہماری آبرو ہے۔ طور آپؐ کے گھر کے غبار کی ایک موج ہے۔ آپؐ کا حجرہ مبارک کعبہ کے لئے بیت الحرم (حرمت والا گھر) ہے۔

ہست معشوقے نہاں اندر دلت　　چشم اگر داری، بیا، بنمائمت

عاشقان او زخوباں خوب تر　　خوشتر و زیبا تر و محبوب تر

دل زعشق او توانا میشود!　　خاک ہمدوش ثریا میشود

خاک نجد از فیض او چالاک شد　　آمد اندر وجد و بر افلاک شد

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است　　آبروے ما زنام مصطفیٰ است

طور موجے از غبار خانہ اش　　کعبہ رابیت الحرم کاشانہ است　　(۱)

پھر کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے پیغام کو سمجھ لے اور اللہ تعالیٰ کے سواء جتنے آقا ہیں ان سے فارغ ہو جا۔

از پیام مصطفیٰ آگاہ شو　　فارغ از ارباب دو ن اللہ شو　　(۲)

مصطفیٰ کا پیغام صرف اور صرف اسلام ہے۔ جس میں سارے بنی نوع انسان کی بہتری ہے۔ قبل از اسلام اہل ہند کفر کے زنار بند تھے۔ مگر حجازیوں نے کفر کو تہ و بالا کر کے اسلام کا بول بالا کر دیا۔ اقبال کہتے ہیں ہم اہل ہند کا آبائی مذہب کفر تھا جسے حجازیوں نے ختم کر دیا مگر ہم زبان پر حرف شکایت تک نہیں لائے۔ کیوں کہ ہمارا محبوبؐ عربی ہے۔

---

(۱) اسرار خودی۔ ۱۹۔　(۲) رموز بے خودی۔ ۱۶۱۔

متاعِ قافلۂ ما حجازیاں بروند ولے زباں نکشائی کہ یار ماعربیؔ است (۱)

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری (۲)

اگر چہ زادۂ ہندم ، فروغ چشم من است زخاک پاک بخاراو کابل و تبریز! (۳)

تنم گلے زخیابان جنت کشمیر دل از حریم حجاز و نوا زشیراز است (۴)

مرا اگر چہ بہ بتخانہ پرورش دادند چکید از لب من آنچہ دردل حرم است! (۵)

مطلب یہ کہ:۔

مرا ساز اگر چہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا

وہ شہید ذوق و فا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی (۶)

اسلامی تعلیمات اور عشق رسول کی بناء پر علامہ محمد اقبال ہر اس شخص سے بھی متاثر ہیں ۔جس نے عشق رسولؐ کا دم بھرا ہو ۔ اس سلسلے میں مولانا جلال الدین رومیؒ سرفہرست ہیں ۔ علامہ اقبال مغربی فلسفیوں کی بجائے پیر رومی کو اپنا پیر سمجھتے ہیں ۔ اس لئے کہ رومیؒ عاشق رسولؐ اور عاشق ذات باری تعالیٰ ہیں ۔ اسی ناطے سے اقبال نے مولانا سے بے پناہ فیض اٹھایا ہے ۔ رومی ۱۲۰۷ء کو بلخ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۷ کو قونیہ میں وصال پایا ۔ صاف ظاہر ہے اس زمانی بعد کی بناء پر اقبال اپنے پیر سے بہ نفس نفیس کبھی نہ ملے ۔مگر عشق و مستی میں زمانی و مکانی فاصلے کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔ اقبال نے عشق و مستی سے سرشار تعلیمات رومیؒ سے روحانی فیض اٹھایا ،جس کا اعتراف وہ اس طرح کرتے ہیں ۔

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش لاکھ حکیم سر بجیب ، ایک کلیم سربکف

اک دانش نورانی ، اک دانش برہانی ہے دانش برہانی ، حیرت کی فراوانی! (۷)

فلسفی سر بگریباں رہتے ہیں ، جبکہ عاشق ''سربکف''۔اقبال نے ''سر بجیب'' رہنے کی بجائے سربکف رہنما پسند کیا ۔ اس لئے کہ مولانا روم ہی کے نزدیک فرعون بھی فلسفی تھا ۔جس نے خدا کو ماننے کی بجائے اپنی خدائی کا دعویٰ کر دیا ۔

عقلِ فرعون ذکی فیلسوف کورگشت از تونیابید او وقوف (۸)

لیکن مرنے کے بعد اقبال لینن کی طرح فرعون کو بھی گمراہی پر پشیمان دکھاتے ہیں اور فرعون یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا

---

(۱) پیامِ مشرق۔ ۱۶۵۔ (۲) بانگِ درا۔ ۱۷۰۔ ''شکوے کا آخری شعر''۔ (۳) پیامِ مشرق۔ ۱۲۹۔ (۴) ایضاً۔ ۱۷۸۔
(۵) زبورِ عجم۔ ۸۸۔ (۶) بانگِ درا۔۲۸۲ ۔ (۷) بالِ جبریل۔۱۹۔ (۸) مثنوی معنوی مولوی۔۲۵۳۔''دفتر دوم''۔

ہے کہ اگر میں ''کلیم اللہ'' کو پھر دیکھوں تو اس سے ایک دل آگاہ یعنی عشق میں پڑ رہ دل کی التماس کروں۔

بازاگر بینم کلیم اللہ را خواہم از وے یک دل آگاہ را (۱)

اقبال اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ عشق نے ہر معرکہ مارا ہے۔ نمرود کی عقل و خرد اور فلسفے کے مقابلے میں صدق خلیل بے خطر بازی لے گیا اور بھڑکتی ہوئی آتش نمرود گل و گلزار بن گئی۔ عقل و فلسفہ اور سائنسی علم تو یہ نہیں مانتا کہ آگ پھولوں میں کیسے تبدیل ہوگئی؟ مگر قوت عشق نے آگ کو معطر پھولوں میں بدل دیا۔

کشت جاں شعلوں کے پھولوں سے مہکتی جائے اپنے جلووں میں مری راکھ جلانے آئے (فقری)

اقبال کو عشق کی یہ ادائے دلیرانہ و دلبرانہ بہت محبوب ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں مشکلات ہی سے عشق کرنا اچھا ہے خلیل اللہ کی طرح شعلے سے پھول چننا ہی اچھا لگتا ہے۔

عشق باردشوار ورزیدن خوش است چوں خلیل ازشعلہ گل چیدن خوش است (۲)

اسی طرح عشق کلیم کی صورت میں سربکف ہوکر ''حسن مطلق'' سے گفتگو بھی کرسکتا ہے۔ عشق ید بیضا ہے اور اقبال بھی سربکف ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ:۔

چراغ خویش برافروختم کہ دست کلیم دریں زمانہ نہاں زیر آستیں کردند (۳)

طلسم علم حاضر را شکستم ربودم دانہ ودامش گسستم
خداداند کہ مانند براہیم برنار او چہ بے پروا نشستم! (۴)

مولانا جلال الدین رومی نے عشق کی جراءت رندانہ اور ہمیشہ سربکف رہنے کی سرشت مجاہدانہ کو بہت سراہا ہے۔ چنانچہ اقبال مولانا رومی سے فیضیاب ہوتے ہوئے مولانا کی اس ذرہ نوازی کا ذکر ایسے ایسے خوبصورت پیرایوں میں کرتے ہیں کہ پڑھنے سننے والا ششدر رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں بھی کلام اقبال سے ''حسن و جمال'' کے تبسم ریز اور کیف آمیز جلوے، جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

پیر رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد (۵)

راز معنی مرشد رومی کشود فکر من برآستانش درسجود (۶)

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۹۵۔ (۲) اسرار خودی۔ ۴۹۔ (۳) ضرب کلیم۔ ۱۲۶۔ (۴) ارمغان حجاز۔ ۵۲۔ (۵) اسرار خودی۔ ۹۔
(۶) زبور عجم۔ ۱۸۵۔

ہم خوگر محسوس ہیں ساحل کے خریدار　　اک بحر پرآشوب و پراسرار ہے رومی!
تو بھی ہے اسی قافلہء شوق میں اقبال!　　جس قافلہء شوق کا سالار ہے رومی
اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام؟　　کہتے ہیں چراغ رہ احرار ہے رومی　　(۱)

اقبال مولانا رومؒ سے اس قدر متاثر و فیض یاب ہوئے کہ ''جاوید نامہ'' میں رومی ہی کی معیت میں آسمانوں اور جنت الفردوس کی سیر کرتے ہیں اور رومی ہی کی رہنمائی و ہدایت کی روشنی میں اقبال جنت سے بھی آگے ''حسن مطلق'' کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں اور حوروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ۔ چنانچہ کہتے ہیں ۔

در تلاش جلوہ ہائے پے بہ پے　　طے کنم افلاک و می نالم چو نے!
ایں ہمہ از فیض مردے پاک زاد　　آنکہ سوز او بجان من فتاد!　　(۲)

علامہ محمد اقبال پیر رومی سے اس قدر متاثر ہیں کہ ان کی عظمت و بڑائی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ، میں پیر روم کے فیض سے ، اسرار علوم کے سر بستہ دفتر کھول دوں ۔ مولانا رومؒ کی جان کئی ''شعلوں'' کی سرمایہ دار ہے ۔ جبکہ ان کے سامنے میری چمک شرر کی مانند لمحہ بھر کی ہے ۔

باز بر خوانم زفیض پیر روم　　دفتر سر بستہء اسرار علوم
جان او از شعلہ ہا سر مایہ دار　　من فروغ یک نفس مثل شرار　　(۳)

بعد ازیں اقبال کہتے ہیں کہ مجھے ایک فرنگی دانا کے بہت سے راز یاد ہیں ۔ جو وہ ہست و نیست کے بارے میں بیان کیا کرتا تھا ۔ لیکن تجھے ان کی بجائے عجم کے ایک پیر مرد یعنی مولانا روم کے وہ حرف سناتا ہوں ، جو اس نے مجھ سے کہے تھے ۔

مرا یاد است از دانائے افرنگ　　بسا رازے کہ از بودم و عدم گفت
و لیکن باتو گویم ایں دو حرفے　　کہ بامن پیر مردے از عجم گفت　　(۴)

گویا کہ اقبال فرنگی فلسفی کے فلسفے کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے ۔ اس کے مقابلے میں پیر روم کے عاشقانہ و دلبرانہ اقوال پر عمل کرنا اور انہیں دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔ مولانا روم کی گفتار کے جواہر بیش بہا میں سے ایک یہ ہے کہ، سن!

---

(۱) بال جبریل ۔ ۱۴۸ ۔ ۱۴۹ ۔ ''یورپ سے ایک خط'' ۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۱۱۵ ۔ (۳) اسرار خودی ۔ ۸ ۔ (۴) ارمغان حجاز ۔ ۱۱۱ ۔

اے چند نامحرموں یعنی فرنگی پروفیسروں وفلسفیوں کے مارے ہوئے ۔ تو نے مغربی تعلیم کے ذریعے اپنے ایک دل کے لئے سینکڑوں تفکرات خرید لئے ہیں ۔ کسی اللہ والے کے پاس چند لمحے بیٹھنا ظاہری علوم کی نکتہ آفرینیوں سے کہیں بہتر ہے ۔

الا اے کشتۂ نامحرمے چند خریدی از پے یک دل غمے چند
زتاویلات ملایاں نکوتر نشستن باخود آگاہے دمے چند (۱)

گویا کہ مغربی فلسفیوں اور رومی کا مطالعہ کرنے کے بعد اقبال اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عشق ہی سب کچھ ہے فلسفیوں کی بجائے کسی ''صاحب دل'' کی صحبت اختیار کرنی چاہئے جو بدن کی مشت خاک کو اکسیر بنا دے ۔ چنانچہ اقبال نے رومی ہی سے روحانی فیض اٹھانا شروع کیا اور فیضاب ہونے کے بعد کہتے ہیں کہ، اس نے مجھ ناکارہ کی مشکلات حل کر دیں ، مجھ جیسے غبار راہ کو کیمیا بنا دیا ۔ اس پاکباز ''نے نواز'' کے نغموں نے مجھے عشق و مستی کی دولت سے مالا مال کر دیا ۔

گرہ از کار ایں ناکارہ وا کرد غبار رہگذر را کیمیا کرد
نے آں نے نواز پاکبازے مرا باعشق و مستی آشنا کرد (۲)

تو بھی میری طرح اپنے حلق میں وہی پرانی شراب انڈیل ، جس کا ایک جام سلطنت پرویز سے بڑھ کر ہے ۔ جلال الدین رومی کے اشعار حریم دل کی دیوار پر آویزاں کر لے ۔ تاکہ ان کی معنوی تجلیات سے ، میری طرح تیرا سینہ بھی جگمگا اٹھے ۔

بکام خود دگرآں کہنہ مے ریز کہ باجامش نیرزد ملک پرویز
زاشعار جلال الدین رومیؒ بہ دیوار حریم دل بیا ویز (۳)

رومی کا کلام سراپا درد و سوز محبت ہے ۔ اس کا وصول ہجر کا ترجمان ہے ۔ اس کے نغموں کی بدولت جمال عشق ، جلال کبریائی کی شان رکھتا ہے ۔

سراپا درد و سوز آشنائی وصال او زباں دان جدائی
جمال عشق گیرد از نے او نصیبے از جلال کبریائی (۴)

میں نے اسی کی چمک اور تپش سے حصہ پایا ہے ۔ اسی کے ستارے نے ، میری رات کو دن کی طرح روشن کر دیا

---

(۱) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۱۱۔ (۲) ارمغانِ حجاز ۔ ۷۶۔ (۳) ایضاً ۔ ۷۵۔ (۴) ایضاً ۔ ۷۶۔

ہے۔ اب بیابان حرم میں، اس غزال، یعنی اقبال کو دیکھ، اس کے لبوں پر شیر کی سی مسکراہٹ ہے۔ یہاں تک کہ:۔

مرشد رومی حکیم پاک زاد سرّ مرگ و زندگی بر ماکشاد (۱)

نصیبے بردم از تاب و تب او شبم مانند روز از کوکب او

غزالے در بیابان حرم بیں کہ ریزد خندۂ شیر از لب او (۲)

پھر کہتے ہیں دیکھ میں پیر روم کی صراحی سے وہ مئے سخن لایا ہوں۔ جو انگور کی شراب سے تیز تر ہے۔ مرشد رومی نے یہ کہہ کر ہماری منزل اللہ ہیں ہر طرح کے فلسفیانہ خس و خاشاک پر ایسا شعلہ عشق پھینکا ہے۔ جس نے انہیں جلا کر رکھ دیا ہے۔ یہاں بھی اقبال کا مطلب یہ ہے کہ عشق کے سامنے فلسفے کی کوئی حیثیت نہیں۔

بیا کہ من زُخم پیر روم آوردم مئے سخن کہ جواں تر بادۂ عنبی است (۳)

شعلہء درگیرزد برخس و خاشاک من مرشدرومی گفت ''منزل ما کبریا است'' (۴)

مولانا جلال الدین رومی چونکہ بہت بڑے عاشق رسول تھے۔ اور ان کی تعلیمات قرآن و حدیث کی روشنی میں ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال کس درجہ رومی سے متاثر ہوئے۔ علاوہ ازیں شیخ الکبیر ابن عربی، عبدالرحمٰن الجیلی، حکیم سنائی، خواجہ فرید الدین عطار، جامی،

کشتہء انداز ملا جامیم نظم و نثر او علاج خامیم (۵)

اس نے لبریز معانی شعر کہا۔ گویا حضورؐ کی تعریف میں موتی پر و دیئے کہ آپؐ کتاب کونین کا مقدمہ ہیں۔ سارا جہاں غلام ہے۔ صرف آپؐ آقا ہیں۔

شعرلب ریز معانی گفتہ است درثنائے خواجہؐ گوہرسفتہ است

''نسخہء کونین را دیباچہ اوست

جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست'' (۶)

بابا فرید الدین شکر گنج، منصور حلاج، حضرت داتا گنج بخش، حضرت میاں میر، حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، اور حضرت بو علی قلندر کے علاوہ ایسے سینکڑوں صوفیاء کرام ہیں۔ جن سے اقبال کو دلی عقیدت

---

(۱) پیام مشرق۔ ۲۰۔ (۲) ارمغان حجاز۔ ۷۶۔ (۳) پیام مشرق۔ ۱۶۵۔ (۴) پیام مشرق۔ ۱۷۱۔
(۵) اسرار خودی۔ ۲۱۔ (۶) ایضاً۔ ۲۱۔

اس لئے تھی کہ وہ سب اسلامی تعلیمات کے مبلغ اور عاشقان رسول اللہؐ تھے ۔ اقبال ان بزرگوں کی روحانی صحبت کو حسن مطلق تک رسائی کے لئے انتہائی موثر سمجھتے ہوئے کہتے ہیں ۔

عاشقی آموز و محبوبے طلب چشم نوحے ، قلب ایوبے طلب
کیمیا پیداکن از مشت گلے بوسہ زن برآستان کاملے (۱)

یہ وہی ہستیاں ہیں جن کے بارے میں اقبال نے کہا ۔سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں ۔ یا گوئٹے اور اپنے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

او زافرنگی جواناں مثل برق شعلہء من از دم پیران شرق (۲)

بہر حال یہ بات طے شدہ حقیقت ہے کہ اقبال کے ہاں ایک طرف حسن ہے اور دوسری عشق ۔ حسن عشق بن جانا چاہتا ہے اور عشق چاہتا ہے کہ وہ حسن بن جائے ۔ تو من شدی من تو شدی کے مصداق دونوں باہم شیروشکر ہو جانا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی حسن کا درجہ عشق سے اس لئے بلند ہے کہ حسن سے عشق کو ہے تحریک کمال ۔ اور عشق حسن کے لئے زیادہ مضطرب و بے قرار رہتا ہے ۔ اور یہ بھی طے شدہ ہے کہ حسن کو حاصل کرنے اور سمجھنے کا وسیلہ صرف اور صرف عشق ہی ہے ۔ عشق وہ تمنائے رفعت ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو ۔

حسن سے عاشق کا عشق قوت ارادی اور حسرت و آرزو کی صورت میں ڈھل کر بے چینی و بے قراری کی حدود پھلانگتے ہوئے مجسم دعا بن جاتا ہے ۔ چنانچہ یہی کیفیت جب اقبال پر طاری ہو جاتی ہے تو وہ بھی سراپا سوز و درد بن کر محبوب حقیقی کے حضور میں محو دعا ہو جاتے ہیں کہ ہم مفلسوں سے اپنا خوبصورت چہرہ نہ چھپایئے ۔ سلمانؓ و بلالؓ کا عشق ہمیں ارزاں فرمایئے ۔ اے اللہ مجھے وہ آنسو عطا فرمایئے جو دل کو روشن ، بے قرار ، مضطر اور بے چین رکھیں ۔ میں ان آنسوؤں کو باغ میں بوؤں اور ان سے ایسی آگ پیدا ہو جائے جو عبائے لالہ کو بھی مات کر دے ۔

از تہی دستاں رخ زیبا مپوش عشق سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش
یارب آں اشکے کہ باشد دلفروز بے قرار و مضطرب و آرام سوز
کارمش درباغ و روید آتشے از قبائے لالہ شوید آتشے (۳)

---

(۱) اسرار خودی ۔ ۱۸۔ (۲) پیام مشرق ۔ ۱۲۔ (۳) اسرار خودی ۔ ۷۲۔

یہ ساری بزم موجودات و کائنات ،" حسن مطلق" (اللہ تعالی) کی شہید ناز ہے ۔ صاف ظاہر ہے کہ اقبال تجزیاتی و تصوراتی فلسفیوں سے خطاب کر رہے ہیں کہ کائنات خالق حقیقی نے بنائی ہے ۔ اور کائنات کے ذرّے ذرّے کو اپنے خالق سے عشق ہے ۔ ہست و بود کی اس نہاد کے اندر نیاز مندی ہے ۔ یہ کائنات اپنے محبوب حقیقی کے حضور میں سجدۂ عشق بجا لاتی ہے ۔ اے فلسفی کیا تو صبح کے ماتھے پر مہر فلک تاب کی صورت میں سجدوں کا نشان نہیں دیکھتا ۔

شہید ناز او بزم وجود است　　　نیاز اندر نہاد ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہر فلک تاب　　　بسیمائے سحر داغ سجود است　(۱)

میں نے کلام اقبال کو چھان مارا ۔ جہاں بھی نظر پڑی عقل و فلسفے یا حکمت کے مقابلے میں اقبال نے عشق یعنی حکمت ذوقیہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ یوں لگتا ہے کہ انہیں حسن وعشق سے عشق ہے کہ عشق ہی "حسن مطلق" تک پہنچاتا ہے ۔ اس لئے کہتے ہیں ، میرا دل عشق سے روشن ہے ۔ اشک خونیں یعنی عشق نے میری آنکھ کو جہاں بیں بنا دیا ہے ۔ جو شخص عشق کو جنوں کہتا ہے ۔ اسے سر حیات سے ، یعنی حسن مطلق کے راز سے بیگانہ تر سمجھو ۔

عشق نے میرے دل کی آنکھ روشن کر دی ہے ، لہٰذا میں ظاہر و باطن کو آشکارا دیکھ سکتا ہوں ۔ عشق پاگل پن نہیں ۔ بلکہ مخفی اسرار اور حسن مطلق کی تڑپ عشق ہے ۔

دل من روشن از سوز دروں است　　　جہاں بیں چشم من از اشک خوں است
ز رمز زندگی بیگانہ تر باد　　　کسے کو عشق را گوید جنون است　(۲)

ہماری دنیا جس کا کوئی کنارہ نہیں ۔ زمانے کے سمندر میں مچھلی کی طرح غرق ہے ۔ لیکن ذرا اپنے دل پر نظر ڈال ۔ زمانے کا سمندر اس ایک جام میں سمایا ہوا ہے گویا کہ دل میں "حسن مطلق" اور اس کی تخلیقات و تجلیات سمیت سب کچھ موجود ہے ۔

جہان ما کہ پایانے ندارد　　　چو ماہی دریم ایام غرق است
یکے بردل نظر واکن کہ بینی　　　یم ایام دریک جام غرق است　(۳)

ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک کئی جہان ہیں ۔ جہاں بھی خرد پہنچی وہاں ایک آسمان موجود تھا۔ لیکن جب

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۲۵ ۔ "لالہ طور" ۔　(۲) پیام مشرق ۔ ۲۵ ۔　(۳) پیام مشرق ۔ ۲۷ ۔ "لالہ طور" ۔

میں نے اپنے اندر دیکھا تو میرے اندر ایک لامحدود جہان تھا۔ یعنی ''حسن و جمال'' کا ناپیدا کنار سلسلہ۔ گویا خرد کو ظاہر میں آسمان دکھائی دیتے ہیں۔ اور عشق دل کے آئینے میں ''حسن مطلق'' دیکھ لیتا ہے۔

خرد ہر جا کہ پرزد آسماں بود   زانجم تا بہ انجم صد جہاں بود

و لیکن چوں بخود نگریستم من   کران بیکراں درمن نہاں بود (۱)

اس سلسلے میں مزید کہتے ہیں کہ میری طرف سے اللہ تعالیٰ کے متلاشی اور حقیقت آشنا صوفیان باصفا سے کہو، میں ایسے خود پرست کی ہمت کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں، جو اپنی خودی کے نور سے اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے۔

زمن گو صوفیان باصفا را   خدا جویان معنی آشنا را

غلام ہمت آں خود پرستم   کہ بانور خودی بیند خدا را (۲)

انسان نغمۂ عشق کے لئے ساز کی حیثیت رکھتا ہے، گویا عشق کے نغمے انسان ہی کے دل میں پھوٹتے ہیں۔ یہ خالق حقیقی کا راز کھولتا ہے مگر خود بھی راز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں پیدا کیا یہ اسے خوب تر بناتا ہے اس طرح یہ خالق کا شریک کار ہے۔

نوائے عشق را ساز است آدم   کشاید راز و خود رازاست آدم

جہاں او آفرید، ایں خوب تر ساخت   مگر باایزد، انباز است آدم (۳)

اللہ تعالیٰ نے پانی اور مٹی سے یہ خوبصورت کائنات تخلیق کی۔ ایسا جہاں جو بہشت سے زیادہ خوبصورت ہے۔ مگر ساقیؐ جناب رسول پاکؐ نے اپنی آتش عشق سے میری خاک سے ایک نیا جہاں پیدا کر دیا ہے۔

زآب و گل خدا خوش پیکرے ساخت   جہانے از ارم زیبا ترے ساخت

ولے ساقی بآں آتش کہ دارد   زخاک من جہانے دیگرے ساخت (۴)

خدایا اس جہان میں کیا خوب ہنگامہ بپا ہے۔ آپ نے سب کو ایک ہی ''پیمانہ الست'' سے مست کر دیا ہے۔ نظر تو نظر سے مل جاتی ہے مگر دل دل اور روح روح سے الگ رہتی ہے۔ ہر روح یکتا ہے اور پھر قلب کے سوچنے کا انداز مختلف ہے۔

---

(۱) پیام مشرق۔ ۵۰۔ (۲) ایضاً۔ ۶۷۔ (۳) پیام مشرق۔ ۲۸۔ (۴) پیام مشرق۔ ۳۰۔

جہاں یا رب چہ خوش ہنگامہ دارد ہمہ رامست یک پیمانہ کر دی
نگہ را بانگہ آمیز دادی دل از دل ، جاں زجاں بیگانہ کر دی (۱)

اقبال پھر کہتے ہیں کہ اے تجزیاتی فلسفی اور میرے عام قاری ، اگر تیری جان شہید جستجو نہیں ہے تو میرے باغ کی سیر میں صرف اپنا نقصان ہی دیکھے گا ۔ میں تو جو کچھ رگ گل کے اندر ہے وہ دکھاتا ہوں ۔ میری بہار ، رنگ و بو کا طلسم نہیں ہے ۔ جو کہ موضوعی تصوراتیوں کا نظریہ ہے ۔ اور نہ میں تجزیاتیوں کی طرح صرف ظاہر کی بات کرتا ہوں ۔ بلکہ عشق یا وحدت جمال کا پیامبر ہوں ۔

زیاں بینی زسیر بو ستانم اگر جانت شہید جستجو نیست
نمایم آنچہ ہست اندر رگ گل بہار من طلسم رنگ و بونیست (۲)

یہ فیضانِ عشق ہے کہ میں شاخ گل کے اندر بھی دیکھ سکتا ہوں ۔ وہاں مجھے کلیاں بنتی نظر آتی ہیں ۔ لالہ کو پہاڑوں ، وادیوں اور میدانوں میں کھلنے سے روکا نہیں جا سکتا ۔ صاحب جستجو مرد وہ نغمہ بھی سن لیتا ہے ۔ جو ابھی مغنی کے گلے میں ہوتا ہے ۔

بردرون شاخ گل دارم نظر غنچہ ہارا دیدہ ام اندر سفر!
لالہ را دروادی و کوہ ودمن از دمیدن باز نتواں داشتن
بشنودد مردے کہ صاحب جستجو است نغمہ را کوہنوز اندر گلواست! (۳)

سکندر نے حضر سے کیا اچھی بات کہی ، بحر و بر کے سوز و ساز میں حصہ دار ہو ۔ تو اس جنگ کو کارزار حیات کے کنارے سے دیکھتا ہے ۔ کشمکش حیات میں جان دے کر زندہ تر ہو جا ۔ گویا شہید عشق کا رتبہ پا لینے سے حیات جاوداں حاصل ہوتی ہے ۔

سکندر با حضر خوش نکتہ گفت شریک سوز و ساز بحرو برشو
تو ایں جنگ از کنار عرصہ بینی بمیر اندر نبرد وزندہ ترشو (۴)

حسن مطلق کا عاشق ہونے کے باعث ، میں باغ کے پرندوں کی داستان بیان کرتا ہوں ۔ میں بے زبان کلیوں کی زبان ہوں ۔ جب میں مرجاؤں تو میری خاک کو باد صبح میں ملا دینا ۔ کیوں کہ مجھے پھولوں کے طواف کے سوا اور کوئی کام اس

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۳۵ ۔ (۲) ایضاً ۔ ۳۴ ۔ (۳) مثنوی مسافر ۔ ۷۰ ۔ (۴) پیام مشرق ۔ ۳۶ ۔ "لالہ طور" ۔

لئے نہیں کہ ان میں ''حسن مطلق'' کی جھلک نظر آتی ہے۔

بمرغان چمن ہمداستانم زبان غنچہ ہائے بے زبانم
چومیرم باصبا خاکم بیامیز کہ جز طوف گلاں کارے ندانم (۱)

''اقبال کا ذوق جمال'' اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے کہ معروضی و موضوعی اور تجزیاتی و تصوراتی فلسفے کے برعکس، اقبال وحدت جمال کے معتقد ہوتے ہوئے، محبوب حقیقی کے عاشق زار ہیں، اس لئے کہتے ہیں کہ تو سورج ہے اور میں تیرے گرد طواف کرنے والا سیارہ ہوں۔ تیرے نظارے سے میں بھی سراپا نور بن سکتا ہوں۔ مگر تجھ سے دور ہوں اور نامکمل ہوں۔ تو قرآن ہے اور میں تیرا سیپارہ ہوں۔ یعنی تیرا ہی ایک حصہ ہوں۔

تو خورشیدی و من سیارۂ تو سراپا نو رم از نظارۂ تو
زآغوش تو دورم ناتمامم تو قرآنی و من سیپارۂ تو (۲)

عاشق اور ''حسن مطلق'' کے باہمی تعلق و رشتے سے متعلق اقبال مزید کہتے ہیں کہ ہماری سانس اللہ تعالیٰ کے بحر بیکراں سے اٹھی ہوئی موج ہے۔ ہماری نے اور ہمارا نغمہ اسی کے دم سے ہے۔ یعنی ہماری سانسوں کا آنا جانا، اسی کا مرہون منت ہے۔ ہم ابد کی ندی کے کنارے سبزے کی مانند اگے ہیں۔ ہمارا رگ و ریشہ اسی نم ابدیت سے ہے۔

نفس آشفتہ موجے از یم اوست نےء ما نغمۂ ما از دم اوست
لب جوئے ابد چوں سبزۂ رستیم رگ ما، ریشۂ ما از نم اوست (۳)

اقبال کے نزدیک سبھی تخلیقات دریائے ابد کے کنارے پر ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں، اے غنچہ نورستہ، دل گرفتہ نہ ہو۔ اس باغ میں تو اور کیا چاہتا ہے۔ ندی کا کنارہ ہے، پھولوں کی بزم ہے، اڑتے ہوئے پرندے ہیں۔ صبا ہے، شبنم ہے، صبح کے گیت ہیں۔

مشو اے غنچۂ نورستہ دلگیر ازیں بستاں سرا دیگر چہ خواہی
لب جو، بزم گل، مرغ چمن سیر صبا، شبنم، نوائے صبحگاہی (۴)

تجزیاتی و تصوراتی فلسفیوں اور آب و گل کے اسیروں کی طرح میں اس دنیا کے محسوسات اور یہاں کی رات دن کا

---

(۱) پیام مشرق۔ ۴۸۔ (۲) پیام مشرق۔ ۴۸۔ ''لالہ طور''۔ (۳) ایضاً۔ ۵۱۔ ''لالہ طور''۔ (۴) ایضاً۔ ۴۷۔ ''لالہ طور''

زندانی نہیں ہوں ۔ گویا کہ میں عاشق ہوں اور موجودات و محسوسات کا اسیر نہیں ۔

دل من در طلسم خود اسیر است　　جہاں از پر تو او تاب گیر است
مپرس از صبح و شام زآفتا بے　　کہ پیش روزگار من پریر است　(۱)

اے محبوب حقیقی میرے ساز جان میں نوا آپ کے مضراب سے ہے ۔ آپ کس طرح میری جان کے اندر بھی ہیں اور باہر بھی ۔ میں چراغ ہوں ، آپ سے تعلق ہو تو میرے اندر روشنی پیدا ہو جاتی ہے ۔ آپ کے تعلق کے بغیر میری روشنی بجھ جاتی ہے ۔ اے وہ جس کی مثل کوئی نہیں ! تو میرے بغیر کیسے ہے ؟

نوادرساز جاں از زخمہ تو　　چساں در جانی و از جاں برونی؟
چراغم ، باتوسوزم ، بے تو میرم　　تو اے بیچون من بے من چگونی؟　(۲)

پھر کہتے ہیں آپ کے سینے میں تنہائی کا درد پیچ و تاب کھا رہا تھا ۔ چنانچہ آپ نے یہ جہان رنگ و بو تخلیق فرمایا ۔ اب ہمارے عشق بیباک سے ناگواری خاطر کیوں ۔ آپ نے خود یہ ہنگامہ پیدا کیا ہے ۔ گویا کہ تجزیاتیوں کے برخلاف اقبال یہاں بھی قادر مطلق کو خالق حقیقی اور موجودات و محسوسات کو تخلیق بالحق قرار دیتے ہیں ۔

ترا دردیکی درسینہ پیچد　　جہان رنگ و بو را آفریدی
دگر از عشق بیباکم چہ رنجی　　کہ خود ایں ہائے وہو را آفریدی　(۳)

اس جلوہ آرائی کے باوجود آپ پردے میں ہیں ، شاید ہماری نگاہ عشق کی تاب نہیں لا سکتے ۔ آپ کا عشق ہمارے خون کے اندر نشہ شراب کی مانند سرایت کئے ہوئے ہے ۔ مگر ہیں آپ بیگانہ خو بڑی دیر سے ملتے ہیں ۔

بچندیں جلوہ درزیر نقابی　　نگاہ شوق مارا برنتابی
دوی درخون ماچوں مستئی مے　　ولے بیگانہ خوئی ، دیریابی　(۴)

ہمارا یہ جہان جو صرف نقش ناتمام ہے ۔ جو صبح و شام کی تبدیلی کا اسیر ہے ۔ قضا کی سان اسے ہموار کرتی ہے ۔ ورنہ ابھی تک یہ مٹی کا پیکر نامکمل ہے ۔ گویا کہ جب یہ جہاں مکمل ہوگا ، حسن مطلق صاف ظاہر ہو جائے گا ۔

جہان ما کہ جز انگارۂ نیست　　اسیر انقلاب صبح و شام است

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۵۰ ۔　(۲) ایضاً ۔ ۵۱ ۔　(۳) پیام مشرق ۔ ۵۱ ۔　(۴) پیام مشرق ۔ ۵۴ ۔ "لالہ طور" ۔

زسوہان قضا ہموار گردد ہنوز ایں پیکر گل ناتمام است (۱)

قدم وحدوث کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ خودی یا حسن ازل کے آغاز کی کسی کو خبر نہیں۔ خودی ، ذات مطلق شام وسحر کے حلقے میں نہیں سماتی ۔ میں نے یہ نادر نکتہ حضر علیہ سے سنا ہے کہ بحر اپنی موج سے قدیم تر نہیں۔

زآغاز خودی کس را خبر نیست خودی درحلقهء شام و سحر نیست
زخضر ایں نکتهء نادر شنیدم کہ بحر از موج خود دیرینہ ترنیست (۲)

خودی "حسن مطلق" ہے اور حسن کہتا ہے کہ:۔

نہ بہ امروز اسیرم نہ بہ فردا نہ بہ دوش نہ نشیبے ، نہ فرازے ، نہ مقامے دارم (۳)

یعنی کہ:۔

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے! نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس ازل سے ابد تک دم یک نفس
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے نشیب و فراز و پس و پیش سے! (۴)

عاشق ایمان بالغیب رکھتا ہے ۔ وہ فلسفیوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے نور کی جائے پیدائش نہیں ڈھونڈتا ۔ حق تعالیٰ کے لباس کو تار و پود کی کیا ضرورت ہے؟

نور حق را کس نجوید زاد و بود خلعت حق راچہ حاجت تار و پود (۵)

دنیا کے ہر پست و بلند سے تپش حیات یعنی" حسن مطلق" ظاہر ہے ۔ کیا دامن کوہ ! کیا ٹیلے اور کیا صحرا ، ہر جگہ اسی کی کارفرمائی ہے ۔ حسن ازل صرف ہمارے ساتھ ہی نہیں ۔ نہ یہ ہماری وجہ سے ہے ۔ لیکن ہم ضرور اس کی وجہ سے ہیں ۔ حسن قدیمی ہر جگہ موجود ہے ، معلوم نہیں اس کا آغاز کہاں سے ہوا ؟

بہ بلند و پست عالم تپش حیات پیدا چہ دمن چہ تل چہ صحرا رم ایں غزالہ دیدم
نہ بہ ماست زندگانی! نہ زماست زندگانی!
ہمہ جاست زندگانی ! زکجاست زندگانی! (۶)

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۵۸ ۔ (۲) ایضاً ۔ ۶۰ ۔ (۳) پیام مشرق ۔ ۱۶۴ ۔ "غزل" (۴) بال جبریل ۔ ۱۲۷ ۔ ۱۲۸ ۔ "ساقی نامہ" ۔
(۵) رموز بیخودی ۔ ۱۶۳ ۔ (۶) زبور عجم ۔ ۱۳۲ ۔

جسے ہم قدیم اور محدث کہتے ہیں ۔ یہ ہمارے اعداد و شمار کا نتیجہ ہے ۔ یہ ہمارے تصور زماں کا کرشمہ ہے ۔ ہم ہر وقت گزشتہ و آئندہ دونوں کا شکار کرتے رہتے ہیں ۔ ہماری سوچ ماضی ، حال اور مستقبل سے وابستہ ہے ۔ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے جدا رکھنا ، تڑپنا اور مقصود تک نہ پہنچنا ہماری فطرت ہے ۔ نہ اس کے فراق سے ہماری قدر و قیمت کم ہوتی ہے نہ اسے ہمارے وصل کے بغیر قرار ہے ۔ نہ وہ ہمارے بغیر ، نہ ہم اس کے بغیر یہ کیا صورت حال ہے؟ ہمارا فراق ، فراق اندر وصال ہے ۔

قدیم و محدث ما ازشمار است — شمارِ ما طلسم روزگار است
دما دم دوش و فردا می شماریم — بہ ہست و بود و باشد کار داریم
ازوخود را بریدن فطرتِ ماست — تپیدن نارسیدن فطرت ماست
نہ مارا در فراق او عیارے — نہ اورا بے وصال ما قرارے
نہ او بے ما نہ ما بے او ! چہ حال است — فراق ما فراق اندر وصال است (۱)

گل رعنا بھی میری طرح مشکل میں ہے ۔ وہ بھی محفل کے جادو کا اسیر ہے ۔ اس کے پتوں کی زبان کو قوت گویائی عطا نہیں ہوئی ۔ مگر اس کے سینہ چاک کے اندر دل موجود ہے ۔ جو ''حسن مطلق'' کا گرویدہ ہے ۔ اگر یہ پھول بول سکتا تو اس کے پتوں کی ہر زباں سے ''اللہ ہو'' کا ورد جاری ہو جاتا ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں ۔ مگر ان کی زبان ہم نہیں سمجھ سکتے ۔

گل رعنا چومن درمشکلے ہست — گرفتار طلسم محفلے ہست
زبان برگ او گویا نکردند — ولے درسینہ چاکش دلے ہست (۲)

میں عاشق حسن مطلق ہوں ، تجزیاتی و تصوراتی فلسفی نہیں کہ گل و گلزار اور پرندوں کا مزاج نہ سمجھ سکوں ۔ عشق کا داغ جگردار لالہ خود رو اور باغ کے پرندے سبھی محبوب حقیقی کی شان میں خوش الحانی کررہے ہیں ۔ ''حسن مطلق'' کا عاشق ہونے کے باعث وہ پھول جو ابھی شاخ کے اندر ہوں میں ان کی خوشبو محسوس کر لیتا ہوں ۔ گویا کہ'' حسن مطلق'' اسی طرح پردوں میں نہاں ہے ، جس طرح کھلنے سے قبل پھول اپنی شاخ کے اندر پنہاں ہوتا ہے ۔ باغ کا پرندہ اور میں دونوں دوست ہیں ۔

---

(۱) زبور عجم ۔ ۱۵۷ ۔ (۲) پیام مشرق ۔ ۹۳ ۔

وہ اپنی زبان میں ''اللہ ہو'' کہتا ہے اور میں اپنی زبان میں ''اللہ ھو'' کا ورد کرتا رہتا ہوں ۔

مزاج لالہ خود روشناسم بشاخ اندر گلاں رابوشناسم
ازاں دارد مرا مرغ چمن دوست مقام نغمہ ہاے او شناسم (۱)

نئی پیدا ہونے والی کلی نے شبنم سے کہا، ہم چمن میں پیدا ہونے والوں کی نگاہ حقیقت تک نہیں پہنچتی ۔ تو جو آسماں سے ٹپکتی ہے تو ہمیں بتا کہ اس وسعت میں جہاں سینکڑوں سورج ہیں ۔ پست و بالا کا فرق ہے یا نہیں ۔

بہ شبنم غنچہ نورستہ می گفت نگاہ ما چمن زاداں رسانیست
دراں پہنا کہ صد خورشید دارد تمیز پست و بالا ہست یا نیست؟ (۲)
من زفلک افتادہ تو از خاک دمیدی از ذوق نمود است دمیدی کہ چکیدی
در شاخ تپیدی
صد پردہ دریدی (۳)

یعنی کیا حسن کے لئے پستی و بلندی ہے یا نہیں ۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے اقبال مکالماتی انداز اختیار کرتے ہیں اور شبنم کی زبانی یہ حقیقت ظاہر کرتے ہیں کہ زمین کو آسمان کی راز داں سمجھ ۔ مکاں کو لامکاں کے معنی کی شرح خیال کر ۔ ہر ذرہ منزل دوست ، گویا ''حسن مطلق'' کی جانب محو پرواز ہے ۔ تو راستے کے نشان ، ریگ رواں کے ذروں سے پوچھ، محبوب حقیقی کا پتہ بتا دیں گے ۔ اس لئے کہ ہر ذرہ ہے شہید کبریائی۔

زمیں را راز دان آسماں گیر مکاں را شرح رمز لامکاں گیر
پرد ہر ذرہ سوے منزلِ دوست نشان راہ از ریگ رواں گیر (۴)

گویا کہ :۔

غبار راہ کو بخشا گیا ہے ذوق جمال خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے؟ (۵)

جہان ہست و بود کا ضمیر، یعنی معنئ پنہاں تیرے سوائے اور کوئی نہیں ۔ صرف تو ہی اس بے نشاں، (اللہ تعالیٰ) کا نشان ہے ۔ راہ حیات میں دلیرانہ قدم رکھ ۔ اس جہاں کی وسعتوں میں تیرے سوا اور کوئی نہیں ۔

---

(۱) پیامِ مشرق ۔ ۶۳ ۔ ''لالہ طور'' ۔ (۲) ایضاً ۔ ۶۸ ۔ (۳) پیامِ مشرق ۔ ۱۲۰ ۔ (۴) ایضاً ۔ ۶۹ ۔ (۵) ارمغانِ حجاز ۔ ۲۵ ۔

ضمیر کن فکاں غیر از تو کس نیست　　نشان بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ دررہ زیست　　بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست　(۱)

یہاں تو ہے اور تیرا محبوب ہے اور بس!

اقبال مزید کہتے ہیں کہ عشق زودرس کے طفیل میرے سامنے یہ جہان رنگ و بو باقی نہیں ہے۔ نہ زمیں ہے، نہ آسماں، نہ چارسو۔ اے دل! تو اس جہان کے ہنگامے سے کنارہ کش ہوگیا ہے۔ یا جہاں (خود) تیرے خلوت آباد سے نکل گیا ہے۔ گویا عاشق مکاں سے لامکاں تک پہنچ گیا ہے۔ اس لئے کہ، رہتے ہیں زخود رفتہ جہاں، وہ ہے جہاں اور۔

زپیش من جہان رنگ و بو رفت　　زمین و آسمان و چار سورفت
تو رفتی اے دل از ہنگامہ او　　ویا از خلوت آبادِ تو اورفت؟　(۲)

پھر کہتے ہیں، میں پردۂ ساز (اسرار کائنات) سے تو آگاہ نہیں ہوں۔ مگر جانتا ہوں کہ نغمۂ حسن کیا ہے۔ میں نے درختوں پر بیٹھ کر اس طرح گیت گایا، کہ پھول باغ کے پرندے سے پوچھنے لگا کہ یہ کون ہے؟ اس کا راگ محبوب کے غم میں تمہارے راگ سے زیادہ پرسوز ہے۔ یعنی انسان عشق کرے تو سب سے زیادہ "حسن مطلق" کے قریب ہوتا ہے۔ انسان ہی نے حسن مطلق کے سربستہ راز کو فاش کیا ہے اور اس سے متعلق گفت وشنید کا آغاز کیا ہے۔

مرا از پردۂ ساز آگہی نیست　　ولے دانم نوائے زندگی چیست
سرودم آنچناں در شاخساراں　　گل از مرغ چمن پرسید کہ ایں کیست؟　(۳)
آں راز کہ پوشیدہ درسینہ ہستی بود　　از شوخی آب و گل درگفت و شنود آمد　(۴)
میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں　(۵)

اس چمن میں انسان کی عظمت کا گیت کس نے گایا اور یہ آواز کہاں سے آئی۔ جسے سن کر غنچہ احساس کمتری سے سربگریباں اور پھول کا چہرہ ندامت سے عرقناک ہے۔ یعنی انسان کی "نوائے شوق" نے حسن ازل کے ایسے راز افشا کئے کہ تمام موجودات حیران ہیں۔

---

(۱) پیام مشرق۔ ۶۹۔　(۲) ایضاً۔ ۷۰۔　(۳) پیام مشرق۔ ۷۱۔　(۴) ضرب کلیم۔ ۶۳۔　(۵) بال جبریل۔ ۵۔ "غزل"۔

دریں چمن کہ سرو د است و ایں نوا از کجاست؟
کہ غنچہ سربگریبان و گل عرقناک است! (۱)

اقبال کہتے ہیں، تجزیاتی فلاسفہ کے برعکس، مجھے نسیم کی مانند آزاد رو بنایا گیا ہے۔ میرے دل کو عشق سے پھول کی طرح صدچاک کیا گیا ہے۔ فلسفی انسانوں کی نگاہ تو ظاہر کو بھی پوری طرح نہیں دیکھ سکتی۔ مگر میری عاشقانہ نظر کو ''حسن مطلق'' (حقیقت) نے اپنے نظارے سے سرفراز فرمایا ہے۔

مرا مثل نسیم آوارہ کردند دلم مانند گل صد پارہ کردند
نگاہم را کہ پیدا ہم نہ بیند شہید لذت نظارہ کردند (۲)

کہتے ہیں، مجھے اپنی جان کی قسم! کہ روح ہی نے تن کو پیدا کیا ہے۔ نظارے کے شوق میں اس نے اس پھول کو دورو بنا دیا ہے۔ حواس بدنی ہی کے ذریعے اس دنیا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جان بے تاب کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر جب اس نے ایک رنگ اختیار کر لیا تو بدن بن گیا۔

بجان من کہ جاں نقش تن انگیخت ہوائے جلوہ ایں گل را دو روکرد
ہزاراں شیوہ دارد جان بیتاب بدن گردد چو بایک شیوہ خو کرد (۳)

رنگ و بو میں اٹکے ہوئے، اے ظاہر پرست تجزیاتی فلسفی! بے شک یہ جہان رنگ و بو اس قابل ہے کہ اسے سمجھا جائے۔ اس وادی میں بہت سے ایسے پھول ہیں۔ جو اس قابل ہیں کہ انہیں چن لیا جائے۔ لیکن تجھے اپنے اندرون سے آنکھ بند نہیں کرنی چاہیئے۔ تیرے اندر اور بھی قابل دید چیز موجود ہے۔ جسے ''حسن مطلق'' کہتے ہیں۔

جہان رنگ وبو فہمید نی ہست دریں وادی بسے گل چیدنی ہست
و لے چشم از درون خود نہ بندی کہ درجان تو چیزے دیدنی ہست (۴)

اس کے بعد اگلا قطعہ اقبال نے خالصتاً ''تجزیاتی اور تصوراتی فلسفے'' کے بارے میں کہا ہے۔ تجزیاتی فلسفی کہتا ہے کہ میں ہوں اور خدا نہیں ہے۔ میری طرح دوسرے لا انتہا مظاہر بھی موجود ہیں۔ جن کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ دوسری طرف تصوراتی یا موضوعی فلسفی موجودات و محسوسات کو دھوکہ و سراب سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ، میری آنکھ جو کچھ

---

(۱) زبور عجم۔ ۷۷۔ (۲) پیام مشرق۔ ۷۲۔ (۳) پیام مشرق۔ ۷۵۔ (۴) ایضاً۔ ۷۶۔

دیکھتی ہے۔ وہ ہے بھی کہ نہیں، وہ شکوک وشبہات کا شکار ہے۔

تومی گوئی کہ من ہستم خدا نیست جہان آب و گل را انتہا نیست
ہنوز ایں راز برمن ناکشود است کہ چشم آنچہ بیند ہست یا نیست (۱)

بعد ازیں علامہ محمد اقبال "تجزیاتی فلسفی" سے یہ بھی کہتے ہیں کہ لامکاں یعنی حق تعالیٰ کو الفاظ میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تو اپنے اندر دیکھے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ ہمارے اندر جان نے اس طرح نشیمن بنایا ہوا ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس جگہ جان ہے اور اس جگہ نہیں۔

بحرف اندر نگیری لا مکاں را درون خود نگر، ایں نکتہ پیداست
بہ تن جاں آنچناں دارد نشیمن کہ نتواں گفت اینجا نیست آنجاست (۲)

بے شک:۔

حقیقت پہ ہے جامہ، حرف تنگ حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ! (۳)

تجزیاتی وتصوراتی فلسفے کے حوالے سے اقبال حقیقت کے بارے میں کہتے ہیں کہ عقاب تیز نظر نے جوئینہ سے کہا، میری نظر جو کچھ دیکھتی ہے وہ سراب ہے۔ اس راست فکر پرندے نے جواب دیا۔ تو صرف دیکھتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ یہ پانی ہے۔ دریا کے نیچے سے مچھلی کی آواز آئی، ہاں کوئی چیز ہے جو پیچ وتاب کھا رہی ہے۔ تیز نظر عقاب سے مراد موضوعی وتصوراتی فلسفی ہیں۔ جو ظاہر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اور تخلیق بالحق کو افلاطون کی پیروی میں واہمہ و سراب سمجھتے ہیں۔ راست فکر جوئینہ سے مراد تجزیاتی ومعروضی فلسفی ہیں۔ جو موجودات یعنی تخلیق بالحق ہی کو حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور اس طرح منکرین حقیقت ٹھہرتے ہیں۔ مچھلی ان عشاق کی نمائندگی کرتی ہے جو حقیقت کو مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک "حسن مطلق" ہر چیز کی حقیقت ہے۔ خود اقبال بھی انہی عاشقان حقیقت میں شامل ہیں۔

عقاب دوربیں جوئینہ راگفت نگاہم آنچہ می بیند سراب است
جو ابش دادآں مرغ حق اندیش تو می بینی و من دانم کہ آب است

---

(۱) پیام مشرق۔ ۷۶۔ "لالہ طور"۔ (۲) ایضاً۔ ۷۸۔ (۳) بال جبریل۔ ۱۲۹۔ "ساقی نامہ"۔

صدائے ماہی آمد ازتہ بحر
که چیزے ہست و ہم پیچ و تاب است! (۱)

اقبال ہر طرح کے فلسفے کی بجائے عشق پر نازاں ہیں کہ اس نے روز ہجر کی بے تابی کے ذریعے ہماری جان پر آپ کے (محبوب حقیقی) درد کا ایک پیوند لگا دیا ہے۔

عشق را نازم که از بیتابیء روزِ فراق جان مارابست با دردِ تو پیوندے دگر (۲)

میرے اور حسن مطلق کے درمیان آنکھ اور نظر کا سا تعلق ہے۔ کہ اس سے بہت دور ہونے کے باوجود، میں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوں۔

میانہء من و او ربط دیدہ و نظر است که درنہایت دوری ہمیشہ بااویم (۳)

آتش جدائی ہی سے میرے شرر کی نمود ہے۔ اگر میں اسے دبا دوں تو اسی لمحے میری موت واقع ہو جائے۔

دہد آتشِ جدائی شررِ مرا نمودے به ہماں نفس بمیرم که فرونشانم اورا (۴)

ہم اپنے ساتھ بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی، یہ ہجر ہے یا وصل؟ اے عقل تو کیا کہتی ہے، اے عشق تو کیا فرماتا ہے۔

ہم باخود وہم باداو، ہجراں که وصال است ایں؟ اے عقل چه میگوی، اے عشق چه فرمائی (۵)

پھر ''حسن مطلق'' سے عرض کرتے ہیں کہ مجھے اپنی دیدۂ بینا سے اور طرح کی شکایت ہے۔ کہ جب تو جلوۂ افروز ہوتا ہے میری نگاہ ہی حجاب بن جاتی ہے۔ تاب دیدار نہیں لا سکتی۔ کبھی تو میں آپ کے جلوہ کے شوق میں سارے حجاب پارہ پارہ کر دیتا ہوں اور کبھی خود ہی اپنی نگاہ نارسا سے آپ کے چہرے پر پردہ ڈال دیتا ہوں۔ یعنی دل کی آنکھ سے دیدار حسن مطلق نصیب ہوتا ہے اور ظاہری آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی۔

مرا زدیدۂ بینا شکایت دگر است که چوں بجلوہ درآئی حجاب من نظر است (۶)

ہم به ہوائے جلوۂ پارہ کنم حجاب را ہم بنگاہ نارسا پردہ کشم بروے تو (۷)

تیرے چہرے کا نظارہ کرنے کے لئے اپنی ''نگاہ شوق'' کو آنسوؤں کی ندی میں دھو کر پاک کرتا ہوں۔ یہاں بھی

---

(۱) پیامِ مشرق۔ ۱۰۸۔ (۲) ایضاً۔ ۱۷۵۔ (۳) پیامِ مشرق۔ ۱۴۸۔ (۴) زبورِ عجم۔ ۴۵۔ (۵) پیامِ مشرق۔ ۱۶۸۔
(۶) پیامِ مشرق۔ ۱۴۶۔ (۷) زبورِ عجم۔ ۲۷۔

اقبال ''حسن مطلق'' کومجسم کرکے پیش کررہے ہیں ۔ پھر کہتے ہیں اگر چہ میرے کام میں غنچہ کی مانند گرہ ڈال دی گئی ہے ۔ مگر میں پھر بھی آفتاب کی جلوۂ گاہ کے شوق میں آگے ہی بڑھتا جا رہا ہوں ۔

پے نظارۂ روے تو می کنم پاکش　　نگاہ شوق بہ جوے سرشک می شویم

چو غنچہ گر چہ بکارم گرہ زنند ولے　　زشوق جلوہ گہِ آفتاب می رویم　　(۱)

میں گل لالہ کی مانند خوں میں نہایا ہوا، گوشہ چمن میں گرا پڑا ہوں ۔ کیوں کہ محبوب کے ''تیر نگاہ '' نے میرے جگر کو اپنا نشانہ بنایا ہے ۔

مثال لالہ فتادم بگوشۂ چمنے　　مرا زتیر نگاہے نشانہ برجگراست　　(۲)

اور یہ فلسفے کا نہیں بلکہ عشق کا کمال ہے کہ محبوب حقیقی اپنے عاشق کی طرف ملتفت ہوا ہے ۔ میں اس بہانے سے اس دنیا میں اپنا محرم راز تلاش کرتا ہوں ۔ غزل گاتا ہوں اور دوست (اللہ تعالی) کا پیغام پہنچاتا ہوں محرم اس پیغام کوخود بخود سمجھ لیتا ہے ۔ میں بادۂ راز ہوں اور ہم پیالہ ڈھونڈتا ہوں ۔ خرابات مغاں یعنی دنیا میں اپنا جام گردش میں رکھتا ہوں ، یعنی اپنی نوائے عشق یا شاعری کے ذریعے اپناہم راز تلاش کرتاہوں ۔ میری شوریدہ نوا سے عدم توجہی نہ کر ۔ میں مرغ لاہوت ہوں اور دوست (محبوب حقیقی) سے پیغام محبت لے کر آیا ہوں ۔ میں نے اپنے آپ کو پردے میں رکھا ہواہے کہ میرا محبوب پردے میں ہے ۔ کنایتہً بات کرتا ہوں ۔ تیغ خوں ریز ہوں ،مگر اپنے آپ کو نیام میں رکھتا ہوں ۔

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم　　غزل سرایم و پیغام آشناگویم　　(۳)

بادۂ رازم و پیانہ گسارے جویم　　درخرابات مغاں گردش جامے دارم

بے نیازانہ زشوریدہ نوایم مگذر　　مرغ لاہو تم واز دوست پیامے دارم

پردہ برگیرم و درپردہ سخن میگویم　　تیغ خونریزم و خود را بہ نیامے دارم　　(۴)

اقبال کہتے ہیں میں منزل عشق کا رہنما ہوں ، میرا دامن پکڑ لے ۔ آتش کا شرر ہوں ۔ مجھے اپنے تن و جان میں شامل کرلے تاکہ تو بھی سراپاعشق بن جائے ۔ میں عشق ہوں اس لئے میری یعنی عشق کی آواز سن کر عروس لالہ یعنی حسن حجلہ ناز سے باہر آگیا ۔ آکہ میں اپنے ''شوق انگیز'' اشعار سے تیری جان کوبھی جلا دوں ۔

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۱۴۸ ۔ (۲) ایضاً ۔ ۱۴۷ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۱۴۷ ۔ (۴) پیام مشرق ۔ ۱۶۳ ۔

دلیل منزل شوقم بدامنم آویز شرر ز آتش نابم بخاک خویش آمیز
عروس لالہ بروں آمد از سراچہ ناز بیاکہ جان تو سوزم زحرف شوق انگیز (۱)

یعنی کہ:۔

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز اندیشہ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز (۲)

پھر کہتے ہیں اے میرے محبوب تیرے دردِ محبت کے سرمائے کو ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ وہ آنسو جو میرے دل سے اٹھتا ہے اسے میں اپنی آنکھوں میں سمو لیتا ہوں۔ میں گفتگو میں فرزانہ ہوں اور کام کرتے وقت دیوانہ ہوں۔

سرمایہ درد تو، غارت نتواں کردن اشکے کہ زدل خیزد دردیدہ شکستم من
فرزانہ بگفتارم ، دیوانہ بہ کردارم از بادۂ شوق تو ہشیارم و مستم من (۳)

گویا کہ اقبال یہاں بھی عقل و خرد کی بجائے عشق کو رہنما بنانے کی تلقین کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ عشق سے عمل کا سبق لے اور جو چاہے کر۔ اس لئے کہ عشق ہی سمجھ کا جوہر اور عقل کی جان ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تو نے عقل کی ساری کتاب پڑھ لی ہے۔ مگر افسوس کہ تو نے عشق و محبت کی بات نہیں سمجھی۔

زعشق درس عمل گیر و ہر چہ خواہی کن کہ عشق جوہر ہوش است و جان فرہنگ است (۴)
گرفتم این کہ کتاب خرد فروخواندی حدیث شوق نہ فہمیدۂ دریغ از تو (۵)

اور تو ازل کے راز جاننا چاہتا ہے تو اپنے آپ پر نظر ڈال۔ تو تجھے معلوم ہوگا کہ وہ یکتا بھی ہے بسیار بھی۔ وہ وحدت میں کثرت ہے۔ اور کثرت میں وحدت بھی ہے وہ پنہاں بھی اور ظاہر بھی۔

اسرار ازل جوئی ؟ برخود نظرے واکن یکتائی و بسیاری ، پنہائی و پیدائی (۶)

یعنی کہ:۔

خودی کیا ہے راز درون حیات! خودی کیا ہے بیداریء کائنات!
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک من و تو میں پیدا من و تو سے پاک!
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند! سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

(۱) پیام مشرق۔۱۶۹۔ (۲) بالِ جبریل۔۲۶۔ "غزل"۔ (۳) پیام مشرق۔ ۱۵۲۔ (۴) ایضاً۔ ۱۵۱۔
(۵) ایضاً۔ ۱۸۴۔ (۶) ایضاً۔ ۱۶۷۔

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی! عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی!
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود!
من و تو سے ہے انجمن آفریں مگر عین محفل میں خلوت نشیں (۱)

گویا کہ:۔

دلے جاں ازدم جاں آفریں است بچندیں جلوہ ہا خلوت نشیں است (۲)

اقبال کہتے ہیں ''حسن مطلق'' یا محبوب حقیقی نہ تو حرم تک محدود ہے اور نہ بت خانے میں سما سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے چاہنے والوں کی طرف بڑے شوق سے بڑھتا ہے۔ حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں آسمان اور زمین میں نہیں سماتا مگر مومن کے قلب میں سما جاتا ہوں، جو میری طرف ایک قدم بڑھتا ہے میں اس کی طرف دس قدم بڑھتا ہوں۔ پھر اقبال ذات باری تعالیٰ کے حضور عرض کرتے ہیں، اپنے چاہنے والوں کے حریم جان میں بے باکی سے قدم رکھیئے۔ اے اللہ تعالیٰ آپ اس دل کے مالک ہیں، چھپ چھپ کر کیوں آتے ہیں۔ کبھی آپ تسبیح خوانوں کا حاصل کردہ سرمایہ غارت کر دیتے ہیں اور کبھی زناریوں کے دل پر بیباکانہ شبخون مارتے ہیں۔ کبھی آپ سو لشکر کھڑے کر دیتے ہیں تاکہ اپنے دوستوں کا خوں بہائیں اور کبھی ذکر کی مجلس میں، جہاں شیشہ و پیمانہ چل رہا ہے، آجاتے ہیں۔ آپ کلیم کے درخت پر اپنی تجلی بے دریغ گرا دیتے ہیں۔ مگر شمع یتیم پر پروانے کی مانند بار بار آتے ہیں۔ گویا کہ ''حسن مطلق'' کی جلوہ گری کے یہ مختلف انداز ہیں۔ اور یہ کہ وہ ہماری سوچ سے بڑھ کر لامحدود ہے۔

نہ تو اندر حرم گنجی، نہ در بت خانہ می آئی ولیکن سوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی
قدم بیباک تر نہ در حریم جان مشتاقاں تو صاحب خانہ، آخر چرا دزدانہ می آئی
بغارت می بری سرمایہ تسبیح خواناں را بشبخون دل زناریاں ترکانہ می آئی
گہے صد لشکر انگیزی کہ خون دوستاں ریزی گہے در انجمن باشیشہ و پیمانہ می آئی
تو برنخل کلیمے بے محابا شعلہ می ریزی تو بر شمع یتیمے صورت پروانہ می آئی (۳)

مغرب آپ سے ناآشنا ہے۔ مشرق میں صرف آپ کے قصے کہانیاں ہیں۔ حقیقت سے وہ بھی ناواقف ہے۔

---

(۱) بال جبریل۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ (۲) زبور عجم۔ ۱۶۴۔ (۳) پیام مشرق۔ ۱۷۳۔

اب ضرورت ہے کہ آپ دنیا میں نئے نقش سے جلوہ گر ہوں۔

مغرب زتو بیگانہ ، مشرق ہمہ افسانہ   وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی   (۱)

بعد ازیں اقبال یہ بھی کہتے ہیں ، اے وہ ذات! (حسن مطلق) تو ہماری رگ جان سے قریب تر ہے ، مگر ہماری نگاہ سے اوجھل ہے ، مجھے آپ کا ہجر دوسروں کے وصل سے زیادہ پیارا ہے۔

اے کہ نزدیک تر از جانی و پنہاں زنگہ   ہجر تو خوشترم آید زوصال دگراں!   (۲)

ہمارے بدن کی مشت غبار سے آپ کے ہجر میں سینکڑوں نالے اٹھتے ہیں۔ کیوں کہ آپ میری رگ جاں سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی مجھ سے دور رہتے ہیں۔

از مشت غبار ماصد نالہ برانگیزی   نزدیک تر ازجانی باخوے کم آمیزی   (۳)

علاوہ ازیں اقبال کہتے ہیں کہ اے محبوب حقیقی ہمارے سینے میں آپ کی محبت کا سوز کہاں سے آیا۔ بدن تو ہمارا ہے لیکن اس مٹی کے اندر عشق الٰہی کی شراب کہاں سے آگئی۔ مانا کہ یہ جہاں خاک ہے اور ہم مٹھی بھر خاک ہیں۔ مگر ہماری خاک کے ذرّے ذرّے میں یہ تلاش حق کا درد کہاں سے پیدا ہوگیا۔ ہماری نگاہ کی رسائی اتنی بلندی تک ہے کہ یہ گریبان کہکشاں سے الجھتی ہے۔ ہمارے اندر یہ جنوں اور یہ شور ہائے وہو کہاں سے آیا؟ گویا یہ سب کچھ ''حسن مطلق'' کے باعث ہے۔

درون سینہ ء ما سوز آرزو کجاست؟   سبوز ماست ، ولے بادہ درسبوز کجاست؟

گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ماکف خاکیم   بہ ذرہ ذرۂ ما درد جستجوز کجاست؟

نگاہ ما بگیریبان کہکشاں افتد   جنون ماز کجا؟ شور ہاے وہوز کجاست؟   (۴)

پھر کہتے ہیں ، ہماری فطرت میں جوتب وتاب ہے اس کا سبب ہماری نیازمندی ہے۔ آپ خدائے بے نیاز ہیں۔ آپ میرے سوز وساز کونہیں پا سکتے۔

تب و تاب فطرت ماز نیازمندیء ما   تو خداے بے نیازی نزی بسوز و سازم   (۵)

مطلب یہ کہ :۔

---

(۱) زبور عجم۔ ۸۔ (۲) پیام مشرق۔ ۱۷۵۔ (۳) زبور عجم۔ ۸۔ (۴) زبور عجم۔ ۵۔ (۵) زبور عجم۔ ۹۔

بحیان درد منداں تو بگوچہ کار داری؟ تب و تاب ما شناسی ؟ دل بے قرار داری؟
چہ خبر ترا زاشکے کہ فروچکد زچشمے تو بہ برگ گل زشبنم در شہوار داری!
چہ بگویمت زجانے کہ نفس نفس شارد دم مستعار داری؟ غم روزگار داری؟ (۱)

تصوراتیوں اور تجزیاتیوں کے نزدیک تو ''حسن ازل'' ہے ہی نہیں مگر اقبال کے نزدیک، نہ صرف وہ موجود ولایزال ہے بلکہ اس قدر نزدیک ہے کہ اقبال اس سے راز و نیاز کے علاوہ گلے شکوے بھی کر لیتے ہیں ۔ میں تو محبوب کے خوبصورت چہرے سے ذرا نظر نہیں ہٹاتا ۔ مگر وہ تغافل میں اس قدر مست ہے کہ اسے ایک نگاہ کی بھی توفیق نہیں ۔

من چشم نہ بردارم از روے نگار یَنش آں مست تغافل را توفیق نگاہے نیست! (۲)

غزل ہو یا نظم کلام اقبال میں بے پناہ تغزل پایا جاتا ہے ۔ صاف ظاہر ہے کہ انسان جب محبوب حقیقی کے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہے تو اسے مجازی اشارات وکنائیات اور اصطلاحات ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور پھر ویسے بھی زبور عجم کے یہ بھی اشعار اقبال کی غزلوں سے پیش کئے جا رہے ہیں ۔ جن میں بے پناہ تغزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ۔

حسن وعشق کے حوالے سے اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر چہ میں تاریک مٹی سے بنا ہوں مگر میرا دل (عشق) میری متاع خاص ہے ۔ اس کے سبب میں حق تعالیٰ کے ''نظارہء جمال'' کی خاطر ستارے کی مانند پل جھپکے بغیر بیٹھا ہوں ۔ اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ میں دنیا کی پرانی خاک میں جان کا موتی یعنی ''حسن مطلق'' دیکھ رہا ہوں ۔ مجھے ہر ذرّے کی آنکھ ستارے کی طرح ''حسن مطلق'' کا دیدار کرتے دکھائی دیتی ہے ۔ یہی نہیں بلکہ چاند ستارے جو راہ عشق میں ہمارے ہمسفر ہیں ۔ وہ کرشمہ سنج ، ادافہم اور صاحب نظر ہیں ۔ معلوم نہیں انہیں ہماری مشت غبار میں کیا جلوے نظر آتے ہیں ۔ کہ آسمان کی جانب پیٹھ کئے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں ۔ یعنی چاند تاروں کو بھی ہماری ارضی دنیا اور ہماری مشت خاک میں ''حسن مطلق'' کے جلوے دکھائی دیتے ہیں ۔ ان تمام حقائق میں دراصل اقبال تصوراتیوں و تجزیاتیوں کو زبان عشق میں جواب دے رہے ہیں ۔

من اگر چہ تیرہ خاکم دلکے است برگ و سازم بنظارہء جمالے چو ستارہ دیدہ بازم (۳)
من دریں خاک کہن گوہر جاں می بینم چشم ہر ذرّہ چو انجم نگراں می بینم (۴)
مہ و ستارہ کہ در راہ شوق ہم سفر اند کرشمہ سنج و ادا فہم و صاحب نظر اند

---

(۱) زبور عجم ۔ ۴۳ ۔ (۲) زبور عجم ۔ ۱۰۵ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۹ ۔ (۴) پیام مشرق ۔ ۱۹۲ ۔

چہ جلوہ ہاست کہ دیدند درکف خاکے　　قفا بجانب افلاک سوئے ما نگرند　(۱)

اور:۔

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے　　دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے　(۲)

تو کیستی ؟ از کجائی کہ آسمان کبود　　ہزار چشم براہ تو از ستارہ کشود　(۳)

اے ''حسن مطلق'' آپ نے میری نگاہ نارسا کو کس بہار جلوہ سے نواز دیا کیوں کہ میں باغ و راغ میں طائر نوآموز کی مانند فریاد کناں ہوں ۔

بنگاہ نارسایم چہ بہار جلوہ داری　　کہ بباغ وراغ نالم چوتد رو نوصفیرے　(۴)

میں ایسا شرر ہوں۔ جس کا رنگ اڑا ہوا ہے مگر تو میرے جلوے کو نظر انداز نہ کر۔ ایک دو آن کی چمک کی بجائے میرے اندر تپش جاوداں ہے۔ مجھ پر اپنی محبت کی چنگاری ڈالئے مگر ایسی جو مجھے بالکل ہی نہ جلا دے۔ میں تو نیاز عشق ہوں۔ میرے اندر ابھی تک آشیانے سے وابستگی باقی ہے۔

شرر پریدہ رنگم ، مگذرزجلوۂ من　　کہ بتاب یک دو آنے تب جاودانہ دارم

شررے فشاں و لیکن شررے کہ و انسوزد　　کہ ہنوز نو نیازم غم آشیانہ دارم　(۵)

ساقی میرے جگر پر ایسا شعلہ ڈال، جس میں سوز کی نمی ہو۔ پھر میری کف خاک میں آشوب قیامت برپا کر دے۔ ابلیس نے مجھے ایک دانہء گندم کھلا کر جنت سے نکلوا دیا۔ آپ مجھے ایک جرعہ عشق سے ورائے افلاک پہنچا دیں۔ عشق کو ایسی شراب عطا فرمائیے کہ جو مرد افگن اور پر زور ہو۔ پھر اس کی درد میرے پیمانہ ادراک میں ڈال دیجئے۔ میرے شراب عشق کی گرمی خرد میں گداز پیدا نہیں کر سکی۔ اس کا علاج اپنے ناز و ادا گویا کہ ''جلوۂ جمال'' سے کیجئے۔

ساقیا برجگرم شعلہء نمناک انداز　　دگر آشوب قیامت بکف خاک انداز

او بیک دانہ ء گندم بزمینم انداخت　　تو بیک جرعہء آب آنسو ے افلاک انداز

خرد از گرمی ء صہبا بگدازے نرسید　　چارۂ کا ر بآں غمزۂ چالاک انداز　(۶)

اقبال ''حسن مطلق'' میں اس قدر محو ہیں کہ ان کا سارا کلام ''حسن مطلق'' کی تجسیم سازی اور ذوق و شوق سے

---

(۱) زبور عجم۔ ۶۳۔ (۲) بال جبریل۔ ۱۳۲۔ (۳) زبور عجم۔ ۱۱۸۔ (۴) ایضاً۔ ۱۰۔ (۵) ایضاً۔ ۲۱۔ (۶) زبور عجم۔ ۲۹۔

عبارت ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے ان گنت پیرایہ ہائے اظہار اپنائے ہیں۔ جن میں ہجرو وصال سے لیکر محو انتظار اور عالم دیدار کے وقت حسن یار کی مختلف دلربا جھلکیوں سے پڑھنے سننے والوں کو مسحور کر دیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں، میرا محبوب راستے میں بیٹھے ہوؤں پر ایک نظر ڈال کر سوار گزر جاتا ہے۔ مجھے سنبھالیے۔ کہ اس کی ایک نظر نے میرا تو کام تمام کر دیا ہے۔ میں کسی سے جلوۂ دوست کی کیا بات کروں۔ وہ تو میری نظر کے سامنے سے شرر کی مانند گزر جاتا ہے۔ اس چاند کی منزل تک پہنچنے کا راستہ بہت دشوار ہے۔ مگر عشق کے لئے مشکل نہیں۔ کیوں کہ عشق ستاروں کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ جب تو اس کی خلوت میں پہنچے تو اس کے چہرے کی طرف مت دیکھ۔ کیوں کہ وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ جب کام نظارے کے بس کا نہیں رہتا۔ میں جدائی کی کیا بات کروں جبکہ میرا دل ہی نہیں۔ وہ تو پارہ پارہ ہو کر آنسوؤں کی صورت میں، آنکھوں کے راستے باہر نکل چکا ہے۔

نظر بہ راہ نشیناں سوارہ می گزرد — مرا بگیر کہ کارم زچارہ می گزرد
بہ دیگراں چہ سخن گسترم زجلوۂ دوست — بیک نگاہ مثال شرارہ می گزرد
رہے منزل آں ماہ سخت دشوار است — چناں کہ عشق بدوش ستارہ می گزرد
بخلوتش چو رسیدی نظر باومکشا — کہ آں دمے ست کہ کار از نظارہ می گزرد!
من از فراق چہ نالم کہ از، ہجوم سرشک — زراہ دیدہ، دلم پارہ پارہ می گزرد (۱)

گویا کہ:۔

دل بھی اے دردؔ قطرہ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا (۲)

لیکن یہ رونا عشق و مستی کا رونا ہے۔ جو رائیگاں بھی نہیں جاتا چنانچہ اقبال کہتے ہیں۔ ہماری دیدۂ تر نے ہمارے گریباں پر ستارے گرائے ہیں۔ ہمارے آنسوؤں نے ہمارے اندر جو ذوق نظر پیدا کیا ہے۔ وہ ہمیں آسمان سے زیادہ بلندی پر لے گیا۔

انجم بگریباں ریخت ایں دیدۂ تر مارا — بیروں زسپہر انداخت ایں ذوق نظر مارا (۳)

---

(۱) زبور عجم۔۲۲۔ (۲) دیوان دردؔ۔ ۱۱۔ (۳) زبور عجم۔ ۴۸۔

اس کے بعد اقبال اپنے محبوب سے کہتے ہیں، اور ان کا محبوب ''حسن مطلق'' ہی ہوسکتا ہے۔ کہ آپ کی جستجو میں جولذت ملتی ہے۔ وہی سوز و گداز زندگی ہے۔ اگر میں آپ کی طرف سفر نہ کروں تو راستہ مجھے سانپ کی طرح ڈستا ہے۔ جبرئیل امین اپنا سینہ کھولے ہوئے عاشقوں کے پاس سے گزرتے ہیں۔ تاکہ انہیں بھی آپ کی محبت کی کوئی چنگاری میسر آجائے۔ میں آپ کی تلاش میں نکلوں یا اپنی تلاش میں، عقل، دل اور نظر سب آپ کی گلی میں گم ہو چکے ہیں۔ میں آپ ہی کے چمن کا پودا ہوں، مجھے قطرۂ شبنم عطا فرمائیے۔ اس سے میرے غنچے کا دل کھل جائے گا۔ اور آپ کی ندی میں کچھ کمی واقع نہیں ہوگی۔ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اقبال کو تجزیاتی وتصوراتی فلسفیوں کے مقابلے میں ''حسن ازل'' پر کس قدر پختہ ایمان ہے۔

سوز و گدازِ زندگی لذتِ جستجوے تو — راہ چومارِ گزد گرنہ روم بسوے تو
سینہ کشادہ جبرئیل از برِ عاشقاں گذشت — تاشررے باوفتد آتش آرزوے تو
من بتلاش تو روم یا بتلاش خود روم — عقل و دل و نظر ہمہ گم شدگان کوے تو
از چمن تو رستہ ام قطرۂ شبنمے بہ بخش — خاطرِ غنچہ واشود کم نشود زجوے تو (۱)

مجھے شراب عشق کا ایسا پیالہ عطا فرما، جو میرے اندر معرفت کا گل لالہ کھلا دے۔ ساقی میری مشت خاک کو بادبہار کے سپرد کر دے۔ تاکہ میرے بدن کا ذرّہ ذرّہ گل وگلزار بن جائے۔ میں تو وہی مٹھی بھر خاک ہوں جو کسی کام کی نہیں۔ میری اس خاک کے اندر جو پھول کھلتے ہیں وہ بھی آپ کا کرم ہے اور جو ابر بہار وہ پھول کھلاتا ہے، اس کا برسنا بھی آپ کے کرم سے ہے۔ میرے دل میں آرزوئیں شرر کی مانند اٹھتی اور بجھتی رہتی ہیں۔ میری رات کی تاریکی کو ایک آرزوے دلنشیں یعنی عشق کا ستارہ عطا فرمائیے۔

من ہماں مشت غبارم کہ بجائے نرسد — لالہ ازتست و نم ابر بہاری از تست (۲)
ازاں آبے کہ درمن لالہ کاردساتگینے دہ — کف خاک مرا ساقی بیادفرودینے دہ
بجانم آرزو ہا بود و نابود شرر دارد — شبم راکوکبے از آرزوے دل نشینے دہ (۳)

لیکن تجزیاتی وتصوراتی فلسفی کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ اس لئے اقبال سمجھتے ہیں کہ یہ گئی گزری محفل جو شراب عشق اور

---

(۱) زبورعجم۔ ۲۷۔ (۲) ایضاً۔ ۳۴۔ (۳) زبورعجم۔ ۳۰۔

محبوب حقیقی کی ملاقات و دیدار کی صلاحیت نہیں رکھتی ۔ اس میں ایسا ندیم و محرم راز عاشق کہاں ملے گا، جس کے جام میں اپنی جاودانی شراب معرفت ڈال سکوں ۔ جو شخص یعنی تجزیاتی و تصوراتی فلسفی جام زریں سے زہر شریں پینے کا عادی ہو چکا ہے، وہ میرے مٹی کے پیالے سے ایسی کڑوی شراب عشق کیسے پیئے گا ۔ جو اس فلسفیانہ زہر کا تریاق ہے ۔

دریں محفل کہ کارے او گذشت از بادہ و ساقی — ندیمے کو کہ در جامش فروریزم مئے باقی
کسے کو زہر شیریں می خورد از جام زرینے — مئے تلخ از سفال من کجا گیرد بہ تریاقی (۱)

کبھی جہاں مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور کبھی میں جہاں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہوں ۔ آپ جام آگے بڑھائیں تا کہ میں اس کشمکش سے باہر نکلوں ۔ گویا کہ اگر انسان عقلیت سے کام لے تو دنیا اس پر چھا جاتی ہے اور اگر عشق سے کام لے تو وہ موجودات و محسوسات پر چھا جا تا ہے ۔

گہے پیچد جہاں برمن ، گہے من برجہاں پیچم — بگرداں بادہ تا بیروں ازیں پیچاک می آیم (۲)

میں نماز بے حضور ادا نہیں کر سکتا ۔ بالکل ادا نہیں کر سکتا ۔ قلب سلیم آپ کی جناب میں پیش کر دیا ہے ۔ اس کافر سے آپ اور کیا چاہتے ہیں ۔

نماز بے حضور از من نمی آید ، نمی آید — دلے آوردہ ام دیگر ازیں کافر چہ می خواہی (۳)

محبت کی راہ میں ایک قدم ہزار پارسائی سے بہتر ہے ۔ خدائی کی محنت و کلفت چھوڑ کر ایک لمحے کے لئے میرے سینے میں آرام فرمالیں ۔ ہمیں ہمارے مقام سے باخبر کیجئے ، ہم کہاں ہیں اور آپ کہاں ہیں؟ پرانے محرمانہ غمزے یاد کیجئے ۔ کب تک تغافل سے ہماری آزمائش کریں گے ۔

تجھے یاد کیا نہیں ہے میرے دل کا وہ زمانہ — وہ ادب گہ محبت وہ نگاہ کا تازیانہ (۴)

خوشتر ز ہزار پارسائی — گامے بطریق آشنائی!
در سینہ من دمے بیا سائے — از محنت و کلفت خدائی !
مارا از مقام ما خبر کن — مائیم کجا وتو کجائی؟
آں چشمک محرمانہ یاد آر — تا کے بتغافل آزمائی (۵)

---

(۱) زبور عجم ۔ ۲۸ ۔ (۲) ایضاً ۔ ۳۱ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۳۳ ۔ (۴) بال جبریل ۔ ۱۵ ۔ ''غزل'' (۵) زبور عجم ۔ ۳۵ ۔

اقبال کہتے ہیں راہ طلب میں ابھی تک میں علائق دنیا میں گرفتار ہوں ۔ ابھی تک میرا دل قافلہ، سامان اور منزل کے چکر میں ہے ۔ کہاں ہے وہ برق نگاہ جو میرا گھر بار جلا دے! ابھی تک میں کھیتی اور اس کی پیداوار کی فکر میں گرفتار ہوں ۔ ایک جلوے سے میری نگاہ شوق کی تسلی نہیں ہوئی ۔ اس خلش کا کیا علاج کروں جو ابھی تک میرے دل میں موجود ہے ۔

مرا براہ طلب باردر گل است ہنوز ۔۔۔ کہ دل بقافلہ و رخت و منزل است ہنوز
کجاست برق نگاہے کہ خانماں سوزد! ۔۔۔ مرا معاملہ باکشت و حاصل است ہنوز
نگاہ شوق تسلی بجلوۂ نشود ۔۔۔ کجا برم خلشے راکہ دردل است ہنوز (۱)

یعنی کہ:۔

بدہ آں دل بدہ آں دل کہ گیتی رافرا گیرد ۔۔۔ بگیرایں دل بگیرایں دل کہ دربند کم وبیش است (۲)

مجھے ساقی کی آنکھ نے مست کر دیا ہے ۔ میری مستی بغیر کسی شراب کے ہے، بغیر کسی شراب کے ہے ۔ آپکی بے حجابی نے میرا شوق اور بڑھا دیا ہے ۔ دیکھوں یا نہ دیکھوں، اسی پیچ و تاب میں ہوں ۔ جب رات کے وقت شمع روشن کی جاتی ہے ۔ تو میں مضراب محبت سے تار رباب بن جاتا ہوں ۔

از چشمِ ساقی مستِ شرابم ۔۔۔ بے مے خرابم، بے مے خرابم
شوقم فزوں تر ازبے حجابی ۔۔۔ بینم نہ بینم، درپیچ و تابم
چوں رشتۂ شمع آتش بگیرد ۔۔۔ ازز خمۂ من تار ربابم (۳)

اس کے علاوہ علامہ محمد اقبال ''حسن مطلق'' سے راز و نیاز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے میری رات کو سحر سے آشنا کر دیا ہے ۔ چونکہ آپ طلعت میں آفتاب کی مانند ہیں ۔ اس لئے مناسب ہے کہ آپ بے حجاب نظر آئیں ۔ آپ نے میرے درد کو پا لیا ہے اور میرے ضمیر میں آرام فرما ہوئے ہیں ۔ باوجود آہستہ آہستہ آنے کے میری نگاہ سے گریز پا رہے ہیں ۔ آپ کی وجہ سے بے قیمت لوگ گرانقدر ہو جاتے ہیں ۔ آپ بے قراروں کا قرار اور دل فگاروں کی دوا ہیں ۔ مگر ملتے ذرا دیر سے ہیں ۔ گویا تجزیاتی فلسفیوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ'' حسن ازل'' موجود ہے اور اس تک رسائی بھی ممکن ہے ۔

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو ۔۔۔ پلا کے مجھ کو مئے لا الہ الاھو (۴)

---

(۱) زبورِ عجم ۔ ۳۷ ۔ (۲) ایضاً ۔ ۴۴ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۴۰ ۔ (۴) بالِ جبریل ۔ ۱۳ ۔

پھر اقبال محبوب حقیقی کے حضور عرض کرتے ہیں کہ میرے دل کی کہانی آپ سنائیں کیونکہ آپ اسے بہتر جانتے ہیں۔ مجھے بتائیں کہ میرا دل کہاں ہے؟ میں اسے اپنے پہلو میں تو نہیں پاتا۔

شب من سحر نمودی کہ بہ طلعت آفتابی　　تو بطلعت آفتابی سزدایں کہ بے حجابی
تو بدرد من رسیدی ، بضمیرم آرمیدی　　زنگاہ من رسیدی بچنیں گراں رکابی
تو عیارکم عیاراں ، تو قرار بے قراراں　　تو دوائے دل فگاراں ، مگر ایں کہ دیریابی
زحکایت دل من تو بگو کہ خوب دانی　　دل من کجا کہ اورا بکنارمن نیابی!　　(۱)

پھر کہتے ہیں کہ اگر نظارہ جمال سے خود رفتگی پیدا ہو، تو حجاب ہی بہتر ہے۔ مجھے ایسا سودا قبول نہیں۔ یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ آپ اپنا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ باوجود بے نیازی کے اپنے وجود پر دوستوں کے خون کی شہادت چاہتے ہیں۔ شہید کو شہید اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی جان دے کر، اللہ تعالیٰ کے وجود پر گواہی پیش کرتا ہے۔

تو اگر ترک جہاں کردہ سرِاوداری　　پس نخستیں زسر خویش گذر بایدکرد　　(۲)

مقام بندگی اور ہے مقام عاشقی اور ہے۔ فرشتے سے آپ صرف سجدہ چاہتے ہیں۔ لیکن خاکی سے اس سے زیادہ یعنی شہادت کے طلب گار ہیں۔ میرے پاس تو کچا تانبا قلب کی صورت میں ہے۔ میں اسے آپ کے عشق سے کیمیا بنا رہا ہوں۔ کیوں کہ روز قیامت، جب میں آپ کے سامنے پیش ہوں گا تو آپ فرمائیں گے: میرے لئے کیا تحفہ لائے ہو۔ یہ عاشقانہ راز و نیاز ہے۔ جبکہ تجزیاتی وتصوراتی فلسفی اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتے۔

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولے　　نگیرد بامن ایں سودا بہا از بس گراں خواہی
چناں خود رانگہ داری کہ باایں بے نیازی ہا　　شہادت بروجود خود زخون دوستاں خواہی!
مقام بندگی دیگر ، مقام عاشقی دیگر　　زنوری سجدہ می خواہی زخاکی بیش ازاں خواہی!
مس خامے کہ دارم از محبت کیمیاسازم　　کہ فردا چوں رسم پیش تو از من ارمغاں خواہی!　　(۳)

تخلیق کائنات کے سلسلے میں اقبال ''حسن مطلق'' سے کہتے ہیں کہ آپ کے نور نے سفید و سیاہ میں تمیز پیدا کی اور دریا، پہاڑ، جنگل اور مہر و ماہ وجود میں آئے۔ آپ انسان کامل کی خواہش رکھتے تھے۔ جسے نگاہ دیکھ سکتی ہے۔ میں آپ

---

(۱) زبور عجم۔ ۴۱۔ (۲) ایضاً۔ ۸۵۔ (۳) ایضاً۔ ۴۳۔

کی تلاش میں ہوں جسے نگاہ نہیں پا سکتی۔

نور تو وانمود سپید وسیاہ را　　دریا وکوہ و دشت و درومہر و ماہ را
تو درہوا ے آں کہ نگہ آشنائے اوست　　من درتلاش آں کہ نتابد نگاہ را! (۱)

اگر آپ ہمارے پہلو میں ہوں تو خزاں میں بھی بہار کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ نہ ہوں تو بہار کے دن خزاں سے زیادہ افسردہ ہو جاتے ہیں۔ اے ''حسن ازل'' تیرے بغیر میری جان اس ساز کی مانند ہے۔ جس کے تار ٹوٹ چکے ہوں۔ اور تیرے حضور میرے سینے سے مسلسل نغمے پھوٹتے ہیں۔ گویا کہ تجزیاتیوں وتصوراتیوں کے تار ٹوٹے ہوئے ہیں۔ یہی ان کے فلسفے کا بھی حال ہے۔ ادھر اقبال بزم عشق میں، پھولوں بھرا چمن، نالوں بھرا نیستاں اور شراب بھرا خمخانہ لائے ہیں۔ یہ سب چیزیں ''حسن مطلق'' سے معرفت کا وسیلہ ہیں۔

درکار آئی خزانِ ما زند رنگ بہار　　ورنیائی فرودیں افسردہ تر گردد زدے!
بے تو جان من چو آں سازے کہ تارش درگسست　　درحضور از سینۂ من نغمہ خیزد پے بہ پے
آنچہ من دربزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست　　یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے! (۲)

خیر آپ ''حسن ازل'' اور ''حسن مطلق'' ہیں۔ آپ نے اپنے مشتاقوں سے قوت گویائی سلب کر لی۔ مگر آپ کو شاید معلوم نہیں کہ محبت نگاہ بے زباں کو زباں عطا کر دیتی ہے۔

زمشتاقاں اگر تاب سخن بردی نمیدانی؟　　محبت می کند گویا نگاہِ بے زبانے را! (۳)
نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری　　خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری (۴)

کیا حرم اور کیا دیر ہر جگہ محبت کے چرچے ہیں۔ مگر بات یوں ہے کہ میرے اور آپ کے راز اور کوئی نہیں جانتا۔ آپ میری آنکھوں کے راستے میرے دل میں بس گئے۔ مگر آنکھوں سے اس طرح گزرے کہ نگہ کو بھی خبر نہ ہوئی۔ ان جوہریوں یعنی تجزیاتی وتصوراتی فلسفیوں میں سے کوئی بھی میرے نگینے ______ دل بے تاب۔ کی بیش بہا وقعت نہ سمجھ سکا۔ میں اسے آپ ہی کے سپرد کرتا ہوں۔ کیونکہ تجزیاتی وتصوراتی اہل جہاں، ''صاحب نظر'' نہیں۔

چہ حرم چہ دیر ہر جا سخنے ز آشنائی!　　مگر ایں کہ کس زراز من و تو خبر ندارد!

---

(۱) زبور عجم۔ ۴۴۔ (۲) ایضاً۔ ۴۷۔ (۳) ایضاً۔ ۵۴۔ (۴) بانگ درا۔ ۶۸۔ ''تصویر درد''

تو زراہ دیدۂ ما بضمیر ما گذشتی　　مگر آنچناں گزشتی کہ نگہ خبر ندارد!

کس ازیں نگیں شناساں نگذشت برنگینم　　بتوی سپارم اورا کہ جہاں نظر ندارد!　　(۱)

اس باغ کا لالہ ابھی تک آلودۂ رنگ ہے ۔ یعنی تجزیاتی فلسفی مجاز کو جو کہ تخلیق باالحق ہے حقیقت جان کر پوج رہا ہے۔ اے عاشق سپر نہ رکھ کیونکہ فلسفے اور عشق کے درمیان ابھی جنگ جاری ہے ۔ جمال حقیقی کا جلوہ طلب کر ، مہ و خورشید سے آگے گزر جا۔ کیوں کہ اس دیر یعنی صنم خانہ کائنات کا ہر جلوہ نگہ آلودہ ہے ۔ ٹھہرتا کہ ایک اور مقام سے پردہ ہٹائیں میں ان نواؤں کو کیسے بیان کروں ، جو ابھی تک پردۂ ساز میں ہیں ۔ خالق کائنات نے جب میرے جنوں کی طرف دیکھا تو فرمایا کہ تیرے جنوں کے لئے یہ جہاں تنگ ہے ۔ یعنی عشق تمام کائنات پر حاوی ہے ۔ اور یہ کہ اس دنیائے چمن کو اللہ تعالی نے تخلیق کیا ہے ، جسے وہ دم بہ دم بڑھا رہا ہے ۔ اس لئے کہ عشق کے لئے دنیا تنگ ہے ۔ اگر چہ گل وگلزار کی کمی نہیں مگر اس کے باوجود اسے ویرانہ اس لئے کہتے ہیں کہ خالق کائنات اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہا ہے ۔ جبکہ ارسطو کے نزدیک کائنات ایک ساکن و مردہ وجود ہے ۔

لالہ ء ایں چمن آلودۂ رنگ است ہنوز　　سپر ازدست مینداز کہ جنگ است ہنوز

جلوۂ پاک طلب از مہ و خورشید گذر　　زانکہ ہر جلوہ دریں دیرنگہ آلوداست

باش ! تا پردہ کشایم زمقام دگرے!　　چہ دہم شرح نواہا کہ بچنگ است ہنوز!

نقش پردازِ جہاں چوں بجنونم نگریست　　گفت و یرانہ ، بسودائے تو تنگ است ہنوز　　(۲)

یہ گمان نہ کر کہ عشق کا ایک ہی انداز ہے ۔ گل و لالہ کی قبا جنوں کے بغیر بھی چاک ہے ۔ وہ ذات جس نے ''لن ترانی'' کہا تھا ، ابھی تک اس بات کی منتظر ہے کہ کوئی انسان اپنے اندر اس کا جلوہ دیکھنے کی استعداد پیدا کرے ۔

گماں مبرکہ بیک شیوۂ عشق می بازند　　قبا بدوش گل و لالہ بے جنوں چاک است

کشائے چہرہ کہ آنکس کہ لن ترانی گفت　　ہنوز منتظر جلوۂ کف خاک است　　(۳)

کافر اپنے دل آوارہ کو پھر اس ذات بے منتہا کے ساتھ وابستہ کر ۔ غیروں کو دیکھنے سے نظر بند کر اور اپنے آپ کو دیکھ ۔ دیکھنا یا نہ دیکھنا دوبارہ سیکھ ۔ سائس کیا ہے؟ پیام دوست ہے ، تو نے سنا یا نہیں سنا ، تیری خاک میں ''حسن ازل'' کا

---

(۱) زبور عجم ۔ ۵۷ ۔ (۲) ایضاً ۔ ۶۸ ۔ ۷۰ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۷۷ ۔

جلوۂ عام ہے مگر تو نے نہیں دیکھا پھر سے دیکھنا اور سننا سیکھ۔

کافر دل آوارہ دگر بارہ باو بند برخویش کشادیدہ وازغیر فروبند

دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز

دم چیست ؟ پیام دوست ، شنیدی ، نشنیدی! در خاک تو یک جلوۂ عام است ندیدی!

دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز! (۱)

گویا کہ:۔

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا (۲)

''تجزیاتی فلسفی'' دل کی آنکھ سے دیکھنا سیکھیں تو انہیں وہ کچھ دکھائی دے سکتا ہے۔ جس سے وہ انکاری ہیں۔ دل میں اگر لات ومنات بسے ہوئے ہوں تو بھی ، ''حسن مطلق'' کا قرب حاصل نہیں ہوسکتا۔

گفتمش دردل من لات و منات است بسے گفت ایں بتکدہ را زیر و زبر باید کرد (۳)

یعنی تمام بتوں کو مٹا کر ، دل میں صرف ''نور مطلق'' کو بسایا جائے تو معرفت نصیب ہو جاتی ہے۔ پھر کہتے ہیں میں نہیں جانتا کہ میرے سینے کے اندر نور ہے یا نار ، البتہ یہ جانتا ہوں کہ اس روشنی میں چاندنی ملی ہوئی ہے۔ گویا کہ میرے سینے کے اندر ''آتش عشق'' اور ''حسن مطلق'' باہم شیر وشکر ہیں۔

من ندانم نور یانار است اندر سینہ ام ایں قدر دانم بیاض او بہ مہتابے زند (۴)

تو خودی کو پردہ کہتا ہے۔ بے شک کہہ ، مگر میں تجھ سے کہتا ہوں ، خبردار! اس پردے کو چاک نہ کرنا کیونکہ دامان نگاہ تنگ ہے۔ نگاہ اسے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتی۔

خودی راپردہ میگوئی ؟ بگو ! من با تو ایں گویم مزن ایں پردہ را چاکے کہ دامان نگہ تنگ است (۵)

خودی کا ذوق میرے لئے شہد ہے۔ کیا کروں یہی میری کیفیت ہے۔ پہلے میں اس کیفیت کو خود آزماتا ہوں پھر اسے اہل مشرق کی نذر کرتا ہوں۔ اگر اس تحریر کو جبرئیلؑ پڑھ لیتے ، تو نور کو گرد کی طرح اپنے پروں سے جھاڑ دیتے۔ وہ اپنے مقام ورتبے پر نازاں ہونے کی بجائے ، فریاد کرتے اور اپنے دل کا حال اللہ تعالیٰ سے یوں بیان کرتے۔

---

(۱) زبور عجم۔ ۷۹۔ (۲) بال جبریل۔ ۲۲۔ (۳) زبور عجم۔ ۸۵۔ (۴) ایضاً۔ ۱۱۱۔ (۵) ایضاً۔ ۱۲۹۔

میں تجلی کو اتنا بے حجاب نہیں دیکھنا چاہتا میں جدائی کے غم پنہاں کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ میں وصل دوام سے دستبردار ہوتا ہوں تاکہ اہ وفغاں پاؤں مجھے آدم کا ناز و نیاز عطا ہو، میری جان کو آدم کا سوز وگداز ملے۔

مرا ذوق خودی چوں انگبیں است	چہ گویم واردات من ہمیں است
نخستیں کیف اورا آزمودم	دگر برخاوراں قسمت نمودم
اگر ایں نامہ را جبریل خواند	چوں گرد آں نور ناب از خود فشاند
بنا لد از مقام و منزل خویش	بہ یزداں گوید از حال دل خویش
تجلی را چناں عریاں نخواہم	نخواہم جز غم پنہاں نخواہم
گزشتم از وصال جاودانے	کہ بینم لذتِ اہ و فغانے
مراناز و نیاز آدمے دہ	بجان من گداز آدمے دہ (۱)

جیسے عشق کی تب و تاب کو فنا نہیں، اسی طرح ایمان و یقین اور ''نظارۂ جمال'' کی بھی انتہا نہیں۔ کمال زندگی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ عاشق زمان و مکان کی حدود پھلانگتے ہوئے باہر نکل جائے۔ ذات حق تعالیٰ سے اس طرح خلوت حاصل ہو کہ تو انہیں دیکھے اور وہ تجھے۔ اپنے آپ کو، رسول پاکؐ کے نور سے منور کر جنہوں نے ''من یرانی'' فرمایا تھا۔ ان پر سے نظر نہ ہٹا ورنہ تو خود باقی نہیں رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے آپ کو محکم رکھ۔ اس کے نور کے بحر میں ناپید نہ ہو جا۔ تیری شخصیت کے ذرّے کو ایسا اضطراب نصیب ہو کہ وہ حریم آفتاب میں بھی چمکتا رہے۔ یار کی ''جلوہ گاہ'' میں اس طرح سوختہ ہو کہ ''ظاہر'' میں تو چمک اٹھے اور ''باطن'' وہ چمک جائے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کا جمال دیکھ لیا وہی جہاں کا امام ہے۔ نہ کہ تجزیاتی فلسفی کہ اس کی حقیقت سے ہی انکاری ہے ہم سب ناتمام ہیں اور وہ مکمل ہے۔

تب و تاب محبت رافنا نیست	یقین و دید را نیز انتہا نیست
کمال زندگی دیدار ذات است	طریقش رستن از بند جہات است
چناں با ذات حق خلوت گزینی	ترا او بیند واورا تو بینی

(۱) زبور عجم۔ ۱۴۷۔

منور شو زنور ، ''من یرانی'' مژہ برہم مزن تو خود نمائی
بخود محکم گزر اندر حضورش مشو ناپید اندر بحر نورش
نصیب ذرہ کن آں اضطرابے کہ تابد در حریم آفتابے
چناں درجلوہ گاہ یار می سوز عیاں خود رانہاں اورابرافروز
کسے کو 'دید' عالم را امام است
من و تو ناتمام او تمام است (۱)

''حسن مطلق'' کے جلوے کی کوئی انتہا نہیں ۔ مختلف مظاہر کی صورت میں ''حسن ازل'' کی جتنی دید ہم کرتے ہیں اگر اس سے اربوں کھربوں گنا زیادہ ، مزید دید کریں تو پھر بھی ، دیدار نامکمل ہی رہے گا ۔

حسن مطلق کی دید و نادید اور اس کی صفات و حجابات کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے علامہ اقبال جاویدنامہ میں مولانا رومیؒ کے ہمراہ سیر افلاک کے دوران میں زروان فرشتے کے حوالے سے اس مسئلے کو حل کرتے ہیں ۔ جو ان کے ''ذوق جمال'' کا ایک دلچسپ و دلکش پہلو ہے ۔

زروان فرشتہ کہتا ہے میں عتاب بھی لاتا ہوں اور التفات بھی ۔ تشنگی پیدا کرتا ہوں تا کہ مشروب لاؤں ۔ میں ہی زندگی ہوں ، میں ہی موت ہوں اور میں ہی روز حشر ، میں ہی حساب کتاب ، میں ہی دوزخ و جنت اور اس کی حوریں ، آدم یا فرشتہ سب میرے اسیر ہیں ۔ یہ شش روزہ جہاں میری اولاد ہے ۔ ہر پھول جو تو شاخ سے توڑتا ہے ، وہ میں ہوں ، ہر چیز جو تو دیکھتا ہے ۔ اس کو جنم دینے والا میں ہوں ۔ یہ جہاں میرے طلسم میں اسیر ہے اور میرے سانس سے یہ ہر لحظہ بوڑھا ہوتا جاتا ہے ۔ مگر جس جواں مرد کے دل میں ''لی مع اللہ'' بیٹھ گیا ، وہ اس طلسم کو توڑ دیتا ہے ۔

اگر تو چاہتا ہے کہ میں درمیان میں نہ رہوں تو ''لی مع اللہ'' دوبارہ دل و جان سے پڑھ ۔ میں نہیں جانتا اس کی نگاہ میں کیا تھا ۔ کہ میری نگاہ سے یہ پرانا جہاں اوجھل ہوگیا ۔ یا تو میری نگاہ نے کوئی اور جہاں دیکھا یا یہی جہاں سارے کا سارا تبدیل ہوگیا ۔ میں اس کائنات رنگ و بود میں مرگیا اور ایسے جہاں میں پیدا ہوا ، جو ہنگامہ بغیر تھا ۔ اس پرانی دنیا سے میرا رشتہ منقطع ہوگیا اور ایک نیا جہان میرے ہاتھ آ گیا ۔ اس جہاں کے نقصان سے میری جان تڑپنے لگی ، یہاں تک کہ میری

---

(۱) زبور عجم ۔ ۱۶۷ ۔

خاک سے ایک نئے عالم نے جنم لیا۔ میرا بدن سبک تر اور روح تیز رفتار ہوگئی اور میرے دل کی آنکھ بیدار ہو کر اس کی بینائی تیز تر ہوگئی۔ چھپی ہوئی چیزیں بے حجاب ظاہر ہوگئیں اور میرے کانوں نے ستاروں کا یہ نغمہ سنا۔

هم عتابے هم خطابے آورم   تشنه سازم ، تاشرا بے آورم

من حیاتم من مماتم ، من نشور   من حساب و دوزخ و فردوس و حور!

آدم و افرشته دربند من است!   عالمِ شش روزه فرزند من است!

هرگلے کز شاخ می چینی منم   ام هر چیزے که می بینی منم!

درطلسم من اسیراست این جهاں   از دمم هر لحظه پیر است این جهاں

لی مع الله هر کرا در دل نشست   آں جوانمردے طلسم من شکست

گرتو خواهی من نباشم درمیاں

لی مع الله باز گو از عین جاں

در نگاه او نمیدانم چه بود   از نگاهم این کهن عالم ربود

یانگاهم بر دگر عالم کشود   یا دگرگوں شد هماں عالم که بود

مردم اندر کائناتِ رنگ و بو   زادم اندر عالم بے ہائے و ہو

رشتهء من زاں کهن عالم گسست   یک جهان تازهٔ آمد بدست

از زیان عالمے جانم تپید   تادگر عالم زخاکم بر دمید

تن سبک ترگشت و جاں سیار تر   چشم دل بینده و بیدار تر

پردگی ها بے حجاب آمد پدید

نغمهء انجم بگوشِ من رسید!

دررہ دوست جلوہ ہاست تازہ بتازہ نو بنو   صاحب شوق و آرزو دل نه دہد بکلیات (۱)

دل برنگ و بوے و کاخ و کومه   دل حریم اوست جز با او مده (۲)

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۲۶۔ ۲۷۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۷۳۔

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا (۱)

گویا کہ بدن کی اس مشت خاک سے گزرنے کے بعد دیدار ''حسن مطلق'' بے حجابانہ نصیب ہوتا ہے اور اس محبوب حقیقی کے نت نئے جلوے ہیں ۔ جن کی جھلک اس کی صفات میں صاف دکھائی دیتی ہے ۔ اور یہی کل یوم ھو فی الشان ہے ۔خودی کے بغیر خودی کا دیدار نہیں کیا جا سکتا اور خودی مصائب ہی سے پختہ ہوتی ہے ۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے چہرے سے پردے ہٹا دیتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو بھی پیش آئے خوب ہے ۔ دوست کی نامہر بانیاں بھی مبارک ہیں ۔ میری آنکھ اکیلی جلوۂ حق کو نہیں دیکھنا چاہتی ۔ حسن کو انجمن کے بغیر دیکھنا غلطی ہے ۔ اگر چہ اللہ تعالیٰ خلوت اور جلوت دونوں میں ہیں ۔ مگر خلوت آغاز ہے اور جلوت انتہا ۔خلوت کیا ہے ۔ درد وسوز اور آرزو ، خلوت ''حسن مطلق'' کی جستجو ہے اور جلوت اس کا دیدار ۔

از بلا ہا پختہ تر گردد خودی تا خدارا پردہ در گردد خودی
درہ حق ہر چہ پیش آید نکوست مرحبا نامہر بانیہائے دوست !
جلوۂ حق چشم من تنہا نخواست حسن را بے انجمن دیدن خطاست
چیست خلوت؟ درد و سوز و آرزوست انجمن دید است و خلوت جستجو است
گرچہ اندر خلوت و جلوت خداست خلوت آغازست و جلوت انتہاست (۲)

گویا کہ بے شک :۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائیؐ خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش خودی کی زد میں ہے ساری خدائی (۳)

بلاشبہ اس جہاں کی بنیاد خودی پر رکھی گئی ہے ۔ یہاں دلبری کے ساتھ قاہری کی بھی آمیزش ہے ۔ یعنی ''جلال و جمال'' باہم شیر وشکر ہیں ۔ کہیں خودی (حسن مطلق) ظاہر ہے کہیں مستور ۔ لیکن ہماری نگاہ اس کی تاب نہیں لا سکتی ۔ خودی کے نور کے اندر کئی اقسام کی آگ پوشیدہ ہے ، اسی کے ''طور'' سے کائنات میں رنگا رنگ جلوے ہیں ۔ اس دنیا میں ہر دل ہر

---

(۱) بال جبریل ۔۲۲۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۵۰ ۔ ۵۱ ۔ (۳) بال جبریل ۔ ۸۳ ۔

لحہ در پردہ طور پر خودی سے محو راز و نیاز ہے۔ جو کوئی خودی کی آگ سے حصہ نہیں پاتا، وہ اس جہان میں اپنے آپ سے ناآشنا رہتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔

از خودی طرح جہانے ریختند دلبری با قاہری آمیختند!
ہر کجا پیدا و ناپیدا خودی برنمے تابد نگاہ ماخودی
نارہا پوشیدہ اندر نور اوست جلوہ ہائے کائنات از طور اوست
ہر زماں ہر دل دریں دیرکہن از خودی در پردہ میگوید سخن
ہر کہ از نارش نصیب خود نبرد درجہاں از خویشتن بیگانہ مرد (۱)

جنت الفردوس میں زندہ رود سے حسن مطلق ''ندائے جمال'' کی صورت میں پوچھتا ہے، اے مرد نجیب! کیا تو جانتا ہے کہ زندہ رہنا کیا ہے؟ زندگی حق تعالٰی کے جمال سے حصہ پانا ہے۔ جس نے ہمارے جمال سے حصہ نہیں پایا۔ اس نے نخل حیات کا پھل حاصل نہیں کیا۔

چیست بودن دانی اے مرد نجیب؟ از جمال ذات حق بردن نصیب!
از جمال ما نصیب خود نہ برد از نخیل زندگانی بر نخورد (۲)

جب تک تو اللہ تعالٰی کے جمال سے حصہ نہ پائے گا۔ اس کے جمال سے بھی بہرہ اندوز نہ ہو سکے گا۔

تا نہ گیری از جلال حق نصیب ہم نیابی از جمال حق نصیب (۳)

انسان کو ہماری تجلی کے بغیر ثبات نہیں۔ ہمارا جلوہ ہی فرد و ملت کو حیات بخشتا ہے۔ فرد و ملت دونوں توحید سے کمال پاتے ہیں۔ فرد کی زندگی جمال ہے اور قوم کی جلال، ذرے یک نگاہی سے آفتاب بن جاتے ہیں۔ تو بھی یک نگاہ ہو جاتا کہ اللہ تعالٰی کو بے حجاب دیکھ سکے۔

بے تجلی نیست آدم راثبات جلوۂ ما فردوملت را حیات!
ہر دو از توحید می گیرد کمال زندگی ایں را جلال آں را جمال!
ذرہ ہا ازیک نگاہی آفتاب یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب! (۴)

---

(۱) جاوید نامہ۔۱۲۳۔ (۲) ایضاً۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ (۳) پس چہ باید کرد۔۱۴۔ (۴) جاوید نامہ۔۱۹۲۔

معروضی و تجزیاتی فلسفی کو سمجھانے کی خاطر اقبال کہتے ہیں کہ ''حسن مطلق'' جو کہ میرے اور تیرے افکار کی تگ و تاز کا مقصود ہے۔ وہ ہماری نظر کے اندر ہے، مگر نظر کی طرح نظر نہیں آتا۔ واقعی نظر سے ہم ساری دنیا دیکھتے ہیں مگر اپنی ہی نظر سے اپنی نظر کو نہیں دیکھ سکتے۔

آنچہ مقصود تگ و تاز خیال من و تست　　ہست در دیدہ و مانند نظر پیدا نیست　(۱)

پتلی کی طرح آنکھ سے مستور ہے تو　　آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو　خواجہ میر درد

اس کے بعد اقبال بلا واسطہ طور پر ''حسن مطلق'' سے مختلف انداز میں، سوسو طرح سے، التجا کرتے ہیں کہ ذات و صفات کے مختلف پردے اپنے رخ زیبا سے ہٹا دیجئے۔ اس لئے کہ ہم اس دنیائے چمن میں نرگس کی طرح بغیر پل جھپکے، آنکھ کھولے سراپا نظارہ ہیں۔

چشم آفریدہ ایم چو نرگس دریں چمن　　رو بند برکشا کہ سراپا نظارہ ایم　(۲)

نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے　　نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی　(۳)

اے میرے محبوب تو کب تک اپنے لطیف چہرے پر صبح و شام کے پردے ڈال رکھے گا۔ تیرے حسن کا نور اتنا درخشاں ہے کہ ان پردوں میں سے بھی چھن چھن کر باہر آرہا ہے۔ مگر صاف ظاہر ہے اس طرح تیرے حسن کی مکمل تجلی دکھائی نہیں دیتی۔ لہٰذا یہ پردے ہٹا دے۔ تاکہ میں مکمل طور پر تیرا دیدار کر سکوں۔ تیرے پنہاں اشاروں نے میرا دل اجاڑ دیا ہے۔ اب میں بیباک اور خونریز غمزہ چاہتا ہوں۔

چند بروئے خود کشی پردۂ صبح و شام را　　چہرہ کشا تمام کن جلوۂ نا تمام را　(۴)

اشارتہائے پنہاں خانماں برہم زند لیکن　　مرا آں غمزہ می باید کہ بیباک است و خونریز است　(۵)

پردہ چہرے سے اٹھا، انجمن آرائی کر　　چشم مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر

تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کب تک؟　　بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر　(۶)

تیرہ و تار ہے جہاں گردش آفتاب سے　　طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے　(۷)

عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں!　　یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۷۰۔ (۲) ایضاً۔ ۱۷۹۔ (۳) بانگِ درا۔ ۱۰۲۔ (۴) زبور عجم۔ ۵۵۔ (۵) ایضاً۔ ۱۳

(۶) بانگِ درا۔ ۲۷۹۔ (۷) بالِ جبریل۔ ۱۱۳۔ ''ذوق و شوق''

تو ہے محیط بیکراں ، میں ہوں ذرا سی آبجو　　یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بیکنار کر!
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو　　میں ہوں حزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر ! (۱)

فصل بہار ایں چنیں ، بانگ ہزار ایں چنیں　　چہرہ کشا ، غزل سرا ، بادہ بیار ایں چنیں (۲)

منزلے بخش ایں دل آوارہ را
باز دہ باماہ ایں مہ پارہ را (۳)

عقل گئی ، جنوں نے رنگ باندھا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ، اپنا جلوہ دکھا کیوں کہ میری جان عشق سے لبریز ہے ۔

گسست عقل و جنوں رنگ بست و دیدہ گداخت　　در آ بجلوہ کہ جانم زشوق لبریزاست (۴)

اگر آپ میرا اندرون کھو دیں تو سوائے اپنے جمال کے اور کچھ نہیں پائیں گے ، جیسے ریگستاں میں چاندنی پھیلی ہوتی ہے ۔

اگر کاوی درونم را خیال خویش رایابی　　پریشاں جلوۂ چوں ماہتاب اندر بیابانے! (۵)

اے ''حسن مطلق'' میں نے اپنے آپ کو ہر اس نقش سے پاک رکھا ہے ۔ جو نگاہ کے ذریعے دل پروارد ہو چونکہ میں آپ کے حسن پاکیزہ کا گدا ہوں ۔ اس لئے اپنا ادراک صاف رکھتا ہوں ۔

زہر نقشے کہ دل از دیدہ گیرد پاک می آیم　　گدائے معنیء پاکم تہی ادراک می آیم (۶)

اقبال متواتر ''حسن مطلق'' سے بے حجابانہ جلوہ افروز ہونے کی گزارش کر رہے ہیں ۔ چنانچہ یہاں بھی کہتے ہیں کہ ہم سے سامنے آکر بات کریں ۔ کم آمیزی کے دن بیت گئے ۔ جبکہ دوسرے یہ کہتے تھے : آپ ہم سے یہ چاہتے ہیں وہ چاہتے ہیں ۔

ہماری نگاہ شوق نے آپ کے دیدار کی خاطر آسمان میں رخنے ڈال دیئے ہیں ۔ اگر آپ کو حجاب ہی پسند ہے تو اور جہاں بنا لیجئے ۔ یہاں اقبال ''حسن مطلق'' سے دل لگی پر اتر آئے ہیں ۔

سخن بے پردہ گو باما ، شدآں روزے کم آمیزی　　کہ می گفتند تو مارا چنیں خواہی ، چناں خواہی

---

(۱) بال جبریل ۔ ۷ ۔　(۲) زبور عجم ۔ ۱۸ ۔　(۳) جاوید نامہ ۔ ۱۰ ۔　(۴) پیام مشرق ۔ ۱۹۸ ۔
(۵) زبور عجم ۔ ۳۳ ۔　(۶) ایضاً ۔ ۳۱ ۔

نگاہ بے ادب زد رخنہ ہا درچرخ مینائی   دگر عالم بنا کن گرحجابے درمیاں خواہی   (۱)

جیسے بھی ہو، چہرے سے پردہ اٹھایئے کہ میں آفتاب صبح کی مانند، آپ کے دیدار کی خاطر ہمہ تن نگاہ کھڑا ہوں۔

پردہ از چہرہ برافگن کہ چو خورشید سحر   بہر دیدار تو لبریز نگہ آمدہ ایم   (۲)

اس لئے کہ:۔

آدمی دید است باقی پوست است   دید آں باشد کہ دید دوست است   رومی

اقبال کے دل میں عشق نے اودھم مچا رکھا ہے کہ کسی طرح ''حسن ازل'' کا دیدار کر سکے۔ اس ضمن میں تمنا و آرزو کے ساتھ ساتھ، گلے شکوے بھی کئے جا رہے ہیں کہ مجھے خالق حقیقی سے گلہ ہے کہ اگر چہ اسے اپنی ذات کے اظہار کا بہت شوق ہے۔ لیکن اس نے مجھ سے وہ راز پوشیدہ رکھے ہیں، جن سے میں اس کے جمال کا پوری طرح نظارہ کر سکوں۔

من از کار آفرین داغم کہ با ایں ذوق پیدائی   زما پوشیدہ دارد شیوہ ہائے کار سازی را   (۳)

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں   تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ   (۴)

اے حسن ازل تو نور ازل ہے۔ اس جہان کی شب تاریک کو روشن کر، تجزیاتی فلسفی تجھے حقیقت نہیں مانتے، تو دست کلیم ہے، آستیں کے پردے سے باہر آ۔

نور قدیمی شب را بر افروز   دست کلیمی در آستینی!   (۵)

آیہ تسخیر کس کی شان میں ہے، یقیناً انسان کی شان میں ہے، اور یہ نیلا آسمان کس کی عظمت پر حیران ہے؟ علم لا سماء کا راز دان کون ہوا۔ اس ساقی اور اس کی ''شراب الست'' سے کون سرمست ہوا۔ اے حسن ازل آپ نے کسے سارے عالم میں سے منتخب فرمایا اور راز دروں سے محرم کیا۔ وہ میں انسان ہی ہوں۔ آپ کے تیر ناز نے میرا سینہ چھلنی کر دیا ہے۔ مجھے پکارو میں جواب دوں گا، کس نے کہا تھا اور کس سے کہا تھا؟ آپ کا چہرہ ہی میرا ایمان اور میرا قرآن ہے۔ آپ اپنے دیدار سے مجھے کیوں نہیں نوازتے، جس طرح آفتاب کا سینکڑوں شعاعیں بکھیر دینے سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، بلکہ راقم الحروف ذاتی طور پر یہ کہے گا، سورج دن رات غروب نہیں ہوتا ازل سے اب تک اپنے جلوۂ عام سے کائنات پر اپنے حسن کی تجلیاں نچھاور کر رہا ہے، مگر اس کے جمال میں سرمو کمی واقع نہیں ہوئی_____ اسی طرح اگر آپ مجھے اپنے''

---

(۱) زبور عجم۔ ۴۳۔ (۲) ایضاً۔ ۵۸۔ (۳) ایضاً۔ ۱۰۴۔ (۴) بانگ درا۔ ۹۸۔ (۵) زبور عجم۔ ۱۱۶۔

جلوہ جمال'' سے نواز دیں، تو آپ کے'' متاعِ حسن'' کے نور میں معمولی تجلی کی بھی کمی واقع نہیں ہوگی۔ گویا کہ اقبال کسی نہ کسی طرح سے دیدار ''حسنِ مطلق'' کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہی ان کے'' ذوقِ جمال'' کا مطمحِ نظر ہے۔

آیہء تسخیر اندر شان کیست؟ ایں سپہر نیلگوں حیران کیست؟

راز دان علم الاسما کہ بود؟ مست آں ساقی و آں صہبا کہ بود

برگزیدی از ہمہ عالم کرا؟ کردی انداز دروں محرم کرا؟

اے ترا تیر کہ مارا سینہ سفت حرف ''ادعونی'' کہ گفت و با کہ گفت؟

روے تو ایمان من قرآن من جلوہٗ داری دریغ از جانِ من؟

از زبانِ صد شعاع آفتاب

کم نمی گردد متاع آفتاب (۱)

اگر چہ میری مشت خاک سے سوائے کلام کے اور کچھ پیدا نہیں ہوتا مگر پھر بھی میرا کلام داستان ہجر کو پوری طرح سے بیان نہیں کر سکا۔ میں آسمان کے نیچے اپنے آپ کو غریب الوطن سمجھتا ہوں۔ آسمان کی اس طرف سے صدا دیجئے کہ میں قریب ہوں۔

گرچہ از خاکم نروید جز کلام حرف مہجوری نمی گردد تمام!

زیر گردوں خویش را یابم غریب زآنسوے گردوں بگو انی قریب (۲)

کلی کو دیکھ، کہ ہے تشنۂ نسیم سحر اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ! (۳)

تا کہ اس جہان کی جہات چاند سورج کی مانند نظروں سے اوجھل ہو جائیں، میں قید و مکاں سے آزاد ہو جاؤں اور میں ماضی و مستقبل کے طلسم اور مہ و مہر و ثریا کے ہاں سے نکل جاؤں، یعنی قید زماں سے بھی رہا ہو جاؤں۔

تامثال مہر و مہ گردد غروب ایں جہات و ایں شمال و ایں جنوب

از طلسم دوش و فردا بگذرم از مہ و مہر و ثریا بگذرم (۴)

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۸۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۱۰۔ (۳) بالِ جبریل۔ ۵۱۔ (۴) جاوید نامہ۔ ۱۰۔

ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیئے
چشم باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیئے (۱)

اقبال اپنے ''ذوق جمال'' کے تحت زمان و مکان کو حسن مطلق کے چہرے پر پڑے ہوئے پردے قرار دیتے ہیں۔وہ ہر وقت اسی تڑپ میں رہتے ہیں کہ کس طرح زمان و مکان کے حجابات کو تار تار کرتے ہوئے ''حسن مطلق'' سے نظریں چار کریں ۔ کہ اتنے میں نوائے طاہرہ سنائی دیتی ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ''حسن ازل'' کا نورانی جلوہ دیکھنے کی آرزو میں اپنے دل کے اندر ذوق وشوق کا وہ سیل رواں لئے ہوئے ہے کہ جس کا تھامنا ممکن نہیں ۔ ہجر و وصال کی کوندتی بجلیاں اس غزل میں ، باہم گلے ملتی دکھاتی دیتی ہیں ۔ ایسے میں آنکھوں کی برستی گھٹاؤں اور آنسوؤں کے چھلکتے موتیوں نے آہوں کے دھوئیں سے مل کر عشق آموزی و دل سوزی کی ایسی دردناک فضا قائم کر دی ہے کہ پڑھنے سننے والے کے رگ و پے میں بھی دردِ عشق کا کرب سرایت کرتا محسوس ہوتا ہے ۔ یہ غزل اپنے آتشناک نالہ وفریاد کی بناء پر دنیائے عشق و جمال میں بے مثال ہے ۔

ان اشعار کی تاثیر فوری طور سے انسان پر بے خودی طاری کر دیتی ہے ۔ اگر کوئی شخص یہ غزل پڑھ ،سن کر سمجھنے کے باوجود سرمست نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سینے میں دل ہی نہیں ۔ اس غزل میں ایران کی شاعرہ ، طاہرہ نے ''حسن مطلق'' کو مجسم انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ،اگر تجھ پر اس طرح نظر پڑے کہ تو میرے رو برو ہو اور میرا چہرہ تیرے چہرے کے سامنے ہو ،تو میں تیرے عشق کا غم ''نکتہ بہ نکتہ''اور''مو بہ مو'' یعنی پوری وضاحت سے بیان کروں ۔ تیرا چہرہ دیکھنے کے لئے میں نے صبا کی مانند خانہ بخانہ ، دربدر ، کوچہ بکوچہ اور گلی گلی چھان ماری ہے ۔ تیری جدائی میں میرے دل کا خون ، دونوں آنکھوں کے راستے آنسوؤں کی صورت میں دجلہ دجلہ ،سمندر سمندر ، چشمہ چشمہ اور ندی ندی بہ رہا ہے ۔ اے ''حسن ازل'' ! میرے غمگین دل نے تیری محبت کو اپنی جان کی ایک ایک رگ ، ایک ایک نخ ، ایک ایک تار اور ایک ایک پور پر بن لیا ہے ۔ طاہرہ نے اپنے دل کے اندر نظر ڈالی ۔مگر اسے دل کے صفحہ صفحہ ، ورق و رق ، پردہ پردہ اور تہ درتہ میں تیرے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا ۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو   شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ ،مو بہ مو!

---

(۱) بانگِ درا ۔ ۴۸۔

از پے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام — خانہ بخانہ ، در بدر ، کوچہ بکوچہ کو بکو!

می رود از فراق تو خون دل از دودیدہ ام — دجلہ بہ دجلہ ، یم بہ یم ، چشمہ بہ چشمہ ، جو بجو !

مہر ترا دل حزیں بافتہ برقماش جاں — رشتہ بہ رشتہ ، نخ بہ نخ ، تار بہ تار ، پو بہ پو!

در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا

صفحہ بہ صفحہ ، لا بہ لا ، پردہ بہ پردہ تو بہ تو (۱)

بعد ازیں علامہ محمد اقبال محبوب حقیقی کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں کہ ، ابھی تک میری خاک میں وہ شرر باقی ہے ۔ ابھی تک میرے سینے میں آہ سحر موجود ہے ۔ میری چشم پر اپنی تجلی ڈالیے ۔ اس پیری میں بھی میرے اندر دیکھنے کی سکت موجود ہے ۔

ہنوز ایں خاک دارائے شرر ہست — ہنوز ایں سینہ را آہ سحر ہست

تجلی ریز برچشم کہ بینی — بایں پیری مرا تاب نظر ہست! (۲)

اور اے حسن ازل ! آپ چاند ہیں میرے شبستان کی طرف آیئے ۔ اور ذرا میری جان کی تاریکی کو دیکھئے ۔ شعلے کو خس و خاشاک جلانے سے پرہیز کیوں ہو ۔ بجلی کو گرنے سے کیا خوف؟ میں جب تک جیا ہجر و فراق ہی میں جیا ۔ مجھے دکھایئے کہ اس نیلے آسماں کے پرے کیا ہے ۔ مجھ پر بند دروازے کھول دیجئے ۔ اس خاکی کو نوریوں کا ہمراز بنایئے ۔ میرے دل میں آتش عشق بھڑکا دیجئے ۔ عود کو باقی رہنے دیجئے اور ایندھن کو جلا دیجئے ۔ پھر اس عود کو آگ پر رکھئے اور اس کا دھواں سارے جہاں میں پھیلا دیجئے ۔ میرے پیمانے کی ، یعنی دل کی آگ کو تیز کر دیجئے ۔ تغافل کے ساتھ ایک نظر بھی ملا دیجئے ۔ گویا کہ نظر ملانے سے عشق اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے ۔ یا اس پردۂ اسرار کو ہٹا دیجئے ۔ یا دیدار سے محروم اس جان کو واپس لے لیجئے ۔

تو مہی ، اندر شبستانم گذر — یک زماں بے نوری جانم نگر

شعلہ را پرہیز از خاشاک چیست — برق را از برفتادن باک چیست

زیستم تا زیستم اندر فراق — وانما آنسوے ایں نیلی رواق!

---

(۱) جاوید نامہ ۔ ۱۱۸ ۔ ۱۱۹ ۔ "نوائے طاہرہ" ۔ (۲) ارمغان حجاز ۔ ۵۰ ۔

بستہ در با را بروبم باز کن خاک را باقدسیاں ہمراز کن !
آتشے در سینۂ من برفروز عود را بگذار و ہیزم را بسوز
باز بر آتش بنہ عودِ مرا در جہاں آشفتہ کن دودِ مرا
آتشِ پیمانۂ من تیز کن باتغافل یک نگہ آمیز کن
پاکشا ایں پردۂ اسرار را
یا بگیر ایں جان بے دیدار را (۱)

اقبال کہتے ہیں اے ''حسن مطلق''! جس طرح صبح کے وقت کلی اپنا سینہ کھول دیتی ہے اور سورج اپنے نور کی کرنیں اس کے سینے کے اندر داخل کر دیتا ہے۔ کلی دل کھول کر اپنے محبوب کی دید کے مزے لوٹتی ہے۔ اسی طرح تو بھی مجھے اپنے دیدار و وصال سے نواز دے۔

جب دکھاتی ہے سحر عارض رنگیں اپنا کھول دیتی ہے کلی سینہ زرّیں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں
سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے
مرے خورشید! کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہِ بیتاب
تیرے جلوے کا نشیمن ہو مرے سینے میں عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں
زندگی ہو ترا نظارہ مرے دل کے لئے روشنی ہو تری گہوارہ مرے دل کے لئے
ذرّہ ذرّہ ہو مرا پھر طرب اندوزِ حیات ہو عیاں جو ہر اندیشہ میں پھر سوز حیات
اپنے خورشید کا نظارہ کروں دورسے میں صفت غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں
جان مضطر کی حقیقت کو نمایاں کردوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کردوں (۲)

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۹۔ (۲) بانگِ درا۔ ۱۱۸۔ ''کلی''

اس طرح اقبال محبوب حقیقی کے عشق میں اس قدر محو ہیں کہ سو سو انداز سے نقاب کشائی کی التماس کرنے کے بعد عرض کرتے ہیں، اس امید پر کہ ایک روز آپ شکار کے لئے آئیں گے، یعنی مجھے اپنے دیدار سے نوازیں گے، میں مجازی محبوبوں کی کمندوں سے غزال کی طرح بھاگتا رہا۔ چنانچہ میں قیامت کے روز آپ کے حضور "قلب سلیم" لے کر حاضر ہوں گا۔ نہ میں نے کسی اور کو دل دیا ہوگا اور نہ دونوں جہانوں کو محبوب رکھا ہوگا۔

بہ امید ایں کہ روزے شکار خواہی آمد　　زکمند شہریاراں رم آہوا نہ دارم　　(۱)

دل بکسے نباختہ ، بادوجہاں نساختہ!　　من بحضور تو رسم ، روز شمار ایں چنیں　　(۲)

اقبال کے "ذوق جمال" کے حوالے سے ہم مختلف مراحل سے گزرے ہیں۔ جن میں موضوعیت و معروضیت کے سلسلے میں حسن فطرت وحسن انسانی پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔ کہ درحقیقت یہ دنوں ایک ہی ہیں۔ اس لئے کہ جس کی یہ عکاسی کرتے ہیں۔ وہ حقیقت ہی یکتا ہے۔ تجزیاتی و تصوراتی فلسفی عقل و خرد کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ حقیقت کا راز صرف عشق ہی انشا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اقبال کیا خوب فرماتے ہیں۔

کشودم از رخ معنی نقابے　　بدست ذرّہ دادم آفتابے　　(۳)

عشق ہی عاشق کو دونوں جہانوں کا راز، دل کے آئینے میں منعکس کر کے دکھاتا ہے۔ اور دو عالم را تو اں دیدن بمینائے کہ من دارم، کے مصداق عشق کے لئے "حسن ازل" تک رسائی حاصل کر لینا، دور کی بات نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ "حسن مطلق" تمام مظاہر میں جلوہ افروز ہے۔ اس کی چمک بجلی میں، شرارے میں، سورج چاند اور تارے میں ہے۔ کسک اس کی دل عاشق کے گھوارے میں اور کشش حسن انسانی کے مہ پارے میں ہے۔ وہ پھول میں رنگ و خوشبو ہے، جس کی مہک چہارسو ہے۔ خلوت وجلوت میں وہ ہمارے روبرو ہے۔ جس نے اسے پہچان لیا وہ سرخرو ہے۔ اقبال بجا طور سے کہتے ہیں کہ:۔

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے　　انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا　　آنکھوں میں ہے سلیمیٰ تیری کمال اس کا

گفت ایں علم و ہنر ؟گفتم کہ پوست　　گفت حجت چیست ؟ گفتم روے دوست　　(۴)

---

(۱) زبور عجم۔ ۲۱۔ (۲) ایضاً۔ ۱۸۔ (۳) زبور عجم۔ ۱۳۶۔ (۴) جاوید نامہ۔ ۳۷۔

حسن مطلق بے شک مظاہر اور ذات وصفات کے پردوں میں ہے، لیکن اقبال کہتے ہیں کہ دیدۂ دل وار کھنے والوں کے لئے حس ازل ہر کہیں ظاہر ہے۔ وہ اس درجہ نورانی وسبحانی ہے۔ کہ فطرت کے باریک ولطیف پردوں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ اگر کوئی اپنے آپ کو دیکھ سکتا ہے تو خدا کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ ہاں اگر انسان انسان نہ ہو محض تصویر بنا کسی دیوار سے لٹکا رہے تو نہ خود کو دیکھ سکتا ہے نہ حسن مطلق کی دید کا یارا اس میں ہوتا ہے۔ اور اگر وہ عاشق حسن مطلق ہے تو پھر اقبال کہتے ہیں کہ:۔

جہاں میں دانش وبینش کی ہے کس درجہ ارزانی ! کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسمہائے پنہانی
یہ دنیا دعوت دیدار ہے فرزند آدم کو کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوق عریانی (۱)

علاوہ ازیں علامہ محمد اقبال جاوید نامے میں بھی کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی ذات کے دیدار کے لئے یہ عالم حجاب نہیں۔ سطح آب کے نقوش غوطہ لگانے میں حائل نہیں ہوتے۔ تجزیاتی وتصوراتی فلسفیوں کو رہنے دیجئے، اہل عشق قلب سلیم کے ساتھ حقیقت مطلقہ کی حضوری میں رہتے ہیں۔

ذات حق را نیست ایں عالم حجاب غوطہ را حائل نگردد نقش آب (۲)

اقبال کہتے ہیں ''حسن مطلق'' جہاں بھی ہو اس تک پہنچنا میرے لئے کوئی ناممکن بات نہیں۔ ٹھیک ہے میں خاکی ہوں، میرا بدن مٹی سے بنا ہے، لیکن میری روح تو مٹی کی نہیں۔ بدن کے پر نہ سہی لیکن روح کے پر تو ہیں۔ اور میری روح میرے مٹی کے بدن میں ہے۔ روح کے اندر طاقت پرواز ہو تو بدن کو بھی اپنے ساتھ لے اڑتی ہے۔ لہٰذا:۔

ایں بدن باجانِ ما انباز نیست مشت خاکے مانعِ پرواز نیست (۳)

روح کے جوہر کی کوئی مثال نہیں، وہ مٹی کی قید میں ہوتے ہوئے بھی آزاد ہے:۔

جوہرش باہیچ شے مانند نیست ہست اندر بند و اندر بند نیست (۴)

تو کہتا ہے کہ ہمارا طائر روح جال کے نیچے ہے۔ اس کے پر وبال کے لئے پرواز ناممکن ہے۔ روح کی معنویت تن کی وجہ سے بلند تر ہوگئی ہے۔ اس لئے کہ ہمارا نیام یعنی ''بدن'' ہمارے خنجر گویا کہ ''روح'' کے لئے سان کا کام کرتا ہے۔

---

(۱) ارمغان حجاز۔ اردو۔ ۵۰۔ ''حضرت انسان''۔ (۲) جاوید نامہ ۳۸۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۴۴۔ (۴) ایضاً۔ ۱۶۳۔

عمل بدن کرتا ہے اور ارتقا روح کرتی ہے۔

توگوئی طائر ما زیر دام است | پریدن بر پروبالش حرام است
زتن برجستہ تر شد معنئی جاں | فسان خنجر ما از نیام است (۱)

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشہ چالاک | رکھتی ہے مگر طاقت پرواز مری خاک!
وہ خاک، کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک | وہ خاک، کہ جبریل کی ہے جس سے قباچاک!
وہ خاک، کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی | چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک!

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک! (۲)

تو مطلب یہ کہ ایک طرف ہست و بود کا یہ سارا ہنگامہ ''حسن مطلق'' کے جمال کے بغیر خود بخود معرض وجود میں نہیں آ گیا۔ بلکہ یقیناً ''حسن ازل'' نے اسے تخلیق فرمایا ہے۔ نقش میں اپنے نقش گر کا کمال ضرور جھلکتا ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں ڈرامائی اور مکالماتی انداز میں ''ندائے جمال'' آتی ہے کہ:۔

ایں ہمہ ہنگامہ ہائے ہست و بود | بے جمال ما نیا ید دروجود! (۳)

تو دوسری طرف عشق بھی کہتا ہے کہ ''حسن مطلق'' جہاں جہاں بھی ہے یا جہاں کہیں بھی ہے، اس تک رسائی کوئی مشکل کام نہیں۔ کیوں کہ ''حسن مطلق'' تو زمینوں اور آسمانوں کے چپے چپے کو اپنی تجلی سے منور کئے ہوئے ہے۔ زمینوں و آسمانوں اور زمان و مکاں کی اصطلاحیں تو ہمارے لئے ہیں۔ ''حسن ازل'' کے لئے تو کل کائنات بھی ایک انچ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ''ان اللہ علی کل شی قدیر'' وہ تو قادر مطلق ہے۔ اقبال کہتے ہیں اس کے جمال کے بغیر کوئی چیز معرض وجود میں آتی ہی نہیں۔ جس سے ثابت ہوا کہ ''حسن مطلق'' ہر کہیں موجود ہے۔ ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔۔ اور پھر ویسے بھی، مشت خاکے مانع ء پرواز نیست کے مصداق نزدیک سے نزدیک اور دور سے دور تک جہاں کہیں بھی جائیں قدم قدم پر موجودات و تخلیقات کی صورت میں نئے نئے ''طور'' اور تجلیات ''حسن ازل'' جلوہ گر ہیں۔ پس اقبال فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں:۔

---

(۱) پیامِ مشرق۔ ۵۷۔ ''لالہ طور''۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۲۹۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۱۹۱۔

خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ   تو شعلۂ سینائی ، میں شعلۂ سینائی
ہر لحظہ نیا طور ، نئی برق تجلی   اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے   (۱)

اس کے بعد اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ:۔

چشم درکشت محبت کاشتم
از تماشا حاصلے برداشتم   (۲)

تو نہ صرف اپنے ''ذوق جمال'' بلکہ دنیائے جمال کا حسن آمیز، دل آویز اور عشق انگیز نچوڑ پیش کر کے رکھ دیتے ہیں۔ جس میں عاشق ہمہ تن دید دوست دکھائی دیتا ہے۔ سبحان اللہ کیا باریک بینی اور نازک خیالی ہے۔ عشق و محبت کی کھیتی میں آنکھ کا بیج بونا اور پھر اس ایک بیج سے چشم و نظر کا پورا خرمن حاصل کرنا اور پھر اس سارے خرمن کو بو کر ''دل و نظر'' کے ان گنت خرمن کما لینا۔ اور بوائی و کٹائی کا یہ سلسلہ بار بار دہراتے ہوئے دل و نظر کی روشنی میں مسافت پہ مسافت طے کرتے ہوئے، عقل و خرد کے مارے ہوئے، ڈارون جیسے فلسفیوں سے ہٹ کر، عاشق اپنی ابتداء نہیں بلکہ انتہاء کے بارے میں سوچتے ہوئے بلند سے بلند تر، پرواز کے ذریعے'' حسن مطلق'' تک جا پہنچتا ہے۔ ''حسن مطلق'' لا انتہا ہے تو چشم درکشت محبت کاشت کرنے والے کی نظر کی بھی کوئی انتہا نہیں، اسی لئے یہ عاشق ''حسن مطلق''، کے اس قدر قریب ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے عاشق کو اپنا مقصود و منتہا بنا لیتا ہے۔ جب عاشق، مقصود کل بن جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اس سے ماورا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ پوری کائنات اس کی مٹھی میں آ جاتی ہے۔

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے؟
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے!   (۳)
اگر مقصود کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے؟
مرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے؟   (۴)

---

(۱) ضرب کلیم۔ ۱۲۷۔   (۲) اسرار خودی۔ ۲۱۔   (۳) بال جبریل ۔ ۵۵۔   (۴) ارمغان حجاز۔ ۵۰۔

باب چہارم

اقبال کی "حسن کاری"

اقبال کی ''حسن کاری''

عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے | اوروں کا ہے پیام اور ، میرا پیام اور ہے
یہ بھی سنو کہ نالہء طائر بام اور ہے | طائر زیر بام کے نالے تو سن چکے ہو تم (۱)

حسن کو جب مجسم انداز میں پیش کیا جائے تو ''فن'' کہلاتا ہے ۔ اور فکر وفن کے باہمی آمیزے کو''فن پارہ'' کہتے ہیں۔ جبکہ میرے نزدیک ''حسن پارہ''زیادہ مناسب ہے ۔ اب تک حسن کو مجسم کرنے والے کوفن کار کہتے ہیں ۔ لیکن حسن کی مناسبت سے فن کار کو،''حسن کار'' کا نام دیتا ہوں ۔ اس لئے کہ حسن کار میں معنی خیزی کے ساتھ ساتھ دل آویزی بھی ہے ۔ ایک غزل میں الفاظ کی نشست و برخاست مطلع ومقطع ، بحر اور قوانی وردیف ،فن کے زمرے میں آتے ہیں ۔ جبکہ غزل کے شعر میں جو خیال پیش کیا جاتا ہے وہ فکر ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر کلام اقبال ہی میں ، بال جبرئیل کی پہلی غزل لے لیجئے ۔ کہ میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں ، اس غزل کی ہیت فن اور جو سوچ یا مضامین جو اس غزل میں باندھے گئے ہیں وہ فکر کے دائرے میں آئیں گے ۔ اسی طرح شعر و ادب کی ہر صنف کا حسن پارہ ،خواہ وہ ناول ، افسانہ ، ڈرامہ یا نظم ہو مذکورہ بالا تعریف پر پورا اترتا ہے ۔ شعر و ادب کے سلسلے میں خیال و جذبہ کے علاوہ دکھائی دینے والا مواد چونکہ الفاظ ہوتے ہیں ، اس لئے شعری وادبی فن کو لفظی ''تجسیم نگاری'' کہا جائے تو بے جانہ ہوگا ۔

مصوری ،سنگ تراشی اور فن تعمیر میں بھی فکر وفن باہم شیر وشکر دکھائی دیتے ہیں ۔ جس کے نتیجے میں ایک مجسم حسن پارہ معرض وجود میں آتا ہے ۔ یہ تینوں فنون تجسیم سازی یا تجسیم گری کہلاتے ہیں ۔ اس لئے کہ ان میں کوئی مجسمہ ،تصویر یا عمارت بنا کر پیش کی جاتی ہے ۔ یہ تمام فنون ، فنون لطیفہ کہلاتے ہیں ۔ اس لئے کہ ان میں ''حسن و جمال'' کو پیش کیا جاتا ہے ۔ نقادوں نے ،مصوری ،تعمیر اور مجسمہ سازی کو فنون مفیدہ کہا ہے ، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ، کیا شعر وسخن مفید نہیں ہوتے ؟ یہ بھی تو ہر لحاظ سے مفید ہوتے ہیں ۔

جان رسکن مشینوں اور کارخانوں میں تیار ہونے والی اشیاء کو فنون لطیفہ کے زمرے میں شمار نہیں کرتا۔وہ کہتا ہے کہ:۔

''فن لطیف وہ ہے ،جس میں انسان کے ہاتھ ، دماغ اور دل تینوں مل کر کام کرتے ہیں ۔ اور یاد رکھو ہاتھ ہر شے

---

(۱) بانگ درا ۔ ۱۱۴

کی تہ میں ہونا چاہیئے ۔ اسے ہر شے پر سبقت بھی لے جانا چاہیئے ۔

کیوں کہ فن لطیف کی لازمی طور پر ہاتھ ہی سے تخلیق ہونی چاہیئے اور اس سے زیادہ واضح مفہوم میں ہونی چاہیئے جو صنعت سے لیا جاتا ہے ۔ فن لطیف کو ہمیشہ لطیف مشین کے ساتھ ، جو انسان کا ہاتھ ہے پیدا کرنا چاہیئے ۔ ۔ ۔ پورے طور پر مکمل فن لطیف وہ ہے جو دل سے نکلتا ہے ۔ اور جو ایسے تمام شریفانہ جذبات پر مشتمل ہوتا ہے ، جن سے دماغ موافقت پیدا کر لیتا ہے ۔ لیکن دماغ دل سے درجے میں ادنیٰ ہے ۔ اور ہاتھ دل و دماغ دونوں سے کم تر ہے ۔ فن لطیف اس طرح سے کل انسان کو اجاگر کر دیتا ہے ۔" (۱)

جیسا کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ افلاطون فن کو تیسرے درجے کی نقالی سمجھتے ہوئے رد کر دیتا ہے ۔ اس لئے کہ افلاطون کے نزدیک فطرت اعیان کا عکس ہے ۔ اس طرح فطرت بذات خود ، دوسرے درجے کی نقل ٹھہرتی ہے ۔ اور فن نقل کی نقل ہوتے ہوئے ، تیسرے درجے کی نقل کا درجہ پاتا ہے ۔

مگر اس کے برعکس جان رسکن فطرت کو ترجمان و آئینہ دار حقیقت مانتا ہے ۔ اسی بناء پر وہ فطرت کو فن کا مثالی نمونہ قرار دیتا ہے ۔ رسکن کی نظر میں فطرت ہی "حسن و کمال" کا شاہکار اور فن کا مقصود و منتہا ہے ۔ چنانچہ اسکے نزدیک جو حسن کار فطرت کے نمونے سے منحرف ہوتا ہے وہ گمراہ اور "کور ذوق" ہے ۔ اور اس کا ہر حسن پارہ باطل ہونے کی بناء پر جمالیات میں کسی فنی حیثیت کا حامل نہیں ہو سکتا ۔ فطرت کو مشعل راہ سمجھتے ہوئے جان رسکن نے جمالیات میں ، دبستان فطریت یا حقیقت کی داغ بیل ڈالی ۔ جس کی رو سے فطرت کو ملجا و ماوا گردانتے ہوئے اس کی تقلید میں فنی عظمت کا راز پوشیدہ ہے ۔
علامہ اقبال چونکہ تقلید ، پیروی یا نقل کے خلاف ہیں ۔ اس لئے انہوں نے ردعمل کے طور پر "فطریت" کے مقابلے میں "فوق الفطرت" کی صدا بلند کی ۔ نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں :۔

" نظریہ فطریت کے برخلاف ، بظاہر ایک ترقی یافتہ نظریہ یہ ہے کہ فن ، فطرت سے ارفع ہے اور اسے ایسا ہونا بھی چاہیئے ، کیوں کہ فنکار فطرت سے زیادہ ہنر مند ہے ۔ دور جدید میں اس نظریے کا سب سے بڑا علمبر دار اقبال ہے ۔" (۲)

اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبال کی شاعری میں وہ قوت و حوصلہ پایا جاتا ہے جو "حسن کار" کو فطرت پر بازی لے جانے کے

---

(1) Ruskin: Unto This Last - Twopaths, Book 2-pp-89-87

(۲) تاریخ جمالیات ۔ ۷۸ ۔ ۷۹ ۔ جلد دوم ۔

لئے ہمہ وقت تیار کرتا رہتا ہے ۔ جس کے بارے میں آئندہ صفحات پر بات ہوگی۔

غزل آں گوکہ فطرت سازِ خود را پردہ گرداند

چہ آید زاں غزل خوانے کہ بافطرت ہم آہنگ است (۱)

علاوہ ازیں چارلس پلانک (فرانسیسی عالم جمالیات ولکھاری) کہتا ہے کہ حسن فطرت میں پایا جاتا ہے ۔ اور انسانی قلب ہی اسے محسوس کر سکتا ہے ۔ بذات خود فطرت کو بھی اپنے حسن کا احساس نہیں ہوتا ۔ گویا کہ حسن فقط انسان کے قلب میں ہوتا ہے ۔ اس لئے جو فنکار حسن کا عرفان حاصل کر لیتا ہے وہ فطرت سے عظیم ہوتا ہے ۔ فطرت سے عظیم ہونے میں تو اقبال اور چارلس پلانک کا نقطہ نظر ایک ہی ہے ۔ مگر دوسری بات کہ فطرت کو اپنی خوبصورتی کا علم نہیں ہوتا ، مشکوک ہے ، ہمیں کیا معلوم اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ فطرت اپنے حسن سے نابلد ہے ؟ اقبال کے ہاں حسن زندگی کا استعارہ بھی ہے ۔ اور زندگی کم از کم ہر کہیں اپنے بارے میں بنیادی معلومات ضرور رکھتی ہے ۔ پھر زندگی کا ہر روپ اپنی زندگی کے مختلف طور طریقے رکھتا ہے اور کیا انسان فطرت کا حصہ نہیں ؟ کیا خوبصورت انسان فطرت سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوتا ۔ کیا ایسے انسان نہیں جنہیں دیکھ کر پھولوں کے چہرے شرمندہ ہو جاتے ہیں ؟ کہیں تو پھول کا شباب انسان کے شباب سے بڑھ کر ہوتا ہے اور کہیں انسان کا شباب اتنا طوفانی ہوتا ہے کہ پھول کیا ، مہر و مہتاب بھی اس کی تاب نہیں لا سکتے ۔

ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ فطرت پہ شاعروں و ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے یا لکھتے ہیں ، ممکن ہے فطرت اس سے باخبر نہ ہو ۔ شمع و پروانے اور گل و بلبل کی بلا جانے کہ شاعروں نے ان کے بارے میں زمین و آسماں کے قلابے ملا رکھے ہیں ۔ لیکن حسن کی پہچان والا معاملہ ذرا دوسرا ہے اسی لئے تو اقبال کے نزدیک ، شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں ۔

چارلس پلانک یہ بھی کہتا ہے کہ فطرت کا حسن فانی ہے ۔ مثلاً "ایک زندہ عورت اپنی ساری زندگی حسین بننے اور حسن کھو دینے میں گزار دیتی ہے ۔ مگر اسے حسن مکمل کا ایک لمحہ تک بھی نصیب نہیں ہوتا" ۔ (۲)

حسن پر بات کرتے ہوئے میں پچھلے باب میں کہہ آیا ہوں کہ حسن فانی نہیں ہوتا ۔ بلکہ حسین فانی ہوتا ہے ۔ ویسے بھی کھوئی ہوئی چیز کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فنا ہوگئی ہے ۔ وہ ضرور کسی نہ کسی مقام پر موجود ہوتی ہے ۔ اور کسی بھی موڑ پر دوبارہ مل سکتی ہے ۔ رہی دوسری بات تو یہاں چارلس پلانک نے خود بھی عورت کو فطرت کا حصہ مان لیا ہے ۔ جسے اپنے حسین ہونے

---

(۱) زبور عجم ۔ ۱۲۹۔

(2) The Philonophy of the beautiful, P 129 Knight

یا نہ ہونے کا شدید احساس ہے۔

اس کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اقبال فن کے بارے میں کون سے خیالات رکھتے ہیں ۔ اگر کلام اقبال کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ فن کے لئے ''حسن وعشق''، خودی اور حرکت وعمل کو ناگزیر سمجھتے ہیں ۔ اور انہی عناصر سے ان کا ''ذوق جمال'' تشکیل پاتا ہے۔فن کا ''کسبی'' یا ''وہبی'' ہونا ہمیشہ بحث طلب مسئلہ رہا ہے۔جس کے متعلق عموماً دومختلف نظریے دیکھنے میں آتے ہیں ۔ ایک کے نزدیک فنی صلاحیت کلی طور پر ''وہبی'' ہوتی ہے ۔ جس میں فنی وتخلیقی صلاحیت اللہ کی دین ہے ۔ جسے چاہئے نواز دے ، جس میں حسن کار کی اپنی کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا ۔

اس کے برعکس دوسرے نظریے کا دعویٰ ہے ۔کہ ہر شخص کوشش و اکتساب کے بل بوتے پر ''حسن کار'' بن سکتا ہے ۔ کانٹ کا تعلق '' وہبی نظریہ فن'' سے ہے ۔جس کے نزدیک '' فنکاری عبقریت کا نام ہے اور عبقریت سے مراد جمالیاتی تصورات کی شبیہ گری ہے ۔ کانٹ علم اورفن کے مابین اسی بناء پر امتیاز کرتا ہے کہ علم اکتسابی ہے اورفن وہبی۔ چنانچہ علم حاصل کرنے یا سیکھنے کے لئے انسان کو اس عطیہء فطرت یعنی عبقریت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ شعوری عقل کی عملیاتی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسی لحاظ سے فن ،فن عبقریت بھی کہلاتا ہے ۔'' (۱)

> بوزنکٹ کے مطابق:۔'' نیوٹن کی طرح ہر کوئی علم سیکھ سکتا ہے ۔لیکن تخیلات کی موجودگی کے باوجود ہر کوئی شاعر نہیں بن سکتا۔فن لطیف اس خصوصیت کی وجہ سے فطرت کے ساتھ گہری مشابہت کا حامل ہے۔'' (۲)

علامہ محمد اقبال کے نزدیک یہ دونوں مکتبہ فکر ناقص ہیں ۔ اس لئے کہ اقبال کے نزدیک فنی صلاحیت ''وہبی'' ہونے کے ساتھ ساتھ ''اکتسابی'' بھی ہے ۔ بے شک فنی صلاحیت کا موتی ''حسن کار'' کوفطری طور پر عنایت کیا جاتا ہے ۔مگر اس گوہر نایاب کو معدن قلب سے باہر نکالنے اور تاب دار و آب دار بنانے کے لئے محنت و جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے ۔

لطف بڑھ جاتا ہے اقبال سخن گوئی کا　　　شعر نکلے صدف دل سے گہر کی صورت

اور وہ جو تخم فن عطیہء خداوندی ہے ۔اس نکتے کی ترجمانی یوں کرتے ہیں ۔

قبائے علم و ہنر لطف خاص ہے ورنہ　　　تیری نگاہ میں تھی میری ناخوش اندامی　(۳)

---

(1)Art of Genious.

(2) Basanquet, A History of Aesthetic p-297-　(۳) بال جبریل ۔۷۳۔

اقبال کے نزدیک شعر وسخن ایسی حسن کاری ہے۔ جو الفاظ کی سیپیوں میں معانی کے موتی پیش کرتی ہے۔

عروس معنی از صورت مدعا بست نمود خویش را پیرا یہ ہا بست (۱)

اس کے علاوہ علامہ کے نزدیک فطرت فنی قوت کو، دل کے اندر بیج کی صورت میں ودیعت کردیتی ہے۔ پھر یہ بیج حسن کار کے خون جگر، پیہم لگن اور سوز عشق سے نمو پاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ پروان چڑھتے چڑھتے اوج کمال تک پہنچ جاتا ہے۔

ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خداداد کوشش سے کہاں مرد ہنر مند ہے آزاد

خون رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر میخانہ ء حافظ ہو کہ بتخانہ ء بہزاد

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا روشن شرر تیشہ سے ہے خانہ ء فرہاد (۲)

جاوید نامہ میں بھی اقبال کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی راتیں فکر اور مطالعہ میں بسر کرتا ہے تو وہ علم وفن اور حکمت کا سراغ پالیتا ہے۔ معانی کی سلطنت جس کی حدود کا تعین کوئی نہیں کر سکا۔ کوشش پیہم کے بغیر ہاتھ نہیں آتی۔

گر کسے شبہا خورد دودچراغ گیر د از علم و فن و حکت سراغ !

ملکِ معنی کس حد اورانہ بست بے جہادپیہم ناید بدست! (۳)

پھر کہتے ہیں کہ دانایان راز کا ناخن محنت وکاوش کے ذریعے ساز کی رگوں سے جوئے خون نکالتا ہے۔

کاوِکاوِ ناخنِ مردان راز جوئے خوں بکشاد از رگہاے ساز (۴)

ہر ''حسن کار'' کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے فن پارے کو سو سو طرح سے پرکھے اس کی جانچ پڑتال کرے۔ '' مصور'' اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک اس کی بنائی ہوئی تصویر اپنی اصل، یا ذہنی خاکے کے مطابق نہ ہو۔ ایسا اسی وقت ہوسکتا ہے۔ جب وہ ''حسن پارے'' کی تکمیل میں خوب محنت ولگن سے کام لے۔ یہی حال موسیقی اور مغنی کا ہے۔ فن تعمیر اور سنگراشی بھی خون پسینہ ایک کرنے کا نام ہے۔ اور شعر وسخن کی تو بات ہی کیا،

بندش ِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں ہے شاعری بھی کام آتش مرصع ساز کا

اقبال کے نزدیک بجا طور پر فن یا حسن کے لئے سخت کوشی، جہد مسلسل اور دل گدازی انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ

---

(۱) زبور عجم۔ ۱۵۵۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۱۳۱۔ ایجاد معانی۔

(۳) جاوید نامہ۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ (۴) ایضاً۔ ۱۸۲۔

کہتے ہیں ۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر!　　(۱)

رنگ ہو یا خشت و سنگ ، چنگ ہو یا حرف و صوت　　معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود!

قطرۂ خون جگر ، سل کو بناتا ہے دل　　خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!　　(۲)

اقبال کہتے ہیں جب تک ''حسن پارے''میں حسن کار کا خونِ جگر شامل نہ ہو اس وقت تک کوئی فن یا حسن پارہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا ۔ اور یہی قانون ، مصوری ، فن تعمیر ، سنگتراشی ، موسیقی ، شاعری اور گائیکی پر لازم آتا ہے ۔ ذرا غور کریں تو اقبال نے فن کو معجزہ کہا ہے ۔ اور فن کا یہ معجزہ اپنے ظہور کے لئے حسن کار سے اس کے خون جگر کا متمنی ہے ۔ اس ضمن میں خود علامہ اقبال نے بھی بڑے پاپڑ بیلے ہیں ۔ وہ اپنے ایک ایک شعر پر خوب غور و خوض کیا کرتے تھے ۔ تب کہیں جا کر مطمئن ہوتے ۔ مثال کے طور پر ''ترمیمات اقبال'' کے زیر عنوان جگن ناتھ آزاد رقم طراز ہیں :۔

''۱۹۱۸ء میں جب ''رموز بیخودی'' چھپی تو جسٹس دین محمد نے اقبال سے کہا کہ یوں تو یہ ساری مثنوی لاجواب ہے لیکن اس کا ایک شعر مجھے خاص طور سے پسند آیا ہے اور وہ شعر یہ ہے !

درمیانِ کارزار کفر و دیں　　ترکش مارا خدنگ آخریں

اقبال نے جواب دیا ،'' دین محمد ! یہ شعر میری چالیسویں کوشش کا نتیجہ ہے''۔　　(۳)

اس لئے کہ :۔

ناداں ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے　　اسباب ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو　　(۴)

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر　　کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا　　(۵)

اس میں شک نہیں کہ اقبال پر شاعری کا نزول ہوتا تھا ۔ وہ صرف نوک پلک سنوارنے کے لئے غور و فکر کرتے تھے ۔ الفاظ کی نشست و برخاست درست کرنے سے آمد متاثر نہیں ہوتی ۔ بلکہ اس میں اور بھی نکھار پیدا ہو جاتا ہے ۔ جیسا کہ :۔

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے　　گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش!　　(۶)

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال پر نازل شدہ شاعری میں تبدیلی اور ردوبدل کی گنجائش نہیں ہوتی تھی ۔ یا اگر

---

(۱) بالِ جبریل ۔ ۱۰۱ ۔ مسجد قرطبہ ۔　(۲) ایضاً ۔ ۹۵ ۔　(۳) اقبال کا فن ۔ ۱۳۴ ۔ مرتبہ گوپی چند نارنگ ۔

(۴) ضرب کلیم ۔ ۱۶۷ ۔ محراب گل افغان کے افکار ۔　(۵) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۵ ۔　(۶) بالِ جبریل ۔ ۷۵ ۔

ہوتی تو بہت ہی شاذ ، مولانا عبدالمجید سالک ، ذکر اقبال میں لکھتے ہیں :۔

"۔۔۔۔ڈاکٹر لوکس تقریب سے فارغ ہونے کے بعد علامہ کے پاس آئے اور سوال کیا کہ آیا آپ کے نزدیک آپ کے نبیؐ پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا تھا ، جسے وہ الفاظ میں بیان کر دیتے تھے یا الفاظ بھی نازل ہوتے تھے؟ علامہ نے صاف جواب دیا کہ" میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرت صلعم پر نازل ہوتی تھی ۔یعنی قرآن کے مطالب ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی الہامی ہیں ۔"ڈاکٹر لوکس نے اس پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسا اعلیٰ پایہ فلسفی ، الہام پر کیونکر اعتقاد رکھ سکتا ہے ۔ علامہ نے ارشاد فرمایا ،ڈاکٹر صاحب میں اس معاملے میں کسی دلیل کا محتاج نہیں ۔ مجھے تو خود اس کا تجربہ حاصل ہے ۔ میں پیغبر نہیں ہوں ۔محض شاعر ہوں ۔ جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے ،تو مجھ پر بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے شعر اترنے لگتے ہیں ۔ اور میں بعینہ نقل کر لیتا ہوں ۔ بارہا ایسا ہوا کہ ان اشعار میں کوئی ترمیم کرنی چاہی ،لیکن میری ترمیم اصل اور ابتدائی نازل شدہ شعر کے مقابلے میں بالکل ہیچ نظر آئی اور میں نے شعر کو جوں کا توں رکھا ۔جس حالت میں ایک شاعر پر پورا شعر نازل ہو سکتا ہے تو اس میں کیا تعجب ہے کہ آنحضرت صلعم پر قرآن کی پوری عبارت لفظ بہ لفظ نازل ہوتی تھی؟ اس پر ڈاکٹر لوکس لاجواب ہوگئے ۔" (۱)

گویا کہ :۔

جز نالہ نمی دانم ، گویند غزل خوانم این چیست کہ چوں شبنم بر سینہ من ریزی؟ (۲)

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے ۔ کہ اقبال حسن کاری اور تخلیق کاری کے سلسلے میں وہبی و اکتسابی دونوں نظریوں کے حامل ہیں ۔

اقبال چونکہ خود شاعر ہیں اس لئے انہوں نے زیادہ تر فن شعر وسخن پر ہی بات کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ فن شاعری پر سب سے پہلے یہ لازم ہے کہ اس کی زبان سادہ وسلیس اور عام فہم ہونی چاہئے ۔ اس لئے کہ اس طرح شعر زیادہ موثر اور فطری ہو جانے کے ساتھ ساتھ ، زیادہ سے زیادہ اذہان کو منور کر سکتا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں ،کیا خوب ہے وہ شخص جو ضمیر وجود میں غوطہ زن ہو کر ،موتیوں جیسی قیمتی باتیں نکال لایا اور انہیں آسان زبان میں کہہ دیا ۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اقبال آسان زبان کے علاوہ ایسے خیالات کے بھی قائل ہیں ۔ جو موتیوں کی طرح نادر اور نایاب ہوں ۔

---

(۱) ذکر اقبال ۔۲۴۴ ۔ ۲۴۵ ۔

(۲) زبور عجم ۔ ۸ ۔

خوشا کسے کہ فرورفت درضمیر وجود سخن مثالِ گہر برکشیدہ آساں گفت (۱)

اقبال کے نزدیک فن کے لئے دوسرا ضروری نکتہ یہ ہے کہ حسن کا ر دوسروں کی مرضی اور پسند و ناپسند کے لئے حسن پارے کی تخلیق نہ کرے ۔ بلکہ اپنے قلب ونظر کی نظر میں جو درست سمجھے اسے بیان کر دے خواہ جابر سلطان کے سامنے کلمہء حق ہی کیوں نہ کہنا پڑے ۔

پیرما گفت جہاں برروشے محکم نیست از خوش و ناخوش او قطع نظر باید کرد (۲)

اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ فن میں اس قدر زور اور حرکت ہونی چاہئے کہ اس کے اثر سے ہر کہیں ہل چل پیدا ہو جائے ۔تا کہ جمود کا قلع قمع ہو سکے ۔خود ان کی ''حسن کاری'' اس تعریف پر خوب اترتی ہے ۔ مثال کے طور پر :۔

جہاں راپیش ازیں صد بار آتش زیر پا کردم سکون و عافیت را پاک می سوزدہم وزیرم (۳)

اقبال کے نزدیک فن وہ ہے جس میں تلخی و شیرینی دونوں پائی جائیں ،حسن کار کے پیغام میں بجلی کی کڑک کے ساتھ ساتھ پھولوں کی خوشبو بھی ضروری ہے ۔ خود کلام اقبال ایسی ہی تختی و نرمی کا آمیزہ ہے ۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں ۔

اے کہ نوشم خوردۂ از تیزیء نیشم مرنج نیش ہم باید کہ آدم رارگ خوابے زند (۴)

جاوید نامہ میں جب '' سروش'' جلوہ گری کرتا ہے تو رومی کی زبانی اقبال کہلواتے ہیں کہ اسی کی وجہ سے شاعر اپنے ساز دل کو مضراب سے چھیڑتا ہے ۔ اسی کی وجہ سے محمل کا پردہ چاک چاک ہوتا ہے گویا کہ غالب صرصیر خامہ نوائے سروش ہے ، والی بات کی گئی ۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اقبال شاعری کو الہام سمجھتے ہیں ۔

زخمۂ شاعر بسا ز دل ازوست چاکہا درپردۂ محمل از وست (۵)

اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ اہل ہنر انسانیت کی بےلوث خدمت کرتے ہیں ۔ان کی نظروں میں ریشمی لباس ، چاندی ، لعل و گوہر اور خوبصورت اور زریں کمر خادموں کی کیا حیثیت ہے ۔ وہ اپنے اللہ تعالیٰ کی طرح دونوں جہانوں سے بے نیاز ہیں ۔ اور یہی بے نیازی ان کی دولت ہوتی ہے ۔ مطلب یہ کہ فن اور فنکار کو ایسا ہی ہونا چاہئے ۔ اگر چہ سرنہ تراشد قلندری داند اور ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز کے مصداق :۔

قماش و نقرہ و لعل و گہر چیست؟ غلامِ خوش گل و زرّیں کمر چیست؟

---

(۱) زبور عجم ۔ ۶۷ ۔ (۲) زبور عجم ۔ ۸۵ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۱۰۱ ۔

(۴) زبور عجم ۔ ۱۱۱ ۔ (۵) جاوید نامہ ۔ ۴۲ ۔

چہ یزداں از دوگیتی بے نیاز ند　　دگر سرمایہ ء اہل ہنر چیست؟　(۱)

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری　　وگر نہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے!　(۲)

اقبال کہتے ہیں شاعر کا فن اور تجربات و مشاہدات دوسروں کی امانت ہوتے ہیں ۔ وہ جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ معاشرے کے سامنے بلاکم وکاست پیش کر دیتا ہے ۔

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لئے　　دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لئے　(۳)

اقبال تمام علوم وفنون کو دین کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسی میں انسانیت کی خدمت اور بھلائی پوشیدہ ہے وہی شعروسخن ،سیاست اور دوسرے ہنر، منفعت بخش ہو سکتے ہیں جو خودی اور دین کی پیروی میں ہوں ۔ ایسے ہی فنون کا رتبہ بلندو بالا ہوتا ہے ۔ دینی حدود و قیود کو جب پھلانگ لیا جائے تو پھر حالت یہ ہوتی ہے کہ:۔

ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد　　فرنگیوں کی سیاست ہے دیوبے زنجیر　(۴)

دین چونکہ فنون وہنر کو اخلاقی اقدار کے زیور سے آراستہ و پراستہ کر دیتا ہے اس لئے دین کی پاسداری کرنے والے فنون کا مرتبہ ستاروں سے بھی اونچا ہوتا ہے ۔

سرود و شعر و سیاست ، کتاب و دین و ہنر　　گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ!

ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی　　بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ!　(۵)

سخنوری کے لئے اقبال کے نزدیک عمر کی کوئی حد یا قید نہیں وہ کہتے ہیں ۔کہ بچہ، جوان اور بوڑھا سب بات کرتے ہیں سخن کے لئے مہ و سال کی پابندی نہیں ۔

سخنگو طفلک و برنا و پیر است　　سخن را سالے و ماہے نباشد　(۶)

اقبال علم وفن کی مقصدیت کے پر زور حامی ہیں ۔ اس لئے ان کے نزدیک علم وفن زندگی کے خدمت گار اور غلام ہیں ۔

علم و فن از پیش خیزان حیات　　علم و فن از خانہ زادان حیات　(۷)

اقبال فن کاری وحسن کاری کے لحاظ سے ایسی شاعری کے قائل ہیں جو اپنی دلگدازی و دردوسوز سے دلوں کو فتح کرتے ہوئے پوری دنیا کو اپنے زیرنگیں کر لے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں کہتے ہیں ، بادشاہوں کی نوکری کرنے والوں کو یہ راز بتا

---

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۱۳۷۔　(۲) بال جبریل ۔ ۴۸　(۳) بانگ درا ۔ ۶۵۔　(۴) ضرب کلیم ۔ ۱۵۳۔

(۵) ایضاً ۔ ۱۰۰ ۔ ''دین و ہنر''　(۶) پیام مشرق ۔ ۲۱۹۔　(۷) اسرار خودی ۔ ۱۷۔

دو کہ نوائے دلگداز سے دنیا کو فتح کیا جا سکتا ہے۔

بملازمان سلطاں خبرے دہم زرازے — کہ جہاں تواں گرفتن بنوائے دلگدازے (۱)

من بسیمائے غلاماں فرِ سلطاں دیدہ ام — شعلہ ء محمود از خاک ایاز آید بروں (۲)

اس لئے کہ:۔

صد نالہ ء شبگیرے ، صد صبح بلا خیز ے — صد آہ شرر ریزے ، یک شعر دلاویزے (۳)

دل کے نالہ مستانہ سے سخن میں سوز پیدا ہوتا ہے۔اس شمع کی چمک پروانہء دل ہی کے سبب ہے۔ہم مٹھی بھر خاک ہیں اور خاک ذوق فغاں نہیں رکھتی۔ہماری ساری ہائے و ہو پیانہ دل کی گردش کے سبب ہے۔

سوز سخن زنالہء مستانہ ء دل است — ایں شمع را فروغ زپروانہ ء دل است

مشت گلیم و ذوق فغانے نداشتیم — غوغاے ما زگردش پیانہء دل است (۴)

اقبال کسرِ نفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری نوائے بے اثر سے سرود کی قیمت کا اندازہ نہ کر نغمہ کی بجلی سے تو سکندر کی قیمتی متاع بھی جلائی جا سکتی ہے۔یعنی وہ شاعری جس میں سو و گداز کی بجلیاں بھری ہوں ، اس کے سامنے سکندر اعظم جیسے بادشاہوں کی بادشاہی بھی ہیچ ہے۔

مسنج قدر سرود از نواے بے اثرم — زبرق نغمہ تواں حاصل سکندر سوخت (۵)

اسی لئے تو اقبال یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ:۔

بملک جم نہ دہم مصرع نظیری را — ''کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ ء مانیست'' (۶)

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — شباب جس کا ہے بے داغ ،ضرب ہے کاری (۷)

اقبال نظیری کے ایسے ہی مصرعے جیسی شاعری کے گرویدہ ہیں۔ایسے ایک مصرعے کی قدر و قیمت سلطنت جمشید سے کہیں زیادہ ہے۔

امیر قافلہ سخت کوش و پیہم کوش — کہ درقبیلہء ما حیدری زکراری است (۸)

ہنگری کے نوجوان شاعر''پٹوفی'' پر اقبال نے اس لئے نظم لکھی کہ وہ اپنے وطن کی حفاظت میں لڑتا ہوا مارا گیا

---

(۱) پیامِ مشرق۔۱۵۰۔ (۲) زبورِ عجم۔۷۳۔ (۳) پیامِ مشرق۔۱۶۱۔ (۴) پیامِ مشرق۔۱۷۱۔

(۵) پیامِ مشرق۔۱۵۵۔ (۶) ایضاً۔۱۵۹۔ (۷) ضربِ کلیم۔۱۷۱۔ (۸) زبورِ عجم۔۷۶۔

تھا۔بس یہ حقیقت طے شدہ ہے کہ شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر کے مصداق ،اقبال اس علم و دانش کو گھاس کے تنکے کے برابر بھی نہیں سمجھتے ، جو مرد غازی کو تیغ و سپر سے دور کر دے ۔

من آں علم و فراست باپر کاہے نمی گیرم — کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را! (۱)

اقبال کہتے ہیں کہ لاجواب شاعری کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس میں فاش انداز میں بات نہ کی جائے ۔ اہل خلوت یعنی صاحبان تخلیق صرف رمز اور اشارے سے اپنا مطلب بیان کر جاتے ہیں ۔ اس لئے کہ قصہء دل بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ درد جگر چھپا کر رکھنے والی چیز ہے ، جبکہ اے خلوت میں رہنے والو !میں لذت فغاں کا کیا کروں یہ مجھے نالہ و فریاد پر مجبور کرتی ہے۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است — حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایمانیست (۲)

قصہء دل نگفتنی است ، درد جگر نہفتنی است — خلوتیاں کجا برم لذت ہاے ہاے را (۳)

پردہ برگیرم و درپردہ سخن می گویم — تیغ خونریزم و خود رابہ نیامے دارم (۴)

اقبال کہتے ہیں کہ میں نے بیرونی دروازہ چھوڑ کر گھر کے اندر کی بات کی ہے ۔ جو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا ، اسے قلندرانہ انداز سے کہہ دیا ہے ۔

زبرون درگذشتم زدرون خانہ گفتم! — سخنے نگفتہ ء را چہ قلندرانہ گفتم! (۵)

اقبال ''حسن کاری''میں در پردہ بات کرنے کے اس قدر قائل ہیں کہ اپنا راز محبت نہ کسی پر عیاں کرتے ہیں اور نہ کسی سے چھپاتے ہیں ۔ البتہ غزل اس انداز سے کہتے ہیں کہ ان کا راز ان کے سینے سے باہر آجاتا ہے۔

بکسے عیاں نکردم زکسے نہاں نکردم — غزل آنچناں سرودم کہ بروں فتاد رازم (۶)

وقت تو کھل کر بات کہنے کا ہے مگر میں نے اشاروں میں بات کی ہے ۔ آپ ہی کہیں کہ ان ناپختہ ساتھیوں کا کیا کروں !

وقت برہنہ گفتن است من بہ کنایہ گفتہ ام — خود تو بگو کجا برم ہم نفسان خام را! (۷)

اقبال اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ آپ نے مجھے قلم عطا فرمایا ہے ۔ کہ میں اس سے شاہکار نقوش رقم کروں ۔

---

(۱) زبور عجم ۔۱۰۴۔ (۲) پیام مشرق ۔۱۶۰۔ (۳) ایضاً ۔۱۶۲۔

(۴) پیام مشرق ۔۱۶۴۔ (۵) زبور عجم ۔۳۔ (۶) ایضاً ۔۹۔ (۷) زبور عجم ۔۵۵۔

مجھے ایسا لکھنے والا بنایا ہے تو کوئی ایسی لوح جبیں بھی عطا فرمائیے، جہاں میں یہ نقوش رقم کر سکوں۔

بدستم خامہ ، دادی کہ نقش خسروی بندد   رقم کش این چنینم کردۂ لوحِ جبینے دہ   (۱)

پھر کہتے ہیں آپ نے میری طبع رواں کو بحر نغمہ سے آشنا کر دیا ہے۔ میرے چاک سینہ سے افکار کا دریائے رواں نکالیئے۔ گوہر کی طلب کیوں؟

بہ بحر نغمہ کردی آشنا طبع روانم را   زچاکِ سینہ ام دریاطلب ، گوہر چہ می خواہی   (۲)

جب تک اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل حال نہ ہو اس وقت تک کوئی بڑا ''حسن کار'' نہیں بن سکتا۔ اقبال چونکہ روحانی حسن کار ہیں اس لئے ''حسن مطلق'' کے حضور اعتراف کرتے ہیں کہ ہم تو بس قلم چھڑک دیتے ہیں اس سے نقش بنانا آپ کا کام ہے۔ ہمارے حال و مستقبل کی آرائش و نگارش آپ کے ہاتھ میں ہے۔

نقش پرداز توئی ما قلم افشانیم   حاضر آرائی و آیندہ نگاری از تست   (۳)

پھر کہتے ہیں آپ نے مجھے ذوق بیان عطا فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ شعر کہوں۔ لیکن جو کچھ میرے سینے کے اندر ہے وہ کسی سے نہیں کہا جا سکتا۔

تو مرا ذوق بیاں دادی و گفتی کہ بگوے   ہست درسینہ ، من آنچہ بکس نتواں گفت!   (۴)

اقبال کے نزدیک شاعری و ''حسن کاری'' کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہر قسم کی تاریکی کے خلاف نبرد آزما ہو کر، بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دے۔ یعنی شاعر شمع کی طرح اوروں کے غم میں جلے اور اس کی نوا یعنی شاعری:۔

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں   خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں   (۵)

میں اتنا سوز و گداز ہو کہ لپکتے شعلے کی طرح اپنے ماحول کو روشن و منور کر دے۔ اور شاعر کی آواز میں ایسا انقلابی زور ہو کہ، اسی ہنگامے سے محفل کو تہ و بالا کر دے۔ اور عشق و تمنا و آرزو کے ذریعے اپنے حال کے پتھر کو ایسا چمکانا چاہیئے کہ اس سے مستقبل کا آئینہ معرض وجود میں آجائے۔

اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق   سنگ امروز کو آئینہ فردا کر دیں   (۶)

علامہ اقبال کی ''حسن کاری'' پر تبصرہ کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں ''بڑے شاعر خود کو بعض نظریات کا

---

(۱) زبور عجم۔ ۳۰۔   (۲) ایضاً۔ ۳۳۔   (۳) زبور عجم۔ ۳۴۔

(۴) ایضاً۔ ۳۶۔   (۵) بانگِ درا۔ ۱۳۲۔   (۶) ایضاً۔

(مثبت نظریات) پابند کر لینے کے باوجود، اپنی بے ساختگی کو مجروح نہیں کرتے اور جو شاعر کسی فن یا تہذیبی نقطہ نظر کا پابند نہیں ہوتا ، وہ اپنی بے ساختگی کو صرف اس حد تک کام میں لاتا ہے کہ آخری دم تک اسے پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا کہتا رہا ہے ۔ ۔۔۔اقبال نے شعر و شاعری کے بارے میں جو بھی نظریات پیش کئے ہیں ان پر عمر بھر عمل بھی کیا اور یوں وہ دنیا کی عظیم شاعری کے علاوہ زندگی کے سرمائے میں بھی بے پناہ اضافہ کر گئے ؟ ان کا یہ نظریہ،شعر زندگی اور اس کے حسن ، انسان اور اس کی توانائیوں ، کائنات اور اس کی پہنائیوں اور انسانی فکر کی رسائیوں کا نظریہ ہے ۔ اور یہی وہ نظریہ ہے جس سے منفیت ، بے معنویت اور لایعنیت کے نظریوں کو شکست دی جاسکتی ہے جنہوں نے آج کے جدید انسان کو اپنی گرفت میں لینے اور اس سے اس کا انفرادی شرف چھیننے کی کوشش شروع کر رکھی ہے ۔" (۱)

کلام اقبال پر اساتذہ کی طرف سے اعتراضات بھی کئے جاتے تھے ۔ جنہیں وہ خندہ پیشانی سے قبول فرماتے ۔ جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں کہ:۔

" اس ضمن میں سخن شناسوں کے مشورے کو اقبال نے ہمیشہ اہمیت دی ۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مشورہ انہوں نے ہمیشہ قبول کیا ہوگا ۔ چونکہ اقبال اس دولت سے مالا مال تھے ۔ جسے " Open Mind " کہتے ہیں ،اس لئے کسی مشورے کو غور و خوض کے بغیر انہوں نے رد نہیں کیا ۔ اور کسی مشورے کو محض مروت میں آ کے قبول نہیں کیا ۔" (۲)

اقبال ان اعتراضات کا جواب ایسی تحقیق ،عرق ریزی اور جانفشانی سے دیتے ہیں کہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس سلسلے میں اعتراضات اور سوال و جواب کی ایسی ایسی مثالیں ہیں کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ کہ سوال کرنے والا اس قدر باریک بینی میں گیا ہے اور پھر اقبال نے بھی جواب دیتے وقت تحقیق و سند کا وہ ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ اساتذہ بھی لاجواب ہو جاتے تھے میں اس موقع پر صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا ۔

علامہ محمد اقبال نے رموز بیخودی میں اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظم میں یہ شعر کہا ہے ۔:۔

شیر بر آمد پدید از طرف دشت   از خروش او فلک سر زندہ گشت

مولانا سید سلمان ندوی لفظ دشت پر یوں معترض ہوئے کہ جہاں اورنگ زیب عالمگیر نماز پڑھ رہے تھے وہاں اقبال کے بقول ہر شجر پر پرندے تسبیح خوانی میں مشغول تھے ۔ گویا وہ جگہ اجاڑ بیابان اور صحرا کی طرح نہیں تھی ۔اقبال نے کہا

---

(۱) اقبال کا ادبی نصب العین ۔ ۵۰۔۵۴ ۔ مرتبہ سلیم اختر ۔   (۲) اقبال کا فن ۔ ۱۳۵۔

دشت کے لئے ضروری نہیں کہ بالکل خشک ہو اور یحیٰ شیرازی کا یہ شعر پیش کیا۔

مپرس از آب و رنگ کو ہسارش ہزاراں دشت لالہ داغدارش

پس بے شک معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود۔ اس حوالے سے اقبال مزید کہتے ہیں۔

خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو! (۱)

اقبال کے نزدیک بجا طور پر خون جگر سے رنگینیٔ فن پیدا ہوتی ہے۔ جس سے فن کو نکھار اور بہار نصیب ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے بہار کے بغیر رنگ ہاتھ نہیں آتا اور رنگ کے بغیر کوئی بھی حسن پارہ پھیکا، بے کیف اور نامکمل ہوتا ہے۔ اقبال کے قائم کردہ اپنے ہی اس فنی معیار کی کسوٹی پر اگر کلام اقبال کو پرکھا جائے تو بلا شبہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی شاعری ''خون جگر'' والے معیار پر بدرجہ اتم اترتی ہے۔ چنانچہ کلام اقبال کو کہیں سے بھی اٹھا کر دیکھ لیں، اس میں خون جگر کا چمکتا و دمکتا رنگ صاف دکھائی دیتا ہے۔ اسی سے ان کے افکار انقلابی و عقابی خصوصیات کے حامل ہو کر پوری دنیا میں پھیل گئے۔

برگ گل رنگیں زمضمون من است مصرع فن قطرۂ خون من است (۲)

چنگ را گیرید از دستم کہ کار از دست رفت نغمہ ام خوں گشت واز رگ ہائے ساز آید بروں (۳)

علاوہ ازیں اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اپنے افکار کے سمندر میں موج کی طرح تڑپتا رہا۔ تب کہیں جا کر میں نے آنے والے طوفان کی جھلک دیکھی۔ پھر میں نے اپنے خون سے طوفان کی تصویر کھینچی۔ کیوں کہ مجھے اس رنگ سے بہتر رنگ کہیں نظر نہ آیا۔

بہ بحر خویش چوں موجے تپیدم تپیدم تابطوفانے رسیدم

دگر رنگے ازیں خوشتر ندیدم بخون خویش تصویرش کشیدم! (۴)

حسن کار جب اپنے حسن فن کی آبیاری خون جگر سے کرنے لگتا ہے تو پھر اس کا سینہ موتیوں کی کان بن جاتا ہے۔ اس کی ہر بات لعل بے بہا سے کم نہیں ہوتی۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ نہ میں اعلیٰ نسلی گھوڑے پر سوار ہوں اور نہ بادشاہ کا مصاحب بن کر اتراتا پھرتا ہوں۔ اے دوست مجھے یہی دولت بہت ہے کہ جب اپنا سینہ کھودتا ہوں تو لعل نکال لیتا ہوں۔

نہ من برمرکب ختلی سوارم نہ از وابستگان شہر یارم

---

(۱) بال جبریل۔ ۱۱۳۔ ذوق و شوق۔ (۲) پیام مشرق۔ ۱۷۔

(۳) زبور عجم۔ ۷۳۔ (۴) ارمغان حجاز۔ ۸۸۔

مرا اے ہمنشیں دولت ہمیں بس چوکا وم سینہ را لعلے برآرم (۱)

اس سے مراد یہ بھی ہے کہ فن کار کے لئے نہ تو کسی بادشاہ کا مصاحب یا وزیر ہونا ضروری ہے اور نہ اعلیٰ قسم کی سواری، موٹر کار یا جہاز میں پرواز کرنا ضروری ہے۔ حسن کار بوریا نشین بھی ہو تو اعلیٰ نسل کے گھوڑے یا ہوائی جہازوں کی پر تعیش سواری کے مزے لوٹنے والوں سے زیادہ دانا اور نکتہ رس ہوتا ہے۔ پھر حسن کاروں میں بھی مختلف درجات ہیں۔ بے شک مولانا جلال الدین رومی، بہزاد، مانی، سعدی، حافظ شیرازی، خواجہ کرمانی، فردوسی، انوری، خاقانی، عرفی، بیدل، عنصری، نظامی گنجوی، عمر خیام، میر تقی میر، خواجہ میر درد مرزا غالب اور آتش وغیرہ نے کبھی فلک پیاؤں میں بیٹھ کر فلک پیائی نہیں کی۔ لیکن آج کل کے شعراء جو ہر وقت محو پرواز رہتے ہیں، سے ان کا کلام ہر لحاظ سے عظیم تر ہے۔ اس سلسلے میں مولانا روم نے ایک خوبصورت بات کی ہے۔ "حکمت رومی" سے دیکھ کر بیان کرتا ہوں۔

"اگر چاندی کو کوٹھے پر رکھ دو اور سونے کو زمیں پر تب بھی سونا چاندی سے اوپر ہی ہے۔ اسی طرح لعل سونے سے بالاتر ہے۔ خواہ سونے سے نیچے پڑا ہو اور خواہ اس کے اوپر۔ آٹے کو چھاننے میں تو گندم کا بورا چھلنی کے اوپر رہتا ہے اور آٹا نیچے گرتا ہے۔ اسکے باوجود ان میں سے اوپر کا درجہ آٹے ہی کو حاصل ہے۔"(۲)

خونِ جگر کی اصطلاح کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال بلند پروازی کے لئے فطرت کا مقابلہ کرنا ضرروی سمجھتے ہیں۔ "لانجائنس" کا بھی یہی خیال ہے کہ بڑا ذہن اور عظیم فن ہمیشہ خطرات میں گھرے ہوتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں، عجم ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں، اس کے اندر سفید قیمتی موتی ہیں۔ لیکن میں ایسے سمندر میں اپنی کشتی نہیں ڈالتا، جس کی موجوں میں مگرمچھ نہ ہوں۔

عجم بحریست ناپیدا کنارے کہ دروے گوہر الماس رنگ است
و لیکن من نہ رانم کشتیء خویش بدریائے کہ موجش بے نہنگ است (۳)

خطرے ہی سے حوصلے اور قوت کا امتحان ہوتا ہے یہی بدن اور جان کے امکانات کا معیار ہے۔

خطر تاب و تواں را امتحان است عیار ممکنات جسم و جان است (۴)
خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد! (۵)

---

(۱) پیامِ مشرق۔ ۵۶۔ لالہ طور۔ (۲) حکمتِ رومی۔ ۱۹۸۔ (۳) پیامِ مشرق۔ ۷۴۔
(۴) پیامِ مشرق۔ ۱۲۳۔ (۵) بالِ جبریل۔ ۸۔

شاہینی اور سخت جانی محنت و ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ۔ اسی مضمون کو اقبال ایک اور انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ ، کب تک زندگی کا لباس تار تار رکھے گا؟ کب تک چیونٹیوں کی طرح خاک میں گھر بنائے گا ؟ محو پرواز ہو اور شاہینی سیکھ ۔ مٹی میں کب تک اپنا رزق تلاش کرتا رہے گا ۔ اس طرح اقبال زندگی کے عام رویے میں بھی خون جگر کا پیام دیتے ہیں ۔

قبائے زندگانی چاک تاکے؟ چوموراں آشیاں درخاک تاکے؟
بہ پرواز آ شاہینی بیاموز تلاش دانہ درخاشاک تاکے؟ (۱)

جس حسن پارے میں خون جگر کی سرخی استعمال ہو وہ انسانی ہوتے ہوئے بھی لافانی ہو جاتا ہے ۔ انسان تو ایک ایسا شہ پارہ ہے ، جسے فطرت نے قرن ہا قرن میں اپنے خون جگر سے تراشا ہے ، اس کے فانی ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔

مشو نومید ازیں مشتِ غبارے پریشاں جلوۂ ناپائیدارے
چو فطرت می تراشد پیکرے را تمامش می کند درروزگارے (۲)

اسی سلسلے میں مزید کہتے ہیں ، ذوق سخن نے میرے جگر کو خون کر دیا ہے ۔ میں جو غبار راہ تھا ، اس نے میری خاک کو شرر بنا دیا ہے ۔ گویا کہ راہ شوق میں خون جگر کرنے سے ارتقائی مراحل طے ہوتے ہیں ۔ محبت کو بیان کرنے کے لئے میں نے اپنے لب کھولے ۔ مگر بیان نے اس راز کو اور پوشیدہ بنا دیا ۔ جو کمال فن کا کمال ہے ۔

مرا ذوق سخن خوں درجگر کرد غبار راہ را مشت شرر کرد
بگفتار محبت لب کشودم بیاں ایں راز راپوشیدہ تر کرد (۳)

اقبال ہمیشہ مشکل اور خطر پسند واقع ہوئے ہیں ۔ مشکلات اور خطر پسندی ہی میں خون جگر کیا جا سکتا ہے ۔ وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے کی روشنی میں ، اگر منزل کا راستہ پیچدار نہ ہو تو عقل کی غلط روی کی لذت اور خون جگر کی خلش کہاں ۔ ایسے جہانِ کورذوق یعنی بہشت کے اندر زندگی بسر نہ کر ، جہاں یزداں ہے مگر شیطان نہیں ۔ گویا کہ جو حسن کارخطرات میں گھرا ہوا اس سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں ۔

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۷۵ ۔ (۲) ایضاً ۷۶ ۔ (۳) ایضاً ۔ ۷۹ ۔

کجا آں لذت عقل غلط سیر   اگر منزل رہ پیچاں ندارد
مزی اندر جہانے کور ذوقے   کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد (۱)

خطر پسندی ہی کی بدولت اقبال غوطہ زنی میں بہت گہرے اور بلند پروازی میں انتہائی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں ۔

خیال من بہ تماشاے آسماں بود است   بدوش ماہ و بآغوش کہکشاں بود است (۲)

پھر کہتے ہیں ، ہمارا فکر بلند جس نے طوفانوں میں پرورش پائی ہے ۔ ایک دن اس نیلگوں آسماں کے گرداب سے باہر نکل جائے گا ۔

خیال ما کہ اورا پرورش دادند طوفا نہا   زگرداب سپہر نیلگوں بیروں شود روزے (۳)

اقبال کے نزدیک فن وہ ہے جسے خون جگر سے سینچا گیا ہو اور اس میں ایسی تاثیر پیدا ہو گئی ہو کہ اس کے معجزے سے موج کو سینہ دریا سے الگ کیا جا سکے اور بے پایاں سمندر کو اپنی ندی میں مقید کر لے ۔ خون جگر میں نہا کر نکھرے ہوئے فن کے ذریعے پورے شہر دل کو خون میں نہلایا جا سکتا ہے اور بادنسیم سے سارے پھولوں کا سینہ زخمی کیا جا سکتا ہے ۔ فن وہ ہے جس کے طفیل جبرئیل کو اپنے ہاتھ کی سدھائی ہوئی چڑیا بنایا جا سکتا ہو ۔ فنی ریاضت سے ''حسن کار'' اس قدر محکم ہو جاتا ہے کہ بڑے سے بڑے سیلاب کا خطرہ بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔ ایسا ''حسن کار'' دریا کے دل میں گوہر کی مانند پرسکوں بیٹھ سکتا ہے ۔

موج را از سینہ دریا گسستن می تواں   بحرِ بے پایاں بجوے خویش بستن می تواں
از نوائے می تواں یک شہر دل درخوں نشاند   یک چمن گل از نسیمے سینہ خستن می تواں
می تواں جبرئیل را گنجشک دست آموز کرد   شہپرش باموے آتش دیدہ بستن می تواں
گر بخود محکم شوی سیل بلا انگیز چیست   مثل گوہر دردل دریا نشستن می تواں (۴)

مشکلات و مصائب اور خطرات کا مقابلہ کرنا فن اور ''حسن کار'' کا ایمان ہونا چاہئے ، جو کہ ناپید ہے ۔ اس لئے اقبال ایسے شاعر پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی طبع موشگاف کی نزاکتوں کے بارے میں نہ پوچھ ، ہمارے شاعر کا شیشہ ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ جاتا ہے ۔ وہ کیسے زندگی کے راز کی وضاحت وصراحت کر سکتا ہے ۔ اس کا تو یہ حال ہے کہ

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۱۳۲ ۔   (۲) زبور عجم ۔ ۸۶ ۔   (۳) ایضاً ۔ ۱۱۲ ۔   (۴) پیام مشرق ۔ ۱۶۰ ۔

دریا میں بلبلہ ٹوٹے تو اس کا رنگ اڑ جاتا ہے۔

از نزاکت ہائے طبع موشگاف او مپرس   کز دمِ بادے زجاجِ شاعر ما بشکند
کے تواند گفت شرح کار زار زندگی   می پرد رنگش ، حبابے چوں بدریا بشکند   (۱)

اقبال کہتے ہیں "نے " یعنی فن ایسا ہونا چاہیئے ، جس کی لے سے سینے کے اندر دل رقص کرنے لگے ۔ یعنی فن کو روحانیت سے بھر پور ہونا چاہیئے ۔ جو شیشۂ قلب کو گداز کر دے ۔ عجم کے نیستاں میں بادِ صبا بہت تیز ہے ۔ فن کے ساز سے ایسے آتش ناک نغمے نکلنے چاہئیں ۔ جو اس نیستان میں آگ لگا دیں ۔

نےء کہ دل زنوایش بسینہ می رقصد   مے کہ شیشۂ جاں را دہد گداز آور
بہ نیستانِ عجم باد صبحدم تیز است   شرارۂ کہ فروی چکد زساز آور   (۲)

اقبال تو جو اپنی شاعری کا انقلاب انگیز سیلاب لایا ہے ، یہ شہر میں نہیں سماتا ۔ اس خانہ برانداز طوفان کے لئے ویرانے کی خلوت بہتر ہے ۔ یعنی کہ اقبال ایسے کلام کو پسند کرتے ہیں ۔ جو ولولہ انگیز ہو ۔ وہ مدرسیت یعنی " ارسطاطیلیسی " فلسفے کو بھی فن میں جگہ دینے کے قائل نہیں اور نہ خود "مدرسیت" کے فریب میں جانے کو تیار ہیں ۔ اس لئے کہ اقبال عشق کے قائل ہیں ۔

سیلے کہ تو آوردی درشہر نمی گنجد   ایں خانہ براندازے درخلوت ہاموں بہ
اقبال غزل خواں را کافر نتواں گفتن   سودا بد ماغش زد از مدرسہ بیروں بہ   (۳)

اقبال رومی کی طرح شعر کے لئے سوز و گداز کو ضروری سمجھتے ہوئے رومی کی زبانی کہتے ہیں کہ رومی جو عشق و محبت کا رہنما ہے ۔ جس کا کلام پیاسوں کے لئے جنت کا چشمہ ہے ۔ اس نے کہا کہ جس شعر میں سوز ہے ۔ اس کی اصل "اللہ ھو" کی حرارت سے ہے ۔ یعنی وہ شعر "حسن مطلق" کا قرب ہے ۔ ایسا ہی شعر خس و خاشاک کو گلشن بنا دیتا ہے ۔ اور ایسا انقلابی ہوتا ہے کہ افلاک درہم برہم ہو جاتے ہیں ۔ ایسا شعر صداقت پر گواہی دیتا ہے اور فقیروں کو پادشاہی عطا کرتا ہے ۔ یہ ولولہ انگیز ہوتے ہوئے بدن کے اندر گردشِ خون تیز کر دیتا ہے ۔ اور دل کو روح الامین سے بھی زیادہ بیدار کر دیتا ہے ۔ ایسے ہی شعر کو اقبال فن کی کسوٹی سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ شعر ایسا ہی ہونا چاہیئے ______ جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے۔

---

(۱) پیامِ مشرق ۔ ۲۲۰۔   (۲) زبورِ عجم ۔ ۶۔   (۳) ایضاً ۲۳۔

رومی آں عشق و محبت را دلیل | تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل
گفت آں شعرے کہ آتش اندروست | اصل او از گرمیٔ اللہ ھوست!
آں نواگلشن کند خاشاک را | آں نوا برہم زند افلاک را
آں نوابر حق گواہی می دھد | بافقیراں پادشاہی می دھد!
خوں ازو اندر بدن سیار تر | قلب از روح الامیں بیدار تر (۱)

یعنی کہ:۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات | ہو نہ روشن، تو سخن مرگ دوام اے ساقی! (۲)
عزیز تر ہے، متاع امیرو سلطاں سے | وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی! (۳)
مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی! | دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی!
حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج | کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی (۴)

اگر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ محبت سوز وگداز کا آفتاب ہے۔ جتنا سوز و گداز زیادہ ہوگا۔ محبت اتنی ہی شدید ہوگی۔ اقبال کہتے ہیں محبت اپنی ہمت سے، یعنی سوز و گداز سے ایک روز اس مقام پر پہنچ جاتی ہے کہ محبوب کے ناز و ادا اسے متاثر نہیں کرتے، محبّ مقام محبوبیت تک پہنچ جاتا ہے۔ کلام اقبال اپنی جگہ سوز و گداز کا الگ سے ایک نظام شمسی ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ میں نے ''حسن مطلق'' کے حریم کے سامنے درد بھرا نغمہ اس انداز سے گایا کہ محرم بھی سوز جدائی کی لذت محسوس کرنے لگے۔

محبت از جوانمردی بجاے می رسد روزے | کہ افتد از نگاہش کا روبار دلربائی ہا!
چناں پیش حریم او کشیدم نغمہ ء درد ے | کہ دارم محرماں را لذتِ سوز جدائی ہا! (۵)

فقیر کی کٹیا ہو یا امیر کا محل۔ ہر جگہ ایسے غم ہیں جن سے جوانی میں کمر خمیدہ ہو جاتی ہے۔ علاج کہاں، علاج سے تو درد میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ سب دانش حیلہ، فریب اور شعبدہ بازی ہے۔ مجھ سے سفر زندگی کا ماجرا نہ پوچھ۔ درد کو اپنا لیا ہے اور اس کے گیت گاتا چلا جاتا ہوں۔ میں نے اپنی سانس کو نسیم سحر سے ملا دیا ہے اور اس طرح پھولوں پر پاؤں رکھے بغیر چمن

---

(۱) جاوید نامہ۔۴۳۔ (۲) بالِ جبریل۔۱۲۔ غزل۔ (۳) ایضاً۔۲۶۔
(۴) بالِ جبریل۔۴۳۔ (۵) زبورِ عجم۔۱۲۴۔

سے گزر جاتا ہوں ۔ چاند کی آنکھ سے اس جاں کا نظارہ کرتا ہوں ۔ کوچہ و محل سے جدا بھی ہوں اور ان پر اپنی چاندنی بھی بکھیرتا ہوں ۔

دربنگہ ء فقیر و بکاشانہء امیر　　غمہا کے پشت را بجوانی کند دو تاے
درماں کجا کہ درد بدرماں فزوں شود　　دانش تمام حیلہ و نیرنگ و سیمیاے
از من حکایت سفر زندگی مپرس　　درساختم بدرد و گزشتم غزل سرای
آمیختم نفس بہ نسیم سحر گہی!　　گشتم دریں چمن بہ گلاں نا نہادہ پاے
از کاخ و کو جدا و پریشاں بکاخ و کوے
کردم بچشم ماہ تماشاے ایں سرائے!　　(۱)

لیکن اقبال کے نزدیک بہت سے شاعر صرف ہنر کے جادو سے قلب کے رہزن اور نظر کے ابلیس بن جاتے ہیں ۔ ہندی شاعر اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے ۔ اس کی روح لذت گفتار کے بغیر ہے ۔ اس نے عشق کو راگ و رنگ اور خلیلوں کو آزری سکھا دی ہے ۔ اس کے الفاظ مترنم ہیں ، مگر سوز و درد سے خالی ہیں ۔ اہل درد ایسے شاعر کو مرد نہیں بلکہ امرد سمجھتے ہیں ۔ اس پسندیدہ آواز سے جو راگ کے زیر و بم ، یعنی قومی نفع و نقصان سے بے بہرہ ہے ۔ نیند میں بڑ بڑانا بہتر ہے ۔ ایسے نقلی شاعر کی اقبال کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ۔ جبکہ اصلی شاعر کا رتبہ اقبال کے نزدیک بہت بلند ہے ۔ اس لئے کہ وہ قوم و ملت کی ہمدرد آنکھ کا درجہ رکھتا ہے ۔

قوم گویا جسم ہے ، افراد ہیں اعضائے قوم　　منزل صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفل نظم حکومت ، چہرۂ زیبائے قوم　　شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ　　(۲)

قومی شاعر دنیا والوں کو اپنے دستر خواں کی طرف دعوت دیتا ہے اور اپنی آتش عشق کو ہوا کی طرح عام کر دیتا ہے ۔

اہل عالم را صلابر خواں کند　　آتش خود را چو باد ارزاں کند　　(۳)

---

(۱) زبور عجم ۔ ۱۳۷ ۔　　(۲) بانگ درا ۔ ۶۱ ۔ "شاعر" ۔　　(۳) اسرار خودی ۔ ۳۶ ۔

جبکہ نقلی اور ضرور رساں شاعر کا یہ حال ہے کہ :۔

اے بسا شاعر کہ از سحر ہنر رہزنِ قلب است و ابلیسِ نظر!
شاعر ہندی ! خدائش یار باد جان او بے لذتِ گفتار باد
عشق را حیلا گری آموختہ باخلیلاں آزری آموختہ!
حرف او چاویدہ و بے سوز و درد مُرد خوانند اہل درد اورانہ مرد
زاں نوائے خوش کہ نشناسد مقام خوشترآں حرفے کہ گوئی درمنام (۱)

اقبال کے ''ذوق جمال'' میں ایسا شعر وسخن بالکل بیکار ہے ۔ خاص کر یہ حقیقت روزروشن کی طرح عیاں ہے ۔ کہ اقبال ہمیشہ عشق کو'' حقیقت رسا'' سمجھتے ہیں ۔ اور جوفن عشق کا جنازہ نکالنے والا ہو، اقبال کو ایک آنکھ نہیں بھاتا ۔ اس لئے ''ہنروران ہند'' کے بارے میں بغیر کسی لگی لپٹی کے گویا ہوتے ہیں :۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا ان کے اندیشہء تاریک میں قوموں کے مزار!
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند کرتے ہیں روح کو خوابیدہ ، بدن کو بیدار
ہندکے شاعر و صورت گرو افسانہ نویس (۲)
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

اقبال کے نظام فکر میں فرد وقوم زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم منسلک ہیں ۔قوم کی مثال دریا کی سی ہے اور فرد اس کی موج ہے ۔جس طرح دریاء سے باہر موج کا کوئی وجود نہیں ہوتا ، اسی طرح قوم سے علیحدہ ہوکر فرد کی کوئی حیثیت نہیں رہتی ۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں ، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں (۳)

اس کے علاوہ ایک اور مشہور زمانہ مثال کے ذریعے اقبال فرد کو ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھنے کی تلقین کرتے ہیں کہ جو شاخ ایک دفعہ اپنے درخت سے علیحدہ ہوجائے پھر دوبارہ ہر گز ہری نہیں ہوسکتی۔ شاخ اگر موسم بہار کے آنے تک درخت کا حصہ بن کر رہے تو سرسبز ہوسکتی ہے ۔ ہماری امت پر بھی خزاں کا دور ہے اس لئے امت کے شجر سایہ دار پر سے وہ

---

(۱) جاوید نامہ ۔۴۴۔ (۲) ضرب کلیم ۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ (۳) بانگ درا ۔۱۹۰۔ شمع اور شاعر ۔

غیور و جسور طیور (سچے مسلمان) پرواز کر گئے یعنی دنیا سے رخصت ہوگئے جن کی قوت ایمانی کا یہ عالم تھا کہ شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی اور کلمہ حق پڑھتے تھے چھاؤں میں تلواروں کی ۔ یہاں تک کہ :۔

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے | پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز | قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز (۱)

لیکن اس کے بعد افراد ملت عیش و عشرت کے دلداہ ہوئے تو ملت پر دور خزاں آ گیا ۔ ایسے میں

''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ''

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ | ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے

ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے | کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ وبار سے

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور | خالی ہے جیب گل ، زر کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوت اوراق میں طیور | رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے

شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو | ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ! (۲)

اس طرح رموز بے خودی میں بھی اقبال کہتے ہیں کہ فرد کے لئے جماعت سے ربط رکھنا باعث رحمت ہے ۔ ملت کے اندر رہ کر ہی اس کا جوہر کمال حاصل کرتا ہے ۔ جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ لگا رہ ۔ اور اس طرح ہنگامہ احرار کی رونق بن جا ۔ حضور اکرم ﷺ کے اس فرمودہ کو اپنی جان کے لئے تعویز بنا لے کہ شیطان جماعت سے دو رہتا ہے ۔ فرد اور جماعت ایک دوسرے کے لئے آئینے کی مانند ہیں ۔ ان کی مثال دھاگے اور موتی اور کہکشاں اور ستارے کی ہے ۔

فرد کی توقیر ملت سے ہے ۔ اور ملت کا نظام افراد پر مبنی ہے ۔ جب فرد جماعت میں گم ہو جاتا ہے ۔ تو گویا وسعت کا متلاشی قطرہ دریا بن جاتا ہے ۔ فرد اپنی ملت کی قدیم روایات کا حامل ہوتا ہے ۔ اس کے اندر ملت کے ماضی اور مستقبل کا عکس دیکھا جا سکتا ہے ۔ فرد کی ذات ملت کے ماضی و مستقبل کا نقطہ اتصال ہے ۔ ملت ہی سے فرد کے اوقات ابد کی طرح لا

---

(۱) بانگ درا ۔ ۱۶۳ ۔ ۱۶۴ ۔ شکوہ ۔

(۲) بانگ درا ۔ ۲۴۸ ۔ ۲۴۹ ۔

انتہا ہو جاتے ہیں ۔ ملت ہی کی وجہ سے فرد کے دل میں اپنی قوتوں کے اظہار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ فرد کی سرگرمیوں کا اندازہ ملت ہی کے مقام سے لگایا جا سکتا ہے ۔ قوم فرد کا پیکر بھی ہے اور اسکی جان بھی ۔ قوم ہی اس کا ظاہر ہے اور قوم ہی اسکا باطن ،فرد قوم ہی کی زبان سے بات کرتا ہے اور اسی کے ذریعے اسلاف کی راہ پر گامزن رہتا ہے ۔ فرد ملت میں مل کر اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے گویا معناً فرد ملت بن جاتا ہے۔ فرد کی وحدت ملت کی کثرت سے استقامت پاتی ہے ۔ اور افراد کی کثرت ملت کے ذریعے وحدت بن جاتی ہے ۔ جیسے لفظ کو اگر شعر سے نکال دیا جائے تو اس کی جیب سے مضمون کا معنی ٹوٹ جاتا ہے ۔ یعنی وہ بے معنی ہو جاتا ہے ۔ پتہ اگر اپنے درخت سے گر جاتا ہے تو بہار کے موسم میں بھی اس کے سرسبز ہونے کی امید ختم ہو جاتی ہے ۔

فرد اکیلا ہو تو وہ اعلیٰ مقاصد سے غافل رہتا ہے ۔ اور اس کی قوتیں روبہ انحطاط ہو جاتی ہیں ۔ قوم اسے ضبط سے متعارف کراتی ہے اور اسے صبا کی مانند ہولے ہولے چلاتی ہے ۔ قوم اسے شمشاد کی مانند مٹی کی پابند بناتی ہے ۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھتی ہے ۔ تاکہ اسے آزاد کرے ۔ جب فرد اپنے آپ کو قانون کا پابند بناتا ہے ۔ تو اس کی رم خوفطرت میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے ۔

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است
ناتوانی باجماعت یارباش — رونق ہنگامۂ احرار باش
حرز جاں کن گفتۂ خیرالبشر — ہست شیطاں از جماعت دُورتر
فرد و قوم آئینہ یک دیگراند — سلک و گوہر ، کہکشاں ، و اختراند
فرد میگیرد زملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
مایہ دارِ سیرتِ دیرینہ او — رفتہ و آئندہ را آئینہ او
وصلِ استقبال و ماضی ذات او — چوں ابد لا انتہا اوقات او
دردلش ذوق نمو از ملت است — احتساب کارِ او از ملت است

پیکرش از قوم و ہم جانش زقوم　　ظاہرش از قوم و پنہانش زقوم

درزبانِ قوم گویا می شود　　بررہِ اسلاف پویا می شود

پختہ تر از گرمیء صحبت شود　　تا بمعنی فرد ہم ملت شود

وحدتِ او مستقیم از کثرت است　　کثرت اندر وحدت او وحدت است

لفظ چوں از بیت خود بیروں نشست　　گوہرِ مضموں بجیب خود شکست

برگِ سبزے کزنہال خویش ریخت　　از بہاراں تارامیدش گسیخت

ہر کہ آب از زمزمِ ملت نخورد　　شعلہ ہاے نغمہ درعودش فسرد

فرد تنہا از مقاصد غافل است　　قوتش آشفتگی را مائل است

قوم باضبط آشنا گرداندش　　نرم رومثل صبا گرداند ش

پابہ گل مانند شمشاد ش کند　　دست و پا بندد کہ آزادش کند

چوں اسیر حلقہء آئیں شود
آہوئے رم خوے او مشکیں شود　　(۱)

گویا کہ بے شک :۔

وجود افراد کا مجازی ہے ، ہستیء قوم ہے حقیقی　　فدا ہوملت پہ ، یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا　　(۲)

امت مسلمہ کی زبوں حالی کا یہ عالم ہے کہ بطحا کا رہنے والا اپنے ہی صحرا میں راہ گم کیئے ہوئے ہے ۔ اس کے دم سے الا اللہ کا سوز ختم ہو چکا ہے ۔ اہل مصر نیل کے گرداب میں پڑے ہیں ۔ افلاس زدہ تورانی بھی کمزور پڑ چکے ہیں ۔ آل عثمان (ترک) زمانے کے شکنجے میں گرفتار ہیں ۔ مشرق و مغرب ان کے خون سے سرخ ہو چکا ہے ۔ عشق کے اندر سلمان فارسیؓ کا انداز نہ رہا ۔ ایران کی سرزمین رہ گئی ، وہی آب وگل ایران وہی تبریز ہے ساقی مگر ایرانی ختم ہوگیا ۔ اسی لیے تو نہ اٹھا پھر کوئی رومیؒ عجم کے لالہ زاروں سے ۔ اس کے بدن میں زندگی کا سوز و ساز نہیں رہا ۔ اس کے دل کے اندر کی پرانی آگ افسردہ ہو چکی ہے ۔ ہندی مسلمان صرف پیٹ کا غلام ہے ۔ اس نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے اور دین سے برگشتہ خاطر ہو چکا

---

(۱) رموز بے خودی ۔ ۸۵ ۔ ۸۶ ۔ ۸۷ ۔　　(۲) بانگِ درا ۔ ۱۳۰ ۔

ہے۔ ہندوستانی مسلمان کو نماز قائم کرنا بھی مشکل لگتا ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان کی ولایت بدل رہی ہے۔ یہاں کے زمین و آسمان بدل رہے ہیں۔ ہم سے پانچ وقت کی نماز کی امید نہ رکھ محکوموں کے لیے صف آرائی گراں ہے۔

دگرگوں کشور ہندوستان است ۔ دگرگوں آں زمین و آسماں است

مجو از ما نماز پنجگانہ ۔ غلاماں راصف آرائی گراں است (۱)

غلامی نے مسلمان کو خود فروش بنا دیا ہے۔ وہ مادی دنیا کے فریب میں گرفتار ہے۔ غلامی کے باعث ہمارے بدن کی رگیں ایسی ست ہوچکی ہیں۔ کہ شریعت اور دین ہمارے لیے بار دوش بنے ہوئے ہیں۔ مسلمان کے اندر شان محبوبی نہیں رہی۔ وہ فاروق اعظم اور صلاح الدین ایوبی نہیں رہا۔

ز محکومی مسلماں خود فروش است ۔ گرفتار طلسم چشم و گوش است

ز محکومی رگاں در تن چناں ست ۔ کہ مارا شرع و آئیں بار دوش است (۲)

اقبال کہتے ہیں کہ فرد سے قوم زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح قطرے سے دریا کا رتبہ بہت بڑھ کر ہے۔ سکندر گیا اور اس کی شمشیر اور علم بھی اس کے ساتھ ہی گئے۔ شہروں سے وصول کیا ہوا خراج، کان سے نکالا ہوا خزانہ اور سمندر سے حاصل کیے ہوئے موتی سب گئے۔ قوموں کو بادشاہوں سے زیادہ پائیندہ سمجھ۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ ایران باقی ہے جبکہ جمشید ختم ہوچکا ہے۔

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت ۔ خراج شہر و گنج کان ویم رفت

امم را از شہاں پائندہ تر داں ۔ نمی بینی کہ ایراں ماندہ و جم رفت (۳)

ملت افغانیہ جو پہاڑوں اور وادیوں میں بکھری ہوئی ہے۔ اس کی رگوں میں شیروں کا خون موجزن ہے۔ یہ لوگ سمجھدار، قوی بدن اور روشن جبین ہیں۔ ان کی آنکھ نر باز کی طرح تیز نگاہ ہے۔ گویا کہ اقبال کو افغانوں سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ آج وہی افغان ہیں جنھوں نے روس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دکھایا۔ جس کے نتیجے میں وسط ایشیاء کے مسلمان آزاد ہوئے اور پھر سے اسلامی ریاستیں معرض وجود میں آئیں۔ بے شک زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں، لیکن مادیت کے پرستار جنرل پرویز مشرف نے ڈالروں کے جھانسے میں آ کر اس نازک موڑ پر امریکہ کے ہاتھوں افغانیوں کے خون سے اپنے

---

(۱) ارمغان حجاز۔ ۱۷۔ (۲) ایضاً (۳) پیام مشرق۔ ۷۰۔

ہاتھ رنگ لیے ہیں ۔ نہ جانے افغانیوں کا یہ خون کیا رنگ لائے گا ۔ بہرحال یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ کہاں وہ کشتیاں جلانے والے جرنیل اور کہاں آج کے ایسے جرنیل کہ خود ہی اپنی تقریروں کے ذریعے امت مسلمہ کو اتنا ڈرا رہے ہیں کہ گویا امریکہ ہمیں ہڑپ کر جائے گا ۔ کسی مسلمان جرنیل کو اس قدر بزدلانہ و مایوسانہ تقاریر زیب ہرگز نہیں دیتیں ۔

اجمی وردشت خویش از راہ رفت	از دمِ او سوزِ الا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گرداب نیل	ست رگ تورانیانِ ژندہ پیل
آلِ عثماں در شکنجِ روزگار	مشرق و مغرب زخونش لالہ زار
عشق را آئین سلمانی نماند	خاک ایران ماند و ایرانی نماند
سوز و سازِ زندگی رفت از گلش	آں کہن آتش فسرد اندر دلش
مسلم ہندی شکم را بندہ	خود فروشے ، دل زدیں برکندۂ
درمسلماں شان محبوبی نماند	خالدؓ وفاروق و ایوبی نماند
ملت آوارۂ کوہ و دمن	در رگ او خون شیراں موجزن
زیرک و روئیں تن و روشن جبین	چشم اوچوں جرہ بازاں تیز بیں (۱)

ہمارے دین میں بادشاہی خدمت گری ہے ۔ یہ فاروقی عدل اور حیدری فقر سے عبارت ہے ۔ حکومت اور دین کے معاملات کے ہجوم میں ۔ کبھی ایک لمحہ کے لیے اپنے دل کے ساتھ بھی خلوت اختیار کر ۔ جو شخص ایک لمحہ کے لیے اپنی گھات میں بیٹھا ہے ۔ اس کی کمند سے کوئی شکار بچ کے نہیں جا سکتا ۔ بادشاہی کے لباس میں درویش کی طرح زندگی بسر کر ۔ راتوں کو جاگ اور ہر دم اللہ تعالیٰ کو یاد رکھ ۔ مسلمانوں نے اس طرح حکومت کی ہے کہ وہ شہنشاہی میں بھی فقیر منش رہے ۔ انہوں نے اپنی امارت کے دوران فقر میں اضافہ کیا ۔ وہ اس طرح زندگی بسر کرتے رہے جس طرح سلمان فارسیؓ مدائن میں رہے ۔ وہ حکمران تھے مگر ان کے پاس کوئی سامان نہ تھا ۔ وہ قرآن پاک اور تلوار کے علاوہ اپنے پاس کچھ نہ رکھتے تھے ۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن	نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن (۲)

اس لیے کہ قرآن پاک عدل و انصاف کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔ قرآن پاک کی نظر میں آقا و غلام برابر ہیں ۔ کوئی بوریا

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۱۷ ۔ ۱۸ ۔

(۲) رموز بیخودی ۔ ۱۲۳ ۔

نشین ہو یا تخت کا وارث ان میں کوئی فرق نہیں ۔

پیش قرآن بندہ و مولا یکے است　　بوریا و مسند دیبا یکے است　(۱)

اللہ تعالی سے حضرت صدیقؓ اور حضرت علیؓ کا سوز طلب کر۔ حضور اکرمؐ کے عشق کا ذرہ مانگ۔ اس لیے کہ ملت اسلامیہ کی زندگی کا دارومدار حضورؐ کی محبت پر ہے ۔ یہی عشق کائنات کا سارا سازوسامان ہے ۔ حضورؐ کے جلوۂ بے پردہ سے وہ جو ہر پنہاں جو وجود کائنات کے اندر ظاہر ہوا ۔ آپؐ کی محبت کے بغیر روح کو تسکین حاصل نہیں ہوتی ۔ آپؐ کا عشق ایسا روز روشن ہے ۔ جس پر شام کا گزر نہیں ۔ امریکہ سے عشق کرنا چھوڑ، اٹھ اور عشق رسولؐ کے جام کو گردش میں لا، قہستان کے اندر ازسرنو عشق کا پیغام عام کر ۔

سروری در دینِ ماخدمت گری است　　عدل فاروق و فقر حیدری است

در ہجوم کار ہائے ملک و دیں　　بادل خود یک نفس خلوت گزیں

ہر کہ یک دم در کمین خود نشست　　ہیچ نخچیر از کمند او نجست

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند　　در شہنشاہی فقیری کردہ اند

در امارت فقر را افزودہ اند　　مثل سلمانؓ در مدائن بودہ اند

حکمرانے بود و سامانے نداشت　　دست اوجز تیغ و قرآنے نداشت

سوز صدیقؓ و علیؓ از حق طلب　　ذرّہء عشقِ نبی از حق طلب

زانکہ ملت راحیات از عشقِ اوست　　برگ و ساز کائنات از عشق اوست

جلوۂ بے پردۂ او وا نمود　　جوہر پنہاں کہ بود اندر وجود

روح راجز عشقِ او آرام نیست　　عشقِ او روزیست کو را شام نیست

خیز و اندر گردش آور جام عشق
درقہستاں تازہ کن پیغام عشق　(۲)

اقبال کہتے ہیں کہ قوموں پر جب زبوں حالی اور خستہ حالی چھا جاتی ہے تو ایسے میں قوم کے سنوارنے اور بگاڑنے

---

(۱) رموز بیخودی ۔ ۱۰۸۔

(۲) پیام مشرق ۔ ۲۰۔ ۲۱۔

میں شاعر کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے ۔ ان کے ہاں اس ضمن میں طرح طرح کی مثالیں موجود ہیں، جن کا حوالہ موقع ومحل کے مطابق پیش کیا جا رہا ہے ۔ لیکن یہاں "مشاہیر یونان و روما" سے ایک واقعہ پیش خدمت ہے ۔ " جس زمانے میں ایتھنز والے جزیرہ سلامیس کے لیے اہل مگارا سے لڑتے لڑتے تھک گئے اور دشمنوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے تو انہوں نے قانون بنایا کہ جو کوئی اب ایتھنز کو سلامیس پر قبضہ حاصل کرنے کی بذریعہ تقریر یا تحریر ترغیب دے تو اس کو سزائے موت دی جائے ۔ اس بزدلی پر سولن نہایت ناراض ہوا ۔ اور یہ دیکھ کر کہ ناراض تو اور بھی بہت سے نوجوان ہیں ۔ لیکن قانون کے خوف سے ہاتھ پاؤں ہلانے سے ڈرتے ہیں ۔ اس نے اپنے آپکو دیوانہ بنالیا ۔ ۔۔۔۔۔۔ اس نے ایک مرثیہ لکھ کر اسے حفظ کرلیا"۔ (۱)

اس مرثیے کا اس قدر اثر ہوا کہ ایتھنز کی حکومت نے سزائے موت والا قانون منسوخ کرتے ہوئے سلامیس پر آخری بار پھر چڑھائی کردی ۔ اہل مگارا کو شکست فاش دی اور اپنے جزیرے پر قبضہ کرلیا ۔ یہ ہے اس شاعر کا کارنامہ جس کی آنکھ قومی جسم کے درد میں بے اختیار اشکبار ہوجاتی ہے ۔ ایسی ہی قوم خوش قسمت ہوتی ہے ۔

اقبال کہتے ہیں کہ دوسری جانب اس قوم پر افسوس ہے جو اپنی موت لانے میں خود حصہ دار بنتی ہے ۔ اور جس کا شاعر ذوق حیات سے روگردانی کرتا ہے ۔ ایسے ناکارہ شاعر کا آئینہ افکار بری چیز کو اچھی کرکے دکھاتا ہے ۔ جس کا شہد جگر میں سینکڑوں نشتر چبھو دیتا ہے ۔ جو پھول کو بوسا دے تو وہ مرجھا جاتا ہے ۔ جو بلبل کے دل سے ذوق پرواز چھین لیتا ہے ۔ یعنی قوم پر بے عملی سوار کر دیتا ہے ۔ جس کے افیونی نغمے افراد قوم کے اعصاب شل کر دیتے ہیں ۔ جس کا مضمون قوم سے زندگی چھین لیتا ہے ۔ جو سرو سے بانکپن کا ذوق چھین لیتا ہے ۔ جس کی آہ سرد نر شاہین کو چڑیا بنا دیتی ہے ۔ ایسا شاعر درحقیقت مچھلی ہے لیکن سینے سے سر تک آدم کی صورت رکھتا ہے ۔ بنات السحر کی طرح وہ سمندر ہی میں رہتا ہے ۔ وہ اپنے نغمے سے ملاح کو سحر زدہ کر دیتا ہے ۔ اور اس کی کشتی کو دریا کی گہرائی میں غرقاب کر دیتا ہے ۔ اس کی شاعری دلوں سے استقلال چھین لیتی ہے ۔ اس کے جادو سے لوگ موت کو زندگی سمجھنے لگتے ہیں ۔

وائے قومے کز اجل گیرد برات   شاعرش وا بوسد از ذوق حیات
خوش نماید زشت را آئینہ اش   در جگر صد نشتر از نوشینہ اش
بوسہء او تازگی از گل برد   ذوق پرواز از دل بلبل برد

---

(۱) مشاہیر یونان و روما ۔ ۲۴۰ ۔ جلد اوّل ترجمہ از مولوی سید ہاشمی فرید آبادی ۔

ست اعصابِ تو از افیون او زندگانی قیمت مضمون او
می رباید ذوق رعنائی ز سرو جرهٔ شاہیں از دم سردش تدرو
ماہی و از سینہ تا سر آدم است چوں نباتِ آشیاں اندریم است
از نوا برناخدا افسوں زند کشتیش در قعر دریا افگند
نغمہ ہایش از دلت دزدد ثبات مرگ را از سحر او دانی حیات (۱)

وہ تیرے اندر سے زندگی کی خواہش نکال لیتا ہے، گویا تیری کان کے اندر سے سرخ لعل نکال لیتا ہے۔ وہ نفع کو نقصان بنا کر دکھاتا ہے اور ہر اچھی چیز کو بری بنا دیتا ہے۔ وہ تجھے وسوسوں کے سمندر میں ڈال دیتا ہے۔ اور اس طرح عمل سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ اسکے کلام سے بیمار اور زیادہ بیمار ہوجاتا ہے۔ اس کا جام انجمن کو اور زیادہ افسردہ کر دیتا ہے۔ اس کے بادل میں برق کی ندی نہیں۔ اس کا باغ رنگ و بو کا سراب ہے۔ اس کے حسین وجمیل الفاظ کو سچائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے سمندر میں عیب دار و داغدار موتیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ نیند کو بیداری سے بہتر قرار دیتا ہے۔ اس کی پھونکوں سے آگ تیز ہونے کی بجائے الٹا بجھ جاتی ہے۔ اس کی بلبل کے نغموں سے دل مسموم ہوجاتا ہے۔ اسکے پھولوں کے انبار کے نیچے سانپ سویا ہوا ہے۔

اس کے خم اور مینا و جام سے خدا محفوظ رکھے۔ اس کی آئینہ بساں شفاف شراب سے خدا بچائے۔ تو ایسے ہی شاعر کی شراب پی کر گرا پڑا ہے۔ تیری صبح اس کی صراحی کی مرہون منت ہے۔ اس کے نغمے سے تیرے دل کا جوش ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ تو نے اس کے نغموں کی صورت میں کان کی راہ سے زہر قاتل کھایا ہے۔

تیرا انداز ہی انحطاط اور زوال کی دلیل ہے۔ تیرے ساز کا تار نوا پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ تو آرام طلبی کے باعث اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ دنیا میں ننگ مسلمانی ہے۔ تجھے رگ گل سے باندھا جاسکتا ہے۔ بادنسیم کا جھونکا تجھے زخمی کر دیتا ہے۔

اے جوانو! اب ضعیفی ہے ہماری ان دنوں
پھینک دیتی ہے ہمیں باد بہاری ان دنوں (واجد علی شاہ)

---

(۱) اسرار خودی۔ ۳۶۔

وایۂ ہستی زجان تو برد   لعل عنابی زکان تو برد
چوں زیاں پیرایہ بندد سود را   می کند مذموم ہر محمود را
در یمِ اندیشہ اندازد ترا   از عمل بیگانہ می سازد ترا
خستۂ ما از کلامش خستہ تر   انجمن از دور جامش خستہ تر
جوئے برق نیست درنیسان او   یک سراب رنگ و بوستان او
حسنِ او را باصداقت کار نیست   در یمش جز گوہر تف دار نیست
خواب را خوشتر زبیداری شمرد   آتش ما از نفسہایش فسرد
قلب مسموم از سرودِ بلبلش   خفتہ مارے زیر انبار گلش

از خم و مینا و جامش الحذر
از مئے آئینہ فامش الحذر

اے زپا افتادہ صہبائے او   صبح تو از مشرق مینائے او
اے دلت از نغمہ ہایش سرد جوش   زہر قاتل خوردۂ از راہ گوش
اے دلیل انحطاط انداز تو   از نوا افتاد تار ساز تو
آں چناں زار ازتن آسانی شدی   درجہاں ننگ مسلمانی شدی
از رگ گل میتواں بستن ترا   از نسیمے میتواں خستن ترا (۱)

ایسا شاعر ''حسن کار'' کی بجائے سانپ کی پھنکار ہے۔ اس کی سریلی پھنکار کے اثر سے، تیری آہ و پکار نے عشق کو رسوا کردیا ہے۔ تیری مصوری نے عشق کی جو تصویر کھینچی ہے۔ وہ بدصورت ہے۔ تیری بیماری کی وجہ سے عشق کے رخسار بھی پیلے پڑ چکے ہیں۔ تیری بے حسی نے آتش عشق سے تپش ختم کردی ہے۔ تیرے زخموں کے سبب تیرا عشق بھی مضمحل ہے۔ تیری کمزوری کی وجہ سے تیرا عشق بھی تاب و تواں سے محروم ہے۔ تیرے پیمانۂ عشق میں سوائے بچوں کی طرح رونے کرلانے کے اور کچھ نہیں۔ تیرے عشق کی ساری متاع صرف لمبی لمبی آہیں بھرنا ہے۔ تیرا عشق میخانوں کی بھیک سے

---

(۱) اسرار خودی۔ ۳۷۔

سرمست ہے۔ اس کا کام دوسروں کے گھروں کے روزن سے روشنی چرانا ہے۔ یہ عشق ہمیشہ ناخوش، افسردہ و آزردہ اور خانہء محبوب کے پاسبان کی مار پیٹ اور دھول دھپے سے ادھ موا رہتا ہے۔ ہجوم غم کی بنا پر وہ سرکنڈے کی مانند نحیف و نزار ہے۔ اس کی زبان پر ہمیشہ آسمان کے سینکڑوں شکوے رہتے ہیں۔ اس کے آئینہ فطرت کا جوہر خوشامد یا کینہ ہے اور کمزوری سے اس کا پرانا ساتھ ہے۔ یہ عشق کم نصیبی، کمزوری، پس فطرتی، نالائقی، ناامیدی اور ناکامی کا شکار رہتا ہے۔ اس کی آہ و پکار نے تمہاری زندگی کی پونجی اور ہمسایوں کی آنکھوں سے نیند کا لطف چھین لیا ہے۔ افسوس ایسے عشق پر جس کی آگ بجھ چکی ہو۔ جو حرم میں پیدا ہوا اور بت خانے

جو اس شور سے میر روتا رہے گا تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

میں جا کر مرگیا۔

عشق رسواگشتہ از فریاد تو زشت رو تمثالش از بہزاد تو
زرد از آزار تو رخسار او سردیء تو بردہ سوز از نار او
خستہ جاں از خستہ جانیہاے تو ناتواں از ناتوانیہائے تو
گریہء طفلانہ درپیمانہ اش کلفت آہے متاع خانہ اش
سرخوش از دریوزۂ میخانہ ہا جلوہ دزدِ روزن کاشانہ ہا
ناخوشے افسردۂ آزردۂ ازلگد کوب نگہبان مُردۂ
از غماں مانندنے کاہیدۂ وز فلک صد شکوہ برلب چیدۂ
لابہ وکیں جوہر آئینہ اش ناتوانی ہمدمِ دیرینہ اش
پست بخت و زیردست ودوں نہاد ناسزا و ناامید و نامراد
شیونش از جان تو سرمایہ برد لطفِ خواب از دیدۂ ہمسایہ برد
وائے بر عشق کہ ناراو فسرد
در حرم زائید و دربتخانہ مرد (۱)

---

(۱) اسرار خودی۔ ۳۸۔

اس کے بعد اقبال ایسے ناکارہ شاعر سے بغرض اصلاح کہتے ہیں کہ، اے وہ شخص جس کی جیب میں سخن کی نقدی ہے اپنی شاعری کو زندگی کی کسوٹی پر کس۔ پرامید سوچ عمل کی رہبر بنتی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے کڑک سے پہلے بجلی کی چمک۔ ادب میں فکر صالح ہونا چاہیے۔ جو عمل کی طرف رہنمائی کرے۔ ہمیں دوبارہ عربی ادب کی طرف لوٹنا چاہیے۔ دل عرب کی محبوبہ کے سپرد کرنا چاہیے، تاکہ کرد کی شام سے حجاز کی صبح پھوٹے۔ تو نے عجم کے باغ سے پھول چنے ہیں، ہند اور ایران کی نئی بہار دیکھی ہے۔ اب تھوڑی دیر کے لیے صحرا کی گرمی میں وہاں کی کھجور سے حاصل کی ہوئی پرانی شراب بھی چکھ۔ ذرا صحرا کے گرم پہلو میں بھی سر ڈال۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے بدن کو اس کی صرصر کے حوالے کر۔

تو بڑی مدت تک ریشمی لباس سے لطف اندوز ہوتا رہا ہے۔ اب تھوڑی دیر کے لیے کھردرا کپڑا پہننے کی عادت ڈال۔ تو صدیوں تک گل لالہ کی پتیوں پر رقص کرتا رہا ہے۔ تو پھول کی مانند اپنے رخسارں کو شبنم سے دھوتا رہا ہے۔ اب اپنے آپکو تپتی ریت پر بھی سرگرم سفر کر، چشمہء زمزم کے اندر بھی غوطہ زن ہو۔ بلبل کی مانند کب تک نالہ وشیون مین مست رہے گا۔ کب تک اپنا نشیمن باغوں میں بنائے رکھے گا۔ اے وہ شخص جس کے دام، کی برکت سے، ہما جیسا پرندہ گراں قیمت ہوجاتا ہے تو کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر اپنا آشیاں بنا۔ ایسا آشیانہ کہ بجلی اور کڑک اس کے پہلو میں ہوں۔ جو نر بازوں کے گھونسلوں

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر   تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں! (۱)

سے کہیں بلند ہو۔ تاکہ تو کشمکش حیات کے قابل ہو۔ اور تیرا جسم و جاں آتش حیات سے سوزاں ہو۔

اے میان کیسہ ات نقد سخن   برعیار زندگی او را بزن

فکر روشن بیں عمل را رہبر است   چوں درخش برق پیش از تندراست

فکر صالح در ادب می بایدت   رجعتے سوئے عرب می بایدت

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد   تادمد صبح حجاز از شام کرد

از چمن زار عجم گل چیدۂ   نوبہار ہندو ایراں دیدۂ

اند کے ازگرمیء صحرا بخور   بادۂ دیرینہ از خرما بخور

---

(۱) بال جبریل۔ ۱۴۰۔ ایک نوجوان کے نام۔

سر یکے اندر برِ گرمش بدہ | دن دے باصرصر گرمش بدہ
مدتے غلطیدۂ اندر حریر | خو بہ کر پاس درشتے ہم بگیر
قرنہا بر لالہ پاکوبیدۂ | عارض از شبنم چوگل شوئیدہ
خویش رابر ریگ سوزاں ہم بزن | غوطہ اندر چشمہ زمزم بزن
مثل بلبل ذوقِ شیون تاکجا | در چمن زاراں نشیمن تاکجا
اے ھما از یمنِ دامت ارجمند | آشیانے ساز برکوہ بلند
آشیانے برق و تندر در برے | از کنام جرہ بازاں برترے

تاشوی در خوردِ پیکارِ حیات
جسم وجانت سوزد از نار حیات (۱)

یعنی کہ:

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز! | بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
نقدِ خود داری بہائے بادۂ اغیار تھی | پھر دکاں تیری ہے لبریزِ صدائے ناؤ نوش
ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہ سیمایان ہند | پھر سلیمیٰ کی نظر دیتی ہے پیغام خروش
پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز | دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگامِ خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش (۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال مقصدیت کے تحت ''حسن کاری'' کرتے ہیں ۔ مذکورہ بالا حسن کاری و شاعری کی روشنی میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح درخشاں ہے کہ وہ ''حسن کاری'' کو انسانیت کی اصلاح و بقا اور منفعت کی خاطر بروئے کار لانے کے پرزور حامی ہیں ۔ وہ ادب برائے ادب یا عیش برائے عیش کے قائل نہیں بلکہ ادب برائے زندگی ان کا مطمح نظر ہے۔

---

(۱) اسرار خودی ۔ ۳۸۔ ۳۹۔

(۲) بانگِ درا ۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ''شمع اور شاعر''

اقبال کے نزدیک ''حسن کار'' کا فرض ہے کہ وہ افراد معاشرہ اور قوم وملت کو تن آسانی کی بجائے سختی اور جانفشانی کا درس دے۔ اس لیے کہ جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر، تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ۔ فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ۔

اس ضمن میں وہ بذات خود گڑ کھانا ترک کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسروں کو بھی گڑ کھانے کی عادت سے کنارہ کشی کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ عملی طور پر ایسی قومی وملی شاعری کا پیغمبر بن کر دکھاتے ہیں۔ بعد میں اوروں سے بھی ایسی ہی ''حسن کاری'' کی امید رکھتے ہیں، جس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انسان عزت وتکریم اور آزادی کی زندگی بسر کر سکے۔ جس کے اثر سے انسان زندگی کو بیگاڑ اور پہاڑ سمجھنے کی بجائے، عبادت سمجھ کر گزار دے۔

چنانچہ اقبال کے نزدیک شاعری وہ ہے جو مُردوں کو زندہ کردے۔ سوتوں کو جگادے۔ جاگنے والوں کو کوشش و جدوجہد میں سرگرم عمل کردے۔ بیٹھے ہوؤں کو کھڑا کردے اور جو کھڑے ہیں انہیں برق رفتار بنا دے، فرش پیاؤں کو عرش پیا بنا دے اور آں کہ براَفلاک رفتارش بود، برزمیں رفتن چہ دشوارش بود۔ آسمان پر چلنے والے کے لیے زمین پر حکومت کرنا کون سا دشوار ہے؟ مطلب یہ کہ اقبال اسی شاعری کو روا سمجھتے ہیں جو ظاہر و باطن میں ایک ہنگامہ اور ہل چل مچا دے۔ ذرے کے دل میں آفتاب بننے کا ''ذوق وشوق'' پیدا کرے، بلبل، جبریل و سرافیل بننے کی آرزو مند ہوجائے، غلاموں میں آزادی کی تڑپ و پھڑک پیدا کردے۔ گویا کہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کرنے کا ولولہ عطا کردے۔ ''نیست درخشک و تر بیشہء من کوتاہی، چوب ہر نخل کہ منبر نہ شود دار کنم''، نظیری نیشاپوری کے اس فرمان کے مصداق بس اقبال کا ''ذوق حسن کاری'' بھی تمام تر مثبت پہلوؤں کا علمبردار ہے۔ اس لیے وہ فطرت کے ساتھ کبھی شانہ بشانہ اور کبھی دو قدم آگے چل کر ''حسن کاری'' کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ جونہی رات ختم ہوتی ہے تو اقبال فطرت کو جگانے کی غرض سے پھول کے چہرے پر اپنے آنسوؤں کا آب حیات چھڑکتے ہیں۔ یہ آنسو دراصل کلام اقبال ہے اور پھول قوم کا ہر فرد۔ وہ نرگس یعنی قوم کی خوابیدہ آنکھوں سے نیند کا اثر زائل کرکے اسے بیدار کردیتے ہیں۔ ان کی شاعری اس قدر ولولہ انگیز ہے کہ قوم وملت تو کیا، کہ وہ تو ہوش وحواس رکھتی ہے، زمیں میں سے سبزے نے بھی اس کے اثر سے سر اوپر اٹھالیا۔ شمشیر وسناں اول طاؤس و رباب آخر کے حوالے سے اقبال شاعر سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ مصرعہ کاشت کرے اور اس سے شمشیر اگنی چاہیے۔ خود ان کی ''حسن کاری و جبروت کاری'' کا

یہ متحیر کن عالم ہے کہ جب باغبان فطرت ان کے کلام کے زور کو آزمانے کی خاطر مصرع بوتا ہے تو حاصل کے طور پر شمشیر کاٹتا ہے۔

راہِ شب چوں مہر عالمتاب زد گریہء من بررخ گل آب زد
اشک من از چشم نرگس خواب شست سبزہ از ہنگامہ ام بیدار رست
باغباں زور کلام آزمود مصرعے کارید و شمشیرے درود (۱)

اقبال کہتے ہیں گو میں ایک ذرہ ہوں، لیکن سورج کی ساری روشنی میرے ایک لحظہ کے برابر ہے۔ میرے گریبان میں سینکڑوں صبحیں مستور ہیں۔ میری خاک جمشید کے جام سے زیادہ روشن ہے۔ میں ان واقعات سے بھی باخبر ہوں جو ابھی دنیا کے اندر وجود میں نہیں آئے۔ میرے فکر نے معانی کے وہ غزال اپنے شکار بند میں باندھ لیے ہیں جو ابھی تک عدم سے معرض وجود میں نہیں آئے۔

وہ سبزہ جو ابھی اگا نہیں۔ میرے گلشن فکر کی زیب و زینت ہے۔ وہ پھول جو ابھی شاخ سے پھوٹے نہیں۔ وہ میرے دامن فکر میں ہیں۔ میں عیش وطرب کی محفل برہم کرنے والا ہوں۔ میں رگ عالم کے تار کو اپنے مضراب سے چھیڑتا ہوں کیوں کہ میری فطرت کے ساز سے نادر نغمے پیدا ہو رہے ہیں۔ اس لیے میرے پاس بیٹھنے والا میرے نغمے سے ناواقف ہے۔ میں صبح سویرے اٹھنے والوں کے انتظار میں ہوں۔ کیا خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو میرے آتشیں جذبے کے پرستار ہیں۔ میں ایسا نغمہ ہوں جو مضراب سے بے نیاز ہے۔ میں آنے والے دور کا شاعر ہوں۔ میرا دور میرے اسرار کو نہیں سمجھتا۔ میرا یوسف اس بازار کے لائق نہیں۔

ذرہ ام مہر منیرآنِ من است صد سحر اندر گریبانِ من است
خاکِ من روشن تر از جام جم است محرم از ناز او ہائے عالم است
فکرم آں آہو سر فتراک بست کو ہنوز از نیستی بیروں نجست
سبزہ نارُوئیدہ زیب گلشنم گل بشاخ اندرنہاں دردامنم
محفل رامش گری بر ہم زدم زخمہ برتار رگ عالم زدم

---

(۱) اسرار خودی۔ ۵۔

بسکہ عودِ فطرتم نادر نواست ہم نشیں از نغمہ ام ناآشنا ست

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم من نوائے شاعر فرداستم

عصر من دانندۂ اسرار نیست یوسف من بہرایں بازار نیست (۱)

اقبال شاعر فردا ضرور ہیں لیکن وہ ماضی سے بھی اپنا رشتہ نہیں توڑتے، اس لئے کہ مسلمانوں کے شاندار ماضی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے، اقبال امت مسلمہ میں جوش وولولہ پھونکتے ہوئے زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ اور اس طرح مسلمانوں کو اپنے اسلاف کی طرح بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دینے پر اکساتے ہوئے انہیں جراءت مندی، اولو العزمی، دلیری و شجاعت، عدل و انصاف، سخاوت، حوصلہ مندی، رحم لی، ہمدردی و غمگساری، پاکبازی اور حق گوئی و بے باکی اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔

فاطمہ، خواہ کوئی بھی ہو انصاف کا تقاضا ٹل نہیں سکتا۔ دشمن اگر زیر ہو کر منہ پر تھوک دے تو اسے معاف کردیا جاتا ہے۔ اس کا سر قلم نہیں کیا جاتا، حضرت عمرؓ مال غنیمت کی دو چادروں سے اپنا کرتا بناتے ہیں تو انہیں بھری محفل میں اس کی جوابدہی کرنی پڑتی ہے۔ گناہ اگر سرزد ہوجائے تو خلفیہ کے بیٹے کی قبر پر بھی درے برسائے جاتے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کی قالینوں کو نیزوں کی انیوں سے چیر کر رکھ دیا جاتا ہے۔ یہی مسلمانوں کا ماضی ہے۔ اسی میں اقبال کو موجودہ مسلمانوں کے تمام تر امراض کی اکسیر اور استقبال کی تفسیر نظر آتی ہے۔

ہاں یہ سچ ہے، چشم برعہد کہن رہتا ہوں میں اہل محفل سے پرانی داستان کہتا ہوں میں

یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سامنے رکھتا ہوں اس دور نشاط افزا کو میں

دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں (۲)

چنانچہ اقبال کہتے ہیں، اپنے آپ سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ بلکہ دونوں جہانوں کو اپنی طرف کھینچنا چاہیے۔ اپنے ماضی کی روشنی میں اپنا حال دیکھ۔ حال کو ماضی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

دوگیتی را بہ خود باید کشیدن نباید از حضور خود رمیدن

---

(۱) اسرار خودی۔ ۶۔ (۲) بانگ درا۔ ۱۹۶۔

بہ نور دوش بیں امروز خود را   زدوش امروز رانتواں ربودن (۱)

گویا کہ۔

اخلاص عمل مانگ نیاگان کہن سے   'شاہاں چہ عجب گر بنواز ند گدارا' (۲)

اقبال نے اپنے آپ کو شاعر فردا اس لیے بھی کہا کہ، ان کے معاصرین کو کلام اقبال کی پرکھ ہی نہ تھی ۔ ان کے حسین وجمیل یوسف کا کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا۔ اس لیے مزید کہتے ہیں کہ میں اپنے پرانے دوستوں سے ناامید ہوں کہ وہ میری بات سمجھ سکیں میرا ''طور'' جل رہا ہے تاکہ کوئی کلیم آئے۔ میرے ساتھیوں کا سمندر بغیر کسی جوش وخروش کے ہے۔ اس کے برعکس میری شبنم سمندر کی مانند طوفانی ہے۔ میرے نغمے کا تعلق ایک اور ہی دنیا سے ہے۔ اس جرس کے لیے کوئی نیا قافلہ آئے گا۔ بہت سے شاعر ہیں جو مرنے کے بعد زندہ ہوتے ہیں۔ اپنی آنکھ موند لیتے ہیں اور ہماری آنکھ کھول دیتے ہیں۔ وہ عدم سے دوبارہ زندگی کا ساز و سامان لاتے ہیں۔ پھول کی مانند اپنے مزار سے دوبارہ اُگ آتے ہیں۔

اگرچہ اس صحرا سے کئی قافلے گزرے ہیں۔مگر وہ ناقہ کے قدموں کی مانند بغیر کسی شور وغوغا کے گزرے ہیں۔ میں عاشق ہوں فریاد کرنا میرا ایمان ہے۔ میری فریاد سے اتنا شور اٹھتا ہے کہ اس کے مقابلے میں شور محشر ان ملازموں کی مانند ہے جو بادشاہ کی سواری کے آگے آگے بھاگتے اور اسکی آمد کی اطلاع دیتے ہیں۔ اگرچہ میرے ساز کے تار میرے نغمے کے متحمل نہیں ہوسکتے لیکن میں اس سے نہیں ڈرتا کہ وہ ٹوٹ جائیں گے۔ میں اپنا نغمہ الاپتا رہوں گا۔ قطرے یعنی کم ہمت لوگوں کے لئے میرے نغمے کے سیلاب سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ سمندر ہی کو اس کے شور سے دیوانگی حاصل کرنی چاہیے۔ میرا سمندر کسی چھوٹی ندی میں نہیں سما سکتا۔ میرے طوفان کو سنبھالنے کے لیے کئی سمندر چاہئیں۔ وہ غنچہ جو نشو و نما پا کر گلشن کی صورت اختیار نہیں کرتا وہ میرے نغمے کے ابر بہار کے لائق نہیں۔ میری جان میں بجلیاں خوابیدہ ہیں۔ کوہ وصحرا ہی میری تگ و تاز کے لائق ہیں۔ اگر تو صحرا ہے تب میرے بحر کو گرفت میں لے۔ اگر تو طورسینا ہے تو پھر میری برق کو اپنے اندر سمو۔ آب حیات میرے نصیب کیا گیا ہے۔ میری نوا کی تپش سے ذرّہ زندہ ہوگیا ہے اور پروبال نکال کر جگنو بن گیا ہے۔ جو راز میں بیان کر رہا ہوں وہ کسی اور نے بیان نہیں کیا۔ کسی نے معانی کے موتیوں کو اس طرح ایک لڑی میں نہیں پرویا۔

ناامید استم زیاران قدیم   طورمن سوزد کہ مے آید کلیم

---

(۱) ارمغان حجاز۔ ۱۱۳۔   (۲) ارمغان حجاز۔ (اردو)۔ ۱۶۔

قلزم یاراں چو شبنم بے خروش | شبنم من مثل یم طوفاں بدوش
نغمہ من از جہان دیگر است | ایں جرس را کاروانِ دیگر است
اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد | چشم خود بربست و چشم ماکشاد
رخت باز از نیستی بیروں کشید | چوں گل از خاکِ مزارِ خود دمید
کارواں ہا گرچہ زیں صحرا گذشت | مثل گامِ ناقہ کم غوغا گذشت
عاشقم فریاد ایمان من است | شور حشر از پیش خیزان من است
نغمہ ام زاندازۂ تار است بیش | من نترسم از شکستِ عود خویش
قطرہ از سیلاب من بیگانہ بہ | قلزم از آشوب او دیوانہ بہ
در نمی گنجد بجو عمانِ من | بحرہا باید پے طوفانِ من
غنچہ کز بالیدگی گلشن نشد | در خورِ ابرِ بہارِ من نشد
برقہا خوابیدہ درجانِ من است | کوہ و صحرا باب جولان من است
پنجہ کن بابحرم ار صحراستی | برق من درگیر اگر سیناستی
چشمہ حیواں براتم کردہ اند | محرمِ رازِ حیاتم کردہ اند
ذرہ از سوز نوائم زندہ گشت | پرکشود و کرمک تابندہ گشت
ہیچکس رازے کہ من گویم نگفت | ہمچو فکر من دُرِ معنی نہ سفت (۱)

اگر تو عیش جاوداں کا راز معلوم کرنا چاہتا ہو تو میرے پاس آ تو دنیا کا خواہاں ہو یا آخرت کا میرے پاس آ۔ یہ راز مجھے پیر گردوں نے بتائے۔ اگر چہ انہیں ظاہر نہیں کرنا چاہیے لیکن انہیں دوستوں سے پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا۔ اے ساقی! اٹھ اور میرے جام میں وہ شراب ڈال دے جو دل سے زمانے کی کلفتیں دور کردے۔ وہ آتشیں شراب جس کی اصل زمزم سے ہے۔ یعنی اسلامی تعلیمات۔ اس کا چاہنے والا اگر گداگر بھی ہو تو بادشاہ ہے۔ ایسی شراب سوچ کو اور تیز کر دیتی ہے۔ اور جو آنکھ پہلے ہی بیدار ہو اسے بیدار تر کر دیتی ہے۔ یہ تنکے کو پہاڑ کا وقار عطا کرتی ہے اور لومڑی کو شیروں کی قوت بخشتی ہے۔

---

(۱) اسرار خودی۔ ۷۔

خاک کو ثریا کی بلندی دیتی ہے اور چکور کے پنجے کو باز سے لڑا دیتی ہے۔ اٹھ اور میرے جام میں یہ خالص شراب ڈال اور اس طرح میرے فکر کی رات پر چاندنی بکھیر دے۔ تاکہ میں بھٹکے ہوؤں کو منزل کی جانب لے جاؤں اور ''شوق نظارہ'' کو ''ذوق بے تابی'' دوں۔ تاکہ میں ایک نئی جستجو کے راستے میں سرگرم ہوجاؤں اور اپنے آپکو ایک نئی آرزو سے متعارف کراؤں۔ اہل ذوق کی آنکھ کی پتلی بن جاؤں۔ اور دنیا کی آواز میں صدا کی طرح گم ہوجاؤں۔ تاکہ میں متاع شاعری میں اپنے آنسو شامل کر کے اس کی قیمت بڑھادوں۔

سرعیش جاوداں خواہی بیا | ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا
پیر گردوں بامن ایں اسرار گفت | از ندیماں راز ہانتواں نہفت
ساقیا برخیز و مے درجام کن | محو از دل کاوشِ ایام کن
شعلہء آبے کہ اصلش زمزم است | گر گداباشد پرستارش جم است
می کند اندیشہ راہشیار تر | دیدۂ بیدار را بیدار تر
اعتبارِ کوہ بخشد کاہ را | قوّتِ شیراں دہد روباہ را
خاک را اوج ثریا میدہد | قطرہ را پہنائے دریا میدہد
خامشی راشورش محشر کند | پائے کبک از خون باز احمر کند
خیزو در جامم شراب ناب ریز | برشب اندیشہ ام مہتاب ریز
تاسوئے منزل کشم آوارہ را | ذوق بیتابی دہم نظارہ را
گرم رو از جستجوئے نو شوم | روشناس آروزئے نوشوم
چشم اہل شوق را مردُم شوم | چوں صدادرگوشِ عالم گم شوم
قیمت جنس سخن بالا کنم
آب چشم خویش درکالا کنم (۱)

حقیقی شاعر وہی ہے جس کی مشت خاک میں روشنی بھری ہو اور وہ اس روشنی سے دنیا کو جگمگا دے۔ اقبال ایسے ہی

---

(۱) اسرار خودی۔ ۸۔

شاعر ہیں ۔ وہ کائنات کو روشن و رخشاں کرتے ہوئے دوسروں کو بھی اپنے سوز عشق کی تپش عطا کرتے ہیں ۔ وہ ''حسن مطلق '' کے سربستہ راز برملا بیان کرتے ہیں ۔ وہ شراب عشق کی موج بن کر مینا کا لباس پہن لیتے ہیں ۔ شاعر کا فرض ہے کہ وہ راز و نیاز کی باتیں کرتے ہوئے بانسری کی مانند نیستاں کا پیغام سنائے اور قیس کے لیے لیلیٰ کا پیغام لائے ۔ یعنی مرغ لا ہوتم واز دوست پیامے دارم کا عملی نمونہ بن کر دکھائے ۔ اقبال کی ''حسن کاری'' ایسی ہی شاعری کی مکمل و اکمل مثال ہے ۔ وہ ایک نیا انداز ایجاد کرتے ہوئے، بزم عشق کو ہاو ہو سے گرما دیتے ہیں ۔ ان کا نغمہ زندوں کو نئی جان عطا کرتا ہے اور لفظ ''قم '' کہہ کر زندوں میں اور زیادہ زندگی بھر دیتا ہے ۔ اقبال ایسی شاعری کے قائل ہیں جو نئے راستے کی رہنما بنے اور اپنے سر سے پرانی روایات، بت پرستی و توہم پرستی کا سودا نکال دے ۔

حسن کار شاعر وہی ہے جو لذت گفتار سے آشنا ہو اور قافلے کے لیے بانگ رحیل ہو ۔ جس کی آواز تن بدن میں آگ لگا دے اور دوسروں کو ہنگاموں بھری بانسری کی مانند بنا دے ۔ خود اقبال اور ان کی ''حسن کاری'' اس معیار پر بدرجہ اتم پوری اترتی ہے ۔ اسی لیے تو وہ اپنے ساز کے تار سے نغمے کی مانند اٹھ کر سماعت کے لیے جنت سجا دیتے ہیں ۔ وہ خودی کے راز پر سے پردہ اٹھاتے ہیں اور اس کے معجزات پوری طرح ظاہر کرتے ہیں ۔

آتش استی بزم عالم برفروز   دیگراں راہم زسوز خود بسوز
فاش گو اسرار پیر مے فروش   موج مے شو کسوت مینا بپوش
از نیستاں ہمچو نے پیغام دہ   قیس را از قوم حے پیغام دہ
نالہ را انداز نو ایجاد کن   بزم را از ہاے وہو آباد کن
خیز و جان نو بدہ ہرزندہ را   از قم خود زندہ ترکن زندہ را
خیز و پابر جادۂ دیگر بنہ   جوش سودائے کہن از سر بنہ
آشنائے لذت گفتار شو   اے درائے کارواں بیدار شو
زیں سخن آتش بہ پیرا ہن شدم   مثل نے ہنگامہ آبستن شدم
چوں نوا از تار خود برخاستم   جنتے از بہر گوش آراستم

برگرفتم پردہ از راز خودی
وانمودم سرِ اعجاز خودی (۱)

پھر کہتے ہیں میں نے انسان کے غم میں رو رو کر راتیں گزر دیں۔ تب کہیں جا کر میں زندگی کے رازوں پر سے پردہ اٹھانے میں کامیاب ہوا۔ میں نے ممکنات کے کارخانے کے اندر سے زندگی کے استحکام کا راز نکال لیا ہے۔ میں جس نے شب زیست کو چاند کی طرح خوبصورت بنا دیا ہے۔ میں فقط ملت بیضا کی گرد پا ہوں۔ وہ ملت جس کا شہرہ باغ و راغ میں ہے۔ جس کے تازہ نغمے دلوں میں حرارت پیدا کرتے ہیں۔ وہ ملت جس نے ذرہ بویا اور آفتابوں کے انبار لگا دیئے۔ جس کے کھلیان سینکڑوں رومی اور عطار ہیں۔ میں آہِ گرم ہوں جو آسمان تک پہنچتی ہے۔ اگر چہ میں اہ کا دھواں ہوں، لیکن ہوں تو آگ کے خاندان سے۔ میرے قلم نے فکر بلند کی ہمت سے اس کائنات کے راز کو صحرا میں ڈال دیا یعنی سرعام واضح کر دیا۔ تاکہ قطرہ دریا کے ہم پلہ ہو جائے اور ذرّہ بڑھ کر صحرا بن جائے۔ اس کے بعد اقبال اپنے انداز بیان اور اسلوب پر کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے تبصرہ کرتے ہیں کہ۔ میں ہندی ہوں فارسی میری زبان نہیں میں نئے چاند کی مانند اندر سے خالی ہوں۔ مجھ سے انداز بیان کی خوبصورتی کی توقع نہ رکھ۔ میں شعرائے خوانسار اور اصفہان جیسی زبان پیش نہیں کر سکتا۔ اگر چہ ہندی زبان مٹھاس میں شکر ہے۔ لیکن فارسی زبان کا انداز بیان اس سے زیادہ شیرین ہے۔ فارسی زبان کے جلوے نے میرے فکر کو مسحور کر دیا اور میرا قلم اس کی بدولت ''نخل طور'' کی شاخ بن گیا۔ یعنی میں نے اپنی ''حسن کاری'' کے ذریعے ''حسن مطلق'' کے اسرار و رموز بیان کرتے ہوئے ''حسن ازل'' کی تجلیات کا نور بکھیرا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ کہ اقبال کی ''حسن کاری'' ایسا سویرا ہے، جس کے نور سے دیدہ و دل منور ہو جاتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں، میرے فکر کی بلندی کے لحاظ سے فارسی زبان اس کی فطرت سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اے دانا شخص میری مینائے کلام پر نکتہ چینی نہ کر بلکہ اس مینا کی شراب سے لطف اندوز ہونے کا ذوق پیدا کر۔

بہر انساں چشم من شبہا گریست   تا دریدم پردۂ اسرار زیست
از درونِ کارگاہِ ممکنات   برکشیدم سر تقویم حیات
من کہ ایں شب را چومہ آراستم   گردِ پائے ملتِ بیضا ستم

---

(۱) اسرار خودی۔۱۰۔

ملتے درباغ و راغ آوازہ اش آتش دلہا سرودِ تازہ اش
ذرہ کشت و آفتاب انبار کرد خرمن از صدرومی و عطار کرد
آہِ گرمم رخت برگردوں کشم گرچہ دودم . از تبار آتشم
خامہ ام از ہمت فکر بلند رازِ ایں نہٗ پردہ در صحرا فگند

قطرہ تاہم پایہء دریا شود
ذرّہ ازبالیدگی صحرا شود

ہندی یم از پارسی بیگانہ ام ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام
حسنِ اندازِ بیاں ازمن مجو وانسار و اصفہان ازمن مجو
گرچہ ہندی در عذوبت شکراست طرز گفتار دری شیریں تراست
فکر من از جلوہ اش مسحور گشت خامہء من شاخ نخل طور گشت
پارسی از رفعت اندیشہ ام درخورد بافطرتِ اندیشہ ام

خردہ برمینا مگیراے ہوشمند
دل بذوق خردۂ مینا بہ بند (۱)

مطلب یہ کہ:

میں شاخ تاک ہوں ، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مے لالہ فام پیدا کر! (۲)

اقبال کے نزدیک حقیقی شاعر کی فطرت سراپا جستجو ہے ۔ وہ آرزو یعنی عشق کا خالق بھی ہے اور اس کی پرورش کرنے والا بھی ۔ وہ معاشرے میں شہ زور جذبے بانٹ کر قوم کو مایوسی سے نکال کر جواں امنگوں اور امیدوں سے نوازتا ہے ۔ شاعر قوم کے سینے میں دل کی مانند ہے ۔ دل جب تک دھڑکتا ہے جسم زندہ رہتا ہے ۔ اس لیے شاعر کے بغیر ملت مٹی کا اک ڈھیر ہے ۔ سوز و مستی نئے عالم کے نقوش مرتب کرتی ہے ۔ اس لیے سوز و مستی کے بغیر شاعری سوائے رونے دھونے کے اور کچھ

---

(۱) اسرار خودی ۔ ۱۰، ۱۱ (۲) بال جبریل ۔ ۱۴۷۔

نہیں ۔شاعر شبستان وجود میں جگنو کی مانند ہے کبھی اس کے پروبال میں چمک ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی ۔ لیکن جگنو کی طرح رہ رہ کر اندھیرے میں نور بکھیرتا رہتا ہے ۔

فطرت شاعر سراپا جستجوست خالق و پروردگار آرزو ست!
شاعر اندر سینۂ ملت چو دل ملتے بے شاعرے انبار گل!
سوز و مستی نقشبند عالمے است شاعری بے سوز و مستی ماتمے است!
شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری هم وارث پیغمبری است (۱)

کرمک شب تاب است شاعر در شبستان وجود درپرو بالش فروغے گاہ ہست و گاہ نیست (۲)

اقبال کا ایمان ہے کہ جس شاعر کے دل میں ''محبوب حقیقی'' کا سوز نہیں اس کا فن بے فیض ہے ۔ اس لیے کہ ایسا فن ''حسن ازل'' کے نور سے دور ہوتے ہوئے زندگی کی تپش سے عاری ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ، شاعر رنگیں بیاں کو میری طرف سے کہو ، اگر تو گل لالہ کی طرح جلا ، تو کیا جلا۔ نہ تو نے اپنی آگ سے اپنے آپ کو گداز کیا اور نہ کسی دردمند کی شام روشن کی ۔ گویا کہ ایسا شاعر محض الفاظ کا رنگین گورکھ دھندا پیش کردیتا ہے ۔ اور کسی کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتا ۔

زمن باشاعر رنگیں بیاں گوے چہ سوداز سوز اگر چوں لالہ سوزی
نہ خود رامی گدازی زآتش خویش نہ شام دردمندے بر فروزی (۳)
نالہ کو خیزد از سوز جگر ہر کجا تاثیر او دیدم دگر!
قمری از تاثیر او و اسوختہ بلبل از وے رنگہا اندو ختہ! (۴)

اقبال فن میں کسی کھوٹ کپٹ کے قائل نہیں ۔ وہ کہتے ہیں شاعر کو سچا اور کھرا ہونا چاہیے ۔ اس کی دلیری اور بہادری میں کوئی کمی نہ ہو۔ وہ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کا دل گردہ رکھتا ہو۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق نے ابلہ مسجد ہوں ، نہ تہذیب کا فرزند!
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

---

(۱) جاوید نامہ ۔۴۴۔ (۲) زبور عجم ۔۸۷۔ (۳) پیام مشرق ۔۴۳۔ (۴) جاوید نامہ ۔ ۱۲۵۔

مشکل ہے کہ اک بندہ حق بیں وحق اندیش　　خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دما وند! (۱)ذ

ایک لحاظ سے اُسے مردفقیر ہونا چاہیے۔ تا کہ اس کی شاعری میں شان خلیل اور جبروت کلیم پیدا ہو سکے۔ گویا کہ شاعر کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جلالی نمونہ ہونا چاہیے۔ تا کہ اصلاح کی خاطر آزری کے تراشیدہ بتوں کو پاش پاش کر سکے ۔لیکن سخنوری میں یہ اوصاف پیدا کرنے کے لیے خون جگر کو بروئے کار لانا پڑتا ہے ۔ ایسی شاعری اعلیٰ وارفع مقام رکھتی ہے ۔اس لیے کہ اسی سے زندگی کی چہل پہل اور گل وگلزار کی رعنائیاں قائم ہیں ۔

شاعر دل نواز بھی بات اگر کہے کھری　　ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری

شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں　　کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری

اہل زمیں کو نسخۂ زندگیٔ دوام ہے　　خون جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

گلشن دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو

پھول نہ ہو ، کلی نہ ہو ، سبزہ نہ ہو ، چمن نہ ہو　　(۲)

پھر اقبال مولانا رومی کے حوالے سے شاعری کو ذہن میں رکھتے ہوئے پیغمبری کے اسرار و رموز کھولتے ہیں ۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر شاعر اپنے منصب حقیقی سے آگاہ ہوتے ہوئے ، اقبال کے معیار ''حسن کاری'' کے مطابق شاعری کرے تو اس کی شاعری اور خود اس کا مقام کس قدر بلند ہوسکتا ہے ۔

خیر رومی فرماتے ہیں تو میں اور ملتیں پیغمبری کی آیات میں سے ہیں ۔ ہمارے زمانے پیغمبروں ہی کی تخلیق ہیں ۔ اس کی پھونک سے کنکریاں بولنے لگتی ہیں ۔ پیغمبری کھیت اور ہم اس کا حاصل ہیں ۔ وہ ہڈیوں اور اعصاب کو پاکیزہ بنادیتی ہے اور فکر کو پرواز جبریل عطا کرتی ہے ۔ پیغمبر کائنات کے اندر ہنگامہ پیدا کرتا ہے ، اس کی زبان سے نجم ، نور اور نازعات جیسی سورتیں صادر ہوتی ہیں ۔

پیغمبر کی تعلیمات آفتاب کو زوال ہرگز نہیں ۔ جو شخص رسالت کا منکر ہے وہ کبھی اپنی تکمیل نہیں کر سکتا ۔ اس کے متبعین کی صحبت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سبب بنتی ہے اور اس کے کرار ، حضرت علیؓ کی ضرب اللہ تعالیٰ کا قہر لاتی ہے ۔ تو عقل کل بھی ہو پھر بھی پیغمبر سے دور نہ بھاگ کیونکہ وہ روح و بدن ، یعنی دین و دنیا کو اکٹھا رکھتا ہے ۔

---

(۱) بالِ جبریل ۔۲۱۔　　(۲) بانگِ درا۔ ۲۱۱۔ ''شاعر''۔

گفتم از پیغمبری ہم باز گوے　　سر اوبامرد محرم باز گوے
گفت اقوام و ملل آیات اوست　　عصر ہاے ماز مخلوقات اوست
از دم اوناطق آمد سنگ و خشت　　ماہمہ مانند حاصل اوچو کشت!
پاک سازد استخوان و ریشہ را　　بالِ جبریلے دہد اندیشہ را
ہاے وہوے اندرون کائنات　　از لب او نجم و نور و نازعات
آفتابش را زوالے نیست نیست　　منکرِ او را کمال نیست نیست
رحمت حق صحبت احرار او　　قہر یزداں ضربت کرّار او
گرچہ باشی عقل کل از وے مرم　　زانکہ او بیند تن و جاں راباہم (۱)

ذوق تخلیق بدن کے اندر آگ کی مانند ہے۔ اس کی روشنی سے انجمن منور ہے۔ جو بھی اس آگ سے کوئی حصہ رکھتا ہے وہ اپنے سازفن کو محفوظ کرلیتا ہے۔ ایسا ''حسن کار'' ہرلمحہ اپنی تخلیقات پر نگاہ مرکوز رکھتا ہے۔ گویا کہ کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔ مبادا اس کی لوح کسی اور کا نقش اختیار کرلے۔

ذوق تخلیق آتشے اندر بدن　　از فروغ او فروغ انجمن!
ہر کہ بردارد ازیں آتش نصیب　　سوز و ساز خویش راگردد رقیب
ہر زماں برنقش خود بندنظر　　تانگیرد لوح او نقش دگر (۲)

ہم دیکھ آئے ہیں کہ اقبال ''حسن ازل'' کے کس قدر شیدائی ہیں۔ وہ تمام تجلیوں اور روشنیوں کا سرچشمہ ''حسن ازل'' ہی کو سمجھتے ہیں۔ فن کے بارے میں بھی اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جتنا کوئی ''حسن مطلق'' سے لو لگائے گا اتنا ہی بڑا ''حسن کار'' ہوگا۔ گویا کہ اقبال کے ''ذوق جمال'' میں روحانیت کے بغیر کوئی بڑا حسن کار نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ فن اگر حسن کی تجسیم گری یا تجسیم نگاری کا نام ہے تو پھر یہ ''حسن کاری'' روحانیت کے بغیر اوج کمال تک نہیں پہنچ سکتی۔ چنانچہ کیا خوب کہتے ہیں، کیا تو پہچانتا ہے کہ طبع نکتہ رس کہاں سے ہے؟ بنگہ خاک گویا کہ بدن کے اندر یہ حور کہاں سے آ گئی۔ معلوم ہوا کہ اقبال کے نزدیک نکتہ سنج طبیعت حور سے کم نہیں۔

---

(۱) جاوید نامہ۔۴۴۔۴۵۔　　(۲) ایضاً۔۶۹۔

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور   عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود!
جبین بندۂ حق میں نمود ہے جس کی   اسی جلال سے لبریز ہے ضمیر وجود! (۱)

حکیموں میں قوت فکر کہاں سے ہے؟ کلیموں کے ذکر کی طاقت کہاں سے ہے؟ یہ دل اور اس کی ''واردات قلبی'' کس کی طرف سے ہیں۔ ان فنون و معجزات کا منبع کہاں سے ہے؟ تیرے اندر گرمی گفتار، یعنی شعر وسخن کی دولت ہے تو یہ تجھ سے نہیں اور شعلہ کردار ہے تو یہ بھی تجھ سے نہیں۔ یہ سب بہار وفطرت کا فیض ہے۔ اور فطرت کی اصل پروردگار فطرت سے ہے۔ زندگی کیا ہے؟ یہ موتیوں کی کان ہے تو صرف امانت دار ہے مالک کوئی اور ہے۔ طبع روشن سے بندہ حق کی آبرو ہے اور خلق خدا کی خدمت اس بندے کا مقصود ہے۔ خدمت پیغمبری کی رہ و رسم ہے، خدمت کی مزدوری طلب کرنا سوداگری ہے۔ شاعری بھی پیغمبری ہے اور پیغمبری روٹی کمانے کا بہانہ نہیں ہوتی۔

می شناسی طبع دراک از کجاست؟   حورے اندر بنگہء خاک از کجاست؟
قوت فکر حکیماں از کجاست؟   طاقت ذکر کلیماں از کجاست؟
ایں دل و ایں وارداتِ او زکیست؟   ایں فنون و معجزات او زکیست؟
گرمی گفتار داری ؟ از تو نیست   شعلہء کردار داری؟ از تو نیست
ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است   فطرت از پروردگار فطرت است!
زندگانی چیست ؟ کانِ گو ھراست   تو امینی صاحب او دیگر است!
طبع روشن مرد حق را آبروست   خدمتِ خلق خدا مقصودِ اوست!
خدمت از رسم و رہ پیغمبری است   مزد خدمت خواستن سوداگری است (۲)

اقبال کے نزدیک ''حسن کاری'' بھی حسن ہے اور فن کا یہ حسن، ''حسن مطلق'' کی دین ہے جتنا کوئی حسن کار اس کے زیادہ قریب ہوگا، اتنا ہی یہ حسن زیادہ پائے گا۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں، میری خاک بدن اسی کے دم قدم سے ہے، میرے گل و ریحان یعنی میرے کلام کا گل وگلزار اسی کے ابرتر کا رہین منت ہے۔ نہ میں اپنے آپ کو پہنچانتا ہوں، نہ حق تعالیٰ کو۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ میں ان کے پہلو میں ہوں۔

---

(۱) ضرب کلیم۔۱۱۰۔   (۲) جاوید نامہ۔۱۰۸۔ حکیم مریخی۔

کف خاکے کہ دارم از دراوست　　گل و ریحانم از ابر تر اوست
نہ 'من' را می شناسم من نہ اورا　　ولے دانم کہ 'من' براوست (۱)

شاعر کو قوم وملت کی بے لوث خدمت کرنی چاہیے شاعری کو مال و دولت اکٹھی کرنے کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیے ۔

ناپید نہیں متاع گفتار　　صد انوری و ہزار جامی!
اک صدق مقال ہے کہ جس سے　　میں چشم جہاں میں ہوں گرامی
اللہ کی دین ہے جسے دے　　میراث نہیں ہے بلند نامی (۲)

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر　　کار ہارا کس نمی سنجد بزر! (۳)

اقبال اشتراکیوں اور ترقی پسندوں سے اتفاق نہیں کرتے ، جن کا خیال ہے کہ شعر و شاعری سے بھی غلے کے انبار لگ جانے چاہییں ۔ اقبال کہتے ہیں شاعری شکم پروری کے لیے نہیں بلکہ قلب ونظر کی آبیاری اس کا فریضہ ہے ۔ اس لیے اقبال بجا فرماتے ہیں کہ ، شاعری متاع بازار کی منڈی میں لائے جانے کے قابل نہیں ۔ گل نسترن کی چاندی سے روئی نہیں خریدی جاسکتی ۔

نقد شاعر درخور بازار نیست　　ناں بسیم نسترن نتواں خرید (۴)

شاعری سے قوموں کی تقدیر تشکیل پاتی ہے اور اسی سے ان کی تعمیر و تخریب ۔ یعنی اقبال کے نزدیک اچھی شاعری قوموں کی ترقی اور بری شاعری زوال کا باعث بنتی ہے ۔ غنی کشمیری کی روح اقبال سے کہتی ہے ، اگر چہ تیرے کلام کا تیر دلوں میں پیوست ہو چکا ہے ۔ مگر کسی نے تجھے تیری حقیقی صورت میں نہیں دیکھا ۔ شاعری تیرا پردہ ہے ، ورنہ جو کچھ تو کہتا ہے وہ شاعری سے ماورئی ہے ۔ یعنی کہ اقبال کی شاعری آسمانی لے ہے جو نغمہ جبرئیل اور بانگ سرافیل کا آمیزہ ہے ۔ ایک نوائے مستانہ سے بہشت کے اندر ایک نیا ہنگامہ برپا کردے ۔

از نوا تشکیل تقدیر امم　　از نوا تخریب و تعمیر امم
نشتر تو گرچہ در دلہا خلید　　مرترا چونانکہ ہستی کس ندید!
پردۂ تو ازنوائے شاعری است　　آنچہ گوئی ماورائے شاعری است

---

(۱) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۴۲ ۔　(۲) ضرب کلیم ۔ ۸۸ ۔　(۳) جاوید نامہ ۔ ۱۰۶ ۔　(۴) پیامِ مشرق ۔ ۲۲۱ ۔

تازہ آشوبے فگن اندر بہشت!
یک نوامستانہ زن اندر بہشت! (۱)

چونکہ سچا اور کھرا فن خال خال ہی ملتا ہے۔ اس لیے اقبال سچے فن کار کے خواہ وہ کوئی بھی ہو بڑے قدر دان ہیں۔ بھرتری ہری کو ہی لے لیجیے۔ اقبال نے ان کا شعر بال جبرئیل کے آغاز میں لکھا ہے۔ کسی شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے کا یہ بہت بڑا انداز ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر   مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

جاوید نامہ میں ہندی شاعر بھرتری ہری کے ساتھ صحبت کے دوران میں بھی اقبال اسے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ، بتایئے شعر میں سوز کہاں سے آتا ہے۔ خودی سے پیدا ہوتا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوتا ہے۔

شعررا سوز از کجا آید، بگوے   از خودی یا از خدا آید، بگوے! (۲)

یہ تو محض ڈرامائی انداز ہے، اقبال بھرتری ہری کی زبانی خود ہی جواب دیتے ہیں، کوئی نہیں جانتا کہ دنیا میں شاعر کہاں ہے۔ شاعر اپنے کلام کے بم وزیر کے پردے میں نہاں رہتا ہے۔ اس کے پہلو میں جو آتشناک دل ہے وہ اللہ کے حضور میں پہنچ کر بھی قرار نہیں پاتا۔ ہماری جان جستجو کے اندر لذت پاتی ہے۔ شعر کو بھی مقام آرزو سے سوز حاصل ہوتا ہے۔ تو جو شراب سخن سے مست مدام ہے، اگر تجھے مقام آرزو، یعنی عشق ''حسن مطلق'' میسر آجائے تو دنیا کے اندر دو اشعار کہہ کر، حواران خلد کے دلوں کو گرما کر اپنا گرویدہ کیا جاسکتا ہے۔

کس نداند درجہاں شاعر کجاست   پردۂ او از بم و زیر نواست!
آں دل گرمے کہ دارد در کنار   پیش یزداں ہم نمی گردد قرار!
جان مارا لذت اندر جستجوست   شعر راسوز از مقام آرزوست!
اے توازتاک سخن مست مدام   گرترا آید میسر ایں مقام
بادو بیتے درجہان سنگ و خشت   می تواں بردن دل از حورِ بہشت! (۳)

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۶۷۔   (۲) ایضاً۔ ۱۶۹۔   (۳) جاوید نامہ۔ ۱۷۰۔

ایک دوسرے مقام پر مولانا جلال الدین رومی اقبال کا تعارف ایسے انداز میں کراتے ہیں جس سے فن شعر وسخن کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ کلام اقبال کے محاسن بھی اجاگر ہوجاتے ہیں ۔ رومی جو حسن ادب کا آئینہ ہے ۔ اس نے نہایت دلبرانہ انداز میں لب کھولے اور کہا یہ میرے ساتھ مشرق سے ایک شاعر ہے میں اسے شاعر کہوں یا ساحر۔ اس کا فکر لطیف اور اس کی جان پرسوز ہے ۔ اس کے اشعار نے اہل مشرق کے دلوں میں سوز و درد پیدا کر دیا ہے ۔ یعنی اہل مشرق کے دلوں میں اس کے کلام کے اثر سے زندگی لوٹ آئی ہے ۔

رومی آں آئینہ حسن ادب باکمال دلبری بکشادلب!
گفت مردے شاعر ے از خاوراست شاعرے یا ساحر ے از خاوراست!
فکر او باریک و جانش دردمند
شعر او در خاوراں سوزے فگند (۱)

اقبال کے نزدیک کلام وہ ہے جو نہ صرف اس دنیا کے خوابیدہ لوگوں کو خواب غفلت سے جگا دے، بلکہ ان درد مندوں کو بھی اتنا متاثر کردے جو اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں کہ ان کی ارواح بھی عش عش کر اٹھیں اور وہ اس خوشی کے مارے کہ ہماری ملت میں بھی ایسا کوئی دانائے راز اور ہزاروں سال بعد ''دیدہ ور'' پیدا ہوا ہے جس کے ہاتھ میں شمشیر و تیر بھی ہے اور قلم کا نیزہ بھی۔ اقبال کے دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ، پرنہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے ۔ اسی لیے تو رومی اقبال کی تعریف کرتے ہیں اور سلطان ٹیپوشہید کی روح بھی الفاظ کے ان موتیوں کی صورت میں نذرانہء عقیدت پیش کرتی ہے ۔ جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ شاعری ہو تو ایسی ہو کیوں کہ یہی اقبال کا حسن فن اور حسن ظن بھی ہے ۔ سلطان شہید زندہ رود سے فرماتے ہیں ۔

تجھے وہ کلام عطا ہوا ہے جو دلوں کے غنچے کھلا دیتا ہے میں ابھی تک تیرے آنسوؤں کی تپش سے جل رہا ہوں۔ تیری جان سے جونوا اٹھ رہی ہے ۔ اس نے ہر سینے کوسوز دروں عطا کیا ہے ۔ میں نے جناب رسالتمابؐ کی مجلس میں حاضری دی ہے ۔ آپ وہ شخصیت ہیں ۔ جن کے بغیر زندگی کے راستے طے نہیں ہوتے ۔ اگر چہ وہاں بات کرنے کی جراء ت نہیں ، وہاں روح کو سوائے ''دیدار جمال'' کے اور کوئی کام نہیں ۔ مگر چونکہ تیرے اشعار کی گرمی سے متاثر تھا۔ میری زبان پر تیرے

---

(۱) جاوید نامہ ۔۱۴۳۔

افکار آ گئے۔حضورؐ نے فرمایا۔''یہ شعر جو تو پڑھ رہا ہے کس کے ہیں۔ان میں زندگی کے ہنگامے موجود ہیں''۔اب تو اسی سوز کے ساتھ جو روح کو پسند ہے۔ ہماری طرف سے دریائے کاویری کو ایک دو باتیں پہنچا دے۔کہ دنیا میں تو بھی زندہ رود ہے اور وہ بھی زندہ رود۔سرود کے اندر سرود بہت خوب رہیگا۔

اے ترا داند حرف دل فروز از تپ اشک تومی سوزم ہنوز
آں نوا کز جانِ تو آید بروں می دحدھر سینہ را سوز دروں!
بودہ ام در حضرتِ مولائے کل آنکہ بے او طے نمی گردد سبل!
گرچہ آنجا جراءتِ گفتار نیست روح را کارے بجز دیدار نیست!
سوختم از گرمئی اشعار تو بر زبانم رفت از افکار تو
گفت ایں بیتے کہ بر خواندی زکیست؟ اندرو ہنگامہ ہائے زندگیست!
باہماں سوزے کہ درساز د بجاں یک دو حرف از مابہ کاویری رساں!
درجہاں تو زندہ رود او زندہ رود
خوشترک آید سرود اندر سرود (۱)

سلطان شہید جیسے عظیم المرتبت شہید کی روح علامہ محمد اقبال کو خراج عقیدت کیونکر نہ پیش کرے کہ وہ نیم مردہ ملت کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر یہ تلخ حقیقت بتا رہے ہیں کہ:

زیر گردوں رجعت اورا نارواست چون زپا افتاد قومے برنخاست!
ملتے چوں مرد ، کم خیزد زقبر چارۂ اوچیست غیر ازقبر و صبر! (۲)

ایسے میں اقبال قوم کے ہر فرد کو شمشیر کی مانند تیز رہنے اور سارے جہاں کی تقدیر بن جانے کا پیغام دیتے ہیں تا کہ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ بن کر چمکے تو ساری قوم کی تقدیر درخشندہ و تابندہ ہوجائے اور قوم مرگ دوام سے محفوظ رہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ (۳)
مرد حق! برندہ چوں شمشیر باش خود جہان خویش را تقدیر باش (۴)

---

(۱) جاوید نامہ۔۱۶۳۔ (۲) ایضاً۔۱۹۱۔ (۳) ارمغان حجاز۔۱۵۔''بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو'' (۴) جاوید نامہ۔۱۹۱۔

فرد و ملت سے متعلق اقبال کہتے ہیں کہ دونوں توحید سے پختہ کار بنتے ہیں ۔ بایزید، شبلی ، بوذر اور طغرل جیسی شخصیتیں اللہ تعالیٰ کے قرب سے بنتی ہیں ۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں انسان کو ہماری تجلی کے بغیر ثبات حاصل نہیں ۔ گویا کہ ''حسن مطلق'' کا جلوہ ہی فرد و ملت کو حیات بخشتا ہے ۔ فرد و ملت دونوں توحید سے کمال پاتے ہیں ۔ فرد کی زندگی جمال ہے اور قوم کی جلال ۔ یعنی اکیلا فرد جمال اور متحد قوم جلال جیسی جبروت حاصل کر لیتی ہے ۔ اے ''لا الہ'' کہنے والے کیا تو جانتا ہے کہ ملت کیا ہے ۔ ملت مساوات اور اتحاد و اتفاق کا نام ہے ۔ ملت کا مطلب یہ ہے کہ ہزاروں آنکھوں میں ایک نگاہ پیدا ہوجائے ۔ اہل حق کی دلیل و دعویٰ ایک ہے ۔ کہ ہمارے خیمے الگ الگ ہیں اور دل اکھٹے ہیں۔ اقبال شاعروں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ بھی ایسا ہی فن تخلیق کریں ۔ جس میں اسی طرح جمالی نکھتیں اور جلالی گھن گرج سنائی دے ۔

فرد از توحید لاہوتی شود ملت از توحید جبروتی شود!
بایزید و شبلی و بوذر از وست امتاں راطغرل و سنجر ازوست!
بے تجلی نیست آدم راثبات جلوۂ ما فرد و ملت را حیات!
ہر دو از توحید می گیرد کمال زندگی ایں راجلال آں را جمال!
چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ؟ باہزاراں چشم بودن یک نگہ!
اہل حق راحجت و دعویٰ یکے است خیمہ ہاے ماجدادلہا یکے است! (۱)

جب ملت توحید مست ہوجاتی ہے تو وہ قوت و جبروت کی مالک ہوجاتی ہے ۔ چونکہ ملت کا وجود ربط باہم سے ہے اس لیے جب اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو وہ مرجاتی ہے ۔

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں (۲)

اگر تو مردہ ہے تو یک نگاہی سے زندہ ہوجا۔ بے مرکزی چھوڑ اور پایندگی پالے ۔ وحدت افکار و کردار پیدا کرتا کہ تو جہاں میں فرمانروائی حاصل کرلے ۔

ملتے چوں می شود توحید مست قوت و جبروت می آید بدست!

---

(۱) جاوید نامہ ۔ ۱۹۲۔ (۲) بانگِ درا ۔ ۲۰۱ ۔ جواب شکوہ ۔

تاوجودش رانمود از صحبت است | مرد چوں شیرازۂ صحبت شکست!
مردۂ از یک نگاہی زندہ شو | بگذر از بے مرکزی پایندہ شو
وحدت افکار و کردار آفریں | تاشوی اندر جہاں صاحب نگیں! (۱)

چنانچہ اقبال اپنی ''حسن کاری'' میں ملت اسلامیہ کے اتحاد و اتفاق پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ، اے عقل مند دوست بات کو سمجھنے کے لئے شہد کے چھتے میں دیکھ۔ اس کا ایک قطرہ سرخ لالے سے بنا ہوا ہوتا ہے اور دوسرا نرگسِ شہلا سے۔ نہ یہ قطرہ کہتا ہے کہ میں نرگسِ شہلا سے ہوں اور نہ وہ قطرہ کہتا ہے کہ میں نیلوفر سے ہوں۔ ہماری ملت ابراہیمی، شہد کا چھتہ ہے اور ہمارا شہد ایمانِ ابراہیمی ہے۔ اگر تو نے نسب کو ملّت کا جزو بنایا تو اخوت کے کام میں رخنہ ڈالا۔

نکتہء اے ہمدم فرزانہ بیں | شہد را درخانہ ہائے لانہ بیں
قطرہ از لالہء حمر استے | قطرۂ از نرگسِ شہلا ستے
ایں نمی گوید کہ من از عبہرم | آں نمی گوید من از نیلو فرم
ملت ماشان ابراہیمی است | شہد ما ایمان ابراہیمی است
گرنسب را جزو ملت کردۂ | رخنہ در کار اخوت کردۂ (۲)

گویا کہ:۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم | چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بوبر ما حرام است | کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم (۳)

اس ضمن میں اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ، تیری عادت طفلانہ ہے۔ ادب سیکھ تو مسلمان کی اولاد ہے۔ نسب پر ناز چھوڑ۔ اگر عرب بھی اپنے سرخ رنگ، خون اور رگ و پوست پر ناز کرے، تو اسے بھی نظر انداز کر دے۔

تو اے کو دک منش خود را ادب کن | مسلماں زادۂ ترک نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست | عرب نازد اگر ،ترک عرب کن

حضورؐ نے نسلی امتیازات کو یکسر جلا دیا۔ حضورؐ آنجنابؐ نے ان خس و خاشاک سے باغ دنیا کو پاک کر دیا۔

---

(۱) جاوید نامہ۔۱۹۳۔ (۲) رموز بیخودی۔۱۶۲ (۳) پیامِ مشرق۔۵۲۔

امتیازات نسب را پاک سوخت　　آتشِ او این خس و خاشاک سوخت　　(۱)

مگر اس کے باوجود افسوس صد افسوس کہ:۔

درجہاں آوارۂ بیچارۂ　　وحدتے گم کردۂ صد پارۂ　　(۲)

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں　　کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟　　(۳)

جاوید نامہ میں ناصر خسرو علوی کی روح سے پتہ چلتا ہے کہ بدن اپاہج بھی ہو تو تیغ و قلم کی فضیلت سے اپاہج نہیں رہتا۔ اس لیے کہ جس ہاتھ میں قلم اور تلوار ہو اس بدن کی روح بڑی جاندار ہوتی ہے۔ شمشیر اور قلم کی نوک سے ہنر اس طرح پیدا ہوتا ہے۔ جیسے آگ سے نور اور لکڑی سے آگ۔ اگر بے دین کے ہاتھ میں قلم اور تیغ آ جائے تو اسے بے ہنر سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ دین کے بغیر قلم یا تیغ کی کوئی حیثیت نہیں۔

دست راچوں مرکب تیغ و قلم کردی مدار　　ہیچ غم گر مرکب تن لنگ باشد یا عرن

از سر شمشیر و از نوک قلم زاید ہنر　　اے برادر ہمچو نور از نار و نار از نارون

بے ہنر داں نزد بے دیں ہم قلم ہم تیغ را　　چوں نبا شد دیں، نباشد کلک و آہن راثمن　　(۴)

یعنی کہ:

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم　　شیشہ دل ہو اگر تیرا مثال جام جم

پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذ رحمانی ہے تو　　ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو!

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے

خرمن باطل جلا دے شعلہ آواز سے　　(۵)

اقبال کہتے ہیں کہ فن کو نہ صرف اپنے عہد کا ترجمان ہونا چاہیے۔ بلکہ آئندہ آنے والے زمانوں پر بھی حاوی ہونا چاہیے۔ یہی عظیم فن کی پہچان ہے۔ کلام اقبال میں یہ دونوں خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ ہاں بہ الفاظ دگر انہوں نے ماضی کی ترجمانی بھی کر دکھائی ہے۔ جب وہ شوکت رفتہ اور شب دیرینہ کی بات چھیڑتے ہیں تو پورا ماضی بھی ہمارے سامنے لاکھڑا کرتے ہیں۔ حال کے حوالے سے کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دور سے دو باتیں کی ہیں۔ اور ان دو ''ظروف'' میں

---

(۱) اسرار خودی۔ ۲۰۔　　(۲) پس چہ باید کرد۔ مثنوی مسافر۔ ص۔ ۵۹۔　　(۳) بانگِ درا۔ ۲۰۲۔ جواب شکوہ۔

(۴) جاوید نامہ۔ ۱۷۵۔　　(۵) بانگِ درا۔ ۵۳۔

سمندر بند کر دیئے ہیں ۔ اس سلسلے میں فنی خصوصیات کو نبھاتے ہوئے اقبال نے پیچدار زبان بھی استعمال کی ہے ۔ اور نیش دار یعنی واشگاف الفاظ بھی ۔ اس طرح انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کر کے اس دور کے افراد کے عقل و دل کو شکار کیا ہے۔ انہوں نے بہ انداز مغرب تہ دار الفاظ کے استعمال کے علاوہ اپنے تار رباب سے اشعار کی صورت میں نالہء مستانہ بلند کیا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مغرب کی اصل ''فکر'' اور مشرق کی اصل ''ذکر'' ہے ۔ یعنی ایک عقل اور دوسرا عشق کا متوالا ہے۔ خدا کرے کہ تو اس ذکر وفکر کا وارث بنے ۔ اپنے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں میں ایک ندی ہوں میرا منبع ذکر وفکر کے یہ دو دریا ہیں ۔ میری جدائی جدائی بھی ہے اور وصل بھی ۔

چونکہ فن ترجمان عصر ہوتا ہے ۔ اس لیے اقبال کی شاعری نے اپنے حالات کے مطابق ہنگامہ پیدا کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان پیاسے ہیں ۔ لیکن ان کے جام خالی ہیں ۔ چہرے چمکدار ، دماغ روشن مگر اندرون تاریک اس لیے کہ وہ کم نگاہ ، بے یقین اور مایوس ہیں ۔ جس کی وجہ سے ان کی آنکھ کو دنیا میں کچھ نظر ہی نہیں آتا ۔ یہ ناکس اپنی عظمت سے انکاری ہیں ۔ غیروں کی عظمت پر ایمان رکھتے ہوئے ، غیروں کی تقلید کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بت خانے کا معمار ان کی مٹی سے اینٹیں گھڑتا ہے ۔ اسی لیے تو کہا کہ :

جوانوں کو مری آہ سحر دے — پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نور بصیرت عام کر دے

اقبال اہل مکتب کو اس بے اعتدالی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں ۔ اس لیے کہ انہوں نے نوجوانوں کی روح سے نور فطرت کو دھو دیا ہے ۔ اسی لیے تو مکاتب کی شاخ سے ایک گل رعنا تک نہیں پھوٹا۔ ہمارے معمار یعنی اساتذہ پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھتے ہیں اور شاہین بچے کو ممولے کے بچے کی خو سکھاتے ہیں۔

من بطبع عصر خود گفتم دو حرف — کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف!
حرف پیچا پیچ و حرف نیش دار — تا کنم عقل و دل مرداں شکار!
حرف تہ دارے بہ انداز فرنگ — نالہء مستانہ از تار چنگ!
اصل ایں زذکر و اصل آں زفکر — اے تو بادا وارث ایں فکر و ذکر!

آبجویم از دو بحر اصل من است فصل من فصل ست وہم وصل من است!

تا مزاج عصر من دیگر فتاد

طبع من ہنگامہء دیگر نہاد!

نوجواناں تشنہ لب خالی ایاغ شستہ رو ، تاریک جاں ، روشن دماغ!

کم نگاہ و بے یقین و ناامید چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید!

ناکساں منکر زخود مومن بغیر خشت بند ازخاک شاں معمار دیر!

مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست تا بجذب اندرونش راہ نیست!

نور فطرت را زجانہا پاک شست یک گل رعنا ز شاخ او نرست!

خشت را معمار ما کج می نہد خوے بط با بچہء شاہین دہد! (۱)

اس کمزوری اور بے اعتدالی کا سبب دین سے دوری ہے۔ اقبال بتاتے ہیں کہ دین حاصل کرنے کا راز سچ بولنے، حلال کھانے اور خلوت وجلوت میں حق تعالی کے جمال کا نظارہ کرنے میں ہے۔ راہ دین میں الماس کی طرح سخت زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اور اللہ تعالی سے دل لگا کر ہر قسم کے وسوسے سے دور رہنا چاہیے۔

سر دیں صدق مقال ، اکل حلال خلوت وجلوت تماشاے جمال!

دررہ دیں سخت چوں الماس زی دل بحق بر بند و بے وسواس زی! (۲)

لیکن یہ بنک جو یہودیوں کی عیار سوچ کا نتیجہ ہیں۔ انسان کے سینے سے ''حسن مطلق'' کا نور نکال لیتے ہیں۔ جب تک یہ یہودی نظام تہ و بالا نہ ہو حلال وحرام کی تمیز نہیں ہوسکتی اور نہ ہی دانش، تہذیب اور دین کی باتیں موثر ہوسکتی ہیں۔

این بنوک ایں فکر چالاک یہود نور حق از سینہ آدم ربود

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دیں سوداے خام (۳)

اس طرح اقبال اپنے پیغام میں ایک طرف معاشرے میں سودی نظام کے جبر وتشدد کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور

---

(۱) جاوید نامہ۔۲۰۲۔ (۲) ایضاً۔۲۰۴۔ (۳) پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔۳۰۔

دوسری طرف اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک فن وہ ہے جو حق بات کہہ دے۔ جو حق و باطل کے درمیان کھل کر ایمان کی حکمت ظاہر کردے۔ چنانچہ اقبال اہل ایمان اور فرعونیوں کی حکمت و اشگاف الفاظ میں کہہ دیتے ہیں۔ کہ فرعونیوں کی ڈپلومیسی مکر وفن ہے یعنی وہ بڑی فن کاری سے روح کو بگاڑتے اورتن کو سنوارتے ہیں۔ ان کی پالیسی دین سے بے راہ روی اور مقام عشق و محبت سے دوری ہے۔ ان کی تدبیر سے ایسا نظام تعلیم جاری کیا جاتا ہے، جس سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سوچ اپنے آقاؤں کے مفاد میں ہو۔ یہاں اقبال حالات کی سچی ترجمانی کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہہ جاتے ہیں کہ بکاؤ علماء دلنشیں حدیثیں سنا کر، اپنے آقاؤں کی مرضی کے مطابق دین کی تجدید کرتے ہیں۔ وہ خبردار کرتے ہیں کہ حکمت فرعونی کے جادو سے قومی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ جس کا علاج خودی میں ڈوب کر ضرب کلیمی پیدا کرنے کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

اقبال ایسی قوم پر افسوس کرتے ہیں جو غیروں کی ڈپلومیسی کا آلہء کار بن کر اپنی تخریب اور دوسروں کی تعمیر کرتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں وہ قوم جو علم و آرٹ میں تو صاحب نظر ہو جائے اور اپنے آپ سے غافل رہے اس کی حالت قابل رحم ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا وہ قوم، قوم نہیں ___ مولٹی فوم ہے۔ جس کا جی چاہے، جہاں چاہے اور جب چاہے بچھا کر اوپر چڑھ جائے۔ ایسی ہی قوم اپنے بدن کی انگھوٹھی کے نگینے، یعنی دل سے اللہ تعالیٰ کا نقش مٹا دیتی ہے۔ اس کے ضمیر میں آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں مگر بے عملی کی بنا پر دم توڑتی رہتی ہیں۔ ایسی نام نہاد قوم غیرت مند اولاد سے بے نصیب رہتی ہے۔ اس کے بدن میں روح یوں ہوتی ہے، جیسے قبر میں مردہ۔ اس کے بوڑھے حیا سے عاری اور نوجوان عورتوں کی طرح اپنے بدن کی آرائش و زیبائش میں مشغول رہتے ہیں۔

حکمت ارباب دیں کردم عیاں　　حکمت ارباب کیں راہم بداں
حکمت ارباب کیں مکراست و فن　　مکر وفن ؟ تخریب جاں تعمیر تن!
حکمتے از بندِ دیں آزادۂ　　از مقام شوق دور افتادۂ
مکتب از تدبیر او گیرد نظام　　تابکام خواجہ اندیشہ غلام!
شیخ ملت باحدیث دلنشیں　　برمراد او کند تجدید دیں

از دم او وحدتِ قومے دونیم کس حریفش نیست جز چوب کلیم
وائے قومے کشتۂ تدبیر غیر کار او تخریب خود، تعمیر غیر
می شود در علم و فن صاحب نظر از وجود خود نگردد با خبر!
نقش حق را از نگین خود سترد در ضمیر ش آرزوہا زاد و مرد
بے نصیب آمد زاولاد غیور جاں بہ تن چو مردۂ در خاکِ گور
از حیا بیگانہ پیران کہن نوجواناں چوں زناں مشغول تن (۱)

گویا کہ:

جواناں را بدآموز است ایں عصر شب ابلیس را روز است ایں عصر
بدامانش مثال شعلہ پیچم مہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر (۲)

ایسے میں اقبال ارمغان حجاز میں حضورؐ کے حضور میں دعا کرتے ہیں کہ میرے عہد کو ایسا پاکباز جوان عطا فرمائیے۔ جس میں مشرقی اور حجازی کر و فر ہو۔ جس کے بازو حیدر کرّار کی مانند قوی ہوں اور جس کا دل دونوں جہانوں سے بے نیاز ہو۔ جو یہاں رشوت کا لالچ نہ رکھتا ہو اور وہاں کے لیے جنت کی خاطر عبادات کی سوداگری نہ کرتا ہو۔ بلکہ خلد بریں کو دوزخ میں جھونک دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

بدہ او را جوانے پاکبازے سروش از شرابِ خانہ سازے
قوی بازوے او مانندِ حیدرؓ دل او از دوگیتی بے نیازے (۳)

اقبال کے دل میں قوم و ملت کے لیے اس قدر درد بھرا ہوا ہے کہ سرکار دو عالم کے حضور میں ان کا ہندی نغمہ اور حجازی لے فریاد میں تبدیل ہو کر یوں مجسم ہوجاتی ہے۔

کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصرو ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں!
یہ زائران حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے

---

(۱) پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق۔ ۱۵۔ حکمتِ فرعونی۔ (۲) ارمغان حجاز۔ ۹۵۔ (۳) ایضاً۔ ۵۳۔

ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں!

غضب ہیں یہ مرشدان خود بیں خدا تری قوم کو بچائے!

بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں (۱)

جس قوم کے علماء رشوت لے کر اغیار کے حق میں فتوے فروخت کرتے ہوں ۔ اس قوم کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ صرف اسی قوم کو سرداری عطا فرماتے ہیں ۔ جو خود اپنے ہاتھ سے اپنی تقدیر لکھتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ ایسی قوم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ۔ جس کا دہقان دوسروں کے لئے کھیتی بوتا ہے ۔

خدا آں ملتے را سروری داد کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت

بہ آں ملت سروکارے ندارد کہ دہقانش برائے دیگراں کشت (۲)

یہ ''دیگراں'' اور ''غیر'' صاف ظاہر ہے کہ فرنگی ہیں ۔ جو اپنی نت نئی سازشوں سے مسلمانوں کو بہاء اللہ اور مرزا محمد قادیانی کی شکل میں نئے نئے نبی بھی فراہم کرتے رہتے ہیں ۔ اقبال طنزاً کہتے ہیں کہ اگر تیری شان و مرتبہ فرنگی کے سبب سے ہے تو اسی کے دروازے پر سجدہ ریز ہو۔ لیکن اپنے ''سرین'' بھی اسی کے ڈنڈے کے حوالے کر ۔ کیوں کہ آخر پالان گر اپنے گدھے پر کچھ حق بھی رکھتا ہے ۔

اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است جبین خود منہ جز بردرِ او

سریں راہم بہ چوبش دہ کہ آخر حقے دارد بہ خرپالاں گر او! (۳)

سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے

نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں (۴)

اقبال کا فن ایسی قوم پر کڑی نکتہ چینی کرتا ہے اور بجا کرتا ہے کہ ان نوجوانوں کی آرزوؤں میں ثبات نہیں گویا کہ وہ ثابت قدم نہیں ، وہ اپنی ماؤں کے پیٹ ہی سے مردے پیدا ہوتے ہیں ۔ ایسی قوم کی لڑکیاں اپنی زلف گرہ گیر میں اسیر، شوخ چشم ، خودنما اور دوسروں کی سوچ سے متاثر ہوتی ہیں ۔ وہ آرائش و زیبائش اور دل باختگی کی شوقین ہوتی ہیں ۔ ان کے ابرویں ہوتے ہیں جیسے دو کھینچی ہوئی تلواریں ۔ ان کے چاندی جیسے سفید ہاتھ نظر کے لیے سامان عیش ہیں ، جیسے کوئی موج آب کے

---

(۱) بانگِ درا ـ ۱۶۳ـ (۲) ارمغانِ حجاز ـ ۶۸ ـ (۳) ایضاً ـ ۱۴۱ـ (۴) بانگِ درا ـ ۱۶۲ـ

اندر مچھلی کا سینہ دیکھے ۔ یہ ایسی قوم ہے جس کی راکھ میں کوئی چنگاری باقی نہیں ۔ اس کی صبح اس کی شام سے بھی زیادہ تاریک ہے ۔ وہ ہر دم روپے پیسے کی تلاش میں رہتی ہے۔ اس کا کام فکر معاش اور موت سے ڈرنا ہے ۔ اس قوم کے دولت مند بخیل اور عیش پرست ہوتے ہیں ۔ وہ رسوم کے چھلکے میں گرفتار اور حقیقت کے مغز سے غافل ہوتے ہیں ۔ ایسی قوم اپنے آباواجداد کے کارناموں کا دفتر بغل میں دبائے پھرتی ہے ۔ مگر اس کے پاس باتیں ہی باتیں ہیں ۔ عمل کوئی نہیں۔ اس کا دین غیروں سے عہد وفا باندھنا ہے ۔ وہ گو حرم کو گرا کر اس کی اینٹوں سے بت کدہ تعمیر کرتی ہے ۔ افسوس اس قوم پر جس نے اللہ تعالیٰ سے دل ہٹا لیا، جو مرچکی ہے، مگر اپنی موت کو بھی نہیں پہچانتی ۔

در دلِ شاں آرزو ہا بے ثبات مردہ زایند از بطون آمہات

دختران او بزلف خود اسیر شوخ چشم و خودنما و خردہ گیر

ساختہ، پرداختہ ، دل باختہ ابرواں مثلِ دو تیغ آختہ

ساعد سیمین شاں عیش نظر سینہء ماہی بموج اندر نگر

ملتے خاکستر او بے شرر صبح او از شام او تاریک تر

ہر زماں اندر تلاش ساز و برگ کار او فکر معاش وترس مرگ

منعمان او بخیل و عیش دوست غافل از مغز اند و اندر بند پوست

از نیاگاں دفتر اندر بغل الاماں از گفتہ ہائے بے عمل!

دین او عہد وفا بستن بغیر یعنی از خشت حرم تعمیر دیر

آہ قومے دل از حق پرداختہ

مردہ مرگِ خویش رانشاختہ (۱)

یہ سانحہ اس لیے رونما ہوا کہ ہم سب نے دین و دل ہار دیا ہے ۔ اور افغانستان پر حالیہ امریکی بربریت اور جارحیت کے سلسلے میں امریکہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ہم نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ہم ایک مردہ قوم ہیں اور ہر وقت پیٹ کی فکر میں لگے رہتے ہیں ۔ ہم دین کے پھول سے اس طرح دور ہو چکے ہیں جس طرح خوشبو۔ جب ہمارا دل مرا تو اس کے

---

(۱) پس چہ باید کرد ۔ ۱۶۔

مرنے سے دین بھی مرگیا۔ہم نے ایک سودے میں دوہری موت خریدی۔

من و تو از دل و دیں نا امیدیم   چو بوے گل ز اصل خود رمیدیم!
دل مامرد و دیں از مردنش مرد   دو تا مرگے بیک سودا خریدیم! (۱)

اقبال پھر کہتے ہیں کہ یہ حکمت فرعونی خاکی ابلیس کی پروردہ ہے اور حکمت شیطانی ،نوری ابلیس کی ایجاد ہے۔ دور حاضر میں جو فساد ہر طرف برپا ہے، وہ ظاہر ہے۔ اس دور کی برائی سے آسمان بھی شرمسار ہے۔ اگر تو چاہے تو تجھے اپنی خدمت کے لیے سینکڑوں خاکی شیطان مل سکتے ہیں۔ شیطانوں کی کوئی کمی نہیں انسان نہیں ملتے۔

فساد عصر حاضر آشکار است   سپہر از زشتیء او شرمسار است
اگر پیدا کنی ذوق نگاہے   دوصد شیطاں تراخدمتگذارست! (۲)

پھر کہتے ہیں اس دور کے پرویزوں سے کہہ دو۔ میں فرہاد نہیں کہ ہاتھ میں تیشہ لوں۔ میرے دل میں جو کانٹا کھٹک رہا ہے، اس سے بیستوں جیسے سینکڑوں پہاڑوں کے دل زخمی کیئے جاسکتے ہیں۔عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را۔

بگواز من بہ پرویزان ایں عصر   نہ فرہادم کہ گیرم تیشہ در دست
زخارے کوخلد درسینہ من   دل صدبیستوں رامی تواں خست (۳)

چونکہ اقبال کا دل نور مطلق سے منور ہے وہ اپنے دل کے اندر گرمی عشق رکھتے ہیں۔ اسی لیے اپنے کلام میں دین کی باتیں کرتے ہیں اور پیغمبر دین حضورؐ سے بے پناہ عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ کے حضور میں دعا گو ہیں کہ اگر وہ دانائے راز یعنی اقبال آئے تو اسے نوائے دلگداز عطا فرمائیں۔ کیوں کہ امتوں کے دلوں کو یا تو کلیم پاک کرتا ہے یا ایسا حکیم جو شاعر ہو۔

اگرمی آید آں دانا ے راز ے   بدہ او را نوائے دل گدازے
ضمیر امتاں رامی کند پاک   کلیمے یا حکیمے نے نوازے (۴)

اقبال لادین فنون کو پسند نہیں کرتے اس لیے ان کا اپنا فن دینی عقائد سے لبریز ہونے کے ساتھ ساتھ عشق و مستی سے بھرپور ہے۔ چنانچہ انہوں نے عشق و مستی کا گناہ سرعام اور عام کر دیا ہے۔ کہتے ہیں پختہ کاروں کی دلیل خام ثابت

---

(۱) ارمغان حجاز۔۱۴۲۔ (۲) ایضاً۔۱۳۶۔ (۳) ارمغان حجاز۔۱۳۳۔ (۴) ایضاً۔۱۳۔

ہوئی، میں حجازی لے میں گیت گا رہا ہوں۔ جو سب سے پہلے جام میں ڈالی گئی ،یعنی شراب الست۔

گناہ عشق و مستی عام کردند   دلیل پختگاں را خام کردند
بآہنگ حجازی می سرایم   نختیں بادہ کاندر جام کردند (۱)

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری   نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اگرچہ میرے بدن کی صراحی ہندی ہے لیکن اس ہندی مینا کے اندر اسلامی تعلیمات اور شراب توحید حجاز کی ہے، اسلام کا نور حجاز سے ہند سمیت پوری دنیا میں پھیلا۔ اور میری شاعری نے خاک ہند میں جنم لیا، مگر اس کی روح حجازی ہے۔ یہ اس لیے کہ اقبال نے حرم شریف کی فضائے دل پذیر میں پرواز کی۔ وہاں برستے ہوئے انوار سے، ان کے پر تر ہو گئے۔ چونکہ حرم ان کے قلب میں اتر گیا، اس لیے اقبال نے اپنے اشعار میں وہی کہا جو ان کے ضمیر میں تھا۔

پریدم در فضائے دلپذیرش   پرم تر گشت از ابر مطیرش
حرم تا در ضمیر من فرورفت   سرودم آنچہ بود اندر ضمیرش! (۲)

پھر کہتے ہیں کہ میری شاعری کے مقامات کے متعلق کیا پوچھتے ہو۔ میرے دوستوں کو بھی خبر نہیں کہ میں کہاں سے ہوں۔ میں نے اپنا سامان اس ویرانے میں کھول دیا ہے تاکہ اس تنہائی میں اکیلا گاؤں۔ اس لیے کہ:

ع   صاحب تخلیق را خلوت عزیز

چہ پرسی از مقامات نوایم   ندیماں کم شناسند از کجایم
کشادم رخت خود را اندریں دشت   کہ اندر خلوتش تنہا سرایم (۳)

اسی سلسلے میں مزید کہتے ہیں کہ بہار کی آمد ہے سبزہ زاروں میں لالہ کے پھول کھل اٹھے۔ دوستوں نے صحرا میں خیمے گاڑھ دیے۔ لیکن مجھے پہاڑ کے دامن میں ندی کے کنارے، اکیلے بیٹھنا ہی پسند ہے۔

بہ راغاں لالہ رست از نوبہاراں   بصحرا خیمہ گستردند یاراں
مراتنہا نشستن خوشتر آید   کنار آبجوئے کوہساراں (۴)

گھر بنایا ہے سکوت دامن کوہسار میں   آہ! یہ لذت کہاں موسیقی گفتار میں (۵)

---

(۱) ارمغان حجاز۔ ۴۵۔ (۲) ارمغان حجاز۔ ۴۳۔ (۳) ارمغان حجاز۔ ۴۵۔ (۴) ایضاً۔ (۵) بانگ درا۔ ۶۳۔

اور پھر:

بزم ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند ہے دل شاعر کو لیکن کنج تنہائی پسند (۱)

تلاش گوشہ عزلت میں پھر رہا ہوں میں یہاں پہاڑ کے دامن میں آچھپا ہوں میں (۲)

نہ مئے، نہ شعر، نہ ساقی، نہ شور چنگ و رباب! سکوت کوہ و لب جوئے ولالہ خود رو (۳)

اس میں شک نہیں، اقبال نے اپنے فن کے ذریعے ''حسن و جمال'' کے جو راز ہائے پوشیدہ بیان کئے، لوگوں نے ان تک رسائی نہیں پائی۔ انہوں نے اقبال کے نخل کلام سے پھل نہ کھائے، چنانچہ حضور کو شاہ اممؐ! کہہ کر پکارتے ہوئے طالب انصاف ہیں کہ دوستوں نے انہیں محض غزل خواں جانا۔ حالانکہ وہ ملت کے درد و غم میں تڑپتے رہے۔ انہوں نے ''حسن و جمال'' کے رموز آشکارا کئے۔ ان کی نوائے شوق سے شور حریم ذات میں اور غلغلہ ہائے الاماں بتکدہ صفات میں۔

بآں رازے کہ گفتم، پے نبردند ز شاخ نخل من خرما نخوردند

من اے میرامم داد از تو خواہم مرا یاراں غزلخوانے شمردند (۴)

اقبال اپنے فن کے بارے میں خود کہتے ہیں، یہ شعر نہیں، جس پر میں نے توجہ دی ہے۔ میں نے تو اسرار و معانی کی گرہیں کھول دی ہیں۔ میں نے دور حاضر کے مفلس مسلمانوں کے قلوب کو اس امید پر گرمایا ہے کہ عشق ان پر اپنی اکسیر ڈال کر انہیں سونا بنادے۔

نہ شعر است ایں کہ بروے دل نہادم گرہ از رشتہء معنی کشادم

بامیدے کہ اکسیرے زند عشق مس ایں مفلساں را تاب دارم (۵)

گذشتہ ابواب میں ہم تفصیلاً دیکھ آئے ہیں کہ واقعی اقبال نے اسرار و معانی کی بھرپور گرہیں کھولی ہیں۔ ان کا سارا کلام عشق و مستی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اپنے اندر اکسیر کی خاصیت رکھتا ہے۔

اقبال نے ''حسن ازل''، حضورؐ اور دین کو معیار بناتے ہوئے اپنی فنی ذمہ داریاں نبھائی ہیں۔ وہ دوسروں سے بھی ایسے ہی فن کی توقع رکھتے ہیں۔ اس لیے عام دنیا دارانہ قسم کی فرمائشی شاعری سے اپنے آپکو دور ہی رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ میں حیات جاوداں کی بات کروں۔ ان مردہ دلوں کے کان میں زندگی کا پیغام پھونکوں۔ مگر یہ حق

---

(۱) بانگ درا۔ ۶۴۔ (۲) بانگ درا۔ ۱۳۱۔ (۳) بال جبریل۔ ۱۳۔ (۴) ارمغان حجاز۔ ۴۳۔ (۵) ارمغان حجاز۔ ۴۳۔

ناشناس مجھ سے کہتے ہیں کہ ایسے ویسے لوگوں کی تاریخ وفات کہوں۔ اقبال ویسے بھی شاعر حیات ہیں، شاعر مرگ نہیں ۔

تو گفتی از حیات جاوداں گوے بگوشِ مردۂ پیغام جاں گوے

ولے گویند ایں حق ناشناساں کہ تاریخ و فاتِ این واٰن گوے! (۱)

اقبال کا عشقِ رسول محتاج تعارف نہیں۔ اقبال نے بحر و بر در گوشہ دامان اوست سے لے کر آیہ کائنات تک کیا کچھ نہیں کہا؟ وہ اپنی فریاد لے کر کسی سرکاری دربار، ایسٹ انڈیا کمپنی یا آئی ۔ ایم ایف کے پاس نہیں جاتے ، بلکہ حضورؐ کے دربار میں عرض کرتے ہیں کہ، دردِ پنہاں سے میرا چہرہ زرد ہے اور میری سرخ آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے ۔ بات میرے گلے میں اٹک کے رہ گئی ہے ۔ میرے کہے بغیر بھی ، آپؐ میرا حال جانتے ہیں ۔

رخم از درد پنہاں زعفرانی تراود خوں زچشم ارغوانی

سخن اندر گلو ے من گرہ بست تو احوال مرا ناگفتہ دانی! (۲)

پھر عرض کرتے ہیں ، ہماری ناگفتہ بہ حالت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے اندر صرف سانس باقی ہے ، جو آہوں کے سبب دھواں بن چکی ہے ۔ آپؐ کے دست مشکل کشا کے علاوہ اور کہیں ہماری رسائی نہیں ۔ ہم اپنی داستان غم کسے سنائیں ۔ ہمارے سینوں میں آپؐ کے علاوہ اور کوئی ہے ہی نہیں ۔

درون ماںجز دود نفس نیست بجز دست تو مارا دسترس نیست

دگر افسانہء غم باکہ گویم کہ اندر سینہ ہا غیر از تو کس نیست (۳)

میں ایک غریب ، دردمند ، نے نواز یعنی شاعر ہوں ۔ میری شاعری میں اتنا سوز ہے کہ اپنے نغمے کے سوز ہی سے پگھلا جا رہا ہوں ۔ آپؐ خوب جانتے ہیں کہ ایسا دل جو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہو۔ کس چیز کا جویا ہے اور کیا چاہتا ہے ۔

غریبے ، دردمندے ، نے نوازے زسوز نغمہء خود در گدازے

توی دانی چہ می جوید ، چہ خواھد، دلے از ہر دو عالم بے نیازے (۴)

اقبال نے اپنے عہد کے غم میں اپنا دل خون کر دیا۔ مگر بے قدروں نے کوئی قدر نہ کی ۔ چنانچہ حضورؐ سے فریاد کرتے ہیں کہ، جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس سے میری نگاہ بے نیاز ہے ۔ میرا دل سوز دروں سے پگھلے جا رہا ہے ۔ میں اور یہ بے

---

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۴۴۔ (۲) ایضاً ۔ ۴۴۔ (۳) ارمغانِ حجاز ۔ ۴۵۔ (۴) ایضاً

اخلاص و بے سوز دور !فرمائیے ! کہ آخر یہ کیا راز ہے۔

نگاہم زانچہ بینم بے نیاز است　　دل از سوز درونم درگداز است
من و ایں عصر بے اخلاص و بے سوز!　　بگو بامن کہ آخر ایں چہ راز است؟　(۱)

زمانے کا رویہ دیکھ کر اقبال پھر شکوہ کرتے ہیں کہ مجھے اس بے سوز دور میں پیدا کیا اور اس پر طرفہ یہ کہ میرے بدن میں پرشور روح پھونک دی۔ میری گردن میں زندگی پھندے کی مانند پھنس کر طوق گلو افشار بنی ہوئی ہے۔ گویا مجھے سولی کے تختے پر چڑھا دیا گیا ہے۔

مرادر عصر بے سوز آفریدند　　بخا کم جان پرشورے دمیدند
چونخ درگردن من زندگانی　　تو گوئی برسردارم کشیدند!　(۲)

اقبال کہتے ہیں کہ شاعری ایسی ہونی چاہیے جو قوم پر خودی اور سکر کی حالت طاری نہ کرے۔ بلکہ ایسی کیفیت سے افراد ملت کو ہوش میں لائے۔ حافظ شیرازی اور ایسے ہی دوسرے شعراء کی مخالفت اقبال اسی لیے کرتے ہیں کہ ان کا کلام انسان پر نشے کی حالت طاری کردیتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھ چکے ہیں کہ افلاطون کا ''نظریہ اعیان'' بھی بالواسطہ طور سے انسان پر بے عملی طاری کرتا ہے جس کی بنا پر اقبال نے افلاطون حکیم کی مخالفت کرتے ہوئے اسے، ازگروہ گوسفندان قدیم کہا ہے۔ چنانچہ کلام اقبال کی تو تاثیر ایسی ہے کہ یہ نشے سے عالم ہوش میں لاتا ہے۔ یہ ملت خفتہ کو بیدار کرنے کا نغمہ بھی ہے اور چابک بھی۔ اس کے اندر ''جلال و جمال'' باہم شیر و شکر ہیں۔ جب نشے کی حالت طاری ہونے لگتی ہے تو مے خوار غل غپاڑہ شروع کردیتے ہیں۔ لیکن مے خانہ اقبال میں تو لوگ بے ہوش ہونے کی بجائے، ہوش میں آتے ہیں۔ اس لیے یہاں کے مے خوار شور و غوغا نہیں کرتے۔ یہ عجیب اور انوکھی حقیقت ہے کہ عام شراب سے ہٹ کر اقبال کی شراب نشہ طاری کرنے کی بجائے نشے کا تریاق ثابت ہوئی ہے۔ اردو شاعری کی پوری تاریخ

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر　　کہ زہر بھی کرتا ہے کار تریاقی!　(۳)

میں اکبر آلہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری اور حالی کی مسدس حالی کے بغیر ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس میں بیداری کی کیفیت پائی جاتی ہو۔ یہ صرف اقبال ہی ہیں کہ ایسی گھن گرج سے آ کر جذبے برسائے کہ بے ہوش تو خیر کوئی بات نہیں، مردوں کے

---

(۱) ارمغان حجاز۔ ۵۰۔　　(۲) ایضاً۔ ۵۱۔　　(۳) بال جبریل۔ ۲۶۔

تن مردہ میں بھی جان ڈال دی ۔ اور جو پہلے سے بیدار تھے، ان کی مشت خاک کو عشق وتمنا، حرکت و آرزو اور امید و رجا کے پر لگا کر افلاک کی پہنائیوں میں شاہیں وار محو پرواز کر دیا۔

اک ولولہء تازہ دیا میں نے دلوں کو　　لاہور سے تا خاک بخارا او سمر قند
فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہوگئے پانی　　مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیء خارا ! (۱)

ایں نکتہ کشائندۂ اسرار نہاں است　　ملک است تن خاکی و دیں روح رواں است
تن زندہ و جاں زندہ زربط تن و جاں است　　باخرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز
از خواب گراں ، خواب گراں ، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

اک شوخ کرن ، شوخ مثال نگہ حور　　آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو　　جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوںگی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خاک سے مردان گراں خواب (۲)

لیکن اس کے باوجود اقبال اپنی شاعری کے بارے میں انتہائی عاجزی اور کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر چہ میری شراب اتنی صاف نہیں، مگر اسے پی جا۔ کیونکہ یہ قدیم دور اسلام کے خموں کے بچی ہوئی شراب کا آخری گھونٹ ہے۔

خودی رانشہء من عین ہوش است　　ازاں میخانہء من کم خروش است
مے، من گرچہ ناصاف است درکش　　کہ ایں تہ جرعہء خمہاے دوش است! (۳)

اقبال عوام الناس کے دکھ درد میں جل رہے ہیں اور یہی قومی و ملی شاعری کا تقاضا بھی ہے ۔لیکن رونا اس بات کا ہے کہ جن کے غم میں شاعر جاں گسل ہے انہیں احساس تک نہیں ۔ وہ اقبال کی کسی بات پر عمل کرنے کو تیار نہیں ۔ جبکہ اقبال کی آرزو ہے کہ افراد ملت انہی جیسا رنگ اپناتے ہوئے کم از کم احساس زیاں تو کرلیں ۔مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں

---

(۱) بال جبریل۔ ۲۵۔　　(۲) ضرب کلیم۔ ۱۰۸۔　　(۳) ارمغانِ حجاز ۔ ۱۳۸۔

ہورہا تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ، میری آرزو میرے سینے ہی میں ختم ہو کے رہ گئی ہے ۔ میرا غم پنہاں الفاظ میں نہیں سماتا ۔ اگر سما بھی سکے تو کیا کہوں اور کس سے کہوں۔

نگیرد لالہ و گل رنگ وبویم درون سینہ ام مرد آرزویم
غم پنہاں بحرف اندر نگنجد اگر گنجد چہ گویم باکہ گویم! (۱)

یعنی کہ:

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی ! میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی! (۲)

اس ضمن میں اقبال انتہائی جذباتی ہوجاتے ہیں اور ان کے لہجے میں ایسی شدت آجاتی ہے کہ ہمیں شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔

از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند در دیار ہند خوارم کردہ اند
لالہ، ول از نوایم بے نصیب طائرم درگلستانِ خود غریب!
بسکہ گردوں سفلہ و دوں پرور است
وائے بر مردے کہ صاحب جوہر است (۳)

گویا کہ اقبال کو اپنی اور اپنی ''حسن کاری'' کی ناقدری کا شدید احساس ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مزید کہتے ہیں کہ وہ بازار جس میں صراف بدنظر اور کم نظر ہے۔ میرا نگینہ جب چمک میں بڑھتا ہے تو اس کی نگاہ میں اس کی قیمت اور کم ہوجاتی ہے۔ میں باغ و راغ میں اپنے نغموں کے موتی بکھیر رہا ہوں ۔ متاع تو قیمتی ہے لیکن خریدار نہ ہونے کے باعث ارزاں بیچ رہا ہوں ۔

ببازارے کہ چشم صیرفی شور است و کم نور است نگینم خوارتر گردد چو افزاید بہ براقی (۴)
باغ و راغ گہرہائے نغمہ می پاشم گراں متاع و چہ ارزاں زکند بازاری است (۵)

میری نوا سے مجھ پر قیامت گزر گئی ، لیکن کسی کو خبر نہیں ۔ محفل صرف آواز کے زیر و بم اور مقام و راہ ہی کو دیکھتی ہے۔

---

(۱) ارمغان حجاز ۔۵۳۔ (۲) بالِ جبریل ۔ ۱۷۔ (۳) پیام مشرق ۔ ۱۷۔ (۴) زبورِ عجم ۔ ۴۸۔ (۵) ایضاً ۔ ۷۶۔

از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست　　پیش محفل جز بم و زیر و مقام و راہ نیست　　(۱)

یہی وجہ ہے کہ اقبال کہتے ہیں، میرے عیب تلاش نہ کر بلکہ میرے جام سے اپنے آپ کو پرکھ، اگر تو میرا جام پی سکتا ہے تو مرد ہے۔ میری تلخ شراب کی لذت میری غموں سے گھلی ہوئی جان کا نتیجہ ہے۔

عیب من کم جوے و از جام عیار خویش گیر　　لذّتِ تلخابِ من بے جانِ غم فرسودنے　　(۲)

اقبال کا فن بھی پروردۂ عشق ہے اس لیے ان کی ''حسن کاری'' کا یہ عالم ہے کہ وہ شرر کی مانند ذرّے میں آگ لگا کر اسے اڑنے کے لیے پر فراہم کر دیتے ہیں۔ وہ جب اپنے مقام سے نغمہ شیریں الاپتے ہیں تو آدھی رات ہی کو صبح کے انداز عطا کر دیتے ہیں۔

مثل شرر ذرّہ را تن بہ تپیدن دہم　　تن بہ تپیدن دہم ، بالِ پریدن دہم!

چوں زمقام نمود نغمہ شیریں زنم　　نیم شباں صبح را میلِ دمیدن دہم!　　(۳)

گویا:

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی　　یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا!　　(۴)

بے شک:

بہ سواد دیدۂ تو نظر آفریدہ ام من　　بہ ضمیر تو جہانے دگر آفریدہ ام من

ہمہ خاوراں بخوابے کہ نہاں زچشم انجم　　بہ سرودِ زندگانی سحر آفریدہ ام من　　(۵)

آسمانوں پر مرا فکر بلند　　!　　میں زمیں پر خوار و زارو دردمند!　　(۶)

لیکن سچ یہ ہے کہ اقبال کا ''نغمہ وشوق'' کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ کلام اقبال اپنے اندر رمز درویشی کے ساتھ ساتھ بادشاہی کا ساز و سامان بھی رکھتا ہے۔ یعنی کہ اقبال فقیری کا درس دیتے ہوئے شہنشاہی کے گر سکھاتے ہیں تاکہ بادشاہ دیوِ بے زنجیر بن کر خلق خدا کو نہ کچلتا پھرے۔ اقبال یقین کامل رکھتے ہیں کہ اگر کسی میں ایمان و ایقان ہو، یعنی اگر کوئی عاشق ہو تو، اس پر ان کی شاعری یا ''حسن کاری'' بالکل اسی طرح اثر انداز ہوسکتی ہے۔ جس طرح بادِ نسیم پھول پر اثر انداز ہوتی ہے۔

---

(۱) زبور عجم۔ ۸۷۔　　(۲) زبور عجم۔ ۱۱۰۔　　(۳) ایضاً۔ ۱۲۳۔

(۴) بالِ جبریل۔ ۲۳۔　　(۵) زبور عجم۔ ۱۴۴۔　　(۶) بالِ جبریل۔ ۱۴۱۔

مکذراز نغمہء شوقم کہ بیابی ازوے رمز درویشی وسرمایہء شاہنشاہی
نفسم باتو کند آنچہ بہ گل کرد نسیم اگر از لذتِ آہِ سحری آگاہی (۱)

بہرحال حالات اگر ایسے ہی دگرگوں ہیں تو اے کوثر وتسنیم کے والی ساقی !اٹھ اور جام مے کو گردش میں لا ، یعنی مجھ پر اپنی نظر کرم سے میرے کلام کے سوز کو اور بھی آتشناک بنا دے ۔ ایک بار پھر میرے سینے میں وہ دل دکھ دے کہ میں کیکاؤس اور کیخسرو کا پنجہ مروڑ دوں ۔ مطلب یہ کہ میری ولولہ انگیز شاعری سے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی شوکت رفتہ دوبارہ حاصل کرلیں ۔

بیا ساقی بگر داں جامِ مے را زے سوز ندہ تر کن سوزنے را
دگر آں دل بنہ در سینہء من کہ پیچم پنجہء کاؤس و کے را! (۲)

میں ہتھلی پر دل لیے پھرتا ہوں ، کوئی دلبر نہیں ۔ سامان رکھتا ہوں کوئی لوٹنے والا نہیں ۔ میرے سینے کو اپنا گھر بنا لیجیے ۔ آج مجھ سے زیادہ تنہا مسلمان اور کوئی نہیں ۔

دلے برکف نہادم ، دلبرے نیست متاعے داشتم ، غارتگرے نیست
درون سینہء من منزلے گیر مسلمانے زمن تنہا ترے نیست! (۳)

ایسی ہی صورت حال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اقبال بڑی دل گرفتگی سے کہتے ہیں کہ جب میں نے اس دنیا سے رخت سفر باندھا تو سب نے کہا !یہ ہمارا جاننے والا تھا مگر کوئی نہیں سمجھا کہ اس مسافر نے کیا کہا ، کس سے کہا اور یہ کہاں سے تھا ؟

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند باما آشنا بود!
ولیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت و باکہ گفت واز کجا بود! (۴)

اس امت کی زبوں حالی پر ااقبال تن تنہا اس قدر روئے کہ سوائے انسانوں کے حسن فطرت نے ، ان کی چمن میں بکھری پڑی داستان سمیٹ لی ، جس کے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے اور کچھ گل نے اٹھالئے ۔ اور پھر پرندوں میں اڑائی طوطیوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے ، چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں ان کی ۔ مگر جن کے لیے اقبال نے اپنے دل

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۱۸۰۔ (۲) ارمغان حجاز ۔ ۵۳۔ (۳) ارمغان حجاز ۔ ۵۶۔ (۴) ایضاً ۔ ۱۳۹۔

کے زخم عیاں کر کے چھوڑے ان پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ تو دلِ گرفتہ لے کر اس جہاں سرا سے کوچ کر گئے۔

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہء زمانہ ہوا جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا

قیود شام و سحر میں بسر تو کی لیکن نظامِ کہنہء عالم سے آشنا نہ ہوا

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو

حضور آیہ رحمت میں لے گئے مجھکو

کہا حضورؐ نے اے عندلیب باغ حجاز! کلی کلی ہے تری گرمی نوا سے گداز

ہمیشہ سرخوش جامِ ولا ہے دل تیرا فتادگی ہے تری غیرت سجودِ نیاز

اڑا جو پستیء دنیا سے تو سوے گردوں سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعت پرواز

نکل کے باغِ جہاں سے برنگ بو آیا

ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

(یہ اسی جہاد کا ذکر ہے جب ۱۹۱۲ء میں فاطمہ بنت عبداللہ بھی زخمیوں کو پانی پلاتے شہید ہوئی تھیں) (۱)

اقبال اپنے فن کو عطیہ خداوندی اور حضورؐ کی نظر کرم کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ کہ حضورؐ نے اپنی امت کی زبوں حالی دیکھ کر بطور خاص اس ''دیدہ ور'' کو بھیجا تا کہ جو ملت ''نورِ مطلق'' سے رشتہ توڑ کر اپنے قلب ونظر کا نور کھو چکی ہے، اسے دوبارہ دل و نگاہ عطا کردی جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں کس نے اسے کہا نا امید نہ ہو، دوست کی خوشبو آ رہی ہے۔ کس نے اسے دور بہار کی خوشخبری سنائی۔ جب اس کے دم سے پرانا سوز جاتا رہا، تو کس نے اس کے نیستاں پر نیا شرر پھنک کر آتش زیست دوبارہ

---

(۱) بانگِ درا۔ ۱۹۷۔ ''حضور رسالت مآبؐ میں''۔

بھڑکائی ۔ وہ یقیناً اقبال ہی ہے ۔

کہ گفت اوراکہ آید بوے یارے؟ کہ داد اورا امید نوبہارے ؟

چوں آں سوز کہن رفت از دم او کہ زد برنیستانِ او شرارے؟ (۱)

اقبال کہتے ہیں بلحاظ فن میری شاعری جیسی بھی ہے، لیکن فکر کے لحاظ سے اس میں ''عشق و جنوں'' ضرور پایا جاتا ہے ۔ تجھے چاہیے کہ خلوص نیت کے ساتھ ۔ اس پر عمل پیرا ہو ۔

دگر آئینِ تسلیم و رضا گیر طریقِ صدق و اخلاص و وفا گیر

مگو شعرم چنیں است و چناں نیست جنونِ زیرِ کے از من فراگیر (۲)

اقبال کو یقین ہے کہ ان کی شاعری اس قدر زور دار و حیات آفریں ہے کہ ضرور ایک نہ ایک دن ان کی حجازی لے رنگ لائے گی ۔ یہ اور بات کہ فی الحال میں ایسے غبار راہ کی مانند پریشان ہوں ، جسے ہوا اٹھائے پھرتی ہے ۔ البتہ وہ زمانہ مبارک و خوش نصیب ہوگا ، جب میرے اس غبار کے اندر سے کوئی شہ سوار نمودار ہوگا ۔ وہی میری شاعری کے حاصل کی حیثیت پائے گا ۔

پریشانم چوگرد رہ گزارے کہ بردوشِ ہوا گیرد قرارے

خوشابخت و خرم روزگارے کہ بیروں آید از من شہسوارے! (۳)

اور وہ پریشان حال قوم بھی خوش نصیب ہوتی ہے جس کے اندر سے کوئی پختہ کار لیڈر و دیدہ ور پیدا ہو ۔ خود اقبال کی وجہ سے ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ وہ ہم میں سے ہیں ۔ ایسے شخص کا ظاہر ہونا اسرار غیب کا ایک راز ہے ۔ کیوں کہ ہر غبار کے اندر سے شہسوار نمودار نہیں ہوتا ۔

خوش آں قومے پریشاں روزگارے کہ زاید از ضمیرش پختہ کارے

نمودش سرے از اسرار غیب است زہر گردے بروں ناید سوارے (۴)

اور ایسا شخص بھی خوش نصیب ہے جو گرد میں پنہاں سوار دیکھ لیتا ہے یا تار کے لرزنے ہی سے نغمے کا جوہر بھانپ جاتا ہے ۔ زندگی بہتی ہوئی ندی ہے اور ہمیشہ بہتی رہے گی ۔ یہ پرانی شراب تیز ہے اور تیز ہی رہے گی ۔ جو تھا اور نہیں ہونا

---

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۵۷۔ (۲) ایضاً ۔ ۸۶۔ (۳) ارمغانِ حجاز ۔ ۸۷۔ (۴) ایضاً ۔ ۸۷۔

چاہیے تھا وہ درمیان سے نکل جائے گا، اور جو ہونا چاہیے تھا اور نہیں ہوا وہ ضرور ہو کے رہے گا۔ مجھے اس تاریک رات میں صبح کی خوشخبری دی گئی ہے۔ شمع بجھا دی گئی ہے اور طلوع آفتاب کا نشان دکھایا گیا ہے۔

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند　　جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند
زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود　　ایں مے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود
آنچہ بود است و نباید زمیاں خواہد رفت　　آنچہ بایست و نبوداست ہماں خواہد بود　　(۱)

بڑے شاعر اور ''حسن کار'' ہمیشہ جدت پسند اور تازہ مضامین و خیالات کے حامل رہے ہیں۔ اقبال کی عظمت کا راز بھی نئے نئے خیالات اور تازہ بتازہ افکار کے اظہار میں ہے۔ ویسے تو جدت پسندی اور قدامت پسندی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ آج سے پانچ سو سال پہلے کا قدیم اپنے دور کا جدید ترین تھا۔ اور آج کا جدید آئندہ آنے والے زمانوں کے لیے قدیم ترین ہوجائے گا۔ لیکن اقبال جیسے عظیم ''صاحب نظر'' جسے ''خبر و نظر'' پر برابر دسترس حاصل ہے کے نزدیک، اصل وقت از گردش خورشید نیست، وقت جاوید است و خور جاوید نیست۔ وقت کا تعلق سورج کے ہونے نہ ہونے سے نہیں۔ وقت اس وقت بھی تھا جب آفتاب و مہتاب نہیں تھے اور اس وقت بھی ہوگا جب شمس و قمر ٹھنڈے اور بے جان ہو کر مرجائیں گے۔ وقت میں مہ و سال کی تقسیم ''تجزیاتی فلسفے'' کی کارستانی ہے۔ ورنہ اقبال کہتے ہیں حیات ایک کائنات ایک زمان ایک، دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم۔ بس اس لحاظ سے اقبال کے مطابق وہی جدید و نیا ہے جس میں اتنی قوت و زور ہو کہ وقت کے زنگ سے زنگ آلود ہو کر کبھی مٹ نہ سکے۔ اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب کوئی ''حسن پارہ'' اپنے وقت سے بعد کے زمانوں کی بھی مکمل و اکمل ترجمانی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے اقبال کا سارا کلام جدید ٹھہرتا ہے۔ اس لیے کہ کم از کم موت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اقبال ہمیشہ نت نئے مضامین و خیالات اختراع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان سے پہلے اگر کوئی بات کسی نے کہہ رکھی ہے تو اقبال اس سے بھی حیران کن حد تک نئے معانی نکال لیتے ہیں۔

مرا معنیء تازۂ مدعا ست　　اگر گفتہ را باز گویم رواست　　(۲)

اس لیے کہ غم فرہاد اور عشرت پرویز کی کہانی، ہر دور میں نئے انداز سے کہی جاتی ہے۔

بہرزمانہ بہ اسلوبِ تازہ می گویند　　حکایتِ غمِ فرہاد و عشرتِ پرویز　　(۳)

---

(۱) پیامِ مشرق۔۱۹۲۔　　(۲) پیامِ مشرق۔۱۱۲۔ ''قطرۂ آب''۔　　(۳) ایضاً۔۱۶۹۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال تازہ معنی کی خاطر ہر وقت جستجو میں رہتے ہیں۔ ان کے متعلق رومی کہتے ہیں یہ ایسا شخص ہے۔ جو جستجو میں آوارہ پھر رہا ہے۔ یہ گویا ایک ستارہ ہے، جس کی فطرت سیارے کی سی ہے۔ ہنر میں خامی کامیابی کی اولین دلیل اور سیڑھی ہوتی ہے۔ خامیاں ہی حسن کار کو پختہ کار بناتی ہیں۔ اقبال کا بھی یہی حال ہے۔ میں اس کی ناتمامی پر جان دیتا ہوں۔ اس نے اپنی صراحی کے لیے آسماں کو طاق بنایا ہے۔ اس کا فکر جبرئیل سے تصدیق چاہتا ہے۔ یعنی کہ اقبال کی شاعری الہامی ہے۔ اور یہ مہر و ماہ کے شکار کی خاطر عقاب کی طرح جھپٹتا ہے اور نو آسمانوں کے طواف میں سرگرم رہتا ہے۔ گویا اقبال سورج و چاند کی طرح نورانی و درخشاں مضامین پر کمند ڈالتا ہے۔ کلام اقبال بذات خود اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ واقعی ان کا تخیل بہشت سے پھول چنتا ہے۔ ان کا تخیل جب کوئی نیا مضمون پیدا کرتا ہے تو جدت پسندی کے باعث اقبال کا دل خوشی کے مارے پھول کی اس پتی کی طرح لرزنے لگتا ہے، جس پر شبنم کا قطرہ ٹپک پڑا ہو۔

خیالم کو گل از فردوس چیند   چو مضمون غریبے آفریند
دلم در سینہ می لرزد چو برگے   کہ بروے قطرۂ شبنم نشیند (۱)

اس کا ذہن بلند پرواز ہے اور تازہ و انوکھے خیالات کے شکار کی غرض سے نو آسمانوں میں محو پرواز رہتا ہے۔

مردے اندر جستجو آوارۂ   ثابتے با فطرت سیارۂ!
پختہ تر کارش زخامی ہاے او   من شہید ناتمامی ہاے او
شیشہء خود را بگردوں بستہ طاق   فکر ش از جبریل می خواہد صداق!
چوں عقاب افتد بصید ماہ و مہر   گرم روا ندر طواف نہُ سپہر (۲)

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے روائتی شاعری سے ہٹ کر اپنا پیغام دیا ہے۔ جس کی بنا پر چمن میں نوائے اقبال بالکل نئی اور اچھوتی ہے۔ خود انہیں بھی اس کا احساس ہے۔ اور کہتے ہیں کہ میرا جاننے والا بھی مجھے جانے بغیر چلا گیا۔ اس نے بھی میرے کلام کے میخانے سے اپنا پیمانہ پُر نہ کیا۔ دوسرے شاعروں سے اقبال کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ہمیں خسروانہ شان دیتے ہیں، ہمارے پاؤں کے نیچے قیصر و کسریٰ کا تخت بچھاتے ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ ان سے دلبری کی روایتی شاعری کے خواہاں ہیں۔ شاعری کے بارے میں وہ افلاطوں کے روائتی خیال سے ہٹ کر کہتے ہیں کہ شاعری دیوانگی نہیں، بلکہ میں نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ

---

(۱) پیام مشرق۔ ۷۳۔   (۲) جاوید نامہ۔ ۳۵

کمالِ دانائی ہے۔

آشنائے من زمن بیگانہ رفت از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہ خسروی او رادھم تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیث دلبری خواہد زمن رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن
تانہ پنداری سخن دیوانگیست در کمالِ ایں جنوں فرزانگیست (۱)

مطلب یہ کہ:

حدیثِ بادہ و جام آتی نہیں مجھ کو نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا (۲)
نغمہء عافیت از بربطِ من می طلبی؟ از کجا برکشم آں نغمہ کہ درتارش نیست (۳)

جب تک ''حسن کار'' تحقیق وجستجو سے کام نہ لے اس کی تخلیق اوج کمال حاصل نہیں کرسکتی۔ اقبال اسی نکتے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں میں نے سنا ہے کہ فارس میں ایک برگزیدہ شخص، جو ادافہم، رمز شناس اور نکتہ بیں تھا۔ اس نے مرنے سے پہلے عالم نزع میں بہت سختی دیکھی۔ اس لیے وہ ناراضگی اور شکوہ سے لبریز جان لے کر یہاں سے رخصت ہوگیا۔ بعد از مرگ اس نے داور حشر کی جناب میں دعویٰ دائر کردیا کہ عزرائیلؑ کی سختی سے میرا دل پاش پاش ہوگیا ہے۔ فرشتہء اجل کا ایک ہی کام ہے۔ لیکن وہ اس میں بھی کمال حاصل نہیں کرسکا۔ اس نے ابھی جان قبض کرنے کا کوئی جدید فن نہیں سیکھا۔ وہ روح تو قبض کرلیتا ہے مگر ابھی اس کام میں ناپختہ ہے۔ دنیا نئی ہوگئی ہے۔ مگر وہ ابھی وہی پرانا انداز اپنائے پھرتا ہے۔ اس حکایت سے واضح ہوجاتا ہے کہ اقبال کسی بھی فن میں کمال اور ''جدت لازوال'' کے کس قدر برتنے والے ہیں۔ تاکہ فن زمانے کی تیز رو کے ساتھ چل سکے۔

شنیدم کہ در پارس مرد گزیں ادافہم رمز آشنا، نکتہ بیں
بسے سختی از جانکنی دید و مرد برآشفت و جاں شکوہ لبریز مرد
بنالش درآمد بہ یزدان پاک کہ دارم دلے ازاجل چاک چاک
کمالے ندارد بایں یک فنی نداند فنِ تازہٴ جاں کنی

(۱) پیامِ مشرق ۔ ۱۷۔ (۲) بالِ جبریل ۔۳۲۔ غزل۔ (۳) پیامِ مشرق ۔ ۱۷۷۔

برد جان و ناپختہ درکار مرگ — جہاں نوشد و اُو ہماں کہنہ مرگ (۱)

اس کے بعد ندی کی مثال دیتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ پانی کی ندی مختلف مراحل اور رکاوٹوں سے گزرتی ہوئی۔ پتھروں کی سلوں اور پہاڑوں کے دلوں کو چیرتی، نگاہیں بدلتی، اچھلتی، پھسلتی اور پھسل کر سنبھلتی ہوئی نئی نئی گھاٹیوں اور وادیوں سے ہو کر بحر بیکراں میں گرنے کے بعد دریا بن جاتی ہے۔

بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار — در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت (۲)

اقبال ''ذوق جمال'' اور تازگیٔ فن جدت پسندی میں اس درجہ آگے جاتے ہیں کہ ''حسن مطلق'' کو بھی کوئی نیا انداز اور جہان تازہ تخلیق کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

طرح نوافگن کہ ماجدت پسند افتادہ ایم — ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی! (۳)

پرانے ہیں یہ ستارے، فلک بھی فرسودہ — جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز! (۴)

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب (۵)

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیر تقدیر — خواب میں دیکھتا ہے عالم نو کی تصویر!

اور جب بانگ اذاں کرتی ہے بیدار اسے — کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا کی تعمیر!

بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کف خاک — روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر! (۶)

ایسے اشعار ایک طرف بلحاظ فن اقبال کی جدت پسندی کے عکاس ہیں اور دوسری طرف ''ذوق جمال'' کے ضمن میں ''حسن مطلق'' سے ان کے راز و نیاز اور دلبرانہ چھیڑ چھاڑ کی زندہ مثال ہیں۔ اقبال دراصل انقلابی شاعر ہیں اور وہ انقلاب و تبدیلی ہی کو جدت سمجھتے ہیں۔ طرح نوافگن سے بھی ان کی مراد انقلاب ہی ہے۔ وہ اتنے بڑے انقلابی واقع ہوئے ہیں کہ نہ صرف حالات و واقعات، بلکہ نظام کائنات اور تخلیق کائنات میں بھی تبدیلی چاہتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ انقلاب جو آسمانوں کے ضمیر میں نہیں سماتا۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں اور کوئی نہیں جانتا کہ کیسے دیکھ رہا ہوں۔

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک — بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم (۷)

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں — محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی (۸)

(۱) پیام مشرق۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ (۲) ایضاً۔ ۱۳۰۔ (۳) پیام مشرق۔ ۱۵۵۔ (۴) بال جبریل۔ ۱۶۔

(۵) ایضاً۔ ۱۰۰۔ (۶) ضرب کلیم۔ ۱۳۰۔ ''عالم نو''۔ (۷) پیام مشرق۔ ۱۹۲۔ (۸) بانگ درا۔ ۱۹۵۔ شمع اور شاعر۔

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو آہ !اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو (۱)

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے (۲)

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں ، نہ تدبیریں جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں (۳)

اس طرح اقبال کی جدت پسندی میں انقلاب کی وہ گھن گرج اور قوت و زور دکھائی دیتا ہے کہ ہمارے ہاں اس سے قبل اور بعد میں بھی کوئی ایسی آواز سنائی نہیں دیتی ۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اقبال کا معجزہ ، تخلیق اور ضرب کلیمی بھی جدت طرازی کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس لیے یہ تینوں عناصر زبردست تبدیلی و انقلاب کے حامل ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے مطابق:

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا! (۴)

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں ادھر ڈوبے ، اُدھر نکلے ، اُدھر ڈوبے ، اِدھر نکلے! (۵)

گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا (۶)

بہ الفاظ دگر اقبال کے نزدیک ہنر وہی ہے جو ''ضرب کلیمی'' جیسے ،انقلابی معجزے کا حامل ہو۔ اس لیے کہ جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی ۔

آہ !وہ کافر بیچارہ کہ ہیں اس کے صنم عصر رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات!

تو ہے میت !یہ ہنر تیرے جنازے کا امام! نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات! (۷)

وہ ایسی جدت طرازی کے خواہاں ہیں کہ بس :

وقت آں است کہ آئین دگر تازہ کنیم لوح دل پاک بشوئیم وز سر تازہ کنیم (۸)

اقبال کی جدت آوری کا وہ عام مفہوم نہیں جس سے مراد آج کل کی بے راہ روی ، مادر پدر آزادگی ، نیم عریاں ہو کر اچھل کود کرنا ، شور و غوغا اور اپنی اقدار و اخلاقی روایات کی بے حرمتی ہے ۔ بلکہ وہ ہر اصلاحی اور ارتقائی تبدیلی کو جدت و انقلابی زمرے میں شمار کرتے ہیں ۔

مجو اے لالہ از کس غمگساری چو من خواہ از درونِ خویش یاری

(۱) بانگ درا ۔ ۲۶۲۔ (۲) بانگ درا ۔ ۲۶۳۔ (۳) ایضاً ۔ ۲۷۱۔ (۴) ضرب کلیم ۔ ۱۱۹۔

(۵) بانگ درا ۔ ۲۷۳۔ (۶) ایضاً ۔ ۲۷۴۔ (۷) ضرب کلیم ۔ ۱۱۷ (۸) پیام مشرق ۔ ۱۹۱۔

ببر یادے کہ آید سینہ بکشاے نگہ دار آں کہن داغے کہ داری (۱)

اقبال کے ہاں کسی منفی تبدیلی یا اپنے مقام سے گراوٹ کا نام جدت نہیں ، بلکہ ان کا نظام فکر ہر مثبت تبدیلی اور اپنے مقام سے بلند پروازی کو جدّت کا نام دیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال آنسو ہوکر موتی ، موتی سے ستارہ ، ستارے سے مہتاب اور مہتاب کے بیچ سے آفتاب حاصل کرتے ہیں ۔ اور آفتاب سے اولیٰ اگر کوئی چیز ہے تو اس کی جستجو میں بھی سرگرم عمل رہتے ہیں ۔ اسی مثبت تبدیلی اور جدت کے باعث ہمیشہ رجائیت کا پیغام دیتے ہیں ۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی
عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی! (۲)
اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا! (۳)
خدائے لم یزل کا دست قدرت تو ، زباں تو ہے یقین پیدا کراے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جس کی گرد راہ ہوں ، وہ کارواں تو ہے (۴)

اقبال کہتے ہیں جدت طرازی کا سرچشمہ قرآن پاک ہے اس لیے کہ اس کی آیات میں کئی تازہ جہاں موجود ہیں ۔ اس کے زمان میں بہت سے ادوار مضمر ہیں ۔ عصر حاضر کے لیے قرآن پاک سے لیا گیا ایک جہاں کافی ہے ۔ اگر تیرے سینے میں معنی رس دل ہے تو وہ جہاں لے لے ۔ بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ایک آیت ہے ۔ اس کی قامت پر ہر جہاں قبا کی طرح سج جاتا ہے ۔ جب اس کے ایک جہاں کی قبا پرانی ہوجاتی ہے تو قرآن پاک اسے نیا جہاں عطا کردیتا ہے ۔

صد جہانِ تازہ در آیات اوست عصر ہا پیچیدہ در آنات اوست
یک جہانش عصر حاضر را بس است گیر اگردر سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست ہر جہاں اندر براوچوں قبا ست!
چوں کہن گردد جہانے در برش می دہد قرآں جہانے دیگرش (۵)

اور پھر:

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۱۴۰ ۔ (۲) بانگ درا ۔ ۲۶۷ ۔ طلوع اسلام (۳) ایضاً ۔ ۲۶۸ ۔
(۴) بانگ درا ۔ ۲۶۹ ۔ طلوع اسلام ۔ (۵) جاوید نامہ ۔ ۶۶ ۔

گفتند جہان ما آیا بتومی سازد؟ گفتم کہ نمی سازد ! گفتند کہ برہم زن! (۱)

اقبال کہتے ہیں کہ ذرّے سے آفتاب بنو، مایوسی کو امید میں تبدیل کرو یہی جدّت آفرینی ہے۔ اس جدت و تبدیلی کے تحت اقبال مشہور زمانہ قنوطی فلسفی ''شوپن ہار'' سے بھی کہتے ہیں:

درماں زدرد ساز اگر خستہ تن شوی خوگر بہ خار شوکہ سرا پا چمن شوی (۲)

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے! (۳)

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا! (۴)

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی (۵)

حتیٰ کہ تبدیلی در تبدیلی انقلاب در انقلاب بن جاتی ہے ۔ اور اقبال موت کو بھی موت نہیں ، بلکہ ایک جدت اور مثبت تبدیلی ہی سمجھتے ہیں ۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی روح امم کی حیات کشمکش انقلاب (۶)

تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے، کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے، سے لے کر، پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ،موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ، جدت طرازی ، رجائیت اور عمدہ تبدیلی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اسی طرح:

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات عام یوں اس کو نہ کردیتا نظام کائنات
یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح مرقد انساں کی شب کا کیوں نہ ہوا نجام صبح (۷)

جیسے خوبصورت اشعار موت کو موت نہیں بلکہ ایک تبدیلی اور تبدیلی در تبدیلی ثابت کرتے ہوئے ایک انوکھی اور دلفریب جدت کی طرح ڈالتے ہیں ۔ جو اقبال ہی کی عظمت فن اور'' ذوق جمال'' کی ''حسن کاری'' کا حصہ ہے ۔ جو شاعر یا حسن کار مُردوں کی یخ بستہ رگوں میں بھی زندگی کا خون گرم دوڑا دے۔ اسے یہ دعویٰ کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ :

بصدائے درد مندے بنوائے دلپذیرے خم زندگی کشادم بجہانِ تشنہ میرے (۸)

(۱) جاوید نامہ ۔ ۱۶۷۔ (۲) پیام مشرق ۔ ۱۹۵۔ (۳) بانگ درا ۔ ۲۵۰۔ (۴) ضرب کلیم ۔ ۱۱۹۔

(۵) بانگ درا ۔ ۱۸۸۔ (۶) بال جبریل ۔ ۱۰۰۔ مسجد قرطبہ ۔ (۷) بانگ درا ۔ ۲۳۵۔ (۸) زبور عجم ۔ ۱۰۔

اقبال اپنی آزادہ روی اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر نت نئے معانی اور افکار کی اختراع میں بھی جدت طرازی کرتے ہیں ۔ دراصل تخلیق بذات خود ایک طرح کی جدت پسندی ہے ۔ خود فطرت ہی کو لے لیجیے کہ تازہ بتازہ تخلیقات اور نئی نئی صورتوں کی صورت میں جدت سے کام لیتی رہتی ہے ۔ یہی وہ جدت ہے کہ رنگ برنگ پھولوں کے علاوہ طرح طرح کے پھل اور میوے بھی پائے جاتے ہیں ۔ اقبال بھی ''حسن مطلق'' سے کہتے ہیں کہ آپ نے میرے حسن قلب پر شبنم کی مانند جو معانی نازل فرمائے ، میں نے ان کے فیض سے شعر و سخن کی نئی دنیا بسائی ہے ۔

ازاں معنی کہ چوں شبنم بجان من فروریزی جہانے تازہ پیدا کردہ ام عرض فغانے را (۱)

لیکن اقبال کو یہ گلہ بدستور ہے کہ میری جدت آفرینی کے باجود ، کوئی میری بات نہیں سمجھتا ۔ جلوہ خوں ہو چکا ہے مگر اسے دیکھنے کے لیے ایک نگاہ بھی نہیں پہنچی ۔

سخن تازہ زدم کس بہ سخن وا نرسید جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نرسید (۲)

''حسن مطلق'' ڈرامائی انداز میں اقبال سے کہتے ہیں کہ : اقبال اگر تو زندہ ہے تو تخلیق کاری و حسن کاری کا تمنائی بن اور ہماری طرح آفاق کو اپنے قبضے میں لے لے ۔ جو نقش تجھے ساز گار نہیں لگتا اُسے توڑ دے اور اپنے ضمیر کے اندر سے نیا عالم پیدا کر ۔ دوسروں کے جہان میں زندگی بسر کرنا بندہ آزاد پر گراں گزرتا ہے ۔ جس کے اندر قوت تخلیق نہیں ، ہماری نظر میں وہ کافر و زندیق ہے ۔ اس لیے کہ وہ اگر آزاد ہے تو اپنی آزادی برقرار نہیں رکھ سکتا اور اگر غلام ہے تو اس میں آزادی حاصل کرنے کے لیے تبدیلی و انقلاب کا یارا نہیں ہو سکتا ۔ تخلیق یا خلاق نام ہی آزادہ روی اور جدّت طرازی کا ہے ۔

زندۂ؟ مشتاق شو ، خلاق شو ہمچو ما ، گیرندۂ آفاق شو!
در شکن آنرا کہ ناید سازگار از ضمیرِ خود دگر عالم بیار!
بندۂ آزاد را آید گراں زیستن اندر جہانِ دیگراں
ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیش ما جز کافر و زندیق نیست! (۳)

اقبال کو اپنی نو اختراعی پر اس قدر یقین واثق ہے کہ وہ بڑے وثوق سے کہتے ہیں ، اگر تو میرے میکدہ افکار سے ایک

(۱) زبور عجم ۔ ۵۴ ۔ (۲) زبور عجم ۔ ۹۰ (۳) جاوید نامہ ۔ ۱۹۱ ۔

جام لے لے تو اپنی مشت خاک سے نیا جہاں پیدا کرسکتا ہے۔

اگر زمیکدۂ من پیالہء گیری   زمشت خاک جہانے

اقبال کہتے ہیں کہ اینٹ او رپتھر سے نئی دنیائیں تخلیق نہیں کی جاسکتیں بلکہ نئے سے معرض وجود میں آتے ہیں۔

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود   کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا! (۲)

تخلیق اور جدت دونوں باہم اس طرح منسلک ہیں کہ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے بغیر خطرہ میں ہے۔تخلیق کے بغیر جدت نہیں اور جدت کے بغیر تخلیقی عمل ناپید ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ خودی کے عزم و ہمت کو بروئے کار لانے سے ایسی جدت طرازی معرض وجود میں لائی جاسکتی ہے کہ اس چھوٹی سی ندی کو بحر بیکراں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ گردش دوراں پہ غالب آنے کا انقلابی طریقہ یہی ہے کہ انسان اپنے ہر سانس کو عمر جاوداں میں تبدیل کردے۔لیکن ایسا اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب خودی زندہ و بیدار ہو۔مشرق کا المیہ یہ ہے کہ خودی کے مرجانے کے باعث کوئی خدا کا راز داں یعنی تخلیق کار، جدت پسند یا انقلاب انگیز شخص پیدا نہیں ہوا۔

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے   اس آبجو سے کئے بحر بیکراں پیدا!

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے   جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا!

خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں   ہوا نہ کوئی خدائی کا راز داں پیدا! (۳)

اقبال کی طرح اہل نیاز میں شامل ہوجائیں۔اس لیے کہ اہل نیاز کے سینوں سے جو نالے اٹھتے ہیں۔وہ ضمیر کائنات کے اندر نئے دور کی بنیاد رکھتے ہیں۔

طرح نوافگند اندر ضمیر کائنات   نالہ ہا کزسینہء اہل ناز آید بروں! (۴)

اقبال جدت کے اپنے مخصوص مفہوم میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔تو یہ کہہ دینے میں کوئی باک نہیں رکھتے کہ میرے بعد لوگ میرے شعر پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔اور کہتے ہیں :ایک مرد خود آگاہ نے جہاں کو بالکل بدل ڈالا۔

پس از من شعر من خوانند و دریابند ومیگویند   جہانے را دگرگوں کر دیک مرد خود آگاہے! (۵)

(۱) زبور عجم۔۶۴۔ (۲) ضرب کلیم۔۱۰۰۔"تخلیق"۔ (۳) ضرب کلیم۔۱۰۱۔تخلیق۔ (۴) زبور عجم۔۷۳۔ (۵) ایضاً۔۱۰۰۔

اقبال کی جدت طرازی کا یکتائے زمانہ انداز یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کے سوز و گداز سے، الماس کے ٹکڑے کو قطرۂ شبنم بنا کر ٹپکا دیتے ہیں۔ گویا کہ ایسی تبدیلی اور انقلاب برپا کر سکتے ہیں کہ الماس جیسے سخت پتھر کو شبنم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

سوز نوایم نگر! ریزۂ الماس را قطرۂ شبنم کنم، خوے چکیدن دہم! (۱)

جب ہم جدت اور تازہ کاری کے حوالے سے کلام اقبال کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس ضمن میں ہمیں عجیب و غریب نکات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ ان کی جدت ادا میں معجزانہ شان و ایمان پایا جاتا ہے۔

دانہء خرمن نما ہے شاعر معجز بیاں ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں (۲)

اس لیے کہ ان کے سانس کو باد بہاراں کی صفت عطا ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے اقبال کے آنسو گھاس کو چنبلی بنا دیتے ہیں۔ نازک خیالی کی انتہا یہ ہے کہ حیوانات ہوں یا نباتات انہیں پھلنے پھولنے کے لیے آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال نے گھاس کو چنبلی بنانے میں اپنی سانس سے باد بہار اور اپنے آنسوؤں کا پانی فراہم کیا ہے۔ اقبال چونکہ حرکت و عمل کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک آدم خاکی کی شان نت نئے کاموں سے ہے۔ اس کے برعکس مہ و ستارہ وہی کرتے ہیں جو پہلے سے کرتے آرہے ہیں۔

دمِ مرا صفت باد فرو دیں کردند گیاہ را از سر شکم چو یاسمیں کردند
فروغ آدم خاکی ز تازہ کاری است مہ و ستارہ کند آنچہ پیش ازیں کردند (۳)

اقبال اپنی نظم "اجتہاد" میں بتاتے ہیں کہ، "محکومی"، "تقلید"، اور "زوال تحقیق" کے سبب انسان میں جدت فکر یا اجتہاد فکر و نظر کی جراءت ناپید ہوجاتی ہے۔ ان تینوں چیزوں سے علم و فن کا قلع قمع ہوجاتا ہے۔ اس لیے ان کی موجودگی میں انسان حکمت و حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق!
حلقہ شوق میں وہ جراءت اندیشہ کہاں آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق!

یہ نام نہاد فقیہان حرم، مجتہد نہیں بلکہ انگریز حاکموں کے پٹھو ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ انگریز کی مرضی کے مطابق

(۱) زبور عجم۔ ۱۲۳۔ (۲) بانگ درا۔ ۴۳۔ (۳) زبور عجم۔ ۱۳۶۔

کتاب اللہ کی تاویلات پیش کرتے ہیں ۔ اور سب کچھ غلامی کی بنا پر کرتے ہیں ۔ اپنی لالچی شخصیت کو تبدیل کرنے کی بجائے قرآن حکیم کے معنی بدل کر فتوے فروخت کرتے ہیں ۔

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں ۔۔۔ ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق!
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے، کتاب ۔۔۔ کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق! (۱)

اور نفسیات غلامی یہی ہے کہ:

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی، حکما بھی ۔۔۔ خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا ایک ۔۔۔ ہر ایک ہے گو شرح معانی میں یگانہ!
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھادیں رم آہو ۔۔۔ باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ!
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند ۔۔۔ تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ! (۲)

اور بلاشبہ آجکل ہمارے نام نہاد حکومتی کارندے یہی کچھ کر رہے ہیں ۔

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے ۔۔۔ دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں؟ ۔۔۔ مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر
تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں ۔۔۔ ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر!
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل ۔۔۔ کہتا ہے کون اُسے کہ مسلماں کی موت مر!
تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی ۔۔۔ دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے ۔۔۔ یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے ۔۔۔ مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگذر؟ (۳)

اقبال کہتے ہیں کہ ہر زوال پذیر قوم، جس کی بہار گزر چکی ہو، اجتہاد سے اجتناب کرتی ہے ۔ وہ انہی خوشبوؤں کو

(۱) ضرب کلیم ۔ ۴۳ ۔ اجتہاد (۲) ضرب کلیم ۔ ۱۴۰ ۔ ۱۴۱ ۔ نفسیات غلامی ۔ (۳) ضرب کلیم ۔ ۲۹ ۔

سینے سے لگائے رکھتی ہے جو ختم ہوچکی ہوں ۔ اس کی خاک سے گل لالہ تو اگتا ہے، مگر اس کی قبائے سرخ کا رنگ اڑا ہوا ہوتا ہے ۔ گویا کہ زوال سے بچنے کی خاطر اجتہاد ضروری ہے ۔

ہر آں قومے کہ می ریزد بہارش نسازد جز بہ بوہائے رمیدہ
زخاکش لالہ می روید و لیکن قبا ے دارد از رنگ پریدہ (۱)

روح اگر ہے تری رنج غلامی سے زار ترے ہنر کا جہاں دیر و طواف و سجود
اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو تیری سپہ انس و جن !تو ہے امیر جنود! (۲)

طرح نوافگن کا عملی ثبوت پیش کرتے ہوئے اقبال ہر لحظے جدت آفرینی و ندرت بینی میں مصروف عمل رہتے ہیں ۔ چنانچہ کیا ہی خوب کہتے ہیں کہ میں گدائے بے نیاز ہوں مجھے اپنے آپ پر ناز ہے ۔ تڑپنا، جلنا، گداز ہونا اور نے نوازی کرنا میرا کام ہے ۔ میں تجھے اپنے آتشیں نغموں کی بھٹی میں ڈال دیتا ہوں۔ پھر تجھے آئینے میں تبدیل کردیتا ہوں کیوں کہ میں سکندر فطرت ہوں ۔ جدت طرازی اور اجتہاد کی اس سے خوبصورت اور بڑی مثال نہیں ہوسکتی ۔ بے شک اگر کوئی اقبال کی آتشناک ''حسن کاری'' پر عمل پیرا ہو تو کیا سے کیا ہوجائے ۔

بخود نازم گدائے بے نیازم تپم ، سوزم ، گدازم ، نے نوازم
تراا نغمہ درآتش نشاندم سکندر فطرتم ، آئینہ سازم (۳)

علامہ اقبال کے نزدیک اجتہاد فکر و عمل انسانی زندگی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس لیے کے جدت و ندرت اور اجتہاد ہی کے ذریعے اقوام اضحلال و زوال سے محفوظ رہتی ہیں ۔ اسی کے طفیل قوموں میں کراری اور پلٹنے جھپٹنے کی خو برقرار رہتی ہے ۔ پلٹنے، جھپٹنے میں بھی ایک طرح کی جدت ہے ۔ اگر کوئی ایک دفعہ جھپٹے اور پھر نہ پلٹے یا پلٹے اور دوبارہ نہ جھپٹے تو وہ جدت و اجتہاد سے عاری ہوتا ہے ۔ پس ہر لمحے کی ندرت و جدت میں قوموں کے لیے ترقی و جوانی ہے ۔

ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوق انقلاب ندرت فکر و عمل کیا شے ہے ؟ ملت کا شباب
ندرت فکرو عمل سے معجزات زندگی ندرت فکر و عمل سے رنگ خارہ لعل ناب (۴)

جیسا کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ۔ تبدیلی و انقلاب زمانے کی اٹل خصوصیت ہے ۔ اقبال کہتے ہیں ذوق

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۶۸ ۔ (۲) ضرب کلیم ۔ ۱۱۲ ۔ (۳) پیام مشرق ۔ ۶۶ ۔ (۴) بال جبریل ۔ ۱۵۰ ۔ ۱۵۱

جدت کی وجہ سے کائنات کی ہر چیز مسلسل متغیر رہتی ہے ۔ لہٰذا فن کے حسن و ارتقا کے لیے بھی اجتہاد فکر و نظر نہایت ضروری ہے ۔

ایک صورت پہ نہیں رہتا کسی شے کو قرار ذوقِ جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار (۱)

اسی ذوق جدت کی بنا پر فطرت ہر لحظہ نئی شان نمو میں ارتقاء پذیر رہتی ہے ۔ خود ''حسن مطلق'' بھی کل یوم ھو فی الشان کے مصداق ہر لمحے نئی شان سے جلوہ گر رہتا ہے ۔ اور آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون ، کا مطلب ہی جدت و ندرت اور اجتہاد ہے ۔

دراصل اقبال کا حرکی نظریہ فن بذات خود اپنے اندر جدت و ندرت کا بے پناہ سیل رواں لیے ہوئے ہے ۔ جو جمود و تعطل کے خلاف طلاطم خیز ہے ۔ اس لیے کہ زندگی نام ہی جدت و ندرت کا ہے ۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں (۲)

اب تک ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ اقبال کی جدت طرازی اپنے اندر بڑی وسعت و گیرائی لیے ہوئے ہے ۔ علوم و فنون سے لے کر قوموں کی آزادی اور آزادہ روی بھی ، اقبال کے ہاں جدت پسندی کے معنوں میں آتی ہے ۔ فن ہو یا تہذیب و تمدن اقبال ہر میدان میں خود مختار و آزادی کو جدت کہتے ہیں ۔ اسی لیے غلامی سے آزادی حاصل کرنا بھی ان کے نزدیک جدت طرازی ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ آزادی بھی ایک تبدیلی و انقلاب ہے ۔ یہیں سے یہ نکتہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال تقلید کے بھی خلاف ہیں ۔ اور کسی بھی شعبہ زندگی میں ، کسی کی تقلید نہ کرنے کا پیغام دیتے ہیں ۔ لہٰذا تقلید نہ کرنا بھی اقبال کے نزدیک جدت ہے ۔ غیر کا مقلد بن کے تعمیر و ترقی کے درجات طے نہیں کئے جاسکتے ۔ خاص کر اُس دور غلامی میں اقبال ایسے خوبصورت انداز میں تقلید کی ممانعت کرتے ہیں کہ ان کی بات دل میں اتر جاتی ہے : ۔ دنیا میں اپنے بال و پر کھولنا سیکھ ، دوسروں کے بال و پر سے اڑا نہیں جاسکتا۔

در جہاں بال و پر خویش کشودن آموز کہ پریدن نتواں باپر و بال دگراں (۳)

اگر تو اپنی صلاحیتوں سے آگاہی رکھتا ہے تو اپنی شبنم کو سمندر میں تبدیل کر ۔ اے دل ! مہتاب کی گداگری کب تک ! اپنی رات کو اپنی آہ سے روشن کر ۔

(۱) بانگِ درا ۔ ۱۵۱۔ (۲) بالِ جبریل ۔ ۴۷۔ (۳) پیامِ مشرق ۔ ۱۷۴۔

اگر آگاہی از کیف و کم خویش ‏ بیے تعمیر کن از شبنم خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے! ‏ شب خود را برافروز از دم خویش (۱)

پھر کہتے ہیں کیا اچھا ہوتا اگر نیک خو مرد گزرے ہوئے لوگوں کے بندھنوں سے آزاد رہ کر زندگی بسر کرتا ۔ اگر تقلید اچھی بات ہوتی ۔ تو ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی آباؤاجداد کا راستہ اختیار کرتے ۔

چہ خوش بودے اگر مردنکوپے ‏ زبند پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب ‏ پیغمبرؐ ہم رہ اجداد رفتے (۲)

کر بلبل و طاوس کی تقلید سے توبہ ‏ بلبل فقط آواز ہے ، طاوس فقط رنگ! (۳)

اقبال خود انحصاری و خود داری کا ایسا سبق دیتے ہیں جس میں دوسروں کی تقلید و پیروی سے باز رہنے کی تاکید کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔ اپنے سینے سے نعرۂ تکبیر بلند کر اور اپنی اس اکسیر کو خاک پر ڈال ۔ خودی کو مضبوطی سے پکڑ اور خوش رہ ۔ اپنی تقدیر کسی اور کے ہاتھ میں نہ دے ۔ گویا کہ دوسروں کی تقلید کرنا اپنی تقدیر دوسروں کے ہاتھ میں دینے کے مترادف ہے ۔

بروں از سینہ کش تکبیر خود را ‏ بخاک خویش زن اکسیر خود را
خودی را گیر و محکم گیر و خوش زی ‏ مدہ دردستِ کس تقدیر خود را (۴)

اقبال کے نزدیک ''انا الحق'' کہنا اسی قوم کو زیب دیتا ہے ۔ جو اتنی مضبوط و راہ راست پر ہو کہ اسے کسی کی تقلید نہ کرنی پڑے ۔ جس کا خون ہر نہال باغ کی ہر شاخ کی آبیاری کرتا ہو ۔ جس کے جلال میں جمال نہاں ہو ۔ کیوں کہ نو آسماں اسی کی جولانیوں کے آئینہ دار ہیں ۔

بہ آں ملت اناالحق ساز گاراست ‏ کہ از خونش نم ہر شاخساراست
نہاں اندر جلالے او جمالے ‏ کہ او را نہٗ سپہر آئینہ داراست (۵)

ایسی امت ، امتوں میں بلند مرتبت ہے ۔ کیونکہ وہ دونوں جہانوں کی سردار ہے ۔ وہ ہر دم نئی تخلیق اور اجتہاد میں مصروف رہتی ہے ۔ نیند اور تکان اس پر حرام ہے ۔ اس امت کا وجود اپنے سوز دروں کے طفیل شعلے کی مانند ہے ۔ اس کی ہمت سے اناالحق کی وضاحت ہوتی ہے ۔ وہ جب کن کہتی ہے تو یکون اس کا ساتھ دیتا ہے ۔

(۱) پیام مشرق ۔ ۶۲ ۔ (۲) پیام مشرق ۔ ۲۲۲ ۔ (۳) بال جبریل ۔ ۷۶ ۔ (۴) ارمغان حجاز ۔ ۶۶ ۔ (۵) ایضاً ۔ ۷۰ ۔

وجود ش شعلہء از سوز درون است   چوخس اورا جہانِ چند و چون است
کند شرح اناالحق ہمت او   پئے ہر کن کہ می گوید یکون است (۱)

کسی کا مقلد نہ ہونے کے باعث، وہ امت فضا کی وسعتوں میں یگانہ پرواز کرتی ہے، ان میں کھو نہیں جاتی ۔ اس کی نگاہ اپنے آشیانے کی شاخ پر رہتی ہے۔ وہ مہ و انجم کو اپنی کمند کا اسیر بناتی ہے ۔ زمانے کی تقدیر اس کے ہاتھ میں ہے ۔

پرد در وسعت گردوں یگانہ   نگاہ او بہ شاخ آشیانہ
مہ و انجم گرفتار کمندش   بدست اوست تقدیر زمانہ (۲)

چنانچہ اقبال ہمیشہ اپنی نظر سے دیکھنا پسند کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک خود انحصاری بھی جدت ہی ہے ۔ اس لیے کہ خود انحصاری انسانوں اور قوموں کو تقلید سے دور رکھتے ہوئے، خود مختاری عطا کرتی ہے ۔ اسی بنا پر اقبال اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا کرتے ہیں کہ اے رب ! مجھے دل باخبر عطا فرما! مجھے ایسی نظر دے کہ شراب میں نشہ دیکھ لوں۔ تیرا یہ بندہ جس نے کسی سے زندگی لینا قبول نہیں کیا، اسے سحر کی مانند آہ خانہ زاد عطا کر ۔

یا رب درون سینہ دلِ باخبر بدہ   درباده نشۂ رانگرم ، آں نظر بدہ
ایں بندہ را کہ بانفسِ دیگراں نزیست   یک آہِ خانہ زاد مثال سحر بدہ (۳)

اقبال دوسروں کے افکار و خیال کی کورانہ تقلید سے بھی دور رہنے کی تاکید کرتے ہیں ۔ اس لیے کہ اس طرح جدت کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں ۔ اور انسان ذہنی غلام بن کر رہ جاتا ہے ۔

بدہ آں دل کہ مستی ہائے او از بادہ خویش است   بگیر آں دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است (۴)

کسے کوفاش دید اسرار جاں را   نہ بیند جز بچشم خود جہاں را
نوائے آفریں در سینہ خویش   بہارے میتواں کردن خزاں را (۵)

مطلب یہی کہ اقبال دوسروں کا مقلد بننے سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ اس لیے کہ:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی   رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے (۶)
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن   ہر زماں جانم بلرزد در بدن (۷)

(۱) ارمغانِ حجاز ۔ ۷۱۔ (۲) ارمغانِ حجاز ۔ ۷۱۔ (۳) زبور عجم ۔ ۳۔ (۴) ایضاً ۔ ۴۴۔
(۵) ارمغان حجاز ۔ ۸۴۔ (۶) بانگِ درا ۔ ۱۰۷۔ (۷) جاوید نامہ ۔ ۸۲۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے　　افلاک منور ہوں ترے نور سحر سے! (۱)

در جوے روان ما ، بے منتِ طوفانے　　یکہ موج اگر خیزد آں موج ، زجیحوں بہ (۲)

اقبال کہتے ہیں اپنے افکار اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی آزادی اپنی سوچ اور خود انحصاری کا نتیجہ ہے۔ تقلید سے ذہن غلام ہو کر زنگ آلود ہوجاتا ہے۔جس سے اس کی روشنی اور نور تاریکی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ یوں تخلیقات و ایجادات کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور خودی بھی ناکارہ ہوجاتی ہے۔مقلد کی کوئی قدر نہیں ہوتی جبکہ:

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد　　ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ!

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو　　کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ (۳)

لہٰذا:

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں　　غلام طغرل و سنجر نہیں میں

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن　　کسی جمشید کا ساغر نہیں میں (۴)

گویا کہ:

کامل وہی ہے رندی کے فن میں　　مستی ہے جس کی بے منت تاک! (۵)

اقبال کی جدت آفرینی قوم کے جسم میں ایسی آنکھ، یعنی ایسے شاعر کی متمنی ہے جو قوم کی غلامی کے دکھ درد میں آنسو بہاتے ہوئے اسے آزادی حاصل کرنے کی تلقین کرے۔ بذات خود اقبال نے ایسی ہی ''حسن کاری'' سے کام لیتے ہوئے، ثابت کردکھایا ہے کہ غلاموں اور غلاموں کی سرزمین پرنحوست برستی ہے۔ جیسا کہ آج کل ہم پاکستانیوں کا بھی یہی حال ہے۔ غلاموں اور ان کی سرزمین پر مہتاب و آفتاب کو بھی چمکتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ زبورعجم کی نظم ''بندگی نامہ'' میں چاند کہتا ہے، میں نے آفتاب سے چمکنا سیکھا اور اس مردہ جہاں کو اپنی چاندنی سے چمکادیا۔ یہ خاکدان روشن تو ہے مگر اس میں آسودگی نہیں۔ کیونکہ اس کا چہرہ غلامی سے داغدار ہے۔ یہاں ہر شخص کے گلے میں مچھلی کی مانند کانٹا پھنسا ہوا ہے۔ یہاں کے لوگ خدا کو بھول چکے ہیں اور آدمیوں کی پرستش کرتے ہیں۔آپ نے مجھے آب و گل کا اسیر کر کے اس زمیں کے طواف سے شرمسار کیا ہے۔ یہ جہاں روح کے نور سے آگاہ نہیں اس لیے سورج اور چاند کی شان کے شایاں نہیں۔ اسے

(۱) ضرب کلیم۔۱۲۲۔ (۲) زبورعجم۔۲۳۔ (۳) ضرب کلیم۔۱۶۸۔ (۴) بال جبریل۔۸۶۔ (۵) ضرب کلیم۔۱۱۳۔

نیلگوں فضا میں دھکیل دیں اور ہم نوریوں کا رشتہ اس سے منقطع کردیں۔ یا مجھے اس کی خدمت سے فارغ کردیں اور یا اس جہاں کی خاک سے نیا آدم پیدا کریں۔ جو انسانوں کی غلامی نہ کرے۔ میری بیدار آنکھ اندھی اور بے نور ہی بہتر ہے۔ اس خاکدان کو میری روشنی کے بغیر ہی رہنے دیں۔ غلامی میں بدن کے اندر دل مرجاتا ہے۔ غلامی میں روح بدن کے لیے بوجھ بن جاتی ہے۔ غلامی جوان کو بوڑھوں کی مانند کمزور کردیتی ہے۔ غلامی میں جنگل کے شیر کے دانت جھڑ جاتے ہیں۔ البتہ جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں۔

تا فتن از آفتاب آموختم   خاکدان مردهٔ افروختم
خاکدانے با فروغ و بے فراغ   چہرهٔ او از غلامی داغ داغ
آدم او صورت ماہی بہ شست   آدمے یزداں کشے آدم پرست
تا اسیر آب و گل کردی مرا   از طواف او خجل کردی مرا
ایں جہاں از نور جاں آگاہ نیست   ایں جہاں شایانِ مہر و ماہ نیست
در فضائے نیلگوں اورا بہل   رشتۂ ما نوریاں ازوے گسل
یامرا از خدمت او واگذار   یا زخاکش آدم دیگر بیار

چشم بیدارم کبود و کور بہ
اے خدا ایں خاکدان بے نور بہ

از غلامی دل بمیرد در بدن   از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی ضعفِ پیری در شباب   از غلامی شیرِ غاب افگندہ ناب (۱)

غلامی میں ملت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ سے لڑتا رہتا ہے۔ ایک سجدے میں ہوتا ہے دوسرا قیام میں۔ یعنی ناچاقی و عدم اتحاد کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ایسی غلام ملت کا کام ایسے ہوتا ہے جیسے امام کے بغیر نماز۔ ہر شخص دوسرے سے الجھتا ہے۔ ہر شخص نئی راگنی الاپتا ہے۔ غلامی میں اللہ تعالیٰ کا بندہ بھی بت پرستی کا زنار پہن لیتا ہے۔ غلام کی قیمتی متاع کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ اس کے درخت کی شاخ خزاں کے بغیر ہی عریاں ہوتی ہے اور اسے ہر دم موت کا

(۱) زبور عجم۔ ۱۷۹۔۱۸۰۔

خوف لگا رہتا ہے۔ غلام اتنا کور ذوق ہوجاتا ہے کہ زہر کو شہد سمجھتا ہے۔ بغیر موت کے مرجاتا ہے اور اپنی نعش اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا ہے۔ وہ زندگی کی آبرو گنوا بیٹھتا ہے اور گدھوں کی طرح گھاس اور جو پر مطمئن ہوجاتا ہے۔ اس کا ممکن اور محال دیکھ، اس کی حرکت اور زمانہ ملاحظہ کر۔ اس کے دن ایک دوسرے کے ماتم میں ہیں۔ اور اس کے دنوں کی رفتار ریگ ساعت سے بھی سست ہے۔

از غلامی بزم ملت فرد فرد — این و آں با این و آں اندر نبرد
آں یکے اندر سجود ایں در قیام — کاروبارش چوں صلوٰۃ بے امام
در فتد ہر فرد با فردے دگر — ہر زماں ہر فرد را دردے دگر
از غلامی مرد حق زنار بند — از غلامی گوہرش نا ارجمند
شاخ او بے مہرگاں عریاں ز برگ — نیست اندر جان او جز بیم مرگ
کور ذوق و نیش را دانستہ نوش — مردۂ بے مرگ و نعش خود بدوش
آبروے زندگی درباختہ — چوں خراں با کاہ و جو در ساختہ
ممکنش بنگر محالِ او نگر — رفت و بودِ ماہ و سالِ او نگر

روز ہا در ماتمِ یک دیگر اند
در خرام از ریگِ ساعت کمتر اند (۱)

شور زمین جو بچھو کے ڈنک سے خارخار ہوچکی ہو، جس کی چیونٹی اژدھا کو کاٹتی اور بچھو کا شکار کرتی ہو۔ جس کی باد صرصر میں آتشِ دوزخ کی گرمی ہو۔ جو ابلیس کی کشتی کے لیے باد موافق ہو۔ جس کی ہوا آگ برساتی ہو اور اس کے اندر شعلے بھڑکتے ہوں۔ جس کی آگ اٹھتے ہوئے دھوئیں میں اور تلخی پیدا کر رہی ہو۔ جس کی آگ میں بجلی کی کڑک اور دریا کا جوش وخروش ہو۔ جس کے کنارے پر زہریلے پھنوں والے سانپ آپس میں لڑ رہے ہوں۔ جس کا شعلہ ہولناک، زندہ سوز، اوپر سے بلند اور کاٹنے والے کتے کی طرح لپٹ جانے والا ہو۔ ایسے دشت بلا میں کئی صدیاں گزارنا۔ غلامی کی ایک گھڑی سے بہتر سمجھ۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ غلامی کی ایک گھڑی سے دوزخ کی دائمی زندگی بہتر ہے۔ دوزخ میں رہنا

(۱) زبورِ عجم۔ ۱۸۰۔۱۸۱۔

قبول ہے مگر غلام رہنا قبول نہیں۔

شور یوم از نیشِ کژدم خار خار | مورِ او اژدر گز و عقرب شکار
صرصر او آتشِ دوزخ نژاد | زورقِ ابلیس را باد مراد
آتشے اندر ہوا غلطیدۂ | شعلۂ در شعلۂ پیچیدۂ
آتشے از دودِ پیچاں تلخ پوش | آتشے تندر غود دریا خروش
درکنارش مارہا اندر ستیز | مارہا باکچہ ہائے زہر ریز
شعلۂ اش گیرندہ چوں کلب عقور | ہولناک و زندہ سوز و مردہ نور

در چنیں دشت بلا صدروزگار
خوشتراز محکومئی یک دم شمار (۱)

اسی لیے تو دوزخی کہتا ہے کہ:

اللہ ترا شکر کہ یہ خطۂ پرسوز | سوداگر یورپ کی غلامی سے ہے آزاد (۲)

ہمارے حکمرانوں کے رویے سے ثابت ہو چکا ہے کہ غلام زندگی سے اس قدر خوفزدہ رہتا ہے۔ کہ دوبارہ زندہ ہونا بھی نہیں چاہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ موت کتنی ہی سنگدل ہو لیکن، زندگی سے تو مہرباں ہوگی۔ اس لیے:

ہو روح پھر اک بار سوار بدن زار! | ایسی ہے قیامت تو خریدار نہیں میں

لیکن اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ گھبرانے کی بات نہیں، مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کے نصیب میں ہے۔ جبکہ غلاموں کے لیے تو:

نے نصیب مار و کژدم نے نصیب دام و دد | ہے فقط محکوم قوموں کے لیے مرگ ابد!
بانگ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں | روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام | گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوش لحد

غلام مردے سے قبر بھی پناہ مانگتی ہے:

(۱) زبور عجم ۱۸۱۔ بندگی نامہ۔ (۲) ارمغان حجاز۔ ۲۳۔

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا؟ میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک!
الحذر محکوم کی میت سے سوبار الحذر اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جان پاک! (۱)

یہ تو ہمارے آباو اجداد کا حال ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے غلام تھے۔ ہم۔آئی۔ایم۔ایف کے غلاموں کا کیا انجام ہوگا؟ جبکہ۔آئی۔ایم۔ایف کی غلامی، ایسٹ انڈیا کمپنی سے کئی گناہ سخت گیر ہوتے ہوئے مضبوط زنجیر ہے۔

یہی نہیں بلکہ اقبال کہتے ہیں کہ غلاموں کی فن کاری و ''حسن کاری'' بھی ان کی مردنی کی ترجمانی کرتی ہے۔اس میں زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے۔وہ ہر طرح کی تازگی وتراوٹ سے محروم ہوتی ہے۔گویا کہ غلامی کے فنون لطیفہ میں کئی اموات پوشیدہ ہیں۔

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار!

غلاموں کی موسیقی سے متعلق اقبال کہتے ہیں کہ اس کا راگ زندگی کی آگ سے خالی ہے اور دیوار حیات کو سیلاب کی طرح گرا دیتا ہے۔غلام کی پیشانی اس کے دل کی طرح تاریک ہے۔اور اس کے راگ کی نوائیں اس کی فطرت کی طرح پست ہوتی ہیں۔اس کے دل افسردہ سے حرارت زندگی بجھ چکی ہوتی ہے۔نہ اسے اپنا مستقبل اچھا بنانے کا خیال ہوتا ہے اور نہ وہ اپنے حال سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اس کے نغمے سے اس کے اندر کا حال ظاہر ہوجاتا ہے۔اس کے ساز میں پورے شہر کی موت ہے اس کا راگ تجھے کمزور اور پست ہمت بنانے کے ساتھ ساتھ دنیا سے بیزار کرتا ہے۔مسلسل آنسو اس کی آنکھ کا سرمہ ہیں۔جہاں تک ہو سکے اس کی آواز پر توجہ نہ دے۔اس کا نغمہ، نغمہ موت ہے۔اس سے بچ۔اس کے راگ کے لباس میں سوائے فنا کے اور کچھ نہیں۔

مرگ ہا اندر فنون بندگی من چہ گویم از فسون بندگی
نغمۂ او خالی از نار حیات ہمچو سیل افتد بدیوار حیات
چوں دل او تیرہ سیمائے غلام پست چوں طبعش نوا ہائے غلام
از دل افسردۂ او سوز رفت ذوق فردا لذت امروز رفت

(۱) ارمغان حجاز۔۳۰۔۳۱۔

از نےء او آشکارا راز او! مرگ یک شہر است اندر سازاو
ناتوانِ و زاری سازد ترا از جہاں بیزاری سازد ترا
چشم او را اشک پیہم سرمہ ایست ناتوانی برنوائے او مایست
الحذر ایں نغمہء موت است و بس نیستی درکسوت صوت است و بس (۱)

تو اگر پیاسا ہے تو یہ حرم بغیر زمزم کے ہے۔اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں آدم کی موت ہے۔ یہ دل کو سوز سے خالی کر دیتا اور غمزدہ بنا دیتا ہے۔ یہ جام جم کے اندر زہر ڈال کر پیش کرتا ہے۔اے برادرمن! میرے شعلے، یعنی نغمے کو اپنی سمجھ کا چراغ بنا۔میری بات سن کہ غم کی دوقسمیں ہیں۔ایک وہ غم ہے جو انسان کو کھا جاتا ہے۔ اور ایک وہ غم ہے جو ہر غم کو کھا جاتا ہے۔ایک دوست غم ہے اور ایک دشمن غم۔ یہ دوسرا غم ہی ہمارا ساتھی ہے۔اس کی صحبت میں رہ کر انسان بے غم ہو جاتا ہے۔اس غم کے اندر مشرق ومغرب کے ہنگامے ہیں۔وہ ایسا سمندر ہے جس میں تمام کائنات گم ہے۔ جب یہ غم کسی دل میں اپنا نشیمن بنا لیتا ہے تو اسے بحر ناپیدا کنار بنا دیتا ہے۔ ہمارا دل اس لئے غموں سے دردمند ہے کہ اس کی اصل اس خاک پست یعنی دنیا سے ہے۔ میں اور تو اس غم شیریں سے بے خبر ہیں۔جس کی اصل افکار بلند سے ہے۔

ازاں غم با دلِ مادرد مند است کہ اصل او ازیں خاک نژنداست
من وتوزاں غمِ شیریں ندانیم کہ اصلِ او زافکارِ بلند است (۲)

چونکہ غلامی سرجاں سے ناآگہی ہے اس لئے غلامی کا نغمہ اس دوست غم سے خالی ہوتا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اس میں زیر و بم نہیں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس قسم کا راگ بیوہ عورت ہی کو زیب دیتا ہے۔یعنی اس کا زیر و بم۔

تشنہ کامی؟ ایں حرم بے زمزم است دربم وزیرش ہلاک آدم است
سوز دل از دل بردغم مید ہد زہر اندر ساغر جم مید ہد
غم دوقسم است اے برادر گوش کن شعلہء مارا چراغ ہوش کن
یک غم است آں غم کہ آدم را خورد آں غم دیگر کہ ہر غم را خورد
آں غم دیگر کہ مارا ہمدم است جان ما از صحبت او بے غم است

(۱) زبور عجم۔۱۸۳۔ دربیانِ فنونِ لطیفہء غلاماں، موسیقی۔ (۲) ارمغان حجاز۔۱۱۵۔

اندرو ہنگامہ ہائے غرب و شرق　　بحر و دروے جملہ موجودات غرق
چوں نشیمن می کند اندر دلے　　دل از گردد یم بے ساحلے
بندگی از سر جاں نا آگہی است　　زاں غم دیگر سرود او تہی است
من نمی گویم کہ آہنگش خطا است
بیوہ زن را ایں چنیں شیون رواست!　　(۱)

ایسا سرود فرد اور قوم پر جینا حرام کر دیتا ہے۔ اس لئے اقبال ایسی موسیقی کو" سرود حرام" ہی کے نام سے پکارتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرور　　نہ میرا فکر ہے پیمانہء ثواب و عذاب
خدا کرے کہ اسے اتفاق ہو مجھ سے　　فقیہہ شہر کہ ہے محرم حدیث وکتاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام　　حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب!　　(۲)

جس نغمے کو سن کر خون جوش نہ مارے وہ نغمہ اس تلخ حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ اس کے شاعر کا خون ٹھنڈا ہے۔ جس شاعر کا خون ہی منجمد ہو وہ اپنی نوا سے دوسروں کو کیا خاک گرمائے گا۔ اور جس نے نواز یعنی مطرب کا ضمیر پاک نہ ہو اس کا ساز زہرناک ہوتے ہوئے مہلک ہوتا ہے۔

وہ نغمہ سردیء خونِ غزل سرا کی دلیل　　کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موج نفس سے زہر آلود　　وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں!　　(۳)

اس کے بعد اقبال کہتے ہیں کہ نغمہ سیلاب کی مانند تندرو ہونا چاہئے تا کہ دل کے اندر سے غموں کے لشکر نکال دے۔ نغمہ ایسا ہونا چاہئے جس کی پرورش جنون عشق سے ہو۔ اور وہ خون دل کے اندر آگ بھر دے۔ جس کے نم سے شعلے کی پرورش کی جا سکے۔ اور خاموشی کو بھی اس کا جزو بنایا جا سکے۔ کیا تو جانتا ہے کہ موسیقی میں ایک ایسا مقام بھی ہے جس میں الفاظ کے بغیر کلام رواں رہتا ہے۔ اگر نغمہ عشق سے روشن ہو تو وہ چراغ فطرت ہے۔ اور فطرت کے معانی کو صورت عطا کرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ معنی کی اصل کہاں سے ہے۔ مگر اس کی صورت ظاہر ہے اور ہم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ اگر نغمہ

(۱) زبور عجم۔۱۸۴۔　　(۲) ضرب کلیم۔۱۲۶۔　　(۳) ضرب کلیم۔۱۳۱۔

معنی سے خالی ہے تو وہ مردہ ہے ۔ اگر اس میں سوز ہو بھی تو وہ بجھی ہوئی آگ کا سوز ہے ۔ مرشد رومیؒ نے معنی کا راز کھولا ہے ۔ میرا فکر اس کے آستانے پر سربجود ہے ۔ رومی کہتے ہیں '' معنی وہ ہے جو تجھے تجھ سے رہائی دلائے ۔ اور صورت سے بے نیاز کر دے ۔ معنی وہ نہیں جو تجھے اندھا و بہرہ کر دے ۔ جو مرد کو صورت پر ہی مفتون کر دے ۔''

ہمارے موسیقار معنی کی طرف توجہ نہیں دیتے ۔ وہ معنی سے دور صرف صورت کے شیدا ہیں ۔

نغمہ باید تندرو مانند سیل   تا برو از دل غماں را خیل خیل

نغمہ می باید جنوں پروردۂ   آتشے درخون دل حل کردۂ

از نم او شعلہ پروردن تواں   خامشی را جزو او کردن تواں

می شناسی؟ در سرود است آں مقام   کاندرو ، بے حرف ، می روید کلام

نغمہء روشن چراغ فطرت است   معنیء او نقشبندِ صورت است

اصلِ معنی راندانم از کجاست   صورتش پیدا و با ما آشنا است

نغمہ گر معنی نہ دارد مردہ ایست   سوزِ او از آتش افسردہ ایست

راز معنی مرشد رومی کشود   فکر من برآستانش درسجود

'' معنی آں باشد کہ بستاند ترا   بے نیاز از نقش گرداند ترا

معنی آں نبود کہ کوروکر کند   مرد را برنقش عاشق تر کند ''

مطربِ ما جلوۂ معنی ندید

دل بصورت بست و ازمعنی رمید! (۱)

ہر طرح کی ''حسن کاری'' میں اقبال افادی مقصدیت پر یقین رکھتے ہیں ۔ موسیقی میں بھی ان کا یہی معیار ہے ۔ اس لئے محض زیر و بم کو نہ تو وہ نغمہ سمجھتے ہیں اور نہ سرود ۔ بلکہ معنی سے بھرپور سرود ان کے نزدیک سرود حلال ہے ۔ اس لئے کہ ایسے ہی سرود سے دل زندہ و پائندہ رہتا ہے ۔ اقبال ایسی پر سوز و دلگداز موسیقی کے خواہاں ہیں جس کی گرمی ستاروں کو بھی پگھلا کر رکھ دے ۔ حالانکہ ستارے ہم سے بہت دور ہونے کے علاوہ بذاتِ خود آتشناک ہیں ۔ ایسی موسیقی و نغمہ جس کی تاثیر سے

(۱) زبور عجم ۔۱۸۴۔ ۱۸۵۔

انسان دشمن غم سے نجات پاتے ہوئے دوست غم کی ہمراہی میں غلامی سے آقا بن جائے۔ لیکن ایسے مطرب کا پرامید نگاہ سے انتظار کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال کوئی ایسا ''حسن کار'' موجود نہیں۔

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل — نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود!

ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا — جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود!

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک — اور پیدا ہو ایازی سے مقام محمود!

مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے — تو رہے اور ترا زمزمۂ لا موجود!

جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہان خودی — منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود! (۱)

وہ سرود وہی ہے جو دل کے تاروں سے نکلتا ہو۔ اس لئے کہ دل اقبال کے ہاں علامت عشق ہے۔ اقبال کے نظام ''حسن کاری'' میں عشق کے بغیر سب کچھ نامکمل ہے۔ اس لئے کہ دل سوز وگداز کا منبع ہے۔ سوزوگداز کے بغیر نوا بے اثر رہتی ہے۔ اسی لئے تو اقبال بہ صدائے در دمندے بہ نوائے دلپذیرے، خم زندگی کا منہ کھول دیتے ہیں بہ جہانے تشنہ میرے۔ بانسری کی لے میں، بانس نہیں بلکہ دل کا سوزوگداز شامل ہوتا ہے۔ ورنہ درخت کے ساتھ بھی ''چوب نے'' اسی دکھیارے لہجے میں بین کرنے لگتی۔ دل کا نغمہ بڑا شہ زور و بے باک ہوتا ہے۔ دل عشق کے بل بوتے پر بڑی بڑی سلطنتوں کے تخت الٹ کر ان پر قبضہ کر سکتا ہے۔ غلاموں کو آزادی جیسی نعمت عطا کر سکتا ہے۔ جس وقت دل کی یہ رمز مطرب کے ذہن نشین و دل نشین ہو جائے تو ''حسن کاری'' کے تمام مرحلے طے ہو جاتے ہیں۔

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور مے — اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے؟

دل کیا ہے؟ اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے؟ — کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تخت کے؟

کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات؟ — کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے؟

کیا بات ہے کہ صاحب دل کی نگاہ میں — جچتی نہیں ہے سلطنت روم و شام و رے؟

جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا

سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے! (۲)

(۱) ضرب کلیم۔ ۱۲۵۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔

موسیقی اور نغمہ و سرور کے علاوہ غلاموں کی مصوری میں بھی عزم و ہمت اور زندگی کی کوئی رمق نہیں ہوتی ۔ افسردگی و مایوسی اور حسرت و حرماں نصیبی اور ترک جدوجہد سے غلام اقوام کی مصوری تشکیل پاتی ہے ۔ جبکہ یہ رویہ پیغام اقبال اور اقبال کی ''حسن کاری'' سے بالکل میل نہیں کھاتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ہر لحاظ سے غلامی کی شدید مخالفت کی ہے ۔ اس لئے کہ غلامی میں فنون لطیفہ بھی زہریلے ہو کر انتہائی مہلک ثابت ہوتے ہیں ۔

اقبال کہتے ہیں میں نے غلامی کی مصوری کو بھی دیکھا ہے ، نہ اس میں ابراہیمی ہے اور نہ آزری ۔ کہیں راہب دکھایا گیا ہے جو دام ہوس میں پھنسا ہوا ہے ۔ کہیں محبوب کو پنجرے میں بند پرندے کے ساتھ دکھایا ہے ۔ کہیں بادشاہ دلق پوش فقیر کے سامنے موءدب کھڑا ہے ۔ کہیں کوہستانی شخص لکڑیاں اٹھائے ہوئے ہے ۔ کہیں مندر کی طرف جاتی ہوئی نازنین ہے ۔ کہیں ویرانے میں بیٹھا ہوا جوگی ہے ۔ کہیں درد پیری سے بے حال بوڑھے آدمی کے ہاتھ میں بجھا ہوا چراغ دکھایا گیا ہے ۔ ایسا ساز نواز جو دوسروں کے راگ سے مست ہو ۔ ایسی بلبل جس نے فریاد کی اور اس کا تار ہی ٹوٹ گیا ۔ نگاہ کے تیر سے گھائل نوجوان یا بوڑھے کی گردن پر سوار بچہ ۔ غلاموں کے موقلم موت ہی کی منظر کشی کرتے ہیں ۔ ان کی ہر تصویر میں موت ہی کی کہانی یا فسوں ہے ۔

ہمچناں دیدم فنِ صورت گری ‌ ‌ ‌ نے براہیمی درو نے آزری
راہبے درحلقہء دام ہوس ‌ ‌ ‌ دلبرے باطائرے اندر قفس
خسروے پیش فقیرے خرقہ پوش ‌ ‌ ‌ مرد کوہستانیء ہیزم بدوش
نازنینے دررہِ بت خانہء ‌ ‌ ‌ جوگیئے درخلوتِ ویرانہء
پیر کے از درد پیری داغ داغ ‌ ‌ ‌ آنکہ اندر دست او گل شد چراغ
مطربے از نغمہ ء بیگانہ مست ‌ ‌ ‌ بلبلے نالید و تارِ او گسست
نوجوانے از نگاہے خوردہ تیر ‌ ‌ ‌ کودکے برگردنِ بابائے پیر

می چکد از خامہ ہا مضمون موت
ہر کجا افسانہ و افسون موت (۱)

(۱) زبور عجم ۔ ۱۸۶ ۔ مصوری ۔

یہ کیسا زمانہ ہے کہ دین اس کے ہاتھوں فریاد کناں ہے۔ اس دور کی آزادی میں ہزاروں بند پنہاں ہیں۔ اس کی مصوری کے غلط نقش نے انسانیت کے چہرے کی آب و تاب ختم کر دی ہے۔

چہ عصر است ایں کہ دیں فریادیء اوست ہزاراں بند در آزادیء اوست

زروے آدمیت رنگ و نم برد غلط نقشے کہ از بہزادیء اوست (۱)

جدید علم غروب ہونے والوں کے سامنے سربسجود ہے۔ یہ شک بڑھاتا اور یقین کو دل سے نکالتا ہے۔ حضرت ابراہیم کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ بے یقین میں تحقیق کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ نہ بے یقین کوئی نئی چیز تخلیق کر سکتا ہے۔ بے یقین کا دل ہر وقت موت سے کانپتا رہتا ہے۔ اس کے لئے صورت گری میں نیا تصور لانا مشکل ہے۔ وہ خودی سے دور ہے اس لئے ہر وقت افسردہ خاطر ہی رہتا ہے۔ اس کے پیش نظر فقط عوامی ذوق ہوتا ہے۔ وہ عوامی ذوق کی تربیت کرتے ہوئے اسے ذوق سلیم بنانے کی بجائے اس کی تقلید کرتا ہے۔ وہ فطرت سے حسن کی گداگری کرتا ہے۔ راہزن ہے اور مفلس پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ حسن کو اپنے سے باہر تلاش کرنا غلطی ہے۔ جو کچھ ہونا چاہیئے وہ ہمارے سامنے کہاں؟ جب کوئی مصور اپنے آپ کو فطرت کے سپرد کر دیتا ہے تو وہ صرف فطرت کی نقالی کرتا ہے۔ جبکہ اقبال تسخیر فطرت کے پیامبر ہیں۔ فطرت کا مقلد اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا۔ وہ کبھی نقش کو اپنا رنگ نہیں دیتا، کبھی ہمارے شیشے پر پتھر کی ضرب نہیں لگاتا۔ وہ کینوس پر اپنے قلم سے مختلف رنگوں میں فطرت کی ادھوری نقالی کرتا ہے۔ اس کا پروانہء کم سوز بغیر تپش کے ہے۔ اس کے حال میں مستقبل کی کوئی جھلک نہیں۔ جبکہ اقبال مستقبل کے ''حسن کار'' ہیں۔ اور ان کے نزدیک حسن کار کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

غلام مصور مقلد ہوتا ہے اس لئے اس کی نگاہ میں وہ بے باکی نہیں ہوتی کہ آسمانوں کو چیر سکے۔ کیوں کہ اس کے سینے میں دل بے باک نہیں۔ وہ ہمہ وقت احساس کمتری میں مبتلا، پراگندہ ذہن اور اپنے کئے پر شرمندہ رہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ روح الامین کے فیض سے محروم ہے۔ اس کا فکر تہی دامن اور جدوجہد کے ذوق سے عاری ہے۔ اس کی آواز صور سے قیامت برپا نہیں ہوتی۔ اگر انسان اپنے آپ کو صرف خاکی سمجھے تو اس کے اندر کا خدائی نور مردہ ہو جاتا ہے۔ ایسا کلیم جب اپنے آپ سے باہر آتا ہے۔ تو اس کا ید بیضا تاریک اور عصا محض رسی ہوتا ہے۔ قوت اعجاز کے بغیر زندگی نہیں مگر ہر کوئی اس راز کو نہیں سمجھتا۔

(۱) ارمغان حجاز۔ ۹۵۔

علم حاضر پیش عاقل درجود | شک بیفزود و یقیں از دل ربود
بے یقیں را لذت تحقیق نیست | بے یقیں را قوت تخلیق نیست
بے یقیں رارعشہ ہا اندر دل است | نقش نو آوردن او را مشکل است
از خودی دور است و رنجور است و بس | رہبر او ذوق جمہور است و بس
حسن را دریوزہ از فطرت کند | رہزن و راہِ تہی دستے زند
حسن را از خودبروں جستن خطاست | آنچہ می بائست پیش ما کجاست ؟
نقش گر خود را چو بافطرت سپرد | نقشِ او افگند و نقشِ خود سترد
یک زماں از خویشتن رنگے نزد | برزجاج ماگہے سنگے نزد
فطرت اندر طیلسان ہفت رنگ | ماندہ بر قرطاس او باپا ے لنگ
بے تپش پروانہء کم سوز او | عکس فردا نیست در امروز او
از نگاہش رخنہ درافلاک نیست | زانکہ اندر سینہ دل بیباک نیست
خاکسار و بے حضور و شرمگیں | بے نصیب از صحبت روح الامیں
فکر او نادار و بے ذوق ستیز | بانگ اسرافیلؑ او بے رستخیز
خویش را آدم اگر خاکی شمرد | نور یزداں در ضمیر او بمرد
چوں کلیمے شد بروں از خویشتن | دست او تاریک و چوب او رسن

زندگی بے قوتِ اعجاز نیست
ہر کسے دانندۂ ایں راز نیست (۱)

مگر اقبال اس راز سے بخوبی واقف ہیں ۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ صورت گری مجھ سے سیکھ، شاید تو از سرنو اپنی تخلیق کر سکے ۔

صورت گری را از من بیا موز | شاید کہ خود را باز آفرینی! (۲)

(۱) زبور عجم ۔ ۱۸۷ ۔ ۱۸۸ ۔ (۲) زبور عجم ۔ ۱٦ ۔

غلامی میں بدن روح سے خالی ہوتا ہے اور تن بے جان سے بھلائی کی کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ دل میں ایجاد اور اظہار کا ذوق باقی نہیں رہتا۔ آدمی اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے۔ اگر تو جبرئیل علیہ کو غلام بنا لے تو وہ بھی آسمان کے گنبد آئینہ سے نیچے گر پڑے گا۔ غلام کا مسلک تقلید اور اس کا کام بت گری ہے۔ اس کے مذہب میں ندرت کافری کے مترادف ہے۔ نئی چیز اس کا وہم و شک بڑھا دیتی ہے۔ وہ کہنہ و فرسودہ پر خوش رہتا ہے۔ اس کی نظر صرف ماضی پر رہتی ہے۔ اور وہ مستقبل کے بارے میں اندھا ہوتا ہے۔ مجاور کی طرح وہ اپنا رزق قبر کی مٹی سے حاصل کرتا ہے۔ فرسودہ و مردہ روایات کی مجاوری کرتا ہے۔ اگر یہی ''حسن کاری'' ہے تو اس میں آرزو کی موت ہے اور اقبال آرزو ہی کو زندگی کا دل سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ،زندگی در جستجو پوشیدہ است ،اصل او در آرزو پوشیدہ است ، آرزو را در دل خود زندہ دار ، تا نگردد مشت خاک تو مزار ، ما زتخلیق مقاصد زندہ ایم ، از شعاع آرزو تابندہ ایم _____ ایسے ہنر کا باطن مکروہ اور ظاہر خوبصورت ہے۔

اس کا باطن بدنما تھا ظاہر بڑا رنگین تھا ٹوٹے پھوٹے فرش پر جیسے کوئی قالین تھا

جال خواہ کتنا ہی ریشمی ہو سمجھدار پرندہ اس کا اسیر نہیں ہوتا۔ گویا کہ سمجھدار ایسے ہنر سے متاثر نہیں ہوتے۔

در غلامی تن زجاں گردد تہی از تن بے جاں چہ امید بہی

ذوق ایجاد و نمود از دل رود آدمی از خویشتن غافل رود

جبرئیلے را اگر سازی غلام برفتد از گنبد آئینہ فام

کیش او تقلید و کارش آزری ست ندرت اندر مذہب او کافری ست

تازگیہا وہم و شک افزایدش کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

چشم او بر رفتہ از آیندہ کور چوں مجاور رزق او از خاک گور

گر ہنر ایں است مرگ آرزوست اندرونش زشت و بیرونش نکوست

طائر دانا نمیگردد اسیر (۱)

گرچہ باشد دامے از تار حریر!

حکمران اگر غلام کا ایک بند کھول دیتا ہے تو اسے دوسرے بند میں جکڑ دیتا ہے۔ وہ اس کے لئے ایسا آئین

(۱) زبور عجم ۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔

بناتا ہے ۔ جس میں کئی پیچ ہوں۔ پھر وہ اس آئین کو ظلم ڈھانے کے لئے جواز بناتا ہے ۔ وہ غلام کو قہر و سختی کا جلوہ دکھاتا ہے اور اس طرح اس کے اندر مرگ ناگہاں کا جو خطرہ ہوتا ہے ۔ اس میں اور اضافہ کر دیتا ہے ۔ تاکہ وہ اپنے آپ سے ناامید ہو جائے ۔ اس کے اندر سے کچھ بننے اور کچھ کر گزرنے کی آرزو دم توڑ دے ۔ وہ کبھی اسے ریشمی خلعت عطا کرتا ہے اور کبھی اس کے ہاتھ میں تھوڑا سا اختیار بھی دے دیتا ہے ۔ جس طرح آج کل پرویز مشرف کو امریکہ کی طرف سے نوزا جا رہا ہے ۔

یہ مہر ہے بے مہریء صیاد کا پردہ   آئی نہ مرے کام مری تازہ صفیری!
رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں   شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری! (۱)

محکوم کا المیہ یہ ہے کہ وہ چھوٹے موٹے منصب کی خاطر سب سے قیمتی و نایاب پونجی اپنی روح کی روح یعنی خودی کو بھی فروخت کر ڈالتا ہے ۔ لیکن حاکم پھر بھی اسے اپنی حکمرانی میں شریک نہیں کرتا بلکہ فقط جھانسہ دے کر اس کا جوہر ادراک اونے پونے داموں لے لیتا ہے ۔

ترے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب   کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک!
شریک حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے   خریدتے ہیں فقط ان کا جوہر ادراک! (۲)

دراصل آزادی و محکومی کا پیمانہ ، ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات پر مبنی ہے ۔ اقبال کہتے ہیں مردان آزاد ہی دراصل حکمرانی کے حقدار ہیں ۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے اندر اتنی صلاحیتیں پیدا کر رکھی ہیں کہ حکمرانی ان کے قدم چومتی ہے اور وہ کمزوروں کو غلام بنا لیتے ہیں ۔ کمزوروں و غلاموں کو چاہیئے کہ وہ بھی اپنے اندر حکمرانہ اوصاف کو بیدار کریں اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکیں ۔ ارمغان حجاز کی ایک نظم میں اقبال نے آزاد و محکوم کا خوبصورت موازنہ کیا ہے ۔

آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگ سنگ   محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید   آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم   محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانہء اخلاص و مروت   ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

(۱) ضرب کلیم ۔ ۱۶۱ ۔ ''نفسیات حاکمی'' ۔   (۳) ضرب کلیم ۔ ۱۳۹ ۔

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ھمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے ، یہ خواجۂ افلاک (۱)

درحقیقت غلامی ہی کے ردعمل میں اقبال نے قوم وملت کے جسم کی آنکھ کا کردار ادا کیا۔ اور وہ ایک عظیم ''حسن کار'' کے روپ میں نکھر کر سامنے آئے۔ غلامی کو اقبال دنیا کی سب سے زیادہ مکروہ وقابل نفرت چیز گردانتے ہیں۔اس لئے کہ محکومی میں قوموں کی عزیز ترین متاع ، خودی بھی لٹ جاتی ہے۔لہٰذا اقبال غلام دیس میں پیدا ہونے پر تاسف و افسوس کے ساتھ شرم بھی محسوس کرتے ہیں اور خالق حقیقی سے شاکی بھی ہیں۔

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند! (۲)

اقبال کا ذہن رسا یہ حقیقت بھی جانتا ہے کہ ہندوستانی غلاموں کی مردوں جیسی بوسیدہ حالی اور غلامی دراصل ان کی اپنی ہی کمزوریوں اور بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہے۔

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں گفتار دلبرانہ ، کردار قاہرانہ! (۳)

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے!
جاں بھی گروغیر بدن بھی گروغیر! افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے! (۴)

شاطر اپنے مہرے اس طرح پھینکتا ہے کہ اپنے پیادے کو وزیر کے سامنے کر کے غلام کو بے بس کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے غلام کو فوری نعمتوں کا شیدا بنا دیتا ہے تاکہ غلام مستقبل کی بہتری کا خیال چھوڑ دے۔ غلام کا بدن آقا کی مہربانیوں کی بدولت موٹا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی روح تنکے کی طرح باریک ، یعنی کمزور ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ایک روح کے نحیف ونزار ہونے سے یہ بہتر ہے کہ بدن کی کئی بستیاں بالکل نیست و نابود ہو جائیں۔ زنجیر غلام کے پاؤں میں نہیں ہوتی بلکہ اس کے دل و جان ، گویا سوچ اور ہمت پر ہوتی ہے۔ یہی مشکل اندر مشکل ہے۔

حکمراں بکشاید ش بندے اگر می نہد برجان او بندے دگر

(۱) ارمغان حجاز۔۴۰۔۴۱۔ (۲) ضرب کلیم۔۲۳۔ (۳) بال جبریل۔۵۴۔ (۴) ضرب کلیم ۱۵۱۔ ''گلہ''۔

ساز و آئینے گرہ اندر گرہ — گویدش می پوش ازیں آئیں زرہ
ریز پیز قہرو کیں بنما یدش — بیم مرگ ناگہاں افزایدش
تا غلام از خویش گردد ناامید — آرزو از سینہ گردد ناپدید
گاہ اورا خلعت زیبا دہد — حکم زما م کار در دستش نہد
مہرہ را شاطر زکف بیروں جہاند — بیذق خود را بفرزینی رساند
نعمت امروز را شیداش کرد — تابمعنی منکرِ فرداش کرد
تن ستبراز مستئ مہر ملوک — جان پاک از لاغری مانند دوک
گردد ار زاروزبوں یک جانِ پاک — بہ کہ گردد فربہء تن ہا ہلاک

بند برپانیست بر جان و دل است
مشکل اندر مشکل اندر مشکل است (۱)

بے شک:۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ ! — یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ! (۲)

تقلید جسمانی و ذہنی غلامی کی بناء پر کی جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں تقلید سے حقیقی خیالات اور تخلیقی صلاحیت مردہ ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں غلامی کی بناء پر ہر طرف فرنگی تقلید کا دور دورہ ہے۔ اسی لئے تو آج کے مصور مغرب کے رنگ میں ایسے رنگے جا چکے ہیں کہ مشرقی صورت گری کی تمام تر روایات کو بھلا بیٹھے ہیں۔ انہیں چاہیئے تقلید کی روش ترک کر کے دوسروں کی خودی کی عکاسی کرنے کی بجائے آئینہ فطرت میں اپنی ہی خودی کی عکاسی کریں۔

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگ تخیل — ہندی بھی فرنگی کا مقلد ، عجمی بھی!
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد — کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرور ازلی بھی!
معلوم ہیں اے مرد ہنر تیرے کمالات — صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے — آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی! (۳)

(۱) زبور عجم۔۱۹۲۔ (۲) ضرب کلیم۔۶۷۔ (۳) ضرب کلیم۔۱۲۴۔مصور۔

اور سبحان اللہ:۔

اللہ کا سو شکر ،کہ پروانہ نہیں میں

دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں (۱)

اقبال نے اپنی ''حسن کاری''میں مردان آزاد کے فن تعمیر پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔ہم دیکھ چکے ہیں کہ غلاموں کا فن بھی مایوسی و موت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے ۔ جبکہ آزاد مردوں کا ہنر بھی ان کی طرح آزاد و بیباک ہے ۔ اقبال کہتے ہیں ،ایک لمحہ کے لئے گزرے ہوؤں کی صحبت اختیار کر اور آزاد مردوں کا فن بھی دیکھ ، اگر تیرے اندر حوصلہ ہے تو اپنی آنکھ کھول ، اٹھ اور قطب الدین ایبک اور شیر شاہ سوری کے کرشمے دیکھ ۔ انہوں نے تعمیرات میں اپنے آپ کو ظاہر کرکے خود اپنا نظارہ کیا ہے ۔ انہوں نے پتھر کو پتھر سے وابستہ کرکے پورے عہد کو ایک لمحے میں مقید کر دیا ہے ۔ ان تعمیرات کو دیکھنا تمہاری شخصیت کو پختہ تر بناتا اور تمہیں ایک اور جہان میں لے جاتا ہے ۔فن اپنے ''حسن کار'' کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے ذہن رسا کا پتہ دیتا ہے ۔ ان عمارتوں کو دیکھنے سے ان کے پتھر میں ہمت مردانہ اور طبع بلند کے دو قیمتی موتی نظر آتے ہیں ۔ کہ حسن می خواہد نمود ۔ مجھ سے نہ پوچھ یہ شاہکار کس کی سجدہ گاہ ہیں ۔ بے خبر ! روح کے احوال کو بدن کیا بتا سکتا ہے ۔ افسوس ہے مجھ پر کہ میں اپنے آپ سے حجاب میں ہوں ، اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر سکا۔ میں نے حسن کے دریا سے پانی نہیں پیا۔ افسوس مجھ پر کہ میں نے اپنی بنیادیں کھود دیں ۔ اور اپنے مقام سے دور جا پڑا ہوں ۔ استحکامِ یقین محکم ہی سے ہے افسوس کہ میری شاخ یقین سوکھ چکی ہے ۔ میرے اندر الا اللہ کی قوت نہیں، میرا سجدہ اس درگاہ کے لائق نہیں ۔

بے شک حسن ہنر کی صورت میں اظہار چاہتا ہے ۔ اقبال نے اپنی ''حسن کاری'' کا کھل کر اظہار کیا ہے اور ان کا اندرون الا اللہ کی قوت سے سرمست بھی تھا ۔ یہاں وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بات کر رہے ہیں ۔ ورنہ صاف ظاہر ہے کہ اقبال نے اپنی ''حسن کاری''میں خوب کھل کر دلبری و قاہری کا اظہار کیا ہے ۔ چنانچہ'' اپنے شعر سے'' کہتے ہیں ۔

ہے گلہ مجھ کو تری لذت پیدائی کا　　تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش !

شعلہ سے ٹوٹ کے مثل شرر آوارہ نہ رہ　　کر کسی سینۂ پر سوز میں خلوت کی تلاش! (۲)

اور پھر:۔

(۱) بالِ جبریل۔ ۱۱۵۔'' جگنو''۔　　(۲) ضرب کلیم۔۱۰۲۔

یک زماں بارفتگاں صحبت گزیں ‌ ‌ صنعت آزاد مرداں ہم بہ بیں
خیز و کار ایبک و سوری نگر ‌ ‌ وا نماچشمے اگر داری جگر
خویش را از خود بروں آوردہ اند ‌ ‌ ایں چنیں خود را تماشا کردہ اند
سنگہا باسنگہا پیوستہ اند ‌ ‌ روزگارے را بآنے بستہ اند
دیدنِ او پختہ تر سازد ترا ‌ ‌ درجہانِ دیگر اندازد ترا
نقش سوے نقش گرد آورد ‌ ‌ از ضمیراو خبر می آورد
ہمت مردانہ و طبع بلند ‌ ‌ دردل سنگ ایں دو لعلِ ارجمند
سجدہ گاہِ کیست ایں از من مپرس ‌ ‌ بے خبر ! روداد جاں از تن مپرس
وائے من از خویشتن اندر حجاب ‌ ‌ از فرات زندگی ناخوردہ آب
وائے من از بیخ و بن برکندۂ ‌ ‌ از مقام خویش دور افگندۂ
محکمی ہا از یقین محکم است ‌ ‌ واے من شاخ یقینم بے نم است

در من آں نیروے الا اللہ نیست
سجدہ ام شایانِ ایں درگاہ نیست (۱)

ایک نظر اس گوہر نایاب کو دیکھ، جسے تاج محل کہتے ہیں۔ تاج محل کا چاندنی رات میں نظارہ کر۔ اس کا سنگ مرمر آب رواں سے بھی زیادہ تیز رو ہے۔ اس پر نظر پھسلتی ہے۔ وہاں کا ایک لمحہ ابد سے پائندہ تر ہے۔ معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود اور خون جگر عشق ہی کا دوسرا نام ہے۔ گویا کہ عشق کے بغیر نہ خدا ملتا ہے اور نہ ہنر۔ تاج محل کے ذریعے عشق مرداں نے اپنا بھید کہا ہے۔ لگتا ہے کہ پتھروں کو پلکوں کی نوک سے پرو دیا ہے۔

یک نظر آں گوہرے نابے نگر ‌ ‌ تاج را در زیر مہتابے نگر
مرمرش زآب رواں گردندہ تر ‌ ‌ یک دم آنجا از ابد پائندہ تر
عشقِ مرداں سرخود را گفتہ است ‌ ‌ سنگ را با نوکِ مژگاں سفتہ است (۲)

(۱) زبور عجم۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ‌ ‌ (۲) زبور عجم۔ ۱۹۴۔

اقبال نے اپنی نظم ''مسجد قرطبہ'' میں بھی عشق محبوب حقیقی میں سرشار آزاد مرد کے فن تعمیر کا جائزہ لیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ وقت کا پارکھ ہر چیز کو مٹا دیتا ہے، لیکن وہ ''حسن پارہ'' جس کی تعمیر میں عشق سرگرم عمل رہا ہو، وہ مرد مومن کی تعبیر و تعمیر ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے حسن پارے کا نقش ان مٹ ہوتا ہے۔

تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلہ ء روز و شب صیرفیء کا ئنات

تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار — موت ہے تیری برات موت ہے میری برات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا — ایک زمانے کی رو، جس میں نہ دن ہے نہ رات!

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر — کار جہاں بے ثبات! کار جہا ں بے ثبات!

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا — نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام — جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

یہ اس لئے کہ:۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

اس لئے کہ ہنر اپنے ہنرور کا عکاس ہوتا ہے۔ ہنر میں حسن کار کا راز ظاہر ہوتا ہے:۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

مرد حر کا ''حسن پارہ'' جہاں کہیں بھی ہو عشق اس میں ایسا نور جلوہ گر کر دیتا ہے کہ اس کے تانے بانے حرم سے جا ملتے ہیں۔ حسن میں اس کی نظیر صرف اور صرف ''قلب مسلمان'' میں ملتی ہے۔ کہ اس میں عشق ''حسن مطلق'' کی تجلی جلوہ گر ہوتی ہے۔

کعبہ ء ارباب فن! سطوت دین مبیں — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمین

ہے تہء گردوں اگر حسن میں تیری نظیر — قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں! (۱)

عشق مرداں جنت الفردوس کی صورت پاک و رنگیں ہے۔ وہ سنگ و خشت سے نغمے پیدا کر لیتا ہے۔ عشق مرداں

(۱) بال جبریل۔ مسجد قرطبہ۔

حسینوں کے حسن کا معیار ہے۔ وہ حسن کے چہرے سے پردہ بھی اٹھاتا ہے۔ اور حسن کی حفاظت بھی کرتا ہے۔۔ اس کی ہمت آسمانوں سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ وہ اس جہان محسوسات و موجودات سے باہر نکل جاتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے۔ وہ الفاظ میں نہیں سماتا۔ اس لیے وہ اپنے اندرون سے نقاب اٹھا دیتا ہے۔ عشق سے اہل دل کا سینہ جلوہ گاہ سینا بن جاتا ہے۔ وہ حسن کاروں کو ید بیضا عطا کرتا ہے۔ یعنی عشق کی بدولت روحانیت بڑھتی ہے اور ''حسن کاروں'' کے ہنر میں معجزاتی ''حسن کاری'' کی تجلیاں ودیعت کرنے کے بعد، حسن پارے کو عشق ایک معجزے سے ہمکنار کردیتا ہے۔ عشق کی بدولت ''حسن پارہ'' سراپا معجزہ بن جاتا ہے اور معجزہ باکمال و لازوال ہوتا ہے۔

عشق سے ہے پائیدار تیری خودی کا وجود مہر و مہ و مشتری ، چند نفس کا فروغ (۱)

عشق کے سامنے تمام ممکنات و موجودات ہیچ ہیں۔ ساری دنیا تلخ ہے اور صرف عشق مصری کی ڈلی ہے۔ ہمارے افکار و ''حسن کار'' کی گرمی عشق سے ہے۔ پیدا کرنا اور اس میں روح پھونکنا عشق ہی کا کام ہے۔ چیونٹی، پرندے اور انسان سب کے لیے عشق کافی ہے۔ اکیلا عشق دونوں جہانوں کے لیے بس ہے۔ ''جلال و جمال'' کے بغیر کوئی ''حسن پارہ'' پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ جیسا کہ دلبری یعنی جمال، قاہری یعنی جلال کے بغیر محض جادوگری ہے۔ دلبری و قاہری دونوں یکجا ہوں تو پیغمبری ہے۔ عشق اپنی حسن کاری میں ان دونوں کو ملا دیتا ہے اور اس طرح اس جہاں کے اندر ایک نیا جہاں پیدا کرتا ہے۔

عشق مرداں نقد خوباں را عیار حسن راہم پردہ درہم پردہ دار
ہمت او آنسوے گردوں گذشت از جہان چند و چوں بیروں گذشت
زانکہ در گفتن نیاید آنچہ دید
از ضمیر خود نقابے بر کشید

اہل دل را سینہء سینا دہد باہنر منداں ید بیضا دہد
پیش او ہر ممکن وموجود مات جملہ عالم تلخ و او شاخ نبات
گرمیء افکار ما از نار اوست آفریدن، جاں دمیدن کار اوست
عشق مور و مرغ و آدم را بس است عشق تنہا ہر دو عالم را بس است

(۱) ضرب کلیم۔ ۱۱۲۔

دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است

ہر دورا درکار با آمیخت عشق!

عالمے در عالمے انگیخت عشق! (۱)

اس طرح یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اقبال کے ''ذوق جمال'' اور ''نظام حسن کاری'' میں عشق ایک بنیادی عنصر ہے۔

تیری متاع حیات ، علم و ہنر کا سرور میری متاع حیات ، ایک دل ناصبور! (۲)

جس کے بغیر نہ تو ''حسن مطلق'' کا قرب حاصل ہوسکتا ہے اور نہ کوئی ''حسن پارہ'' معرض وجود میں آنے کے بعد اوج کمال و لازوال حیثیت حاصل کر سکتا ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے غلام اور مقلد شاعر بھی جدت و ندرت سے عاری ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایسے شاعر محض سخن آرائی کرتے ہیں۔ یہ ایسے کلیم ہیں جن کے پاس ید بیضا نہیں۔ ان کی ''حسن کاری'' معجزانہ قوت سے خالی ہے۔ مجھ سے بھی ایسی ہی سخن وری کی توقع کی جا رہی ہے۔ جبکہ میرے نزدیک جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟ معجزے سے عاری شاعری کافری ہے۔ حقیقی شاعری میں معجزاتی خصوصیت پائی جاتی ہے۔

شاعراں بزم سخن آراستند ایں کلیماں بے ید بیضا ستند

آنچہ تو ازمن بخواہی کافری است کافری کو ماورائے شاعری است (۳)

نہ جدا رہے نواگر تب و تاب زندگی سے کہ ہلاکیء امم ہے یہ طریق نے نوازی (۴)

اقبال شاعری میں روایتی سخنوری کے قائل نہیں۔ وہ شاعر فرداستم کے مصداق جدت و ندرت پسند ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں۔ مجھ سے متصوفانہ کلام کی امید نہ رکھ۔ میں عاشقانہ سرشت رکھتا ہوں۔ میں شعر نہیں کہتا۔ بلکہ اپنے خون آمیز آنسوؤں کو شبنم کی طرح اس باغ میں قطرہ قطرہ ٹپکاتا ہوں۔ جو کہ جان جوکھوں کا کام ہے۔

مجواز من کلام عارفانہ کہ من دارم سرشت عاشقانہ

سر شک لالہ گوں را اندریں باغ بیفشانم چو شبنم دانہ دانہ (۵)

اقبال اس ''حسن کاری'' کو پروان چڑھاتے ہیں جو ملت کے لیے آب حیات ثابت ہو۔ یہ آب حیات عشق ہی

(۱) زبور عجم۔۱۹۴۔۱۹۵۔ (۲) ضرب کلیم۔۵۱۔ (۳) جاوید نامہ۔۱۲۸۔ (۴) ضرب کلیم۔۷۴۔ (۵) ارمغان حجاز۔۶۳۔

ہوسکتا ہے ۔ کہ عشق سے جذبے اور تمنائیں جنم لیتی ہیں ۔چنانچہ اقبال کہتے ہیں ۔ ہمارے بدن میں دل اور دل کے اندر غم عشق موجود ہے ۔ ابھی اسلام کی اس شاخ کہنہ میں نمی ہے ۔ ہر مسلمان کے اندر زمزم کا چشمہ موجود ہے ۔تو اپنی ''حسن کاری'' کے زور سے اسے جاری کردے ۔لیکن یہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب ہنر میں ضرب کلیمی کا معجزہ پوشیدہ ہو۔

ہم بخوبی دیکھ چکے ہیں کہ افلاطون اپنے نظریہ اعیان کے تحت فطرت کو دوسرے درجے اور فن کو فطرت کی نقالی گردانتے ہوئے تیسرے درجے کی چیز سمجھتا ہے ۔ جان رسکن نے فطرت کو فن کا اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیتے ہوئے تقلید فطرت ہی کو معیار فن قرار دے دیا ۔لیکن اقبال فن کے دبستان فطریت سے متفق نہ ہوسکے ۔ اور ردعمل کے طور پر فوق الفطرت نظریہ فن کی داغ بیل ڈالی ۔ چنانچہ اقبال کے

چہ پروین فرونآید اندیشہ من بدریوزۂ پرتوِ مہرو ما ہے (۱)

نزدیک فن فطرت سے بلند ترین مقام کا حامل ہے ۔ ان کے خیال میں تقلید خواہ فطرت ہی کی کیوں نہ ہو، فن کار و حسن کار کو جدت تخلیق سے روک دیتی ہے، اس طرح وہ بے عملی اور سست روی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے ۔ ایسی بے عملی اور کاہلی سے بچنے اور دوسروں کو بچانے کی خاطر اقبال افلاطون کے ''اعیان ثابتہ'' کی مخالفت کرتے ہیں اور فن کو تیسرے درجے کی چیز ماننے کی بجائے فطرت سے بھی پہلا درجہ دیتے ہیں ۔ اقبال کے خیال میں دنیا انسان کے لیے تخلیق کی گئی ہے ۔تمام مظاہر و موجودات کو انسان مسخر کرسکتا ہے ۔''وسخرلکم مافی السموات ومافی الارض''۔''اقبال کا ذوق جمال''اور حسن کاری بھی مکمل طور پر قرآن پاک کی روشنی میں ہے ۔ اس لیے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے ۔ تسخیر فطرت میں انسان مہر و ماہ و مشتری سے بھی آگے اسی وقت نکل سکتا ہے جب وہ اپنے آپ کو فطرت کی تقلید سے آزاد کرے اور قرآن پاک کو مشعل راہ بنائے ۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں قرآن پاک کی آیات پر دوبارہ غور کر ۔ تاکہ تو عصر نو پر اپنی کمند ڈال سکے ۔قرآن پاک کے اسرار کوئی نہیں سمجھتا ۔ اہل مشرق ہوں یا اہل مغرب سب پیچ و تاب میں ہیں ۔یعنی بھول بھلیوں میں بھٹکے ہوئے ہیں ۔

دل بآیات مبیں دیگر بہ بند تا بگیری عصر نورا در کمند!
کس نمی داند ز اسرار کتاب شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب (۲)

(۱) زبور عجم ۔۷۴۔ (۲) جاوید نامہ ۔ ۷۸۔

میں اپنے دل کی بات برملا کہتا ہوں یہ کتاب نہیں کچھ اور چیز ہے۔ جب اس کا اثر جان کے اندر داخل ہوتا ہے تو وہ اور ہو جاتی ہے۔ جان بدل جائے تو جہاں بدل جاتا ہے۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی طرح ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ یہ زندہ و پائندہ بھی ہے اور گویا اس کے اندر مغرب و مشرق کی تقدیریں پنہاں ہیں۔ انہیں سمجھنے کے لیے بجلی کی سی تیز سوچ پیدا کر۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!
چوں بجاں دررفت جاں دیگر شود جاں چودیگرشد جہاں دیگر شود!
مثل حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں زندہ و پائندہ و گویاست ایں
اندر و تقدیر ہائے غرب و شرق سرعتِ اندیشہ پیدا کن چوبرق (۱)

اقبال کے نزدیک جب انسان فطرت کے پیچھے پیچھے چلنے کی بجائے آگے نکل کر چلنے کی کوشش کرے گا تو تب ہی وہ فطرت پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں فطرت صید زبوں ہے اور حسن کار یعنی صاحب نظر انسان صیاد ہے۔ لہٰذا:

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو صیاد ہیں مردان ہنر مند کہ نخچیر! (۲)

کائنات کی نہاد کے اندر نیا پن ہے۔ تقلید سے حیات کا استحکام نہیں۔ قلب زندہ نئے زمانے پیدا کرتا ہے۔ تقلید سے اس کی روح مر جاتی ہے۔

طرفگیہا در نہاد کائنات نیست از تقلید تقویم حیات
زندہ دل خلاق اعصار و دہور جانش از تقلید گردد بے حضور (۳)

وہ ہنر واران جنھوں نے ''اہرام مصر'' کی صورت میں عظمت و ابدیت کی تصاویر کھینچی ہیں۔ اگر تقلید فطرت کے چکر میں آ جاتے تو محض ریت کے ٹیلے ہی بناتے لیکن انہوں نے فطرت کی پیروی کرنے کی بجائے اپنی جدت طرازی سے کام لیا اور اس طرح ان کی حسن کاری ''فوق الفطرت'' کے مقام ابد پر فائز ہوئی۔

اس دشت جگر تاب کی خاموش فضا میں فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر!
اہرام کی عظمت سے نگونسار ہیں افلاک کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر؟ (۴)

(۱) جاوید نامہ۔ ۸۱۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۱۱۷۔ (۳) جاوید نامہ۔ ۶۶۔ (۴) ضرب کلیم۔ ۱۱۶۔

فطرت کو تسخیر کرنا کوئی گناہ یا گستاخی بھی نہیں ۔ اس لئے کہ خود قرآن نے تسخیر فطرت کی اجازت اور ترغیب دی ہے۔ پس اقبال بجا فرماتے ہیں کہ شکاری وہی ہے جو شکار پر حاوی ہو ۔ اور اگر شکار' شکاری پر حاوی ہو جائے تو صاف ظاہر ہے معاملہ الٹ ہو جاتا ہے ۔ اسی نظریے کے تحت انسان نے رات کی تاریکی کے مقابلے میں چراغ بنایا ۔مٹی سے پیالہ بنالیا۔ بیابانوں' پہاڑوں اور وادیوں کے برعکس انسان نے باغات پروان چڑھائے ۔ٹھیک ہےفطرت میں پتھر ہیں ۔مگر آئینہ کہیں نہیں ۔ پتھر سے آئینہ بنالینا انسانی فن ہی کا کمال ہے ۔ انسان اپنی ہنر مندی سے زہر کو شہد بھی بنالیتا ہے ۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار وراغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم　　من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم　　(۱)

مطلب یہ کہ:۔

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن　　تراخرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد!
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے　　وہ دشت سادہ ' وہ تیرا جہان بے بنیاد!　　(۲)

اقبال نے فوق الفطرت کا نظریہ اس لئے پیش کیا کہ انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہے ۔ عناصر فطرت اللہ تعالیٰ کی بے شک ترجمانی کرتے ہوئے اس کے جلال و جمال کی نشانیاں ضرور ہیں ۔مگر خلیفتہ اللہ کا رتبہ صرف انسان کو عنایت ہوا ہے ۔ چنانچہ اقبال کیا خوب کہتے ہیں کہ دنیا میں' اللہ تعالیٰ کا نائب ہونا اور عناصر فطرت پر حکمرانی کرنا کیا خوب ہے ۔ نائب حق اس کائنات کی جان کی مانند ہے ۔اس کا وجود اسم اعظم کا سایہ ہے ۔

نائب حق درجہاں بودن خوش است　　برعناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است　　ہستئی او ظل اسم اعظم است　　(۳)
عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں　　کہ برفتراک دولتے بستم سرخود را　　(۴)

ایک دوسرے موقعے پر بھی اقبال جاوید نامہ میں کہتے ہیں ،''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں آدم کو زمین پر اپنا نائب بناتا ہوں'' انسان کی تقدیر ہے اور زمین سے آسماں تک ہر شے کی تسخیر اس تقدیر کی تفسیر ہے ۔ کائنات انسان میں سما جاتی

(۱) پیام مشرق ۔۱۱۴۔　　(۲) بال جبریل ۔ ۸۔　　(۳) اسرار خودی ۔۴۴۔　　(۴) بال جبریل ۔ ۲۵۔

ہے لیکن انسان کائنات میں نہیں سماتا۔

حرفِ انی جاعل تقدیر او | از زمیں تا آسماں تفسیر او
آنچہ در آدم بگنجد عالم است | آنچہ درعالم نگنجد آدم است! (۱)

اقبال کہتے ہیں ایسی کوئی چیز نہیں جو انسان کے لئے نہ بنائی گئی ہو۔ جب ہر چیز انسان کے لئے تخلیق کی گئی ہے تو پھر ایسی کوئی چیز نہیں جسے انسان حاصل نہ کرسکتا ہو یا اس پر غلبہ نہ پا سکتا ہو۔ اس میں صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی خودی کو حاصل کرلیا جائے تو انسان تمام موجودات کو تسخیر کرکے انہیں اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔

فطرت کو خرد کے رو برو کر | تسخیر مقامِ رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے | کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ | تو بھی مقامِ آرزو کر (۲)

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند! (۳)

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا | مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
برنگِ بحر ساحل سے آشنا رہ | کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا (۴)
آسماں میں راہ کرتی ہے خودی | صید مہروماہ کرتی ہے خودی (۵)

اقبال کے نزدیک فطرت کا جبروت و جلال بھی انسان کی آرزو اور جدوجہد کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے اور فطرت کا حسن و جمال بھی حسن کار کی توجہ کا مرہون منت ہے۔ اس کے بغیر فطرت کے حسن و جمال میں بھی نکھار نہیں آتا۔

خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی | رومی ہے، نہ شامی ہے، کاشی نہ سمرقندی!
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے | آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی! (۶)

وہ اس طرح کہ اقبال فوق الفطرت اور تسخیر فطرت میں اس قدر آگے جاتے ہیں کہ مظاہرفطرت تو کوئی بات نہیں، بلکہ:۔

(۱) جاوید نامہ۔ ۶۸۔ (۲) بالِ جبریل۔ ۵۹۔ (۳) بالِ جبریل۔ ۱۵۴۔
(۴) بالِ جبریل۔ ۸۵۔ (۵) بالِ جبریل۔ ۱۴۰۔ (۶) بالِ جبریل۔ ۷۱۔

دردشت جنون من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ (۱)

اور جب ایسا ہوسکتا ہے تو پھر مظاہر فطرت کا انسان کے قابو میں ہونا تو کوئی بڑی بات ہی نہیں ۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل ، یہ گھٹائیں — یہ گنبد افلاک ، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ ، یہ صحرا ، یہ سمندر ، یہ ہوائیں (۲)

اقبال کہتے ہیں کہ شاعر کا سینہ جلوہ گاہ حسن ہے، گویا یہ سینہ طور سینا ہے ۔ جس سے حسن کے انوار پھوٹتے ہیں ۔ شاعر کی نگاہ سے خوبصورت چیز اور خوبصورت ہو جاتی ہے ۔ اس کے اشعار کے جادو سے حسن فطرت اور زیادہ خوبصورت ہو جاتا ہے ۔ شاعر کے نغمے سے بلبل نے نوا سیکھی ہے ۔ اس کے غازے نے پھول کو چمکا دیا ہے ۔ پروانوں کے دل میں اسی کا سوز ہے ۔ وہی عشق کے افسانوں کو رنگین بناتا ہے ۔ شاعر کے آب وگل میں سمندر اور خشکی پوشیدہ ہے ۔ اس کے دل کے اندر سینکڑوں جہاں مستور ہیں ۔ اس کے دماغ میں ایسے گل ہائے لالہ موجود ہیں ۔ جو ابھی پھوٹے نہیں ۔ وہ ایسے نغموں اور نالوں سے بھرا ہوتا ہے ۔ جو ابھی تک کسی نے نہیں سنے ۔ اس کے فکر کی پرواز ماہ و انجم تک ہے ۔ وہ بدصورتی سے ناآشنا ہے ۔ وہ صرف حسن کی تخلیق کرتا ہے ۔ حضر کی مانند شاعر کے ظلمات میں آب حیات ہے ۔ اس کے آنسو کائنات کو زندہ تر کر دیتے ہیں ۔

سینہ شاعر تجلی زار حسن — خیزد از سینائے او انوار حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر — فطرت از افسون او محبوب تر
از دمش بلبل نوا آموخت است — غازہ اش رخسار گل افروخت است
سوز او اندر دل پروانہ ہا — عشق را رنگیں ازو افسانہ ہا
بحر و بر پوشیدہ درآب و گلش — صد جہان تازہ مضمر دردلش
دردماغش نادمیدہ لالہ ہا — ناشنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا
فکر او باماہ و انجم ہم نشیں — زشت رانا آشنا ، خوب آفریں
حضرو در ظلمات او آب حیات — زندہ تر ازآب چشمش کائنات (۳)

(۱) پیام مشرق ۔ ۱۶۶ ۔ (۲) بال جبریل ۔ ۱۳۲ ۔ (۳) اسرار خودی ۔ ۳۵ ۔

ہم سست رو ناپختہ اور بے سمجھ ہیں اور منزل کی راہ میں گرے پڑے ہیں ۔ اس کا بلبل محو ترنم ہے ۔ جو ہمیں سفر پر آمادہ کرتا ہے ۔ تاکہ ہمیں زندگی کے بہشت تک پہنچا دے ۔ اور ہماری زندگی کی قوس مکمل دائرہ بن جائے ۔

اس کی بانگ درا سے قافلے روانہ ہوتے ہیں ۔ اور اس کی لے کی آواز پر سفر جاری رکھتے ہیں ۔ وہ ہماری زندگی کے باغ میں نسیم بن کر آتا ہے ۔ اور لالہ و گل میں آہستگی سے داخل ہو جاتا ہے، اس کے جادو سے زندگی کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے ۔ زندگی اپنا محاسبہ کرتی ہے ۔ اور آگے بڑھنے کے لئے بے تاب ہوتی ہے ۔

عندلیب او نواپرداخت است   حیلہء از بہر ما انداخت است
تا کشد ما را بفردوس حیات   حلقہ کامل شود قوس حیات
کاروانہا از درایش گامزن   درپے آواز نایش گام زن
چوں نسیمش درریاض ما وزد   نرمک اندر لالہ و گل می خزد
از فریب او خود افزازندگی   خود حساب و ناشکیبازندگی (۱)

یعنی کہ :۔

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے   نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو
کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی   گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی (۲)

اقبال کہتے ہیں جو حسن کار فطرت کی تخلیق پر اضافہ کرتا ہے ۔ وہ ہماری نگاہ پر اپنا راز فکر ظاہر کرتا ہے ۔ اگر چہ بحر فطرت کو ہماری ضرورت نہیں لیکن جب ہم اس کے سمندر سے اپنی ندی نکالتے ہیں تو وہ اسے خراج تحسین پیش کرتی ہے ۔ وہ بساط روزگار کے شکن دور کرتا ہے ۔ اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا نقش ہر محبوب کے لئے معیار تصور ہوتا ہے ۔ اس کی حور جنت کی حور سے بہتر ہے اور اس کے لات و منات کا منکر کافر ہے ۔ وہ نئی کائنات تخلیق کرتا ہے وہ قلب کو نئی زندگی عطا کرتا ہے ۔ وہ ایسا سمندر ہے جو اپنی موج سے نبرد آزما ہے ۔ تبھی اس کی موج ہمارے سامنے موتی ڈال دیتی ہے ۔ اس کی ذات کے اندر جو فراوانی ہے، اس کی وجہ سے ہر خالی کو پر کر دینا اس کی شان ہے ۔ اس کی فطرت پاک خوب و ناخوب کا معیار ہے اور اس کی تخلیق خوب و ناخوب کو واضح کرتی ہے ۔ وہ ابراہیم بھی ہے اور آزر بھی ۔ اس کا ہاتھ بت شکن بھی ہے اور بت گر بھی ،

(۱) اسرار خودی ۔ ۳۵ ۔ ۳۶ ۔   (۲) بال جبریل ۔ ۱۳ ۔

گویا کہ وہ حسن کاری کے پرانے معیار کو توڑ کر نئے معیار قائم کرتا ہے۔ وہ ہر پرانی بنیاد کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اور ساری موجودات کو تیز کر دیتا ہے۔

آں ہنر مندے کہ برفطرت فزود ۔۔۔ راز خود را برنگاہ ما کشود
گرچہ بحر او ندارد احتیاج ۔۔۔ می رسد از جوئے ما اوراخراج
چیں رباید از بساط روزگار ۔۔۔ ہر نگارازدست او گیرد عیار
حور او از حور جنت خوشتر است ۔۔۔ منکرلات و مناتش کافر است
آفریند کائنات دیگرے ۔۔۔ قلب را بخشد حیات دیگرے
بحرو موج خویش را برخود زند! ۔۔۔ پیش ما موجش گہری افگند
زاں فراوانی کہ اندر جان اوست ۔۔۔ ہر تہی را پرنمودن شان اوست
فطرت پاکش عیار خوب و زشت ۔۔۔ صنعتش آئینہ دار خوب وزشت
عین ابراہیم و عین آزراست ۔۔۔ دست او ہم بت شکن ہم بت گراست
ہر بنائے کہنہ را بری کند
جملہ موجودات را سوہاں زند (۱)

انسان ایسے آفتاب کا ایک شرر ہے۔ جو سارے عالم کا پروردگار ہے۔ اس لئے انسان اگر کوشش کرے تو اتنی ترقی کر سکتا ہے کہ عروج آدم خاکی سے انجمن سہے جاتے ہیں، کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے۔ یہ اپنے، ہنر میں ایک تازہ کائنات آباد کر سکتا ہے۔

آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں ۔۔۔ خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں (۲)

اقبال کہتے ہیں کہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی فطرت کا جلال و جمال سمجھ گیا کہ ایسی ہستی پیدا ہوگئی ہے، جو ہر ایک چیز پر حاوی ہوگی۔ عشق نے نعرہ بلند کیا کہ ایک خونیں جگر یعنی سخت جانفشاں پیدا ہوگیا ہے۔ حسن شرما گیا کہ صاحب نظر آپہنچا ہے۔ اس سے پہلے کائنات کے ''حسن و جمال'' کا دیدار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ فطرت چیں بجبیں ہوئی کہ اس جہان

(۱) زبور عجم۔ ۱۸۸۔ (۲) بال جبریل۔ ۱۳۳۔

مجبور کی خاک سے ایسی با اختیار ہستی وجود میں آئی جو اپنے آپ کا شعور رکھتی ہے جو اپنے آپ کو توڑ کر نئے سرے سے بنا سکتی ہے۔

آسمان سے شبستان ازل تک یہ خبر پہنچی۔ پردوں میں رہنے والو! ہوشیار ہو جاؤ! پردے چاک کر دینے والا آ گیا ہے۔ آرزو جو آغوش حیات میں اپنے آپ سے بے خبر سوئی تھی۔ اس نے آنکھ کھولی اور ایک نیا جہاں وجود میں آ گیا۔ زندگی نے کہا! میں ساری عمر خاک میں تڑپتی رہی، تب کہیں جا کر اس پرانے گنبد سے راستہ پیدا ہوا۔ یعنی عشق و آرزو انسان میں پیدا ہوئی اور اسی کے بل بوتے پر آسمان چیر گیا نالہ ء بے باک مرا۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد　　حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور　　خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستان ازل　　حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش ماغوش حیات　　چشم وا کرد و جہان دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ درخاک تپیدن ہمہ عمر　　تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد　(۱)

اقبال آدم کی اس قدر حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اگر وہ حرکت و عمل اور جدوجہد سے کام لیتا رہے تو اتنی ترقی کر سکتا ہے کہ سورج و چاند ستارے بھی اس کے مرہون منت ہو کر اس سے کسب ضیا کرنے لگیں اور فطرت جسے جان رسکن فن کا اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیتا ہے۔ وہ بھی انسان کے معجزۂ ہنر کے سامنے ہیچ دکھائی دے۔

خورشید کرے کسب ضیا تیرے شرر سے!　　ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے!
دریا متلاطم ہوں تری موج گہر سے!　　شرمندہ ہو فطرت ترے اعجاز ہنر سے!　(۲)

اس لئے کہ اقبال بڑے وثوق سے کہتے ہیں:۔

فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہنر مند　　شام اس کی ہے مانند سحر صاحب پر تو!
وہ صاحب فن چاہے تو فن کی برکت سے　　ٹپکے بدن مہر سے شبنم کی طرح ضو!　(۳)

فطرت پر حسن کار کی حسن کاری کے طفیل حسن فطرت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ فطرت میں سونا تو ہے مگر اس پر

(۱) پیام مشرق۔ ۸۵۔ ''تسخیر فطرت''۔　(۲) ضرب کلیم۔ ۱۲۲۔ ''جدت''۔　(۳) جاوید نامہ۔ ۱۳۱۔

سہاگے کا کام ''حسن کار'' کے مرہون منت ہے ۔ اس لئے اقبال فن کو فطرت پر ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر انسان محنت و ریاضت کرے تو روحانی حسن کاری کے بھی اس عظیم درجے پر فائز ہوسکتا ہے ۔ کہ خدا بندے سے خد پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے ۔ اب وہ زمانے اور فطرت کی باگیں بھی اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے ۔ چنانچہ اقبال خوب کہتے ہیں کہ اگر تو اپنے اندر نقش ہنر رکھتا ہے ۔ تو جہان کو شکار کر ۔ تقدیر بھی تیری تدبیر کے مطابق راستہ اختیار کرے گی ۔ عصر حاضر تجھ سے نبرد آزمائی چاہتا ہے ۔ اس کا فر پر اللہ تعالیٰ کا نقش ثبت کر دے ۔

نقش حق داری ؟ جہاں نخچیر تست　　　هم عناں تقدیر با تدبیر تست
عصر حاضر باتومی جوید ستیز　　　نقش حق بر لوح ایں کافر بریز! (۱)

اقبال کے نزدیک وہی فنون لطیفہ قوم کو حیات دوام عطا کرتے ہیں جو حفظ خودی کے ضامن ہوں ۔ اس لیے کہ زندگی کا دارومدار خودی پر ہوتا ہے ۔ اگر فنون لطیفہ خودی کے محافظ نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مہلک ہوتے ہوئے قوم کے لیے پیغام اجل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ادب اور فنون خودی سے ہرگز عاری نہ ہوں ۔ ورنہ رسوائی و ہلاکت ناگزیر ہے ۔

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات　　　نہ کرسکیں تو سراپا فسون و افسانہ!
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی　　　خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ! (۲)

مطلب یہ کہ:

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر　　　وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود (۳)

نہ صرف ہنر بلکہ اقبال ہر اس عمل کے خلاف ہیں جس میں خودی کی موت ہو ۔ خودی ان کے نزدیک بہت ہی گراں قدر اور بیش بہا متاع ہے ۔ میرے خیال میں اقبال خودی کو روح کی روح سمجھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسی سروری کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں ۔ جس میں خودی کے مٹنے کا اندیشہ ہو ۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن　　　خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

اس لیے کہ:

(۱) جاوید نامہ ۔ ۱۳۱ ۔　　(۲) ضرب کلیم ۔ ۱۰۰ ۔　　(۳) ضرب کلیم ۔ ۱۱۴ ۔

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ　　خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ!　(۱)

اور جہاں تک مسلمان کے بدن کے اندر آبِ زمزم کے چشمے کا تعلق ہے تو:

بخاکِ مادلے ، در دل غمے ہست　　ہنوزایں کہنہ شاخ را نمے ہست

بہ افسون ہنر آں چشمہ بکشاے　　درونِ ہر مسلماں زمزمے ہست!　(۲)

ٹھیک ہے آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر، لیکن اس فنا کے باوجود بقا میں آنا سیکھ۔ اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کرنا سیکھ۔ میرے نغمے کے سمندر میں اپنی کشتیء جان ڈال کر میرے طوفان کے اندر موتی کی مانند آرام پانا سیکھ۔

بایں نابود مندی بودن آموز　　بہائے خویش را افزودن آموز

بیفت اندر محیطِ نغمہء من　　بطوفانم چو در آسودن آموز!　(۳)

زندگی کے دوسرے میدانوں کی طرح اقبال فنون لطیفہ کو بھی دین کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ دین اخلاقیات کا سرچشمہ ہے۔ اور ''اقبال کے ذوقِ جمال'' و'' حسن کاری'' میں اخلاقیات بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں　　اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!　(۴)

شاعرانہ حسن کاری میں اقبال ایسی پرزور و بلند پرواز آواز کے حامل ہیں جو آسمانوں کے دوسری طرف نکل جائے۔ ان کا اپنا کلام اس معیار کا عملی ثبوت ہے۔

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک　　تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی!　(۵)

مرے گلو میں ہے اک نغمہء جبرئیل آشوب　　سنبھال کر جسے رکھا ہے لا مکاں کے لیے　(۶)

اقبال کے سامنے فن کاری و حسن کاری کے جلیل القدر مقاصد ہیں۔ جنھیں ظاہر کرتے ہوئے وہ فکر و نظر کی باکمال و بے مثال بلندیوں تک جا پہنچتے ہیں۔ انھی بلندیوں و عظمتوں کی بنا پر اقبال بجا طور سے محسوس کرتے ہیں کہ ہنر کا مقصد نہ صرف حیات ابدی بلکہ ''سوز حیات ابدی'' ہے۔ اس لیے کہ اسی سوز حیات میں انسانی زندگی کی فلاح و بقا اور اصلاح و ارتقاء کے علاوہ کیف و سرور کا بے پناہ نور شامل ہے۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن　　جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

(۱) بال جبریل۔ ۴۸۔　(۲) ارمغان حجاز۔ ۸۲۔　(۳) ایضاً۔ ۱۳۶۔

(۴) بانگِ درا۔ ۲۴۸۔　(۵) بال جبریل۔ ۱۹۔　(۶) بال جبریل۔ ۵۰۔

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا!
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرہ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا! (۱)

گویا کہ اقبال فن کے بارے میں افادی نقطہ نظر کے پرزور حامی ہیں ۔ اس لیے کہ وہ بنیادی طور پر ''انقلابی حسن کار'' ہیں اور انقلابی حسن کاری کی ولولہ انگیز و پرجوش گھن گرج ہنروری اور ہنروروں سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو (۲)

ایسا فن جو انسانیت اور قوم و ملت کے لیے نقصان دہ ہو اقبال کے نزدیک اس کا انجام بھی کھیت کے ہر اس خوشہ گندم کا سا ہونا چاہیے، جس سے کسان کو روزی میسر نہ ہو۔

''شعر عجم'' کے عنوان سے نظم لکھتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ عجمی شاعری بظاہر بڑی دلآویز ہے لیکن اس سے خودی کی تلوار تیز نہیں ہوتی ۔ ایسی شاعری کی مثال یوں ہے، جیسے صبح سویرے کوئی پرندہ ایسا نغمہ گائے جو سارے چمن میں مایوسی و افسردگی پھیلا دے ۔ اگر کسی مرغ چمن کی صدا کے نتیجے میں تروتازگی کی بجائے نہال چمن کو سانپ سونگھ جائے تو بہتر یہی ہے کہ وہ مرغ سحر خیز خاموش ہی رہے ۔ اسی طرح جس ضرب سے ظلم و جبر کا خاتمہ نہ ہو، وہ ضرب بھی بیکار ہے۔ جو بھی کام یا ہنر ہو مثبت نتائج کا حامل ہونا چاہیے ۔ یہی اقبال کا ذوق حسن کاری ہے ۔

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دلآویز — اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں — بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے — جس سے متزلزل نہ ہوئی دولت پرویز
اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ — از ہرچہ بآئینہ نمایند بہ پرہیز! (۳)

اقبال کی ''حسن کاری'' کو جہاں سے بھی دیکھیں اس میں عزم و ہمت، قوت و جبروت اور جلال و جمال کا شاندار و پروقار معیار ملتا ہے ۔ قدم قدم پر دریاؤں کے دل دہلتے اور گل و گلزار کھلتے دکھائی دیتے ہیں ۔ خوں چکیدہ زخم سلتے اور مایوسی و ناامیدی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھٹکے ہوئے راہی منزل مقصود سے گلے ملتے نظر آتے ہیں ۔ جن کے گلے میں رنگ برنگ پھولوں اور موتیوں کی دیدہ زیب و مسحور کن مالائیں، لبوں پہ حوصلہ افزا صدائیں اور ایسی بے باک نگاہیں ہیں جو شاعر کو صور

(۱) ضرب کلیم ۔ ۱۱۸۔ (۲) بال جبریل ۔ ۱۱۰۔ ''لینن خدا کے حضور'' ۔ (۳) ضرب کلیم ۔ ۱۲۸۔

سرافیل پھونکنے کی جراءت عطا کرتے ہوئے، ایسی نغمہ آرائی پر اکساتی ہیں جس کے اثر سے غلاموں کی مضمحل خودی میں شمشیر و سناں کی تیزی پیدا ہوجائے۔ ان کے رگ و پے میں حرکت و عمل کی ایسی برقی رو دوڑ اٹھے کہ وہ اٹھ کر بڑی بڑی سلطنتوں کے تختے الٹ دیں۔

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے! شاعر! ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے!
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے!
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے!
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے (۱)

جیسا کہ اقبال ضروری میں ضرب کلیمی پر یقین رکھتے ہیں۔ اس لیے زیادہ تر ان کا زور ''قوت جلالی'' پر ہوتا ہے مگر ان کے نزدیک ''حسن کاری'' میں جلالی و جمالی دونوں قوتیں انتہائی اہم ہیں۔ اکثر ناقدین یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقبال، نطشے کی طرح صرف قوت ہی کو سرچشمہ حیات سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ علامہ کے نزدیک جلال، حسن کی صفت ہونے کی بنا پر زندگی کے لیے لازم وملزوم ہے۔ لیکن اقبال کا انسان کامل نطشے ہرگز نہیں بلکہ حضورؐ کی ذات پاک اقبال کے لیے انسان کامل ہے۔ ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست، بحر و بر در گوشہ دامان اوست، اقبال نے کس کی شان اقدس میں کہا ہے۔ پھر آپ کو رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس لیے خود اللہ تعالیٰ بھی غفور رحیم ہے۔ یہ حقیقت بھی اقبال کے دلنشین تھی۔ اس لیے وہ دلبری و جمال کو فراموش نہیں کرتے۔ جبکہ نطشے صرف قاہری کا پرچار کرتا ہے۔ اور اقبال دلبری و قاہری دونوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ دلبری و جمال کی طرف ان کا جھکاؤ زیادہ ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں زندہ رود، حلاج سے پوچھتے ہیں کہ، اللہ تعالیٰ کے نقش کو دنیا میں ثبت کیا گیا ہے۔ مگر میں نہیں جانتا کہ اسے کیسے ثبت کیا گیا ہے؟

نقش حق را در جہاں انداختند من نمی دانم چساں انداختند؟

جواب دراصل زندہ رود ہی کا ہے مگر حلاج کی زبانی کہتے ہیں کہ یا اسے دلبری کے زور سے ثبت کیا گیا ہے۔ یا قاہری کے زور سے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی شان دلبری یعنی جمال و رحمت میں زیادہ واضح ہوتی ہے اس لیے دلبری قاہری سے اونچا مقام رکھتی ہے۔

(۱) ضرب کلیم۔ ۱۲۷۔ ''شاعر''۔

یا بزور دلبری انداختند یابزور قاہری انداختند!
زانکہ حق دردلبری پیدا تر است دلبری از قاہری اولیٰ تراست! (۱)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے ہاں:

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر زانفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک (۲)

بہر حال اقبال کی ''حسن کاری'' کے مجموعی مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ دلبری و قاہری یا جلال و جمال دونوں ہی کو ضروری سمجھتے ہیں ۔ دونوں کے باہمی شیر وشکر ہونے سے جلیل وجمیل کا مقصد حاصل ہوسکتا ہے ۔ درحقیقت ہوحلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ، رزم حق و باطل ہوتو فولاد ہے مومن کے مصداق اگر مخالف اور متصادم قوتیں محو پیکار ہوں تو ہنر کو ضرب کلیمی ، یا صور اسرافیلی گویا قوت جلالی کا

گر ہو جنگ تو شیران غاب سے بڑھ کر اگر ہو صلح تو رعنا غزال تا تاری! (۳)

مظاہرہ کرنا چاہئے ۔ البتہ امن و سلامتی کی صورت حال میں ''حسن کاری'' کو شان جمالی یعنی '' نغمہ جبرئیل'' کی لے اپنانی چاہئے۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن یہ نکتہ ہے تاریخ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے یا نغمہ جبریل ہے یا بانگ سرافیل (۴)

اقبال کی حسن کاری و جلال کاری میں ایسی ایسی بجلیاں اور گل گلزار کی خوشبوئیں پائی جاتی ہیں کہ دل و دماغ معطر اور رگ و پے میں خون کا سمندر پر جوش ہو کر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے ۔ لہٰذا اس دعوے میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں کہ:۔

یوں داد سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس یہ کافر ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز! (۵)

اس طرح اقبال کے نزدیک وہ شاعری قابل افسوس ہے جو قوموں کے مزار بنا کر ان پر آشکباری اور آہ وزاری کرے ۔ وہ ایسی شاعری کے دلداہ ہیں جو قوموں کو موت کی ابدی نیند سلانے کی بجائے انہیں حیات دوام سے سرفراز کرے ۔ اقبال ''حسن کاری'' کو انسانیت کا غمگسار قرار دیتے ہیں ۔ ان کے نزدیک ہنر مندی زخمی انسانیت کے لئے مرہم پٹی کا درجہ رکھتی ہے ۔ ورنہ کوئی بھی فن اپنے مطلوبہ مقام پر فائز نہیں ہوسکتا ۔ شاعری یا سخنوری ہی کو لے لیں ، شاعری جب تک سارے

(۱) جاوید نامہ ۔ ۱۳۱۔ (۲) ضرب کلیم ۔ ۱۲۳۔ (۳) ضرب کلیم ۔ ۱۷۱۔
(۴) ضرب کلیم ۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳ (۵) بال جبریل ۔ ۲۷۔

جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے کے مصداق انسانیت کے دکھ درد کی اکسیر نہیں بنتی اس وقت تک ''جزو پیغمبری'' اور ''تلمیذ الرحمٰن'' کے اعلیٰ و ارفع درجے کی مستحق نہیں ہوسکتی۔

درغم دیگر بسوز و دیگراں راہم بسوز — گفتمت روشن حدیثے ، گوتوانی دارگوش

کہہ گئے ہیں شاعری جز ویست از پیغمبری — ہاں سنا دے محفل ملت کو پیغام سروش

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے — زندہ کر دے دل کو سوز جوہر گفتار سے (۱)

عقل کھدر کو اطلس بنا دیتی ہے۔ اس کا کمال پتھر کو آئینے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لیکن شاعر جادو نگار کا گیت ، زندگی کے زہر کو شہد بنا دیتا ہے۔ جو کہ بہت بڑی عبادت بھی ہے۔

خرد کر پاس را زرینہ سازد — کمالش سنگ را آئینہ سازد

نوائے شاعر جادو نگارے — زنیش زندگی نوشینہ سازد (۲)

اقبال کی حسن کاری جبر و استبداد کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں عدل و انصاف اور ہمدردی و غمگساری کی نورانی قوس قزح ہے۔ وہ ،کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا ، کے مصداق مایوسی و ناامیدی کے خلاف ، انسانیت کے ہاتھ میں عزم و استقلال اور امید و یقین کا بلند و بالا علم تھما دیتے ہیں۔ جسے دنیا کی کوئی طاقت سرنگوں نہیں کرسکتی۔ اقبال مظلوموں و بے کسوں کو اپنی قسمت پر چپکے چپکے آنسو بہانے کی بجائے ظالم کے خلاف کمر بستہ ہوکر اٹھ کھڑے ہونے کا جراءت آموز پیغام دیتے ہیں۔ ان کی حسن کاری میں جلال و جمال کا ایسا جلیل و جمیل آمیزہ ہے۔ جس میں بجلی کی کڑک اور حسن و جمال کی مسحور کن جھلک پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی حسن کاری میں چودھویں کے چاند کی نکھری ہوئی خنک چاندنی اور آفتاب یوم نشور کی تمازت بھی پائی جاتی ہے۔ جس کے اثر سے مردوں کی رگوں میں بھی زندگی کی ہلچل مچلنے لگتی ہے۔ انہوں نے اپنے نغمے کی صورت میں ایسا صور پھونکا ہے۔ جس کے اثر سے قوموں کا منجمد خون گرم ہوکر دوڑنے لگتا ہے۔ اس طرح اقبال کو امنگوں ، آرزوؤں ، امیدوں ، جراءتوں ، حوصلوں اور ولولوں کا پیامبر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ تدرو کو بھی شاہین بنا دیتے ہیں۔ اور ممولے کو شہباز سے لڑا دیتے ہیں۔ یہ اقبال ہی کی حسن کاری کا کمال لازوال ہے کہ کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا کر دیتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک شاعر کا سب سے بڑا کارنامہ اور فرض اولین یہی ہے کہ کمزوروں کو نطشے

(۱) بانگِ درا ۔ ۱۸۹ ۔ شمع اور شاعر۔ (۲) پیام مشرق ۔ ۷۳۔

کی طرح ''دبایا'' نہ جائے بلکہ انہیں زندگی کی ولولہ انگیز قوت اور ناقابل تسخیر عزم و ہمت کے ساتھ ''جگایا'' جائے ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ اقبال چڑھتے سورج کے پجاری ہرگز نہیں ، بلکہ وہ غریبوں ، دردمندوں اور کمزوروں کے مسیحا ہیں ۔

صفت ماہے تمامے کہ گذشت برستارہ   بشکوہ بے نیازی زخدائیگاں گذشتم

یہی وجہ ہے کہ اقبال اللہ تعالیٰ کے جلال کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ میرے دل میں اس آرزو کے علاوہ کوئی تمنا نہیں کہ تو کبوتروں کو عقابی شان و قوت اور رعب و دبدبہ عطا کر دے ۔ کبوتروں کی طرح کمزور دل اور بے پروبال غلاموں کے دل میں وہ قوت اور بلند پروازی پیدا ہو جائے کہ آسمانوں کی رفعتوں اور عظمتوں کو تہ و بالا کر دیں ۔

بجلال تو کہ دردل دگر آرزوندارم   بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوترا ں عقابی! (۱)

اقبال ایک موحد حسن کار ہیں ۔ اس لئے ان کا ہر حسن پارہ اپنے اندر دعائیہ رنگ لئے ہوئے ہے ۔ اقبال دعا اور عبادت میں کوئی فرق نہیں کرتے ۔ خطبات میں لکھتے ہیں کہ نماز بھی دراصل دعا ہی ہے ۔ بہر حال ان کی ''جمال داری'' اور ''جلال داری'' اخلاقیات کے نورانی ہالے سے باہر نہیں جاتی ، اسی لئے عظیم ''حسن کاری'' کا مقام حاصل کرتے ہوئے تابندہ و پائندہ ہے ۔ بلکہ میں یہ بھی کہوں گا کہ زندہ رود کی شاعری واقعی زندہ رود و زندہ سرود ہے ۔ اس لئے کہ زندہ رود صاحب سوز و سرود ہے اور باہماں سوزے کہ در ساز و بجاں ، یک دو حرف از ما بہ کاویری رساں ______ در جہاں تو زندہ رود او زندہ رود ، خوشتر ک آید سرود اندر سرود ۔

اقبال ایمان و یقین کا ''حسن کار'' ہے ۔ اس کے گلزار میں ہر وقت بہار ہے ۔ وہ دنیاوی سازوسامان اور جاہ و جلال کے نہ دلدادہ ہیں اور نہ اس پر یقین رکھتے ہیں ۔ بلکہ اس قسم کی سوچ رکھنے والوں کے لئے کہتے ہیں، میری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے ۔ یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند ، بہار ہو کہ خزاں لاالہ الا اللہ ۔ اور ، آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا ، آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا ، جیسی ''نوائے شوق'' سے شور حریم ذات میں اور غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں ____ کیوں کر نہ ہو ____ تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا ، میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں ، سے لے کر عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ، کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے ، عروج خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے ، زمیں

(۱) زبور عجم ۔ ۴۱ ۔

از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے

درد دشت جنون من جبریل زبوں صیدے

یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

تک انسانی عظمتوں کی جلیل و جمیل داستان فقط اقبال ہی کی ''حسن کاری'' کا کرشمہ ہوسکتا ہے جس میں دلبری و قاہری کا پرشکوہ امتزاج ملتا ہے ۔ وہ ماضی کی شاندار بنیادوں پر مستقبل کی باوقار عمارت تعمیر کرتے ہیں ۔ وہ آنسو کی موتی سے تعبیر کرتے ہیں ۔ کسی کی تقلید ان کے نزدیک حسن کاری اور حیات امم کے لئے سم قاتل ہے ۔ اس لئے اقبال ہمہ وقت جدت طرازی اور اجتہادفکر ونظر کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں ۔ وہ گھاس کو چنبیلی میں تبدیل کر سکتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ،دمے درخویشتن خلوت گزیدم ، جہانے لازوالے آفریدم اور چوب ہر نخل کہ منبر نہ شود دارکنم کے مصداق ، اقبال ہمارے پتھر کو اپنی شاعری وحسن کاری کی پگھلا دینے والی آنچ میں ڈال کر شیشہ بنا دیتے ہیں اور سکندر فطرتم ، آئینہ سازم جیسا دعویٰ کرنے کا بجا حق رکھتے ہیں ۔ وہ بوڑھے آسمان کو نیا نظام عطا کرتے ہیں اور اس کے پرانے ستاروں کا جنازہ نکال دیتے ہیں ۔

نظام تازہ بچرخ دو رنگ می بخشند ستارہ ہائے کہن را جنازہ بردوشند! (۱)

اقبال ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے بیدار کرتے ہوئے زندگی کی سختی و مشکلات کے مقابلے کی خاطر یہ کہتے ہیں، جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہونظر ، تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ اس لئے کہ فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ ۔ ان کے نزدیک وہی شاعری اور ''حسن کاری'' حقیقی ہے جو شیشے کو پتھر سے ٹکرا کر پتھر کو پاش پاش کر دے ۔ وہ اسی فن کو قابل احترام سمجھتے ہیں جو فطرت پر فوقیت رکھتا ہو اور تسخیر فطرت کی صلاحیت سے مزین ہو۔

اقبال حسن کاری میں ''اصلاحی وفلاحی'' مطمح نظر رکھتے ہیں ۔ اور اپنی شاعری میں اسے بدرجہ اتم برتتے بھی ہیں ۔ وہ حسن کار سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ قوم وملت کی بے اعتدالیوں و بیماریوں کے لئے اپنی حسن کاری کی صورت میں ایسی دوا پیش کرے کہ ''خاک را اکسیر کرد'' کا عملی ثبوت مل جائے ۔ اسی لئے تو اقبال سولن کی طرح ، نہ صرف چھینا ہوا جزیرہ واپس لینے کی آواز بلند کرتے ہیں ، بلکہ کھویا ہوا ایمان اور غصب شدہ آزادی بھی واپس دلاتے ہیں ۔ آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے ، کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے، ایماں کی آزمائش کے ساتھ ساتھ اقبال کی حسن کاری میں ''ذوق یقیں'' کے

(۱) زبور عجم ۔ ۱۲۱۔

بل بوتے پر کٹتی اور ٹوٹتی زنجیروں کی جھنکار بھی صاف سنائی دیتی ہے۔

لاریب اقبال نے اپنی حسن کاری ، فن کاری یا دیدہ وری میں ایسا دیدہ ور ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ واقعی ہزاروں سال بعد ایسا دیدہ ور کہیں پیدا ہوتا ہے۔ اقبال کی حسن کاری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ:۔

مرا زیں شاعری خود عار نآید　　　　که در صد قرن یک عطار نآید

تو عین انصاف ہوگا۔ انسانیت کے لئے اقبال کی حسن کاری مونس وغم خوار ہے۔ اسی لئے انہوں نے زندگی کے زہر کو شہد بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کی نظر ہر وقت اس نکتے پر مرکوز رہتی ہے کہ آدمیت احترام آدمی، باخبر شو از مقام آدمی ۔یہی اقبال کے ہاں ''حسن کاری'' کا مقصود ومنتہا ہے۔ اسی لئے تو شاعری جزویست از پیغمبری۔ اقبال کے مے خانہ حسن کاری میں وہ شراب کہن ہے جو پیالے کی خاک میں بھی جان ڈال دیتی ہے۔ چنانچہ ان کا دعویٰ بجا ہے کہ اگر تو شاخ لالہ کی آبیاری میری صراحی سے کرے تو وہ قد آدم تک بڑھ جائے۔ یعنی گل لالہ میں بھی انسانی اوصاف پیدا ہو جائیں۔ یہی وہ ''حسن کاری'' ہے کہ جس کی تاثیر سے شجر وحجر بھی کلام کرنے لگتے ہیں۔

بیا از من بگیر آں دیر سالہ　　　　کہ بخشد روح باخاکِ پیالہ!

اگر آبش دہی از شیشۂ من　　　　قد آدم بروید شاخ لالہ!　(۱)

اقبال مزید کہتے ہیں کہ میں علم وفن کے نکتے نہیں جانتا۔ مگر میں نے شاعری کو نیا مقام عطا کیا ہے۔ میرے سوز و سرور سے قافلے کے پیران کہن بھی تیز رفتار ہوگئے ہیں۔ بے شک اقبال کی حسن کاری میں بے پناہ قوت اور طاقت پرواز پائی جاتی ہے۔ وہ نوجوان شاہین بچوں کو تو بال و پر دیتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ کاروان ملت کے بوڑھوں کی رگوں میں بھی جوانی کا تیز رو گرم خون دوڑنے لگتا ہے۔

ندانم نکتہ ہائے علم و فن را　　　　مقامے دیگرے دادم سخن را

میان کارواں سوز و سرورم　　　　سبک پے کرد پیران کہن را!　(۲)

انسانیت کا احترام ، اس کی اشک شوئی اور اسے جبر و استبداد سے چھڑانے کی خاطر نغمہ جبرئیل اور سوز سرافیل کے ساتھ ساتھ نعرۂ تکبیر بلند کرنا دراصل اقبال کی کلیمی ہے۔ اسی لئے ''حسن کاری'' میں اپنا معیار وشعار یہ رکھتے ہیں کہ جو ضرب

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۱۳۲۔　　(۲) ایضاً ۔ ۱۳۵۔

کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا۔ اور ضرب کلیمی ہمیشہ انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر لگائی جاتی ہے۔ جابر و ظالم کے سامنے ڈٹ کر غیر متزلزل رہنا ضرب کلیمی ہے۔ اور سنگ راہ سے ہزار چشمے جاری کر دینا ہی اقبال کی ''حسن کاری'' ہے۔ جس میں راہ راست سے بھٹکی ہوئی انسانیت و امت کو راہ راست پر لا کر صراط مستقیم پر ڈالنے کے بعد وسعت افلاک میں محو پرواز کر دینے کی تیاری ہے۔ اقبال کی نوا وہ باد بہاری ہے جو پھولوں، کلیوں اور غنچوں کا سینہ کھول دیتی ہے۔ اسی لئے، میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ، کہ میں ہوں محرم راز دورن مے خانہ کہتے ہوئے اقبال اپنے سوز نفس سے اس وقت کے معاملات درست کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ تا کہ ہم زندگی کا کھیل مردانہ وار کھیل سکیں۔ اور شہر کی مسجد میں اس طرح سے نالہ وفریاد کریں کہ ملا کے سینے میں پتھر جیسا سخت دل بھی گداز ہو جائے۔

بیا تا کار ایں امت بسازیم قمار زندگی مردانہ بازیم! (۱)
چناں نالیم اندر مسجد شہر کہ دل درسینۂ ملا گدازیم!

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں لرز جاتا ہے آواز اذاں سے! (۲)

اقبال کا مقصد شاعری برائے شاعری نہیں، بلکہ وہ اپنی شاعری سے پیغمبرانہ معجزے کے خواہاں ہیں۔ اس لئے انہوں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ ان کے پیش نظر جو مقاصد جلیلہ و جمیلہ تھے۔، ان کی روشنی میں اقبال کو ایک عام شاعر کہنا جائز بھی نہیں۔ اس لئے کہ اس پست ہمت شخص سے بھلائی کی کوئی امید نہیں، جس نے ان پر شعر وسخن کی تہمت لگائی۔

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست . کہ برمن تہمت شعر و سخن بست (۳)

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اقبال شاعر نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال ایسے شاعر نہیں جن کے اعصاب پہ عورت سوار رہے۔ اور ہجر و فراق کے مجازی مضامین باندھ کر رات دن روتے رہیں۔

من اے میر امم داد از تو می خواہم مرا یاراں غزلخوانے شمردند

چونکہ اقبال کو زندگی کا راز سکھایا گیا ہے، اس لئے ان کے پیکر میں ''آتش عشق'' روشن کی گئی ہے۔ اقبال کے معیار کے مطابق عشق کے بغیر ''حسن کاری'' نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ اقبال سینے کو روشن کر دینے والی نوا کے ساتھ ساتھ عشق کے لئے عہد شباب بھی واپس لائے ہیں۔

(۱) ارمغان حجاز۔ ۱۳۹۔ (۲) بانگ درا۔ ۹۹۔ غزل۔ (۳) زبور عجم۔ ۱۳۶۔

تامرا رمز حیات آموختند آتشے درپیکرم افروختند

یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام عشق را عہد شباب آوردہ ام (۱)

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ! (۲)

شاعری سے وہ ارفع و اعلی مقاصد کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ اقبال ایسی معجزاتی حسن کاری کے دلدادہ ہیں جو ''بت گری'' سے ممانعت کرنے کے علاوہ ''بت شکن'' بھی ہو ۔ اسی لئے اقبال کی شاعری بت گری نہیں بلکہ آدم گری کی صفات سے متصف ہے ۔اور

شعر را مقصود اگر آدم گری است شاعری ہم وارث پیغمبری است

اقبال ہرگز پیغمبر نہیں ، بلکہ وہ اپنے آپ کو پیغمبروں کی خاک پاسے بھی کم تر سمجھتے ہیں ۔لیکن یہ ضرور ہے کہ پیغمبروں کی خاص نظر اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا رہنے کے صدقے اقبال کی حسن کاری الہامی و وجدانی کیفیات سے مالا مال ہو کر باکمال و لازوال ہوگئی ۔ اس طرح اقبال پیغمبر نہیں مگر ''قلندر'' ضرور ہیں ۔

بیا بمجلس اقبال ویک دو ساغر کش اگر چہ سر نتراشد قلندری داند

وہ رخ معنی سے نقاب اٹھا کر ذرے کے ہاتھ میں آفتاب تھما دیتے ہیں ۔ سازِ سخن کے پردے میں اقبال نے وہی فریضہ سرانجام دیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے لیکر آنحضورؐ تک مختلف انبیا کرام نے اپنی امتوں کو ودیعت فرمایا تھا ۔ اقبال کو اس بات پر فخر ہے کہ آپؐ کے ایک سچے امتی کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر گئے ۔

ناقہء ما ختہ و محمل گراں تلخ تر باید نوائے سارباں (۳)

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہ ء بے زمام را (۴)

(۱) پیام مشرق ۔ ۱۶۔ (۲) بانگ درا ۔۱۹۴۔ ''شمع اور شاعر'' (۳) جاوید نامہ ۔۸۲۔ (۴) زبور عجم ۔ ۵۵۔

باب پنجم
"نتائج"

نتائج

اس آخری باب میں ہم اقبال کے "ذوق جمال" کا مجموعی جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ حسن وفن کا فلسفہ جمالیات (AESTHETICS) کہلاتا ہے۔اور جلال بھی جمال کی لازمی صفت ہے۔ علاوہ ازیں کسی پوشیدہ راز کو معلوم کرنا بھی جمالیات کے زمرے میں آتا ہے۔حسن کو مجسم انداز میں پیش کرنے کو آج تک مروجہ انداز میں فنکاری کہتے ہیں۔لیکن چونکہ فن کے اندر حسن پیش کیا جاتا ہے اس لئے راقم الحروف اس عمل کو فن کاری کی بجائے "حسن کاری" اور فن پارے کی جگہ "حسن پارہ" کی اصطلاح اختراع کرتے ہوئے اسی مناسبت سے فنکار کو "حسن کار" کا نام دینا زیادہ بہتر خیال کرتا ہے۔

اقبال کے ذوق جمال پر بات کرتے ہوئے خلاصۂ اقبال کی اردو فارسی "حسن کاری" سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ "فلسفہ جمالیات" عالم محسوسات وموجودات تک محدود ہے۔اس لئے "تجزیاتی" یا "معروضی" فلسفے کی رو سے جو کچھ ظاہر ہے وہی حقیقت ہے اور موضوعی یا عینی فلسفہ ظاہر کو دھوکہ اور اعیان کا عکس قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ فلسفے کے مطابق جمالیات صرف مجاز تک محدود ہیں۔مجاز سے آگے نہ جمال ہے نہ جلال۔

لیکن "ذوق وشوق" یا "عشق" کی رو سے مجاز سے آگے ہی جلال و جمال کا سرچشمہ ہے۔"جلال و جمال" کا یہی منبع ایک مخفی راز ہے جو "فلسفیانہ جمالیات" نہیں بلکہ "عاشقانہ جمالیات" کے ضمن میں آتا ہے۔اسے معلوم کرنا فلسفے کے جی کا روگ نہیں بلکہ "قوت عشق" کے ذریعے "جلال و جمال" کے اس "لازوال و باکمال" نورانی سرچشمے تک رسائی ممکن ہے۔ اس بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:۔

> فلسفہء جمالیات ایک "نظریہ" ہے جبکہ ذوق جمالیات نظریہ نہیں بلکہ
> عشق ہے۔فلسفہء جمالیات مجاز یعنی موجودات ومحسوسات تک
> محدود ہے۔اور ذوق جمالیات مظاہر سے ہوتا ہوا، "حسن ازل" تک
> جا پہنچتا ہے۔

اقبال چونکہ اپنے آپ کو فلسفے تک پابند سلاسل نہیں رکھتے، وہ منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے "نظریے" سے

''ذوق وشوق'' کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں ، اسی لئے زیرِ نظر مقالے کو'' اقبال کا ذوق جمال'' جیسے عنوان سے مزین کرتے ہوئے جمالیات میں ان کے قلب ونظر کا تعین کیا گیا ہے ۔

ایستھیٹکس کا لفظ تاریخ جمالیات میں سب سے پہلے بام گارٹن نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ۱۷۳۲ء کو استعمال کیا ۔ جسے اس نے یونانی لفظ ایستھیس سے وضع کیا ۔ ایستھیس کے معنی ادراک حسن کے ہیں ۔ چونکہ فلسفہ جمالیات سے ادراک حسی مراد لیتا ہے ۔ اس لئے پہلے ہم محسوسات وموجودات کے حوالے سے تخلیق کائنات پر بات کرتے ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری ظاہری آنکھوں کے سامنے قدرت کا جتنا جلال و جمال بکھرا ہوا ہے ، وہ موجودات اور مظاہر ہی کی صورت میں دکھائی دیتا ہے ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تخلیق کائنات کی ایسی منظم ترتیب و ترکیب کیسے معرض وجود میں آئی ، جس میں ہمارے ادراک وفہم سے بڑھ کر اعلیٰ درجے کی ''حسن کاری'' سے کام لیا گیا ہے ۔ یہ حسن کاری ، حسن درحسن کے جلال و جمال سے معمور و پرنور ہوتے ہوئے نظر افروز و دل فروز ہے ۔ جس کی بناء پر ساری کائنات جلال و جمال کا ایک دلکش و دیدہ زیب مرقع ہے ۔ اسی دلکشی کی بناء پر کائنات کے حسن نے مختلف ادوار میں بے شمار مفکرین کو اپنی طرف متوجہ کیا جنہوں نے اس ''جلالی و جمالی'' کائنات کی تخلیق اور اجزائے ترکیبی کے بارے میں کبھی حقائق بیان کئے اور کبھی محض مفروضوں اور اندازوں سے کائنات کے معرض وجود میں آنے سے متعلق اظہار خیال کیا ۔ تاریخ میں دستیاب معلومات کی روشنی میں یونانیوں نے سب سے پہلے ''تخلیق کائنات'' پر غور وخوض کیا ۔

'' آیونیا'' اور'' ایلیا'' کے مفکرین اس ضمن میں ہراول دستے کا مقام رکھتے ہیں ۔ سب سے پہلے مصر ، بابل اور یونان میں اساطیری خداؤں کے عام تصور نے یہ عقیدہ پختہ کر دیا کہ کائنات دیوتاؤں کی تخلیق ہے ۔ لیکن ''آیونائی'' مفکر تھیلیز (Thales) نے سوچا کہ کائنات ایک کل ہے ۔ یہ کسی ایک ہی عنصر سے بنی ہے ۔ اس کی علت ''پانی'' ہو سکتی ہے ۔ یعنی تھیلیز پانی کو کائنات کا بنیادی عنصر قرار دیتا ہے ۔ اس طرح اس کے فلسفے میں وحدت الوجود کا عکس دکھائی دیتا ہے ۔ یہ اور بات کہ خود تھیلیز کو اس وقت وحدت الوجود کا احساس نہ ہوگا ۔

اس کے بعد'' آیونیا'' ہی کے فلسفی انیکسمنڈر (Anaximander) نے کہا کہ تخلیق کائنات لامحدود مادہ سے ہوئی ہے ۔ اس نے نظریہ ارتقا بھی پیش کیا ، یعنی پہلے نچلے درجے کی مخلوقات معرض وجود میں آئیں اور پھر ان سے اعلیٰ مخلوقات

ارتقا پذیر ہوئیں ۔ ابتدائی انسان مچھلی تھا ۔ شاید اس نے یہ نظریہ "جل پری" سے اخذ کیا ہو ۔ بعد میں ڈارون نے اسی نظریہ ارتقا کو آگے بڑھایا ۔

پھر آیونیا ہی کے شہر میلیٹس (Miletus) کے انیکسیمنز (Aanaxemines) نے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کائنات اور اس میں تمام موجودات و محسوسات ہوا سے بنی ہیں ۔ فیثا غورث نے ریاضی دان ہونے کی بناء پر اعداد سے کائنات کی تشکیل ظاہر کی ۔ اور نظریہ کثرت بھی پیش کیا۔ یہ تھے آیونائی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے فلسفی جنھوں نے تخلیق کائنات کے بارے میں مختلف نظریات پیش کئے ۔

اس کے بعد " ایلیائی " مفکرین میں سے زینوفینز (Xenophanes) نے سب سے پہلے ہستی کے متعلق " احدیت " (Monism) کا اظہار کیا ۔ ایلیا کا دوسرا مفکر پارمنڈیز (Pormenides) بھی احدیت کو مانتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مطابق ہستی ایک ہے اور موجود ہے ۔ وہ نیستی پر یقین نہیں رکھتا ۔ راقم کا بھی یہی عقیدہ و خیال ہے کہ نیستی ہے ہی نہیں ۔ نیستی تھی بھی نہیں ۔ اگر نیستی ہوتی تو آج ہستی نہ ہوتی ۔ نیستی وہ ہوگی جہاں ہستی نہ ہو ۔ لیکن خدا کی ہستی تو ہر کہیں ہے ۔ لہٰذا نیستی کی اصطلاح محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے ۔ بہر حال پارمنڈیز کا نظریہ ہستی اپنے اندر مادیت اور تصوریت کا ابتدائی تمس رکھتا ہے ۔ بعد میں دیمقراطیس اور افلاطون پارمنڈیز ہی سے متاثر دکھائی دیتے ہیں ۔

اس کے بعد شامی النسل فلسفی زینو ایتھنز میں مقیم تھا ۔ اس نے اپنے استاد پارمنڈیز کے نظریہ وحدت الوجود کا پرچار کیا اور ، رواقیت (Stiocism) کا بانی ہونے کی حیثیت سے درد و غم اور قنوطیت پر یقین رکھتا تھا۔ شوپن ہار نے بعد میں اسی کے چراغ سے قنوطیت کا چراغ روشن کیا ۔ اس کے مقابلے میں ایپیقورس کا فلسفہ ابیقوریت (Epicureanism) کے نام سے مقبول و بدنام ہوا ۔ اس لئے کہ ابیقوریت کو حکمائے " سائرینہ " کے مذہب لذتیت (Hedonism) پر محمول کر لیا گیا ۔ جس میں ہر قسم کی عیش و عشرت اور جنسی بے راہ روی پائی جاتی ہے ۔ مگر درحقیقت ابیقوریت کی اساس لذتیت پر نہیں بلکہ طمانیت اور مسرت پسندی پر ہے۔ اگر چہ ایپیقورس لذت کو بھی طمانیت یا مسرت ہی کی ایک ادنیٰ صورت سمجھتا ہے ۔ اس کے نزدیک خوشی و مسرت ہی زندگی کی غرض و غائیت ہے ۔ لہٰذا ہر وہ شے جو مسرت و طمانیت بخش ہو ایپیقورس اسے "حسن" یا نیکی گردانتا ہے ۔ اس کے نزدیک ہر وہ چیز جو سرور انگیز ہو "حسن و جمال" ہے ۔ اور جو چیز غم انگیز ہو اسے وہ قبیح اور بدصورت

سمجھتا ہے ۔ اپیقورس کہتا ہے کہ فقط کائنات ہی جمال کی مکمل و اکمل جلوہ گاہ ہے۔ حسن کے اس فطری جلوے میں انسان کے، فن پارے ناقص و نامکمل ہیں ۔ اس لئے وہ فنون لطیفہ کو اہمیت نہیں دیتا ۔

جیسا کہ تھیلیز پانی اور انیکسمنز ہوا کو کائنات کا بنیادی عنصر قرار دیتا ہے ۔ گویا کہ ایک سمجھتا ہے کہ کائنات پانی سے بنی ہے اور اس طرح ہر شے کا حسن بھی پانی سے بنا ہے ۔ دوسرے کے مطابق کائنات ہوا سے تخلیق ہوئی اور ہر چیز کا حسن ہوا کا مرہون منت ہے ۔ دراصل جس کسی نے پانی کو زندگی کے لئے ضروری سمجھا اس نے کہہ دیا کہ زندگی یا کائنات پانی سے معرض وجود میں آئی ہے ۔ جس نے ہوا کو زندگی کے لئے ناگزیر جانا اس نے کہا سب کچھ ہوا ہی سے بنایا گیا ہے ۔ انیکسمنز نے آکسیجن کا نام لئے بغیر کہا کہ ہوا میں جلنے کا عمل ہے ۔ سورج ، چاند اور ستارے ہوا کی منجمد شکلیں ہیں اور جل رہے ہیں ۔ اس وقت یہ راز کون جانتا تھا کہ چاند تاروں کی چمک سورج کی روشنی کی مرہون منت ہے ۔ سورج کی روشنی تو دن کو بھی ہوتی ہے مگر دن کو آفتاب کے سامنے مہتاب ایک بجھا ہوا بے نور چراغ دکھائی دیتا ہے ۔ اور ستارے جسامت میں چھوٹے یا ہم سے بہت زیادہ دور ہونے کے سبب بالکل ہی نظر نہیں آتے ۔

بہر حال انکسمنز کے اس نظریے کو بعد میں ہراقلیتوس نے آگے بڑھایا ۔ اس نے ہوا کے جلنے کے عمل سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کائنات کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے انیکسمنز کے علاوہ ہراقلیتوس ایران کے معروف مذہبی فلسفی زرتشت سے بھی بے حد متاثر ہے ۔ اس لئے کہ ہراقلیتوس کا فلسفہ زرتشت کے مذہبی فلسفے کا رہین منت ہے ۔ بعد میں قرآن حکیم نے ''حسن مطلق '' سے متعلق فرمایا '' اللہ نور السموت والارض'' ایلیائی مکتبہ فکر کے مطابق کائنات جامد و ساکن ہے ۔ لیکن ہراقلیتوس کائنات کو متحرک سمجھتے ہوئے اسے کش مکش اور مقابلے کی آماجگاہ بتاتا ہے ۔ نطشے ہراقلیتوس کے اس نظریے سے بھی متاثر دکھائی دیتا ہے ۔ اور سارتر نے بھی فلسفہ وجودیت (Existentialism) ہراقلیتوس ہی سے اخذ کیا ۔ اور برگساں بھی ہراقلیتوس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ ادھر بے شک اقبال نے بھی کہا کہ، ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں اور تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات ۔ لیکن اقبال کا معاملہ دوسرا ہے ۔ اس لئے کہ ان کا ''ذوق جمال'' قرآن حکیم کے رنگ و نور سے نورانی ہے ۔

پھر شہر سسلی ، ایکراگاس کے باشندے '' ایمپیڈوکلیز '' (Empedocles) نے تخلیق سے ہٹ کر ارتباطی (Unifying) طریقہ اپنایا اور اپنے دور کے تمام فکری میلانات کو یکجا کرنے کے بعد اس نے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ

کائنات کسی ایک عنصر سے نہیں بلکہ پانی ، ہوا ، مٹی اور آگ سے بنی ہے ۔

لیوسی پس نے جو ہریت یا ذراتی مادیت (Atomism) کا فلسفہ پیش کیا ۔ دیمقراطیس بھی اس سے متاثر ہوا اور ان دونوں نے مل کر''Corpus '' کے نام سے فلسفہ جوہریت کا ایک مجموعہ لکھا ۔ اس طرح آیونی مفکروں کی مادیت لیوسی پس اور دیمقراطیس کی مشترکہ ذراتی مادیت میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ یوں چراغ سے چراغ جلتا رہتا ہے اور مفکرین ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہتے ہیں ۔ گویا کہ اگر دانشور اور فلاسفر و سائنس دان ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں تو متاخرین اپنے پیش روؤں کے خیالات ونظریات کا ارتباطی تجزیہ نہ کرسکیں ۔ ہراقلیتوس زرتشت سے متاثر ہوئے بغیر ہرگز نہ کہہ سکتا کہ کائنات کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے ۔ اسی طرح اس کے پیش نظر انکسیمنز کا یہ نظریہ بھی تھا کہ ہوا جلتی ہے ۔ پھر نطشے اور برگساں بھی ہراقلیتوس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے اپنے نظریات کو ارتقائی صورت میں پیش کیا ۔ اور ایمپیڈوکلیز نے اپنے عہد کے مختلف فلسفیوں سے متاثر ہو کر ارتباطی انداز اپناتے ہوئے تخلیق کائنات میں چاروں عناصر کو برابر کا شریک ٹھہرایا۔ پس ثابت ہوا کہ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر تعمیر و ترقی اور ایجادات کے مراحل طے نہیں ہو سکتے ۔

یونانی فلسفے کی تاریخ میں انکسا غورس کا نام بھی جانا پہچانا ہے ۔ وہ ''آیونیا'' کے شہر'' کلازومینیا'' میں ۵۰۰ ق م کو پیدا ہوا ۔ انکسا غورسی فلسفے کے دو رخ ہیں ۔ پہلے رخ کے مطابق سبھی عناصر ایک دوسرے میں خلط ملط ہیں ۔ کسی چیز میں جس عنصر کا غلبہ ہوگا وہ وہی چیز بن جائے گا ۔ اس کے دوسرے حصے کی رو سے دنیا ایک نہیں بلکہ بہت سی دنیائیں ہیں جن کی تشکیل کا باعث ایک عالمگیر حرکت ہے ۔ یہ حرکت عقل ، ذہن یا ناؤس (Nous) ہے ۔ جو'' قادر مطلق'' اور غیر مخلوط ہے ۔ وہ غیر مادی او غیر شخصی (Impersonal) ہے ۔ اس نظریے سے فکر و نظر کی نئی راہیں کشادہ ہوتی دکھائی دیتی ہیں ۔ اس لئے کہ یہ نظریہ ''حسن مطلق '' کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ انکسا غورس کے مطابق کائنات مادے کا ڈھیر نہیں بلکہ ایک عمل (Process) ہے ۔ امریکی فلسفی وائٹ ہیڈ اسی فکر ونظر کو آگے بڑھاتا ہے ۔

یہاں تک یونانی فکر کا اولین دور ہے اس کے بعد سوفسطائیوں سے فکر یونان کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے ۔ ان کے نزدیک طاقتور جو بھی کہے جائز ہے ۔ ہراقلیتوس کے علاوہ نطشے پر سوفسطائیت کا اثر بھی بہت گہرا ہے ۔ اس سلسلے میں پروٹا گورس (Protagorass) کا ذکر بھی اہم ہے ۔ وہ ہراقلیتوس کے نظریہ تغیر سے متاثر ہو کر کہتا ہے کہ اس طرح کسی چیز

کا علم ناممکن ہے ۔ پروٹا گورس کے مطابق آدمی ہر شے کا پیمانہ ہے ۔

اس کے بعد قنوطیت (Pesimesim) کے لحاظ سے '' پروڈیکس '' زینو کے فلسفہ رواقیت سے متاثر ہے جس کا سلسلہ بعد میں شوپنہار تک جا پہنچتا ہے ۔ ہمارے ہاں میر تقی میر کو اگر قنوطی مان لیا جائے تو تاریخی لحاظ سے میر شوپنہار سے پہلے کا قنوطی ثابت ہوتا ہے ۔ جیسا کہ میر ۱۷۲۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱۰ء میں وفات پائی ۔ جبکہ شوپنہار کی تاریخ پیدائش ۔۱۷۸۸ء اور تاریخ وفات ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء ہے ۔ لیکن یہ ایک الگ بحث ہے کہ آیا کوئی قنوطی ہوتا بھی ہے یا نہیں ۔ بہر حال '' پروڈیکس '' کے نظام فکر میں ، انسان کو مرنے کی آرزو کرنی چاہئے ۔ میری ذاتی رائے میں خودکشی کرنے والے یا مرنے کی آرزو کرنے والے کو امید ہوتی ہے کہ بعد از مرگ غموں اور مصیبتوں سے چھٹکارا مل جائے گا اور قنوطی کبھی پر امید نہیں ہوتا ۔ لہٰذا مرنے کی امید یا آرزو رکھنے والا قنوطی نہیں ہوتا ۔

جہاں تک '' گورجیس '' کا تعلق ہے ، وہ کہتا ہے کہ کسی چیز کا علم حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اور اگر علم حاصل ہو بھی جائے تو اس کا ابلاغ ممکن نہیں ہوتا ۔ جیسا کہ رنگ کور (Colour Blind) شخص کو سرخ رنگ سے متعلق آگاہ کرنا یا سمجھانا ناممکن ہے ۔ یہی نکتہ موضوعیت سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق تیسرے باب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔

'' ایلیا '' اور '' آیونیا '' کے مفکروں نے '' طبیعاتی '' یا '' کائناتی '' فلسفے کے لحاظ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کائنات کیسے معرض وجود میں آئی ۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ سب فلسفی جو کہ عقل کو بروئے کار لاتے رہے ۔ کسی ایک نکتے پر متفق نہیں ہوتے ۔ حقیقت کے بارے میں ان سب کی متضاد آرا اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ عقل حقیقت کا سراغ نہیں لگا سکتی ۔ البتہ عشق ایک ایسی قوت اور تڑپ ہے ۔ جو زمان و مکاں سے رشتہ بپا عقل کے مقابلے میں طائر سدرہ آشنا ہے ۔ اور مرغ لاہوتم و از دوست پیامے دارم کی روشنی میں اقبال عشق ہی کو حقیقت آشنا سمجھنے میں حق بجانب دکھائی دیتے ہیں ۔

سقراط سے یونانی فکر اور جمالیات کے نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے ۔ ذرا غور کریں کہ اپنے دور کا وہ جدید دور آج کتنا قدیم محسوس ہوتا ہے ۔ اور آج ۲۰۰۱ـ۸ـ۲۰ کی یہ نئی رات کچھ عرصہ بعد کتنی پرانی ہوگی کہ خود راقم الحروف کو بھی یاد نہ ہوگی ۔ واہ جی واہ ! کتنی چھنا چھن ناچتی صدیاں ۔ کتنے گھنا گھن گھومتے عالم ۔ جن کا مآل ، اک سانس کی مہلت ۔ سانس کی مہلت عمر گریزاں ، جس کی لرزتی روشنیوں میں ۔ جھلمل جھلمل ، جھلکے اک مسحور مسافت ۔ حد نظر تک وسعت دوراں ، جس کی خونیں سطح

پہ تڑپے، طوق و سلاسل میں جکڑی، انسان کی قسمت ___ سقراط نے دوسرے مفکرین کے برعکس انسان کو موضوع فکر و نظر بنایا۔ چاند، تاروں، پانی، ہوا، مٹی اور آگ کی بجائے، سقراط نے انسان کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ حسن کو خیر اور علم و حکمت بھی خیال کرتا ہے۔ سقراط کے نزدیک حسن خیر ہے اور خیر حسن ہے۔ اس لئے کہ وہ مظاہر فطرت کو "حسن" اور "مظاہر" اخلاق کو خیر سمجھتا ہے۔ خدا کی ہستی یعنی "حسن مطلق" کے لئے سقراط "اگاتھوس" یعنی "الخیر" کا تصور اجاگر کرتا ہے۔ جس سے مراد "حسن مطلق" ہے۔ تمام جلیل و جمیل چیزیں اسی "حسن مطلق" کے مظاہر ہیں۔ سقراط کے نزدیک روح قفس عنصری میں آنے سے پہلے بھی "حسن مطلق" سے متعلق جانتی ہے۔ اس پہچان کو وہ "تذکر" کا نام دیتا ہے۔ سقراط حسن اور فن کو ایک دوسرے سے علیحدہ تصور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حسن حقیقت اور فن فروعی ہے۔ اس لئے فن حسن کی برابری نہیں کر سکتا۔ چنانچہ باطل اور لاحاصل ٹھہرتا ہے۔ وہ فن کو اظہار میں نہاں سمجھتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حسن بھی اپنا اظہار چاہتا ہے حسن کے اسی اظہار کی بدولت تو، دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں۔ سقراط اگر فن کو بھی اظہار میں پوشیدہ سمجھتا ہے تو اس طرح حسن و فن میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ گویا کہ حسن فن ہے اور فن حسن۔ اور بات بھی یہی ہے کہ حسن کے بغیر فن، فن ہی نہیں ہوسکتا۔ جس فن میں حسن نہ ہو اسے "حسن کاری" نہیں کہا جا سکتا اور جو کوئی حسن کا اظہار نہ کر سکے وہ مقام "حسن کار" کا اہل نہیں ہوسکتا۔ اور نہ اس کا پیش کردہ نمونہ "حسن پارہ" کہلائے جانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ بہر حال سقراط نے فن کے اظہار کی بات کرتے ہوئے جمالیات میں اس اظہاریت کی بنیاد رکھی۔ بعد میں جسے کروچے نے بڑے جوش و خروش سے آگے بڑھایا۔ کروچے وجدان کو بھی اظہاریت کہتا ہے۔ اس لئے کہ جب کسی کو وجدان ہوتا ہے تو وہ کسی نہ کسی صورت میں اس کا اظہار کرتا ہے۔

یہاں ہم ساتھ ساتھ دیکھتے چلے آتے ہیں کہ کس طرح مفکرین و دانشور ایک دوسرے سے متاثر ہو کر علم و دانائی کی شمعیں روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ گویا کہ کسی سے متاثر ہونا منفی نہیں بلکہ مثبت قدر ہے۔ لہٰذا متاثر ہونے کو گالی کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

سقراط نے نظریہ تعقلات بھی پیش کیا۔ افلاطون اور ارسطو اسی نظریے سے متاثر تھے۔ افلاطون نے اسے اعیان اور اعیان ثابتہ کی صورت میں پیش کیا۔ اور بعد میں ظہور پذیر ہونے والی تصوریت (Idealism) دراصل سقراطی نظریہ تعقلات ہی کی ترقی

یافتہ صورت ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ سقراط سے اخذ شدہ ''نظریہء اعیان'' ہی افلاطونی فلسفے کی اصل روح ہے ۔ اس کے علاوہ افلاطون پر فیثاغورث ، پارمینڈیز اور ہراقلیتوس کا اثر بھی ہے ۔ فیثاغورثی اثر کے تحت افلاطون کے فلسفے میں مذہبی لب و لہجے کی آہنگ سنائی دینے کے علاوہ ریاضیات کا رنگ بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے ۔ نظریہ اعیان کی جڑیں سقراط سے ہو کر پارمنیڈیز سے جا ملتی ہیں ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بذات خود سقراط بھی تعقلات کے ضمن میں پارمنیڈیز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ بہر حال افلاطون پارمنیڈیز کے زیر اثر سیکھ کر یہ کہتا ہے کہ حقیقت کی حیثیت ابدی ہے اور جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے ۔ وہ دھوکہ و سراب ہے ۔ اور افلاطون کے بعد پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے ، رہے گا دیر تک ماتم ہمارا ، زمین و آسماں زیر و زبر ہے ، نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا کے مصداق افلاطون نے بھی فلسفے کی دنیا میں ایک دنیا کو متاثر کیا ۔ بارکلے اور بریڈلے افلاطونی ''تصوریت'' و ''عینیت'' کے علمبردار ہیں ۔

ہراقلتیوس کے مطابق اشیاء تغیر پذیر ہیں ۔ عالم ناسوت میں موجودات و محسوسات مستقل نہیں ۔ افلاطون اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اشیاء کا علم عقل کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ حواس پر فریب ہوتے ہوئے صداقت و سچائی تک پہنچنے میں راستے کی دیوار بنتے ہیں ۔ لیکن ہم پچھلے صفحات میں ثابت کر چکے ہیں کہ عقل کو بروئے کار لانے والے سبھی مفکرین تخلیق کائنات کے بارے میں باہم متفق نہیں ۔ ہر ایک دوسرے سے جدا اپنی رائے کا مالک ہے ۔

افلاطون کے مطابق اشیاء کا تصور یا صورت ہی ان کا جوہر ہے ۔ اس کی تصوریت و عینیت کے نزدیک آمیزش و تناقص سے پاک ہستی فقط عالم امثال یا دنیائے اعیان ہی میں پائی جاتی ہے ۔ افلاطونی فلسفہ دلچسپ ضرور ہے مگر حقیقت سے بعید دکھائی دیتا ہے ۔ جو چیز خود حقیقت سے دور ہو وہ دوسروں کو کیسے حقیقت کے قریب لا سکتی ہے؟ گویا کہ ''نظریہ اعیان'' پر عمل پیرا ہونے والا حقیقت سے اور بھی دور ہو جاتا ہے ۔ اس لئے کہ اس کی مثال ایسے شخص کی ہے ، جس نے منزل کی طرف پیٹھ کر رکھی ہو اور مخالف سمت میں بغیر دیکھے جا رہا ہو صاف ظاہر ہے اس طرح وہ مخالف منزل پر بھی نہیں پہنچ سکتا ۔ اس لئے کہ بغیر دیکھے دھڑام سے چت ہو جائے گا ۔

افلاطون خوابوں کی دنیا کا باسی تھا ۔ اس لئے حقائق سے دور افسانوی فلسفے کا بانی ٹھہرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون کا ''نظریہ اعیان'' مختلف اعتراضات کی زد میں ہے ۔ مثال کے طور پر میں یہ کہوں گا کہ خالق حقیقی کو عالم ناسوت بنانے سے

قبل کسی ریہرسل کی ضرورت نہیں تھی کہ اس نے پہلے عالم امثال یا نمونے کے طور پر عالم اعیان بنایا۔ وہ ایسا ''حسن کار'' ہے کہ اصل کی نقل پیش کر کے اپنی ''حسن کاری'' کا یقین نہیں دلاتا اور نہ دھوکے و سراب کے ذریعے ''قادر مطلق'' ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بلکہ وہ حقیقت ہے اور حقیقت پیش کرتا ہے۔ اس کی حسن کاری میں نقلیں بنانے اور دکھانے والی کوئی بات نہیں۔ وہ کوئی انسان نہیں کہ پہلے نمونے بنائے اور پھر ان کی نقلیں۔ اس مقام پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف ادوار میں انسانوں نے ''حسن مطلق'' کی دید کی خاطر اپنی شکل وصورت کے مطابق بت بنائے اور سمجھا کہ ''حسن مطلق'' ایسا ہی ہوگا۔ افلاطون بھی ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اسی رو میں بہ گیا اور ایک عام فن کار کی طرح ''حسن مطلق'' کو بھی نمونے بناتا اور ریہرسل کرتے دکھا دیا۔

افلاطون کے نظریے پر راقم کا یہ اعتراض بھی ہے کہ عکس پھلتے پھولتے اور پروان نہیں چڑھتے۔ جبکہ عالم ناسوت میں موجودات پروان چڑھتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ پھول کی تصویر سے پھول کی خوشبو نہیں آتی۔ اگر یہاں کے پھول تصویریں ہوتے تو تصویر یا عکس کی طرح ان میں خوشبو نہ ہوتی۔

اقبال کی جمالیات اخلاقیات کے تابع ہیں۔ اور افلاطون بھی حسن، خیر، نیکی اور اخلاق کی بات کرتا ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ افلاطون خیر و اخلاق سے متعلق بھی اپنے مخصوص نظریات رکھتا ہے۔ جو فعل افلاطون کے نزدیک خیر ہے وہی اقبال کے نزدیک بدی سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اقبال نے افلاطون کی شدید مخالفت کی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ننگ دھڑنگ ہو کر اکٹھے جمناسٹک کرنا اور بھیڑ بکریوں کی طرح یا جنگل میں درندوں و چرندوں کی طرح مشترکہ شادیوں کے پردے میں جنسی داد عیش دینا، اقبال کے'' ذوق جمال''میں کہیں نہیں سماتا۔ اس کے علاوہ اعلیٰ اور ذہین نسل کشی کی خاطر مخصوص وقوی ہیکل لوگوں کو شادی بیاہ کا حق دینا اور باقی ماندہ بیچاروں کو قرعہ اندازی کا ڈھونگ رچاتے ہوئے، دھوکہ دہی سے اپنی تقدیر کی آغوش میں دھکیل دینا بھی اقبال کو افلاطون کی مخالفت پر اکساتا ہے۔ اور وہ دل کھول کر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ چونکہ افلاطون عالم ناسوت کو دھوکہ و سراب سمجھتا ہے، اس لئے مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ قرعہ اندازی کرتے ہوئے بھی دھوکہ دہی سے کام لیتا ہے۔

علاوہ ازیں افلاطون ملوکیت کا پرچار کرتا ہے۔ اور اقبال نے ملوکیت کی ہر موڑ پر مخالفت کی ہے۔ پھر غار میں

انسانوں کو مجبور و بے بس دکھاتے ہوئے بھی افلاطون تقدیر پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔ جبکہ اقبال جیسا تقدیر شکن، بے باک اور صاحب لولاک مردفقیر تقدیر پرستی کے خلاف ہوتے ہوئے افلاطون کے نظریہ اعیان سے متفق نہیں ہو سکتا۔

نطشے نے بھی افلاطون کے ''نظریہ اعیان'' کی مخالفت کی ہے۔ اس لئے کہ یہ نظریہ نطشے کی تعلیمات سے بھی میل نہیں کھاتا۔ اقبال بھی حرکت و عمل اور جدوجہد کا پیامبر ہے۔ چلنے والے نکل گئے ہیں، جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں۔ اور ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم، ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم، موج زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت، ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم۔ صاف ظاہر ہے خوابوں کی بے عملی میں رہنے والے فلسفی سے اقبال کی یہ سرتوڑ جدوجہد میل نہیں کھا سکتی۔ اقبال کی جدوجہد سورج، چاند اور ستاروں کو بھی مسخر کرنے کے درپے ہے۔ ان کا ذرہ آفتاب بن جاتا ہے اور وہ مہر و مہ اور مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں کے مصداق افلاک کی دوسری جانب نکل جانا چاہتے ہیں۔ خود جاوید نامہ اقبال کے اسی حرکی ''ذوق جمال'' کا نتیجہ ہے۔ عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں، کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے سے اقبال کے بلند و بانگ دعوے اور عظیم ارادے منظر عام پر آتے ہیں۔ یہ سب فطریت، تصوریت اور عینیت کے رد عمل کے طور پر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اور یہیں سے اقبال کے ہاں نظریہ فوق الفطرت معرض وجود میں آتا ہے۔ افلاطون کے تتبع میں بارکلے و بریڈلے کی طرح بہت سے دوسرے موضوعیت و تصوریت پسند فلسفیوں نے ''تصوریت'' کا پرچار کرتے ہوئے مزید بے عملی پھیلائی۔ ظاہر ہے کہ اگر موجودات و مظاہر کو واہمہ و سراب قرار دیا جائے تو اقبال کے عزم و استقلال میں ''تسخیر فطرت'' کا عمل بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ اس لئے بھی اقبال افلاطون کے نظریہ امثال سے اتفاق نہیں کرتے۔

پھر بے عملی اور مایوسی میں فرد و ملت کا کوئی مقصد حیات نہیں ہوتا۔ زندگی ایک بیگار بن کر رہ جاتی ہے۔ جب مقصد نہ ہو تو عمل اور جدوجہد کہاں سے آئے گی؟ اقبال کہتے ہیں مقصود عمل کے اندر جان کی طرح پوشیدہ ہے۔ اسی سے عمل میں کمی بیشی واقع ہوتی ہے۔ ہماری رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے مقصود حاصل کرنے کی کوشش سے وہ تیز ہو جاتا ہے۔ مقصود کی گرمی ہی سے زندگی میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے زندگی گل لالہ کی مانند آگ اکٹھی کرتی ہے۔ ساز ہمت کا مضراب مدعا ہے۔ یہ ایسا مرکز ہے جو انسان کی ہر قوت کو اپنی طرف مرتکز کر لیتا ہے۔ اسی سے قوم کے دست و پا میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی سے افراد کی سینکڑوں آنکھیں ایک نظر بن جاتی ہیں۔ تو بھی شاہد مقصود کا دیوانہ بن اور پروانے کی مانند اس شمع

کا طواف کر۔ قم کے شاعر نے کیا خوب بات کہی ہے۔ گویا اس نے تار ابریشم کو معنی کے مضراب سے چھیڑا ہے۔ جب تک مسافر اپنے پاؤں کے تلوے سے کانٹا نکالتا ہے۔ محمل اس کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ اگر تو ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہو جائے تو اپنی منزل سے سینکڑوں میل دور جا پڑتا ہے۔

ہمچو جاں مقصود پنہاں درعمل کیف و کم از وے پذیرد ہر عمل
گردش خونے کہ دررگہائے ماست تیز از سعئی حصول مدعاست
از تف او خویش را سوزد حیات آتشے چوں لالہ اندوزد حیات
مدعا مضراب ساز ہمت است مرکزے کو جاذب ہر قوت است
دست و پائے قوم را جنبا ند او یک نظرصد چشم را گرداند او
شاہد مقصود را دیوانہ شو طائف ایں شمع چوں پروانہ شو
خوش نوائے نغمہ ساز قم زد است زخمہ معنی بر ابریشم زد است
تا کشد خارازکف پارہ سپر می شود پوشیدہ محمل از نظر
گر بقدر یک نفس غافل شدی
دور صد فرسنگ از منزل شدی (۱)

عمل سے ایمان کی لذت بڑھ جاتی ہے۔ جو ایمان عمل میں نہ آئے مر جاتا ہے:۔

لذت ایماں فزاید درعمل مردہ آں ایماں کہ ناید درعمل (۲)

موج کی مانند مست خودی رہ اور طوفان کے اندر سے سر اٹھا۔ تجھے کس نے کہا کہ تو بیٹھ رہ اور جدوجہد چھوڑ دے۔

چو موج مست خودی باش و سر بطوفاں کش ترا کہ گفت کہ بنشیں وپا بداماں کش؟ (۳)

افلاطون کے زیر اثر بہت سی اقوام پر بے عملی چھا گئی۔ جب فلاطینوس کے اثر سے نو فلاطونیت کا دور دورہ ہوا تو مسلمان بطور خاص ''نظریہ اعیان'' کے تحت بے عملی کا شکار ہوئے۔ بلاشبہ قومہا از سکر او مسموم گشت، خفت و از ذوق عمل محروم

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۱۳۷۔۱۳۸۔ (۲) اسرار و رموز۔ ۱۵۷۔ (۳) زبور عجم۔ ۷۲۔

گشت ۔ چنانچہ ردعمل کے طور پر اقبال نے افلاطون کو راہب دیرینہ اور از گروہ گوسفندان قدیم کے لقب سے یاد کیا۔ اس لئے کہ:۔

منکر ہنگامہء موجود گشت خالق اعیان نامشہود گشت

کے مصداق افلاطون نفی خودی اور بے عملی کی تعلیم دیتا ہے۔ جو اقبال کی ''حسن کاری'' سے سراسر متصادم ہے۔ جس کی بناء پر اقبال افلاطون کی تصوریت کے خلاف کمر بستہ ہو کر کہتے ہیں کہ تو چشم بستی و گفتی کہ ایں جہاں خواب است، کشائے چشم کہ ایں خواب خواب بیداری است، بر عقل فلک پیما ترکانہ شبیخوں بہ، یک ذرۂ دردِ دل از علم فلاطوں بہ، ترسم کہ تو می رانی زورق بسراب اندر، زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر۔ اقبال کے نزدیک افلاطون ایک شعبدہ باز ہے۔ اور اس کا فلسفہ شعبدہ بازی۔ جس نے میری آنکھ کے پردے پر اس جہاں کا نقش بنا دیا۔ میں اس کے ہاتھوں جادو میں گرفتار ہوں۔

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطون!
زدست شعبدہ بازے اسیر جادویم کشید نقش جہانے برکشیدہ چشم (۱)

اس کے بعد جہاں تک ارسطو کا تعلق ہے، وہ افلاطون کا شاگرد تھا چونکہ ارسطو ٹہلتے ٹہلتے خطبہ (لیکچر) دیتا تھا اس لئے اس کا مکتبہ فکر مشائیت کے نام سے مشہور ہوا۔ اور اس کے پیروکاروں کو مشائین کہتے ہیں۔ افلاطون نے فن کو تیسرے درجے کی نقالی کہتے ہوئے اس لئے بھی رد کر دیا کہ اس سے جذبات کمزور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ارسطو جو کہ خاندانی طور پر طبیب تھا، نے تذکیہ نفس یعنی کیتھارسس (Katharsis) کا نظریہ پیش کرتے ہوئے، خصوصاً شاعری کی مدافعت کی۔ اور نقل سے فن کاری، باز آفرینی اور تخلیق مکرر مراد لی۔ علاوہ ازیں ارسطو ہراقلیتوس کے برعکس کائنات کو متحرک یا تغیر پذیر نہیں مانتا، بلکہ اس کے نزدیک کائنات مردہ مادے کا ایک ڈھیر ہوتے ہوئے جامد و ساکن ہے۔ اقبال جیسا کہ حرکی جمالیاتی ذوق رکھتے ہیں اس لئے ارسطو کے اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتے اور ردعمل کے طور پر کہتے ہیں:۔

اے کہ تو پاس غلط کردۂ خود می داری آنچہ پیش تو سکون است خرام است اینجا

اور زندگانی از خرام پیہم است، برگ و ساز ہستی موج از رم است۔ ارسطو کے برخلاف اقبال کہتے ہیں کائنات

---

(۱) پیامِ مشرق۔ ۱۴۸۔

برابر پھیل رہی ہے، یعنی بڑھ رہی ہے۔ عمل تخلیق حسن کاری کے بل بوتے پر برابر جاری و ساری ہے۔ اس لئے کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں اور مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگر گوں، معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا۔

جہاں تک ارسطو کے استاد کے" نظریہ اعیان" کا تعلق ہے۔ ارسطو بھی اس سے اتفاق نہیں کرتا اور اس پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ گل و بلبل ذہن میں پائے جانے والے تعقلات کی بناء پر موجود ہیں نا قابل اعتبار ہے۔ اور یہ کہ افلاطون ایسا شخص ہے جو اشیاء کو شمار کرنے کی بجائے انہیں دوگنا کر دیتا ہے۔ لیکن صورتوں کے اعلیٰ اور کم تر ہونے کی روشنی میں ارسطو بھی افلاطون سے متاثر دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ بھی افلاطون ہی کی طرح تصورات و موجودات کا طلسماتی گھورکھ دندا بناتا ہے۔ مگر ایک نئی ترتیب کے ساتھ۔ وہ استقرا (Indection) اور استخراج (Deduction) کی اصطلاحات سے فکر کی دوصورتیں ظاہر کرتا ہے۔ وہ خدا کو غیر متحرک محرک کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ ارسطو کی یہی دلیل بعد کے فلسفیوں کے لئے کونیاتی دلیل (Cosmological Argument) کی اساس بنتی ہے۔

فنی نقطہ نظر سے ارسطو کسی شے کی تخلیق اور وجود کے لئے چار علتوں کا ہونا لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ان سب سے ایک علت بھی کم ہو تو کسی "حسن پارے" کا معرض وجود میں آنا ممکن نہیں۔ ان چاروں علتوں کی ترتیب یوں ہے۔ (1) علت مادی (The Material Cause) ۲ علت فاعلی (The efficient cause) ۳ علت صوری (The formal Cause) اور ۴ علت غائی (The Final cause) ہم دیکھ چکے ہیں کہ آیونیا کے تھیلیز اور انکسیمنز نے سب سے پہلے پانی اور ہوا کی صورت میں علت مادی کی نشاندہی کی۔ اور انکسا غورس نے علت غائی دریافت کی۔ اس کے نزدیک ناؤس (Nous) کی غرض و غائت کائناتی غائت کی وضاحت کرنا تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ارسطو بھی بہت سے دوسرے مفکروں کی طرح اپنے پیش روؤں سے متاثر نظر آتا ہے اس نے کوئی نیا نظام فکر پیش نہیں کیا۔ البتہ اس کی ارتباطی کاوشوں نے ایمپیڈوکلز کی طرح مختلف نظریات کو یکجا کر دیا۔ خدا کے بارے میں ارسطو تضاد بیانی کا شکار ہے۔ گویا کہ جمالیات کی رو سے حسن مطلق کے متعلق ارسطو کے نظریات میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ وہ کبھی کہتا ہے کہ خدا ایک مقناطیسی قوت ہے۔ جس کی طرف تمام اشیاء کھنچی چلی جاتی ہیں۔ اور کبھی کہتا ہے کہ اسے خلق سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ کہ خدا کو نیکی و بدی یا جنت و دوزخ سے بھی کوئی علاقہ نہیں۔ اس سلسلے میں ویل ڈیورنٹ نے

ٹھیک ہی کہا ہے کہ ارسطو کا خدا کوئی بادشاہ یا شہزادہ ہے ۔ جس کا کوئی کام نہیں ۔۔ ارسطو اللہ تعالی کے بارے میں ایسی افراط وتفریط میں بھٹک جاتا ہے جس کی حدیں دہریت سے جا ملتی ہیں۔

مسلم مشائین نے ارسطو کے منطقی فلسفے کو مذہبی عقائد کی تائید اور تاویل کے طور پر پیش کیا تو یہ طریقہ کار ''علم کلام'' کے نام سے مروج ہوا ۔ بعدازاں یورپ میں اسی طریقے نے مدرسیت (Scholasticism) کی حیثیت سے شہرت پائی ۔ اب تک ''حکمت بحثیہ'' کا دور دورہ رہا مگر اس کے بعد فلاطینوس (Plotinus) نے ''حکمت ذوقیہ'' کی بنیادیں مستحکم کیں ۔ چونکہ وہ افلاطونی نظریات سے متاثر تھا ۔ اس لئے اس کے فلسفہ ''اشراق ''کو اشراقیت ، نو فلاطونیت (Newplotinism)،افلاطونیہ جدیدہ ، مذہب افلاطون جدیدہ اور افلاطونیۃ الحدیثۃ بھی کہتے ہیں ۔ اور اس کے پیروکاروں کو '' اشرقی '' اور ''نو افلاطونی'' کہا جاتا ہے ۔ ''نظریہ اعیان'' پر اقبالی تنقید کے حوالے سے ہم دیکھ آئے ہیں کہ فلاطینوس کی نو فلاطونیت یا فلسفہ اشراق کے باعث سکر اور بے عملی کی تعلیم پھیلی ۔شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی فلاطینوس کے پیروکار تھے اور اس سے متاثر ہوکر'' حکمت الاشراق'' ضبط تحریر میں لائے ۔

فلاطینوس نے بھی ارتباطی عمل کے ذریعے افلاطون کے نظریات کو ایک نئی شکل وصورت دیتے ہوئے اسے ''حکمت ذوقیہ'' کے روپ میں پیش کر دیا ۔ جس کے ڈانڈے تصوف سے آملتے ہیں ۔ ''حسن مطلق'' کے بارے میں وہ ہمہ اوست کا ذوقی نظریہ پیش کرتا ہے ۔ جس نے ''حسن مطلق'' کا ذوق وشوق رکھنے والوں کو خیل درخیل متاثر کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فلاطینوس کی شہرت ومقبولیت کا ڈنکا بجنے لگا ۔مغرب کے مقابلے میں اس نے زیادہ مشرق کو مرعوب کیا ۔ اور اپنے اپنے وقت کی مروجہ زبانوں کے شاعروں و دانشوروں نے فلاطینوس کے'' وحدت الوجودی''عقائد و خیالات کو خوب خوب برتا ۔ مثال کے طور پر ، دل اگرمی داشت وسعت ، بے نشاں بوداں چمن ، رنگ مے بیروں نشست از بس کہ مینا تنگ بود فلاطینوس ہی کے زیراثر ہے ۔ اور آج رمزیت(Symbolism) ، ارتسامیت (Impressionism)اور تجریدیت (Abstractism)افلاطونس ہی کے تصورفن کی ارتقائی صورتیں ہیں ۔ طامس اکویناس اور ونکل مان بھی فلاطینوس سے بہت زیادہ متاثر ہیں ۔ اسی لئے طامس اکویناس ہر چیز میں حسن کا جویا تھا ۔ اس کے نزدیک سارے حسن کا سرچشمہ ''حسن مطلق '' ہے۔

اقبال بھی پہلے وحدت الوجود پر یقین رکھتے تھے ۔لیکن بعد میں انہوں نے یہ عقیدہ ترک کرتے ہوئے وحدت الشہود پر عمل کرنا شروع کر دیا ۔ اشراقیت علم اور عقل کے برخلاف وجدان(Intution)اور بصیرت (Vision) کے ذریعے حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے ۔ افلاطون اپنی'' تصوریت''کو عقل یا حکمت بحثیہ کے ذریعے پروان چڑھاتا ہے ۔ جبکہ فلاطینوس ذوق وشوق ،حکمتِ ذوقیہ اور کشف کے ذریعے''حسن مطلق''کو پالینے کی سعی کرتا ہے ۔ اقبال بھی عقل کے مقابلے میں یا یوں سمجھئے کہ حکمت بحثیہ کے مقابلے میں حکمت ذوقیہ یعنی عشق کو ترجیح دیتے ہیں ۔ اور ،ہود یکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی اس بات کا بین ثبوت ہے ۔ وہ بھی عشق اور کشف کو رہبر و رہنما سمجھتے ہیں ۔لیکن یہ اور بات کہ اس سلسلے میں اقبال کے دل کی آنکھ قرآن پاک اور پھر قرآن پاک ہی کی نسبت سے راز معنی مرشد رومی کشود ،فکر من برآ ستانش درسجود کے مصداق مولانا جلال الدین رومیؒ پر مرکوز رہتی ہے ۔

''حکمت بحیثہ''سے تعلق رکھنے والے مفکروں کے مطابق حسن تناسب و ہم آہنگی سے عبارت ہے ۔لیکن فلاطینوس حکمت ذوقیہ کے تحت کہتا ہے کہ ایسا نہیں بلکہ حسن ایک نور ہے جو اشیاء کے تناسب و ہم آہنگی کے اوپر چمکتا ہے اور اسی پر ان کی دلآویزی ونظر افروزی منحصر ہے ۔

فلاطینوس حسن کی دلکشی و دلآویزی کو زندگی کا مرہون منت سمجھتا ہے ۔نطشے زندگی کی اس خوبی کو وقت ، برگساں قوت حیات اور اقبال قوت خودی وقوت عشق کا نام دیتا ہے ۔ افلاطونس حسن کی معروضیت و موضوعیت دونوں کا قائل تھا ۔ اس طرح اس کا ذوق حسن قرآن پاک کے ذوق حسن ،'' وحدتِ جمال'' کی طرح اپنے عہد کے لحاظ سے بے نظیر تھا ۔

جوان الرگ شیخ شہاب الدین سہروردی فلاطینوسی تعلیمات کے زبردست حامی و پیرو کار تھے ۔ جمالیات کے حوالے سے ان کے نزدیک ہرنوع کے لئے ایک رب النوع ہوتا ہے ۔ جو ہمہ وقت اس کی تدبیر کے مطابق مصروف رہتا ہے ۔ انہوں نے نو افلاطونیت کو آگے بڑھاتے ہوئے روحانیت اور جنسیت کو باہم شیر وشکر کر دیا ۔ روحانیت صرف زندگی سے وابستہ ہے اس لئے شیخ الاشراق جنسی لذت کو روحانیت سے منسوب کرتے ہیں ۔ اور مثال یہ دیتے ہیں کہ مردہ حسین عورت کے ساتھ کوئی شخص مقاربت نہیں کرتا ۔ پتھر کی مورت خواہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اس مقصد کے لئے بالکل بیکار ہے ۔ نو خیز عورت میں روح کے آثار مسن عورت کے مقابلے میں زیاد ہوتے ہیں اس لئے شیخ الاشرق کے نزدیک جنسی فعل کے لئے نوخیز

عورت زیادہ پسند کی جاتی ہے ۔ فلاطینوس مجسمے اور زندہ یا مردہ انسان کی مثال سے حسن اورزندگی کے تعلق کی وضاحت کرتے ہیں ۔ جبکہ شیخ الاشراق بڑھاپے اور جوانی کی مثال سے واضح کرنے کے دوران میں جنسی عنصر بھی ملا دیتے ہیں ۔

آیونی اور ایلیائی مفکرین کی طرح ''اشاعری'' تحریک نے بھی تخلیق کائنات کے بارے میں اپنے اعتقادات پیش کئے ہیں ۔ اشاعرہ کے نزدیک کائنات کی تخلیق ''واجب الوجود'' نے جواہر سے کی ہے ۔ بلکہ تخلیقی عمل اب بھی جاری ہے ۔ اس سے قبل سقراط سے بھی پہلے لیوسی پس جواہر سے تخلیق کائنات کا نظریہ پیش کر چکا تھا ۔ اشاعرہ یا تو لیوسی پس سے متاثر ہوئے یا علامہ اقبال کے مطابق ان کا یہ عقیدہ قرآن پاک کی اس آیت پر مشتمل تھا ۔

و ان من شی الا عند نا خزائنه و ماننزله الا بقدر معلوم

اشاعری تحریک کا بانی الاشعری ہے ۔ جس نے عباسی خلفاء کے زیر پرستی پھلنے پھولنے والی عقلیت کے خلاف اشاعری تحریک کا آغاز کیا ۔ الاشعری نے علمائے عقلیت (معتزلہ) سے تعلیم پا کر انہی کے حربوں سے عقلیت کو ختم کرنے کی کوشش کی ۔

اشاعری حکماء عقلیین کے برعکس صفات باری تعالیٰ کے قائل تھے ۔ ان کے نزدیک ''حسن مطلق'' انتہائی واجب الوجود ہستی ہوتے ہوئے اپنی صفات کو اپنی ہی ہستی میں رکھتا ہے ۔ یہ تحریک فلسفہ ارسطو کی مشائیت اور پری پتا تک یعنی مدرسیت کے خلاف سیسہ پگھلی دیوار بن کر کھڑی ہوگئی ۔ تا کہ غیر اسلامی عناصر کو اسلام سے خارج کر دے ۔ اشاعرہ کے مطابق بجا طور سے ہر ممکنہ ہستی کے لئے ایک علت گویا کہ سبب ناگزیر ہے ، کائنات ممکن ہے ، لہٰذا اس کی ایک علت ہے جو کہ ''حسن مطلق'' ، یعنی خدا ہے ۔

لیکن اقبال علمی بحث و مباحثوں اور مجادلوں سے مطمئن دکھائی نہیں دیتے ۔ دراصل وہ فلسفے کی کسی بھی شاخ کو ''عرفان حقیقت'' کے لائق نہیں سمجھتے ۔ مکدر کردمغرب چشمہ ہائے علم وعرفاں را ، جہاں را تیرہ تر

بنایا ذروں کو ترکیب سے کبھی عالم   خلاف معنی تعلیم اہل دیں میں نے (۱)

سازد چہ مشائی چہ اشراقی ، اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال کے نزدیک افلاطون ، ارسطو اور فلاطینوس کی تعلیمات نے علم وعرفان کے صاف و شفاف چشمے کو گدلہ کر دیا ہے ۔ ارسطو کی مدرسیت کا جلوتی فلسفی ہو یا میخانہ تصوف کا خلوتی دونوں ہی

---

(۱) بانگِ درا۔۸۲۔ ''سرگذشتِ آدم''۔

اندھے، بے ذوق اور خالی جام ہیں۔ فلسفی تو ویسے بھی عاشق نہیں ہوتا، صوفی کا جام قلب بھی مئے عشق سے خالی ہے۔

جلوتیانِ مدرسہ کورنگاہ و مردہ ذوق خلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو

اور پھر ایں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں، کسی چمن میں گریبان لالہ چاک نہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علم کلام!
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردا رنہ ہو خودمسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام!
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام!
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملا، نہ فقیہہ وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام!

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امات کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام! (۱)

چنانچہ اقبال دعا کرتے ہیں کہ مسلمان علمی و عقلی بحثوں سے نکل کر قیل و قال کے جھگڑوں سے توبہ تائب ہو کر کوئی عملی اور مثبت کام کریں۔ تا کہ خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو، وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیغام

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو (۲)

علم کلام کے استدلالیوں اور منطقیوں نے باتوں کے پل بناتے ہوئے حقیقت کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ جس کے نتیجے میں کیا کیا خضر نے سکندر سے، اب کسے رہنما کرے کوئی اور ہر ایک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟ ایسے میں حیراں ہوں دل کو روؤں و یا پیٹوں جگر کو میں، مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں، دل کو روؤں و یا جگر کو اے میر، اپنی دونوں سے آشنائی تھی، بس ابن مریم ہوا کرے کوئی، میرے دکھ کی دوا کرے کوئی۔ کیوں کہ:۔

یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے کہ خود حرم ہے چراغ حرم کا پروانہ
نصیب خطہ ہو یا رب وہ بندۂ درویش کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ (۳)

مسلمان علم کلام اور عقلیت کے جھگڑوں اور مجادلوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان سے کوئی تعمیری و عملی کارنامہ سرانجام

(۱) ضرب کلیم۔ ۲۵۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۱۷۳۔ (۳) ارمغان حجاز۔ ۴۱۔

ہونے سے رہا۔ اقبال طنزاً ابلیس سے کہلواتے ہیں کہ:۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟ ہیں صفات ذات حق، حق سے جدا یا عین ذات؟
آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے یا مجدد، جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات ؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات ؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات!
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات! (۱)

یہ زبوں حالی اس لئے ہے کہ مسلمان عشق و لگن سے دور ہو کر خالی خولی زبانی کلامی دعوؤں میں مشغول ہیں۔ کردار کے غازی بننے کی بجائے، وہ محض گفتار کے غازی بنے پھرتے ہیں۔ یہی حال مغرب کا ہے، وہاں عقل و فلسفے کا دور دورہ ہے اور ''اقبال کے ذوق جمال'' کے مطابق عقل و فلسفہ حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کہ خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں، ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں اور خرد نے مجھ کو

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے جس نے سیے، ہیں تقدیر کے چاک! (۲)

عطا کی نظر حکیمانہ، سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ۔ عقل سوچتی رہ جاتی ہے، وہ مختلف مصلحت اندیشیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ جبکہ عشق جراءت رندانہ سے کام لیتے ہوئے ایک ہی نعرۂ مستانہ کے ذریعے گوہر مقصود تک جا پہنچتا ہے۔ اس لئے:۔

شریک حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش حذر زبیعت پیرے کہ مرد غوغانیست! (۳)

---

(۱) ارمغان حجاز۔۱۳۔۱۴۔۱۵۔ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ''۔ (۲) ضرب کلیم۔۱۱۳ (۳) جاوید نامہ۔۱۱۷۔

یا عقل کی روباہی ، یا عشق ید اللہی　　یا حیلۂ افرنگی ، یا حملہ ء ترکانہ! (۱)

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری　　نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری! (۲)

عشق یقین و ایقان اور ایمان کا نام ہے ۔ جبکہ عقل و فلسفہ بے یقینی اور تشکیک کے غلام ہیں ۔ جس چیز کو حقیقت پر یقین ہی نہ ہو وہ اسے کیوں کر پا سکتی ہے ۔ اور اگر اسے یقین آ جائے تو پھر فلسفہ فلسفہ نہیں رہتا بلکہ عشق بن جاتا ہے ۔ گویا کہ عشق بلند بال ہوتے ہوئے فلسفے سے اونچا مقام رکھتا ہے ۔ جیسا کہ پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں ، کرگس کا جہاں اور ہے ، شاہیں کا جہاں اور ، الفاظ و معانی میں کچھ فرق نہیں لیکن ، ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور ، کرگساں را رسم و آئیں دیگر است ، سطوت پرواز شاہیں دیگر است ، رزق زاغ و کرگس اندر خاک گور ، رزق بازاں در سواد ماہ و ہور ۔

اقبال سو سو طرح سے فلسفے اور عشق کے مابین فرق بیان کرتے ہیں اور ہر بیان میں ایک نیا اور اچھوتا پن پایا جاتا ہے ۔ نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے ، شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں ۔ عشق قلب زندہ میں اپنا مسکن بناتا ہے ۔ دل مردہ سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔ اس لئے کہ شاہباز مردار خور نہیں ہوتا ۔ فلسفہ دل کو مردہ بنا دیتا ہے ۔ یہ حقیقت نہیں وہ حقیقت نہیں ، یہ سراب ہے ۔ یہی حقیقت ہے ، بس اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ۔ فلسفے کی انہی بھول بھلیوں اور تاریک گلیوں میں کسی موڑ پر دل ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا ہے ۔ اور اس طرح فلسفے کے ہاتھوں اسے کبھی حضور نصیب نہیں ہوتا ۔ بے حضوری ہی کی بناء پر وہ دم توڑ دیتا ہے اور دم توڑنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے حضور ہو جاتا ہے ۔ اقبال کیا خوب کہتے ہیں کہ بے حضوری ہے تری موت کا راز ، زندہ ہو تو تو بے حضور نہیں ۔ اور عقل گو آستاں سے دور نہیں ، اس کی تقدیر میں حضور نہیں ، دل بینا بھی کر خدا سے طلب ، آنکھ کا نور دل کا نور نہیں ۔ دل بینا دل زندہ ہی ہو سکتا ہے ۔ مردہ تو بصارت سے محروم ہوتا ہے ۔

گزشتہ ابواب سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ " اقبال کے ذوق جمال " میں عشق ہی عشق ہے ۔ اسی مناسبت سے میں نے " نظریہ جمال " کی بجائے " اقبال کے ذوق جمال " کی اصطلاح اختراع کی ہے ۔ نظریہ فلسفے کا ہو سکتا ہے ۔ عشق کا نہیں ہوتا ۔ عشق ، ذوق و شوق ہے ایک تڑپ و آرزو ہے ۔ جو اقبال کے ذوق جمال کی روح رواں ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا پختہ ایمان ہے کہ فلسفہ " حقیقت اولیٰ " یا " حسن مطلق " کی حضوری سے بے نصیب رہتا ہے ۔ حکیماں گرچہ صد پیکر شکستند ، مقیم سومنات بود و ہستند ، چساں افرشتہ و یزداں بگیرند ، ہنوز آدم بفترا کے نہ بستند ۔ اور بلند بال تھا ،

---

(۱) بال جبریل ۔ ۶۸ ۔　　(۲) ضرب کلیم ۔ ۴۳ ۔

لیکن نہ تھا جسور و غیور، حکیم سرمحبت سے بے نصیب رہا! پھر انضاؤں میں اگر چہ شاہیں وار، شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا۔

فلسفے اور عشق کے درمیان اقبال ملا، مجاہد اور کرگس و شاہین کا سا فرق بتاتے ہیں۔ ملا صرف گفتار کا غازی ہے اور مجاہد کردار کا۔ اور بال بازاں راسوئے سلطاں برد جبکہ بال زاغاں را بگورستاں برد۔ علاوہ ازیں عقاب کی بلند پروازی اور کوے کی مرداروں پر نچلی پرواز میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پس یہی فرق فلسفے اور عشق کے درمیان ہے۔ چنانچہ اقبال فلسفے سے امیدیں وابستہ کرنے کی بجائے دامن عشق تھامتے ہیں۔ کہ ''حسن مطلق'' تک عشق ہی کی رسائی ہو سکتی ہے۔ فلسفہ بذات خود اندھا ہے دوسروں کی رہنمائی و رہبری کیا کرے گا۔ یہ خود تیرہ و تار ہے۔ زندگی کی شب تاریک میں روشنی کیسے پھیلا سکتا ہے۔

عقل بے مایہ امانت کی سزا وار نہیں — راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کار حیات
فکر بے نور ترا، جذب عمل بے بنیاد — سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تار حیات

اقبال کے نزدیک بجا طور پر عقلیت پسندی اور فلسفہ پرستی، راہ شوق کے مسافر کو اپنے گردوغبار ہی میں گم کر دیتی ہے۔ گویا کہ راہ شوق کا راہی فلسفے اور عقلیت میں اپنا راستہ ہی کھو بیٹھتا ہے۔ اسی لئے بوعلی سینا غبار ناقہ میں گم ہو گئے اور رومی نے دامن عشق تھام کر پردۂ محمل کو جالیا، جس میں جلوۂ حسن مطلق جلوہ گر ہے۔ رومی نے عشق کے ایک ہی غوطے سے گوہر مقصود کو پالیا۔ مگر بوعلی سینا علم کلام اور عقلیت پسندی کی وجہ سے، تنکے کی طرح فلسفے کے بھنور ہی میں چکر کاٹتے رہے۔

بو علی اندر غبار ناقہ گم — دست رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فروتر رفت و تا گوہر رسید — آں بگردابے چوخس منزل گرفت

اسی بنا پر، مطرب غزلے بیتے از مرشد روم آور، تا غوطہ زند جانم در آتش تبریزے، شمع خود را ہمچو رومی برفروز، روم را در آتش تبریز سوز۔ اقبال فلسفے اور عقل کو آتش عشق میں ڈال کر عشق بنا دینا چاہتے ہیں۔ جس طرح رومی کا قال، حال میں تبدیل ہو گیا اسی طرح، قال را بگذار و باب حال زن، نور حق بر ظلمت اعمال زن۔ یاد رکھ، دین مجو اندر کتب اے بے خبر، علم وحکمت از کتب دیں از نظر۔ بوعلی دانندۂ آب و گل است لیکن بے خبر از خستگیہائے دل است۔ نیش و نوش بوعلی سینا بہل اس

لئے کہ چارہ سازی ہائے دل از اہل دل ۔ اور فلسفے کی زبوں حالی اور لاحاصل آوارہ گردی کا یہ عالم ہے کہ :۔

دشت و کہسار نور دید و غزالے نگرفت   طوف گلشن زدو یک گل بہ گریبانش نیست

علے کہ تو آموزی مشتاق نگاہے نیست ، واماندۂ راہے ہست ، آوارۂ راہے نیست اور واقعی معجزۂ اہل فکر فلسفہ پیچ پیچ ، جبکہ معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون وطور ۔ حیرت آغاز و انتہا ہے ، آئینے کے گھر میں اور کیا ہے ۔ واہ جی واہ ، یا رب یہ کیا طلسم ہے ادراک وفہم یاں ، دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے ۔ بے شک پائی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک ، مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی ۔ مرا از منطق آید بوئے خامی ، دلیل او دلیل ناتمامی ، بروبیم بستہ درہا را کشاید ، دوبیت از پیرومیؒ یا زجامیؒ ۔

عقل و فلسفہ زمان و مکاں سے رشتہ بپا اور بے پرو بال ہوتے ہوئے قوت پرواز سے محروم ہیں ۔ ایسے میں فلسفے کے لئے حقیقت تک رسائی حاصل کرنا محال ہے ۔ اور مغربی فلسفی کے لئے تو اقبال کا پیغام یہ ہے کہ ، از من اے بادصبا گوے بدانائے فرنگ ، عقل تابال کشود است گرفتار تر است ۔ بس ، اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے ۔

اسی لئے مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم ، تا غلام شمس تبریزی نہ شد ۔ کیوں کہ صحبت اہل صفا نور و حضور و سرور ، سرخوش و پرسوز ہے لالہ لب آبجو ۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں ، اسے کیا خبر کہ کیا ہے راہ و رسم شہبازی ۔ اور ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی ، خراب کرگئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ ۔ واقعی ، می نہ روید تخم دل زآب وگل ، بے نگاہے از خداوندانِ دل ۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ

جرۂ شاہینی بمرغان سرا صحبت مگیر   خیز و بال و پر کشا پرواز تو کوتاہ نیست (۱)

جب تک انسان کسی مرد خدا سے فیض یاب نہیں ہوتا اس وقت تک انسان کی قدر و منزلت اس دنیا میں گھاس کے تنکے کے برابر بھی نہیں ہوتی ۔

اندر ایں عالم نیرزی باخسے   تا نیاویزی بدامان کسے

عشق ایسی اکسیر ہے کہ بس ، تپش می کند زندہ تر زندگی را ، تپش می دہد بال وپر زندگی را اور زندگانی سوختن باساختن ، درگلے تخم دلے انداختن ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کہتے ہیں ، شوق مری لے میں ہے ، شوق مری نے میں ہے ، نغمہ ء اللہ ہو

---

(۱) زبور عجم ۔۸۷۔

میرے رگ و پے میں ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ دگر است آنسوے نہ پردہ کشادن نظرے، ایں سوے پردہ گمان وظن وتخمین دگراست۔

علاوہ ازیں زمانے کا دل اپنے اندر سرایت کرتے ہوئے زہر کی وجہ سے فریاد کر رہا ہے، لیکن خرد آنسو بہا رہی ہے کہ اس کے پاس اس زہر کا کوئی مداوا نہیں۔ مطلب یہ کہ ''اقبال کے ذوق جمال'' کے مطابق حکمت وفلسفہ مشکل کشائی کرنے کی بجائے، الٹا مزید مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ فلسفے کے بارگراں سے کوئی عاشق ہی چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ عشق ہی فلسفے کی ڈالی ہوئی سرگرانی سے نجات کا واحد راستہ ہے۔

دلِ گیتی ! انا المسموم ، انا المسموم فریادش	خرد نالاں کہ ما عندی بتریاق ولا راقی
حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا	حضرِ من از سرم ایں بار گراں پاک انداز

اقبال کو علم و دانش وعقل وفلسفے کی شاخ میں ایسا کوئی کانٹا دکھائی نہیں دیتا جسے دل میں چھویا جا سکے۔ یعنی فلسفہ دل کو گرما نہیں سکتا۔ لہٰذا ایسے علم و دانش سے جہالت ہزار درجہ بہتر ہے۔ جس کی تصدیق دل نہ کرتا ہو۔ عقل کی گتھیاں سلجھانے میں اگر چہ اور طرح کا لطف ہے، لیکن سادہ دلوں کا ایمان دقیق نکات سے خوب تر ہے۔ اقبال فلسفے وعلم کلام کی سطحیت و بے ہمتی کی بناء پر دونوں کو ذہن کی تختی سے دھو ڈالتے ہیں۔ فلسفے کی تاریخ بتا رہی ہے کہ اکثر فلسفی درباروں کے پروردہ ہیں۔ لیکن عاشق کی بات اور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال سلطانی دربار سے دور رہتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں کافر نہیں ہوں کہ ''حسن مطلق'' کے علاوہ کسی بے اختیار خدا کی پرستش کروں۔ بلکہ خدا بھی اگر اپنی خدائی کی زکات کے طور پر کچھ خدائی اقبال کو دے تو وہ اسے بھی لینے سے انکاری ہیں۔

چہ کنم چہ چارہ گیرم کہ زشاخِ علم و دانش	نہ دمیدہ ہیچ خارے کہ بدل نشانم اورا
ہزار بار نکوتر متاعِ بے بصری	زدانشے کہ دل اورانمی کند تصدیق
پیچ و تابِ خرد گرچہ لذت دگراست	یقینِ سادہ دلاں بہ زنکتہ ہائے دقیق
کلام و فلسفہ از لوحِ دل فروشستم	ضمیر خویش کشادم بہ نشترِ تحقیق
ز آستانہء سلطاں کنا رہ می گیرم	نہ کافرم کہ پرستم خدا ے بے توفیق (۱)

(۱) زبور عجم۔ ۱۱۳۔۱۱۴۔

فریب کشمکش عقل دیدنی دارد ، کہ میر قافلہ و ذوق راہزنی دارد ، نشان راہ زعقل ہزار حیلہ مپرس ، بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد ۔ بگذر از عقل و درآویز بموج یم عشق ، کہ درآں جوے تنک مایہ گہر پیدا نیست ۔ اقبال ہمیشہ رجائیت پسند ہیں اس لئے کہ عاشق ہوتا ہی رجائی ہے ۔ ورنہ آتش نمرود میں بے خطر کون کود سکتا ہے؟ اس لئے کہتے ہیں ، خذر از خرد کہ بندد ہمہ نقش نامرادی ، دل ما برد بسازے کہ گسستہ تار بادا ۔ اور نرسد فسوں گیری خرد بہ تپیدن دل زندہَ ، زکنشت فلسفیاں درآ بحریم سوز و گداز من ۔ چونکہ شعلہ درآغوش دارد عشق بے پروائے من ، برنخیزد یک شرار از حکمت نازائے من ۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے   جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

مامون الرشید کے عہد میں یونانی فلسفے وحکمت کو جب عربی زبان میں منتقل کیا گیا تو اسلامی فکر ونظر ایک بڑے دھچکے کا شکار ہوگیا ۔ جس کے نتیجے میں دین کو عقل کا تابع ہونا پڑا ۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں ۔ تمدن تصوف ، شریعت کلام ، بتان عجم کے پجاری تمام حقیقت ،خرافات میں کھوگئی ، یہ امت روایات میں کھوگئی ۔ اگر چہ ،لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب ،مگر لذت شوق سے بے نصیب ، بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا ، لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا ۔ ایسی صورت حال میں بلا شبہ ، حریف نکتہ توحید ہو سکا نہ حکیم ، نگاہ چاہئے اسرار لاالہ کے لئے ، اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا ، جو کہتی تھی خرد سے کہ بہانے نہ تراش ، ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے ۔ گرفتہ چینیاں احرام ومکی خفتہ دربطحا اور یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے ، گلیم بوذرؓ و دلق اویسؒ و چادر زہراؓ ۔ پس اسی وجہ سے ، زبزم صوفی و ملا بسے نمناک می آیم ۔ یہیں سے عجمی تصوف بھی اسلامی تعلیمات میں داخل ہوا تو اب ہجرہ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی ، خون دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز ۔ سبوئے خانقاہاں خالی از مے ، کند ''مکتب'' رہ طے کردہ راطے ، دل ملا گرفتار غمے نیست ، نگاہے ہست درچشمش نمے نیست ، ازاں بگریختم از مکتب او ، کہ در ریگ حجازش زمزمے نیست ، واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو ، کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی ۔ اقبال ملا وصوفی کے حجرے سے یہ کہتے ہوئے غمناک اٹھے ہیں کہ تو نامہء اعمال اور میزان قیامت کی باتیں تو کرتا ہے ، مگر میں حیران ہوں تجھے غلامی و ذلالت کی یہ قیامت نظر نہیں آتی جو اس وقت برپا ہے ۔ مکتب و میخانہ پر مجھے اعتبار نہیں ۔ میں ایسے بے فیض در پر سجدہ نہیں کرتا ۔

سخن زنامہ و میزاں دراز ترگفتی   بحیرتم کہ نہ بینی قیامت موجود

ازاں بمکتب و میخانہ اعتبارم نیست   کہ سجدۂ بزم بردر جبیں فرسود!   (۱)

واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست ، اعتبار ملت بیضا شکست ، واعظ ما چشم بربتخانہ دوخت ، معنیِ دین مبیں فتوی فروخت ۔ پھر اگر مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے ، یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے ۔صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال ، ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار ، ایسے میں وہ مرد مجاہد نظر آ تانہیں ان کو (اقبال کو) ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار ، اس لئے کہ مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں ، بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست ۔ ادھر فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور ، کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست ۔ ہر کوئی مست مے ذوق تن آسانی ہے ۔ حیدری فقر ہے نہ دولت عثمانی ہے ، تم مسلماں ہو یہ انداز مسلمانی ہے ، تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے۔اور خبردار ! وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر ۔

خوار از مہجوری ء قرآں شدی   شکوہ سنج گردش دوراں شدی   (۲)

ایسے میں اگر چہ پیر حرم ورد لا الہ دارد ، کجا نگاہ کہ برندہ تر از پولاد است ۔ درحقیقت ہیچ شک نیست کہ ، سرمنبر کلامش نیش داراست ، کہ اورا صد کتاب اندر کنار است ، واعظ دستاں زن افسانہ بند ، معنئی اوپست وحرف او بلند ۔ از خطیب دیلمی گفتار او ، با ضعیف و شاذو مرسل کار او ۔ صوفی ء پشمینہ پوش حال مست ، از شراب نغمہ قوال مست ، آتش از شعر عراقی در دلش ، در نمی سازد بقرآں محفلش ۔ جبکہ :۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اور اگر چہ از طور وکلیم است بیان واعظ ، تاب آں جلوہ بآئینہ گفتارش نیست ۔ جبکہ شعور و ہوش وخرد کا معاملہ ہے عجیب ، مقام شوق میں ہیں سب دل ونظر کے رقیب ، میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا ، مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب۔ بس

چیست یاراں بعد ازیں تدبیر ما   رخ سوئے میخانہ دارد پیر ما

ایسی حالت زار کے پیش نظر اقبال یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بروں آ از مسلماناں گریز اندر مسلمانی ، مسلماناں روادارند کافر ماجرائی ہا ، میکدۂ تہی سبو حلقہ خود فراموشاں ، مدرسہ بلند بانگ بزم فسردہ آتشاں ۔ فکر گرہ کشا ، غلام ، دیں بروایتے

---

(۱) زبور عجم ۔۱۱۸   (۲) اسرار ورموز ۔ ۱۶۵۔

تمام، زانکہ درون سینہ ہا دل ہدفے است بے نشاں یہ عجمی تصوف کا اثر ہے کہ مومنینہ بہ برکردی و بے ذوق تپیدی، آں گونہ تپیدی کہ بجائے نہ رسیدی، درانجمن شوق تپیدن دگر آموز۔ ایسے میں اقبال ''پیر ما'' کو راہ راست پر لانے کی خاطر ایک انوکھی تدبیر سوچتے ہیں جو کہ یہ ہے، ازاں پیش بتاں رقصیدم و زنار بربستم، کہ شیخ شہر مرد با خدا گردد ز تکفیرم۔ اور وقت است کہ بکشائم میخانہء رومی باز، پیران حرم دیدم درصحن کلیسا مست۔ فلسفے اور عجمی تصوف کے زیر اثر مسلمان پستی و گراوٹ کی ایسی اتھاہ گہرائیوں میں گر گئے۔ کہ نہ ان میں کلیم کا سلیقہ رہا اور نہ خلیل کا قرینہ۔ ان میں کوئی جادوئے سامری سے ہلاک اور کوئی شیوۂ آزری سے قتل ہوا۔ آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر، کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں۔ مسلمان نہ رہے، ان کے رہنے سہنے کے آثار رہ گئے۔ ہسپانیہ میں عرب مسلمانوں کی مہمان نوازی، کالی آنکھیں، سیاہ بال اور نرالی چال باقی رہ گئی۔ مگر مہمان نوازی اپنے مہمانوں کو، چال اپنے پاؤں کو، بال اپنی کھوپڑیوں کو اور آنکھیں اپنے چہروں کو بھول چکی ہیں۔

رفت سوز سینہ تاتارو کرد   یا مسلماں مُرد یا قرآں بمرد! (۱)

رونا اس بات کا ہے کہ، درصد فتنہ رابر خود کشادی، دوگامے رفتی و از پا فتادی، برہمن از بتاں طاق خود آراست، تو قرآں رابر طاقے نہادی۔ صوفیہ کے پاس خرقہ تو ہے لیکن ان کے سبو معرفت سے خالی ہیں۔ فریاد! کہ کوئی نہیں جانتا کہ مئے عشق الٰہی کہاں ہے۔

بزیر خرقہء پیراں سبوچہ ہا خالی است   فغاں کہ کس نشاسد مئے جوانہ کجاست (۲)

دریائے کبیر کے کنارے مسجد قرطبہ، غرناطہ کا الحمرا اور عبدالرحمان الداخل کی بوئی ہوئی صحرائے عرب کی حور درنسل کھجور اب بھی ہے۔ لیکن وہاں مسلمان اور اسلام نہیں۔ مسلمانوں کی مجموعی حالت زار کو سنوارنے اور انہیں پھر سے زندہ و بیدار کرنے کی غرض سے اقبال نے اپنی شاعری کا صور پھونکا اور اس طرح انہوں نے لاہور سے لے کر بخارا و سمرقند تک کے دلوں کو ایک ولولہء تازہ سے گرما دیا۔ انہوں نے نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر مسلمانوں کو پاسبانی حرم کے لئے ایک اور نیک کرنے کی کوشش کی۔ اس کام میں انہوں نے اپنے دل کا خون کر دیا۔ دل پر اتنے زخم کھائے کہ ان کا دل کندۂ قصاب بن گیا۔

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۷۵۔

(۲) زبور عجم۔ ۷۸۔

وہ یہ سب کچھ اس امید پر کرتے رہے کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی ۔ اگر چہ :۔

محفل ما بے مے و بے ساقی است ساز قرآں را نوا ہا باقی است (۱)

یہ تو تھے علم کلام، فلسفے اور عجمی تصوف کے اسلام پر منفی اثرات اور فلسفے و عشق کے مابین فرق جو اس باب کے آغاز ہی میں زیر بحث لایا گیا ہے۔جس کے حوالے سے یہ بات طے شدہ ہے کہ اقبال عشق کے مقابلے میں فلسفے کو اہمیت نہیں دیتے ۔ اس لئے وہ فلسفیوں ،منطقیوں اور ماہرین علم کلام کی بجائے عشق اور عاشقوں سے متاثر ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق ''حسن ازل'' کے حضور میں مقرب ہے ۔ اور عقل و فلسفہ کی تقدیر میں حضور نہیں ۔ شیطان بھی عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے فلسفی بن گیا اور ''حسن مطلق'' سے دور ہوگیا ۔ حالانکہ فلسفی بننے سے پہلے ''خواجہ اہل فراق'' نے ''حسن ازل'' کا دیدار بھی کر رکھا تھا ۔ بہر حال یہ ہے فلسفی کا حال جبکہ عاشق کی کشت جاں شعلوں کے پھولوں سے مہکتی چلی جاتی ہے ۔

اقبال کے نزدیک عشق ایک ایسی قوت ہے، جس کے اثر سے ہر پست کو بالا کیا جاسکتا ہے ۔عشق میں طاقت پرواز ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال معروضی یا تجزیاتی اور موضوعی یا تصوراتی فلسفے کی بجائے عشق کے بال و پر لگا کر اور اپنی مشت خاک کو جگنو بنا کر محو پرواز ہو جانا چاہتے ہیں ۔ اس لئے کہ فلسفے کے پر تو ہوتے نہیں کہ کوئی انہیں لگائے اور پرواز کرے ۔عشق شور انگیز کی سطوت پرواز کی شان ہی نرالی اور جلالی و جمالی ہے ۔ اقبال کو عشق پر اتنا یقین ہے کہ وہ بے دھڑک یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ :۔

ایں بدن با جانِ ما انباض نیست مشت خاکے مانعِ پرواز نیست

بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند

فلسفہ کیا ہے کرمک و مور اندر گور، کرگس و زاغ و زغن مردہ خور ۔ جبکہ عشق دم جبرئیل ،عشق دل مصطفیٰ ،عشق خدا کا رسول ،عشق خدا کا کلام ۔عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک ،عشق ہے صہبائے خام ،عشق ہے کاس الکرام ۔ اور عشق کے مضراب سے نغمہء تار حیات عشق سے نور حیات ،عشق سے نار حیات ۔

قرآنی تعلیمات کی بناء پر اقبال مولانا روم کو علامت عشق کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔اور مختلف انداز سے عشق کی وضاحت اور صراحت کی خاطر ''روم و تبریز'' کا ذکر بھی کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ کلیم ، دست کلیم اور ید بیضا بھی عشق کی علامتیں ہیں جبکہ طور، جلوۂ طور ،شعلہ سینائی اور زندگی سے ''حسن ازل'' یا ''حسن مطلق'' مراد لیتے ہیں ۔

---

(۱) جاوید نامہ ۔ ۸۱۔

بہر حال ''اقبال کے ذوق جمال'' میں عشق ہی سب کچھ ہے ۔اس واسطے عشق امیر جنید، عشق فقیہہ حرم اور عشق ہے میروں کا میر ۔ پس ایں کار حکیمے نیست دامان کلیمے گیر، صد بندۂ ساحل مست یک بندۂ دریامست ، صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش ، لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف ، مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی ، اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف ۔لیکن اس کے برعکس ، تہی از ہائے و ہو میخانہ بودے ،گل ما از شرر بیگانہ بودے ، نبودے عشق و ایں ہنگامہ ء عشق ، اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے ۔عشق میں فرزانگی نہیں ہوتی اسی لئے جراءت رندانہ سے کام لیتا ہے ، ٹھیک ہے ہر دو بمنزلے روا ، ہر دو امید کارواں ، لیکن عقل بحیلہ می برد ، عشق بروکشاں کشاں ۔عشق میں جھجک اور پیش و پس نہیں ہوتا جس کی بناء پر ، عشق زیادہ آور دخیمہء شش جہات را ، دست درازی کند تا بہ طناب کہکشاں ۔ اور عقل ورق ورق بگشت عشق بہ نکتہء رسید ، طائر زیرکے برد دانہء زیر دام را ۔عشق کے ہیں معجزات ، سلطنت و فقر و دیں ، عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں ، عشق مکان و مکین ! عشق زمان و زمیں ، عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح یاب ۔''اقبال کے ذوق جمال'' میں دل قدم قدم پر خرد سے الجھتا رہتا ہے ۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفے کی خرد'' حسن مطلق'' سے دور ہی رہتی ہے ۔ جہاں تک اہل جنوں رسائی حاصل کر لیتے ہیں ، فلسفے کی کیا مجال کہ وہاں دم مار سکے ۔ چنانچہ پیر رومی خوب فرماتے ہیں کہ ۔فلسفی را زہرہ نے تا دم زند ، دم زند دین حقش برہم زند اور اقبال کے مطابق ، دانش مغربیاں فلسفہء مشرقیاں ،ہمہ بت خانہ و درطوف بتاں چیزے نیست ۔فلسفی کو چھوڑ جس نے حقیقت کو دیکھا نہیں ۔مگر اسے بیان کرتا ہے ۔ باتیں بہت بناتا ہے لیکن لذت دید سے آشنا نہیں ۔

گذر از انکہ ندیدست و جز خبر ندہد سخن دراز کند لذت نظر ندہد (۱)

چنانچہ بہتر یہی ہے کہ بگذر از خاور و افسونیء افرنگ مشو ، کہ نیرزد بجوے ایں ، ہمہ دیرینہ و نو ۔حکیم مری نواؤں کا راز کیا جانے ، ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں ۔

عشق کی فیض رسانیوں اور مہربانیوں کی کیا بات ۔ یہاں تک کہ ، بود نقش ، ہیستم انگارۂ ، ناقبولے ناکسے ناکارۂ ، عشق سوہاں زد مرا آدم شدم ، عالم کیف و کم ، عالم شدم ،حرکت اعصاب گردوں دیدہ ام ، دررگ مہ گردش خوں دیدہ ام ۔گویا عشق زماں و مکاں کے فاصلوں کو بھی مٹا دیتا ہے ۔ دوریاں ،دوریاں نہیں رہتیں ۔ عاشق اگر زمین پر سے دیکھے تو اسے آسمان کے زندہ اور جلیل و جمیل دھڑکتے اعصاب دکھائی دیتے ہیں اور مہتاب کی رگوں میں گردش کرتا ہوا خون بھی دیکھ سکتا ہے ۔

---

(۱) زبور عجم ۔۱۲۷۔

عشق نازک شیشے کو سخت ترین پتھر اور مٹی کو شعلہ ءطور بنا دیتا ہے ۔ عقل اور فلسفہ ایسا معجزہ ہرگز نہیں دکھا سکتے ۔ تا کجا خود را شماری ماء وطین ، از گل خود شعلہ طور آفریں۔ عشق صبغتہ اللہ ہے ۔ عشق اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ دینے کا نام ہے ۔ اس لئے ، اقبال کہتے ہیں ، گوہرے دریائے قرآں سفتہ ام ، شرح رمز صبغتہ اللہ گفتہ ام ، قلب را از صبغتہ اللہ رنگ دہ ، عشق را ناموس و نام و ننگ دہ ، طبع مسلم از محبت قاہراست ، مسلم ار عاشق نباشد کافراست ۔ کیوں کہ :۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق! عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

سینے میں جب تک سوز عشق موجود ہو تو دل دل ہی رہتا ہے ۔ لیکن جونہی سوز عشق ختم ہو جائے تو دل مٹی بن جاتا ہے ، چہ می پرسی میان سینہ دل چیست ، خرد چوں سوز پیدا کر د دل شد ، دل از ذوق تپش دل بود لیکن ، چو یک دم از تپش افتاد ، گل شد۔ عشق میں ایسی معجزاتی تاثیر ہے جس کی بدولت پیکر خاکی جام حق بن جاتا ہے ۔ یہ قطرے میں قلزم کو بند کر دیتا ہے۔ عشق انسان کے سارے بدن کو دل بنا دیتا ہے ۔ جس میں ''حسن مطلق'' کی ہر ادا صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہے ۔ عقل دماغ میں بتکدہ تعمیر کرتی ہے ۔ جبکہ عشق بت شکن ہوتے ہوئے اس بت خانے کو حرم میں تبدیل کر دیتا ہے ۔

سفالم را مئے او جام جم کرد درونِ قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بتخانہ ریخت خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد

عشق کے بل بوتے پر ، دل بے باک را ضرغام رنگ است ، دل ترسندہ را آہو پلنگ است ، اگر بیمے نداری بحر صحراست ، اگر ترسی بہر موجش نہنگ است ۔ اور ریخت ہنر ہائے من بحر بیک نائے آب ، تیشہء من آورد از جگر خارہ شیر ، بلکہ ، تیشہ اگر بسنگ زد ایں چہ مقام گفتگوست ، عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را ۔ عشق بڑی سے بڑی مشکل کو آسان بنا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ملا اور فلسفی کو بھی انسان بنا دیتا ہے ۔

عشق کی مزید توضیح وتشریح میں اقبال کہتے ہیں کہ ، اگر نہ بوالہوی باتو نکتہ گویم ، کہ عشق پختہ تر از نالہ ہائے بے اثر است ، درعشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست ، آں تیشہء فرہادے ، ایں حیلہ ء پرویزے ، رمز عشق تو بہ ارباب ہوس نتواں گفت ، سخن از تاب و تب شعلہ بہ خس نتواں گفت ۔

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثل ہوس پر شہباز سے ممکن نہیں پرواز مگس

اور اگر چہ متاعِ عشق را، عقل بہائے کم نہد، من ندہم بہ تختِ جم، آہ جگر گداز را، اگر چہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت، تو دل گرفتہ نہ باشی کہ عشق تنہانیست۔ اقبال عقل کے شیشے کو پتھر مار کر پاش پاش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ عقل برف کی طرح یخ بستہ ہے۔ ادھر عشق سوز و گداز اور جلنے کا نام ہے۔ پگھلنے کا نام ہے۔ عقل جلنے اور پگھلنے سے روکتی ہے۔ اس لئے، آہِ درونہ تاب کو، اشک جگر گداز کو، شیشہ بسنگ می زنم عقل گرہ کشارا، اے جان گرفتارم دیدی کہ محبت چیست ؟ درسینہ نیاسائی، از دیدہ بروں آئی۔

عشق وہ قوت مسخرہ ہے کہ، لاہوتیاں اسیر کمند نگاہ او، صوفی ہلاک شیوۂ ترکانہء دل است، محمود غزنوی کہ صنم خانہ ہا شکست، زناریء بتان صنم خانہ دل است، سطوت از کوہ ستانند و بکاہ بخشند، کلہ ء جم بہ گدائے سرراہ بخشند، گاہ شاہی بجگر گوشہ سلطان ندہند، گاہ باشد کہ بزندانیء چاہے بخشند۔ اس لئے کہ، جہان عشق نہ میری، نہ سروری داند، ہمیں بس است کہ آئین چاکری داند۔

عشق فیض و برکات اور لطف و کرم کا ایک ایسا دائمی سرچشمہ ہے کہ، زفیض عشق و مستی بردہ ام اندیشہ را آنجا، کہ از دنبالہ چشم مہر عالمتاب می گیرم، آدم کہ ضمیر او نقش دو جہاں ریزد، بالذت آہے ہست، بے لذت آہے نیست، عشق ازیں گنبد دربستہ بروں تاختن است، شیشہء ماہ زطاق خاک انداختن است۔ بردل بے تاب من ساقی مئے نابے زند، کیمیا ساز است و اکسیرے بہ سیمابے زند۔

اور، زور عشق از بادوخاک و آب نیست، قوتش از سختی اعصاب نیست، عشق با نانِ جویں خیبر کشاد، عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد، کلہ نمرود بے ضربے شکست، لشکر فرعون بے حربے شکست، عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر، ہم درون خانہ ہم بیرون در، عشق ہم خاکستر و ہم اخگراست، کار او از دین و دانش برتر است، عشق سلطنت است و برہان مبیں، ہر دو عالم عشق را زیر نگیں، لا زمان و دوش فردائے از و، جذب ایں دیرِ کہن باطل از و، عاشقاں خود را بہ یزداں می دہند، عقلِ تاویلی بقرباں می دہند۔

عقل سمجھی ہی نہیں معنیء پیغام ابھی   عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل

اقبال نے علم اور عشق کا موازنہ بھی کیا ہے۔ علم اچھی چیز ہے، اس نے ہماری خاک کو اکسیر بنا دیا مگر فرنگیوں پر اس

کا الٹا اثر ہوا۔ انہوں نے علم کے ذریعے انسان کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اس لئے کہ ان کے علم میں عشق کی آمیزش نہیں۔ جس کی بناء پر انہوں نے پیٹ اور روٹی کی خاطر دنیا کو میدان جنگ بنا دیا۔ انہوں نے کتے کی ناف سے کستوری بنالی۔ اشتراکیت کے لئے زندگی بغاوت کا نام ہے اور سرمایہ داری کا دارومدار ٹیکسوں پر ہے۔ اور چکی کے ان دو پاٹوں میں آدم شیشے کی طرح پس رہا ہے۔ یہ علم مذہب اور آرٹ کے ذریعے توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ وہ بدن سے جان اور ہاتھ سے نان چھین لیتا ہے۔ میں نے ان دونوں کو مادیت میں غرق دیکھا ہے۔ دونوں بدن کو چمکاتی اور روح کو تاریک کرتی ہیں۔

زندگی ایں راخروج آں راخراج　　درمیان ایں دوسنگ آدم زجاج!
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست　　آں برد جاں را زتن ، ناں را زدست
غرق دیدم ہر دو را درآب و گل　　ہر دورا تن روشن و تاریک دل! (۱)

کمزور اقوام کو لوٹنے اور دبانے کی خاطر "اقوام متحدہ" کا ڈھونگ رچایا۔ اقبال اقوام متحدہ کو انگریز کی داشتہ قرار دیتے ہوئے اس کے گلے میں ابلیس کا تعویز ڈالنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ طہران کو اقوام مشرق کا جنیوا قرار دیتے ہیں۔ تاکہ کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے۔ کیوں کہ یورپ کے ہر گرگ کو ہے برہ معصوم کی تلاش۔ قیامت ہے کہ انسان نوع انسان کا شکاری ہے۔ آسمان کے نیچے آدمی آدمی کو کھارہا ہے۔ قومیں قوموں کو لوٹ رہی ہیں۔

زیر گردوں آدم آدم را خورد　　ملتے بر ملتے دیگر چرد! (۲)
گرگے اندر پوستینِ برۂ　　ہر زماں اندر کمین برۂ (۳)
فکر جاں کن چوں زناں برتن متن　　ہمچو مرداں گوے در میداں فگن (۴)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال وطنیت کے سخت خلاف ہیں۔ لیکن یورپی تعلیم اور تہذیب و تمدن دوسروں کو پارہ پارہ کردینے کی غرض سے نیشنلزم کی تعلیم دے رہا ہے۔ تاکہ مخلوق خدا اقوام میں بٹ جائے اور مذہبیت اسلام کی جڑ کٹ جائے۔

ترک و ایرن و عرب مست فرنگ　　ہر کسے را درگلوشست فرنگ (۵)
غدار وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن　　انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر (۶)

سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ اصل کے لحاظ سے وہ مشرقی ہے۔ لیکن وہ مشرقی کہلاتا ہے نہ مغربی۔ اس لئے

---

(۱) جاوید نامہ۔۶۵۔　(۲) جاوید نامہ۔۱۶۰۔　(۳) پس چہ باید کرد۔۴۳۔　(۴) پس چہ باید کرد مثنوی مسافر۔۶۸۔
(۵) جاوید نامہ۔۶۲۔　(۶) ضرب کلیم۔۳۶۔ ہندی مسلمان

کہ ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی ۔ رہ دہر میں آزاد وطن صورت ماہی ۔ اور اللہ ہُو کہنے والا چار جہات کے اس نظام میں نہیں سماتا ۔ پرکاہ جو خاک سے ہے وہ بھی خاک سے اوپر اٹھتا ہے ۔ افسوس ہے اگر جان پاک خاک ہی میں مر جائے ۔ اگر چہ آفتاب شوخ و بے حجاب تجلیات کے ساتھ مشرق سے طلوع ہوتا ہے ۔ مگر وہ سوز درون کے باعث کشمکش میں رہتا ہے تا کہ مشرق و مغرب کی قید سے باہر نکل آئے ۔ وہ اپنے مشرق سے جلوہ مست نکلتا ہے ۔ تا کہ سارے آفاق کو اپنی لپیٹ میں لے لے ۔ اس کی فطرت مشرق و مغرب سے آزاد ہے ۔ اگر چہ نسبت کی رو سے وہ مشرقی ہے ۔ یہی اقبال کا آفاقی پیغام ہے ۔

می نگنجد آں کہ گفت اللہ ھو   درحدود ایں نظام چار سو

پر کہ از خاک و برخیز د زخاک   حیف اگر درخاک میرد جان پاک

گر چہ از مشرق برآید آفتاب   با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب

درتب و تاب است از سوز دروں   تازقید شرق و غرب آید بروں

بردمداز مشرق خود جلوہ مست   تاہمہ آفاق را آرد بدست!

فطرتش از مشرق و مغرب بری است

گرچہ او از روئے نسبت خاوری است! (۱)

چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ تو فرنگیوں کے جادو سے آگاہ نہیں ۔ اس کی آستین کے اندر جو فتنے پوشیدہ ہیں انہیں دیکھنے کی کوشش کر ۔ اگر تو اس کے فریب سے بچنا چاہتا ہے تو اس کے اونٹوں کو اپنے حوض اور ٹینکوں ، جہازوں ، توپخانوں ، بحری بیڑوں ، گوریلوں اور مزائیلوں کو اپنی سر زمین سے بھگا دے ۔ جو آج کل وہاں گدھوں کی طرح منڈلا رہے ہیں ۔ اس کی ڈپلومیسی نے ہر قوم کو لاچار اور عربوں کو 100 ٹکڑوں میں تقسیم

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی   ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی! (۲)

کر دیا ہے ۔ جب سے عرب اس کے حلقہ دام میں گرفتار ہوئے ہیں ۔ آسمان نے انہیں ایک لمحے کے لئے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا ۔ اے صاحب نظر اپنے دور کو سمجھ اور اپنے بدن کے اندر دوبارہ حضرت فاروق اعظمؓ کی روح پیدا کر ۔ دین مبین کو جمعیت ہی سے قوت حاصل ہوتی ہے اور دین عزم و اخلاق اور یقین پر مبنی ہے ۔ تو اپنے مقام سے بہت دور جا پڑا

---

(۱) جاوید نامہ ۔ ۶۳ ۔   (۲) ضرب کلیم ۔ ۱۷۵ ۔

ہے۔تو شاہینوں کی اولاد ہے۔کرگسوں جیسے کام نہ کر۔

اے زافسونِ فرنگی بے خبر　　فتنہ ہا در آستینِ او نگر
از فریب او اگر خواہی اماں　　اشترانش را ز حوضِ خود براں
حکمتش ہر قوم را بیچارہ کرد　　وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد
تا عرب درحلقۂ دامش فتاد　　آسماں یک دم اماں اورا نداد
عصر خود را بنگر اے صاحب نظر　　دربدن باز آفریں روحِ عمرؓ
قوت از جمعیت دین مبیں　　دین ہمہ عزم است و اخلاص و یقیں (۱)

از مقام خویش دور افتادۂ
کرگسی کم کن کہ شاہیں زادۂ (۲)

عرب کے سوز میں ساز عجم ہے　　حرم کا راز توحید امم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب　　کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے (۳)

وہ مسلمان جو دین کی روح سے باخبر ہے وہ غیر اللہ کے سامنے اپنی پیشانی نہیں رگڑتا۔اگر آسمان اس کی مرضی کے مطابق گردش نہ کرے،تو وہ زمین کو اپنی مرضی کے مطابق گھمالیتا ہے۔

مسلمانے کہ داند رمز دیں را　　نساید پیش غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بہ کام او نہ گردد　　بکام خود بہ گرداند زمیں را! (۴)

بہر حال مغرب کے مدرسے میں قومیت پرستی اور مادہ پرستی کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں۔ان کے مدرسے میں فکر معاش اور لارڈ میکالے کا نظام تعلیم انسان نہیں بلکہ عصر حاضر کے بت تراش رہا ہے۔جن میں نہ ادائے کافرانہ ، نہ تراش آزرانہ ہے۔اسی لئے یہ جہاں عجب جہاں ہے نہ قفس نہ آشیانہ۔اوراس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن ، لہٰذا کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت۔جگن ناتھ آزاد ،''اقبال اور مغربی مفکرین'' میں رقمطراز ہیں :۔

''جہاں نطشے نے یہ کہا ہے کہ عورت مرد کے لئے ایک خطرناک کھلونا ہے ، وہاں وہ یہ

---

(۱) پس چہ باید کرد۔۴۱۔　(۲) پس چہ باید کرد۔۱۳۔　(۳) بال جبریل۔۸۲۔　(۴) ارمغان حجاز۔۱۴۲۔

بھی کہتا ہے کہ مرد عورت کے لئے بچہ پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے ۔ گویا نطشے مرد اور عورت
کے تعلقات کو ایک حیاتی تعلق سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ۔ اقبال اس تعلق کو ایک اعلیٰ سماجی
اور روحانی سطح پر لے جاتے ہیں ۔" (۱)

اسی طرح مذکورہ کتاب ہی میں جگن ناتھ آزاد، عورت کے بارے میں شوپن ہار کے خیالات کا ذکر بھی کرتے ہیں:۔

" شوپن ہار کا خیال ہے کہ چونکہ آدمی کی عقل وخرد جنسی محرکات سے مغلوب ہے ۔ اس لئے
اسے عورت میں دل کشی نظر آتی ہے ۔ ورنہ دراصل عورت کو خوبصورت کہنے کی بجائے اسے
بدصورت صنف کہنا چاہیئے ۔ عورتوں میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ نغمہ، شاعری یا فنون
لطیفہ کی کسی اور صف سے متاثر ہوسکیں ۔ اگر وہ ان فنون کے ساتھ کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار
کرتی ہیں تو یہ صرف دکھاوا ہے اور اس سے ان کا مقصد محض مرد کا دل جیتنے کی کوشش کرنا
ہے ۔ آج تک کوئی عورت خواہ شعوری اعتبار سے اسے کتنا ہی امتیاز کیوں نہ حاصل ہو صف
اول کا طبع زاد فن پارہ نہیں پیش کر سکی ۔ نہ ہی زندگی کے کسی اور شعبے میں اس نے کوئی مستقل
نوعیت کا کارنامہ انجام دیا ہے ۔" (۲)

نطشے نے یورپ میں عورت کو جس روپ میں دیکھا وہی کچھ کہہ دیا ۔ مشینوں کے دھوئیں میں یورپ کے دانشور عورت کو بھی بچہ پیدا کرنے کی ایک مشین ہی کا نام دے سکتے ہیں ۔

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ۔۔۔ یہ وادیء ایمن نہیں شایان تجلی! (۳)

نظیر اکبر آبادی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بھوکے فقیر کو آفتاب و مہتاب بھی دو روٹیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ یورپی معیشت کا یہی کمال ہے کہ انسان انسان کو مشین سمجھ بیٹھا ہے ۔ علاوہ ازیں یورپ کی تعلیم ہی نے زن کو نازن بناتے ہوئے اسے خطرناک کھلونے کے نام سے نوازا ۔ خطرناک کھلونا، سانپ، بم یا کوئی اور وحشی درندہ بھی ہوسکتا ہے ۔ جدید تعلیم کا یہی فیض ہے کہ مرد آوارہ اور زن تہی آغوش تو اقبال نے بھی خوب فرمایا ہے ۔

جہاں تک شوپن ہار کا تعلق ہے تو اس کا معاملہ ہی ٹیڑھا ہے ۔ اس کے ذاتی حالات زندگی ہی اتنے تلخ ہیں کہ ان

---

(۱) اقبال اور مغربی مفکرین ۔ ۱۱۴ ۔ جگن ناتھ آزاد ۔ (۲) اقبال اور مغربی مفکرین ۔ ۵۹ ۔ ۶۰ ۔ (۳) ضرب کلیم ۔ ۱۴۰ ۔

میں زہر گھلا ہوا ہے ۔ فلسفے کی ہر تاریخی و تنقیدی کتاب میں تحریر شدہ ہے کہ شوپن ہار کا والد ایک تاجر تھا ، جس کی وفات کے بعد شوپن ہار کی والدہ ، جو کہ ایک ناول نگار تھی نے اپنے ادیب دوستوں کے ساتھ خوب دادِ عیش دینا شروع کر دی۔ شوپن ہار کے تعلقات والدہ سے انتہائی کشیدہ ہوگئے ، حتیٰ کہ ایک دن اس کی ماں نے اسے دھکا دے کر سیڑھیوں سے نیچے گرا دیا ۔ کہنے کا مطلب یہ کہ شوپن ہار اپنی ماں کے قابل اعتراض رویے اور ناروا سلوک ہی کے نتیجے میں قنوطی ہوگیا۔ ردِعمل کے طور پر اس نے عورت کی خوب تکفیر کی ۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ عورت کے خلاف لکھتے ہوئے شوپن ہار کے پیش نظر اپنی والدہ ہی کا کردار تھا ۔ خاص کر فنون لطیفہ کے حوالے سے عورت کے احساسات و جذبات کو بے صلاحیت کہنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شوپن ہار کے نزدیک اس کی والدہ کا ادب میں کوئی مقام نہیں ۔ اور اس نے ماں سے ایک دن کہا بھی تھا کہ تم میری وجہ سے پہچانی جاؤ گی۔

یہ تو یورپ کی باتیں ہیں ۔ اور اقبال ایسے ہی تلخ حقائق سے خوفزدہ ہیں کہ کہیں مشرق میں بھی تعلیم کی الٹی چکی نہ گھوم جائے ۔ لیکن بنیادی طور پر اقبال کے نزدیک عورت اس روپ کی مالکہ نہیں ۔ جیسے یورپ والے اجاگر کر رہے ہیں ۔ بلکہ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ ، اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں اور شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی ، کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درمکنوں !

نطشے ، شوپن ہار اور دوسرے مغربی مفکرین کے سامنے جانے کن کن عورتوں اور مردوں کا کردار ہوگا ۔ جبکہ اقبال کے پیش نظر حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے علاوہ دیگر پاک دامن پردہ نشینوں اور طرابلس کے جہاد میں شہید ہونے والی معصوم فاطمہ کا کردار ہے ۔

فاطمہ تو آبروے امت مرحوم ہے ۔۔۔ ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی ۔۔۔ غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر ! ۔۔۔ ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر!
یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی! ۔۔۔ ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی!

اپنے صحرا میں بہت آہوابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں!

فاطمہ ! گوشبنم افشاں آنکھ ترے غم میں ہے — نغمہ عشرت بھی اپنے نالہء ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے! — ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں — پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں — آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں
تازہ انجم کا فضائے آسمان میں ہے ظہور — دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موج نور
جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانہ ء ایام سے — جن کی ضو ناآشنا ہے قید صبح و شام سے

جن کی تابانی میں انداز کہن بھی ، نو بھی ہے
اور تیرے کوکب تقدیر کا پر تو بھی ہے (۱)

مزید کہتے ہیں کہ دنیا کی پائیداری ماؤں کے دم قدم سے ہے ۔ کیوں کہ ان کی نہاد ممکنات کی امانت دار ہے ۔ ماؤں کی گود سے ایسے بچے پیدا ہوتے ہیں ، جن کے ذریعے تعمیر وترقی اور ممکنات کے دروازے کھلتے ہیں ۔ جو قوم یہ نکتہ نہیں سمجھتی اس کا نظام حیات درہم برہم ہو جاتا ہے ۔

جہاں را محکمی از امہات است — نہاد شاں امین ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نداند — نظام کاروبارش بے ثبات است (۲)

اور سب سے بڑھ کر اقبال کے پیش نظر وہ امہات ہیں جن کے قدموں کے نیچے جنت ہے ۔

الجنة تحت اقدام امهتکم

بہر حال ''اقبال کے ذوق جمال'' کے نزدیک علم اگر عشق کے تابع رہے تو ایمانی ورنہ شیطانی قوت بن جاتا ہے ۔ جس کے ہاتھوں تمام تر اخلاقی و دینی اقدار مٹ جاتی ہیں ۔ اور جب اخلاقی اقدار نہ رہیں تو تعلیم ہو یا سیاست دیو بے زنجیر بن جاتی ہے ۔ اقبال ایسے علم کو پسند نہیں کرتے جس کے منفی اثر سے دیں زار و زبوں ہو جائے اور چشم بینا سے جوئے خوں

---

(۱) بانگِ درا ۔۲۱۴ ۔ ۲۱۵ ۔۱۹۱۲ء ۔
(۲) ارمغانِ حجاز ۔۹۳۔

جاری ہونے لگے ۔ شیطانی علم تن کے لئے حاصل کیا جاتا ہے اور وہ مار بن کر ڈسنے لگتا ہے ۔ جبکہ پروردۂ عشق علم یا ایمانی علم دل کے لئے ہوتا ہے اور یہی علم انسان کا یار اور غم خوار بن کر رہتا ہے ۔ شیطانی علم تہذیب و تمدن کو بھی شیطانی بنا ڈالتا ہے ۔ اسی لئے اقبال کہتے ہیں کہ آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو ۔ کہ وہ ایسی تہذیب کو تہس نہس کر دے ۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ :۔

شیوۂ تہذیب نو آدم دری است   پردۂ آدم دری سوداگری است

اور ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود، نور حق از سینہ آدم ربود ، تاتہ و بالا نہ گردد ایں نظام ، دانش و تہذیب و دیں سودائے خام ۔ ضمیر مغرب سراسر تاجرانہ ہے ۔ تجارت ، سیاست اور کھوٹ میں وہ بڑے تیز و طرار ہیں ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور آئی ایم ایف کے انسانیت سوز و دل دوز کارنامے ہمارے سامنے ہیں ۔ پس غربیان راز یرکی سازحیات ، اور شرقیاں راعشق راز کائنات ۔ مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری اور

شرق حق را دید و عالم را ندید   غرب در عالم خزید ، از حق رمید (۱)

عقل و دیں از کافر یہائے تو خوار   عشق از سوداگریہائے تو خوار! (۲)

عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش ۔ اپنا بوریا چھوڑ کر اس کا قالین نہ لے اور اس کے وزیر کے عوض اپنا پیادہ نہ دے ۔ کیوں کہ چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس ، جی سکتے ہیں بے روشنیء دانش و فرہنگ ۔

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں   سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

یورپی تہذیب یونانی فلسفے کی پروردہ ہے افلاطونی تعلیمات کے زیر اثر برہنگی جمناسٹک کی حدود سے نکل کر ساحلوں اور بازاروں تک آ پہنچی ہے ۔ افلاطون نے تو ''مشرکہ شادیوں'' کو روا قرار دیا تھا ، یورپ دو قدم آگے نکلتے ہوئے ''مردانہ'' و ''نسوانی شادیاں'' رچانے لگا ہے ۔ مرد مرد سے اور عورت عورت سے شادی کر رہی ہے ، تہذیب کا ہے کمال ، شرافت کا ہے زوال ۔ اسی طرح اقبال کہتے ہیں ارسطو کی ''مدرسیت'' کفر و الحاد کی جڑ ہے ، اس لئے کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ ۔ مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے ، مگر چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام ، اور مردہ لادینیء افکار سے افرنگ میں عشق ، عقل بے ربطیء افکار سے مشرق میں غلام ۔

---

(۱) جاوید نامہ ۔ ۳۶ ۔   (۲) جاوید نامہ ۔ ۵۳ ۔

مگر یہ سب کچھ مدرسی علم کی بناء پر ہے ۔ ایسے ہی علم و فلسفے کی بنا پر ہاتھ آ تا نہیں اپنا سراغ ۔ اس لئے کہ وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں ، تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم ، یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار ، شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں ۔

عشق کے بل بوتے پر بڑے بڑے معرکے سر کئے جا سکتے ہیں ۔ یہاں تک کہ کبوتر جیسا نازک پرندہ عشق و مستی میں جب ''ھو ھو'' کرے تو عقاب کے سر پر سے تاج اتار سکتا ہے ۔ نغمہ عشق ایسا جوش و ولولہ عطا کرتا ہے کہ ، کبوتر کے تن نازک میں بھی شاہین کا جگر پیدا ہو جاتا ہے ۔

یہیں سے اقبال مرد مومن ، مرد فقیر ، مرد قلندر اور انسان کامل کی بات کرتے ہیں ۔ اور یہ سب فیض عشق ہے ۔ عشق قلب سلیم رکھنے والے ایک عام بوریا نشین کو مرد فقیر بنا دیتا ہے ۔ اس لئے کہ در راہ عشق فلاں ابن فلاں چیزے نیست ، ید بیضائے کلیمے بہ سیاہے بخشند ، عشق کے طفیل جب کوئی مرد مومن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے تو پھر ساری دنیا اس کے زیر نگیں آ جاتی ہے ۔ لیکن یہ درجہ حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے عشق مصطفیؐ ضروری ہے ۔ اس لئے کہ ، ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست ، بحر و بر در گوشہ دامان اوست اور ہر کہ اندر دست او شمشیر لاست ، جملہ موجودات را فرمانرواست ۔ ایسا فرمانروا کہ وقت بھی پوری طرح اس کے قابو میں آ جاتا ہے ۔ پھر وہ اپنی مرضی سے جیتا ہے اور مرتا تو ہے ہی نہیں ۔ مرد قلندر کبھی یہ نہیں کہتا کہ رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے ، نے ہاتھ باگ پر ہے ، نہ ہے پا رکاب میں ۔ کیوں کہ ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر ۔ راکب وہی ہوتا ہے جسے زمانے پر پورا پورا اختیار ہو ۔ بلکہ مرد فقیر دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کرتے ہوئے ، نیا زمانہ اور نئے صبح و شام بھی پیدا کر سکتا ہے ۔

یہ دیر کہن یعنی بت خانہ ء رنگ و بو! (۱)
صیاد ہے کافر کا ، نخچیر ہے مومن کا

مرد قلندر کے سامنے بادشاہ وقت کی کوئی وقعت نہیں ہوتی حضرت بوعلی قلندر اور حضرت میاں میر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں ۔ جن کے واقعات کو علامہ نے نظم کیا ہے ۔ حضرت بوعلی قلندر نے علاؤالدین خلجی کو لکھ بھیجا کہ '' اپنے ملک نائب کو سزا دو ورنہ میں دہلی کا نیا شحنہ مقرر کرتا ہوں'' ۔ حضرت میاں میر نے بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی اور مزدور سے کہا کہ یہ '' درہم'' یہاں بیٹھے ہوئے بادشاہ شاہجہان کو دے دو یہ اب بھی بھوکا ہے ، ملک گیری کی ہوس میں خلق خدا کے خون

---

(۱) ضرب کلیم ۔ ۱۷۳۔

کے درپے ہے ۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بادشاہ وقت بھی مردِ فقیر ہو سکتا ہے ۔ علامہ اقبال نے اورنگ زیب عالمگیر کی مثال بھی مردِ قلندر کے ضمن میں پیش کی ہے ۔

اسی طرح پروفیسر محمد فرمان خواجہ فرید الدین عطارؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :۔

"ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید اپنے وزیر فضل کے ہمراہ خواجہ فضیلؒ بن عیاضؒ کے در دولت پر حاضر ہوا ۔ دروازہ کھٹکھٹایا پوچھا کون ہے ؟ وزیر نے جواب دیا ۔ امیر المومنین ، خواجہ فضیل نے فرمایا ، امیر المومنین کو مجھ سے کیا کام اور مجھے ان سے کیا واسطہ ۔ وزیر نے کہا بادشاہ کی اطاعت واجب ہے ۔ فرمایا مجھے حیران نہ کرو ۔ وزیر نے کہا کہ اندر آنے کی اجازت دو ورنہ ہم حکماً اندر آجائیں گے ۔ فرمایا اجازت تو نہیں دیتا ، حکماً اندر آسکتے ہو ۔ چنانچہ وزیر اور خلیفہ اندر آگئے ۔ خواجہ فضیل نے چراغ گل کر دیا ۔ تاکہ ہارون الرشید کو دیکھ نہ سکیں ۔ اسی اثنا میں ہارون کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے چھو گیا فرمایا " کیا نرم ہاتھ ہے ۔ کاش کہ دوزخ کی آگ سے بچ سکے ۔" (۱)

واقعی ، عجب ایں کہ می نگنجد بہ دو عالمے فقیرے

اور یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق کہ" امام اعظم ابوحنیفہ نے طرح طرح کے مصائب برداشت کئے لیکن حکومت وقت کی ملازمت کرنا برداشت نہ کیا ۔ یزید گورنر کوفہ نے امام صاحب کو میرمنشی اور امیر خزانہ مقرر کرنا چاہا ۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا ۔ یزید نے قسم کھا کر کہا جبراً منظور کرنا ہوگا ۔ دوستوں نے بھی سمجھایا لیکن امام صاحب انکار پر قائم رہے اور کہا کہ اگر یزید کہے کہ مسجد کے دروازے گن دو تو بھی مجھ کو گوارا نہیں ۔ چہ جائے کہ وہ کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اس پر مہر کروں ۔ یزید نے غصے میں آکر حکم دیا کہ ہر روز ان کے دس درے لگائیں جائیں ۔ اس ظالمانہ حکم کی بھی تعمیل ہوئی ۔ لیکن امام صاحب اپنی ضد سے باز نہ آئے ۔ پھر خلیفہ منصور نے قضا کا عہدہ پیش کیا ۔ امام صاحب نے انکار کیا اور کہا کہ میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا ۔ منصور نے غصے میں آکر کہا " تم جھوٹے ہو" امام صاحب نے کہا ۔ اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ

---

(۱) اقبال اور تصوف ۔ ۳۹ ۔ ۴۰ ۔ پروفیسر محمد فرمان ۔ پروفیسر موصوف نے یہ حوالہ " تاریخ مشائخ چشت " ۔ ص ۔ ۷۵ ، از خلیق احمد نظامی سے لیا ہے ۔

دعویٰ ضرور سچا ہے کہ میں قضا کے قابل نہیں ۔ کیونکہ جھوٹا شخص قاضی مقرر نہیں ہو سکتا ۔ منصور نے قسم کھا کر کہا کہ تم کو قبول کرنا ہوگا ۔ امام صاحب نے بھی قسم کھائی کہ ہرگز قبول نہ کرونگا ۔ امام صاحب قید خانے میں بھیج دیئے گئے ۔ اور وہاں سے اوس وقت چھوٹے کہ قید حیات سے چھوٹے" (۱)

پیش فرعوناں بگو حرف کلیم تا کند ضرب تو دریا را دونیم

مرد قلندر اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت سے جز وکل کے جملہ رموز سے آگاہی رکھتا ہے ۔ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہوتا ہے ۔ جب وسعت کائنات میں اپنا خیمہ گاڑتا ہے تو اس بساط کہنہ کو درہم برہم کر دیتا ہے ۔ اس کی فطرت عشق و نور سے معمور ہوتی ہے وہ اپنا اظہار چاہتی ہے ۔ چنانچہ وہ نیا جہاں معرض وجود میں لے آتا ہے ۔ اس کے افکار کی کھیتی سے اس جہان جز وکل کی طرح کے سینکڑوں جہان پھولوں کی مانند پھوٹتے ہیں ۔ وہ ہر خام کی شخصیت کو پختہ کر دیتا ہے ۔ ہر قلب کے حرم سے بت نکال دیتا ہے ۔ اس کی مضراب عشق سے دلوں کے تاروں سے نغمہ ہائے عشق پھوٹتے ہیں ۔ اس کا سونا جاگنا سب اللہ کے لئے ہے ۔ وہ بڑھاپے کو جوانی کا انداز سکھاتا ہے ۔ ہر چیز کو جوانی کے رنگ میں رنگ دیتا ہے ۔ اس لئے کہ ایام کا راکب ہے ۔

از رموز جزو و کل آگاہ بود در جہاں قائم بامر اللہ بود
خیمہ چوں در وسعت عالم زند ایں بساط کہنہ را برہم زند
فطرتش معمو رو می خواہد نمود عالمے دیگر بیارد در وجود
صد جہاں مثل جہانِ جزو و کل روید از کشت خیال او چوگل
پختہ سازد فطرت ہر خام را از حرم بیروں کند اصنام را
نغمہ زا تا رِ دل از مضراب او بہر حق بیداریء او خواب او
شیب را آموزد آہنگِ شباب می دہد ہر چیز را رنگ شباب (۲)

اس کا سفید ہاتھ عصا سے مضبوط ہے ۔ اسے پورا علم اور پورا اختیار حاصل ہوتا ہے ۔ جب وہ شہسوار اپنے ہاتھ میں باگ تھامتا ہے تو زمانے کے گھوڑے کی رفتار اور تیز ہو جاتی ہے ۔ اس کی ہیبت سے دریا خشک ہو جاتا ہے اور وہ نبی اسرائیل

---

(۱) تاریخ مشائخ چشت ۔ ۷۶ ۔ ۷۷ ۔ تالیف، خلیق احمد نظامی ۔ بحوالہ تذکرۃ الاولیاء از فرید الدین عطار ۔ (۲) اسرار و رموز ۔ ۴۴ ۔

کو مصر سے نکال لے جاتا ہے۔ مرد قلندر کے قم کہنے سے مردہ جانیں قبر کے اندر سے اس طرح اٹھ کھڑی ہوتی ہیں جس طرح باغ کے اندر سے صنوبر۔ اس کی شخصیت جہاں کی شخصیت کی توجیہہ ہے۔ اس کے جلال وعظمت پر جہاں کی عظمت موقوف ہے۔ اس کے زیر سایہ رہ کر ذرہ خورشید کی عظمت پالیتا ہے۔ اس کی قوت سے زندگی کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ وہ اپنے زورِ عمل کے اعجاز سے دنیا کو نئی زندگی عطا کرتا ہے اور عمل کے نئے طور طریقے ایجاد کرتا ہے۔ اس کے نقوش پا سے کئی جلوے اٹھتے ہیں، سینکڑوں کلیم اس کے "طور" کے مشتاق ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کی نئی تفسیر کرتا ہے۔ وہ اس خواب کو نئی تعبیر عطا کرتا ہے۔

اس کی پوشیدہ ہستی رازِ حیات ہے۔ وہ سازِ حیات کا ان سنا نغمہ ہے۔ فطرت کی مضمون نگار طبیعت بڑی جاں گسل محنت کرتی ہے۔ تب کہیں جا کر نائب حق کی شخصیت کے دو بیت موزوں ہوتے ہیں۔

از عصا دست سفیدش محکم است قدرتِ کامل بعلمش توام است
چوں عناں گیرد بدست آں شہسوار تیز تر گردد سمندِ روزگار
خشک سازد ہیبت او نیل را می برد از مصر اسرائیل را
از قم او خیزد اندر گور تن مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن
ذات او توجیہہ ذات عالم است از جلال او نجات عالم است
ذرہ خورشید آشنا از سایہ اش قیمت ہستی گراں از مایہ اش
زندگی بخشد زاعجاز عمل می کند تجدید انداز عمل
جلوہ ہا خیزد ز نقش پائے او صد کلیم آوارۂ سینائے او
زندگی را می کند تفسیر نو میدہد ایں خواب را تعبیر نو
ہستیء مکنون او راز حیات نغمہء نشنیدۂ ساز حیات
طبع مضموں بند فطرت خوں شود تا دو بیت ذات او موزوں شود (۱)

ہماری مشت خاک پریشانی کے عالم میں آسمان تک جا پہنچی ہے۔ امید ہے کہ اب اس غبار سے وہ شہسوار ظاہر ہو۔

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۴۵۔

ہمارے آج کی راکھ میں ایسا شعلہ سویا پڑا ہے ۔ جو مستقبل قریب میں ہماری دنیا میں تپش و حرارت پیدا کر دے ۔ ہمارے غنچے کے دامن میں گلستاں پوشیدہ ہے ۔ ہماری آنکھ آنے والی صبح کے نور سے روشن ہے ______ شاعر فرداستم۔
اے نائب حق ، اے زمانے کے گھوڑے کے سوار آ!، تو امکان کی آنکھ کا نور ہے ، تجھ سے عمل کے نئے نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں ۔ اس ہنگامہ موجودات کی رونق بن ۔ افلاطون جس کے ہنگامے کا منکر ہوتے ہوئے اسے واہمہ و اسراب کہتا ہے ۔ اور یہی حال دوسرے تصوراتیوں ، بار کلے اور بریڈلے وغیرہ کا ہے ۔ تو اس دنیا کی آنکھوں کا نور ہے ، ہماری آنکھوں میں بس جا ۔ اقوام دنیا نے جو شورش بپا کر رکھی ہے ۔ اسے آ کر خاموش کر دے ۔ ایسا نغمہ سنا جو کانوں کے لئے لطف و راحت بنے ۔ اٹھ اور دوبارہ ایسا قانون لا جو اخوت ساز ہو ، ایسا جام جس کے اندر شراب الفت ہو ۔ دنیا میں پھر ایک بار امن وامان قائم کر اور جنگجوؤں کو پھر صلح کا پیغام دے ۔ نوع انسان کھیتی ہے اور تو اس کا حاصل ، تو ہی کاروان زندگی کی منزل و مقصود ہے ۔ ہمارے شجر ملت کے پتے خزاں کے جور وظلم سے گر چکے ہیں ۔ ہمارے باغ پر موسم بہار کی مانند آ ______ ہمارے آباء و اجداد ایسٹ انڈیا کمپنی کی رسوا کن غلامی گزار گئے ۔ ہم جعفر از بنگال و صادق از دکن ، ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن کا رونا رو رہے ہیں ۔ مگر آج ہمارا ہر حکمران میر جعفر و میر صادق بنا ہوا ہے ۔ امریکہ اور افغانستان کا تازہ مسئلہ ہمارے سامنے ہے ____ جس کے نتیجے میں ہم ، ہمارے بچے، جوان اور بوڑھے آئی ۔ ایم ۔ ایف اور امریکہ کے سامنے سربجود ہیں ان کی شرمسار پیشانیوں کو اس سے نجات دلا۔ عصر حاضر میں علامہ اقبال کے مردِ فقیر " اسامہ بن لادن اور ملا محمد عمر ہی ہو سکتے ہیں۔ ہم اس جہاں کے سوز میں اس لئے جل رہے ہیں کہ تیرے آنے سے ہم عزت سے سرفراز ہو جائیں ۔

قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش　　جس نے نہ ڈھونڈی سلطان کی درگاہ!　(۱)

ایران میں تو اقبال کی پیش گوئی ، می رسد مردے کہ زنجیر غلاماں بشکند پوری ہوگئی ہے ۔ اب یہاں کا شدت سے انتظار ہے ۔

مشت خاک ما سر گردوں رسید　　زیں غبار آں شہسوار آید پدید

خفتہ در خاکستر امروز ما　　شعلہ ء فردائے عالم سوز ما

غنچہء ما گلستاں در دامن است　　چشم ما از صبح فردا روشن است

---

(۱) ضرب کلیم ـ ۱۶۷۔

اے سوار شہب دوراں بیا | اے فروغ دیدۂ امکاں بیا

رونق ہنگامہ ایجاد شو | درسوا د دیدہ ہا آباد شو

شورش اقوام را خاموش کن | نغمہ خود را بہشت گوش کن

خیز و قانون اخوت ساز دہ | جام صہبائے محبت باز دہ

باز درعالم بیار ایام صلح | جنگجویاں رابدہ پیغام صلح

نوع انساں مزرع و تو حاصلی | کاروان زندگی را منزلی

ریخت از جور خزاں برگ شجر | چوں بہاراں بر ریاض ما گزر

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر | از جبین شر مسار ما بگیر

از وجود تو سر اِفرازیم ما (۱)

پس بہ سوز ایں جہاں سوزیم ما

اس طرح ''اقبال کے ذوق جمال'' کے معیار کے مطابق وہی شخص مردفقیر ہوسکتا ہے جو قوت عشق سے بھر پور و پرنور ہو۔ جو خدا تو نہیں ہوسکتا خدا کی صفات کا حامل ضرور ہو۔ جس کے دست مبارک میں یدبیضا اور آنکھوں میں جلوۂ طور ہو۔ جس کی ہیبت سے دریا صحرا بن جائے اور صحرا دریا جو اس مقام تک پہنچا ہو کہ بس خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

مرد مومن انقلابی ہوتے ہوئے ہر قسم کی برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ حتیٰ کہ غلاموں کو غلامی کی ذلت سے نجات دلاتا ہے۔ اس کے ''قم'' سے مردے زندہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے سامنے کنکریاں بول اٹھتی ہیں۔ وہ رحمت اللعالمین ہوتا ہے۔ نان جویں کھا کر خیبر شکنی کرتا ہے، پیٹ پر پتھر باندھ سکتا ہے۔ اور جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں کو ''حسن مطلق'' کے نور سے ستیزہ کار بنا دیتا ہے۔

مرد قلندر لوگوں میں نیازاویہء نگاہ پیدا کرتا ہے۔ اور اس طرح دشت و در میں گلستاں پیدا کر دیتا ہے۔ یہی اس کا انقلاب، تبدیلی اور جدت ہے۔ اس کی تپش عشق سے ملت حرمل کی مانند شور و ہنگامہ کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ فرد

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۳۵۔۳۶۔

کے دل میں شرر عشق ڈالتا ہے۔ جس سے اس کا بدن سراپا عشق بن جاتا ہے۔ صاحب عشق کا نقش پا مٹی کو "صاحب نظر" بنا دیتا ہے۔ خاک کا ہر ذرہ رشک طور سینا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ بدست ذرہ دادم آفتابے۔ وہ عقل عریاں کو لباس عطا کرتا ہے۔ اور اس طرح اس ناچیز کو مالدار بنا دیتا ہے۔ وہ اس کے انگارے کو اپنے دامن سے ہوا دیتا ہے تاکہ جو کھوٹ اس کا جھوٹا تکیہ ہے وہ کھوٹ اس کے سونے سے باہر نکل جائے۔ مرد قلندر غلام کے پاؤں کی زنجیر کھول کر اسے آقاؤں کے پنجہ ء استبداد سے رہائی دلا کر اسے خوشخبری سناتا ہے کہ تو کسی کا غلام نہیں تو بے زبان بتوں سے کم تر نہیں۔ یہاں تک کہ وہ اسے ایک مقصد کی طرف لاتا ہے اور اسے پابند شریعت بنا کر از سر نو توحید کا درس دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے نیاز مندی اور رسوم و آداب سکھاتا ہے۔

تازہ انداز نظر پیدا کند   گلستاں در دشت و در پیدا کند
از تف او ملتے مثل سپند   برجہد شورافگن و ہنگامہ بند
یک شرری افگند اندر دلش   شعلہء درگیر میگردد گلش
نقش پایش خاک را بنا کند   ذرہ را چشمک زن سینا کند
عقل عریاں را دہد پیرایہء   بخشد ایں بے مایہ را سرمایہء
دامن خود میزند براخگرش   ہر چہ غش باشد رباید از درش
بند ہا از پاکشاید بندہ را   از خدا وندان رباید بندہ را
گویدش تو بندۂ دیگر نہء   زیں بتان بے زباں کمتر نہء
تا سوے یک مدعایش می کشد   حلقہء آئیں بپائش میکشد
نکتۂ توحید باز آموز دش
رسم و آئین نیاز آموز دش (۱)

اقبال حضورؐ کی ذات اقدس کو انسان کامل کہتے ہیں۔ اس طرح حضور اکرمؐ جز وکل کے راز دان ہیں۔ جن کی گرد پا دیگر رسولوں کی آنکھ کا سرمہ ہے۔ حضورؐ جو شمع شبستانِ وجود ہیں، دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیا سے ماوریٰ تھے۔ آپؐ کا

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۹۰۔

جلوہ اس وقت بھی فرشتوں کے سینوں کو گرما رہا تھا۔ جب آدم کا بدن تخلیق کے اولین مراحل میں تھا۔

ہمچناں آں راز داں جزو و کل　　گرد پایش سرمۂ چشم رسل

یعنی آں شمع شبستانِ وجود　　بود در دنیا و از دنیا نبود

جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز　　بود اندر آب و گل آدم ہنوز　　(۱)

جوہر او نے عرب نے اعجم است　　آدم است و ہم زآدم اقدم است!　　(۲)

حضورؐ فقر کا عملی نمونہ تھے۔ اس لئے کہ وہ نگاہ راہ بیں کے ساتھ زندہ دل بھی رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر باسلاطیں درفتد مرد فقیر، از شکوہ بوریا لرزد سریر، فقر خیبر گیر بانان شعیر، بستہ فتراک او سلطان و میر اور قلب اور ا قوت از جذب و سلوک، پیش سلطاں نعرۂ او لا ملوک۔ کے مصداق معرکہ حق و باطل میں بڑی بڑی سلطنتوں اور بادشاہوں پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔

ہمہ ناز بے نیازی، ہمہ ساز بے نوائی　　دل شاہ لرزہ گیرد زگدائے بے نیازے　　(۳)

دیارِ عشق، یعنی مدینہ منورہ کی خاک درد آشنا ہے۔ یہاں کے ذرے ذرے میں پاکیزہ زندگی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں مغ زادوں سے شراب نہیں لیتے۔ نگاہ ساقی، کوثر شیشہ ہائے تاک سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ گویا کہ تشنگئی ذوق بجھانے والے کوثر و تسنیم کے والی ساقی اپنی نظر کرم سے شراب معرفت پلاتے ہیں۔ یہ مقام نیاز ہے۔ یہاں مستی میں قبا چاک نہ کر۔ ہوش میں رہ اور اپنے جوش جنوں پر ضبط رکھ۔

دیار شوق کہ درد آشناست خاک آنجا　　بہ ذرہ ذرہ تواں دید جان پاک آنجا

مے مغانہ زمغ زادگاں نمی گیرد　　نگاہ می شکند شیشہ ہاے تاک آنجا

بہ ضبط جوش جنوں کوش درمقام نیاز　　بہوش باش و مروقبائے چاک آنجا!　　(۴)

حضورؐ کے فقر سے حق کا بول بالا ہوا۔ انسانی بدن کے اندر ایمان کا بیج بویا اور حضورؐ کے صدقے ہمیں کلمہ توحید نصیب ہوا۔ جہانوں کی گردش کا مرکز یہی کلمہ طیبہ ہے۔ اور اس جہاں کے کام کی انتہا بھی لا الہ ہے۔ آسمان اسی کے زور سے گھوم رہا ہے۔ سورج نے اسی سے پائندگی اور چمک حاصل کی۔ دریا نے اسی کی چمک سے موتی پیدا کئے اور اسی تپش سے

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۱۱۳۔　(۲) جاوید نامہ۔ ۱۲۸۔　(۳) پیامِ مشرق۔ ۱۵۰۔　(۴) زبورِ عجم۔ ۱۱۹۔

بحر میں موج تڑپی۔ اسی کی موج نسیم سے خاک پھول ہوئی اور اسی کے سوز سے مشت پر بلبل بنی۔ انگور کی رگوں میں اسی کے عشق سے شعلہ پیدا ہوا اور خاک مینا چمکدار بنی۔

تخم ایماں آخر اندر گل نشاند   بازبانت کلمہ توحید خواند
نقطہ ء ادوار عالم لا الہ   انتہائے کار عالم لا الہ
چرخ را از زور او گردندگی   مہر را پایندگی رخشندگی
بحر گوہر آفرید از تاب او   موج در دریا تپید از تاب او
خاک از موج نسیمش گل شود   مشت پر از سوز او بلبل شود
شعلہ در رگہائے تاک از سوز او   خاک مینا تابناک از سوز او (۱)

بے شک:۔

قوت سلطان و میر از لااِلہ
ہیبت مرد فقیر از لا الہ (۲)

دنیا کی زندگی کا اصول عشق ہے۔ عناصر عالم کی باہمی پیوستگی اسی سے ہے اور عشق ہمارے دل کے سوز سے زندہ اور لا الہ کے شرر سے تابندہ ہے۔

عشق آئین حیات عالم است   امتزاج سالمات عالم است
عشق از سوز دل مازندہ است   از شرار لا الہ تابندہ است (۳)

عشق کے بل بوتے پر مرد فقیر باطل کے سامنے تلوار ہے اور حق کی سپر۔ اس کا کسی کام کا کرنا یا نہ کرنا خیر و شر کا معیار ہے۔ اس کا انگارہ اپنے اندر سینکڑوں شعلے رکھتا ہے۔ اس کے جوہر سے زندگی کمال تک پہنچتی ہے۔ اس جہان ہا ے وہو کی فضا میں صرف اس کا نعرہ تکبیر ہی نغمہ پیدا کرتا ہے۔ وہ عفو، عدل، سخاوت اور احسان کی عظیم صفات کا حامل ہے۔ قہر کے اندر بھی اس کے مزاج پر لطف و کرم غالب رہتا ہے۔ بزم احباب میں اس کا ساز دلوں کو خوش کرتا ہے جنگ میں اس کی حرارت لوہے کے ہتھیاروں کو پگھلا دیتی ہے۔ بس، ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم، رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۱۳۹۔   (۲) پس چہ باید کرد مثنوی مسافر۔ ۷۷۔   (۳) اسرار و رموز۔ ۱۴۰۔

مومن۔ اسی لئے گلستاں میں وہ

بروز بزم سراپا چوپر نیاں و حریر — بروز رزم خود آگاہ و تن فراموشند (۱)

بلبلوں کے ساتھ ہمنوا ہوتا ہے اور صحرا میں نر باز کی طرح جھپٹتا ہے۔ اس کا دل دنیا میں آسودگی نہیں پاتا۔ اس کا بدن آسمان پر قرار حاصل کرتا ہے۔ اس کا پرندہ ستاروں پر چونچ مارتا ہے۔ اس لئے کہ اسے عشق کے پر لگے ہوتے ہیں۔ وہ فریب خوردہ شاہین نہیں ہوتا جو کرگسوں میں پلا ہو، بلکہ اسے شہبازوں ہی کی صحبت میسر ہوتی ہے۔ مرد قلندر کو صحبت زاغ بھی خراب نہیں کر سکتی۔ وہ اس قدر بلند پرواز ہوتا ہے کہ اس بوڑھے آسمان سے پرلی طرف اڑتا ہے۔

پیش باطل تیغ و پیش حق سپر — امرونہی او عیار خیر و شر
درگرہ صد شعلہ دارد اخگرش — زندگی گیرد کمال از جوہرش
درفضائے ایں جہان ہائے وہو — نغمہ پیدانیست جز تکبیر او
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم — ہم بقہر اندر مزاج او کریم
درگلستاں باعنادل ہم صفیر — دربیاباں جرہ باز صید گیر
زیر گردوں می نیا ساید دلش — برفلک گیرد قرار آب و گلش
طائرش منقار بر اختر زند — آنسوے ایں کہنہ چنبر پرزند (۲)

اس زمیں نے آپؐ کی بارگاہ کے سبب شرف پایا۔ آسمان نے آپؐ کی بارگاہ کے بام کو بوسہ دے کر بلند مرتبہ حاصل کیا۔ اس کائنات کا مرتبہ آپؐ کی وجہ سے بلند ہوا۔ آپؐ کا فقر کائنات کی دولت ہے۔ آپؐ نے جہاں میں زندگی کی شمع روشن کی اور غلاموں کو آقائی سکھائی۔ جب آپؐ نے مٹی کے پیکروں کے اندر سے آتش عشق نکالی تو ان خاکی تودوں نے صورت آدم اختیار کر لی۔ پھر یہ انسان جو ذرہ تھا۔ مہر و ماہ کا ہم پلہ ہوگیا۔ اس نے اپنی قوتوں سے آگاہی حاصل کی۔ جب سے میری نظر آپؐ کے چہرہ مبارک پر پڑی ہے۔ آپؐ مجھے ماں باپ سے زیادہ محبوب ہوگئے۔

اے زمیں از بارگاہت ارجمند — آسماں از بوسہء بامت بلند
از تو بالا پایہء ایں کائنات — فقر تو سرمایہء ایں کائنات

---

(۱) زبور عجم۔ ۱۲۱۔

(۲) اسرار و رموز۔ ۱۶۴۔۱۶۵۔

در جہاں شمع حیات افروختی بندگاں را خواجگی آموختی

تا دم تو آتشے از گل کشود تودہ ہائے خاک را آدم نمود

ذرہ دامنگیر مہر و ماہ شد یعنی از نیروے خویش آگا شد

تا مرا افتاد بر رویت نظر از اب وام گشتہء محبوب تر (۱)

بہر دہلیز تو ازہندوستان آوردہ ام سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیماے من (۲)

یہی وجہ ہے کہ حضور کا ایک ادنیٰ غلام اور جاں نثار ہونے کے طفیل اقبال اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ اقبال نہ شیخ شہر ہے، نہ شاعر نہ خرقہ پوش، وہ صرف ایک فقیر راہ نشیں ہے۔ البتہ دل بے نیاز رکھتا ہے۔

نہ شیخ شہر ، نہ شاعر ، نہ خرقہ پوش اقبال فقیر راہ نشیں است و دل غنی دارد (۳)

مردفقیر بادشاہوں اور سلطنتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جیسا کہ صاحب نظر لوگوں کی نگاہ میں ہر وہ گداگر جو سکندری کا انجام جانتا ہے، سکندر سے بڑھ کر ہے۔

بچشم اہل نظر از سکندر افزوں است گدا گرے کہ مآل سکندری داند (۴)

قلندر اتنا خوددار ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے سامنے اپنی حاجت نہیں لے جاتا۔ کیا کرے پہاڑ تنکا نہیں بن سکتا۔ اسے بادشاہ کیا بادشاہی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو بذات خود بادشاہوں کی حاجت روائی کرتا ہے۔ جبکہ وہ دولت عشق سے مالا مال ہوتا ہے۔

حاجتے پیش سلطاں نبرد مرد غیور چہ تواں کرد کہ از کوہ نیا ید کاہی (۵)

میں تو اک خاک نشیں ہوں بابا لے کے وہ بارہ دری کیا کرتا؟ (فقری)

ایسا فقر جو تلوار کے بغیر دلوں کی صد ہا مملکتیں فتح کر لیتا ہے۔ شوکت دارا اور فر فریدوں سے بہتر ہے۔

آں فقر کہ بے تیغے صد کشور دل گیرد از شوکت دارابہ ، از فر فریدوں بہ (۶)

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے قوت فرماں روا کے سامنے بیباک ہے (۷)

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق (۸)

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۱۶۶۔ (۲) پیام مشرق۔ ۱۸۳۔ (۳) پیام مشرق۔ ۱۶۳۔ (۴) پیام مشرق۔ ۱۷۵۔

(۵) پیام مشرق۔ ۱۸۰۔ (۶) زبور عجم۔ ۲۳۔ (۷) بانگ درا۔ ۵۳۔ (۸) بال جبریل ۳۴۔

پھر کہتے ہیں کہ میں فرمانرواؤں کے طور طریقے جانتا ہوں ۔ وہ گدھوں کو اوپر اٹھاتے ہیں اور یوسف کو کنویں میں پھینکتے ہیں ۔لیکن مرد فقیر ایسا نہیں کرتا ۔

رہ و رسم فرمانروایاں شناسم　　خراں برسر بام و یوسف بچاہے! (۱)

قلندر جو تسخیر جہاں میں کوشاں رہتے ہیں ۔ بظاہر وہ خرقہ پہنتے ہیں لیکن بادشاہوں سے خراج وصول کرتے ہیں ۔ جب وہ جلوت میں ہوتے ہیں تو مہر و ماہ پر کمند پھینکتے ہیں اور جب خلوت میں ہوتے ہیں تو زمان و مکاں ان کی آغوش میں ہوتے ہیں۔ جمشید کا تخت بوریے کے نیچے پوشیدہ ہے ۔فقر و شاہی رضا ہی کے مقامات ہیں ۔

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند　　زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اندو کمندے بہ مہرو ماہ پیچند　　بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند! (۲)
تخت جم پوشیدہ زیر بوریا است　　فقر و شاہی از مقامات رضاست (۳)

اور پھر :۔

عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ ساز　　کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری!
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی　　کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری!
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو　　یہ بے کلاہ ہے سرمایہء کلہ داری! (۴)

علاوہ ازیں :۔

دنیا میں محاسب ہے تہذیب فسوں گر کا　　ہے اس کی فقیری میں سرمایہ سلطانی!
یہ حسن و لطافت کیوں؟ وہ قوت وشوکت کیوں ؟　　بلبل چمنستانی، شہباز بیابانی! (۵)

اسی لئے فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی ، یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی! وہ مرد آزاد خوب و ناخوب کو پہچانتا ہے اس کی روح بہشت کے اندر نہیں سماسکتی۔

مردے آزادے کہ داند خوب و زشت　　می نگنجد روح او اندر بہشت (۶)

اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ نشہء درویشی کے ساتھ موافقت اختیار کر اور دما دم لگا رہ ۔ جب پختہ ہو جائے تو اپنے آپ

---

(۱) زبور عجم۔۴۷۔　(۲) زبور عجم ۔۱۲۱۔　(۳) پس چہ باید کرد ۔۳۱۔
(۴) ضرب کلیم ۔۱۷۱۔　(۵) ایضاً ۔۱۷۸۔　(۶) جاوید نامہ ۔۱۱۹۔

کو سلطنت جم کے مقابلے پر لے آ۔

بانشہ ء درویشی در ساز و دما دم زن   چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن   (۱)

لیکن تیرا زمانہ روحانی رموز سے آگاہ نہیں۔ اس کا مذہب صرف غیر اللہ سے محبت کرنا ہے۔

عصر نو از رمز جاں آگاہ نیست   دین او جز حب غیر اللہ نیست   (۲)

عاشق ہونے کے ناطے، عشق ہی کی طرح قلندر آسمانوں کا نر باز ہے۔ اس کی پرواز کے سامنے مشکلیں آسان ہیں۔ اس کی شکارگاہ، یہ نیلگوں فضا ہے۔ وہ چڑیوں کے آشیانوں کے گرد نہیں گھومتا۔

قلندر جرہ باز آسمانہا   بہ بال او سبک گردد گرانہا

فضائے نیلگوں نخچیر گاہش   نمیگردد بگرد آشیانہا!   (۳)

مرد حق کی شب کے گریباں میں کئی صبحیں پوشیدہ ہیں۔ اس کے مقدر کے ستارے سے کئی جہاں روشن ہیں۔ مرد حق کی پہچان اور کیا بتاؤں۔ موت کے وقت اس کے لبوں پر تبسم ہوتا ہے۔

سحر ہا در گریبان شب اوست   دو گیتی را فروغ از کوکب اوست

نشان مرد حق دیگر چہ گویم   چو مرگ آید تبسم برلب اوست!   (۴)

جمالیات میں مردِ فقیر کا مقام بہت بلند ہے اس لئے کہ مرکز جمالیات یعنی ''حسن مطلق'' انہی خرقہ پوشوں، بوریا نشینوں اور خلوت گزینوں کی انجمن میں رونق افروز ہوتا ہے۔ یہ گدڑی پوش کلیم بھی ہیں اور خلیل بھی۔ یہ فلسفی و حکیم نہیں عاشق ہیں۔ اقبال مردِ فقیر کو اس لئے بھی اہمیت دیتے ہیں کہ ذوق و شوق کی بناء پر مردِ فقیر ہی حسن مطلق تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہیں خلوت گزینوں میں   (۵)

مردِ فقیر و مردِ مومن کے مقامات نوریوں سے بھی بلند ہیں۔ کیوں کہ مقام شوق کی بناء پر، فروغ خاکیاں از نوریاں

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۲۷۔   (۲) پس چہ باید کرد۔ ۸۔   (۳) ارمغان حجاز۔ ۱۳۱۔

(۴) ارمغان حجاز۔ ۱۱۶۔   (۵) بانگِ درا۔ ۱۰۴۔

افزوں شود روزے، زمیں از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے۔ اور عرش معلیٰ سے کم سینہ آدم نہیں۔اگر چہ کف خاک کی حد ہے سپہر کبود۔ یہی وجہ ہے کہ:۔

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں ۔۔۔ انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد! (۱)

جو فقر ہوا تلخیٔ دوراں کا گلہ مند ۔۔۔ اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی! (۲)

وہ مرد مومن جو ارض وسما کی گردش اپنی مرضی کے مطابق آہستہ، تیز یا رکوا سکتا ہو، جس کی نگاہ گرم سے آفتاب لرز جائے اور جو اپنے دل کی نظر سے اعصاب گردوں کی حرکت اور مہتاب کی رگوں میں گردش خوں دیکھ لیتا ہو، اس کے ''جلال و جمال'' کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن ۔۔۔ گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ۔۔۔ یہ چارعناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

ہمسایۂ جبریلِ امیں ، بندۂ خاکی ۔۔۔ ہے اس کا نشیمن ،نہ بخارا نہ بدخشان!

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن ۔۔۔ قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے ۔۔۔ دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان!

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم! ۔۔۔ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!

فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز ۔۔۔ آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن! (۳)

اور:۔

خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال ۔۔۔ کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں (۴)

پھر یہ بھی ہے کہ مومن ہمیشہ متحرک و بے دھڑک رہتا ہے۔ اس کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ وہ دلبری وقاہری، تقدیس اور قوت مسخرہ کا عملی نمونہ ہوتا ہے۔ وہ افلاکی و آفاقی ہوتے ہوئے عدل و انصاف کی میزان اور قرآن کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ پھولوں کے لئے شبنم اور مغرور دریاؤں پر لرزہ طاری کرنے دینے والا طوفان ہے۔ ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم ،۔۔۔۔۔۔اور صورۃ رحمٰن کی طرح ہر لحاظ سے مکمل و اکمل ہے۔ اس لئے اقبال فلسفی کی خدمت میں

---

(۱) بالِ جبریل۔۸۔ (۲) ضرب کلیم۔۱۷۵۔ (۳) ضرب کلیم۔۶۰۔ (۴) ارمغان حجاز۔۴۳۔

عرض کرتے ہیں۔

اس مرد خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو تو بندۂ آفاق ہے، وہ صاحب آفاق!
تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی وہ پاکیء فطرت سے ہوا محرم اعماق! (۱)

مرد حر، مرد فقیر اور مرد قلندر یا صاحب ذوق وشوق ہی عشق کے ذریعے ''حسن ازل'' تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ ''اقبال کے ذوق جمال'' میں عشق، مرد فقیر اور ''حسن مطلق'' لازم وملزوم ہیں۔ عشق، محبوب ومحب کے درمیان رابطے و پیغامبر کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا والا کوئی خدشہ نہیں۔ عشق، مرد فقیر اور حسن مطلق تینوں ایک دوسرے کے لئے غیر نہیں۔ جبکہ عقل و فلسفہ ان تینوں کے لئے غیر ہے۔ چنانچہ، قلندر یعنی عاشق اور حسن مطلق زبان غیر سے شرح آرزو نہیں کرتے۔ عشق بڑا غیور و جسور ہے۔ وہ اپنی خلوت میں تنہا ہی جاتا ہے۔ عقل کو ساتھ نہیں لے جاتا۔ اس لئے کہ عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے، عشق بیچارہ نہ زاہد ہے نہ ملا نہ حکیم۔ عشق اپنا رازداں آپ ہی ہوتا ہے۔ عشق وہ ہے کہ:۔

وفعتاً جس سے بدل جاتی ہے تقدیر امم ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقل حکیم!
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی کبھی شمشیر محمدؐ ہے، کبھی چوب کلیم! (۲)

درحقیقت، مرد مومن درنساز د باصفات، مصطفیٰ راضی نشد الا بذات۔ اسی لئے:۔

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات!
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی نہ تیرہ خاک لحد ہے، نہ جلوہ گاہ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاک داں بروں جستند
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند! (۳)

مرد درویش کی جب ''حسن مطلق'' سے رسائی اور راز و نیاز پیدا ہو جاتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ بھی ''حسن لایزال'' کی طرح لازوال ہو جاتا ہے۔ جب تک وہ مجاز میں اٹکا ہوتا ہے، مجاز ہی کی طرح زوال پذیر ہوتا ہے۔ اور جب جمال لایزال کا وصال حاصل کر لیتا ہے تو اسی کی طرح لافانی ہو کر آسودگی حاصل کر لیتا ہے۔ بے شک موت ہر شاہ و گدا

---

(۱) ضرب کلیم۔ ۷۵۔ (۲) ضرب کلیم۔ ۱۴۴۔۱۴۵۔ (۳) ارمغان حجاز۔ ۲۶۔

کے خواب کی تعبیر ہے، اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے۔ لیکن مرد درویش میں صفات ''حسن مطلق'' پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا معاملہ ایسا ہے کہ:۔

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں (۱)

یہ سب فلسفے اور عشق کا فرق ہے۔ فلسفہ مجاز ہے اور عشق حقیقت۔ مجاز فانی ہے اور حقیقت لافانی۔ فلسفہ مجاز سے آگے نہیں بڑھتا اور عشق حقیقت تک پہنچتے ہوئے، عاشق کو بھی وہ مقام دلا دیتا ہے کہ ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق۔ گویا کہ عشق کے بغیر زندگی، زندگی ہی نہیں۔ عشق سے پہلے دل ہوتا ہی مردہ ہے۔ اور جب عشق سے ایک دفعہ زندہ ہو جاتا ہے تو پھر اسے موت نہیں آ سکتی۔ چنانچہ از محبت می شود پائندہ تر، زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر۔ اور یہ نگاہ شوق، یہ خیال بلند اور ذوق حیات، یعنی حسن مطلق کا عشق، خوف نہ کھا، یہ سب چیزیں خاک راہ گزر نہیں بن سکتیں۔

نگاہ شوق و خیال بلند و ذوق وجود مترس ازیں کہ ہمہ خاک رہگذر گردد (۲)

موت سے اس کی جان اور پائندہ ہو جاتی ہے۔ اس کی بانگ تکبیر الفاظ، اور آواز میں نہیں سماتی۔

جان او پائندہ تر گردد زموت بانگِ تکبیرش بروں از حرف و صوت (۳)

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی اگر بیزار ہو اپنی کرن سے (۴)

یہ پائیداری و دلداری حسن مطلق اور عشق کے مابین راز و نیاز کی مرہون منت ہے۔ لیکن جمالیات کی رو سے موضوعیت (Subjectivity) اور معروضیت (Objectivity) فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں۔ اقبال کے ''ذوق جمال'' کا تقابل گزشتہ صفحات میں انہی فلسفیانہ اصطلاحات کی روشنی میں ''تصوریت'' اور ''معروضیت'' سے کیا گیا ہے۔ جن کے مقابلے میں '' وحدت جمال'' عاشقانہ اصطلاح ہوتے ہوئے، عشق کی نمائندگی و ترجمانی کرتی ہے۔ اور ''اقبال کا ذوق جمال'' بھی '' وحدت جمال'' پر مشتمل ہے۔ اسلئے کہ اقبال فلسفے کی بجائے بوسیلہ عشق حسن ازل یا حقیقت تک پہنچے ہیں۔ کیوں کہ وہ بخوبی جانتے ہیں، فلسفی، ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں۔

اس ضمن میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر بھی بات کی گئی ہے۔ اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں ہی

---

(۱) بانگِ درا۔ ۲۳۔ (۲) زبورِ عجم۔ ۸۴۔ (۳) پس چہ باید کرد۔ ۲۶۔ (۴) بالِ جبریل۔ ۸۷۔

حقیقت کے متلاشی ہیں ۔ اگر چہ راستے جدا جدا ہیں ۔ بس کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا فرق ہے ۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہو د ، دونوں اس مسئلے پر متفق ہیں کہ کائنات اس لئے جلیل وجمیل ہے کہ "حسن مطلق" اس میں جاری و ساری ہے ۔ اس طرح "حسن ازل" حسن کائنات اور تخلیق کائنات کی علت ٹھہرتا ہے ۔

جبکہ معروضی مکتبہ فکر کے مطابق تکوین کائنات میں تناسب ، ہم آہنگی اور اعتدال پایا جاتا ہے ۔ جس کی بناء پر یہ خوبصورت ہے ۔ موضوعیت کی رو سے حسن خارجی دنیا میں موجود نہیں ۔ بلکہ انسان کے اندر یعنی قلب ونظر میں پایا جاتا ہے ۔ اس طرح کوئی بھی چیز بذات خود خوبصورت نہیں ہوتی ، بلکہ اس کا حسن دیکھنے والے کی نظروں کا مرہون منت ہے ۔ یعنی موضوعیت کی رو سے حسن موجود فی الذہن ہے ۔ موضوعین نے جمالیات میں "تصوریت" کی داغ بیل ڈالی ، جس کے ڈانڈے افلاطونی تصوریت سے جا ملتے ہیں ۔

دنیائے جمالیات میں "جمالیاتی حس" اور "جمالیاتی ذوق" بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان میں جہاں تک جمالیاتی حسِ کا تعلق ہے وہ "اصل" اور جمالیاتی ذوق "فروعی" حیثیت رکھتا ہے ۔ حس ایک ہی ہوتی ہے اور ذوق اپنا اپنا جداگانہ رنگ رکھتا ہے ۔ جمالیاتی حسن قدر مشترک اور ذوق انفرادی حیثیت کا حامل ہے ۔ اس لئے مختلف علاقوں ، نسلوں ، قوموں اور افراد کا معیار حسن بہت سی وجوہات کی بناء پر مختلف ہوتا ہے ۔ لیکن میری ذاتی رائے میں کسی کے معیار کی بناء پر بنیادی طور سے حسن کی حیثیت و کیفیت میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی ۔ یعنی اگر لوگوں کا معیار حسن بدل جائے یا بدلا ہوا ہو تو ، اس کا حسن پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ بلکہ حسن جیسا ہوتا ہے ۔ ویسا ہی ہوتا ہے ۔

مجازی حسن کو سبھی ماہرین جمالیات نے خوشی و انبساط اور حظ کا اعلیٰ ترین وسیلہ بتایا ہے ۔ لیکن راقم الحروف کی ذاتی رائے اس سے مختلف ہے ۔ میرے نزدیک حسن مجازی خوشی و مسرت کی بجائے فوری صدمے کا ذریعہ ہے ۔

موضوعین یا تصوریت پسندوں کے مطابق کائنات اور مظاہر کائنات کا ہونا نہ ہونا حواس کا مرہون منت ہے ۔ اس لئے ہابز کہتا ہے ، روشنی آنکھوں کی وجہ سے ہے ۔ قوس قزح بھی آنکھوں کی وجہ سے موجود ہے ۔ گویا آنکھیں نہ ہوں تو وہ بھی نہ ہو ۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنکھیں ہوتی ہیں اور جب رات یا اندھیرا ہو جائے تو پھر کیوں کر دکھائی نہیں دیتا ۔ اسی مقام پر دن کے وقت سب کچھ نظر آتا ہے ۔ اور اسی مقام پر رات کے وقت بیٹھ کر دیکھیں تو فقط اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے ۔ اسی

طرح اگر قوس قزح ہماری آنکھوں میں ہے تو ہم ہر وقت خواہ دن ہو یا رات اسے کیوں نہیں دیکھ پاتے ۔ کائنات کی وسعتوں میں اربوں ، کروڑوں اشیاء خصوصاً ایسے ایسے ستارے موجود ہیں ۔ جنہیں ابھی تک انسان کی آنکھ یا دور بین دیکھ نہیں پائی ۔ تو کیا وہ موجود ہی نہیں ؟ میرے پاؤں میں کل خار مغیلاں چبھ گیا اور میں شدت درد سے بلبلا اٹھا۔ میری آنکھوں نے تو اسے نہیں دیکھا تھا مگر وہ موجود تھا ۔

حسن یوسف دیدۂ اخواں ندید — از دل یعقوب کے شد ناپدید

بار کلے درخت کی سرسبزی و شادابی کو آنکھوں سے منسوب کرتا ہے ۔ اگر یہی بات ہے تو وہی درخت جو موسم بہار میں ہرا بھرا دکھائی دیتا ہے ، بلکہ میوہ دار درخت میں پہلے سفید پھول کھلتے ہیں ۔ تو وہ سفید نظر آتا ہے ۔ اس کے بعد پتے نکلتے ہیں تو وہ سبز ہو جاتا ہے ۔ اور جب خزاں میں پتے جھڑ جاتے ہیں تو پھر سبز کیوں نہیں دکھائی دیتا ؟

جہاں تک ''معروضیت'' کا تعلق ہے تو بے شک حسن خارج میں موجود ہے ۔ ہم اسے دیکھیں یا نہ دیکھیں وہ موجود تھا ، موجود ہے ۔ اور موجود رہے گا ۔ لیکن اسے دیکھ کر اس سے لطف اندوز ہونے یا رنج والم اٹھانے کے لئے حواس کی ضرورت لازمی ہے ۔ حواس کے بغیر جب ہم مر جاتے ہیں تو حسن و قبیح کی حدود سے بھی نکل جاتے ہیں ۔ اگر چہ جمال و جلال بلا شبہ اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے ۔ کیوں کہ یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے ، افسوس ہم نہ ہوں گے ۔ اور ہر چیز زمانے کی جہاں پر تھی وہیں ہے ، ایک تو ہی نہیں ہے ۔ بہر حال درد وغم اور خوشی و مسرت کا تعلق حواس سے ہے ۔ اسی لئے ہم خواب میں بھی خوشی اور درد وغم سے دو چار ہوتے رہتے ہیں ۔ موت کے بعد اگر جنت و دوزخ کا احساس ہوگا تو وہ بھی حیات بعد الموت کی وجہ سے ہوگا ۔

حسن کے مختلف درجات ہیں ۔ جن میں سب سے اعلی و برتر ''حسن مطلق'' ہے ۔ وہ اس لحاظ سے یگانہ و یکتا ہے کہ وہی خالق و مالک ہے ۔ وہ ازلی و ابدی ہے ۔ اسی کے طفیل مجازی حسن میں بھی ابدیت کی شان پائی جاتی ہے ۔ اس لئے کہ مجازی حسن ، ''حسن ازل'' ہی کی جھلک ہے ۔ اور حسن ازل کی یہ جھلک میرے خیال میں عارضی نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ جھلک جن پر دوں یا مظاہر میں دکھائی دیتی ہے ۔ وہ عارضی و فانی ہو سکتے ہیں ۔ لیکن عرض کے عارضی ہونے سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جوہر بھی عارضی ہے ۔ جوہر کسی اور روپ میں بھی '' جلوہ گر'' ہوسکتا ہے ۔

لہٰذا چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا اور شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا، کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حسن فانی ہے۔ جب :-

"حسن خدا ہے اور خدا حسن ہے" تو پھر کیوں کر فانی ہوسکتا ہے؟

پہلے پہل یونانیوں کے ہاں حسن مطلق کا "تنزیہی" تصور تھا۔ جو بعد میں رفتہ رفتہ "تجسیمی" صورت اختیار کر گیا۔ اور اس سے بت گری اور اصنام تراشی کا فن معرض وجود میں آیا۔ پیکریت اور تجسیمیت کے زیر اثر ہومر اور ہسوئڈ کے اساطیری خدا مشہور و معروف ہیں۔ انہوں نے خدا کو اپنی ہی شکل و صورت اور عادات و اطوار کے مطابق ظاہر کیا۔ جس کی ایلیائی مفکر، زینوفینز نے شدید مخالفت کی۔ زینوفینز کا تصور خدا قرآن حکیم کے مطابق دکھائی دیتا ہے۔

بہر حال جمالیات کے حوالے سے جب "حسن مطلق" کو بہ نفس نفیس دیکھنے کی آرزو نے جنم لیا۔ تو نتیجتاً ساتھ ہی رسم صنم گری بھی معرض وجود میں آ گئی۔ اقبال نے ان حالات و واقعات، کیفیات و جذبات اور نفسیاتی ضروریات کو سو سو طرح سے بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر، ذوق حضور در جہاں رسم صنم گری نہاد، عشق فریب می دہد جان امید وار را، گر چہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند، میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں، دل و دیدۂ کہ دارم ہمہ لذت نظارہ، چہ گناہ اگر تراشم صنمے زسنگ خارہ۔ لیکن دیر و حرم کے یہ اختلافات اسی لئے ہیں کہ "حسن مطلق" اپنے چہرے پر صفات کے پردے ڈالے ہوئے ہے۔ ورنہ اگر،

ہم ایک بار جلوۂ جاناں نہ دیکھتے
پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے — اصغر گونڈوی

اور مرا بر صورت خویش آفریدی، بیروں از خویشتن آخر چہ دیدی اس لئے کہ از من بیروں نیست منزلگہ من، من بے نصیبے راہے نیابم، **من عرف نفسه فقد عرف ربه**۔ ما ترا جویم و تو از دیدہ دور، نے غلط ما کور و تو اندر حضور، اگر زیری زخود گیری زبر شو، خدا خواہی؟ بخود نزدیک تر شو۔ اور حسن بے پایاں درون سینہ خلوت گرفت، آفتاب خویش را زیر گریبانے نگر۔ حسن مطلق زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ نور سے مراد قوت اور پھر بہترین مراد تخلیقی قوت ہے۔ پھر نور جلیل و جمیل ہوتا ہے، گویا کہ وہ تخلیقی قوت جلیل و جمیل بھی ہے۔ اسی لئے :-

الله جميل و يحب الجمال

یہ تخلیقی قوت جلیل و جمیل ہے ۔ لہٰذا اس کی تخلیقات یا خلقت بھی جلیل و جمیل ہے ۔

الذی احسن کل شی خلقه

چونکہ انسان کے پاس ایسا کوئی دوسرا طریقہ نہیں کہ اس کے وسیلے سے ''حسن ازل'' کو بیان کر سکے ۔ اس لئے تجسیم اور مجاز ہی کا طریقہ اپنایا گیا ہے ۔ صاف ظاہر ہے کہ دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جاسکے ۔ اس کے علاوہ انسان اور کر بھی کیا سکتا ہے ۔ اقبال بھی ،دام زگیسواں بدوش زحمت گلستاں بری ،صید چرانمی کنی طائر بام خویش را کے حوالے سے ''حسن مطلق '' کو مجسم انداز ہی میں پیش کرتے ہیں ۔ اور یک دوشکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را کی التجا بھی کرتے چلے جاتے ہیں ۔ کیوں کہ اقبال کی شاعری میں بلا کا تغزل پایا جاتا ہے ۔ اس لئے بھی انہوں نے ''حسن مطلق'' کو مجاز ہی کے روپ میں پیش کیا ہے ۔

اگر سخن ہمہ شوریدہ گفتہ ام چہ عجب!   کہ ہر کہ گفت زگیسوے او پریشاں گفت

پھر یہ بھی ہے کہ حسن مطلق نے بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی حوالے سے مجازی روپ ہی میں پیش کیا ہے ۔ اگر طور پہ تجلی گرائی ہے تو طور مجازی ہے ۔ اگر مظاہر کے پردے میں جلوہ گری کی ہے تو مظاہر بھی مجازی ہیں ۔ قرآن حکیم میں اپنی قدرت ثابت کرنے کے لئے بھی مجاز ہی کی قسمیں کھائی ہیں ۔ پیغمبروں کو بھیجا ہے تو بھی مجازی روپ میں ۔ اس لئے کہ انسان کو سمجھانے اور منوانے کا اس سے بہتر طریقہ اور نہیں ہوسکتا۔ اور جواباً انسان نے بھی ، چند بروئے خودکشی پردۂ صبح و شام را ، چہرہ کشا تمام کن جلوۂ نا تمام را کہتے ہوئے مجازی انداز بیان میں اپنے دل کی بات کی ہے ۔ اور اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا ہے؟

نطشے مجاز میں ایسا پھنسا کہ اپنے تصور میں تراشیدہ فوق البشر کو خدا بنا ڈالا ۔ ہومر اور ہسویڈ کے مقابلے میں اس نے اتنی ترقی کی کہ دیوتاؤں کی بجائے کسی وحشی اور بربریت سے بھر پور آدمی کو خدا کا رتبہ دیا ۔ چنانچہ اقبال اس مجذوب فرنگی کو مقام کبریا سمجھانے کے شرف سے باریاب ہونے کے متمنی ہیں ۔ مگر افسوس، دل کی دل ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی ، ایک بھی ان سے ملاقات نہ ہونے پائی ۔ لیکن مجذوب فرنگی اس زمانے میں ہوتا ، تو نہ جانے اقبال یہ سعادت ، بزور دلبری انداختنے یا بزور قاہری ۔ اگر بزور قاہری انداختے تو یقیناً نطشے بہت خوش ہوتا ۔

بہر حال یوں لگتا ہے کہ ہیگل نے ہوا ، پانی ، کیمیائی عناصر اور وقت مہیا کرنے کا مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ وہ ایک ''فوق البشر'' تخلیق کر دکھائے ۔ اگر کوئی یہ سب کچھ مہیا کر سکتا ہے ۔ تو خود ہی خدا کیوں نہ بن جائے اور وہ پہلے ہی سے خدا ہے ۔ جس کی قدرت کو ، اے ، کریسی ماریسن گھڑی اور مکھی کی مثال سے واضح کرتا ہے ۔

لیکن فلسفی کا فیشن ہے کہ وہ انسان کی صنعت کاری وفن کاری تو مانتا ہے ، مگر خالق کائنات کی تخلیقی ''حسن کاری'' کو بالکل نہیں مانتا ۔ جبکہ یہ راز عاشق ہی جانتا ہے کہ انسان روحانیت کے ذریعے لقائے ربانی سے سرفراز ہو سکتا ہے مولانا جلال الدین رومی نے معمار اور عمارت کا حوالہ دے کر نہایت لطیف پیرائے میں اس مسئلے کو سلجھایا ہے ۔

''حکمت بحثیہ ''والے بحثیں ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور ''حکمت ذوقیہ'' والے عاشق ، حقیقت کی جھلکیاں راتوں کو ستاروں ، سرشار بہاروں اور آبشاروں میں دیکھ لیتے ہیں ۔ اقبال کے نزدیک دعا اور عبادت کے ذریعے حضوری نصیب ہو سکتی ہے ۔ وہ عبادت کو بھی دعا ہی کہتے ہیں ۔ نکو ملکیت ملک صبحگاہی ، درآں کشور بیابی ہر چہ خواہی ، من آں شمعم کہ در شب زندہ داری ، حمہ شب می کنم چوں شمع زاری ، نظامی گنجوی کی طرح اقبال بھی زاشک صبحگاہی زندگی را برگ و ساز آور ، شود کشت تو ویراں تا نہ ریزی دانہ پے درپے پر یقین رکھتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق شور انگیز را ہر جادہ درکوے تو برد ، بہ تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوے تو برد!

ابن عربی کے زیر اثر اقبال پہلے پہل وحدت الوجود کے قائل رہے ہیں ۔ اگر چہ نقادوں نے اس سلسلے میں مولانا رومی کا اثر بھی بتایا ہے ۔ لیکن یہ مسئلہ ذرا غور طلب ہے ۔ اس لئے کہ رومی نرے وحدت الوجودی نہیں تھے ۔ البتہ ابن عربی والی بات دل کو لگتی ہے اور سچی بھی ہے ۔ برسرایں باطل حق پیرہن ، تیغ لا موجود الا ھو بزن ۔ بعد میں مختلف وجوہات کی بناء پر اقبال نے وحدت الوجودی عقائد ترک کر دیئے ۔ بہر حال عشق کے سبھی راستے حسن ازل ہی کی طرف جاتے ہیں اس لئے کہ :۔

''حسن طلب ہے اور عشق اس طلب کو پا لینے کی طلب میں ایک تڑپ ہے'' ۔

البتہ ، عشق است ہزار افسوں ، حسن است ہزار آئیں ، نے من بہ شمار آیم ، نے تو بہ شمار آئی ، عشق فنافی الحسن ہو جانا چاہتا ہے ۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر عشق سراپا آرزو بن جاتا ہے ۔ تا کہ اس کے بعد سراپا دید بن جائے ۔

خیر" اقبال کے ذوق جمال'' میں آرزو اور مدعا مرکزی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس لئے کہ، زندگی در جستجو پوشیدہ است ، اصل او در آرزو پوشید است اور ، زندگانی را بقا از مدعاست ، کاروانش رادرا از مدعاست ، آرزو یعنی عشق پرواز کے لئے شہپر ہے ۔ جس کے بغیر پرواز محال ہے ۔ اور گرم خوں انسان زداغ آرزو ، آتش ایں خاک از چراغ آرزو ، از تمنا ے بجام آید حیات ،گرم خیز و تیز گام آید حیات اور سب سے بڑھ کر ،چشم و گوش ولب کشا اے ہوشمند ،گرنہ بینی راہ حق بر من بخند ۔

بے شک اقبال خوب فرماتے ہیں کہ ، مرگ راساماں زقطع آرزوست ، زندگانی محکم از لاتقنطواست ، ناامید از آرزوے پیہم است ، ناامیدی زندگانی راسم است ۔ آرزو را دردل خود زندہ دار ، تانہ گردد مشت خاک تو مزار اور ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم ، از شعاع آرزو تابندہ ایم ۔ یہ آرزو دراصل عشق ہی ہے ۔ بے شک اقبال کے نزدیک عشق کے بل بوتے پر صبا کی مانند گل لالہ کے اندر داخل ہو کر دیکھا جا سکتا ہے کہ پھول کے پردے میں کون ''محمل نشیں'' ہے ۔ بلا شبہ وہ ''حسن مطلق''ہی ہے ،عشق کی ایک ہی گرم پھونک سے غنچے کا راز کھولا و معلوم کیا جا سکتا ہے ۔

درون لالہ گذر چوں صبا توانی کرد بیک نفس گرۂ غنچہ توانی کر د

اقبال کہتے ہیں عشق و آرزو کو تابندہ و درخشندہ رکھنے کی خاطر ہجر و فراق انتہائی ضروری ہے ۔ اس لئے کہ جدائی خاک راںخشد نگاہے ، دہد سرمایہء کوہے بکاہے ، جدائی عشق را آئینہ داراست ، جدائی عاشقاں را سازگار است ، اسی جدائی اور فراق کی بناء پر میں ''حسن ازل'' کے عشق میں ، گہے از سنگ تصویرش تراشم ، گہے نادیدہ بروے سجدہ پاشم اور گہے ہر پردۂ فطرت دریدم ، جمال یار بے باکانہ دیدم گویا کہ ذوق حضور درجہاں۔۔۔۔۔ واہ سبحان اللہ ''جمال لایزال'' کی تڑپ میں اقبال نے کمال بے مثال اور تب و تاب جاودانہ کا ایسا سماں باندھا ہے کہ جی عش عش کر اٹھتا ہے ۔

اقبال کسی منزل کے باسی نہیں ۔ اس لئے کہ ٹھہراؤ اور جمود ان کے ''ذوق جمال'' سے میل نہیں کھاتا ۔ دیدار یار اور وصال یار کی خاطر وہ منزلوں پر منزلیں مارتے چلے جاتے ہیں ۔ اس لئے کہ رات کو روشن کرنے والے جگنو کی مسلسل پرواز ''سوز عشق''اور''واردات قلبی'' کی وجہ سے ہے ۔ لگاتار حرکت اور تمنا اسے '' حسن مطلق'' سے معرفت کا مقام عطا کرتی ہے۔

اے کرمک شب تاب سراپائے تو نور است پرواز تو یک سلسلہ غیب و حضور است

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے ۔ جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا ،تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا ۔ شاخ ، پھول ، ندی اور باغ و راغ ہر جگہ ''حسن مطلق'' ہی جلوہ گر ہے ۔ اس لئے حیراں ہو کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں ۔ اور عشق اندر جستجو افتادہ و آدم حاصل است ، جلوۂ او آشکار از پردۂ آب وگل است ، خدائے زندہ بے ذوق سخن نیست ، تجلی ہائے او بے انجمن نیست ، مرا دل سوخت برتنہائی او ، کنم سامان بزم آرائی او ، مثال دانہ می کارم خودی را ، برائے او نگہدارم خودی را ، یہ سب کچھ عشق و آرزو کی بناء پر ہے ۔ اس لئے کہ بے خلشہاز یستن نازیستن ، باید آتش درتہ پاز یستن ۔

اس ''قلزم جمالیات'' میں مادیت و روحیت اور عقلیت و تجربیت پر سرسری بات کی جائے تو ولیم جیمز ، شوپن ہائر ، ڈارون اور اسپنسر مادئین کے زمرے میں آتے ہیں ۔ چونکہ مادیت مختلف حوالوں سے ''شاہین بچوں'' کو خاک بازی کا سبق دیتی ہے ، اس لئے صاف ظاہر ہے ، اقبال کے لئے ناقابل قبول ہے ۔ اور وہ ''حسنِ وحقیقت'' کو روحانی قوت سمجھتے ہیں ۔ ادھر ڈیکارٹ ، اسپنوزا اور لائبنز عقلیت پسندی (Rationalism) کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ جبکہ کانٹ ، شلر اور برگساں روحانیت کے حامی و بانی ہیں ۔ کانٹ ''تنقید عقل محض'' میں عقلیت پرستی پر ضرب لگاتے ہوئے ثابت کر دکھاتا ہے کہ ''وجدان '' بھی ایک قوت ہے جو معرفت حقیقت میں رہنمائی کرتی ہے ۔ شلر اور برگساں بعد میں وجدانیت کو مزید آگے بڑھاتے ہیں ۔ اور اقبال وجدان کا یہ تصور قرآن پاک سے اخذ کرتے ہیں ۔ اور مولانا روم سے ہوتے ہوئے از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد کے مصداق اپنی خاک کو اکسیر بنا لیتے ہیں ۔

ایک طویل بحث کے دوران میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اقبال کے نزدیک عقلیت پسندی معرفت حاصل نہیں کر سکتی ۔ اس کی اپنی ایک حد ہے ۔ اس سے آگے اڑتے ہوئے اس کے پر جلتے ہیں ۔ کرگساں رارسم و آئیں دیگر است ، سطوت پرواز شاہیں دیگر است ۔ اور لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف والی بات ہے ۔

نظر تو ہمہ تقصیر و خرد کوتاہی   نزی جز بہ تقاضائے کلیم اللہی (۱)

عقلیت پسندی کے مقابلے میں تجربیت (Empiricism) ہے ۔ جس کے نمائندے لاک ، برٹرنڈرسل ، جان سٹارٹ مل اور ہیوم ہیں ۔ اسے ''تجزیاتی فلسفہ'' بھی کہتے ہیں ۔ جس کا آغاز جی ۔ امور (G-E-Moore) سے ہوا ۔ تجزیاتی فلسفہ مابعد الطبیعات کی نفی کرتا ہے ۔

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۱۸۰۔

اس کے برعکس پروفیسر بریڈلے تصوریت (Idealisim) کا قائل ہے۔ جس کی سرحدیں افلاطوفانی ''عینیت'' سے جا ملتی ہیں۔ بریڈلے وحدت الوجود (Wholeness) پر یقین رکھتا ہے۔ تصوریت کے مطابق تجزیے سے یکتائی ختم ہو جاتی ہے۔

حسن مطلق کی معرفت، ہر طرح کے حسن مجازی کے بغیر ناممکن ہے۔ حسن فطرت ہو یا حسن انسان بات دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ اس لئے کہ دونوں جگہوں میں معنی مولا ہے جلوہ گر۔ صنوبر بندۂ آزادۂ او، فروغ روے گل از بادۂ او، حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے، انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے۔ بیاباشاہد فطرت نظر باز، چرا درگوشہ خلوت گزینی، تراحق داد چشم پاک بینے، کہ از نورش نگاہے آفرینے، دلا رمز حیات از غنچہ دریاب، حقیقت در مجازش بے حجاب است اور جلوہ دہد باغ و راغ معنی ء مستور را، عین حقیقت نگر حنظل و انگور را۔

تجزیاتی فلسفے کے بر خلاف اقبال کے نزدیک مظاہر حقیقت نہیں۔ بلکہ حقیقت کی صفات ہیں۔ اور تصوراتیوں کے برعکس کائنات یا مظاہر فطرت واہمہ و سراب نہیں بلکہ تخلیق بالحق ہے۔ اس لئے:۔

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ　　　ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر　　　ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ

چنانچہ اقبال تصوراتی و تجزیاتی فلسفی سے کہتے ہیں کہ اب ساقی مشرق یعنی اقبال سے شراب عشق پی لے تا کہ تیری خاک سے پے در پے مستانہ نالے اٹھیں۔

زدست ساقی خاور و جام ارغواں درکش　　　کہ زخاک تو خیز د نالہ ء مستانہ پے در پے　　　(۱)

اور کوہ ہائے خنگ سار او نگر، آتشیں دست چنار او نگر، در بہاراں لعل می ریزد زسنگ، خیز د از خاکش یکے طوفان رنگ، لکہ ہائے ابر در کوہ و دمن، پنبہ پراں از کمان پنبہ زن، پھر سب سے بڑھ کر سادہ اور سیدھے سادے الفاظ میں:۔

کوہ و دریا و غروب آفتاب　　　من خدا را دیدم آنجا بے حجاب

الٹ جائیں گی تدبیریں، بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!　　　(۲)

---

(۱) زبور عجم۔۱۰۷۔　　　(۲) بال جبریل۔۵۹۔

اقبال کہتے ہیں پہلے مادی دنیا کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کرنی چاہئے ۔ پھر اس پر عشق کا آب حیات ڈال کر، معرفت حسن مطلق حاصل کی جا سکتی ہے ۔

پشتو کے معروف شاعر امیر حمزہ شنواری بھی کہتے ہیں :۔

تعلی ے د غرور لہ تہ نہ دہ
پہ رنجونتہ روسترگو انتیار یم
خو وزرم د مجاز دی پرے وید یزم
کنی عرش ے یو قدم ھغہ پروازیم — امیر حمزہ شنواری

باخبر شو از رموز آب و گل — پس بزن برآب و گل اکسیر دل

تصوراتیوں و تجزیاتیوں کے برخلاف اقبال کے نزدیک مظاہر فطرت نہ تو واہمہ ہیں اور نہ حقیقت سے عاری ۔ بھلا وہ کائنات سراب کیسے ہو سکتی ہے؟ اور حقیقت سے تہی کیونکر ہوگی ، جس کی ہر چیز کے اندر ''حسن و عشق'' کی کشاکش پائی جاتی ہو ۔ چنانچہ اقبال تصوراتیوں کو باور کراتے ہیں کہ بحر و بر اور دشت و کہسار دھوکہ و فریب نہیں ہو سکتے ۔ اور تجزیاتیوں کے جواب میں کہتے ہیں کہ ''نور حقیقت'' کے بغیر ان مظاہر کی کوئی حقیقت نہیں ۔ مظاہر کے وجود سے خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ ''حقیقت مطلق'' بھی ہے ۔ تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں ، پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں ، استادہ سرو میں ہے سبزے میں سو رہا ہے، بلبل میں نغمہ زن ہے ، خاموش ہے کلی میں ، آ میں تجھے بتاؤں رخسار روشن اس کا ، نہروں کے آئینے میں شبنم کی آرسی میں :۔

صحرا و دشت و در میں کہسار میں وہی ہے — انساں کے دل ، میں ، تیرے رخسار میں وہی ہے

فطرت اور مظاہر فطرت کے علاوہ نسوانی حسن بھی ''قرب الٰہی'' کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے ۔ اس لئے کہ ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا ، آنکھوں میں ہے ''سلیمٰی'' تیری کمال اس کا ، اور اس لئے بآ دے نرسیدی ، خدا چہ می جوئی ، زخود گریختہ آشنا چہ می جوئی ، پھر نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پر عریاں کی ، یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی ، چنانچہ پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں، معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا ۔

اقبال حسن فطرت کے علاوہ حسن نسوانی کے راستے سے بھی گزرے ہیں۔ لیکن صرف گزرے ہیں ۔ اس لئے کہ ٹھہراؤ ان کی جمالیات کے بنیادی ذوق کے خلاف ہے ۔ مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی وغیرہ اقبال کا نقطہ

زشرر ستارہ جویم ، زستارہ آفتابے سر منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

آغاز تھا ۔ اور پھر یہ پگڈنڈی متواتر گھومتی ہوئی مقام ثریا تک جا پہنچی ۔ شعلہ ءکزوے شرر ہا در گسست ، جان و تن بے سوز او صورت نہ بست ، ارج ما از ارجمند یہائے او ، ما ہمہ از نقشبند یہائے او ، حق ترا داد است اگر تاب نظر ، پاک شو قدسیت او ر انگر ۔ اقبال کے نزدیک تین چیزیں ، بینائی میں ، افزودگی کا باعث بنتی ہیں ۔ سبزہ ، آب رواں اور خوبصوت چہرہ ۔

چشم را افزاید سہ چیز سبزہ و آب رواں و روے خوش

وہ کہتے ہیں ، جوانمردے کہ دل باخویش بست ، رو ددر بحر و دریا ایمن از شست ، نگہ را جلوۂ مستی ہا حلال است ، ولے باید نگہ داری دل و دست ۔ اور خراب لذت آنم کہ چوں شناخت مرا ، عتاب زیر لبی کرد و خانہ ویراں گفت ، دگر زسادہ دلیہائے یار ، نتواں گفت ، نشستہ بر سر بالین من زدرماں گفت ۔

مدتے بالالہ رویاں ساختم عشق بامر غولہ مویاں باختم

بادہ ہا با ماہ سیما یاں زدم بر چراغ عافیت داماں زدم

مگر حضورؐ کی تمنا میرے دل میں خوابیدہ رہی ۔ اور صدف میں موتی کی طرح پوشیدہ رہی ۔ پھر آخر کار میری آنکھوں کے پیمانے سے چھلک پڑی اور اس نے میرے ضمیر کے اندر سے نغمے پیدا کر دیئے ۔ یہ اور بات کہ ، پیر ما مصلحتا رو بمجاز آورداست ، ورنہ باز ہرہ وشاں ہیچ سروکارش نیست ۔ درحقیقت ، بکوئے دلبراں کارے ندارم ، دل زارے غم یارے ندارم ، نہ خاک من غبارے رہگذارے ، نہ در خاکم دل بے اختیارے ، جبریل امیں ہم داستانم ، رقیب و قاصد و درباں ندانم ۔

اس میں شک نہیں کہ جاوید نامہ کے حوالے سے ، حوریاں را در قصور و در خیام ، نالہ ءمن دعوت سوز تمام ، آں یکے از خیمہ سر بیروں کشید ، واں دگر از غرفہ رخ بنمود و دید ، برلب شاں زندہ رود ، اے زندہ رود ، زندہ رود اے صاحب سوز و سرود ، شور و غوغا از یسار و از یمیں ، یک دو دم با ما نشیں با ما نشیں ۔

اور جواباً اقبال کا یہ کہنا کہ ، عشق در ، ہجر و صال آسودہ نیست ، بے جمال لایزال آسودہ نیست ، ابتداء پیش بتاں

افتادگی ، انتہا از دلبراں آزادگی ، عشق بے پروا و ہر دم در رحیل ، در مکان و لامکاں ابن السبیل ، طلسم نہایت آں کہ نہایتے ندارد ، بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امید وارے ،

اگر عنان تو جبریل و حور می گیرند   کرشمہ بردل شاں ریزد و دلبرانہ گزر   (۱)

اس لئے کہ :۔

حسرت جلوۂ آں ماہ تمامے دارم   دست بر سینہ نظر بر لب بامے دارم

کیش ما مانندِ موج تیز گام   اختیار جادہ و ترک مقام

ہم دیکھ آئے ہیں کہ "میری" میں "فقیری" میں ، شاہی میں غلامی میں ، کچھ کام نہیں بنتا بے جراءت رندانہ اور جراءت رندانہ عشق ہی کر سکتا ہے ، جو عقل کے برعکس آگ میں بے خطر کود پڑتا ہے ۔ عقل بیٹھی سوچتی

کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا   عشق نے زور آزمائی کی   (میر)

رہ جاتی ہے اور عشق آسماں پر سے مہر و ماہ کے شیشے اتار لاتا ہے ۔ اور عشق در صحبت میخانہ بگفتار آید ، زانکہ در دیر و حرم اسرارش نیست ، ادھر ، خرد زنجیری ء امروز و دوش است ، پرستار بتان چشم و گوش است ، صنم در آستیں پوشیدہ دارد ، برہمن زادۂ زنار پوش است ___ عقل نے آج کل تجزیاتی و تصوراتی اور معروضی و موضوعی زنار پہنا ہوا ہے ۔ چنانچہ اقبال "محبوب حقیقی" کے حضور میں کہتے ہیں کہ ، خرد بر چہرہ تو پردہ ہا بافت ، نگاہے تشنہ دیدار دارم ، در افتد ہر زماں اندیشہ باشوق ، چہ آشوب افگنی در جان زارم ۔

اقبال کے نزدیک ہر شے کی حقیقت ایک ہی ہے ۔ چاند تاروں کی بوقلمونی ضرور ہے ۔ مگر یہ سب حقیقت کی تخلیقات ہیں ۔ بذات خود حقیقتیں نہیں ہیں ۔ چنانچہ تجزیاتی فلسفے کے برخلاف اقبال بجا فرماتے ہیں کہ ، حرکت اعصاب گردوں دیدہ ام ، در رگ مہ گردش خوں دیدہ ام ۔ اور پھر لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں ۔ واہ جی واہ ، سبحان اللہ ، لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں ۔

فلسفہ و خرد یا معروضی ہے یا موضوعی ، لیکن عشق ظاہر و باطن دونوں پر یقین رکھتا ہے ۔ خرد فانی ہے ۔ عشق لافانی ۔ خرد وقت کے لمحے گنتی رہتی ہے ۔ اور عشق سارے زمانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے ۔ حواس عقل یا فلسفہ ہیں ۔ جبکہ عشق

---

(۱) زبور عجم ۔ ۹۸ ۔

فغاں ہے ۔ خرد را از حواس آید متاعے ، خرد میرد فغاں ہرگز نمیرد ، خرد بہر ابد ظرفے ندارد ، نفس چوں سوزن ساعت شمارد ، تراشد روز ہا شب ہا ، سحر ہا ، نگیرد شعلہ و چیند شرر ہا اور بس ، علم حق اول حواس ، آخر حضور ، آخر او می نگنجد در شعور ۔

اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ خودی کے استحکام سے ، ''حسن مطلق'' کا وصال باکمال حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ اس لئے ، خودی را لازوالے می تواں کرد ، فراقے او وصالے می تواں کرد ، چراغے از دم گرمے تواں سوخت ، بسوزن چاک گردوں می تواں سوخت ، اس لئے کہ خدائے زندہ بے ذوق سخن نیست ، تجلی ہائے او بے انجمن نیست ۔

علم و فلسفہ تجزیاتی ہو یا تصوراتی ان کا مقام سوچ سے آگے نہیں ۔ جبکہ عشق قلب بیدار میں جلوہ گر رہتا ہے ۔ علم اور فلسفہ عشق سے فیض حاصل کئے بغیر ، محض تماشائے افکار ہیں ۔ جس کی حیثیت سحر سامری سے زیادہ نہیں ۔ گویا کہ روح القدس کے بغیر علم شعبدہ بازی بن کر رہ جاتا ہے ۔ چنانچہ اقبال یہ حقیقت کھل کر بیان کرتے ہیں کہ ، بے تجلی مرد دانا رہ نبرد ، از لکد کوب خیال خویش مرد ، بے تجلی زندگی رنجوری است ، عقل مہجوری و دیں مجبوری است ، ایں جہان کوہ و دشت و بحر و بر ، ما نظر خواہیم وا و گوید 'خبر' ۔

حضرت موسیٰ کا پختہ ایمان تھا کہ ''حسن مطلق'' موجود ہے انہوں نے عشق کی بدولت دیدار کی آرزو کی ۔ اس طرح اقبال تجزیاتی فلسفیوں سے کہتے ہیں کہ تم ''حسن مطلق'' پر ایمان نہیں رکھتے کہ وہ غیب ہے ۔ تم اسے ظاہری آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہو ۔ ایسا مت کرو کہ وہ خلوت پسند ہے ۔ اور تم عقل و فلسفے کے وسیلے سے اس کی دید نہیں کر سکتے ۔ اس کے لئے ''دیدہ دل'' یعنی عشق کی ضرورت ہے ۔

ہر کجا بے پردہ آثار حیات — چشمہ زارش در ضمیر کائنات
در نگر ہنگامہء آفاق را — زحمت جلوت مدہ خلاق را

حفظ ہر نقش آفریں از خلوت است
خاتم اورا نگیں از خلوت است

لیکن اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ ، فلسفی ایں رمز کم فہمیدہ است ، فکر او بر آب و گل پیچیدہ است ، دیدہ از قندیل دل روشن نکرد ، پس ندید الا کبود و سرخ و زرد ، چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ ، آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار است ، اور بلا

شبہ آنکہ شبخوں بدل و دیدۂ دانایاں ریخت، پیش ناداں سپر انداختنش رانگرید۔ چنانچہ اقبال اپنے بارے میں ''تجزیاتی فلسفیوں'' کی طرف سے کہتے ہیں کہ،اے باغباں! اقبال سے کہہ دے، وہ چمن سے نکل جائے۔ اس جادو نوا نے تو ہمیں پھول سے بیگانہ کر دیا ہے۔ گویا اقبال کے نزدیک مظاہر نہیں، بلکہ حقیقت،حقیقت ہے۔

بگو اقبال را اے باغباں رخت از چمن بندد که ایں جادو نوا! مارا زگل بیگانہ می سازد

چنانچہ اقبال کے نزدیک دانش حاضر کے تجزیاتی و تصوراتی فلسفے کا یہ حال ہے کہ، درصراط زندگی از پافتاد، برگلوے خویشتن خنجر نہاد، آتشے دارد مثال لالہ سرد، شعلہ ء دارد مثال ژالہ سرد، فطرتش از سوز عشق آزاد ماند، در جہان جستجو آزاد ماند، جملہ عالم ساجد و مسجود عشق، سومنات عقل را محمود عشق۔

ایں مئے دیرینہ در میناش نیست شور ''یا رب'' قسمت شبہاش نیست

حدیث عشق بہ اہل ہوس چہ میگوئی بچشم مور مکش سرمہء سلیمانی! (۱)

عاشقوں کی بجائے یہاں تجزیاتی و تصوراتی فلسفیوں کا راج ہے ورنہ حسن مطلق تو اپنی تجلیات کا ہر وقت اظہار کر رہا ہے۔ اس لئے کہ، اورا لذتے درانکشاف است۔ لہٰذا تو شعلہ ء سینائی، میں شعلہ ء سینائی، جنہیں دیکھنے کے لئے دیدۂ دل وا کرنے کی ضرورت ہے۔ جبکہ فلسفیوں کے پاس وہ آنکھ ہے ہی نہیں، اسے وا کیا کریں گے؟ وہ آنکھ صرف اور صرف عاشق حسن ازل، مرد قلندر کے پاس ہوتی ہے۔ اس لئے آں نگاہے پردہ سوز از من بگیر، کوبچشم اندرنمی گردد اسیر، جملہ تن را درگداز اندر بصر، درنظر رو، درنظر رو، درنظر۔ کیونکہ آدمی دید است باقی پوست است اور دید آں باشد کہ دید دوست است۔

جراء ت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے!

کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار جب تک تو اسے ضرب کلیمی سے نہ چیرے

کہتے ہیں کہ میں نے احکام شریعت کی تحقیق کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صرف منکر عشق ہی کافر و زندیق ہے۔ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں پہنچان سکتا۔

زرسم و راہ شریعت نکردہ ام تحقیق جز اینکہ منکر عشق است کافر وزندیق! (۲)

اقبال ایک عرصے تک خرد کی گتھیاں سلجھاتے رہے مگر جب انہیں یقین ہو گیا کہ خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۳۶۔ (۲) زبور عجم۔ ۱۱۳۔

جبکہ، ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں، علم میں بھی سرور ہے لیکن، یہ وہ جنت ہے

وحشت ہے خرد مندوں کی صحبت سے مجھے میر اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو (میر)

جس میں حور نہیں تو انہوں نے فلسفے اور فلسفیوں کو خیر باد کہہ دیا اور ''اہل نظر'' کی صحبت سے فیضاب ہوتے رہے۔

چنانچہ کہتے ہیں کہ:۔

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

جب اہل عشق کی صحبت میں اقبال کا سینہ تجلی زار ''حسن مطلق'' بن گیا تو بجا فرمانے لگے کہ:۔

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم

کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اقبال کسی بھی فلسفی سے متاثر نہ ہو سکے۔ ورنہ وہ فلسفے کو چھوڑ کر عشق کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ گویا فلسفہ، علم کلام اور منطق وغیرہ سے انہیں خامی کی بو آتی ہے۔ بے شک، با مغربیاں بودم برجستم وکم دیدم، مردے کہ مقامآتش ناید بہ حساب اندر اور میان آب وگل خلوت گزیدم، زافلاطون و فارابی رمیدم، نہ کردم از کسے دریوزۂ چشم، جہاں را جز بچشم خود ندیدم۔ ''اقبال کے ذوق جمال'' کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ حضورؐ کی ذات اقدس، قرآن پاک اور مولانا رومی سے متاثر ہیں۔ اس لئے کہ یہ تینوں عشق و عاشقی کے سرچشمے ہیں۔ اور عشق ہی اقبال کی نظر میں ''نظر'' ہے۔ لہٰذا:۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اور لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب، گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب، آیہء کائنات کا معنی دیریاب تو، نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو۔ اور دارم اندر سینہ نور لا الہ، در شراب من سرور لا الہ، فکر من گردوں مسیر از فیض او، جوئے ساحل ناپذیر از فیض او۔

اقبال کا سارا کلام ''حسن مطلق'، کی تجسیم گری اور عشق و آرزو سے عبارت ہے۔ اس سلسلے میں ان کے ہاں بے شمار پیرائیہ ہائے اظہار کے ساتھ ہجر و صال سے لے کر انتظار اور عالم دیدار کے عالم میں حسن یار کی جلیل وجمیل جھلکیاں پائی

جاتی ہیں ۔ مثال کے طور پر، من بتلاش تو روم یا بتلاش خود روم، عقل و دل ونظر ہمہ گم شدگان کوے تو، از چمن تو رستہ ام قطرۂ شبنمے بہ بخش، خاطر غنچہ واشود کم نشود ز جوے تو۔

لیکن تجزیاتی اور تصوراتی فلسفی کچھ اور ہی راگ الاپتے ہیں ۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں، دریں محفل کہ کارے او گذشت از بادہ و ساقی، ندیمے کو کہ در جامش فرو ریزم مے باقی، کسے کو ز ہر شیریں می خورد از جام زرینے، مئے تلخ از سفال من کجا گیرد بہ تریاقی۔

اقبال محبوب حقیقی کے جلوؤں میں اس قدر محو ہیں ۔ کہ اس سے راز و نیاز کرتے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ، شب من سحر نمودی کہ بہ طلعت آفتابی، تو بہ طلعت آفتابی سزد ایں کہ بے حجابی، تو بہ درد من رسیدی، بضمیرم آرمیدی، ز نگاہ من رمیدی، بگنیں گراں رکابی، تو عیار کم عیاراں، تو قرار بے قراراں، تو دوائے دل فگاراں، مگر ایں کہ دیر یابی، اور، ز حکایت دل من تو بگو کہ خوب دانی، دل من کجا کہ اورا بکنار من نیابی ۔اگر ہم سے غزل عاشقانہ چاہتا ہے تو تو بھی ناز و ادا ور دلبرائی سیکھ۔

اگر زما غزل عاشقانہ می خواہی! تو ہم بعشوہ گری کوش و دلبری آموز (۱)

اور اگر آپ کے حضور کوئی میری غزل پیش کرے تو کیا ہی اچھا ہو، اگر آپ اسے یہ کہہ کر نواز دیں کہ'' میں اس کو جانتا ہوں''

بحضور تو اگر کس غزلے زمن سراید چہ شود اگر نوازی بہ ہمیں کہ ''دانم اورا '' (۲)

عقل و خرد کے عکس و تجزیے اور ''ذوق وشوق'' کی مندرجہ بالا روشنی میں ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ'' اقبال کا ذوق جمال'' قرآنی تعلیمات کا نچوڑ ہے ۔جس کے مطابق مظاہر تخلیق بالحق ہیں ۔ موجودات ومحسوسات کی یہ دنیا ''حسن ازل'' کی صفات کا درجہ رکھتی ہے ۔ چند بروئے خود کشی پردۂ صبح و شام را، چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را، سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ عالم ناسوت کے پردوں میں

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں (۳)

حقیقت جلوہ گر ہے ۔ یہ پردے نہ عکس ہیں اور نہ حقیقت، بلکہ حقیقت نے انہیں اپنی نشانیوں اور ''جلال و جمال''

---

(۱) زبور عجم ۔۶۵۔ (۲) زبور عجم ۔۴۵۔ (۳) بانگ درا ۔۱۰۵۔

''کے طور پر تخلیق کیا ہے ۔ اقبال کے مطابق زروان فرشتہ بھی حسن اور عاشق کے درمیان ایک پردے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ بہر حال ان تمام پردوں کے اس پار فلسفے کی آنکھ سے نہیں ، بلکہ عشق کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے ۔ اس لئے کہ حقیقت کے راز تک فقط عشق ہی پہنچ سکتا ہے ۔

از نگاہ عشق خاراشق شود   عشق حق آخر سراپا حق شود

کشودم از رخ معنی نقابے   بدست ذرہ دادم آفتابے

اقبال کے ذوق وشوق اور عشق جمال کا یہ عالم ہے کہ از زیان صد شعاع آفتاب ، کم نمی گردد متاع آفتاب جیسی جمالیاتی ترغیب سے '' حسن ازل '' کے حضور میں ملتمس ہیں کہ ، اشارتہائے پنہاں خانماں برہم زند لیکن ، مرا آں غمزہ می باید کہ بیباک است وخونریز است ، چنانچہ ، پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر ، چشم مہرومہ وانجم کو تماشائی کر ، تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کب تک ، بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر ۔

چشم در کشت محبت کاشتم

از تماشا حاصلے برداشتم

حسن کی جب تجسیم گری کی جائے تو فن کہلاتا ہے ۔ فن کار و فن پارے کے لئے راقم کی اختراع کردہ اصطلاحات '' حسن کار '' اور '' حسن پارہ '' ہیں ۔ ''اقبال کا ذوق جمال '' ، حسن وعشق ، کے علاوہ خودی اور حرکت وعمل سے تکمیل پاتا ہے ۔ وہ ان چاروں عناصر کو فن کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں ۔ ورنہ فن کا افادی اور مثبت کارگر پہلو ختم ہو کر رہ جاتا ہے ۔

فن کا '' کسبی '' یا '' وہبی '' ہونا شروع سے زیر بحث رہا ہے ۔ اقبال کے نزدیک فنی صلاحیت وہبی ہوتے ہوئے بھی اکتسابی ہے ۔ اس لئے کہ خدا داد صلاحیت کی بناء پر بے شک کسی حسن پارے کی بنیاد فراہم ہو جاتی ہے ۔ مگر بعد میں اکتساب کے ذریعے ہی اس میں کمی بیشی یا کانٹ چھانٹ کی بدولت ، نشست و برخاست درست کی جاتی ہے ۔ چنانچہ ملک معنی کس حد اورانہ بست ، بے جہاد پیہم ناید بدست ، کاوکاو ناحق مردان راز ، جوئے خوں بکشاد از رگہائے ساز ،

ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خداداد   کوشش سے کہاں مرد ہنر مند ہے آزاد

اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اقبال کے نزدیک '' حسن کاری '' الہام و وجدان بھی ہے ۔ بلکہ کرو چے تو اظہار کو

کہتا ہی وجدان ہے ۔ اظہار کے بغیر ''حسن کاری'' معرض وجود میں نہیں آسکتی ۔ اور معرض وجود میں آنے کے لئے ، اظہار ضروری ہے ۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں ، صبح کے وقت چمن کی شاخ پر مرغ نغمہ خواں نے کیا اچھی بات کہی کہ جو کچھ تیرے سینے کے اندر ہے باہر نکال ۔ وہ راگ ہو ، نالہ و فریاد یا اہ و فغاں ۔

سحر در شاخسارے بوستانے چہ خوش می گفت مرغ نغمہ خوانے
برآور ہر چہ اندر سینہ داری سرودے ، نالہء آہے ، فغانے (۱)
از نالہ برگستاں آشوب محشر آورد تادم بہ سینہ پیچد مگذار ہائے وہورا

یہ سب وجدان و اظہار کا مرہون منت ہے ۔ اس لئے کہ :۔

جز نالہ نمی دانم ، گویند غزل خوانم ایں چیست کہ چوں شبنم برسینہ من ریزی
زگردوں فتد آنچہ برلالہء من فروریزم اورا بہ برگ گیا ہے (۲)

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ، حسن کاری نمودِ وجدان سے ہوتی ہے ، اس لحاظ سے ''حسن کاری'' وہبی اور عطیہ خداوندی کہلائے جانے کی مستحق ہے ۔ اور بعد میں جب اکتساب کے ذریعے نوک پلک درست کی جاتی ہے تو اس میں کسبیت بھی شامل ہو جاتی ہے ۔ اس لئے ، خون رنگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر ، میخانہ ء حافظ ہو کہ بتخانہ ء بہزاد سے لے کر ،

قبائے علم و ہنر لطف خاص ہے ورنہ تیر ی نگاہ میں تھی میری ناخوش اندامی

تک اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اقبال'' حسن کاری'' کو وہبی و کسبی دونوں عناصر کا مرہون منت سمجھتے ہیں ۔

بے شک حسن کاری کا بیج قدرت کاملہ ، قلب حسن کار میں بو کر اس کی ننھی سی کونپل بھی اگا دیتی ہے ۔ لیکن آگے حسن کار کا کام ہے کہ اسے اپنے خون جگر سے سینچتا رہے ۔ ورنہ حسن کاری کی وہ نرم و نازک اور حسین و جمیل کونپل ، اقبال کے نزدیک وہیں مرجھا کر رہ جائے گی ۔ چنانچہ جب اقبال کہتے ہیں کہ :۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

تو اس سے ان کی مراد وہی اکتسابی سخت کوشی اور مسلسل جدوجہد ہے ۔ جس کے بل بوتے پر ''حسن کار'' اپنی حسن

---

(۱) پیامِ مشرق ۔۳۳۔ (۲) زبور عجم ۔۴۷۔

کاری کو دائمی وقار اور لطیف نکھار سے ہمکنار کرتا ہے ۔ اقبال کا یہ معیار حسن کاری ، بسانِ باد بہاری ، تمام فنون کے متعلق ہے ۔ اس میں کسی ایک "حسن کاری" یا "حسن" کی بات نہیں ۔ بلکہ مصوری ، حسن تعمیر ، سنگتراشی ، موسیقی ، شاعری اور لحن ، سبھی کا پیمانہ یا کسوٹی یہی خون جگر ہے ۔ لہٰذا اقبال کہتے ہیں ۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

"حسن کاری" کے اس معیاری شعر میں پتے کی بات یہ ہے کہ وہی حسن یا فن اعلیٰ وارفع ہوگا ، جس کے اندر "معجزاتی شان" پائی جاتی ہو ۔ اور معجزہ عشق کے بغیر نہیں دکھایا جا سکتا ۔ گویا کہ "حسن کاری" میں بھی خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور ، حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر ، کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا ۔

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال مزید کہتے ہیں کہ ، برگ گل رنگیں زمضمون من است ، مصرع من قطرۂ خون من است ، چنگ را گیرید از دستم کہ کار از دست رفت ، نغمہ ام خوں گشت و از رگہائے ساز آید بروں ، اور یہ کہ ، بہ بحر خویش چوں موجے تپیدم ، تپیدم تا بطوفانے رسیدم ، دگر رنگے ازیں خوشتر ندیدم ، بخون خویش تصویرش کشیدم ۔

خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو
لخت دل پر خونے از دیدہ فرو ریزم لعلے زبد خشانم بردار و بخاتم زن! (۱)

جو حسن کار اپنی حسن کاری میں خون جگر کا رنگ بھرتے ہوئے اسے رنگین و دلکش بناتا ہے تو وہ بجا طور پر اپنی حسن کاری کو بڑی سے بڑی سلطنت کے مقابلے میں بھی اعلیٰ و ارفع تصور کر سکتا ہے ۔ اقبال کے نزدیک ایسے حسن کار کی حیثیت و مقام ایسا ہوتا ہے کہ گویا ، نہ من بر مرکب ختلی سوارم ، نہ اازوابستگان شہر یارم ، مرا اے ہمنشیں دولت ہمیں بس ، چو کاوم سینہ رالعلے برآرم ۔

خون جگر کی اصطلاح میں مزید پیش رفت کرتے ہوئے اقبال فطرت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ تن و من تیار دکھائی دیتے ہیں ___ عجم بحریست ناپیدا کنارے ، کہ دروے گوہر الماس رنگ است ، ولیکن من نہ دانم کشتی خویش ، بدریائے کہ موجش بے نہنگ است ۔

---

(۱) زبور عجم ۔ ۷۵ ۔

اقبال زندگی کے عام رویے میں بھی محنت و جانفشانی اور شاہینی کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں، قبائے زندگی چاک تاکے ؟ ، چوموراں آشیاں درخاک تاکے، بہ پرواز آ شاہینی بیاموز ، تلاش دانہ درخاشاک تاکے ۔ چنانچہ کہتے ہیں ، میں باغ کے پرندوں سے ناآشنا ہوں۔ آشیاں کی شاخ پر بیٹھا تنہا راگ الاپ رہا ہوں ۔ اگر تو نازک دل ہے تو مجھ سے پرے رہ ۔کیوں کہ میری نوا سے میرا خون ٹپک رہا ہے ۔

زمرغان چمن ناآشنا یم بشاخ آشیاں تنہا سرایم
اگر نازک دلی ؛ از من گراں گیر کہ خونم می تراود از نوایم (۱)

اقبال کے ''حسن کارانہ ذوق جمال''میں انسان ایک ایسا ''حسن پارہ'' ہے ،جسے فطرت نے قرن ہا قرن کی حسن کاری سے تراشا ہے ۔اس لئے یہ باکمال حسن پارہ لازوال ہے ۔

مشونومید ازیں مشت غبارے پریشاں جلوۂ ناپائیدارے
چو فطرت می ترا شد پیکرے را تمامش می کند در روزگارے

اقبال رومی کی طرح شعر کے لئے سوز و گداز کو ضروری قرار دیتے ہیں ۔اس لئے ان کے نزدیک شعر و سخن ایسا پر سوز ہونا چاہئے ۔جس کی لے سے دل ، سینے کے اندر رقصندہ و رخشندہ ہو جائے ۔گویا کہ فن روحانیت سے بھر پور ہو تا کہ شیشہ دل کو گداز کر دے ۔

اشکوں ،آہوں کی اس دنیا میں اقبال کا پیغام ہے کہ بے شک ایسے ایسے غم ہیں کہ جوانی میں کمر کو دہرا کر دیتے ہیں ،لیکن ہمت نہیں ہارنی چاہئے ، ہر حال میں زندگی کا مقابلہ ضروری ہے ____ دربنگہ فقیر و بکاشانہ ء امیر ،غمہا کہ پشت رابجوانی کند دوتاے، درماں کجا کہ درد بدرماں فزوں شود ، دانش تمام حیلہ و نیرنگ و سیمیاے ، از من حکایت سفر زندگی میرس ، درساختم بدرد و گزشتم غزل سرائے ، آمیختم نفس بہ نسیم سحر گہی ، گشتم دریں چمن بہ گلاں نا نہادہ پاے ، از کاخ و کو جدا و پریشاں بکاخ و کوے ، کردم نچشم ماہ تماشاے ایں سراے ۔ پھر کہتے ہیں کہ شاعری درد و غم لاتی ہے ۔مگر یہ درد و غم خوب ہے ۔ مجھے یہ ہر وقت کا نالہ و فریاد اچھا لگتا ہے ۔سکندر میرے عیش کو کیا جانے ۔''نوائے دلکش''جمشید کی بادشاہت سے بہتر ہے ۔

سخن درد و غم آرد ، درد و غم بہ مرا ایں نالہ ہاے دمبدم بہ

---

(۱) پیام مشرق ۔۳۵۔

سکندر را زعیش من خبر نیست
نوائے دلکشے از ملک جم بہ (۱)

اقبال فن سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ملک وملت اور ساری انسانیت کے لئے بارآور ہو۔ وہی فن بہترین ہے جو عالم انسانیت کی شیرازہ بندی کرے اور فرد وملت کے مابین رشتے کو مضبوط سے مضبوط کرے۔ شاعر پر لازم ہے کہ قوم کے دکھ درد میں آنکھ کی طرح شریک غم رہے۔ اس لئے کہ :۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اقبال اصلی اور نقلی شاعر کے درمیان فرق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ، اے بسا شاعر کہ از وسحر ہنر، رہزن قلب است وابلیس نظر، شاعر ہندی! خدایش یار باد، جان او بے لذت گفتار باد، عشق را خنیا گری آموختہ، باخلیلاں آزری آموختہ، حرف او جاویدہ و بے سوز و درد، مرُ دخوانند اہل درد او رانہ مرد، زاں نوائے خوش کہ نشناسد مقام، خوشتر آں حرفے کہ گوئی درمنام۔

''اقبال کے ذوق جمال''میں حسن وعشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی حسن کاری کے مہر و ماہ اور ستارے حسن وعشق ہی کے جذب باہم سے قائم و دائم اور درخشندہ و تابندہ ہیں۔ عشق کے مقابلے میں ان کے نزدیک علم وفلسفہ کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ اقبال کو ایسی '' حسن کاری'' بالکل پسند نہیں جو عشق وحسن کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرتی ہو۔ چنانچہ اسی لئے ہنروران ہند سے متعلق دوٹوک انداز بیان اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشہ تاریک میں قوموں کے مزار!

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

گویا کہ شاعر اور شاعری ایسی ہونی چاہئے جو ملت کو جینے کا حوصلہ عطا کرے۔ شاعر ایسا ناخدا ہے جس کا فرض قوم کی ڈوبتی، نیا کو غرقاب ہونے سے بچا کر کنارے لگانا ہے۔ شاعر کو قوم کا بیڑا غرق کرنے کی بجائے اسے پار لگانا چاہئے۔

---

(۱) پیام مشرق۔۵۵۔

شاعر تو وہ ہے جو اپنی شاعری کو اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوئے زوال پذیر اور نڈھال قوم کی رگوں میں جوش و جذبے کی ایسی لہر دوڑا دے کہ بس ، اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ ، دریا سے اٹھی لیکن ساحل نہ ٹکرائی ۔ اور

لادینی ولاطینی کس پیچ میں الجھا تو دارو ہے ضعیفوں کا لاغالب الا ھو

اقبال ایسی قوم اور اس کے شاعر پر افسوس کرتے ہیں ، جو اپنی قوم کو جینے کا سہارا نہ دیتا ہو ۔ جو اتنا منحوس ہو کہ قوم کے گل وگلزار میں آگ لگا کر خوشبوؤں کو خاکستر کر ڈالے ۔ اور نغمہ بلبل کو بھی مار ڈالے ۔ وائے قومے کز اجل گیرد برات ، شاعرش وابوسد از ذوق حیات ، خوش نماید زشت را آئینہ اش ، درجگر صد نشتر از نوشینہ اش ۔ ایسے میں تو اقبال بجا فرماتے ہیں کہ :۔

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

شاعر ، سولن کی طرح قوم اور معاشرے کو مایوسیوں کی دھند اور ناکامیوں کی دلدل سے نکال کر ولولہ انگیز امنگوں اور تابناک امیدوں سے نوازتا ہے ۔ جن میں روشن مستقبل کی نوید ہوتی ہے ۔ وہ ملت کے سینے میں دل کا کردار ادا کرتے ہوئے ، ملت کے سارے بدن کو زندہ و پائندہ رکھتا ہے ۔ چنانچہ جس طرح دل کے بعد جسم کی موت واقع ہو جاتی ہے ، یا دل اگر ناکارہ ہو جائے تو زندہ رہنا محال ہوتا ہے ۔ اسی

محفل از شمع نوا افروختم قوم را رمز حیات آموختم (۱)

طرح شاعر کے بغیر قوم زندہ نہیں رہ سکتی اور ناکارہ دل جسم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیتا ہے ۔ دل نہ ہو یا ناکارہ ہو جائے تو امنگیں اور آرزوئیں بھی مر جاتی ہیں ، دل ہی نہیں رہا جو کچھ آرزو کریں ۔ اسی طرح بیکار و ناکارہ شاعر کی موجودگی قوم کے لئے بیمار دل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ ایسی صورت حال میں قوم کی زندگی ختم ہو کر رہ جاتی ہے ۔ پھر وہ قوم نہیں بلکہ مٹی کے ایک ڈھیر کی صورت میں اجل اور جمود کا صید زبوں بن جاتی ہے ۔ اس سلسلے میں اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ، فطرت شاعر سراپا جستجوست ، خالق و پروردگار آرزوست ، شاعر اندر سینہ ملت چو دل ، ملتے بے شاعرے انبار گل ، سوز و مستی نقشبند عالمے است ، شاعری بے سوز و مستی ماتمے است ۔ اقبال کے نزدیک اعلیٰ شاعری کا منصب پیغمبرانہ ہے ۔ ورنہ

---

(۱) اسرار و رموز ۔ ۱۶۷ ۔

فسون و افسانہ ہے ۔ شاعر اندھیری رات میں جگنو کی طرح روشنی اور نور پھیلاتا ہے ۔ ظلم و ستم ، جہالت اور ناانصافیوں کی تاریکیوں کو دور کرتے ہوئے اصلاح انسانیت کے ذریعے آدمیت کو احترام آدمی سکھا کر ، اس کے مقام سے باخبر کرنا ہی پیغمبری ہے ۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں ۔

شعر را مقصود اگر آدم گری است شاعری ہم وارث پیغمبری است

ہم نے سو سو طرح سے دیکھ لیا ہے کہ اقبال ''حسن مطلق'' کے شیدائی ہیں ۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ''نظریہ جمال'' اور ''ذوق جمال'' کا فرق ظاہر کرتا ہے ـــــ ''ذوق جمال'' کے تحت تمام تر تجلیات کا سرچشمہ ''نور ازل'' ہی ہے ۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک جتنا کوئی ''حسن مطلق'' سے زیادہ لو لگائے گا اتنا ہی وہ بڑا ''حسن کار'' ہوگا۔ اس طرح اقبال کا نقطہ نظر یہ ہوا کہ ''روحانیت'' کے بغیر کوئی حسن کار عظیم اور بڑی حسن کاری نہیں پیش کر سکتا ۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ حکیموں کی قوت فکر ، کلیموں کا ذکر و نظر اور قلب کی واردات قلبی سب اللہ تعالی کے فیض سے ہے ۔ لہٰذا:۔

کف خاکے کہ دارم از در اوست گل و ریحانم از ابر تر اوست
نہ '' من '' رامی شناسم من نہ اورا ولے دانم کہ '' من '' بر اوست

بس :۔

اللہ کی دین ہے جسے دے میراث نہیں ہے بلند نامی

اقبال کے نزدیک شاعری سے شکم پروری کا کام نہیں لینا چاہیئے ۔ کیوں کہ شعر و سخن قلب و نظر کی آبیاری و دلداری کے لئے ہوتے ہیں ۔ شاعری کوئی بھیڑ بکری یا گائے بھینس نہیں کہ اسے منڈی اور مارکیٹ میں باندھ کر لے جائیں شاعری درحقیقت ، خدمت از رسم و رہ پیغمبری است ، مزد خدمت خواستن سوداگری است ، خدمت آمد مقصد علم و ہنر ، کار ہا را کس نمی سنجد بزر اور

نقد شاعر درخو ر بازار نیست ناں بسیم نسترن نتواں خرید

شاعری تو انواع و اقسام کے نرم و نازک پھولوں کی پر انوار بہار ہے ۔ جن کی اصل گلزار ہے نہ کہ بازار ۔ جبکہ :۔

بک گئے حیف جو کل شہر کے بازاروں میں
پھول پھر آ نہ سکے لوٹ کے گلزاروں میں (فقری)

اقبال کی شاعری اتنی بلند اور اعلیٰ و ارفع ہے کہ جاوید نامہ میں سیر افلاک کے دوران میں بہت سی ارواح جلیلہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں ۔ جن میں نوائے حلاج ، ٹیپو سلطان شہید ، مولانا جلال الدین رومی اور غنی کشمیری بھی شامل ہیں ۔ اسکے علاوہ ''حوارانِ خلد'' بھی اقبال کی ''حسن کاری'' پر فریفتہ ہو جاتی ہیں اور یک دو دم بانشیں ، بانشیں کی گزارش گوش گزار کرتی ہیں ۔ لیکن حرکت و عمل اور ''حسن مطلق'' کا یہ شیدائی ، بے ''جمال لایزال'' آسودہ نیست اور اختیار جادہ و ترک مقام کہتے ہوئے رواں دواں رہتا ہے ، اس لئے کہ جاوداں پیہم رواں ، ہر دم جواں ہے زندگی ۔

اقبال نے ایک بوند پانی میں سمندر بند کر دیا ہے ۔ جس میں ماضی ، حال اور مستقبل کی لہریں موجزن ہیں ۔ وہ ماضی سے رشتہ نہیں توڑتے ، حال کی ترجمانی کرتے ہیں اور مستقبل کے بارے میں ،شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے ، یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے کہہ کر حقیقی شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے ساقی سے کہتے ہیں کہ اٹھ اور پرانی شراب لا کر ، پلا کر اس خزاں زدہ بوڑھے کو نوجوان بہاراں بنا دے ۔ مجھے ایسا آتشیں نغمہ عطا کر کہ میں اپنے دم کے فیض سے ، بانسری کی لکڑی کو مشعل کی طرح روشن کر دوں ۔

بیا ساقی بیاراں کہنہ مے را جوان فرودیں کن پیر دے را
نوائے دہ کہ از فیض دم خویش چو مشعل برفروزم چوب نے را (۱)

اقبال نے اسلامی تعلیمات اور ماضی کی عظیم روایات کی بنیادوں پر اپنی ''حسن کاری'' کی فلک بوس عمارت کھڑی کی ہے ۔ ''مے کہن'' اور ''یوسف گم گشتہ'' سے اقبال کی مراد ہمیشہ مسلمانوں کا شاندار ماضی ہوتا ہے ۔ چنانچہ وہ اپنے کلام کے ذریعے انتہائی حسن کارانہ انداز میں گزرے ہوئے ، ایمان افروز ماضی کی جھلک دکھا کر کوتاہ ہمت مسلمانوں کو اپنے اسلاف کا پر جلال مقام حاصل کر لینے پر اکساتے ہیں ۔

یوسف گم گشتہ را باز کشودم نقاب تا بہ تنک مایگاں ذوق خریدن دہم (۲)
جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیں (۳)

---

(۱) ارمغان حجاز ۔ ۱۰۷ ۔ (۲) زبور عجم ۔ ۱۲۳ ۔ (۳) بانگ درا ۔ ۱۳۲ ۔

اسی طرح وہی بات بہ انداز دگر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لعل کا وہ ٹکڑا (اسلامی علوم) جو میں نے تمہارے بدخشاں سے حاصل کیا اسے میں خالی ہاتھ مشرقیوں کی نذر کر رہا ہوں۔

پارۂ لعلے کہ دارم از بدخشان شما   فکر رنگینم کند نذر تہی دستان شرق

اور اے مٹی کے بتو! میرے پاس آؤ۔ میں اپنے دل میں تمہارے بزرگوں کی آگ سنبھالے ہوئے ہوں۔ یہ آتش عشق تمہارے اندر پھونک دوں اور یوں تم ایک ہی جست سے "آب و گل" کے کھیل سے نکلتے ہوئے ردائے نیلگوں کے بھی اس طرف جا نکلو۔

آتشے در سینہ دارم از نیا گان شما!   حلقہ گردمن زنید اے پیکران آب و گل (۱)

اور وہ سوز جو سینوں سے جا چکا ہے اسے دوبارہ زندہ کرو، گیا ہوا زمانہ پھر دنیا میں واپس لاؤ۔ اے سرزمین مکہ ایک اور خالد پیدا کر۔ ایک بار پھر توحید کا گیت گا۔ تیرے صحرا کی کھجوریں اور بلند ہوں۔ کیا تیرے اندر سے کوئی اور فاروق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اے مشک فام مومنوں کی دنیا یعنی افریقہ، مجھے تیری طرف سے خوشبوے مدام آتی ہے۔ کب تک آگے بڑھنے کے ذوق کے بغیر زندگی بسر کرو گے۔ کب تک اپنی تقدیر غیروں کے ہاتھ گروی رکھو گے۔ کب تک اپنا مقام حاصل نہ کرو گے۔

میری ہڈیاں سمندر کے اندر بانسری کی طرح نالاں ہیں

مصیبت سے ڈرتے ہو؟ رسول پاکؐ کی یہ حدیث نہیں سنی کہ "مرد کے لئے روز بلا روز صفا ہے"۔

زندہ کن درسینہ آں سوزے کہ رفت   در جہاں باز آور روزے کہ رفت!
خاک بطحا خالدے دیگر بزاے   نغمہ توحید را دیگر سراے
اے نخیل دشت تو بالندہ تر   برنخیزد از تو فاروقے دگر؟
اے جہان مومنانِ مشک فام   از تو می آید مرا بوے دوام!
زندگانی تا کجا بے ذوق سیر   تا کجا تقدیر تو دردست غیر!
برمقام خود نیائی تا بکے   استخوانم در بیے نالد چونے!

(۱) زبور عجم۔۱۲۵۔

از بلا ترسی ؟ حدیث مصطفیٰ است (۱)

مرد را روز بلا روز صفاست

مصائب ہی سے پاک مردوں کا امتحان ہے، اس لئے پیاسے کو اور پیاسا کرنا جائز ہے۔ کلیم کی مانند دریائے نیل سے گزر جا، خلیل کی مانند آگ کی طرف قدم بڑھا۔ ایسا مردانہ نغمہ سنا جس سے دوست کی خوشبو آئے۔ تاکہ وہ ملت اسلامیہ کو دوست کی گلی کی طرف لے جائے۔

امتحان پاک مرداں از بلاست تشنگاں راتشنہ تر کردن رواست

درگزر مثل کلیم از رود نیل سوے آتش گامزن مثل خلیل!

نغمہ ء مردے کہ دارد بوے دوست

ملتے را می برد تاکوے دوست! (۲)

اسی سلسلے میں مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے کی خاطر اقبال مزید کہتے ہیں کہ، اس ترک ملاح نے، جس کا چہرہ ارغوانی اور آنکھیں نیلگوں تھیں۔ کیا خوب گیت گایا کہ اگر دریا کے اندر، میں کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤں، تو صرف طوفان ہی سے اس کا مداوا چاہتا ہوں۔

چہ خوش زد ترک ملاحے سرودے رخ او احمرے، چشمش کبودے

بہ دریا گر گرہ افتد بہ کارم بجز طوفاں نمی خواہم کشودے (۳)

اقبال کو احساس ہے کہ عصر حاضر ان کا ساتھ نہیں دے رہا۔ اس لئے وہ اپنی "حسن کاری" کے یوسف کو اس بازار کے لائق نہیں سمجھتے۔ بلکہ نالاں ہیں کہ مجھے ہند میں پیدا کر کے ذلیل کر دیا گیا ہے۔ از ہنرسرمایہ دارم کردہ اند، درد یار ہند خوارم کردہ اند۔ لیکن انہیں امید ہے کہ آنے والا زمانہ ان کے پیغام کو سمجھتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہوگا اس لئے کہتے ہیں۔

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم من نوائے شاعر فرداستم

عصر من دانندۂ اسرار نیست یوسف من بہر ایں باز ار نیست

اقبال کہتے ہیں جوان کسی بھی قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ وہی انقلاب اور تبدیلی کا زینہ بنتے ہیں۔ اگر نوجوان

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۹۷۔ ۹۸۔ (۲) جاوید نامہ۔ ۸۳۔ (۳) ارمغان حجاز۔ ۸۰۔

شاعر کی انقلاب انگیز اور درد انگیز باتیں سمجھ لیں تو کوئی وجہ نہیں، ہر طرح کی غلامانہ زنجیروں کی کڑیاں ٹوٹ کر بکھر نہ جائیں۔
یہی وجہ ہے کہ اقبال کی ساری امیدیں نوجوانوں سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ جوانوں کو مری اہ سحر دے کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ میں جو پیران کہن سے ناامید ہوں، میں آنے والے دور کی بات کہنا چاہتا ہوں۔وہ بات یہ ہے کہ، جوانوں کے لئے میرا کلام سمجھنا آسان کر دیجئے۔ان کے لئے میرے سخن کی گہرائیاں پایاب کر دیجئے۔

من کہ نومیدم زپیران کہن دارم از روزے کہ می آید، سخن!
برجواناں سہل کن حرف مرا بہر شاں پایاب کن ژرف مرا (۱)

پھر کہتے ہیں، میں نے رومی کی مانند حرم میں اذاں دی ہے، اسی سے میں نے روحانی اسرار سیکھے ہیں۔ پچھلے دور کے فتنے کا مقابلہ اس نے کیا۔ دور حاضر کے فتنے سے میں نبرد آزما ہوں۔

چو رومی در حرم دارم اذاں من ازو آموختم اسرار جاں من
بہ دور فتنہء عصر کہن، او بہ دور فتنہء عصر رواں، من (۲)

اقبال اپنی ''حسن کاری'' کی تمام تر رفعتوں اور بلندیوں کو آنحضور کی نظر کرم کا رہین منت سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حسن کاری پر دین اسلام یا دین فطرت کی گہری چھاپ ہے۔ چنانچہ اقبال قدم قدم پر اور ہر نفس میں کہتے ہیں کہ میرے دل کا اضطراب آپؐ کی محبت کے سوز سے ہے۔ میری شاعری آپؐ کے دم کی تاثیر سے ہے۔ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ ملک ہندوستان میں، میں نے کوئی ایسا بندہ نہیں دیکھا جو آپؐ کی عظمت کا راز داں ہو۔

تب و تابِ دل از سوز غم تست نوائے من زتاثیر دم تست
بنالم زانکہ اندر کشور ہند ندیدم بندۂ کو محرم تست (۳)

ہندوستانی غلاموں کی رات صبح سے محروم ہے۔ اس سرزمین میں سورج کا گزر نہیں۔ ہماری طرف نظر التفات فرمائیے۔ کہ مشرق میں کوئی مسلمان ہم سے زیادہ بدحال نہیں۔

شب ہندی غلاماں را سحر نیست بایں خاک آفتابے را گذر نیست
بما کن گوشہء چشمے کہ در شرق مسلمانے زما بیچارہ ترنیست! (۴)

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۱۔ (۲) ارمغان حجاز۔ ۵۶۔ (۳) ارمغان حجاز۔ ۳۱۔ (۴) ایضاً۔ ۳۱۔

اس کی آنکھ میں نور ہے نہ سرور ۔ نہ اس کے سینے میں دل بے قرار ، خدااس امت کا مددگار ہو کہ اس کی موت جان بے حضور ،یعنی عشق الٰہی سے عاری ہونے کے سبب ہے ۔

بچشم او نہ نورونے سروراست نہ دل درسینہ ء او ناصبوراست
خدا آں امتے را یار بادا کہ مرگ او ز جان بے حضور است (۱)

اقبال ملت کی زبوں حالی و بد حالی کا یہ دلدوز نقشہ کھینچنے کے بعد اپنے ہی مقرر کئے ہوئے معیار'' حسن کاری'' کے مطابق ، کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ کے مصداق ایسا آتشناک ونمناک نغمہ الاپتے ہیں ، جس سے عروق مردہ میں بھی زندگی کی گرمجوشی اور ہلچل مچا کر ممولے کو شہباز سے لڑا دیتے ہیں ۔ وہ اس کارعظیم کو سرانجام دینے کی خاطر اسلامی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے قرآن وسنت کو اپنی شاعری کا سرچشمہ بناتے ہیں ۔ چنانچہ حضورؐ کے حضور میں عرض کرتے ہیں ۔

اگر میرے دل کا آئینہ جوہر کے بغیر ہے ، اگر میرے اشعار میں قرآن پاک کے علاوہ کچھ اور پوشیدہ ہے ۔ اگر میں قرآن پاک کے علاوہ کچھ اور کہہ رہا ہوں تو آپؐ میرے فکر کے شرف کا پردہ چاک کر دیجئے ۔ اور خیابان دنیا کو میرے کانٹے سے پاک کر دیجیے ۔ زندگی کے لباس کو مجھ پر تنگ کر دیجیے اور مسلمان کو میری شاعری کے شرم سے محفوظ رکھئے ۔ میری کشت ویران کو سرسبز نہ کیجیے ۔ اسے ابر بہار سے بہرہ مند نہ فرمایئے ۔ میرے انگور کے اندر جو شراب ہے اسے خشک کر دیجیے ۔ میری کافوری شراب کے اندر زہر ڈال دیجیے ۔ مجھے قیامت کے روز خوار و رسوا کیجیے ۔یعنی اپنے بوسہ پا سے محروم رکھئے ۔
لیکن اگر میں نے اپنی شاعری میں قرآن پاک کے موتی پروئے ہیں اور اگر میں نے مسلمانوں سے حق بات کہی ہے ۔تو اے وہ ذات جس کے احسان سے ناکس کس بن جاتا ہے ۔ میرے لئے دعا فرمایئے اور یہ دعا ہی میری ساری گفتار یعنی اشعار کا اجر ہوگا ۔

گردلم آئینہء بے جوہر است دربحر فہم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں رازخارم پاک کن
تنگ کن رخت حیات اندر برم اہل ملت رانگہدا ر از شرم

---

(۱) ارمغانِ حجاز ۔ ۳۵۔

سبز کشت نا بسا مانم مکن | بہرہ گیر از ابر نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ د ر انگور من | زہر ریز اندر مئے کارفور من
روز محشر خوار و رسوا کن مرا | بے نصیب از بوسہء پاکن مرا
گر دُرِ اسرار قرآں سفتہ ام | با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
اے کہ از احسان تو ناکس کس است | یک دعایت مزد گفتارم بس است (۱)

اس میں شک نہیں کہ اقبال نے "حسن کاری" کا جو ہدف تعین کیا ہے۔ اسی کے مطابق نوا پیرا ہوئے۔ چنانچہ ان کے "آتشیں نغموں" سے عجم کے دل میں زندگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور لولی لنگڑی، درماندہ قوم کے لئے ان کی شاعری حرکت و عمل اور سبک رفتاری کا پیغام ہوتے ہوئے رحیل کارواں ثابت ہوئی۔ انہوں نے بھی عرفی کی مانند حدی کی لے کو تیز کیا۔ کیوں کہ راستہ طویل اور محمل گراں تھا۔

عجم از نغمہ ام آتش بجان است | صدائے من درائے کاروان است
حدی را تیز تر خوانم چو عرفی | کہ رہ خوابیدہ و محمل گراں است (۲)

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اقبال نے اپنی جان بے قرار سے آگ کا منہ کھول دیا۔ انہوں نے اپنی مسیحا صفت معجزاتی شاعری کے ذریعے مشرق کے مردہ سینے میں دل زندہ رکھ کر اسے دوبارہ زندگی عطا کر دی۔ بے شک سرزمین مشرق کی بنجر خاک اقبال کی "نوائے سوختہ" سے شعلہ زار و لالہ زار بن گئی۔ اس لیئے کہ اقبال مشرق کے بے جان ضمیر پر کڑکتی بجلی بن کر گرے اور اس میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ اور یہی اقبال کے نزدیک حسن کار کا فریضہ بھی ہے۔

زجان بے قرار آتش کشادم | دلے در سینہء مشرق نہادم
گل او شعلہ زار از نالہء من | چو برق اندر نہاد او فتادم (۳)

اقبال "آتش عشق" میں بجھی ہوئی شاعری کے خواہاں ہیں۔ ایسی شاعری ہی اپنے اندر "ضرب کاری" رکھتی ہے۔ اور قوم پر حالت سکر طاری نہیں ہوتے دیتی۔ اور اگر قوم پہلے سے نشے کی حالت میں بے سدھ پڑی ہے تو شاعر کی "اسرافیلی گونج" اسے بیدار کر کے بڑے بڑے طوفانوں سے ٹکرا کر اس کے بحر کی موجوں میں اضطراب پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال کہتے

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۱۶۸۔ (۲) پیام مشرق۔ ۷۲۔ (۳) پیام مشرق۔ ۷۲۔

ہیں ۔ وہی حسن کاری بہترین ہے جس میں حسن کار نے حق گوئی و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ، جابر سلطان کے سامنے کلمہء حق کہہ دیا ہو۔

پیش فرعوناں بگو حرف کلیم تا کند ضرب تو دریا را دونیم

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق یہی ازل سے رہا ہے قلندروں کا طریق

اقبال ''حسن کاری'' کے سلسلے میں ''جدت اظہار'' اور نو بنو افکار کے زبردست حامی ہیں ۔ اس ضمن میں ، مرا معنیٔ تازہٗ مدعا ست ، اگر گفتہ را باز گویم رواست کے مصداق بیان شدہ نکتے کو بھی کسی نئے مطلب کے تحت باندھا جائے تو بھی روا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی حسن کاری میں بے شمار تضمیمات بھی پیش کی ہیں ۔

یہ جدت پسندی اور اجتہاد فکر ہی ہے جس کی وجہ سے اقبال نے روایتی شاعری سے ہٹ کر ایک ایسا انقلابی و سیلابی طرز کلام اپنایا کہ دنیا ششدر رہ گئی ۔ اسی لئے تو بجا فرماتے ہیں کہ ، اوروں کا ہے پیام اور ، میرا پیام اور ہے ، عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے ۔ طائر زیر بام کے نالے تو سن چکے ہو تم ، یہ بھی سنو کہ نالہء طائر بام اور ہے ۔

اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں

دیکھ یثرب میں ہوا ناقہء لیلیٰ بیکار قیس کو آرزوئے نو سے شنا سا کر دیں (۱)

دوسرے شاعروں کا پیغام افسردہ و مایوس کن ہے ۔ ان کا حال یا تو پنجرے میں اسیر ، اس پرندے کا سا ہے ، جس کے بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ اور اب توقع نہیں رہائی کی ، یا گوشے میں قفس کے اسے آرام بہت ہے ۔ یا پھر طائر زیر دام یا زیر بام کی طرح ، مدت ہوئی کہ میری منقار زیر پر ہے ، گم سم ، افسردہ و آزردہ ، دل بردہ ، جگر خوردہ بیٹھے اپنے نصیبوں کو رو رہے ہیں ۔ جبکہ اقبال طائر بالائے بام کی صورت نغمہء مستانہ تہی از غم جاناں ، غم دوراں سے بھر پور ، صدائے غیور و جسور میں الاپ رہے ہیں ۔

اقبال اس قدر جدت پسند واقع ہوئے ہیں کہ انہیں ہر آن کوئی نہ کوئی جدت سوجھتی ہے ۔ چنانچہ اے پیر حرم ! اقبال کو کعبہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے ۔ کیوں کہ اس کی آستیں میں ، ہر لحظہ ایک نیا بت ہوتا ہے ۔ یعنی کہ اقبال پل پل میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور لاتا ہے ۔

---

(۱) بانگ درا ۱۳۲۔

ز: مدہ درکعبہ اے پیر حرم اقبال را ہر زماں درآستیں دارد خداوندے دگر (۱)

بلکہ اپنی کتاب تشکیل جدید میں اقبال کہتے ہیں کہ اسلام بذات خود اجتہاد فکر و نظر کا نام ہے۔ جس کے تحت ایک نئے معاشرے کا قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

''تہذیب و ثقافت کی نظر سے دیکھا جائے تو بحیثیت ایک تحریک اسلام نے دنیائے قدیم کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا کہ کائنات ایک ساکن و جامد وجود ہے۔ برعکس اس کے وہ اسے متحرک قرار دیتا ہے۔ بعینہ جہاں تک بطور ایک نظامِ اجتماع جذبات سے کام لینے کا تعلق ہے، اس نے رنگ اور خون کے رشتے ٹھکرا دیئے۔ اور اپنی توجہ فرد کی صرف ذاتی قدر و قیمت پر رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ اتحاد انسانی کے لئے کسی خالص نفسیاتی اساس کی جستجو جب ہی کامیاب ہوسکتی ہے، جب اس حقیقت کا ادارک ہو جائے کہ نوع انسانی ایک ہے اور اس کی زندگی کا مبدا اصلاً روحانی۔'' (۲)

جدت طرازی اور ندرت کے بغیر شاعری انقلابی نہیں ہوسکتی۔ گویا کہ جدت انقلاب و تبدیلی ہی کا دوسرا نام ہے۔ جس کا ثبوت قدم قدم پر کلام اقبال میں ملتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا کہ زمین و آسمان زیر و زبر ہو رہے ہیں۔ طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم، ایں چہ حیرت خانہ ء امروز و فرد اساختی کے مصداق اقبال خالق کائنات کو بھی ایسی جدت و تبدیلی اور انقلاب کی ترغیب دیتے ہوئے کسی نئی دنیا کی تخلیق کا مشورہ دیتے ہیں، جس میں ایک ہی پرانی ڈگر پر چلنے والے شب و روز نہ ہوں۔ بلکہ کوئی نیا اور نوکھا نظام حیات ہو۔

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں نفس سوختہ ء شام و سحر تازہ کریں (۳)

اقبال سورج کے لئے کسی نئے رخت سفر کی فکر میں ہیں۔ ایسا رخت سفر جو آفتاب کی پرانی اور بوڑھی رگوں میں شباب و انقلاب آفریں خون پیدا کر دے۔ جس کے نتیجے میں جواں دن اور جواں راتیں معرض وجود میں آئیں ــــــ قیامت سے بڑا انقلاب، جدت اور تبدیلی تو اور کوئی نہیں۔ روز محشر ہی سے اقبال کی، طرح نوافگن والی آرزو بھی پوری ہوگی۔ مردے بھی جی اٹھیں گے۔ ہر طرف زندگی و تابندگی کی چہل پہل ہوگی۔ موت کا نام ونشان تک نہ ہوگا۔ ہجر و فراق نہ ہوگا ہر طرف وصال ہی وصال ہوگا۔ امیدوار ''وعدہ دیدار'' بھی جی اٹھیں گے کہ سچ مچ قیامت آچکی ہوگی۔ لیکن اقبال وہ انقلابی اور جدت طراز ہے کہ قیامت جیسے انقلاب میں بھی اس کی ندرت پسندی اور کوشش و جدوجہد تبدیلی در تبدیلی کے

---

(۱) پیام مشرق۔ ۱۳۶۔ (۲) تشکیل جدید الہیات اسلامیہ۔ ۲۲۳۔ مترجم سید نذیر نیازی۔ (۳) بال جبریل۔ ''۱''۔

درپے رہے گی ۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا   یا اپنا گریباں چاک ، یا دامن یزداں چاک   (۱)

گویا کہ اقبال روزِ محشر بھی حرکت وعمل اور انقلاب کا پیغام دیتے ہیں ۔اس لئے کہ اقبال کے نزدیک اجتہادِ فکر ونظر اور جدت و انقلاب میں قوموں کی تعمیر و ترقی اور زندگی کا راز پوشیدہ ہے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' لکھ کر'' اجتہاد'' کا عملی ثبوت پیش کیا ۔مگر اقبال کہتے ہیں کہ اجتہادِ فکر ونظر ترقی پذیر اقوام کے لئے بہتر ہوتا ہے ۔ زوال پذیر قومِ'' اجتہاد'' کی متحمل نہیں ہوسکتی ۔ایسے میں اقبال اپنے اسلاف کی پیروی کرنے کا مشورہ دیتے ہیں ۔ اس لئے کہ''انحطاط''کے زمانے میں''اجتہاد''سے قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے ۔کوتاہ نظر عالموں کے اجتہاد سے تقلید اسلاف زیادہ محفوظ ہے ۔

نقش بردل معنیء توحید کن   چارۂ کار خود از تقلید کن

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط   قوم رابرہم ہمی پیچد بساط

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر   اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر   (۲)

یعنی کہ:۔

رخت جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا   سب کو محورخ .سعدیٰ و سلیمٰی کر دیں

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز   جگر شیشہ و پیانہ و میناکر دیں   (۳)

اسی سلسلے میں سمیع اللہ قریشی صاحب رقم کرتے ہیں کہ:۔

'' اسلامی ثقافت کو ایک زندہ اور متحرک ثقافت تسلیم کرنے کے باعث ، انہوں نے فرد کی ذات اور معاشرے کی ہیت میں الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید کرتے ہوئے نمو اور تخلیق کی شمع کو اپنے افکار تازہ کا زیتون عطا کیا''۔   (۴)

اس میں شک نہیں کہ اقبال کے ہاں ہر طرح کا مثبت اجتہادِ فکر ونظر دیکھنے میں آتا ہے ۔اس ضمن میں ان کا سارا ذہنی ارتقاء بذات خود اجتہاد کی زندہ مثال ہے ۔ ورنہ وہ ساری عمر خاک وطن کے ہر ذرہ ہی کو دیوتا سمجھتے رہتے ۔ اجتہادی نقطہ نظر ہی سے وہ افلاطون کے''نظریہ اعیان''کو اقوام عالم کے لئے مسموم قرار دیتے ہیں ارسطو کے جمود اور مادے کے مردہ ڈھیر سے اتفاق

---

(۱) بالِ جبریل ۔۴۲۔ (۲) اسرار و رموز ۔۱۲۵۔ (۳) بانگِ درا ۔۱۳۲۔'' عبدالقادر کے نام'' (۴) افکار اقبال ۔۷۔از سمیع اللہ قریشی ۔

نہیں کرتے اور تجزیاتی و تصوراتی فلسفیوں کے چکر میں بھی نہیں آتے ۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر اقبال خرد کی گتھیاں سلجھانے کے بعد صاحب جنوں بنتے ہیں تو یہ بھی جدت و اجتہادِ عمل ہی کی بناء پر ہے ، ورنہ آخر دم تک درس حکیمان فرنگ سے افزدوگیءِ خرد میں لگے رہتے ۔ واقعی چلنے والے نکل گئے ہیں ، جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں ۔

انقلابی اور جدت پسند ہونے کی بناء پر اقبال تقلید کے سخت خلاف ہیں ۔ اس لئے کہ تقلید انسان کو ذہنی و جسمانی غلامی کی طرف راغب کرتی ہے ۔ بلکہ تقلید ہے ہی کار غلاماں ۔ مردان حر کبھی کسی کی تقلید نہیں کرتے ان کے اپنے بال و پر ہوتے ہیں اور وہ ان سے پرواز کر سکتے ہیں ۔ دوسروں کے پروں سے اڑنا محال ہے ۔ اگر دوسروں کے پروں پر تکیہ کیا تو ساری عمر شاہبازی کی بجائے خاکبازی ہی کرنا پڑے گی ۔

اقبال کے نظام فکر میں تقلید کمزوری ، مجبوری و لاچاری اور محکومی و ضعیفی کا دوسرا نام ہے ۔ اپنے آپ کو ضعیفی و محکومی سے بچانا چاہیئے ۔ اس لئے کہ ، ہر جرم کی سزا ہوتی ہے ۔ اور پھر ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ۔ حاکم زبر ہے اور محکوم زیر ۔ حاکمی بلندی اور محکومی پستی ہے ۔ چنانچہ حاکم سر افلاک گھومتا ہے اور محکوم کیڑے مکوڑوں کی طرح خاک میں لوٹتا رہتا ہے ۔ اس کی امیدیں اور آرزوئیں آہوں و سسکیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور حسرتوں و ناکامیوں میں لت پت رہتا ہے ۔ آج کل ہمارا یہی حال ہے ۔ پہلے ہم ایسٹ انڈیا کمپنی اور آج کل ، آئی ۔ ایم ۔ ایف و امریکہ کے غلام ہو کر ذلت و خواری کی زندگی گزار رہے ہیں ۔ مغلوب وہی ہوتا ہے جو بالکل بے جان ہو جائے ۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ خاک مزار سے میرے کان میں یہ آواز آئی کہ قبر میں بھی زندہ رہا جا سکتا ہے ۔ لیکن وہ شخص جو دوسروں کی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اس کے اندر

سانس ہے مگر جان نہیں ۔

بگوشم آمد از خاکِ مزارے ۔۔۔ کہ در زیر زمیں ہم تواں زیست
نفس دارد و لیکن جاں ندارد ۔۔۔ کسے کو بر مراد دیگراں زیست (۱)

اقبال کہتے ہیں ، کہ بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ ، بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ ۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی ۔ ٹھیک ہے ، نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی ، یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی مینا کاری ہے ۔ تقلید اگر کوئی اچھی

---

(۱) پیام مشرق ۔ ۷۶ ۔

چیز ہوتی تو حضورؐ اپنے آباواجداد کے رستے پر چلتے رہتے ۔ چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے ، زبند پاستاں آزاد رفتے ، اگر تقلید بودے شیوۂ خوب ، پیغمبرؐ ہم رہ اجداد رفتے ۔ آپؐ نے تو حضرت ابوطالب سے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ ،'' چچا جان اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیں تو بھی میں ان کے راستے پر چلنے کو تیار نہیں'' ۔ اور'' لکم دینکم ولی دین ''۔

اقبال کہتے ہیں ۔تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی اور خودکشی سے بچنے کے لئے خود انحصاری اور خودمختاری بہت لازم ہے ۔ اور اس کے بغیر کوئی قوم جدت طراز نہیں ہوسکتی اور جب جدت طراز نہیں ہوسکتی تو پھر تقلید کے طوق سے بھی نہیں بچ سکتی ۔ جو کہ رفتہ رفتہ طوق غلامی میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ اور اقبال کے مطابق ہم پر شروع ہی سے مغربی افکار اور تہذیب و تمدن کی یلغار رہی ہے اور تو اور ہمارے فنون لطیفہ اور شاعری وحسن کاری کو بھی یورپی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں پابہ جولاں کیا جاتا ہے ۔ ایک خاص سازش کے تحت یہ جھانسا دیا جاتا ہے کہ یورپ مادر پدر آزاد جدت پسندی کی بناء پر ترقی یافتہ ہے ۔ فرنگ کی خوش حالی وخوش بختی دختران بے حجاب کی وجہ سے ہے ۔ وہ لاطینی رسم الخط میں لکھتے ہیں ، انگریزی زبان ان کی ترقی کا پہلا زینہ ہے ۔ ترکوں کو ایک ایسی ہی سازش کے نتیجے میں ان کے حصے بخرے کرنے کے بعد ترکی زبان کو خط لاطینی میں تبدیل کرکے ترک قوم کو اپنی جڑوں سے جدا کر دیا گیا ۔ عربی ، ترکی ، فارسی اور اردو ایک لحاظ سے ایک ہی زبان ہے ۔ بس مختلف شاخوں کا فرق ہے ۔ آج ہم اردودان پرانے رسم الخط والی '' ترکی'' پڑھ سکتے ہیں ، مگر خود ترک قوم نہیں پڑھ سکتی ۔ اس لئے کہ نئی نسل نے ترکی زبان کو کوٹ پتلون ہی میں دیکھا ہے ۔ ۱۹۹۴ء میں '' قونیہ'' میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار پر '' سلجوق یونیورسٹی'' کے نوجوان لیکچرار ، یوسف کو جب راقم نے پہلی ہی نظر میں پرانی ترکی پڑھ کر سنائی تو وہ بڑا متعجب ہوا ، اور اتنا جذباتی ہوگیا کہ یورپ اور مصطفیٰ کمال پاشا کو ، کوسنے لگا ۔ حالانکہ میں نے اس سے قبل کبھی ترکی زبان پڑھی نہیں تھی ، مگر عربی رسم الخط کی وجہ سے ،کوئی مسئلہ نہ تھا ۔

آج ہم ترکی لفظ '' دادا'' بڑی آسانی سے بولتے اور پڑھتے ہیں ، ہماری علاقائی زبانوں میں بھی مستعمل ہے ۔ لیکن خودترک عربی رسم الخط میں لکھا ہوا '' داد'' نہیں پڑھ سکتے ۔ ان کے لئے '' DEDA'' لکھنا ہوگا ۔ اسی طرح پنجابی اور ہندکو میں مستعمل '' میت'' ترکی کی مساجد پر'' MASEET'' لکھا ہوا دیکھا ہے ۔ پشتو اور فارسی کا '' مار'' وہی ، مارآستیں ترکی

زبان کا لفظ ہے ، مگر ہمارے رسم الخط میں ترک نہیں پڑھ سکتے ۔ اس لئے کہ ان کی '' بہن '' اب '' Bayan '' ہوگئی ہے ۔ ترکوں نے رسم الخط بھی تبدیل کیا ، خواتین کو سکرٹ پہنا کر ، گرل فرینڈ بنا کر بازاروں میں تھام تھام کر گھمایا پھرایا ، ایک پاکستانی بچہ یہ مناظر دیکھ دیکھ کر اپنے باپ سے پوچھنے لگا ، ''ابو یہاں کی ساری لڑکیاں بیمار کیوں ہیں ؟ لوگ انہیں سہارا دے کر لے جا رہے ہیں'' ___ عورتوں کو ایک ایک فٹ لمبے سگریٹ پلائے ، شراب و کباب اور رقص و سرود کی محفلیں سجائیں ، بحیرۂ روم پر اناطالیہ و ازمیر کے ساحل آباد کئے ، مگر پھر بھی کوئی ترقی نہ کر سکے ۔ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا ، دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا ۔

سجلوق یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی ۔ ہر وقت ہمارے ساتھ رہتے اور گپ شپ میں وقت گزرتا ۔ ایک رات عشائیے میں کھانے کی میز پر ، ایک سوال کے جواب میں وائس چانسلر صاحب نے کہا عربی تو بدیسی زبان ہے اس لئے ہم نے ، عربی رسم الخط کی بجائے انگریزی رسم الخط میں لکھنا شروع کر دیا ہے ۔ اس پر ارباب آفریدی نے کہا ، '' انگریزی بھی تو بدیسی زبان ہے '' ۔ یہ سن کر ترک وائس چانسلر صاحب خاموش رہے ۔ مگر دل ہی دل میں ایسے ناراض ہوئے کہ اگلے ہی روز ہم سے رہائش کا کرایہ ادا کرنے کو کہلوا بھیجا ۔

خیر مطلب یہ کہ ، پاکستان میں بھی ترکی کی طرح اردو کو کوٹ پتلون پہنانے کی ایک خاموش تحریک بڑے زوروں پر ہے ۔ خاص خاص نجی محفلوں میں اس عزم صمیم کا اظہار کرتے رہتے ہیں ۔ اور پاکستان ٹیلی ویژن پر ڈراموں کے نام اردو میں لکھ کر انگریزی رسم الخط میں بھی لکھے دیئے جاتے ہیں ۔ فی الحال تو یہ حرکت غیر محسوس انداز میں بے ضرری لگتی ہے ، لیکن اس میں شک نہیں کہ ، رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن ۔ ہمارے میر جعفروں اور میر صادقوں نے بھی تو آئی ۔ ایم ۔ ایف سے خوب دل کھول کر شراب پی ہے ۔

اقبال نے ہر قسم کی تقلیدی روش کا ایسا خوبصورت انداز میں جائزہ لیا ہے ۔ کہ بے دریغ داد دینے اور اس پر عمل پیرا ہونے کو بھی جی چاہتا ہے ۔ ان کی بات دل سے نکلی ہے اور دل پر اثر رکھتی ہے ۔ جس کے نتیجے میں تعمیر و ترقی سے متعلق ہمارے ذہن میں اندھی تقلید سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں ۔

شرق از خود برد تقلید غرب باید ایں اقوام را تنقید غرب

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب　　نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب!
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست　　نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست!
محکمی اورانہ از لادینی است　　نے فروغش از خط لاطینی است!
قوت افرنگ از علم و فن است　　از ہمیں آتش چراغش روشن است!
علم و فن را اے جوان شوخ و شنگ　　مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ!
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست　　ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست!
ترک از خود رفتہ و مستِ فرنگ　　زہرِ نوشیں خوردہ از دستِ فرنگ!
زانکہ تریاقِ عراق ازدست داد　　من چہ گویم جز خدایش یار باد
بندۂ افرنگ از ذوقِ نمود　　می برد از غربیاں رقص و سرود!
نقدِ جانِ خویش در بازد بہ لہو　　علم دشوار است می سازد بہ لہو!
از تن آسانی بگیرد سہل را　　فطرت او در پذیرد سہل را!
سہل را جستن دریں دیرِ کہن
ایں دلیلِ آں کہ جاں رفت از بدن!　　(۱)

اقبال کہتے ہیں کہ جسمانی رقص کی اچھل کود یورپ کے لئے سلامت رہے۔ ہمیں تقلید فرنگ میں بدنی رقص نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ہمیں روحانی رقص زیب دیتا ہے اور اسی میں ہمارا دنیا و آخرت کا فائدہ مضمر ہے۔ روحانی رقص میں ضرب کلیم اللہ ہے۔ جس میں سے ہماری مشکلات حل ہوسکتی ہیں۔ اور ہمارے لئے ہزار چشمے پھوٹ سکتے ہیں۔

چھوڑ یورپ کے لئے رقص بدن کے خم و پیچ　　روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللہی!
صلہ اس رقص کا ہے تشنگئی کام و دہن　　صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی!　　(۲)

اور:۔

سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترک عثمانی　　سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعر غریب!

---

(۱) جاوید نامہ۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔
(۲) ضرب کلیم۔ ۱۳۴

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب! (۱)

وہ اقبال جو ہر وقت فرد و ملت کے مستقبل کی خاطر پریشاں و سرگرداں رہتے ہیں۔اغیار کی پیروی کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک خدا نہ کرے کوئی اتنا بے جوہر ہو جائے کہ غلام طغرل و سنجر ہو کر زندگی بسر کرے۔ چنانچہ جب وہ یہ ہیبت ناک منظر دیکھتے ہیں کہ بے جوھر ہونے کی بناء پر ملت غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے تو اسے رہائی دلانے کی خاطر عام روش سے ہٹ کر جدت و ندرت کے ساتھ قوت عشق کو بروئے کار لاتے ہوئے زور آزمائی کرتے ہیں۔ اغیار کا مقلد بننے کی بجائے، امت کے بزرگوں کے اقوال زریں کو جراءت رندانہ سے بیان کر دیتے ہیں۔ کہ یہی تقاضائے عشق ہے۔

نہ از ساقی نہ از پیانہ گفتم حدیث عشق بیباکانہ گفتم

شنیدم آنچہ از پاکان امت ترا باشوخی رندانہ گفتم (۲)

یہاں نکتے کی بات یہ ہے کہ اقبال ہر قسم کی پیروی کے مخالف نہیں۔ اس لئے کہ اس طرح انسان شتر بے مہار بن جاتا ہے۔ صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے بزرگوں اور قرآن و سنت کی پیروی کرے۔ ورنہ بھٹکتا پھرے گا۔ گویا کہ غیروں کی تقلید سے ممانعت ہے۔ اس لئے کہ غیروں کی تقلید زحمت جبکہ اپنوں کی تقلید رحمت ہوتی ہے۔ غیروں کی تقلید سے کمزوری وضعف اور اپنوں کی تقلید سے انسان کے دل میں قوت عشق پیدا ہوتی ہے۔ جو حوصلے، جراءت، حرکت و عمل، آرزو اور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرتی ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:۔

عشق کی شراب سے کئی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں، تقلید بھی عشق ہی کا ایک نام ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ، جو عشق و محبت میں کامل تھے۔ وہ ''تقلید'' میں بھی بے مثال تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس بناء پر خربوزہ کھانے سے اجتناب کیا کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ حضور اکرمؐ نے اسے کس طرح کھایا۔

اگر تو عاشق ہے تو محبوب کی تقلید سے اپنے عشق کو محکم کر۔ تاکہ تو اللہ تعالیٰ کو اپنی محبت کی کمند میں لا سکے۔تھوڑی دیر کے لئے اپنے دل کے غار حرا میں خلوت اختیار کر۔ اپنے آپ کو چھوڑ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کر۔ پھر اللہ تعالیٰ کی محبت سے محکم ہو کر اپنی طرف واپس آ۔ اور ہوس کے بتوں ____ لات وعزیٰ۔ کا سر توڑ دے۔

---

(۱) بال جبریل۔۷۹۔

(۲) ارمغان حجاز۔۱۰۴۔

قوت عشق سے لشکر تیار کر اور عشق کے فاران کی چوٹی پر جلوہ گر ہو۔ تا کہ رب کعبہ تجھے اپنی تجلی سے نواز دے اور خلافت الٰہی کے بلند مرتبے پر فائز کرے۔

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق   ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
کامل بسطامؒ در تقلید فرد   اجتناب از خوردن خربوزہ کرد
عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار   تا کمند تو شود یزداں شکار
اند کے اندر حرائے دل نشیں   ترک خود کن سوے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوے خود گامزن   لات و عزاے ہوس را سر شکن!
لشکرے پیدا کن از سلطان عشق   جلوہ گر شو برسر فاران عشق
تا خداے کعبہ بنوازد ترا   (۱)
شرح انی جاعل سازد ترا

اپنوں کی تقلید سے انسان کس طرح ان مٹ ہو جاتا ہے اور غیروں کی پیروی سے کس طرح نیست و نابود ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کہتے ہیں کہ میرے اندر سے اٹھتے ہوئے شرارے، یعنی عشق کو لے لے۔۔ میں رومیؒ کی مانند گرم خون ہوں۔ اگر مجھ سے کچھ نہیں لیتا تو پھر تہذیب نو کی آتش لے لے، اس سے اپنا ظاہر چمکا اور اندر سے مر جا۔

شرارے جستہ ، گیر از درونم   کہ من مانند رومیؒ گرم خونم
وگر نہ آتش از تہذیب نو گیر   برون خود بیفروز اندروں میر! (۲)

علاوہ ازیں ''فوق الفطرت'' بھی اقبال کی '' حسن کاری'' کا ایک اہم عنصر ہے۔ جس کے تحت اقبال فطرت جیسی زبردست اور شہ زور قوت پر بھی انسان اور اس کی حسن کاری کو فوقیت دیتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ افلاطونی تصوریت کے نتیجے میں ''فطریت'' معرضِ وجود میں آئی تھی۔ اقبال اسی فطریت کے ردِعمل میں افلاطون اور جان رسکن کے برعکس تسخیر کائنات کرتے ہوئے ہر ایک چیز پر کمند ڈالنے کے بارے میں متفکر رہتے ہیں۔ اور انسان کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ وہ نائب حق اور مردِ فقیر ہوتے ہوئے ساری کائنات اور مظاہر کا راکب ہے۔

---

(۱) اسرار و رموز۔ ۲۱۔۲۲۔   (۲) زبور عجم۔ ۱۷۵۔

چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ، تو تلوار ہے اپنے نیام سے باہر آ، باہر آ، اپنے نیام سے باہر آ۔ اپنی ممکنات سے پردہ ہٹا۔ چاند سورج اور ستاروں کو مسخر کر۔ اپنی رات کو نور یقین سے روشن کر۔ اپنی آستین سے ید بیضا باہر نکال۔ جس نے دل پر اپنی نظر رکھی، اسی نے شرر بویا اور ستارہ حاصل کیا۔

تو شمشیری ز کام خود بروں آ　　بروں آ از نیام خود بروں آ
نقاب از ممکنات خویش بر گیر　　مہ و خورشید و انجم را بہ برگیر
شب خود روشن از نور یقین کن　　ید بیضا بروں از آستیں کن
کسے کو دیدہ بر دل کشود است　　شرارے کشت و پروینے درود است　　(۱)

اقبال کے نزدیک سچے اور کھرے ''حسن کار'' کی ''حسن کاری'' فطرت کے سونے پر سہاگے کا کام کرتے ہوئے اس میں مزید نکھار کے ذریعے اسے تابدار بنا دیتی ہے، چنانچہ آں ہنر مندے کہ بر فطرت فزود، راز خود را برنگاہ ما کشود، چیں ربایہ از بساط روزگار، ہر نگار از دست او گیرد عیار، حور او از حور جنت خوشتر است، منکر لات و مناتش کا فراست اور آفریند کائنات دیگرے، قلب را بخشد حیات دیگرے۔ پھر کہتے ہیں، جس نے اشیائے کائنات کی تسخیر کی اس نے بجلی و حرارت کو اپنی سواری بنایا۔ ایسا شہسوار وحسن کار، حروف کو پرندوں کی سی پرواز عطا کرتا ہے اور ساز سے بغیر مضراب کے نغمے پیدا کرتا ہے۔

آنکہ بر اشیا کمند انداخت است　　مرکب از برق و حرارت ساخت است
حرف چوں طائر بہ پرواز آورد　　نغمہ را بے زخمہ از ساز آورد　　(۲)
ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے از ذرۂ تعمیر کرد　　(۳)

اقبال کہتے ہیں کہ آزاد مردوں کے فنون میں شان جلالی و جمالی پائی جاتی ہے۔ مسجد قرطبہ، تاج محل اور مسجد قوت الاسلام کی روشن مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ غلاموں کے فنون بھی اپنے ''حسن کاروں'' کی طرح دبے دبے اور بے رونق سے ہوتے ہیں۔ جن سے حسرت و یاس اور مایوسی و نامرادی ٹپکتی ہے۔ ایسے فنون خواہ وہ موسیقی ہو، مصوری، فن تعمیر یا شعر و

---

(۱) زبور عجم۔ ۱۷۵۔　　(۲) اسرار خودی۔ ۱۶۴۔　　(۳) رموز بیخودی۔ ۱۴۱۔

سخن، موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں، زندگی سے ہنران برہموں کا بیزار، کی زندہ مثالیں ہوتی ہیں۔

اقبال کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ غلام اپنے آپ سے دور اور حکمرانوں کے نزدیک ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کی خودی مرچکی ہوتی ہے۔ نتیجتاً غلاموں کے فنون بھی اپنے حسن کاروں کی طرح خودی سے عاری ہوتے ہوئے رسوا کن اور ہلاکت خیز ہو جاتے ہیں۔ جب کہ اقبال اسی ''حسن کاری'' کے حق میں ہیں، جو خودی کی حفاظت کرتے ہوئے سرچشمہ زندگی اور تعویز خودی ہو۔ ورنہ

ع وائے صورت گری و شاعری و سرود

''حسن کاری''میں افادی پہلو ہمیشہ اقبال کے پیش نظر رہا ہے۔ اس لئے کہ جب وہ ہندوستانی غلاموں کو خاک و خون میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح لوٹتا دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں ایک درد انگیز ٹیس اٹھتی ہے۔ جو پھیلتے پھیلتے ساری دنیا کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اور، درغم دیگر بسوز و دیگراں راہم بسوز، گفتمت روشن حدیثے، گوتوانی داد گوش، کہہ گئے ہیں شاعری جز ویست از پیغمبری، زندہ کردے دل کو سوز جوھر گفتار سے۔

وہ ساری دنیا کے مظلوموں کا دکھ درد اپنے دل پر لیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک شاعری جزو پیغمبری ہے۔ وہ ایسی شاعری چاہتے اور کرتے ہیں کہ جو سوز جوہر گفتار سے مردہ دلوں کو زندہ کر دینے کا یارا رکھنے کے ساتھ ساتھ شمشیر خودی کے لئے سان بن کر اسے خوب تیز کر دے۔ جس شاعر کی شاعری معاشرے اور قوم میں مایوسی و افسردگی کے ذریعے بزدلی اور سستی و کاہلی پھیلائے اقبال ایسے،'' مرغ سحر خیز شاعر'' کو خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اپنے کلام میں وہ کیمیائی تاثر، جذبہ بلند اور حیات جاوداں کی روئیدگی پائی جاتی ہے کہ، بیا از من بگیر آں دیر سالہ، کہ بخشد روح با خاک پیالہ، اگر آتش دہی از سینہ من، قد آدم بروید شاخ لالہ۔

اقبال نے حرکت وعمل اور جہد مسلسل کا وہ راگ الاپا کہ زجاج کو پتھر اور کبوتر کو عقاب سے لڑا دیا۔ اقبال قوت عشق سے مالا مال اور ''صاحب جلال و جمال'' ہیں۔ چنانچہ جب وہ معجزاتی طور پر، کتوبر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا کر دیتے ہیں، تو دیکھنے والے بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ، یہ کافر ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز۔

بہر حال حالات کچھ ایسے ہیں کہ اقبال حضورؐ کے حضور میں یوں ملتمس ہوتے ہیں، کبھی میں گرتا ہوں اور کبھی پھر

مستانہ وار اٹھ کھڑا ہوتا ہوں ۔شمشیر و تیغ کے بغیر میں کیا خوب لڑائی لڑ رہا ہوں ، اپنے بام سے مجھے نگاہ التفات سے نوازیئے۔ کیوں کہ میں دور حاضر سے نبرد آزماں ہوں ۔

گہے افتم گہے مستانہ خیزم چہ خوں بے تیغ و شمشیر ے بریزم
نگاہِ التفاتے بر سر بام کہ من باعصر خویش اندر ستیزم (۱)

بے شک اقبال موج کی مانند اپنے سمندر سے اٹھے اور موتی کی مانند اپنی نشوونما پر متوجہ رہے ۔نمرود اقبال سے اس لئے ناراض ہے کہ وہ ''تعمیر حرم'' میں کوشاں رہے ۔

چو موج از بحر خود بالیدہ ام من بخود مثل گہر پیچیدہ ام من
ازاں نمرود بامن سرگراں است بہ تعمیر حرم کوشیدہ ام من (۲)

حاصل کلام یہ ہے کہ میکدۂ اقبال میں جمشید کی طرح کوئی مادی شراب نہیں ، بلکہ شراب عشق و معرفت ہے ۔یعنی کہ ان کی شاعری روایتی ورسی نہیں بلکہ انہوں نے جام عجم میں اپنا خون جگر نچوڑ دیا ہے ۔

شراب میکدۂ من نہ یاد گار جم است (۳)
فشردۂ جگر من بشیشہ عجم است

''حسن کاری'' سے متعلق علامہ محمد اقبال نے افغانستان میں کی گئی ایک تقریر کے دوران میں اپنا نقطہ نظر کھل کر بیان کیا تھا ۔ چنانچہ کہتے ہیں :۔'' میرا یہ عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا مصوری یا موسیقی اور یا معماری جو بھی ہو ، ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے ۔ اور اسی بناء پر چاہیے کہ میں آرٹ کو ایجاد کہوں نہ کہ تفریح ۔شاعر ایک قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد یا برباد کرسکتا ہے ۔ اس وقت جب کہ حکومت کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانے میں افغانستان کی تاریخ نئی زندگی کے میدان میں داخل ہوتو اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ اخلاف نوجوانوں کے لئے سچے رہنماء بنیں ۔ زندگی کی عظمت و بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا چڑھا کر نہ دکھائیں ۔ کیوں کہ آرٹ جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا کر دکھاتا ہے تو اس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ محض ایک پیغام موت ہے ۔میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ ایک مرکزی نقطے کی طرف مبذول کراؤں ۔ حیات نبی صلعم کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے

---

(۱) ارمغان حجاز ۔۴۲۔ (۲) ارمغان حجاز ۔۶۵۔ (۳) زبور عجم ۔۸۸۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کے حضور میں امراء القیس کے، جو عرب شاعر ہے، کچھ اشعار پڑھے گئے، ارشاد ہوا:۔

الشعر الشعراء وقائدھم الی النار

تمام شاعروں میں بہتر شاعر اور ان کو دوزخ کی طرف لے جانے والا۔

اس ارشاد سراسر رشاد سے واضح طور پر روشن ہوتا ہے کہ شعر کا کمال بعض اوقات لوگوں پر برا اثر ڈالتا ہے۔ ایک قوم کی زندگی کی موتوف علیہ چیزیں محض شکل صورت نہیں، بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، وہ ''وہ تخیل '' ہے۔ جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند جذبات ہیں جن کو وہ اپنی قوم کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اہل سیاست کی پامردی سے نشوونما پا کر مر جاتی ہیں۔ پس یہ خواہش ہے کہ افغانستان کے نوجوان شعراء و انشاپرداز ہمعصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ رفتہ رفتہ اخیر میں اپنے آپ کو پہچان سکیں۔ جو قوم ترقی کے راستے پر چل رہی ہے اس کی ''افادیت'' خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاج کے ساتھ اٹھایا جائے۔ پس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوان نسلوں کی فکروں کو ادبیات کے ذریعے متشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی صحت بخشے کہ وہ بالآخر اپنی انانیت کو پا کر اور قابلیت بہم پہنچا کر پکار اٹھیں:۔

دو دستہ تیغم و گردوں برہنہ ساخت مرا   فساں کشید و بروے زمانہ آخت مرا
من آں جہان خیالم کہ فطرت ازلی   جہان بلبل و گل را شکست و ساخت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائر حرم   تواں نہ گرمئ آواز من شناخت مرا '' (۱)

اس میں شک نہیں کہ بڑا شاعر پانسہ پلٹتے ہوئے قوم کی سوچ کا دھارا بدل دیتا ہے۔ شاعر کے بغیر قوم انبار گل ہے۔ اور اگر اس انبار گل میں شاعر کی صورت میں کوئی دل پیدا ہو جائے تو یہی انبار گل قوم بن جاتی ہے۔ شاعر کی اس سے بڑی دستگیری اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ مٹی کے ڈھیر سے قوم بنا دے۔ یہی آتش نمرود کو گل و گلزار بنانا اور مسیحائی ہے۔ ایسے مسیحا کی دستگیری ہر وقت راہنما و رہبر ثابت ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنی دستگیری کا جو نقش ہمارے دلوں میں بٹھایا ہے۔ اس کی بدولت ہم ہر وقت اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہم ہر وقت کی علمی و ادبی اور مباحثی مدد اقبال سے لیتے ہیں۔ ہمیں اپنے

(۱) مضامین اقبال۔۲۰۱۔۲۰۳۔ از تصدق حسین حیدرآباد دکن۔ یہ تینوں اشعار زبور عجم حصہ دوم کی غزل نمبر ۵۴ ص۔۱۲۲ سے ہیں۔

تمام تر سوالات و مسائل کا حل اقبال کی ''حسن کاری'' میں ملتا ہے ۔ یہ اور بات کہ ہم اقبال کے کہے پر عمل پیرا نہیں ہوتے ۔شعر کی تعریف کرتے ہوئے ابن رشیق نے کہا تھا:۔

واذا قیل اطمع الناس طراً　　　واذا ریم اعجزا لمعجزینا

لیکن اقبال کی ''حسن کاری'' میں نہ جانے کتنے افلاک اور نظام شمسی سمائے ہونے کی بناء پر ،ایسی جمالی و جلالی شان اور دبدبہ محسوس ہوتا ہے کہ ، اب تک کوئی ماں کا لعل یہ سوچ نہیں سکتا کہ میں بھی ایسا شعر کہہ سکتا ہوں۔ اس کی معجز بیانی کا عاجز آنا تو بعد کی بات ہے ۔ راقم الحروف نے اس مقام پر ،اقبال کے بارے میں ذاتی طور سے جو کچھ محسوس کیا ہے نظم کی صورت میں پیش خدمت ہے ۔

تیرے افکار جو لاثانی ہیں
جتنے اشعار ہیں لافانی ہیں
حرف و معنی ہیں جو نورانی ہیں
اس لئے ہیں کہ وہ قرآنی ہیں

جو بھی فرمایا بجا فرمایا
تو نے لاریب روا فرمایا

شعر ہوتا ہے مسلسل تیرا
خوب کیا خوب تسلسل تیرا
میرے اقبال ہے بیشک گذرا
قوم کے درد میں پل پل تیرا

اشک آنکھوں میں نہ چھوڑے تو نے
عمر بر نین ، نچوڑے تو نے

ہم کلامی کی سعادت ہو تو
تیری محفل میں اجازت ہو تو
لب کشائی کی جسارت کرلوں
اپنے دکھڑوں کی میں بارش کر لوں
ایک چھوٹی سی گزارش کرلوں

سخت حالات میں جاں ہے میری
زندگی مجھ پہ گراں ہے میری
کوئی گرداب نگل جائے گا
ناؤ طوفاں میں رواں ہے میری
دربدر ڈھونڈ رہا ہوں لیکن
جانے تقدیر کہاں ہے میری
میرے اشکوں کی عبارت ہی سے
حالت زار عیاں ہے میری
کوئی تدبیر بتا دے مجھ کو
میرے اقبال فغاں ہے میری (فقری)

خیر جہاں تک امراء القیس کا تعلق ہے تو اقبال کے مطابق حضورؐ نے امراء القیس کو شاعروں کا سرتاج اور سب سے بڑا دوزخی اس لئے قرار دیا کہ اس کی شاعری، شراب و کباب اور عیش وعشرت کی داستانوں کے ذریعے بے راہ روی اور پرانی بستیوں کے کھنڈرات کے مراثی کی صورت میں مایوسی و افسردگی پھیلاتے ہوئے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی بجائے مشکلات ومصائب سے راہ فرار اختیار کرنے کی ترغیب دلاتی ہے۔

اس کے برعکس جب حضورؐ کی خدمت اقدس میں ''بنوعبس'' کے معروف شاعر ''عنترہ'' کا یہ شعر پڑھا گیا:۔

ولقد ابیت علی الطویٰ و اظله ، حتیٰ انال به کریمه الماکل

''میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تا کہ میں اکل حلال کے قابل ہوسکوں ۔''

جہاد زندگانی میں حضورؐ کی عملی زندگی ہمارے لئے مشعل راہ ہے ۔ تفصیل کی ضرورت نہیں ہر کوئی جانتا ہے ۔ کیوں کہ یہ شعر حضورؐ کے نقطہ نظر کے عین مطابق تھا ۔ اس لئے خوش ہوئے اور ''عنترہ'' کے ساتھ ملاقات کی خواہش ظاہر کی ۔ کیوں کہ ''عنترہ'' کا شعر صحت مند زندگی کی زندہ تصویر ہونے کے ساتھ ساتھ رزق حلال کے لئے انسان کو جو جو سخت مراحل طے کرنا پڑتے ہیں ان کا پورا نقشہ ہے ۔ اقبال کے ذہن پر امراء القیس اور ''عنتری'' کے اس شعر پر حضورؐ کا تبصرہ منقش تھا۔ گویا کہ اقبال نے اپنی ''حسن کاری'' کا نظریہ قرآن و سنت اور پھر مولانا روی سے اخذ کیا۔ اس لئے کہ برونگ کے مطابق ۔ زندگی کا بادۂ سر جوش کسمپرسی کی حالت میں تھا ۔ میں نے خضر سے آب حیات لیا اور ساغر میں ڈال کے پیش کر دیا۔

بے پشت بو د بادۂ سر جوش زند گی   آب از خضر بگیرم ودر ساغر افگنم

بائرن کہتا ہے ، خضر کے احسان سے اپنے سینے کو داغ داغ نہیں کیا جا سکتا ، میں جگر سے پانی (خون) لیتا ہوں اور ساغر میں ڈالتا ہوں ۔

از منت خضر نتواں کرد سینہ داغ   آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب کو مئے تلخ خوب بھاتی ہے اس لئے اس کے نزدیک ، تا کہ شراب اور تلخ ہو اور سینہ اور زیادہ زخمی ہو میں صراحی کا شیشہ پگھلا کر ساغر میں ڈال دیتا ہوں ۔

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر   بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

جبکہ رومیؒ کے ہاں آمیزش کہاں وہ تو بالواسطہ قرآنی و اسلامی تعلیمات پیش کر دیتا ہے ۔ اس شراب کی پاکیزگی فطرت کہاں ۔ میں انگور سے شراب لیتا ہوں اور بغیر کسی آمیزش کے ساغر میں ڈال دیتا ہوں ۔

آمیز شے کجا گہر پاک او کجا   از بادہ گیرم و در ساغر افگنم (۱)

گویا کہ رومی کا نظام فکر بغیر ملاوٹ و گھلاوٹ کے خالصتہً اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہے ۔ اس لئے اقبال ان کو اپنا معنوی پیر مانتے ہیں ۔ جبکہ نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں :۔

---

(۱) پیام مشرق ۔۲۱۲۔ الشعراء ۔

"اقبال اور افلاطون کے نظریات میں زبردست مماثلت پائی جاتی ہے۔
اس لئے کہ دونوں کے نظریات کی تاسیس اخلاقیات پر ہوئی ہے۔" (۱)

یہ بات تو طے شدہ ہے کہ اقبال نے نظریہ اعیان کی بناء پر افلاطون کی مخالفت کی ہے۔ رہی اخلاقی مماثلت تو اس سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محض لفظ "اخلاق" کے استعمال سے اقبال اور افلاطون کے مابین اخلاقی مماثلت پیدا نہیں ہو جاتی ۔ہم نے افلاطون کی ری پبلک کے حوالے سے باب اول میں افلاطون کی معاشرتی بے راہ روی اور عزت نفس کے ساتھ ساتھ عصمت و ناموس کی دھجیاں بکھیرنے کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ کیا لڑکوں، لڑکیوں کا برہنہ ہو کر مشترکہ جمناسٹک کرنا اور افلاطون کا یہ کہہ دینا کہ ان کے لئے نیکی کا لباس کافی ہے۔ محض لفظی بازی گری نہیں؟ افلاطون کے نزدیک نیکی و اخلاق یہی ہے کہ برہنگی کی حالت میں مخلوط جمناسٹک کی جائے۔ اسی طرح بغیر نکاح کے مشترکہ شادیاں ۔بچوں کو ماں باپ کا اور ماں باپ کو بچوں کا علم نہ ہو۔ خواہ بعد میں کوئی بچہ جوان ہو کر اپنی ماں کے ساتھ مشترکہ شادی میں شامل ہو جائے۔ قرعہ اندازی کا ڈھونگ اور دھوکہ ــــــ یہ کہاں کی نیکی، حسن، خیر اور اخلاق ہے۔ اقبال تو ایسے نام نہاد اخلاق کے ہرگز قائل نہیں ۔اقبال تو اس اخلاق کے قائل ہیں:۔

انما البعثت مقارمر الاخلاق انما بعثت لأتمم مكارم الاخلاق

اس سلسلے میں پروفیسر محمد عثمان بھی لکھتے ہیں کہ:۔

"ظاہر ہے کہ ان تصورات کو اسلامی کیا، عام اخلاقی معیار پر پرکھا جائے تو بھی
ان میں بہت سی باتیں قابل اعتراض قرار دی جائیں گی"۔ (۲)

ڈاکٹر عشرت حسن انوار رقمطراز ہیں کہ:۔

"اقبال کو جب وجدان ذات میسر ہوا، تو عجیب اتفاق سے وہ
برگساں کے فلسفے سے بالکل غیر متعلق ہوگئے، انہیں محسوس ہوا
کہ برگساں کا وجدان اس "خودی" اور انانیت کی تائید نہیں
کرتا۔جس کا ان کو وجدان ذات کے ذریعے شعور پیدا ہو رہا

---

(۱) اقبال اور جمالیات ۔ ۳۲۵ ۔نصیر احمد ناصر۔ (۲) اقبال کا ادبی نصب العین ۔۶۱ ۔ مرتبہ سلیم اختر۔

ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ برگساں کے مقابلے میں نطشے کے
فلسفہء خودی کو اپنے لئے زیادہ مفید رہنما تصور کرنے لگے۔'' (۱)

بات دراصل یہ ہے کہ کسی سے متاثر ہونا کوئی عیب نہیں۔ ہر بڑا حسن کار یا مفکر کسی نہ کسی طور پر کسی سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی نقاد کھینچ تان کر زبردستی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فلاں فلاں سے متاثر ہے تو یہ بہت بڑی ناانصافی کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ اس طرح وہ حقائق پس پردہ چلے جاتے ہیں جن سے شاعر یا ''حسن کار'' کی جڑیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اپنے وسیع مطالعے کی بناء پر اقبال علامہ بنے۔ انہوں نے ہر فلسفی کو پڑھا اور اس کے افکار کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی رائے دی۔ بس نقادوں نے اقبال کو ہر اس فلسفی سے متاثر قرار دیا، جس جس کا انہوں نے مطالعہ کیا۔ ٹھیک ہے۔ خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں کوئی ایسا پیر مرد نہیں جو حقیقت تک پہنچ سکے تو وہ خود کہتے ہیں کہ میں ان سے دور بھاگ آیا تب کہیں جا کر سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں تک نوبت پہنچی۔

لیکن ادھر اقبال اگر محض برگساں سے ہاتھ ملا لیتے ہیں تو فوراً فتویٰ جاری ہو جاتا ہے کہ متاثر ہوگئے۔ نطشے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتے ہیں تو بس ایک واویلا مچ جاتا ہے۔ جب کہ درحقیقت ہم تفصیلاً دیکھ چکے ہیں کہ اقبال کسی قسم کے فلسفے سے متاثر تھے ہی نہیں۔ ان کی نظر ہر وقت قرآن حکیم پر رہتی ہے۔ جب عشق وجدان و الہام اور نزول وحی سب کچھ اسلام میں ہے تو انہیں کیا ضرورت ہے کہ برگساں سے متاثر ہوں۔ اسی طرح حرکت اور جدوجہد کا عملی نمونہ بھی اسلامی تعلیمات ہیں۔ کیا قرآن ''تسیروفی الارض'' کے حوالے سے زمین میں پھیل جانے کا حکم نہیں دیتا؟ کیا اسلام میں جہاد نہیں؟ اگر ہے تو پھر اقبال کو کیا پڑی ہے کہ نطشے کی بربریت اور بے رحمی و سفاکی سے متاثر ہوں۔ ایسے موقع پر نہ جانے ہمارے نقاد، ایک کلیم سربکف، لاتخف اور خاک مدینہ و نجف کو بھول کیوں جاتے ہیں۔ نہ جانے انہیں از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد اور فکر من برآستانش درسجود کیوں یاد نہیں رہتا۔ اس سلسلے میں، سمیع اللہ قریشی نے بڑی خوبصورت بات کی ہے:۔

''ایک بات سے کسی طور انکار ممکن نہیں کہ اپنے افکار کی تشریح میں اقبال کا
اِدّعا نہ صرف قرآن مجید سے انحراف کا قائل نہیں، بلکہ قرآن کو اقبال اپنے
نظریات کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں''۔ (۲)

---

(۱) اقبال اور مشاہیر۔ ۱۹۸۔ مرتبہ طاہر تونسوی۔

(۲) افکار اقبال۔ ۱۵۹۔ از سمیع اللہ قریشی۔

اسی طرح علامہ محمد اقبال خود اپنے پانچویں خطبے میں کہتے ہیں کہ:۔

"قرآن مجید کی روح چونکہ اساساً یونانیت کی ضد ہے لہٰذا بالآخر وہ اس پر غالب آئی۔ حالانکہ شروع شروع میں بعض افراد کی فی الواقع یہ خواش تھی کہ قرآن پاک کی ترجمانی بھی فلسفہ یونان ہی کی روشنی میں کریں۔" (۱)

یہ حضرات ابن رشد، ابونصر فارابی اور گر باستدلال کار دیں بدے، فخر رازی راز دار دیں بدے تھے۔ جنہوں نے علم کلام اور منطق کے ذریعے قرآن پاک کی ترجمانی کرنا چاہئی۔ لہٰذا اقبال ان کی ہاں میں بھی ہاں نہیں ملاتے۔ چہ جائیکہ وہ قدیم و جدید فلسفیوں سے متاثر ہو جائیں جن کی تمام تر جڑیں ہی یونانی فلسفے کی مٹی سے نم حاصل کر رہی ہیں۔ جو کہ قرآنی تعلیمات سے متضاد ہے۔

راقم الحروف نے اقبال کی "حسن کاری" اور "ذوق جمال" کا منظوم تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک مجموعی تبصرے کے طور پر پیش خدمت ہے۔

ایک ٹھوکر سے پہاڑوں کو مٹانے والے ۔۔۔ یاد کرتے ہیں تجھے آج زمانے والے
جذب و مستی کی مجھے راہ دکھانے والے ۔۔۔ نغمۂ عشق مرے دل کو سنانے والے
مجھ غیروں کی غلامی سے چھڑانے والے ۔۔۔ مجھ سے چھینا ہوا، گھر بار دلانے والے
اپنے اسلاف کی پھر یاد دلانے والے ۔۔۔ مجھ کو طیبہ کی طرف موڑ کے لانے والے

میرے ہونٹوں سے وہی جام لگایا تو نے
پھر مجھے بادۂ توحید پلایا تو نے

گزرے ادوار مجھے یاد کرائے تو نے ۔۔۔ عظمت رفتہ کے دربار سجائے تو نے
جتنے افرنگ نے کیے، ظلم سنائے تو نے ۔۔۔ میری حالت پہ بہت اشک بہائے تو نے
زندہ رہنے کے سبھی راز بتائے تو نے ۔۔۔ عمل پیہم کے یہاں ساز بجائے تو نے

(۱) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۲۱۸۔

میری نس نس میں کئی حشر مچائے تو نے اور آداب جنوں مجھ کو سکھائے تو نے
کہکشاؤں کو مرے آگے جھکایا تو نے
پھول سرسوں کا ہتھیلی پہ کھلایا تو نے
خواب خرگوش سے یوں تو نے جگایا مجھ کو ولولہ اور نیا جوش دلایا مجھ کو
بے پرو بال تھا، پر ایسا اڑایا مجھ کو چاند تاروں کے بھی اس پار پہنچایا مجھ کو
دل سے جو نکلے وہی ساز بنایا مجھ کو تو نے یزداں کا بھی ہمراز بنایا مجھ کو
کتنے شہ زور سے اک روز لڑایا مجھ کو میں کبوتر تھا مگر باز بنایا مجھ کو
مشت بھر خاک تھا بس جب سے اٹھایا تو
میرے اقبال مجھے عرش بنایا تو نے (نقری)

اور پھر:۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید؟ نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگار ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید؟ (۱)

---

(۱) ارمغانِ حجاز ۔۱۲۔

کتابیات

مصنف	کتاب
...د ہاجر محمد السعید	اطراف الحدیث النبوی الشریف عالم التراث للطباعات۔ والنشر بیروت
...اجہ فرید الدین عطار	تذکرۃ الاولیاء در مطبع نولکشور لاہور طبع شد۔ صفحات ۴۳۲۔ ۱۳۰۸ھ
...رار احمد خان ڈاکٹر	حقیقت تصوف انجمن خدام القرآن لاہور جون ۱۹۹۷ء
...از الحق قدوسی	اقبال کے محبوب صوفیہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور جنوری ۱۹۷۶ء
...طو	مابعد الطبیعات۔ کتاب اول جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۳۲ء English Translation in Bohn University by J-H Mamabon, 1889

ابن عربی شیخ الکبیر	فصوص الحکم (مترجم محمد عبدالقدیر صدیقی) نذیر سنز پبلشرز۔ ۴۰ اے اردو بازار لاہور ۱۹۹۲ء
افلاطون	مکالمات افلاطون (ترجمہ محمد رفیق چوہان) نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۱۹۸۷ء
افلاطون	جمہوریہ افلاطون۔پانچویں کتاب (ترجمہ محمد رفیق چوہان) نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، کراچی، پشاور کوئٹہ، سکھر، ملتان۔ ۱۹۸۰ء
افلاطون	یٹوپیا جمہوریہ افلاطون ساتویں کتاب نیشنل بک " " " "
افلاطون	یٹوپیا جمہوریہ افلاطون دسویں کتاب نیشنل بک " " "

بشیر احمد ڈار — تاریخ تصوف قبل از اسلام
ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور۔
اکتوبر ۱۹۷۲ء

برٹرینڈرسل — تاریخ فلسفہ مغرب

westren
History of Europeon Philosophy
Printed by Routledge 11 New Fetter Lane, London EC4P 4EE, 1999

A History of Aesthetic — Basanquet
London ۱۹۰۰ء

تصدق حسین حیدر آباد — مضامین اقبال
حیدرآباد دکن ۱۳۶۲ھ

ثریا حسین پروفیسر — جمالیات شرق و غرب
ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ۔
۱۹۸۳ء

جلال الدین رومی مولانا	مثنوی مولانا روم ۔ دفتر چہارم الفیصل ناشران و تاجران کتب اردو بازار لاہور۔
جلال الدین رومی مولانا	مثنوی مولانا روم ۔ دفتر دوم الفیصل " " "
جلال الدین رومی مولانا	مثنوی مولوی معنوی۔ دفتر ششم الفیصل " " "
جلال الدین رومی مولانا	مثنوی مولوی معنوی۔ دفتر سوئم الفیصل " " "
جلال الدین رومی مولانا	مثنوی مولوی معنوی ۔ دفتر پنجم الفیصل " " " "
جلال الدین رومی مولانا	مثنوی مولوی معنوی ۔ دفتر اول۔ الفیصل " " " "

جگن ناتھ آزاد — اقبال اور مغربی مفکرین
مکتبۂ عالیہ، ایبک روڈ، (انارکلی) لاہور۔

دین محمد شفیقی عہدی پوری — فلسفہ ہندو یونان
مجلس ترقی ادب - ۲ - نرسنگھ داس گارڈن
کلب روڈ لاہور - ۱۹۵۷ء -

Diogenes — **Life of Lucipus**
published in united states by
oxford university 1976

رابرٹ ایس برمیاف — یونان کے فلسفی

Ruskin — **Unto This Last**
London 1862

خلیق احمد نظامی — تاریخ مشائخ چشت
ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی
رمضان المبارک ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء

A Critical History Of Greek Philosophy — Stace Porfessor
London Macillen & Co LTD
New York, ST Martin's press.
1962ء

سمیع اللہ قریشی — افکار اقبال
سنگ میل پبلشرز لاہور۔
نومبر ۱۹۷۷ء

سلیم اختر — اقبال کا ادبی نصب العین
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
لاہور، حیدر آباد، کراچی

سید ہاشمی مولوی فرید آبادی — مشاہیر یونان و روما۔ جلد اول
انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی
۱۹۴۳ء

ضیاء الدین احمد برنی — اقبال اور عطیہ بیگم
مطبوعہ آئینہ ادب لاہور۔

طاہر تونسوی	اقبال اور مشاہیر پبلشرز، نیاز احمد خان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۸ء
طفیل دارا	اقبال اور نسوانی حسن آئینہ ادب چوک مینار انارکلی لاہور۔ اپریل ۱۹۸۳ء
عتیق فکری	انسان اور خدا ادارہ علمیہ دہلی گیٹ ملتان۔ جنوری ۱۹۷۱ء
عبدالرحمان بابا	دیوان عبدالرحمان پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی ۱۹۷۳ء ۱۹۸۷ء
عبدالرشید تبسم	ملفوظات رومی ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور۔ جولائی ۱۹۷۵ء
عبدالحکیم خلیفہ	حکمت رومی مطبوعات ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، پاکستان ۱۹۵۵ء

علاؤ الدین علی علامہ المتقی بن حسام الدین الہندی۔	کنز العمال منشورات مکتبہ التراث الاسلامی حلب ۱۳۹۷ھ ۱۹۷۷ء

مصنف	کتاب
عبدالحمید قاضی ڈاکٹر	اقبال انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۴۴ء
عبدالسلام ندوی مولانا	حکمائے اسلام۔ حصہ دوم مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء
عبدالماجد دریا بادی	تصوف اسلام المعارف، گنج بخش روڈ لاہور ۱۳۹۳ھ
عطاء اللہ شیخ۔ ایم۔ اے	اقبال نامہ (خطوط اقبال) حصہ اول ناشر شیخ محمد اشرف، تاجر کتب کشمیری بازار لاہور۔
عبدالمجید سالک مولانا	ذکر اقبال بزم اقبال لاہور ۱۹۵۵ء
عبدالسلام ندوی	حکمائے اسلام۔ جلد اول در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع گردید ۱۹۵۲ء

عنایت علی شاہ سید ضیاء جعفری	صبوحی ضیاء منزل گنج پشاور ۱۹۷۶ء
گوپی چند نارنگ	اقبال کا فن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۹ء
محمد اقبال علامہ ڈاکٹر	زبور عجم شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، حیدر آباد، کراچی مئی ۱۹۸۵ء
محمد اقبال علامہ ڈاکٹر	پیامِ مشرق شیخ " " " مئی ۱۹۸۵ء
محمد اقبال علامہ ڈاکٹر	دیباچہ اسرار خودی، مشمولہ مضامین اقبال شیخ غلام علی " " " "

میر درد خواجہ	دیوان درد مجلس ترقی ادب لاہور فروری ۱۹۷۲ء
محمد اقبال علامہ ڈاکٹر	ارمغانِ حجاز (فارسی) شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز اپریل ۱۹۷۲ء
محمد اقبال علامہ ڈاکٹر	اسرار و رموز شیخ غلام علی اینڈ سنز " " مئی ۱۹۸۵ء
محمد اقبال علامہ ڈاکٹر	ارمغانِ حجاز (اردو) شیخ " " " ستمبر ۱۹۸۲ء
محمد اقبال علامہ ڈاکٹر	اسرارِ خودی شیخ غلام علی " " مئی ۱۹۸۵ء
مجنوں گورکھپوری	تاریخ جمالیات مکتبہ عزم و عمل کراچی نمبر ۵ مارچ ۱۹۶۶ء

محمد اقبال علامہ ڈاکٹر — بانگِ درا
شیخ غلام علی " " "
سنہ ۱۹۷۲ء

محمد اقبال علامہ ڈاکٹر — بال جبریل
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز ادبی مارکیٹ
چوک انارکلی لاہور۔ سنہ ۱۹۸۴ء

محمد اقبال علامہ ڈاکٹر — جاوید نامہ
شیخ غلام علی " " " "
مئی ۱۹۸۵ء

محمد اقبال علامہ ڈاکٹر — ضرب کلیم
شیخ غلام علی " " "
سنہ ۱۹۷۲ء

محمد اقبال علامہ ڈاکٹر — مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق
شیخ " " "
مئی ۱۹۸۵ء

محمد اقبال علامہ ڈاکٹر — رموزِ بیخودی
شیخ " " " "
مئی ۱۹۸۵ء

محمد اقبال علامہ ڈاکٹر — مثنوی مسافر — شیخ — سن ۱۹۶۸ء

محمد حنیف ندوی — قدیم یونانی فلسفہ۔ ترجمہ از مقاصد الفلاسفہ (امام غزالی)
مجلس ترقی ادب نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور۔
سن ۱۹۵۷ء

محمد اقبال علامہ ڈاکٹر — تشکیل جدید الہیات اسلام (مترجم سید نذیر نیازی)
بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور۔
سن ۱۹۵۸ء

محمد اقبال علامہ ڈاکٹر — فلسفہ عجم (مترجم۔ میر حسن الدین)
نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن
سن ۱۹۴۷ء

(امام راغب اصفہانی) پبلشر شیخ شمس الحق کشمیر بلاک اقبال ٹاؤن لاہور۔
جنوری ۱۹۸۷ء

مجید امجد — کلیات مجید امجد
ماورا پبلشرز۔ بہاولپور روڈ۔ لاہور۔
۱۹۹۱ء

مجید امجد — شب رفتہ
نیا ادارہ لاہور۔ ۱۹۵۸ء

محمد فرمان پروفیسر — اقبال اور تصوف
بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور۔
۱۹۵۸ء

Margret Smith — Reading From the mystic of Islam
Mentoredn 1950ء

نصیر احمد ناصر — تاریخ جمالیات۔ جلد اول
ناشر سید امتیاز علی تاج، مجلس ترقی ادب
۲ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ۔ لاہور۔
مارچ ۱۹۶۲ء

(امام راغب اصفہانی) پبلشر شیخ شمس الحق کشمیر بلاک اقبال ٹاؤن لاہور۔
جنوری ۱۹۸۷ء

مجید امجد
کلیات مجید امجد
ماورا پبلشرز۔ ۶۰ بہاولپور روڈ۔ لاہور۔
۱۹۹۱ء

مجید امجد
شب رفتہ
نیا ادارہ لاہور۔ ۱۹۵۸ء

محمد فرمان پروفیسر
اقبال اور تصوف
بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور۔
۱۹۵۸ء

Margret Smith
Reading From the mystic of Islam
Mentoreadn 1950ء

نصیر احمد ناصر
تاریخ جمالیات۔ جلد اول
ناشر سید امتیاز علی تاج، مجلس ترقی ادب
۲ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ۔ لاہور۔
مارچ ۱۹۷۲ء

The Pleasures of Philosophy — Will Durant

Services Book Club

1995ء

علمی اردو لغت

علمی کتب خانہ کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور۔

۱۹۶۷ء

وارث سرہندی

The Story of Philosophy — Will Durant

Services Book Club

1985ء

نشاط فلسفہ (مترجم محمد اجمل)

فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور۔

۱۹۹۵ء

ول ڈیورنٹ

نعیم احمد — تاریخ فلسفہ یونان
علمی کتب خانہ کبیر سٹریٹ لاہور۔
دوسرا ایڈیشن۔ ۱۹۸۱ء
۱۹۸۷ء

نصیر احمد ناصر — تاریخ جمالیات۔ جلد دوم
مجلس ترقی ادب ۲ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور
فروری ۱۹۷۳ء

نصیر احمد ناصر — اقبال اور جمالیات
اقبال اکادمی، پاکستان کراچی جنوری ۱۹۷۴ء

نصیر احمد ناصر — جمالیات قرآن حکیم کی روشنی میں
ناشر کریم احمد خان، نذیر آرٹ پریس، ۱۷/ ریلوے روڈ لاہور
۱۹۵۸ء

Knight — The Philosophy of the Beautiful
London 1903ء

وزیر آغا ڈاکٹر — تصورات عشق و خرد
اقبال اکادمی پاکستان ۹۰-بی-۲ گلبرگ ۳ لاہور۔

ول ڈیورنٹ — داستانِ فلسفہ
مکتبہ اردو لاہور بالاشتراک مکتبہ فرینکلن لاہور۔ نیو یارک
(ترجمہ سید عابد علی عابد)

Hegel — **Aesthetic**
Eng Tr by W.M Bryant.

یوسف حسین خان ڈاکٹر — اقبال اور غالب کی متحرک جمالیات
پبلشرز کاروان ادب ملتان صدر
۱۹۸۶ء

ینسل — مختصر تاریخ فلسفہ یونان
جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن
۱۹۳۴ء

یوسف حسین خان ڈاکٹر

حافظ اور اقبال
غالب اکیڈمی نئی دہلی

مئی ۱۹۷۶

الہامی کتاب

القرآن